تانیثیت اور پاکستانی اُردو ادب

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اُردو)

(ریگولر پروگرام)

مقالہ نگار :

نورین روبی

پی ایچ۔ڈی ریسرچ سکالر

نگرانِ مقالہ:

ڈاکٹر محمد سلیم ملک

پروفیسر شعبۂ اُردو

شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

۲۰۱۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرستِ ابواب

دیباچہ

عورت کے بارے میں مختلف مباحث اور نظریات اکثر موضوعِ سخن بنتے رہے ہیں۔ تاریخی وتہذیبی اور مذہبی تناظر میں یہ موضوع خاصا تفصیل کا متقاضی ہے۔ معاشرے میں مرد کی برتری مسلمات میں شمار ہوتی ہے اور عورت پر کمتری جہالت، کم عقلی، کم فہمی اور ناسمجھی کی مہر ثبت کردی جاتی ہے۔ عورت کے بارے میں بیشتر اوہام ونظریات اور رویہ جات کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے۔ اس کے بارے میں قائم کردہ تعصبات اور استحصال کے پسِ پردہ محرکات کی تلاش، موضوع کے انتخاب کا سبب بنی۔ تانیثیت ایسی سوچ اور طرزِ فکر کا نام ہے، جو ظلم وتشدد اور جبر ودھونس کے رویوں کی مذمت کرتے ہوئے جائز حقوق کی متقاضی ہے۔ اس تحریک کے بنیادی مقاصد میں سیاسی، سماجی معاشی اور تعلیمی معاملات میں مرد اور عورت کے مساوی وبنیادی انسانی حقوق کی بازیافت کے علاوہ خانگی تشدد اور استحصال کی روک تھام شامل ہیں۔

ادب میں محض جنسی آسودگی کا سامان اور خیالی محبوبہ بنا دی جانے والی عورت حقیقی زندگی میں خانگی تشدد اور جذباتی ونفسیاتی سطح پر عدم تحفظ اور بے یقینی کا سامنا کرتی ہے۔ یہ عورت کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے کہ جہاں کہیں پسی ہوئی عورت نے اپنے حقوق کے تحفظ کی بات کی، تو جسمانی وذہنی اذیتوں کے علاوہ جلادی گئی یا خودکشی کا رنگ دے کر مار دی گئی۔ موجودہ دَور کی عورت اپنے بارے میں قائم کردہ فرسودہ تصورات کے خلاف باغیانہ روش اختیار کر رہی ہے اور نہ سمجھے جانے کا قصہ بننے کی بجائے اپنی سوچ کی عکاس بن گئی ہے۔ تانیثی طرزِ فکر کے حامل مصنفین نے شعور وادراک کی لَو جگا کر قلم کے ذریعے آگہی کی شمع روشن کردی ہے۔ موجودہ دَور میں عورتوں کی اقتصادی خودمختاری بہت بڑا انقلابی قدم ہے، جس میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے، لیکن بیشتر مرد، عورت کے ہم قدم ہونے کی بجائے اپنی شخصیت کے اصل جوہر، محنتِ شاقہ وجستجوئے معاش کھو کر آرام طلبی کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور نفسیاتی طور پر حاکمیت کے طلسم کدے کے ٹوٹنے کے خوف سے جبر، بے جا دھونس اور تشدد کے علاوہ عورت کے مالی وسائل پر قابض ہو رہے ہیں۔ میڈیا وار کے منفی پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ بھی نکل رہا ہے کہ تیسری دُنیا کے ترقی پزیر ممالک میں جدیدیت کی آڑ میں خانگی نظام کی دھجیاں بکھر رہی ہیں۔ عورت جو گھریلو زندگی کے استحکام میں کلیدی کردار ادا کر رہی تھی۔ مسلسل استحصال اور مرد کے عدم تعاون کی وجہ سے اَب وہ مرد کی بے وفائی اور بے راہ روی کے بدلے میں اُسی روش کو اختیار کرنے پر بھی آمادہ ہو رہی

ہے۔ اِس ردِعمل کی شدت کو کم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ مرد و عورت کے مابین معاندانہ اور غاصبانہ مزاج میں تبدیلی لاتے ہوئے دوستانہ رویے کو فروغ دیا جائے ،تا کہ خانگی زندگی میں استحکام کے علاوہ بڑھتی ہوئی شرحِ طلاق پر قابو پایا جا سکے۔

میرے تحقیقی مقالے کا موضوع ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو ادب'' ہے۔ یہ مقالہ چار تفصیلی ابواب پر مشتمل ہے،جن میں سے بابِ سوم کو مزید پانچ ذیلی فصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب بہ عنوان ''تانیثیت : تاریخ،تہذیب اور مذہب کے آئینے میں'' میں عورت کے بارے میں قائم کردہ مختلف نظریات،اوہام مفروضات کی تاریخی،تہذیبی وسماجی اور مذہبی محرکات وعوامل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ دُنیا کے بڑے مذاہب میں عورت کے متعین کردہ حقوق کا تقابل وموازنہ کیا گیا ہے۔ مزید براں، اُن تمام عوامل اور نخستمثال کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، جو موجودہ دَور کی عورت کے استحصال اور جائز حقوق کی عدم دستیابی کا سبب ہیں۔

دوسرا باب بہ عنوان ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو شاعری'' میں ادبی تاریخ میں خواتین مصنفین کو نظر انداز کیے جانے کی وجوہات کے علاوہ شعوری ولاشعوری سطح پر ہونے والے ردِعمل کی صورت میں منظرِ عام پر آنے والی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔اُردو شاعرات نے اپنے مروجہ کردار کے برعکس اپنی سوچ ونظریات ، اُلجھنوں اور خیالات وتصورات کی عکاسی حقیقی انداز میں کی ہے۔ محض حسن و جمال اور جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھی جانے کی بجائے ، جائز حقوق کے حصول کا مطالبہ کیا۔مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں مروجہ رُسومات،جنسی امتیازی رویوں ، جبر واستبداد کے علاوہ مذہب ومعاشرت کی آڑ میں استحصال کرنے والوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والوں میں ادا جعفری،فہمیدہ ریاض،کشور ناہید،یاسمین حمید شبنم شکیل پروین شاکر،شاہدہ حسن اور سارا شگفتہ قابلِ ذکر ہیں۔سماجی وشخصی استحصال کے علاوہ ملازمت پیشہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے مسائل کی عکاسی منصورہ احمد،شہناز مزمل،فاخرہ بتول،یاسمین گل اور حمیدہ شاہین کے ہاں ملتی ہے۔شعرا کی بہ نسبت شاعرات کے ہاں ایسا تانیثی شعری ادب تخلیق ہوا ،جس میں عورت نے اپنا مدعا اپنی زبان سے پیش کیا،یوں موضوعات کے تنوع کی وجہ سے اُردو شاعری کا کینوس وسیع ہو گیا اور تصوراتی محبوبہ کی بجائے بھٹہ مزدور، کسان ومحنت کش سماجی ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں سے نبرد آزما عورت منظرِ عام پر آئی۔ مزید براں، زیورِ تعلیم سے محرومی باپ بھائیوں کے جرائم کی بھینٹ چڑھایا جانا،قتل،زبردستی نکاح،وَنی،کاروکاری،خانگی وجنسی تشدد،تیزاب پھینکنا اور جلایا جانا جیسے مسائل کے علاوہ،عورت کی ذہنی اُلجھنوں اور عصری شعور کی عکاسی اِس بات کا ثبوت ہے کہ عورتوں نے اِس میدان میں شعور وادراک کی نئی جہت اُجاگر کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی ہے۔

بابِ سوم ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو نثر'' میں اُردو ادب کے تانیثی ادبی نثری سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے،جس میں ایسی اصناف منتخب کی گئی ہیں ،جن میں تانیثیت کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اِس کے ذیلی پانچ حصوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:(ا) ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو ناول'' میں تانیثی ناول نگاروں نے حقوقِ نسواں کا شعور اُجاگر کرنے کے علاوہ عورت کو درپیش مسائل ومشکلات کی تصویرکشی اور اُن محرکات کی نشاندہی بھی کی ہے،جو اِس استحصال کا سبب بنے۔ مرد اور عورت کی جنسی گراوٹوں ،سماجی بے حسیوں احساسِ تنہائی اعصابی تھکن کے علاوہ ایثار وقربانی کے باوجود سماجی استبدادی رویوں اور نفرت کے باعث ،عدمِ توازن کی شکار عورت کے مسائل موضوع بنائے گئے ہیں،تانیثی ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر

حجاب امتیاز علی، جمیلہ ہاشمی، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، نثار عزیز بٹ، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی اور انتظار حسین، رضیہ فصیح احمد بلقیس ریاض، ڈاکٹر سلیم اختر اصغر ندیم سید، انوار صدیقی اہم نام ہیں۔ خانگی ادب جس کی بنیاد ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری نے رکھی تھی۔ رضیہ بٹ، اے آر خاتون، فاطمہ ثریا بجیا اور ان کے تتبع میں لکھنے والوں میں بشریٰ رحمٰن سلمیٰ کنول، رفعت سراج اور عمیرہ احمد نے تانیثی ناول نگاری کی عمارت اُستوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ (ب) ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو افسانہ'' میں فسادات کے دوران عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم، اپنوں کی بے حسی، جنسی استحصال کی مختلف صورتوں کو نمایاں کیا ہے۔ ناول کی بہ نسبت تانیثی طرزِ فکر کے حامل افسانوں کی تعداد زیادہ ہے، جن میں عورتوں پر ڈھانے والے جور و ستم ضعیف الاعتقادی اور سماجی رویوں کی بدصورتی سے متاثر ہونے والی خواتین کی مشکلات موضوع بنیں۔ اُردو افسانوی ادب میں مردانہ سوچ کی عکاس جس مثالیت کی حامل عورت کا تصور پیش کیا گیا تھا، اُس کے خلاف بعد میں تانیثی افسانہ نگاروں نے ردِ عمل کے طور پر ایسی عورت کی حقیقی تصویر کشی کی ہے، جسے ہر قدم پر مرد کی حاکیت، جابرانہ رویے، فرسودہ رسوم و رواج شوہر اور سُسرال کے مظالم خانگی تشدد اور جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اِن افسانوں میں عورت کی نفسیاتی اُلجھنیں اور تہہ داریاں جاگیرداروں، سرمایہ داروں بیوروکریٹس اور افسرانِ بالا کی جنسی بھوک کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، احمد ندیم قاسمی، جیلانی بانو خالدہ حسین کی سماجی حقیقت نگاری کا نتیجہ ہے کہ موجودہ دَور میں نیلم احمد بشیر، بشریٰ اعجاز، داؤد رہبر، انوار صدیقی نیر اقبال علوی، عطیہ سید، زاہدہ حنا اور اُم عمارہ جیسے نام منظرِ عام پر آئے، موجودہ دَور کی سماجی کجیوں اور بدلتی اقدار و طرزِ زندگی نے عورت کے مسائل میں جس طرح اضافہ کیا ہے، اُن میں گھریلو زندگی کے مسائل کے علاوہ ہسپتالوں بازاروں، دورانِ سفر یا جائے ملازمت پر جنسی طور پر ہراساں کرنا، جنسی تشدد اور ملازمت پیشہ عورتوں کو درپیش خانگی و سماجی مشکلات سرِ فہرست ہیں جو افسانے میں موضوعاتی تنوع میں اضافے کا باعث بنی۔ (ج) ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو ڈراما'' میں نمائندہ نام اشفاق احمد، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، یونس جاوید، امجد اسلام امجد اور مستنصر حسین تارڑ کے ڈراموں میں گھروں میں کام کرنے والی ملازماؤں نوکرانیوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کی عورتوں کے استحصال اور اُن کو درپیش مسائل کو پیش کیا ہے۔ تانیثی سوچ و فکر کے اعتبار سے بانو قدسیہ کے ڈرامے فوقیت حاصل کر جاتے ہیں، جب وہ صنفی تخصیص کو مدِ نظر رکھے بغیر میاں بیوی کی عدم مطابقت کی بنیادی وجہ بدعہدی اور خیانت کو قرار دیتی ہیں، اُن کے ڈراموں میں عورت کے استحصال کی داستان لڑکیوں کی شادی و جہیز کے مسائل، سُسرال کے مظالم مار پیٹ، خانگی تشدد کی مختلف صورتیں، بے جوڑ اور وٹہ سٹہ کی شادیوں کے بُرے انجام، طلاق کی دھمکیوں سے پیدا ہونے والے عورت میں عدم تحفظ کے احساس اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا بیان، اِن کے ڈراموں کا خاص موضوعات ہیں، جو انھیں اپنے عہد کے ڈراما نویسوں میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ (د) ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو خود نوشت سوانح عمری'' میں تانیثیت کے حوالے سے جو پہلو نمایاں ہوا ہے، اس میں شوہر کی بے جا حاکمیت اور عدم توجہی کے باعث عورت جن اذیتوں کا شکار ہوتی ہے، اِس کی عکاسی ملتی ہے۔ (ہ) ''تانیثیت اور پاکستانی اُردو تحقیق و تنقید'' میں تانیثی طرزِ فکر کے نمائندہ محققین و ناقدین کے تانیثی تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

اُردو ادب میں تانیثیت کے اثرات شاعری سے زیادہ نثر میں دستیاب ہوئے ہیں، اِس لیے مقالے کا تیسرا باب

''تانیثیت اور پاکستانی اُردو ادب'' پانچ ذیلی موضوعات میں تقسیم کرنا پڑا اور مباحث کو سمیٹتے سمیٹتے بھی صفحات کی تعداد کہیں پونے تین سو تک جا پہنچی، اِس کے حوالہ جات شمار کیے، تو وہ پونے سات سو نظر آئے۔ ایک ہی باب میں مسلسل پونے سات سو حوالہ جات دینا موزوں معلوم نہیں ہوا، اِس لیے ہر ذیلی عنوان کے آخر میں حوالہ جات دے دیے ہیں، تا کہ قاری روانی اور آسانی سے پڑھتا چلا جائے۔

باب چہارم ''تانیثیت کے اثرات مستقبل کے پاکستانی اُردو ادب پر'' کے زیرِ عنوان ہے، جس میں حال کے آئینے میں فردا کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، کیوں کہ ماضی کے اثرات اور حال کے واقعات وہ بنیاد تیار کرتے ہیں، جس پر مستقبل کی عمارت ایستادہ ہوتی ہے۔ موجودہ دَور میں سماجی اور افرادی سطح پر نفسیاتی تبدیلیوں میں توازن اُسی صورت بحال ہو سکے گا۔ اگر مرد و عورت کے بارے میں قائم کردہ ٹیبوز، اوہام و مفروضات اور فرسودہ رسوم و رواج کی بیخ کنی کی جائے گی۔ عورت کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کرتے ہوئے، مرد و عورت کے خلاف مخالفانہ و غاصبانہ رویے کی بجائے معاونت اور تسلیم کرنے کا رویہ اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے گا، چوں کہ کمپیوٹر ایج کی سب سے بڑی ضرب مذہب و اخلاقیات پر پڑ رہی ہے۔ اِس لیے اخلاقی اقدار میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جو روایت شکن اور باغیانہ روش کی بجائے مفاہمانہ طرز کا حامل ہو اور نئی نسل کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی اور اخلاقی اقدار کی تطہیر کا باعث ہو۔ یہ فریضہ قلمکار بخوبی انجام دے سکتے ہیں، کیوں کہ معتدل و مثبت طرزِ فکر ہی ایک اچھی سوچ و عمل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ لہٰذا، جہاد بالقلم کے ساتھ ساتھ تمام تعلیمی اِداروں اور میڈیا کے ذریعے صنفی امتیازی رویوں کی مذمت کرتے ہوئے معاشرے کی صحت مند اخلاقی اقدار کی ترویج ہی انتشار اور ذہنی خلفشار کے اِس دَور میں شجرِ سایہ دار ثابت ہوگی۔ مذکورہ باب میں ایسے نکات پیش کیے گئے ہیں، جو اِمکانی صداقتوں پر مبنی ہیں۔

آخر میں محاکمہ پیش ہے، جس میں تانیثیت اور پاکستانی اُردو ادب کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، جس کے مطابق عورت کے بارے میں نئے تصورات اور سماجی رویوں کو تاریخی، تہذیبی اور مذہبی تناظر میں جانچنے کے علاوہ اصنافِ نظم و نثر میں تانیثیت کے مختلف پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دورانِ تحقیق مجھے بعض دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، ملازمت پیشہ ہونے کے باعث بعض مسائل بھی درپیش رہے اور گھر کی چار دیواری میں مقید زندگی کے مختلف پہلو بھی مشاہدے و مطالعے میں آئے۔ حاصلِ تحقیق کا تیقن اِس بات کی دلیل ہے، پھر دو فرزندوں کی دائمی جدائی نے تصورات سے حقیقت کا دَر وا کیا۔

مقالے کی تکمیل کے موقعے پر میں اپنے نگران پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم ملک کی خصوصاً شکر گزار ہوں، جنھوں نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور دَورانِ تحقیق کسی قسم کی رائے مسلط نہیں کی، بلکہ اِس بات پر زور دیا کہ تحقیقی مقالے میں پوری ذہنی آزادی کے ساتھ اپنے خیالات و نظریات کا بھرپور اظہار ہونا چاہیے۔ علم کی پہلی سیڑھی سے لے کر پی ایچ۔ ڈی تک میری والدہ پروین اختر اور والدِ محترم محمد رفیق مرزا جنھوں نے بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق روا نہیں رکھا اور ہمیشہ ''اپنا تیشہ اپنا رستہ'' کا درس دیا۔ اُن کی کاوشوں کا ثمر آج میرے دامن میں سمٹ آیا ہے اور بہت سے عزیزوں دوست و احباب کی شکر گزار ہوں، جنھوں نے ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا۔ تنویر شجاع، جو شوہر کم اور دوست زیادہ ہیں اور حاکمیت کا بھوت بھی اِن کے سر پر نسبتاً کم سوار ہوتا ہے۔ کتابوں کی خریداری اور کمپوزنگ تک کے تمام مراحل اُنھوں نے

بڑی تندہی سے طے کیے، جو اِن کی مثبت سوچ اور بہترین تعاون کی عمدہ مثال ہے۔

زیرِ نظر موضوع خاصا وسیع تھا، اِس کے لیے خاصا ذخیرۂ کتب درکار تھا۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں میرے ساتھ شریکِ حیات تنویر شجاع نے مطلوبہ کتب کی فراہمی کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ مآخذ تک رسائی کے لیے اورینٹل کالج لائبریری پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، قائداعظم لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری، دیال سنگھ لائبریری سے بھرپور استفادے کا موقع ملا۔ اوری اینٹل کالج لائبریری کے سابق ڈپٹی چیف لائبریرین بشیری صاحب، موجودہ ڈپٹی چیف لائبریرین میجر صالح مسعود، اسسٹنٹ ڈپٹی چیف لائبریرین سیما اور عملے کے دیگر ارکین خصوصاً یونس اور بشیر کا تعاون رہا، اِن کی تہہِ دل سے ممنون ہوں۔

پیشِ نظر موضوع بہت زیادہ تحقیق طلب اور تفصیل کا متقاضی تھا اور قلیل وقت میں اِس وسیع موضوع کو سمونا دریا کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف بھی ہے۔ اِس کے باوجود میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک طالب علمانہ کاوش ہے۔ اس میں اغلاط بھی ہوں گی اور لغزشیں بھی، لیکن میں اُمید رکھتی ہوں کہ میری اِس کاوش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

نورین روبی
ریسرچ اسکالر
پی ایچ۔ ڈی (اُردو)
پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

باب اول

تانیثیت: تاریخ، تہذیب اور مذہب کے آئینے میں

۱

عورت کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ عورت اور مرد ایک دوسرے کے حریف ہیں؟ یا ان کا باہمی تعلق حاکم ومحکوم، ظالم ومظلوم، طاقتور وکمزور اور آقا وغلام کا ہے؟ اپنی ذات سے قطعِ نظر، مختلف حیثیتوں اور حوالوں سے پہچانی جانے والی یہ مخلوق معمہ کیوں سمجھی جاتی ہے؟۔ ان سوالات کے جواب کے لیے ہمیں عورت اور مرد کے امتیازی رویوں میں کارفرما موروثی، پیدائشی، ثقافتی، سماجی، تمدنی، نفسیاتی اور تاریخی عوامل کا جائزہ لینا پڑے گا کہ کس طرح یہ محرکات انسانی رویوں اور نظریات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

کائنات دو طرح کے انسانوں سے مزّین ہے ایک مرد اور دوسری عورت۔ زندگی کی اساس عورت و مرد کے ساتھ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں، تو پھر دونوں میں تفاوت اور بُعد کیوں پایا جاتا ہے؟ مرد کو حاکمِ کل مختارِ کل سمجھا جاتا ہے، جب کہ عورت ناقص العقل اور ناتواں گردانی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں مردوں کے غیر معتدل، انتہا پسندانہ اور غاصبانہ رویے سے عائلی زندگی زہرناکیوں کا کیوں شکار ہوتی ہے؟ دراصل ہمیں معتدل رویوں سے تہی جس قدر انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس کا بڑا سبب مناسب تربیت کا نہ ہونا ہے، اس کے بہت سے محرکات ہیں، جن میں تہذیبی و ثقافتی، مذہبی و اخلاقی اور نفسیاتی و احساساتی سطح پر ہونے والی آفاقی ناانصافی اور غیر مساویانہ سلوک ہے، جو عموماً مرد وعورت کے مابین روا رکھا جاتا ہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مرد میں منفی خصائص کو پروان چڑھانے والی بھی عورت ہی ہے۔ مرد کی حاکمیت یا پدرسری معاشرے کی حامل ماں اپنی زندگی کے تلخ تجربات کی روشنی میں بیٹیوں سے ناروا سلوک کرتی ہے اور مرد کی حاکمیت اور بے جا دھونس برداشت کرنے کے نتیجے میں بیٹے کو مضبوطی کی علامت سمجھتے ہوئے لڑکے کی نشوونما اس انداز سے کرتی ہے کہ بالآخر اس کی زہرناکی کا شکار کسی اور کی آغوش میں پلنے والی بیٹی بنتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے مردوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، جن کی شخصیت میں استحکام اور اعتدال پایا جاتا ہے، جو عورت کی عزتِ نفس مجروح کرنے یا اپنی محرومیوں اور نااہلیوں کے عتاب کا نشانہ بنانے کے بجائے اسے اپنی زندگی کا حقیقی ساتھی متصور کرتے ہیں اور اُس کی ذہنی، جذباتی اور احساساتی کیفیات کے بارے میں ایسے محتاط ہوتے ہیں، جیسے اپنے احساسات کے بارے میں۔ لہٰذا، مرد وعورت کے مابین پائے جانے والے فطری امتیازات کو باہمی افہام وتفہیم سے کم کیا جا سکتا ہے، عموماً روزمرہ خانگی زندگی میں پائے جانے والے ذہنی بُعد کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مرد حضرات مسئلوں کے حل کے لیے جلد بازی سے کام لینا پسند کرتے ہیں اور اپنی رائے اور فیصلے کو اٹل سمجھتے ہوئے مسلط کرنا شروع کر دیتے ہیں، جب کہ عورتیں اپنی پریشانیاں بانٹنا پسند کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ مشکل حالات میں اُن کی دلجوئی کی جائے، اُن کے نزدیک یہ مسائل ومشکلات کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے، ایک دوسرے کی

کیفیات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اعتماد، بھروسے اور یقین میں استحکام متزلزل ہونے لگتا ہے۔ جان گرے کی رائے ہے کہ جب مرد و عورت ایک دوسرے کی مختلف طبعیت کو سمجھنے کے لائق ہو جاتے ہیں، تو اُن کی محبت ایک پھول کی مانند کھل جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے سے ایک خوش حال زندگی کی تمنا کی جا سکتی ہے اور زندگی کے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔[۱] کشور ناہید کے خیال کے مطابق:

''مفاہمت اور خانگی تقاضوں کی تاریخ اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہی محبت جو ایک لمحہ پہلے رس تھی، سم بن کر آپ کو کچوکے دینے لگتی ہے۔ محبت کو دوستی میں بدلنا، ہمارے معاشرے کے مردوں کو تو بالکل ہی نہیں آتا، اس لیے عورت اور مرد کے رشتے میں ٹھہراؤ نہیں آتا۔ معاونت کی کوئی شبیہہ نہیں نظر آتی ۔۔۔ بہت کم کم ہے کہ احساس شائستگی اور افتخار عورت، مرد کے رشتے میں جھلکتا ہو۔''[۲]

چناں چہ، اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ قدرتِ حق نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا حریف نہیں، بلکہ زوج بنایا ہے۔ دونوں مل کر زندگی کی اکائی بناتے ہیں، ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، بہ حیثیتِ انسان دونوں برابر ہیں گناہ و ثواب، نیکی و بدی اور جزا و سزا کے معیارات اللہ کے نزدیک دونوں کے لیے ایک سے ہیں۔

''صدائے کن فیکون'' تخلیقِ کائنات کا مظہر ہے۔ ظہورِ آدمؑ و حوا، کائنات کی تعمیر و تشکیل کا سبب بنا۔ دُنیا کے تقریباً تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ حوا کی ایما پر آدمؑ نے دانۂ گندم چکھا، جس کی پاداش میں جنت سے نکال دیے گئے۔ تب سے آج تک یہ نظریہ مشہور ہے کہ عورت، چوں کہ آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی، اس لیے ناقص العقل، کمزور و کمتر ہے۔ دوسرا یہ کہ بنی آدم کو ورغلانے والی ہے، اس طرح جب آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل (جن کے ناموں کا ذکر قرآنِ پاک میں نہیں بلکہ 'ابنی آدمؑ' کہہ کر ضمنی طور پر یہ قصہ بیان کیا گیا ہے، جب کہ تورات میں یہ قصہ ناموں کے ساتھ موجود ہے)[۳]، دونوں اقلیما پر عاشق تھے۔ ہابیل کے ہاتھوں قابیل مارا گیا، یہیں سے طے پایا کہ عورت کا وجود فتنہ و فساد کی علامت ہے۔ سعد اللہ برق کے خیال میں مرد کی حاکمیت کے تصور کی جڑیں بھی اِسی واقعے سے منسلک ہیں:

''قابیل کے انجام کے بارے میں کوئی واضح بیان موجود نہیں ہے، لیکن تورات میں اِس کی اولاد کا تذکرہ آیا ہے۔ اَب یہ بھی واضح نہیں ہے کہ ہابیل کو مارنے کے بعد اُس کی شادی یوندا سے ہوئی یا اقلیما سے ہوئی، لیکن کم از کم یہ بات طے ہے کہ مرد کی یہ ذات شریف ابتدا ہی سے عورت کو انسان کی بجائے ملکیت سمجھتی آ رہی ہے، اِس کہانی میں بے چاری یوندا اور اقلیما کی نہ مرضی پوچھی گئی نہ انسان سمجھا گیا اور یہی روایت آج تک قائم ہے کہ عورت کی زندگی کا فیصلہ مرد کے ہاتھ میں ہے اور عورت کو ایک خاموش جانور کی طرح، جس طرف مرد کا جی چاہے ہنکا دیا جاتا ہے یا یوں کہیے مرد نے یہ بتایا ہے کہ عورت کو ابتدائے آفرینش سے کیا سمجھا جا رہا ہے۔''[۴]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام کائنات اسباب وعلل کے اُصولوں پر کار بند ہے۔ مندرجہ بالا واقعات کے در پردہ بھی یہی عوامل کار فرما ہیں، چوں کہ اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارض پر انسانوں کو آباد کرنا تھا، اس لیے آدمؑ سے دانستہ غلطی فطری

امر ثابت ہوئی۔ ورغلایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے بُھلا بیٹھا اور وہ خطا کا پُتلا ہے، یہ بہکاوا ایک عورت کا بہکاوا نہیں، بلکہ شیطان کا بہکاوا تھا، جس نے محض حوّا کو ہی نہیں، بلکہ آدمؑ کو بھی ورغلایا تھا۔ ان مباحث کو بیان کرنے کا مقصد ان حقائق کو دریافت کرنا ہے، جن کی پرداخت سے عورت کے حوالے سے تعصبات کا درخت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھنا ہوتا گیا اور تکمیلِ آدمؑ کی خاطر تخلیق کی جانے والی مخلوق پر ازل سے ہی 'کج سرشتی' کی مہر لگادی گئی۔ ایم عبدالرحمٰن خان کا اِس حوالے سے کہنا ہے:

> ''جس مشہور حدیث کی رُو سے حضرت حوّا کا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ حضرت آدمؑ کا ہے اور نہ حضرت حوّا کا، بلکہ محض عورت کی پیدائش اور کج سرشتی کا بیان ہے۔ آثار میں بھی جو روایت ملتی ہے، وہ توریت کی آواز کی بازگشت ہے اور توریت کا بیان حسبِ ذیل ہے۔۔۔ خداوند نے آدمؑ پر بھاری نیند بھیج دی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے، جو اس نے آدمؑ سے نکالی تھی، ایک صورت بنا کر آدمؑ کے پاس بھیجا۔'' ۵

دیگر الہامی کتابوں میں عورت کو کمزور اور کم تر درجے کی مخلوق ثابت کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے ایک مخلوق کی بجائے ایک انسان کی حیثیت سے قبول کریں، جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (ترجمہ) اور انسان کو کمزور ہی پیدا کیا گیا۔ اس ارشادِ ربانی میں عورت کا اس طرح مذکور نہیں، جس کی بنا پر عورت کی کمزوری، کمتری اور کم عقلی کو مسلمات میں سمجھ لیا گیا۔ انسان کا لفظ مرد و عورت دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ دونوں کو جسمانی اور ارادی طور پر کمزور پیدا کیا گیا۔ کسی کو بھی دوسرے پر برتری نہیں۔ مرد و عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں، یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ (اللہ) انسانیت کی گاڑی کا ایک پہیہ تو مضبوط اور طاقتور بناتا اور دوسرا کمزور اور ناتواں۔ ۶ دیگر الہامی کتب میں عورت کو خدائی عتاب اور غضب کا محور و مرکز قرار دینے کے لیے دردِزہ اور مرد کی باندی ہونے کی سزا کو ڈھال بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے بقول:

> ''گویا نہ صرف یہ کہ آدمؑ کے جنت سے نکلنے کا سبب عورت کو بتایا جارہا ہے، بلکہ حمل اور اولاد کی پیدائش کی تکالیف کو عورت کی سزا بتایا جارہا ہے، ظاہر ہے کہ ان بیانات سے عورت کے وقار اور مرتبے میں اضافہ تو ہوتا نہیں، دوسری طرف اگر اس حوالے سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام ان تکالیف کو عورت کی عظمت اور وقار میں اضافے کا سبب بتاتا ہے۔'' ۷

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مختلف تہذیبوں، معاشروں میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا جائزہ لیں، تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ موجودہ حالات میں عورت کو درپیش مسائل خود ساختہ ہیں یا ان معاشروں کی دَین ہیں۔ مزید برآں، اُن اوہام کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے، جو مرد کی حاکمیت والے معاشرے کی صدیوں کی ریاضتوں کا نتیجہ ہے۔ کشور ناہید کے خیال میں آدم کو جنت سے نکالے جانے کی ذمہ دار عورت کو قرار نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ محض عورت ہی خطا کار نہ تھی، بلکہ دونوں ہی قصوروار تھے۔ روحانی معاملات میں عورت اور مرد کو قرآن کی رو سے مساوی حقوق حاصل ہیں، اِس حوالے سے کشور ناہید کا کہنا ہے:

''حیاتیاتی سطح پر مرد و عورت یقیناً مختلف ہیں، لیکن اِس تضاد کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں کی اہمیت یکساں نہیں، اللہ کے نزدیک مرد و عورت زندگی کی بھاگ دوڑ میں ایک جیسے حصے دار ہیں، قرآن کی بہت سے آیات، مثلاً (۱۶:۹۷، ۳:۱۹۵، ۴:۱۲۴، ۹:۷۱) میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو مخاطب کیا ہے اور اِن کے حقوق و فرائض ایک جیسے متعین کر دے ہیں، اسی طرح جزا و سزا کے معاملات میں بھی دونوں برابر ہیں۔'' ۸

عورت کے بارے میں خیالات و تصورات اور نظریات، نخستمثال کی صورت اختیار کر چکے ہیں ان آہنی زنجیروں کو صرف آگاہی کی تیز دھار تلوار ہی سے توڑا جاسکتا ہے، جو کہ خاصا کٹھن اور دشوار کام ہے۔ لہٰذا، ہمیں تاریخ کے آئینے میں عورت کی حوالے سے پیدا ہونے والی نظریاتی و تصوراتی تبدیلیوں کا جائزہ لینا پڑے گا، تا کہ عورت سے نفرت و بیزاری حقارت و ذلت آمیزی اور ناروائی کی وجوہات مختلف تہذیبوں، اڈیان اور عقائد کے تناظر میں تلاش کر کے، اِن کے استحصال کی اصل وجوہ کی روشنی میں حقائق کی بازیافت کی جائے، تا کہ فطرت پر الزام تراشی سے بچا جاسکے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ طوفانِ نوحؑ سے بچ جانے والے لوگ خانہ بدوشوں کی طرح مختلف علاقوں میں آباد ہوئے، ان میں سے بیشتر قبائل دریائے نیل کے کنارے، جنوبی عراق، دریائے سندھ کے کنارے اور چین میں آباد ہوئے۔ لہٰذا، قدیم تہذیبی مراکز میں مصر کی تہذیب، یونانی تہذیب، جنوبی عراق کی سومیری تہذیب، ہندوستان میں ہڑپا اور موہنجوداڑو کی تہذیبیں، بابل میں شاہ حمورابی کے عہد کی تہذیب شامل ہیں۔ بابلی تہذیب میں عورتوں کے حق مردوں سے کم نہ تھے۔ لوگ عورتوں سے دبتے تھے، عورتوں کو جائیداد اور ورثے میں حصہ ملتا تھا اور وہ کاروبار بھی کر سکتی تھیں۔ ۹

آثارِ قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ دیویوں کی پوجا کرنے والے معاشروں میں لوگ مساوی ہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے۔ تہذیبی عمل میں عورت کے کردار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ازمنہ قدیم میں عورت معاشرے کا بڑا فعال رکن تھی۔ پتھر کے دَور میں عورتیں زمین جوتتی، اناج پیستی، روٹی پکاتی اور کپڑا تیار کرنے کے ساتھ ساتھ برتن و زیب و زینت کے لیے زیورات بناتی تھیں۔ تمدنی سطح پر معاشروں میں زرعی معاشرہ، جاگیردارانہ معاشرہ، پدرانہ معاشرہ، دھاتوں کا نظام اور مادری نظام شامل ہیں۔ ۱۰ اسی طرح ''عہدِ حجر STONEAGE میں بھی بچوں کی پرورش کے بعد دوسرا فریضہ، جو عورتوں کے سپرد تھا وہ سلائی، پکوان اور گھر کی نگہداشت تھا۔ پرانی مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، عورت کو بہت سی چیزوں کی ایجاد کی ضرورت اِس لیے پڑی کہ نسلِ انسانی کی ماں تھی، جب اُس نے بہت سی چیزیں ایجاد کیں، تو اُن کے نام بھی رکھے، مثال کے طور پر کھالوں سے لباس بنائے، بدن پر قائم رکھنے کے لیے کانٹوں سے ٹانکے۔ اناج کو بچوں کے لیے قابلِ ہضم بنانے کے واسطے کوٹنا پیسنا اُسی نے ایجاد کیا اور ظاہر ہے کہ جتنی چیزیں اُس نے بنائیں، اُن کے نام بھی اُس نے رکھے غرض کہ اُس دَور خانہ بدوشی میں اگر ایک طرف مرد ذرائع معاش کو وسعت دیتا رہا، تو دوسری طرف عورت اپنی گود میں تہذیب و تمدن کے اصنام پالتی رہی۔ زبان، چوں کہ تمدن کی جان ہے، اِس لیے کیا عجب ہے کہ وہ بھی عورت ہی کی تخلیق ہو اور عورت ہی کی گود میں پلی ہو۔ سلائی، پکوان، گھرداری اور بچوں سے متعلق تمام تر الفاظ عورتوں نے خود ایجاد کیے، دُنیا کی کوئی زبان اِس سے خالی نہیں ہے۔ عورت ہی کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ بعد میں لغت میں آئے ادب میں شامل ہوئے اور نظم و نثر میں رچ بس گئے یہ کرشمہ بھی عورت ہی کی قوت اظہار کا ہے۔'' ۱۱

زرعی معاشرے میں عورت زرخیزی کی علامت بن گئی تھی۔ زمین کی طرح وہ بھی بچے پیدا کر کے انسانی آبادی میں اضافے کا باعث سمجھی جاتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ عورتیں قبیلوں کی سردار تھیں اور کئی کئی شوہر رکھتی تھیں۔ تہواروں کی سربراہ بھی عورت ہی ہوتی تھی۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ مرد فعال کردار ادا کرنے لگے۔ دھاتی دور میں مرد نے ہتھیار بنانا شروع کیے، تو ان کے اندر طاقت کا احساس پیدا ہونا شروع ہو گیا، ہتھیاروں کے استعمال سے معاشرہ طبقوں میں تقسیم ہو گیا اور یہیں سے عورتوں کا استحصال شروع ہو گیا۔[۱۲] جاگیردارانہ نظام میں جنگوں، زراعت، کان کنی کے لیے جس جسمانی مشقت کی ضرورت تھی وہ عورت نہیں کر سکتی تھی، اس لیے اسے کمتر اور کمزور سمجھا جانے لگا۔ پدرانہ نظام نے برتری اور آمریت کو ترجیح دی۔ مادرانہ نظام کی انسانی مساوات، زندگی کا تقدس، انسان دوستی، روشن خیالی، جمہوریت و اشتراکیت کے برعکس پدرانہ نظام میں آمریت، مطلق العنانیت، فاشزم اور انفرادیت کا حامل تھا۔ مادری نظام کی شکست کے بعد عورت صرف ایک مرد کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔[۱۳] تہذیبی سطح پر عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے حوالے سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کا کہنا ہے: ''قدیم تہذیبوں میں عورت کی حیثیت نہایت بے وقعت تھی اور اسے محض شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ اسے بنیادی شرف و عزت سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔''[۱۴] پدرسری معاشرے کی ابتدا مشرقِ وسطیٰ میں ہوئی۔ قدیم معاشروں میں، عورتوں کو بڑے اختیارات حاصل تھے، اِس حوالے سے پرویز اختر کا کہنا ہے:

> ''ساتویں اور چھٹی صدی ق۔م میں یونان کے دوسرے علاقوں میں عورتوں کی حالت بہت حد تک خستہ تھی اور معاشرے میں مردوں کی برابری کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں، انھیں نہایت سخت ضابطوں اور قواعد کی پابندی پر مجبور کیا جاتا تھا، لیکن جزیرہ لسبوس میں ایسی کوئی بات نہ تھی، یہاں عورتیں عوامی جلسوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے شریک ہوتیں اور معاشرتی اُمور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ادب، موسیقی اور شاعری میں بھی اُن کی دلچسپی مردوں سے ہرگز کم نہ تھی۔ شعر و سخن اور رقص و موسیقی کی محفلیں جمتیں تو مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی آ موجود ہوتیں۔ قدیم دُنیا کی تاریخ میں آزادیِ نسواں کی ایسی مثال کسی دوسرے خطے میں نہیں ملتی''۔[۱۵]

سومیریوں کے ہاں عورت کے بارے میں بڑا پاکیزہ تصور موجود تھا، ان کے ہاں نسائیت شکن ناگوار اقدامات پر سزا بھی ملتی تھی، مثلاً اگر کسی شخص کی بیوی بن سنور کر کسی اور آدمی کے ساتھ چلی جاتی اور اس کی شریکِ بستر ہوتی، تو اسے قتل کر دیا جاتا، مگر مرد کو چھوڑ دیا جاتا تھا، اس طرح اگر کوئی شخص شادی کا معاہدہ کیے بغیر کسی بیوہ کے ساتھ ہم بستر ہوتا، تو مرد عورت کو بطور جرمانہ چاندی دینے کا پابند نہ تھا، اس کے برعکس اگر کسی کنواری کنیز کی عزت لوٹ لی جاتی، اُسے چاندی کے پانچ نقرئی شیکل ادا کیے جاتے تھے، اگر کوئی آزاد لڑکی ماں باپ کو بتا کر گھر سے جاتے ہوئے عصمت دری کا شکار ہو جائے، تو مطلوبہ شخص مندر کے دروازے پر کھڑا ہو کر حلف اُٹھالے کہ اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ لڑکی آزاد تھی، اُسے معاف کر دیا جاتا تھا۔

سومیری معاشرے میں نیند میں غافل لڑکیوں کی آبروریزی کے واقعات عام تھے۔[۱۶] ابنِ حنیف کا کہنا ہے:

> ''مندروں کی پجارنوں کے بعض مخصوص طبقوں کی خواتین اِننا اور اُشتار دیوی سے سچی عقیدت، ایثار، خلوص اور قربانی کے جذبے میں ڈوب کر ان کی خدمت کے نام پر اپنا

کنوار پن تک تج دیتی تھیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔سومیری اور بابلی ان کے
اس فعل کو دیوی کی نسبت سے مقدس، جائز، روا اور عینِ مذہب خیال کرتے تھے''۔ ۱۷
اسی طرح بابلی تہذیب کے حوالے سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کا خیال ہے:

''اس تہذیب میں عورتوں کو گھٹیا سمجھا جاتا تھا اور بابلی قوانین کے تحت وہ تمام حقوق
سے محروم تھیں، اگر ایک آدمی قتل کا مرتکب ہوتا تو بجائے اس کے کہ اُسی کو سزا ملے اور
اس کی بیوی کو بھی موت کی گھاٹ اُتارا جاتا تھا''۔ ۱۸

یونانی تہذیب جو دُنیا کی قدیم ترین تہذیب کہلاتی ہے، اسے بہترین اور شاندار سمجھا جاتا ہے، اس شاندار تہذیب میں بھی عورت تمام حقوق سے محروم تھی، اسے حقیر اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔یونانی دیو مالائی کہانیوں میں ایک خیالی عورت جسے ''پنڈورا'' کہا جاتا تھا۔ انسانوں کی بدقسمتی کی بنیادی وجہ خیال کیا جاتا تھا۱۹، وہ عورتوں کو مرد کی نسبت کم تر سمجھتے تھے، اگر چہ عورت کی دوشیزگی کو قیمتی سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد میں یونانی تہذیب پر بھی انانیت اور جنسی بے راہ روی چھا گئی اور اس تہذیب میں ذوقِ طوائفیت عام ہو گیا۔۲۰ اسی طرح رومی تہذیب بھی اپنی عظمت کی بلندیوں پر تھی، اس کے باوجود وہاں بھی ایک مرد کو اختیارِ کل حاصل تھا، یعنی وہ اپنی بیوی کی جان لے سکتا تھا۔طوائف بازی اور عریانیت اس معاشرے میں بھی عام تھی۔ مصری تہذیب بھی عورت کو مجسمہ بُرائی سمجھتی اور اُسے شیطانیت کی علامت گردانتی تھی۔۲۱ مشرق وسطیٰ میں پہلی مرتبہ ایسا معاشرہ قائم ہوا، جس میں مرد کی بالادستی قبول کی جانے لگی۔مردوں نے خود کو مردِ عظیم بنانا شروع کیا۔ قدیم معاشروں میں عورت کو بڑے اختیارات تھے، مگر اس دَور میں اُنھیں نہ صرف زیر کیا گیا، بلکہ ان کی تذلیل کر کے بے اختیار بھی کر دیا گیا۔۲۲ برصغیر میں انگریزی دَورِ حکومت میں دیگر تحریکوں کی طرح عورت کی آزادی کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ بنگال میں ستی کی رسم پر پابندی لگائی گئی، اس کے باوجود گھریلو اور معاشی معاملات میں بھی عورت کی حق تلفی کی جانے لگی اور عورت محض بچہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن گئی، اس کی سماجی حیثیت کم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت محبت و الفت اور قربت کے جذبات سے محروم ہونے لگی۔مبارک علی کے خیال میں:

''عورت کی اپنی خواہشات، تمنائیں اور آرزوئیں تمام کی تمام مرد کے ماتحت ہو چکی تھیں اور
اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ اس کا شوہر یا اس کا باپ اس سے خوش رہے، جب
قانونی بیوی اور خاندانی عورت اس حد تک گر جائے، دُنیا کے بارے میں اسے بے خبر بنا دیا
جائے اور اسے اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے میں پتہ نہیں، تو اس صورت میں عورت
محض بچہ پیدا کر کے نسل چلاتی ہے اور خاندان کی عزت بن کر دم توڑتی ہے۔'' ۲۳

عورت کے استحصال کی ایک صورت تب سامنے آئی، جب اُسے اس کے جسم کے بارے میں آگاہ کر کے اسے خد و خال میں اُلجھا کر ایک مقابلے کی سی فضا پیدا کر دی گئی اور عورت ایک دوسرے کے مقابل آ گئی، چناں چہ مرد کی خواہشات پر پوری اُترنے والی عورت کی اہمیت میں اضافہ ہونے لگا:

''جب عورت کو اپنے مقاصد کے لیے قربان کیا جائے گا، تو یقیناً مرد کی یہ خواہش نہیں
ہو گی کہ وہ اسے حقوق دے کر مساوی درجہ دے، کیوں کہ اس صورت میں عورت اپنے

استعمال اور استحصال کے خلاف آواز اُٹھائے گی، اس لیے یہ عورت کو معاشرہ میں مرد
کے تابع رکھتے ہیں اور اس کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں ہونے دیتے لہٰذا، اس صورت
میں عورت صرف جنسی تسکین کے لیے رہ جاتی ہے کہ جس کی جسمانی خوبصورتی کو مرد
استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا، شادی بھی صرف جنسی تعلق کا نام رہ جاتا ہے کہ جس میں عورت
پابندیوں میں جکڑی ہوتی ہے۔'' ۲۴

مہابھارت کے زمانے میں عورت کی سماجی حیثیت کم ہوتی گئی۔ نیوگ کو رواج ہوا یعنی شوہر سے اولاد نہ ہونے کی صورت میں وہ دوسرے مردوں سے تعلقات استوار کر سکتی تھی۔ رامائن کے دور میں عورت کا مرتبہ بالکل ختم ہو گیا اور وہ مکمل طور پر شوہر کی تابع ہو گئی۔ مختلف دھرم شاستروں نے عورت کو بالکل مرد کے تسلط میں جکڑ دیا تھا۔ ستی کی رسم کو فروغ دیا گیا، جو عورت خود چل کر ستی ہونے جاتی وہ پاک باز سمجھی جاتی، بعض شدتِ غم سے بے ہوش ہو جاتیں، جب کہ کچھ رسوم ورواج کے دباؤ سے ستی ہوتیں اور کچھ کو خاوند کے خاندان کے لوگ زبردستی جلا ڈالتے تھے۔ ۲۵ اپنی تمام تر قربانیوں کے باوجود آخر کیوں عورت تاریخ کے پردے سے غائب ہو کر گمنامی کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر رہ گئی ہے؟ یا کہ وہ کوئی بڑا کارنامہ کیوں انجام دے نہ سکی؟، ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی کا کہنا ہے:

''تحریری تاریخ کے وجود میں آتے آتے انسانی معاشرے پر مرد کا غلبہ ہو چکا تھا اور عورت
کی سماجی حیثیت گر چکی تھی اور عورت معاشرے میں مرد کے مساوی نہیں رہی تھی اور اس
غیر مساوی درجہ بندی سے مرد کے لیے مردوں کی تاریخ میں عورت جس حیثیت اور شکل
میں ظاہر ہوتی ہے، اس میں کوئی عظمت، عزت و وقار نہیں، بلکہ اس سے ایک ایسا تاثر ابھرتا
ہے کہ جس میں عورت کو کبھی اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس کی قربانی کا کوئی ذکر
تک نہیں ہوتا کہ جو مرد اپنے مفادات کے لیے اس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔'' ۲۶

ڈاکٹر مبارک علی نے ''تاریخ اور عورت'' میں عورت سے روا رکھے جانے والے سلوک کو تفصیلاً بیان کیا ہے، اس کے چیدہ چیدہ نکات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ مرد نے عورت کو بے جا حاکمیت کے نشے میں اپنی ملکیت و جائیداد سمجھتے ہوئے، تخت و تاج بچانے کی خاطر بطور تاوان قربان کیا۔

☆ دیوتاؤں کی خوشنودی کے حصول اور مختلف آفات کے خاتمے کے لیے بھی بھینٹ چڑھایا گیا۔

☆ اپنی مردانگی اور فتح کو ثابت کرنے کے لیے عورت کی عصمت دری مرد کی اجتماعی وانفرادی نفسیات بن گئی، یہی وجہ ہے کہ عورت کی حیثیت مال پانسے کی ہونے لگی۔

☆ پوری تاریخ میں اگر جنگ مرد کی علامت ہے تو امن پسندی کو عورت سے منسوب کیا جاتا تھا۔

☆ عورت کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھا جاتا تھا اور اس حیثیت سے ملک وقوم اور تہذیب کے زوال کی وجہ اور برائیوں کا سبب قرار دیا جاتا تھا۔ حکمرانوں اور اشراف کی تباہی کی وجہ بھی عورت اور شراب کو کہا گیا ہے۔ عورتوں کی مجلس اور صحبت میں رہنے کی وجہ سے حکمرانوں کی مردانہ صفات ختم ہو کر ان کی جگہ نسوانی عادتیں در آئی تھیں، اس لیے محض مردوں

کی جنسی خواہشات کی تسکین کا سامان بننے سے عورت کا مقام مزید گھٹ گیا۔

☆ پرانے دستور میں عورت قانوناً شادی کے بعد شوہر کی نگرانی میں آ جاتی تھی، جیسا کہ شادی سے پہلے باپ کی نگرانی میں تھی۔ ۲۷

دیگر مؤرخین نے بھی عورت کے زوال کو دو حیثیتوں سے دیکھا ہے:

☆ عورت کی آزادی اور اس کی سماجی وقانونی روایات سے نکلنا، دوسرے ملکی معاملات میں دخل اور حکمرانوں پر اس کے اثرات کی ذمہ دار عورت ہی ٹھہرائی گئی۔

☆ تاریخ میں عورت کا تاثر وہی اُبھرتا ہے، جو مرد نے اپنی خواہشات اور مفادات کے تحت تیار کیا، لیکن عورت تاریخ کے اس عمل میں مرد کے تابع اور غلام ہے۔ عورت کی اپنی شخصیت ختم ہوگئی اور اس نے خود کو مرد کی ذات میں ضم کر لیا، گویا کئی تہوں میں دبی ہوئی وہ مرد کی بنائی ہوئی روایات واقدار اور اداروں کے درمیان کھوئی ہوئی، گمشدہ ذات ہے۔ ۲۸ عورت سماج کے ہاتھوں بے بس رہی ہے۔ سعد اللہ جان برق کے خیال میں:

> ''انسانی معاشرے کی ابتدا میں مرد وعورت یکساں تھے، بلکہ بعض ادوار میں تو عورت ہی کا راج تھا۔ یہ دور مادرِ کائنات کا دور تھا، لیکن پھر مرد نے عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا، تو آہستہ آہستہ اس کا دماغ کام نہ کرنے کے باعث کمزور ہوتا گیا اور مرد کا مضبوط ہوتا چلا گیا، یہی حال جسم کا بھی تھا، چناں چہ یہ جو عورت کو حقوق کے نام پر مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنے کا نظریہ ہے یہ بھی مرد کی چالاکی اور تیز دماغ کا ایک پینترا ہے، جب کہ عورت اپنے کمزور دماغ کی وجہ سے اسے اپنی آزادی سمجھتی ہے، حالاں کہ صرف آزادی کے نام پر عورت کو کمائی کا ذریعہ بنانے کے لیے مرد کی ایک اور چال ہے، کیوں کہ صدیوں کی غلامی کے ذریعے مرد نے عورت کا برین واش کر کے ایسا بنا دیا ہے کہ مرد جیسے چاہے اس کا استعمال اور استحصال کر سکتا ہے۔ آج بھی اس کا دماغ نہیں صرف جسم آزاد ہوا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ عورت ذہنی طور پر بھی مرد کا کھلونا رہی اور جسمانی طور پر بھی اسے ایک کھیتی ایک جوتی اور ایک لباس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا گیا۔'' ۲۹

مذہب کی ابتدا، آفرینشِ انسانی کے ساتھ ہوئی، ابتداً تمام مذاہب، مظاہر پرستی یعنی اعلیٰ ارواح کی پرستش کی طرف مائل تھے۔ سحر ومنتر کے ذریعے ارواحِ خبیثہ سے خود کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔ قبل از تاریخ عہد کی ابتدائی اقوام کا مرکز آسٹریلیا اور اس کے آس پاس کے جزائر تھے، ان کے یاں کثرت پرستی اور جادوٹونہ عام تھا۔ مُردوں کے سوگ میں خواتین کے سروں کے بال منڈھوا دیے جاتے تھے۔ دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر سردار اپنی بیویوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ ۳۰ افریقہ کے مذہب میں خدا یا ہستی اعلیٰ کا تصور ملتا ہے۔ مظاہر پرستی حیوان پرستی اور شجر پرستی کے علاوہ آبا پرستی میں بادشاہوں کی ارواح کے لیے انسانی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ عورتیں پروہت کا کام کرتی تھیں، جب کہ امریکہ میں ہستی اعلیٰ کا تصور، مظاہر پرستی اور عبادت کے مختلف طریقے مروج تھے، جن میں روزے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ عورتیں اپنے مرنے والے شوہروں یا بھائیوں کی لاشوں کے سرہانے بیٹھ کر روزانہ ناشتہ لاتیں اور اُن سے ہم کلام ہونے

کے ساتھ ساتھ عبادت کرتیں۔ یہاں کے لوگ جنت و دوزخ اور جزا و سزا پر یقین رکھتے تھے۔ انسانوں کی قربانی کا عام رواج تھا، جب کہ قدیم عراق میں سمیری مذاہب کو خصوصی اہمیت حاصل تھی، ان کے ہاں دیوی و دیوتاؤں کی عبادت کی جاتی تھی۔ اِنّی اِنّی، ماں دیوی اور 'اشتر دیوی' کا چرچا عام تھا۔ ارواحِ خبیثہ سے رہائی کی خاطر کامنیوں سے مدد لی جاتی تھی۔ اکادی مذہب میں جزا و سزا کا تصور موجود نہ تھا۔ بابلی مذہب میں سورج دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی۔ اکادی اور بابلی مذاہب، حمورابی تہذیب کے ماننے والے تھے، ان کے ہاں موسموں کے تہوار منانا، دیوی دیوتاؤں کی شادی کرنا، بھجن گانا عام تھا۔ اہلِ بابل کی طرح آشوریوں کے ہاں تثلیث یعنی خون، پانی اور مٹی سے انسان کا پیدا ہونا اور چاند، دیوتا اور سورج کا امتزاج، دیوتا شمس اور فضا کا دیوتا کے تصورات پائے جاتے تھے اور عبد و معبود کے حوالے سے دیوتاؤں کا انسانی تصور بھی موجود تھا۔ ان کے عقائد کے مطابق، انسان ابتداً دوسروں پر انحصار کرتا تھا۔ آشوریوں کے ہاں پوجا، بھجن اور قربانی خصوصی اہمیت رکھتے تھے۔ قدیم مصری مذاہب میں تخلیقِ انسان کا تصور موجود تھا کہ سورج دیوتا ''اَتُم'' نے حکومتِ زمین کے دیوتا گیپ کے حوالے کر دی تھی۔ دیویوں کی پرستش، حیوان پرستی، فطرت پرستی، شاہ پرستی اور پروہت پرستی عام تھی۔ نوجوان عورتیں عموماً پروہتوں کی دیکھ بھال پر معمور تھیں، ان کا عقیدہ تھا کہ دیوتا اپنی ماں کا شوہر ہے، اسی طرح چینی مذاہب میں اخلاق و باہمی تعلقات کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ کنفیوشیس مذہب میں ہستیِ اعلیٰ کا تصور، حیات بعد الممات تخلیقِ کائنات تھا۔ تاؤمت کے ماننے والے انسانوں کو کائنات کا ایک جزو سمجھتے تھے اور تدابیر و منصوبہ سازی اور خواہش و تمنا کو انسانی فطرت کے منافی قرار دیتے تھے۔ ہندی مذاہب کے تحت افسوں و جادو، حیواں پرستی، شجر پرستی اہم تھی۔ آریاؤں کے ہاں مظاہر پرستی، پروہت، وید کے ماننے والے دیوتاؤں میں خدائی صفات کے متلاشی تھے۔ برہما کے ماننے والے منتروں سے دیوتاؤں پر قابو پانے پر یقین رکھتے تھے۔ پروہتوں کو برہمن کا نام دیا گیا تھا۔ اپنشد نظریات کے ردِعمل کے طور پر جین مت وجود میں آیا، اس کے ماننے والوں کا عقیدہ تھا کہ دل سے خواہشات نکال دینا ہی اصل نروان ہے۔ ہندو دھرم، برہمنوں کا قائم کردہ مذہب ہے، ان کے نظریۂ ویدانت نے وشنو پرستی کی بنیادیں ہلا دیں۔ ایران کے قدیم مذاہب زرتشت کے علاوہ مظاہر پرستی، آبا پرستی اور دیوتاؤں خصوصاً ''متھرا'' سے متاثر تھے۔ زرتشتی تعلیمات کے مطابق ثنویت کے علاوہ جانوروں کے پیشاب سے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ جنت و دوزخ کا تصور بھی ان کے ہاں موجود تھا۔ مُزدکی کے ماننے والوں نے گوشت خوری کی مذمت کی[۳۱] دھرم شاستروں میں معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے یہ مؤقف تھا کے حوالے سے راما شنکر یاتھی لکھتے ہیں:

> ''جہاں عورتوں کی پرستش کی جاتی ہے، وہاں دیوتاؤں کی برکتیں نازل ہوتی ہیں، لیکن جہاں ان کی عزت نہیں کی جاتی وہاں تمام کام بے نتیجہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عورتیں مردوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہ کہ عورتیں کبھی آزاد و خود مختار زندگی نہیں گزار سکتی، چوں کہ متلون مزاج ہوتی ہیں، اس لیے انھیں گواہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا، وہ بارہ سال یا آٹھ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ منو عقدِ بیوگان اور نیوگ کے خلاف ہیں۔''[۳۲]

دُنیا کو اگر عقائد و نظریات کی روشنی میں پرکھا جائے، تو چار بنیادی اَدیان منظرِ عام پر آتے ہیں، جن میں

یہودیت، عیسائیت، ہندومت اور اسلام ہیں۔ مذہبی عقائد انسانی زندگی کی اساس ہیں اور ان کی راہیں متعین کرنے میں معاونت کرتے ہیں، انھی کے تحت زندگی کا لائحہ عمل تیار ہوتا ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور بدھ مت میں عورت کو کمتر اور کمزور مخلوق قرار دیا ہے، جو خاوند کی غلام اور لونڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاوند اس کا مالکِ کل کے طور پر آتا ہے، اس کے برعکس اسلام میں عورت کے ذاتی تشخص کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت و مقام کو متعین کیا گیا ہے۔ انسانی تاریخ کے ارتقائی سفر میں مختلف تہذیبوں اور معاشروں نے بھی مختلف مدارج طے کیے۔ ہمارے آج کی جڑیں، ماضی کی زرخیز زمینوں میں پیوست ہیں، یہی وجہ ہے کہ موجودہ دَور میں عورت کے بارے میں مختلف خیالات و نظریات اور تصورات کا تانا بانا عہدِ گذشتہ سے مربوط ہے۔ طلوعِ اسلام سے قبل مثالی معاشروں میں صنفی تفریق اور عورت سے متعلق رواجوں، سماجی نظریات و تصورات، مروجہ تہذیب و ثقافت اور مذہب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح دھرم، قانون اور علم کے سائے میں تہذیبیں پروان چڑھیں اور ان کے اثرات ایک عورت کی ذات پر کس طرح اثر انداز ہوئے، اہم نکات درج ذیل ہیں:

☆ یہودی مذہب میں عورت کو حقِ وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا۔

☆ عورت کو سرتاپا گناہ کا منبع قرار دیا گیا ہے۔

☆ مصیبتِ اول بیوی ہی کی تحریک سے شروع ہوئی۔ لہٰذا، اس کو شوہر کا محکوم رکھا گیا، شوہر اس کا حاکم اور مالک ہے اور وہ اس کی مملوکہ۔

☆ مرد شریف الطبع اور صالح ہے، لیکن عورت چالاک ہے، یہی وجہ ہے کہ آدم کو جنت سے محروم کیے جانے کے جرم کی پاداش میں عورت کو حمل اور ولادت کی تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

☆ یہودی اگر کسی اجنبی عورت کی عزت لوٹ لیتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، اس لیے غیر یہودی عورت جانور کے برابر ہے اور عورت کے بارے میں تحقیر آمیز کلمات کے بیان نے اس کی عزتِ نفس کو مجروح کر دیا۔

☆ اس کی کمائی شادی سے پہلے باپ کی اور پھر شوہر کی ہوتی اور باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی، بیٹے کی وراثت شمار ہوتی۔

☆ سوتیلی ماؤں اور سوتیلے بیٹوں کی آپس میں شادیاں ہوتی تھیں اور کسی کی منکوحہ کو اس کے شوہر سے ورغلانے کو وہ بڑی فتح و کامیابی تصور کرتے تھے۔ عورت مردوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی حق دار نہیں تھی، گویا! یہودی عورت بہت سے مذہبی، عائلی اور معاشرتی حقوق سے محروم ہے۔ ۳۳

☆ یہودیت میں عورت موت سے زیادہ تلخ ہے۔

☆ یہودی معاشرت میں عورت اثاث البیت جیسی شے تھی، جس کی وجہ سے باپ کو اپنی بیٹی کے بیچ دینے کا اختیار تھا۔

☆ خاوندوں کے اختیارات بھی جابرانہ تھے۔

☆ عورت بعض حالات میں ملک کی ملکیت قرار دی جاتی یا قوم کی ملکیت ہوتی تھی، جس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ ان کے ہاں ہر شخص کا نام اسرائیل میں باقی رہنا ضروری تھا اور اِس مقصد کے حصول کے لیے عورت کی خواہشات اور عزتِ نفس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ۳۴

عیسائیت میں عورت کے بارے میں افکار ونظریات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ اخلاقی، تاریخی، عالمگیری، توحید پرست اور نجات دہندہ مذہب ہے، جس میں خدا اور بندے کے تعلقات کا درمیانی واسطہ خداوند یسوع کی ذات کو کہا جاتا ہے، ان کے خیال میں:

☆عورت بگاڑ پیدا کرنے والی انسانیت کی پہلی مجرم، شیطانیت کی پیروکار، جھوٹ کی بیٹی، دوزخ کی سپاہی اور امن کی دُشمن، سانپ کا زہر اور اژدھے کا کینہ رکھنے والی ہے، اس لیے راندۂ درگاہ ہے۔

☆مسیحی شریعت کی رُو سے عورت مکمل طور پر مرد کے قابو میں تھی۔ طلاق وخلع کی بھی اسے اجازت نہ تھی، اِس کی تعظیم مریم پرستی کا نتیجہ قرار پائی۔

☆نکاح نہ کرنے اور مجرد زندگی گزارنے کو اللہ کی اور حضرت مسیح کی خوشنودی کا حصول قرار دیا گیا۔ دوسری طرف اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ بچے پیدا کرے۔

☆عورت کو اپنی کمائی پر کوئی اختیار نہ تھا اور نہ ہی اُس کے لیے نان ونفقہ کا کوئی قانون تھا۔ وہ اپنے شوہر کی کسی چیز کی مالک ومختار نہ تھی، بلکہ ہر چیز کا مالک ومختار اس کا شوہر تھا۔

☆شادی کر کے مصائب ومشکلات کا شکار ہونے کی بجائے خود کو بدکاری اور گناہ کی دلدل میں گر جانے کو ترجیح دیتی ہے نہ کہ ایک مرد کی قیدی بننا اور وہ محض جسمانی تسکین کا ذریعہ ہے۔

☆چرچ کے مطابق عورت میں بچے پیدا کرنے کی اہلیت تو ہے، لیکن وہ اس کی تربیت کرنے کی اہل نہیں ہے۔ بچوں کی ذہنی وجسمانی تربیت باپ کے ذریعے ہے۔ ۳۵

☆ عیسائیت میں عورت کے پردے کے حوالے سے، جو تعلیمات ملتی ہیں، اُن کے متعلق بائبل میں ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والی عورتوں کو مردوں کی طرح لباس پہننا منع ہے، تاہم خواتین کا لباس بنیادی طور پر وہی ہے، جو مرد پہنتے ہیں۔ خواتین نے مختلف حالات میں جدت اختیار کرتے ہوئے خوبصورت لباس بنائے ہیں، جو اُس کی اپنی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ بائبل میں بہت سے مضامین عورتوں کے لباس کے حوالے سے موجود ہیں، اُن میں سے کچھ ایسے ہیں، جو اس کے صحیح ترجمان نہیں۔ ۳۶

☆ہندو مذہب میں مرد اپنے زورِ بازو سے نجات کا رستہ پکڑ سکتا ہے مگر عورت کے لیے نجات کا واحد راستہ شوہر کی خوشنودی ہے۔

☆ خانقاہوں میں مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے زنا کاری کو تقویت پہنچی۔

☆ جو شخص اپنی بیٹی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتا، اسے انعام سے نوازا جاتا۔

☆ برہمن کو یہ قانونی اجازت حاصل تھی کہ وہ نچلی ذات کے ہندو کی عورت سے ہم بستر ہو جائے۔

☆ ہندو مذہب کے مطابق عورت سماج کی ناپسندیدہ ہستی ہے اور اسے اچھوت اور نا اہل سمجھا گیا۔

☆ستی کی رسم کو اہمیت دی گئی۔ ۳۷

☆ہندو معاشرے میں عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔

☆ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے، بیوہ عورت قانونی طور پر ہر لذت سے محروم کر دی جاتی تھی۔

☆ لڑائی میں ہار جانے کے ڈر سے عورتوں کو خود اُن کے باپ، بھائی اور شوہر قتل کر ڈالتے تھے۔

☆محرمات سے تمتع کارِثواب سمجھا جاتا تھا اور عصمت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ نیوگ کا رواج عام تھا۔ ۳۸؎

☆بدھ مت میں عورت کو مچھلی کی طرح متلون کہا گیا ہے۔

☆ان کے خیال میں عورت کی ذات مذہبی فرائض کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہے۔ لہٰذا، مکتی اور نجات حاصل کرنے کے لیے اس سے دُوری ضروری ہے۔

☆بدھ مت دُنیا کا پہلا مذہب ہے، جس نے عورتوں کو مذہبی اُمور کی ادائیگی میں شریک نہیں کیا۔

☆بدھ مت میں عورت کی عزت نہ تھی، اُن کے خیال میں عورت کے پاس چوروں کی طرح حربے ہوتے ہیں، یعنی وہ کسی وقت بھی کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

☆بدھ مت نے اپنے ماننے والوں کے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر آپ کو نجات حاصل کرنی ہے، تو عورتوں سے اپنے تعلقات کو ختم کرلو اور خود مہاتما بدھ نے بھی اپنی بیٹی سے دوری اختیار کر لی تھی۔ ۳۹؎

☆مذہب اسلام مرد و عورت دونوں مساوی انسان ہیں اور انسان کو احسن تقویم سے پیدا کیا گیا ہے۔

☆مرد کو عورت پر فوقیت اور جائیداد میں دو گنا حصے کی وجہ نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے۔

☆عورت رزقِ حلال کما سکتی ہے، اِس کی کمائی پر مرد کا حق نہیں، جب کہ مرد کی کمائی پر بیوی کا پورا حق ہے۔

☆عورت مہر اور وراثت کی حق دار ہے، جس طرح مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے، اُسی طرح عورت کو خلع کا اختیار حاصل ہے۔

☆ناگزیر حالات میں مرد کی طرح عورت کو بھی نکاح ثانی کا حق دیا گیا ہے۔

☆عورت کو بہ حیثیتِ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے باوقار زندگی گزارنے کا تحفظ دیا گیا ہے۔

☆اسلام میں بچوں کی تعلیم و تربیت میں ماں اور باپ مساوی کردار ادا کرتے ہیں۔

مرد کی حاکمانہ طبعیت کی نفسیاتی وجوہ میں نمایاں عنصر، مرد کی عورت پر مکمل اجارہ داری کا حق تصور کرنا ہے۔ ابتداً عورت کو اعلیٰ درجات حاصل تھے، لیکن جب اُس کا خون سے رشتہ یا شادی مردانہ حاکمیت والے طبقے سے ہوئی، تو مرد نے خود کو تمام معاملات کا کرتا دھرتا ثابت کرنے کے لیے عورت کو اپنا ماتحت بنایا اور عورتوں کے جسم، جنس و تولیدی صلاحیت کو اپنی ملکیت تصور کرتا تھا، حتیٰ کہ اُس نے عورت کے لیے جائیداد کا حصول یا منتقلی کٹھن اور بعض صورتوں میں ناممکن کر دی۔ ۴۰؎ نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تو مرد و عورت میں فطری تضاد پایا جاتا ہے، یہ امتیاز جسمانی، نفسیاتی سطح پر ہے، لیکن اِس انداز سے کہ کسی ایک خصوصیت میں مرد کا پلڑا بھاری اور کسی میں عورت کا۔ معاشرے میں مرد و عورت تفریق انسانی تاریخ کا حصہ ہے۔ عورتوں کو اُن کے معاشی اور سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا اور رومانی و ذہنی طور پر غلام بنا کر اُن کی زندگی کے دائرۂ عمل کو گھر کی چار دیواری تک مخصوص کر دیا گیا۔ سرمایہ دار نظام میں جنس کی بنیاد پر امتیازی تفریق کے حالات پیدا کیے گئے، جو آج بھی زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں: ''خواتین یا ہماری 'خاموش اکثریت' کے خلاف یہ امتیاز بلا تخصیص جاری ہے۔ ماہرینِ نفسیات اُسے 'سیکس ازم'، 'جنسی امتیاز' یا جنس کی بنیاد پر امتیازی سلوک کا نام دیتے ہیں۔'' ۴۱؎

حمیر ہاشمی نے انسانی نفسیات پر فرائڈ اور یونگ کے نظریات کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ فرائڈ کے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالباً فرائڈ پہلا شخص تھا، جس نے عورت کی نفسیات کے حوالے سے الگ نظریہ پیش

کیا اور بچی کی نشوونما کے مراحل میں تفریق کرتا ہے، اِن کے خیال میں لڑکا بچپن سے ماں سے قُربت اور باپ سے رقابت محسوس کرتا ہے، جسے اڈی پس تنقید یا اڈیپس کمپلکس کا نام دیا جاتا ہے، اِس کے برعکس لڑکی باپ کو محبت کے قابل سمجھتی ہے، جسے الیکٹرانی تنقید یا الیکٹرا کمپلکس کا نام دیا گیا، جب کہ کارل یونگ نے انسانی نفس یا ذات کی وضاحت مردانہ نفس یعنی ایک مرد کے ذہن میں ایک عورت کا، جو تصور ہوتا ہے، اُسے اینیما Anima یا تصورِ زن اور ایک عورت کے ذہن میں ایک مرد کا، جو تصور ہوتا ہے، اُسے اینی مس Animus یا تصورِ مرد کا نام دیا جاتا ہے، اِن رُجحانات کے خصائص کے وضاحت یونگ نخستمثال کے ذریعے دیتا ہے۔ حمیر ہاشمی نے حیاتیاتی سطح پر بھی مرد و عورت جنین کی افزائش اور نشوونما کے مدارج میں پائے جانے والے فرق کو بیان کرتے ہوئے ثابت کیا ہے۔ مادہ جنین، نر جنین کی بہ نسبت زیادہ جاندار ہوتا ہے، اِسی طرح مردوں میں رنگ اندھا پن، گنجا پن، میکانکی مہارت لڑکیوں کی نسبت تیز ہوتی ہے، اِس کے برعکس لڑکیوں میں لفظی مہارت، سونگھنے اور سننے کی حِس لڑکوں کی بہ نسبت تیز ہوتی ہے، اِسی طرح عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں ضرر دماغ اور اقل فتور، فعلِ دماغ زیادہ تواتر سے پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ذہنی معذور لڑکیوں کے مقابلے میں معذور لڑکوں کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔ لڑکیوں میں ذہنی الطبا کی شرح لڑکوں سے کم دیکھی گئی ہے، اِسی طرح خلقی طور پر بڑی عمر میں ایک اوسط درجے کی عورت عام طور پر اِس سے زیادہ دیر زندہ رہتی ہے، جتنا کہ ایک مرد رہتا ہے۔ مردوں میں عموماً طلبِ تحسس زیادہ پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بقول حمیر ہاشمی:

> ''بیویوں کی مارکٹائی، جوابازی، نشہ آور ادویات کا استعمال، حد سے زیادہ شراب نوشی یا الکحل ازم، کرداری کج روی اور معمولی درجے کا مجرمانہ کردار، یہ وہ مسائل ہیں، جو خصوصی طور پر مردوں ہی سے وابستہ ہیں، اِن کو بھی ہم طلبِ تحسس کی اونچی سطح کے رُجحانات کے حوالے سے سمجھ سکتے اور اُن کی وضاحت کر سکتے ہیں۔۔۔۔ عورتوں میں طلبِ تحسس کے رُجحان کی سطح نیچی پائی جاتی ہے، اِس لیے ہوسکتا کہ وہ کم جارح، کم تشدد کرنے والی اور جوئے بازی، نشہ بازی اور شراب نوشی کی جانب کم راغب اور مائل ہوں۔ مزید برآں، اِس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ وہ معمولی قسم کے مجرمانہ کردار میں ایک نچلے یا کم درجے کی سطح تک ہی ملوث ہیں، اگر غذر کیا جائے، تو عورتوں کے کردار کے بارے میں آج کل یہی صورتِ حال ہے۔''[۴۴]

عورت کے بارے میں تصورات کا جائزہ حیاتیاتی و نفسیاتی سطح پر لیتے ہیں، تو کمتری و برتری کے قائم کردہ معیارات تبدیل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حمیر ہاشمی نے اپنے مضمون ''عورت اور نفسیات'' میں عورت اور مرد کے حیاتیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے، جس کا ملخص یہ ہے کہ ظاہری جسمانی خط وخال میں عورت و مرد میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق نہ صرف ظاہری سطح پر نظر آتا ہے، بلکہ کم ظاہری جسمانی افعال میں بھی نمایاں ہوتا ہے، مثلاً ایک جسمانی زوال پذیری دوسرا جنسیت یعنی ہیجان، تیسرا ہمواریت اور چوتھا انجذا اور تحویلِ قوت وغیرہ، جب حیاتیاتی اور نفسیاتی سطح پر مرد و عورت کو پرکھا جائے، تو قدرتِ حق نے عورت کو مرد کے مقابلے میں زیادہ طاقتور بنایا ہے۔ مرد کو بھی اس بات کا احساس ہوتا ہے، لیکن اپنے آپ کو حاوی کرنے کے لیے اور غلبے کی خواہش سے مغلوب ہو کر وہ ایسے طور

طریقے اپناتا ہے، جس سے عورت ہمیشہ اُلجھاؤ، دباؤ اور تناؤ کا شکار رہے اور وہ اس کی حاکیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر مرد اپنا یہ حاکمانہ رویہ دوستانہ رویے میں بدل دے تو زندگی نہایت پر سکون اور خوش کن ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر حمیر ہاشمی کی تحقیق کے مطابق مرد وعورت کو جسمانی زوال پذیری کے تناظر میں شواہد کی کسوٹی پر پرکھنے سے مندرجہ ذیل حقائق منظرِ عام پر آتے ہیں:

☆ عقلی صلاحیت یا ذی فہمی کی صلاحیت کی زوال پذیری عمر رسیدہ عورتوں کی نسبت عمر رسیدہ مردوں میں زیادہ ہوتی ہے۔

☆ مرد عورت پر اپنی جنسی فوقیت ثابت کرنے کی تابڑتوڑ کوشش کرتا ہے، حقیقتِ حال یہ ہے کہ جنسی ردِعمل کے چار مراحل ہیں: ''ہیجان، ہمواریت، انتہا اور تحویلِ قوت'' کے مراحل میں دونوں اصناف میں ایک نمایاں فرق ہے، یعنی عورتیں خلقی طور پر تیزی اور تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے ایک سے زیادہ بار انتہائی حد تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، جو کہ مردوں میں نہیں پائی جاتی۔ کم از کم اس معاملے میں عورت مرد کے مقابلے میں صنفِ قوی کا درجہ رکھتی ہے۔

☆ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بڑی عمر میں ایک اوسط درجے کی عورت عام طور پر اس سے زیادہ دیر تک زندہ رہتی ہے، جتنا کہ ایک مرد رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مردوں کی شرحِ اموات عورتوں کی شرحِ اموات سے خاصی زیادہ ہوتی ہے۔

☆ جسمانی طور پر عورت کی نسبت مرد دباؤ اور فشار کے معاملے میں زیادہ غیر محفوظ اور ضرب پذیر ہوتا ہے، پھر صنفِ نازک کون ہے؟ جنسیت کے معاملے میں، طویل عمری کے لحاظ سے، مختلف بیماریوں کی مدافعت اور دباؤ کو برداشت کرنے کے سلسلے میں بظاہر عورت ہی صنفِ قوی دکھائی دیتی ہے نہ کہ مرد۔

☆ مادہ جنین (قبل از پیدائش بچہ) نرینہ جنین کی نسبت زیادہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے۔

☆ لڑکوں میں میکانکی مہارت لڑکیوں کی نسبت تیزی سے نشوونما پاتی ہے، جب کہ لڑکیوں میں لفظی مہارت لڑکوں کی نسبت زیادہ تیزی سے نشوونما پاتی ہے۔

☆ دماغ کے دائیں اور بائیں نصف کرّے کو آپس میں ملانے والی عصبی ریشے مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ اور کثیف ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں میں بہتر لفظی مہارت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

☆ لڑکیوں میں آنکھوں اور ہاتھوں کی باہمی مطابقت لڑکوں سے بہتر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں ایک طرف عظیم کرکٹر پائے جاتے ہیں، تو دوسری طرف کشیدہ کاری میں شاندار مہارت رکھنے والی خواتین پائی جاتی ہیں۔

☆ عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں ضرر دماغ اور اقل فتور، فعل دماغ زیادہ تواتر سے پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں ذہنی معذور لڑکیوں کی نسبت معذور لڑکے زیادہ نظر آتے ہیں۔

☆ لڑکیوں میں ذہنی الطبا کی شرح لڑکوں کی نسبت کم ہوتی ہے۔

☆ مرد وعورت کی ذہانت میں کوئی قابلِ غور یا واضح اختلافات نہیں پائے جاتے مگر پھر بھی عورتوں کو دورانِ ملازمت کم ذہین سمجھتے ہوئے، ان کے خلاف طبعی عوامل یا لاشعوری اعمال جیسی غلط بنیادوں کی بنا پر امتیاز برتا جاتا ہے۔

☆ تخلیقیت یا تحریکِ حصول میں بطور انسانی شخصیت کے عمل کے جنس سے متعلقہ کوئی تفاوت نہیں پایا گیا۔ پھر بھی عام لوگ روز مرہ زندگی میں مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تخلیقی سمجھتے ہیں۔

☆ کامیابی کا حصول یا تحریکِ حصول، عورتوں میں مردوں کے مقابلے میں کم پائی جاتی ہے، اس کے فقدان کی اصل وجہ

عورتوں میں کامیابی کا خوف ہے، کیوں کہ عورتوں کو کام کا معاوضہ بھی کم دیا جاتا ہے اور ستائش کی بجائے ملامتوں اور ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے اِن میں اجتنابی ردِعمل، جو معاشرتی، معاشی حالات کی بنا پر جنم لیتا ہے، اس کے خلاف یہ ردِ عمل نسلِ انسانی یعنی مرد و عورت دونوں ہی میں پایا جاتا ہے، چناں چہ کامیابی کے بارے میں پایا جانے والا جنسی امتیازی نظریہ تجرباتی تحقیق کے سامنے ناکام ہوگیا۔

☆طلبِ تحسس سے مُراد دوسروں کی توجہ اپنی جانب کرانا ہے، اس کے لیے تہیج یا وجہ بیرونی نظر نہ آئے، تو فرد لاشعوری طور پر دوسروں پر لاگو کر دیتا ہے، ایسا شخص جو دفتر سے آتے ہی بغیر کسی وجہ کے بیوی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ عورتوں کی نسبت یہ طلبِ تحسس کا رُجحان مردوں میں زیادہ پایا جاتا ہے، یعنی اگر مردوں میں اس منفی خصوصیت کو قابو نہ کیا جائے، تو شراب نوشی، کردار کی کجی اور مجرمانہ کردار، بیوی کی مارکٹائی اور نشہ آور ادویات کا استعمال بڑھ جاتا ہے، جب کہ عورتوں میں رُجحان انتہائی کم درجے میں پایا جاتا ہے اور جن عورتوں میں یہ نمایاں ہوتا ہے ہو، وہ متشددانہ رویے، شراب نوشی اور بدکرداری میں مبتلا ہوتی ہیں، لیکن یہ شرح عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت کم ہوتی ہے۔

☆عصبانیت یا نیوراتی امراض میں انسان کو اپنی ذات پر تو اختیار ہوتا ہے اور حقیقت سے رابطہ بھی نہیں ٹوٹتا، مگر اس کی شخصیت میں کج روی در آتی ہے۔ مثلاً مستقل اور بے بنیاد فکر یا تشویش، کسی خیال کا بار بار ذہن میں اس طرح آنا کہ بظاہر اس پر اختیار نہ ہو، جب کہ شدید ذہنی امراض میں مبتلا لوگوں میں اپنی ذات کا احساس مٹ جاتا ہے، وہ حقیقت کو کھو دیتے ہیں اور اپنی ذاتی یا خودساختہ اور اکثر بے بنیاد و بے ربط دُنیا میں مستغرق رہتے ہیں، اُنھیں عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتی ہیں، وہ خود کو پیغمبر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور بعض اوقات، تو تشدد کی لہر میں اپنے عزیزوں کو بُرے طریقے سے قتل کر دیتے ہیں، اسے اضمحلالی اختلال ذہنی کا نام دیا جاتا ہے۔ نفسیاتی مسائل ایسے غیر لچکدار اور حالات کے مطابق نہ ڈھل سکنے والے شخصیاتی خصائل ہوتے ہیں، جو ان کا شکار ہونے والے شخص اور اس کے آس پاس کے لوگوں کے لیے تکلیف اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔[۴۳] مرد و عورت کے مابین صنفی امتیازی سلوک برتے جانے کے حوالے سے ڈاکٹر حمیر ہاشمی کا کہنا ہے:

> ''تحقیق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں میں امتیاز کرنے کا کوئی خاطر خواہ جسمانی یا نفسیاتی جواز نہیں ہے اور اگر ہم اس بات پر اڑے رہیں کہ مرد و زن مختلف ہی ہیں، تو جب کبھی اور جہاں بھی کوئی فرق نظر آیا ہے، وہ عورتوں کی حمایت میں ہی جاتا ہوا پایا گیا ہے، پھر بھی عورتوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے، اس امتیازی سلوک کی جڑیں دراصل ان رویوں میں پائے جانے والے اختلافات میں موجود ہیں، جو معاشرہ عمومی طور پر مردوں اور عورتوں کی جانب روا رکھتا ہے، جب کہ درحقیقت دونوں جنسوں میں کوئی نمایاں حیاتیاتی یا نفسیاتی تفاوت موجود نہیں ہے۔۔۔ معاشرے میں عورتوں کو مردوں سے علٰحیدگی کی وجہ سے عورتیں ایک طرف، تو بڑی محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی اور مددگار بن جاتی ہیں اور دوسری جانب وہ لازماً محتاج، دوسروں پر انحصار کرنے والی، کمزور اور کم تر ہو کر رہ جاتی ہے۔''[۴۴]

مرد و عورت کی تربیت کے مختلف انداز اپنانے سے ،ایسے افرادِ معاشرہ منظرِ عام پر آتے ہیں، جن کی

اصلاح ایک خاص پروپیگنڈا کے تحت کی جاتی ہے:

"مردوں کو مردانہ رویے سکھائے جاتے ہیں، یعنی مضبوط، جفاکش، جارح اور پر اعتماد بننا سکھایا جاتا ہے۔ مردوں کے جذباتی، نرم دل یا کمزور ہونے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ عورتوں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ حساس، شرمیلی، خدمت گزار اور جاں نثار بنیں، ان کے بہت زیادہ اعتماد، حصولِ پسند یا حاوی ہونے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، یوں جنسی کردار کی تربیت یا مردانہ یا زنانہ رویے سیکھنا اس دُنیا میں آمد کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے اور سنِ بلوغت اور پختہ عمر میں بھی حاوی رہتا ہے۔" [۴۵]

مولانا ابوالکام آزاد کا بھی یہ مؤقف ہے کہ مرد و عورت کی دماغی قوتیں یکساں ہوتی ہیں، صرف مواقع ملنے کی بات ہے، عورت کی بہ نسبت مردوں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے مواقع زیادہ ملتے ہیں، لیکن جہاں کہیں عورتوں کو اپنی فضا میسر آتی ہے کہ جہاں وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکیں، وہ مردوں کی شانہ بشانہ دکھائی دیتی ہیں:

"آج علمِ تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ اُنھیں عام آزادی بھی دے دی ہے، اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے، جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں، پروفیسر عورتیں ہیں اور لیکچرار عورتیں ہیں، غرض یہ کہ ہر میدان میں عورتیں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں۔ یہ نظیر بھی بتلا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فائدہ اُٹھائیں تو وہ کسی چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہوسکتیں۔" [۴۶]

مردوں کے تسلط اور بے جا حاکمیت اور غاصبانہ طبعیت کے خلاف اکثر و بیشتر باغیانہ روش اختیار کی جاتی ہے۔ آج کل کے دَور میں زندگی کے ہر میدان میں خواتین نے بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ایک طرف اِن کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے، تو دوسری طرف معاشی مسائل کا حل نکالنا اِن کے لیے آسان ہوگیا ہے، اِس کے برعکس مرد کا حد سے بڑھا ہوا جبری رویہ، بے راہ روی اور عورت کو حقیر جانتے ہوئے اِس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر عورت بغاوت اور انتقام پر اُتر آتی ہے: "ایسی عورتوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، اپنی انفرادیت، تنوع پسندی اور مہم جوئی اور خوب سے خوب تر کی جستجو کرنے والی بعض اوقات پدرانہ وابستگی کی بنا پر بھی ایسا کرتی ہیں، ایسی عورتوں کے خاوند اگر اِن کے لیے بوقلموں انداز میں سامان تہیج بہم پہنچانے میں ناکام رہیں، تو وہ بھی بیرون ازدواج جنسی تعلقات کا سلسلہ شروع کر لیتی ہیں۔ تنوع پسندی، خاوند کی بدمزاجی یا غبی پن تو ایک شعوری بہانہ ہوتا ہے، دراصل اِنھیں اپنے آئیڈیل کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ خاوند کے روپ میں باپ کے خدوخال کی متلاشی تھیں اور ناکامی کی صورت میں وہ طرح طرح کے مرد چکھتی ہیں، بعض اوقات یہ اِن عورتوں پہ بھی صادق آتا ہے، جو نیم شریفانہ اور نیم طوایفانہ زندگی بسر کرتی ہیں، یہ اپنے جسم سے پیسہ نہیں کماتیں، بلکہ پلے سے پسندیدہ مردوں پر خرچ کرتی ہیں، اِس میں شوہر سے انتقام کا بھی ایک لطیف انداز ملتا ہے، یعنی اِس کے گاڑھے پسینے کی کمائی اِس کے ناموس کی فروخت کے کام آتی ہے۔" [۴۷] اگر مرد

عورت کو اپنے جیسا انسان متصور کرتے ہوئے، اُس کے جائز حقوق دے اور ازدواجی زندگی کی اساس وفا اور بھروسے کی حفاظت کرے، تو کوئی شک نہیں کہ عورت اِس کے لیے ہر قربانی دینے پر تیار ہو جائے گی، اِس تناظر میں عورت کے حوالے دیکھا جائے، جو مرد عورت کو کمزو ناتواں اور شہوانی جذبات کا مرکز سمجھنے کی بجائے اُسے اپنی محرم و ہمراز سمجھتے ہوئے اِسے قوی و مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہی سچا حقِ رفاقت ادا کرتے ہیں، کیوں کہ وہ اِس راز کو پا جاتے ہیں کہ عورت مرد کی ٹھوکریں کھانے کے لیے پیدا نہیں کی گئی، بلکہ اِس کا مقام و مرتبہ مرد کی طرح ہی اہمیت کا حامل ہے۔

پاکستان میں عورت کو درپیش مسائل مذہبی، قانونی، معاشرتی و معاشی اور نفسیاتی نوعیت کے ہیں، جن میں ہندوانہ اور اسرائیلی رُسومات کی آمیزش نظر آتی ہے، یہاں اسلام کی تعلیمات بظاہر حاوی ہیں، لیکن صحیح اسلامی اقدار تک رسائی کے مواقع بہت کم ہیں، جس کی بنیادی وجہ قرآنِ پاک کی تعلیمات کو نظر انداز کیا جانا ہے، اگرچہ قرآنِ پاک میں روزمرہ زندگی کے تمام مسائل کا ذکر ہے اور ان کا حل بھی موجود ہے، لیکن زمانہ پرور لوگ اپنی ذاتی نظریاتی بنیادوں پر اسلام کا پرچار کرتے ہیں۔ اِس بارے میں ارشاد احمد کا کہنا ہے:

> ''پنجابی سماج میں بیٹی پیدا ہوتے ہی حقارت اور افسوس کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ لہٰذا، لڑکی کی پیدائش پر کوئی خاص رسم ادا نہیں کی جاتی ہے، بلکہ تمام عزیزوں کے منہ لٹک جاتے ہیں اور ایک طرح سے کئی روز تک دِلی سوگ منایا جاتا ہے، لوگوں کے خیال کے مطابق بیٹی انسان کے لیے گوناں گوں مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ قدیم زمانے سے یہ بدظنی عام ہے کہ بیٹی کے جنم کے ساتھ ہی عزت و ناموس کے لیے خطرات جنم لیتے ہیں، غرض کہ اس کی آمد ماں باپ کے دل و دماغ کے لیے مستقل بوجھ بن جاتی ہے اور لڑکی کی زندگی سے وابستہ مختلف قسم کے اندیشے ان کے شب و روز کا آرام حرام کر دیتے ہیں۔''[۴۸]

بیٹیوں سے ناروا سلوک کے حوالے سے رابعہ الرَّبا کا کہنا ہے:

> '' اس طرح کے امتیازی سلوک سے لڑکیوں کی ذہنی تربیت بہت متاثر ہوتی ہے، ان میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتی ہے وہ خود کو محکوم و کمزور سمجھنے لگتی ہیں، یہی کمی ان کی آئندہ زندگی پر ایسی اثر انداز ہوتی ہے کہ وہ بہ طریقِ احسن اپنے شوہر کے حقوق بھی پورے نہیں کر سکتیں، پھر اولاد کی تربیت میں بھی یہی کمی کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے۔''[۴۹]

پاکستان کے مختلف علاقوں میں مختلف رسوم کی بھینٹ بھی عورت ہی کو چڑھایا جاتا ہے۔ قتل کے بعد صلح جوئی کے لیے خاندان کی کنواری، خواہ وہ شیر خوار کیوں نہ ہو، دشمنوں کے حوالے کر دی جاتی ہے، وٹہ سٹہ، ولور کی رسم، قرآن سے شادی، وَنی، کاروکاری وغیرہ کی رسوم زیادہ تر قتل، جائیداد کے حصول اور خاندانی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے مروج ہیں، ان میں عورت کی مرضی و رضا یا عمر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ عموماً بیٹیوں کی نسبت بیٹوں کو اچھا کھلایا پلایا جاتا ہے:

آ بیٹے پی لے دودھ
کٹورہ بھر کے

پتہ نہ چلے تیری بہن کو اس کا ۵۰؎

بعض دیہی علاقوں اور پختونوں میں شادی کے نام پر بچیاں فروخت کی جاتی ہیں، اس کی قیمت، اس کے قد کاٹھ کے مطابق مقرر کی جاتی ہے، جو کہ ایک لاکھ روپیہ ہے، جو اگر لڑکی دماغی یا جسمانی طور پر معذور، بوڑھے، ڈاکو، نشئی سے بیاہ دی جاتی ہے۔ پرانی دشمنیوں کو ختم کرنے یا قتل کا خون بہا دینے کے لیے بھی لڑکیاں دان کی جاتی ہیں:

''چاچا نے قتل کیا مگر سزا مجھے ملے گی
آہ! ڈھول تاشے والے آئیں گے، اور ناچیں گے گائیں گے
میں اپنی قسمت کو کوستی ہوں جس نے مجھے گائے کے برابر بنا دیا ہے
مجھے ذبح کیا جا رہا ہے۔''۵۱؎

کم سنی کی بے جوڑ شادیاں بھی بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہیں، عدم مطابقت، ردعمل، جارحانہ انداز اور ذہنی بعد، بہت سی اُلجھنوں کا باعث بنتا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام میں عموماً ماں کو بچوں کا دشمن ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے بات بات پر اولاد کے سامنے ماں باپ کے خلاف اُگلا جانے والا زہر بچوں کے معصوم ذہنوں کو دوہری کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے، جو مرد اپنی بیوی کے ساتھ جور و ستم، ذہنی و جسمانی تشدد، لڑائی جھگڑے، دھونس اور بے جا حاکمانہ رویہ اختیار کرتا ہے، اپنے سخت گیر رویے کی وجہ سے سسرال کی بدتعریفیاں اس کے حصے میں آتی ہیں۔ بچے باپ کے خلاف ناخوشگوار کلمات سُن کر ٹینشن اور ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں، جب کہ باپ کی جانب سے ماں سے تلخ و ترش رویہ اور اخلاقی بدصورتی بچوں کے آدرش کو شدید متاثر کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا مرد و عورت کی تعلیم کو بنیادی اساس قرار دیتے ہیں، ان کے خیال میں علمی اور ادبی حوالے سے بھی عورت نے ان بنیادوں کو چیلنج کیا ہے، جن پر مردوں کی برتری کا نقش ثبت کیا جاتا رہا ہے:

''مرد معاشرے نے برتر سطح پر مرد کو، جب کہ کم تر سطح پر عورت کو دکھایا ہے اور یوں اُسے زمین، بدی، تاریکی وغیرہ سے جوڑ کر 'تذکیریت' کا مظاہرہ کیا ہے، اس سلسلے میں ساخت شکنی سے جُڑی ہوئی خواتین نے سماجی مذہبی نیز علوم و فنون کی سطح پر جس متشددانہ انداز میں مرد معاشرے پر تنقید کی ہے وہ اب مغربی فکر کا حصہ ہے، مشرق میں نوبت یہاں تک نہیں پہنچی، لیکن عام زندگی میں 'تذکیریت' کی نشاندہی اب ہونے لگی ہے۔''۵۲؎

عموماً جائے ملازمت پر بھی مرد عورت کی تخصیص روا رکھی جاتی ہے، محنت اور حصول و کارکردگی کے حوالے سے بھی مردوں کی بہ نسبت عورتوں کو کم نہیں سمجھا جاتا ہے، برابر محنت کے بدلے میں کم معاوضہ دیا جاتا ہے، عورتوں کو کمتر و کمزور گردانے والوں کی رائے عامہ حتمی سمجھی جاتی ہے۔ معاشی حوالے سے بھی کمانے کے باوجود عورت کے پیسے پر مرد کا قبضہ کرنا یا اپنی مرضی سے خرچ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے، حالاں کہ مذہبی، اخلاقی اور سماجی لحاظ سے وہ اس کا حق دار نہیں: ''خصوصاً نچلے طبقے کی عورتیں اپنے جائز حقوق سے محروم کر دی جاتی ہیں، اُن کو اُن کی محنتوں کا صلہ نہیں ملتا، بلکہ مرد اُس پر قابض رہتا ہے۔ معاشی طور پر مرد پر انحصار کرنے کے باعث تمام عمر وہ ذہنی و جسمانی غلامی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ شاید اسی لیے مرد خود کو زمینی خدا متصور کرتے ہیں۔''۵۳؎، ڈاکٹر حمیر ہاشمی کا خیال ہے: ''جب ہمارے ذرائع ابلاغ ہی عورت کو اور باتوں کے علاوہ کمتر اور کمزور محتاج، بے عقل، فیصلہ نہ کر سکنے والی، توہم پرست، تقدیر پسند اور معاشی طور پر بے کار ہستی کے طور پر پیش کریں گے، تو پھر اپنی

خواتین، بالخصوص جلد متاثر ہونے والے ذہنوں کی مالک کم عمر بچیوں سے کیا سننے کی توقع رکھتے ہیں، جس شخص کو قدرت نے تھوڑی سی بھی عقل دی ہے، وہ جانتا ہے کہ عورتوں کا اس قسم کا تصور حقیقت سے، بہت دُور ہے۔'' ۵۴؎

مرد کی حاکمیت روز مرہ زندگی عورت کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی نظر آتی ہے، مرد عورت کو ذہنی طور پر بھی غلام رکھنا چاہتا ہے، اِس لیے وہ فکرِ رسا ذہن کو پابندِ سلاسل رکھنے کی ہر ممکن کاوش کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دیگر معاملاتِ زندگی کے علاوہ تخلیقی ذہن رکھنے والی باشعور عورتوں کا استحصال بھی نمایاں نظر آتا ہے، راضیہ شمشیر کے خیال میں: ''لکھاری عورت سے مرد ہمیشہ خائف رہتا ہے، کیوں کہ وہ مرد کے پورے سچ سے آگاہ ہوتی ہے، لیکن وہ جراُتِ رندانہ سے محروم ہونے کے باعث فکر اور عمل کی دُنیا میں اپاہج رہتی ہے۔'' ۵۵؎ تاریخی وتہذیبی اور مذہبی ارتقائی جائزے سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عورت پر ہر دَور میں مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔ بے جا حاکمیت کی آڑ میں اسے محکوم بنانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی گئی، اِس کی فطری صلاحیتوں کو دبایا گیا۔ ردِعمل کے طور پر عورت نے اپنا تشخص اُجاگر کرنے کے لیے عملی قدم اُٹھانا شروع کیا اور بالآخر خواتین نے اِس ناروا سلوک، بے جا مظالم اور غیر انسانی رویوں کے خلاف آواز بلند کی، جس نے بعد میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی، جو تانیثیت کہلائی۔ اِس تحریک نے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر انقلاب برپا کیا۔ بنیادی طور پر تانیثیت (فیمنزم) کی تحریک کا آغاز یورپ میں ہوا، اس کی جڑیں اٹھارھویں صدی میں اُبھرنے والی انسانیت کی تحریک یا ہیومنیزم سے جُڑی ہوئی ہیں۔ نپولین عورتوں کے سخت خلاف تھا، اس کے نزدیک عورتوں کا کام محض گھر داری بچے پالنا ہے نہ کہ علوم وفنون کی باتیں کرنا، ۱۸۶۱ میں سول وار کے بعد یورپ میں حقوقِ نسواں کی تحریک کو عروج حاصل ہوا۔ برصغیر میں ۱۸۵۷ میں عیسائی مشنریوں نے عورتوں کی فلاح اور تعلیم و تربیت کے لیے ادارے قائم کیے، یوں اس تحریک کے بالواسطہ اثرات ہندوستانی معاشرے پر پڑے۔

دونوں عالمی جنگوں کے دوران مردوں کی تعداد میں کمی کے باعث خواتین نے زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لینا شروع کر دیا اور ثابت کیا کہ معاشرہ عورت کی خدمت کا محتاج ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں آئی کون روزی ورکنگ ویمن کونسل کی نمائندہ کے طور پر سامنے آئی۔ سوشلزم اور کیمونزم نے خواتین کی بھرپور حمایت کرتے ہوئے سیاست میں بھی حوصلہ افزائی کی۔ نازی جرمنی جو آمریت پسند معاشرہ تھا، اس میں بھی عورتوں کی بڑی تعداد نے مردوں کے برابر حصہ لینا شروع کیا، اس انقلاب سے دُنیا بھر میں جینڈر یعنی صنفی تفاوتی قوانین بھی متعین کیے جانے لگے۔ اُس حوالے سے کشور ناہید کا کہنا ہے:

> ''عورتوں کے حقوق کی حمایت میں فکر و خیال کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، کرستین ڈیپاں، میری وولسٹونیکر افٹ، جارج سینڈ اور بیسویں صدی کی دوسری لکھاری خواتین نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا اور پھر انقلابِ فرانس میں سے حقوقِ نسواں کی تحریک بھی پھوٹ پڑی، تاہم سیاسی حلقوں میں بڑے پیانے پر یہ تحریک ۱۸۴۸ سے اور امریکہ میں سینیکا فالز تحریک سے شروع ہوئی۔۔۔ اس تحریک سے صرف اشرافیہ کے مرد ہی نہیں تمام مرد زچ ہونے لگے، کیوں کہ اس سے گھروں میں عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہونے لگا، مزدوروں کی تحریک کے برعکس اس تحریک نے مردوں کو اس پہلو سے جالیا جہاں وہ کمزور تھے، اس صدی میں حقوقِ نسواں کی تحریک نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں

> اُنھیں تعلیم، سیاسی حقوق اور ملازمتوں تک رسائی حاصل ہوئی، دوہرے معیار قائم کرنے والے قوانین کو ختم کرایا، جو زیادہ تر صنعتی اور سوشلسٹ ممالک میں رائج تھے۔"[۵۲]

یورپ میں باقاعدہ طور پر ۱۸۵۰ سے قبل، تحریکِ آزادیِ نسواں کا آغاز ہو چکا تھا، لیڈی میری والسٹونیکرافٹ کی کتاب A Vindication of Rights of Women تانیثیت کے حوالے سے پہلی باقاعدہ کاوش سمجھی جاتی ہے، اس میں جدید تانیثی نظریات کا ذکر نہیں ہے۔ میری والسٹونیکرافٹ کے مطابق دونوں جنس کے لوگ اس صورت حال میں برابر کے شریک ہیں، بعض معاملات میں خواتین، مردوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ مغربی یورپ میں ہولڈ برگ نے یہ مطالبہ کیا کہ طبقۂ نسواں کو تعلیمی اور شہری حقوق دیے جائیں۔ تحریکِ حقوقِ نسواں کا پہلا اجلاس ۱۸۴۸ میں سینیکا فال، نیو یارک میں ہوا، اس اجلاس میں ۶۸ خواتین اور ۳۲ مردوں نے ایجنڈے پر دستخط کیے، جس کے مطابق خواتین کو بھی مردوں کی طرح ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔ پہلی نیشنل ویمن رائٹرز کنونشن ۱۸۵۰ میں ہوئی، اس میں ۱۰۰۰ افراد نے شمولیت کی، اس کا سالانہ اجلاس ۱۸۵۷ تا ۱۸۶۰ ملتوی رہا۔

سوسن بی اینتھنی اور ایلز بتھ کیڈی سٹانٹن نے نیشنل ویمن سفریج ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی، مئی ۱۸۵۰ کے اجلاس میں طے پایا کہ خواتین کو ووٹ کا حق دیا جائے۔ نومبر ۱۸۶۹ میں کانگریس کی آئینی ترمیم میں لکی سٹونز، ہنری بلیک ویل اور دیگر افراد نے مل کر امریکن ویمن سفریج ایسوسی ایشن قائم کی۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۶۹ میں وومنگ پاسیس نے خواتین کے لیے پہلا سفریج ویمن لا قائم کیا، جس کے تحت خواتین نے اسی سال وکالت کے شعبہ میں قدم رکھا، اس تحریک کا ایجنڈا تھا کہ ریاست ہر ایک کے لیے یکساں ہے اور آئین میں ترامیم کر کے خواتین کو ووٹ کا حق دیا جائے۔ ۱۸۷۱ میں پریگنینسی ایکٹ پاس ہوا، جس کے مطابق حاملہ خواتین کو ترقی اور نوکری سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۷۶ میں پہلی بار میریٹل ریپ یعنی شادی شدہ جنسی تشدد کا قانون سامنے آیا، اِس کے مطابق شوہر کے لیے بیوی سے زبردستی ہم بستر ہونا جُرم قرار دیا گیا۔ ۱۸۸۶ میں سپریم کورٹ نے خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کو غیر قانونی قرار دیا۔ ۱۸۹۰ میں نیشنل ویمن سفریج ایسوسی ایشن اور امریکن ویمن سفریج ایسوسی ایشن کا الحاق ہوا اور نیشنل ویمن سفریج ایسوسی ایشن قائم کی گئی، جس کے تحت ہر ریاست کی خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ ۱۸۹۳ میں پہلی مرتبہ ریاست کولوٹیڈو میں خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ ۱۸۹۶ میں نیشنل ایسوسی ایشن آف کلرڈ ویمن کا قیام عمل میں آیا۔ تقریباً ۱۰۰ نگرو خواتین نے کلب کی تشکیل دی۔ ۱۸۹۶ ہی میں خواتین کے خلاف تشدد کا ایکٹ پاس ہوا، ریپ اور تشدد کی شکار خواتین کو دفاعی تربیت بھی دی گئی۔ ۱۹۰۳ میں نیشنل ویمن ٹریڈ یونین (این۔ ڈبلیو۔ ٹی۔ یو) کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد کام اور بہتر تنخواہ کے قواعد و ضوابط کا تعین تھا۔ ۱۹۱۶ میں مارگریٹ سینگر نے پہلی مرتبہ امریکہ میں برتھ کنٹرول کلینک قائم کیا۔ ۱۹۲۱ میں مارگریٹ سینگر نے امریکن برتھ کنٹرول لیگ بنائی۔ ۱۹۵۵ میں پہلی ہم جنس پرست اور گنائیزیشن (لیسبیَن) امریکہ میں قائم ہوئی۔ ۱۹۶۰ میں فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن نے برتھ کنٹرول گولیوں کی منظوری دی، بیٹی فرائیڈن نے اپنی مشہور کتاب Feminist Mystique لکھی۔ کانگرس نے برابریٔ تنخواہ کا قانون پاس کیا، جس کے مطابق مرد و عورت کو تنخواہ میں برابری کا حق حاصل ہوا۔ ۱۹۶۶ میں نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن (این۔ او۔ ڈبلیو) نے تانیثی طرزِ فکر کے حامل ایک گروہ، جس میں بیٹی فرائیڈن شامل تھی، امریکہ میں خواتین کے حقوق کے لیے خواتین نے قانونی لابی بنائی، جس کے تحت

جنسی تفاوت کو دُور کیا گیا۔ ۱۹۷۰ میں عدالتی نوٹس کے مطابق مرد و عورت کو برابر تنخواہ دی گئی۔ ۱۹۷۱ میں نیو یارک میگزین میں حقوقِ نسواں کے حوالے سے تقریباً تین لاکھ مضامین چھپے۔ ۱۹۷۲ میں تعلیمی اداروں میں جنس کی بنیاد پر روا رکھے جانے والا فرق ختم کیا گیا۔ ۱۹۷۴ میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا، چوں کہ ایمپلائرز خواتین کو کم معاوضہ اس لیے دیتے ہیں کہ کم آمدنی والی عورت کو قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔ ۱۹۸۷ میں فیڈرل ایجنسیوں نے تعلیم و نوکری کے شعبوں میں فعال کردار ادا کیا اور اس طرح اقلیتوں نے ایسے مواقع سے لطف اُٹھایا، جیسا کہ سفید فام اُٹھا رہے تھے۔ ای ای او سی کے قوانین کو جنسی تفاوت کی بنیاد پر نوکری کے لیے اخبارات میں دیے جانے والے اشتہارات کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور اچھی تنخواہوں کی نوکریوں کی اجازت دی گئی۔ لاطینی امریکہ میں ایک آئیڈیل کنبے اور شادی کی کوشش کی گئی، جس کی بنیاد بے جا حاکمیت، مالی برتری یا جائیداد کے حصول کی بجائے پیار، محبت اور تعاون میں برابری کے اُصولوں پر رکھی گئی۔ شمالی امریکہ میں خواتین نے کھیتی باڑی میں حصہ لینا شروع کر دیا، جو دَورِ غلامی سے محض گھریلو فرائض انجام دیتی رہی تھیں۔

مشرقِ وسطیٰ اور شمالی امریکہ میں مسلمان خواتین میں مزدوری کے مسائل نسبتاً کم ہیں، کیوں کہ یہ ممالک دولت سے مالا مال ہیں۔ ڈاکٹر نوال نے عرب ممالک میں غلاموں اور کنیزوں سے رکھے جانے والے ناروا سلوک کی مذمت کی ہے، اِن کے خیال میں اسلام سے قبل و ما بعد کنیزوں اور لونڈیوں کو رکھنے والے قبائل نظام کی شدید مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''باقی تمام قبائل میں پدری نظام انتہائی مضبوط تھا، اِس نظام کا جوتانا بانا مرد کے لامحدود غلبہ کی بقا کے لیے بُنا گیا تھا، وہ ہمیشہ کی طرح مضبوط اور ناقابلِ شکست رہا۔ قبایل میں مسلسل جنگ و جدل، جس میں مرد مرتے تھے، جنگوں میں مالِ غنیمت کے طور پر آنے والی متعدد جنگی قیدی خواتین اور لونڈیاں اسی طرح نئے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت کے سبب، تعدد ازدواج ایک معاشرتی ضرورت بن کر اُبھری، چناں چہ اسلام نے مردوں کی جنسی آزادی، ایک سے زیادہ شادیوں کے علاوہ لونڈیاں اور کنیزیں رکھنے کے حق پر مذہب کی مہر لگا دی، عملاً ایک بار پھر غلاموں کے آقاؤں قبائلی سربراہوں اور امیر لوگوں کو ایسے حقوق و فوائد سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، کیوں کہ صرف اِن ہی لوگوں کے پاس اتنی عورتیں خریدنے اور رکھنے کے وسائل تھے۔'' ۵۷

ہمارے بہت سے اسلامی ملکوں میں خواتین نے شوہروں کو طلاق کا حق دے چھوڑا ہے۔ السوداوی کی تحقیق کے مطابق بانجھ پن اور بیٹوں کے نہ پیدا ہونے کا الزام مرد، عورت کے سر ڈال کر اپنی بیویوں کو طلاق دے دیتے ہیں۔ طلاق عورت کے لیے بہت بڑی بدقسمتی بن جاتی ہے۔ اولاد ہونے کی صورت میں مرد بچوں کو چھین لیتا ہے، بعض اوقات بچے کی پیدائش پر مرد بچے کی ولادت پر شبہ کر کے بچوں سمیت عورت کو نکال دیتا ہے، حالاں کہ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ علیحدگی کے بعد بھی عورت اور بچوں کے نان ونفقہ کا پابند ہو، عموماً اسلام کی روشنی میں خواتین کے فرائض، تو گنوا دیے جاتے ہیں، لیکن اپنی تمام تر معتبر حیثیتوں، مثلاً ماں، بہن، بیوی، بیٹی کے حقوق یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ اِسے انسان متصور کرنے کے گریز کیا جاتا ہے۔ مسلمان ممالک میں پردہ یا نقاب عورت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ قطر میں تبولا کا رواج ہوا، جس میں پورے چہرے پر ماسک چڑھا کر صرف آنکھوں کے لیے جگہ چھوڑ ی جاتی

ہے۔ پردے سے مراد عورت کا غیر مردوں کی طرف دیکھنا یا ان کا عورت کو دیکھنا ممنوع ہے، اگرچہ نئی نسل اس سے انحراف کر رہی ہے، بعض مقامات پر پردہ سماجی برتری اور اہمیت کا حامل ہے۔ صرف امیر لوگ اپنی بیویوں کے لیے پردہ کرواسکتے ہیں۔ عراقی خواتین عبایا پہنتی ہیں، جو عزت واحترام کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں ۱۹۳۶ میں خواتین پر سے قانوناً نقاب کی پابندی ہٹائی گئی۔ شاہ ایران کے مؤقف کے مطابق ملک کی آدھی آبادی ملکی ترقی میں حصہ نہ لینے سے بیکار ہو جائے گی، اس لیے نقاب کی پابندی ختم کی گئی، ۱۹۶۷ میں ایران میں قائم ہونے والے فیملی پروٹیکشن لا کے مطابق مردوں کی ایک سے زیادہ شادی کی ممانعت کی گئی ہے، اگر کوئی مرد دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، تو اُسے عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عدالت اُس کی پہلی بیوی سے اُس کے شوہر کی مالی وسماجی اور اخلاقی حوالوں سے کوائف اکٹھا کرتی ہے اور بیوی اجازت دے، تو مرد کو دوسری شادی کا حق دیا جاتا ہے۔ عدالت عورت کو طلاق کا حق دیتی ہے، اس کے برعکس مرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر عورت کی نوکری اس کے کنبے کی ترقی اور بہتری کی راہ میں رُکاوٹ بنتی ہے، تو عورت کو نوکری کرنے سے روک سکتا ہے۔ انقلابِ ایران کے بعد دو طرح کے لوگ سامنے آئے۔ ایک وہ جنھوں نے ایرانی خواتین کو یقین دلایا کہ وہ دوسرے درجہ کی شہری ہیں، اُنھیں سماجی و گھریلو سطح پر کوئی خاص تحفظ حاصل نہیں۔ مرد عورت پر مکمل طور پر حاوی ہے، دوسرے وہ، جن کے خیال میں خواتین کو ووٹ کا حق حاصل ہے، جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایرانی خواتین نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کی۔

مڈل ایسٹ اور جنوبی افریقہ کی خواتین کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے، اس میں مشترکہ خاندانی نظام، ساس نندوں، دیوروں اور جیٹھوں کے جھگڑے اضافی بوجھ بن گئے ہیں۔ مغربی افریقہ میں دیگر افریقی ممالک کی بہ نسبت عورت پر دباؤ کم ہے وہ پورا وقت ماں کا کردار ادا کرتی ہوئی گھریلو امور سرانجام دیتی ہے، اُسے شوہر کی عدم موجودگی میں گھریلو ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے۔ جنوبی ایشیا کی خواتین کو گھریلو کردار بطور بیوی اور ماں کی حیثیت سے ادا کرنا ہوتا ہے۔ مذہبی نظریات کے مطابق خواتین کی کمترین حیثیت کا پرچار کیا جاتا ہے۔ والدین کی مرضی کی شادیاں جہیز کی پابندی اور دوسروں پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، جب کہ مرد کچھ نہ کرتے ہوئے بھی احساسِ تفاخر میں مبتلا ہوتا ہے۔

چین اور تائیوان کی تہذیب کے مطابق خواتین کو باپ، شوہر اور بیٹے کا تابع فرمان ہونا چاہیے اور گھر میں بیوی اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ ملائیشیا میں اسلامی اثرات کے نتیجے میں خواتین کو تنخواہ کا حق دیا گیا ہے۔ شامی عورت کا کردار ایک ماں اور بیوی کے روپ میں ہے۔ تھائی لینڈ میں ۱۹۷۵ کے سول اینڈ کمرشل ایمنڈمنٹ میں خواتین اور مردوں کو برابر حقوق اور طلاق کا حق دیا ہے۔ نوکری کے باوجود خواتین کو اولیت اپنے گھر اور خاندان کو دینی پڑتی ہے۔ مرد کے برابر روزگار کمانے والی خواتین کی مشقت کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ تعلیم عورت کو قوتِ فیصلہ اور سیاسی، معاشی نظام میں عورتوں کی معاون ثابت ہوتی ہے، جو خواتین کو اپنی حالت سدھارنے میں مدد دیتی ہے۔ اُنیسویں صدی کے اواخر میں فیمینسٹ تحریک کا اصل مسئلہ خواتین کی تعلیم ہے، اس کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ پردہ تھا، جس کی آڑ میں خواتین کو ان کے قانونی حق سے محروم کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں سرسید احمد خان خواتین کو تعلیم کے اولین علمبردار تھے، اُنھوں نے ۱۸۹۶ میں اِسی مقصد کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے کیوں کہ ہر ہزار مسلم لڑکیوں میں سے صرف چار خواتین کو تعلیم کے مواقع حاصل ہوئے۔

برصغیر پاک و ہند میں عورتوں کی تعلیمی ترقی میں پہلا قدم عورتوں کے روایتی پردے سے متعلق فرسودہ خیالات کی نفی کرنا تھا۔ لہٰذا، سر سید احمد خاں نے اس علامتی پردے کی مذمت کی، جو مرد و عورت کی دنیاؤں میں حائل تھا۔ دو گروہ منظرِ عام پر آئے۔ ایک سیاسی گروہ تھا، جس میں سرکردہ خواتین یعنی مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈروں کی بیویاں بھی شامل تھیں۔ سماجی سطح پر ''انجمن خواتینِ اسلام'' تھی۔ تحریکِ خلافت کے دوران عابدی بیگم المعروف بی اماں نے پردے کی مخالفت کی۔ آزادی کے بعد سرکردہ مسلم خواتین نے اپنے حقوق کی آواز اُٹھائی، انھی کی ایما پر مسلم پرسنل لا آف شریعت ۱۹۱۴ کے تحت، خواتین کے جائیداد کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۵۶ میں فیملی لا آرڈیننس میں نئی شق کے تحت شادی وطلاق کے معاملات طے کیے گئے۔ ''فیملی لاز آرڈیننس، جو ۱۹۶۱ میں پاس ہوا، اس کی رو سے خواتین کو یہ فائدہ پہنچا:

۱۔ اِس سے عورتیں زرعی زمین میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے قابل ہوئیں۔
۲۔ مرد کو دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی رضا مندی حاصل کرنا پڑے گی۔
۳۔ مردوں کے لیے طلاق کا حق ملا۔
۴۔ پہلی مرتبہ عورتوں کو طلاق کا حق ملا۔
۵۔ شادیوں کی رجسٹریشن کا نظام رائج ہوا۔'' ۵۸

۸۸۔ ۱۹۷۷ میں خواتین سے امتیازی سلوک برتے جانے کے خلاف خواتین کے مختلف گروہ سرگرم ہوئے۔ ۱۹۷۹ میں حکومت کے اسلامائزیشن پروگرام کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا۔ ۱۹۷۹ میں حدود آرڈیننس کا نفاذ عمل میں آیا، لیکن یہ زنا اور زنا بالجبر میں تخصیص نہ کر سکا، اس کے مطابق مرد صرف اس وقت زنا کا مرتکب ہوگا، جب اس کی گواہی دوسرے مرد دیں گے، اس طرح عورت کا استحصال بآسانی ہوسکتا تھا، کیوں کہ زنا کی صورت میں حمل کے ٹھہرنے ہی کو اُس کی نشانی قرار دیا گیا۔

۸۴۔ ۱۹۸۳ میں قانونِ شہادت یا گواہی کے قوانین کے بارے میں بھی یہی سمجھا گیا اور مرد عورت کو برابر حق نہیں دیا گیا۔ ۱۹۸۴ میں خواتین کے ایک گروہ نے قصاص اور دیّت کے قوانین کے خلاف بھی آواز اُٹھائی، اس آرڈیننس کے مخالفین کا کہنا تھا کہ اس قصاص و دیت میں دیا جانے والا معاوضہ عورت و مرد میں مختلف ہے۔ مرد کی صورت میں دیّت کا آدھا حصہ ملتا ہے۔ آخر کار ۱۹۹۰ میں یہ بل عورت و مرد کی تخصیص کے قانون کی شکل اختیار کر گیا۔ ۱۹۸۶ میں شریعت بل اور نویں ترمیم، جس کے مطابق پاکستان کے تمام قوانین شریعت کے پابند ہوں گے، بہت سی تنظیموں نے شریعت بل کی مخالفت شروع کر دی، کیوں کہ یہ بل انصاف، جمہوریت، شہریوں کے بنیادی حقوق سے محرومی، بے جا ڈکٹیٹرشپ اور قوم کو تقسیم کرنے والا تھا۔ ضیا گورنمنٹ نے بتدریج اسلامی اصولوں کا پرچار شروع کیا اور اس کے برعکس شریعت بل اور نویں ترمیم نے خواتین کو حقوق سے محروم کر دیا اور عمومی تاثر دیا گیا کہ شریعت بل اور نویں ترمیم خواتین کے حقوق کی بازیابی میں معاون ہیں، اگرچہ ۱۹۹۱ میں بھی شریعت بل اور نویں ترمیم کے خلاف آواز اُٹھائی گئی، لیکن کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ ۱۹۹۱ میں انٹرنیشنل نیٹ ورک آف انفارمیشن قائم ہوا، جس کے تحت ویمن اینڈ ویمن لونگ انڈر مسلم لا یا ڈبلیو اینڈ ایل لا پروگرام کے تحت خواتین میں شعور و آگہی اجاگر کرنے پر زور دیا گیا، تاکہ رسوم و رواج، قانون اور سیاست کی تناظر میں خواتین کی زندگی سے مطابقت تلاش کی جا سکے کہ کس طرح یہ عوامل ایک عورت کی زندگی کو بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر متاثر

کرتے ہیں، یعنی تمام انسان مساوی حقوق کے حامل ہیں اور بہ حیثیتِ انسان ہر ایک کی عزتِ نفس اور عظمت ذات ہے، اس کی تکریم ہر ایک کے لیے ضروری ہے، دیگر انسانی حقوق مثلاً زندگی، آزادی، تحفظ، شادی و خاندان وغیرہ تمام انسانوں میں مساوی ہیں اور یہ کہ خوراک، رہائش، طب و تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہونے چاہیے۔

اپوا آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن ایک سرگرم تنظیم کے طور پر کام کرنے لگی اور میڈیا کے ذریعے حدود آرڈیننس کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ ڈبلیو اے ایف پر بھی روشنی ڈالی جانے لگی، اپوا نے قصاص اور دِیت کے تضاد پر مبنی قوانین کی بھی مخالفت کی، جس کے تحت مرد کی بہ نسبت عورت کا خون بہا نصف تھا، یہ قوانین شریعت بل اور نویں ترمیم کی صورت میں بھی پیش کیے گئے۔ ۱۹۸۴ میں قانون شہادت اسلامی نظریاتی کونسل میں پیش کیا گیا۔ خواتین کی تحریک ڈبلیو اے ایف تحریکِ خواتین کا سنگِ میل ثابت ہوئی۔ ۱۲ فروری ۱۹۸۳ کو تین سو خواتین لاہور کی گلیوں، سڑکوں پر اکٹھی ہوئیں، ان پر لاٹھی چارج کی گئی اور آنسو گیس پھینکی گئی۔ تحریک سے وابستہ خواتین کو جیل بھی کاٹنا پڑی، انھیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ لوگوں میں آگاہی پیدا کرنے کے لیے خصوصی لیکچرز اور جلسوں کا انعقاد بھی کیا گیا، اُنھوں نے پرنٹ میڈیا اور پوسٹروں اور کیسٹوں کے ذریعے اپنا پیغام عام کیا۔ ۱۹۸۳ میں تحریک کی سرکردہ رُکن مجلسِ شوریٰ کے اراکین سے بھی ملے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی خواتین اراکین کو مسائل کے حل کے لیے دستاویزات پیش کی گئیں۔ ۱۹۸۴ میں تحریکِ خواتین کے اس بل کو کوئی منظور ہونے سے کوئی نہ روک سکا۔ مزید ردِ عمل کے خوف سے اس کا نفاذ عمل میں نہ آسکا، بالآخر ۱۹۹۱ میں شریعت ایکٹ منظور ہوا، اس میں تحریکِ خواتین کے حوالے سے منفی صورتحال پیدا کی گئی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی پاکستان میں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ ۹۰۔۱۹۸۸ میں بینظیر کے مختصر دَور میں، عورتوں کے ساتھ ملٹری دَور میں تفاوت و تضاد کے قانون سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں، اس دَور میں عورت کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۹۰، ہی میں غلام مصطفیٰ جتوئی کے دَور میں قصاص و دیّت آرڈیننس، جب کہ نواز شریف، جماعتِ اسلامی اور دوسرے مذہبی گروہوں نے شریعت ایکٹ بنایا۔ فلاحی تنظیموں کے تحت دیہی و شہری علاقوں کی خواتین کے مسائل منظرِ عام پر آئے مختلف خواتین کی تنظیموں، ہیومن رائٹس گروپ، اخبارات، ٹریڈ یونین فیڈریشن وغیرہ نے ان مسائل کو منظرِ عام پر لانے کا کام کیا، یہ بل مذہبی اور قانونی و آئینی نظریات کا حامل تھا۔ جائنٹ ایکشن کمیٹی کے مختلف شہروں میں اجلاس ہوئے۔

جون ۲۰۰۰ میں انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین جو ۱۰ ممالک سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتوں کی تنظیم ہے، اس کے تحت نیویارک میں عورتوں کی عالمی کانفرنس ہوئی، جسے بیجنگ پلس فائیو کا نام دیا گیا۔ ۲۰۰۰ میں خرطوم اور جکارتہ میں بھی انٹرنیشنل مسلم یونین کی جنرل کانگرس کا اجلاس عمل میں آیا۔ ۲۰۰۱ میں لندن میں مسلم خواتین کی بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ ۲۰۰۱ میں تہران میں فاطمہ الزہرا ؓ کانفرنس منعقد ہوئی۔ ۲۰۰۳ میں پاکستان میں خاندانی اقدار کے موضوع پر کانفرنس ہوئی، اس طرح اکتوبر ۲۰۰۴ میں جکارتہ میں انٹرنیشنل ویمن یونین کے زیرِ اہتمام عورت اُمید اور حقیقت کے درمیان کے موضوع پر سیمینار ہوا، اسی طرح ۱۹۶۱ کے عالمی قوانین، جو اسلامی قوانین سے متصادم تھے، اُنھیں ختم کرنے کی بھی تجویز پیش کی گئی۔ حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ کے اعتراضات کا از سرِ نو جائزہ لیا گیا، اسی طرح نواز شریف اور بےنظیر دَور میں توہینِ رسالت، قصاص و دیّت کا قانون، قانونِ شہادت وغیرہ کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ۲۰۰۵ میں قومی اسمبلی میں خواتین کے تحفظ کا بل پیش کیا گیا۔ قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے اس بل کے مطابق:

i اغوااور زنا بالجبر کے کیسز میں خواتین کی ضمانت قبل از گرفتاری اور بعد از گرفتاری، رہائی یقینی بنائی جائے، کیوں کہ اسلام میں عورت کے لیے جیل کا کوئی تصور نہیں، کیوں کہ جیلوں میں عورتوں کو قید رکھنے سے بہت سی سماجی برائیاں پروان چڑھتی ہیں اور خاندانی نظام ٹوٹتا ہے، اس لیے عورتوں کی ضمانت پر رہائی اور قبل از گرفتاری ضمانت کو یقینی بنایا جائے۔

ii کسی بھی فوجداری کیس میں کسی خاتون کو گرفتار کرنے سے قبل یہ امر یقینی بنایا جائے کہ ان کے پاس عدالتی سمن یا نا قابلِ ضمانت وارنٹ موجود ہیں۔

iii نکاحِ ثانی کے وقت عورت کے پاس طلاق نامہ یا اور کوئی دستاویز موجود ہو، تا کہ اسے دوسری شادی کے وقت اور اس کے بعد کسی الزام کا سامنا نہ کرنا پڑے، کیوں کہ اس وقت زیادہ تر کیسز ایسی عورتوں کے ہیں، جن کے پاس دوسری شادی کے وقت طلاق نامہ یا کچھ اور دستاویز نہ تھی، جس پر پہلے والی سسرال اور شوہر نے حدود کا مقدمہ درج کرا لیا۔

iv قذف کا قانون مؤثر بنایا جائے، تا کہ کوئی مرد عورت پر غلط الزام نہ لگا سکے۔ جھوٹا لزام لگانے والوں اور اپنے الزام کو ثابت نہ کرنے والوں کو قذف کی سزا دلوائی جائے۔

v عدالتوں میں لیڈی ڈاکٹر اور ڈی این اے ٹیسٹ کی کِٹ فراہم کی جائے، تا کہ کاروائی میں بے جا تاخیر نہ ہو اور مجرم جلد کیفرِ کردار تک پہنچ سکیں اور بے گناہ لوگ جلد اذیت سے بچ سکیں۔ اگست ۲۰۰۲ میں جینڈر ریفارم ایکشن پلان (جی آر اے پی، گریپ) کا اجرا حکومتی سطح پر ہوا، جس کے مطابق ۱۹۷۳ کے آئین کی شق کہ خواتین کو آگے لانے کے لیے جہاں ضرورت محسوس کی جائے، خصوصی اقدامات کیے جائیں، پر عمل درآمد کیا جائے، اس پروگرام کے تحت خواتین کی سیاسی شمولیت صنفی برابری کے بنیاد پر، انسٹی ٹیوشنل سٹرکچر اُمور پالسیز میں تبدیلی، خواتین کو پبلک سیکٹر میں روزگار کے برابر مواقع اور ان کی صلاحیتوں میں اضافے اور تربیت کے لیے مختلف اداروں کا قیام شامل ہے۔ جنوری ۲۰۰۶ میں خواتین کے خلاف گھریلو تشدد کا قانون قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا، اسی ضمن میں حقوقِ نسواں بل ۲۰۰۶ میں پیش کیا گیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ جسے بعض سرکردہ اراکین نے مسترد کرادیا کہ اس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ ان کی دانست میں اسلام عورت پر تشدد کی اجازت دیتا ہے۔ تحفظِ نسواں بل کا ملخص درج ذیل ہے:

> ''تحفظِ نسواں (فوج داری ترمیم) ایکٹ ۲۰۰۶ کے مطابق عورت کو نکاح وغیرہ پر مجبور کرنے کے لیے بھگانا یا اغوا کرنا یا ترغیب دینے کی سزا عمر قید ہے، اسی طرح کسی بھی شخص خواہ مرد ہو یا عورت غیر فطری نفسانی خواہش کا نشانہ بنانے کی غرض سے اغوا کرنا، عصمت فروشی کی نیت سے اغوا کرنا، خریدنا یا زنا کرنا، کسی عورت کو مجرمانہ نیت سے ورغلانا یا جائز نکاح کا یقین دلوا کر ہم بستری کرنے کی سزا کم از کم پچیس سال سخت سزا یا جُرمانہ ہے، اسی طرح زنا کے حوالے سے دفعہ ۵ آرڈیننس ۱۹۷۹ کے مطابق محصن کی صورت میں موت تک رجم کرنا اور محصن نہ ہو، تو سو کوڑوں کی سزا ہے۔'' ۵۹

مارچ ۲۰۰۷ کو خواتین کی عالمی دن کے موقع پر ملک بھر میں سوشل ویلفیئر اور ویمن ڈویلپمنٹ کے وفاقی وصوبائی محکموں کے علاوہ تقریباً سبھی سیاست، تعلیم، طب اور شعبہ ہائے زندگی کے علاوہ سماجی کارکنوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ دَورِ حاضر میں وزارتِ حقوقِ نسواں قائم کی گئی ہے، جس کی تحت خواتین سے روا رکھے جانے والے ناہموار رویوں، تشدد و جبر

کے خلاف پیش قدمی کی گئی ہے مثلاً گھریلو تشدد، ریپ، اغوا،قتل، وٹے سٹے، کاروکاری، وَنی، قرآن سے شادی، ہراساں کیا جانا، طلاق وخلع کے مسائل، بچوں کو چھین لیا جانا وغیرہ جیسے مسائل کا فوری حل اوراس کے لیے قانون سازی کی جارہی ہے۔ خواتین کے ذہنی دباؤ اور گھریلو تشدد کا قانون بھی زیرِ غور ہے۔ ڈاکٹر زاہد محمود گھریلو تشدد کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہیں:

> ''گھریلو تشدد اس طرزِ عمل کو کہتے ہیں، جو مسلسل کسی شخص کے خلاف اس لیے روا رکھا جائے کہ اس کی حرکات وسکنات اور قوتِ ارادی کو قابو میں لایا جا سکے۔ جسمانی، ذہنی اور جنسی تشدد اسی طرزِ عمل کی مثالیں ہیں۔ گھریلو تشدد کے حربوں میں چیخنا چلانا، گالیاں دینا، دھکے دینا، مار پیٹ کرنا، تھپڑ ماران، گلا گھونٹنا، ٹھوکریں مارنا، کاٹنا، کسی ہتھیار سے مارنا، ڈرانا دھمکانا اور ہراساں کرنا، جان لینے کی دھمکی دینا، کسی کے جذبات اوراحساسات کو مجروح کرنا، کسی کے ماں باپ یا بزرگوں کی بے عزتی کرنا، کسی کو نیچا دکھانا، کسی کو سرِ عام بے عزت کرنا، کسی کو دوسروں کے سامنے ذلیل کرنا، جنسی تشدد جبر واکراہ، زور زبردستی سے کام لینا، جنسی حملہ اور زنا بالجبر کا ارتکاب شامل ہیں۔''۶۰

جہیز کم لانے، ساس بہو، نندوں کے جھگڑوں، غربت و بے روز گاری کے نتیجے میں چولہا پھٹنے کے واقعات خواتین اور بچیوں پر تیزاب پھینکے جانے جیسے مکروہ افعال کو قابلِ گرفت بنانے کے لیے عملی اقدامات کیے گئے ہیں مثلاً برن کیسز میں ڈیتھ سٹیٹمنٹ کے قانون میں تبدیلی لائی گئی ہے، پہلے قانون کے مطابق مضروبہ کا نزاعی بیان ہسپتال میں ڈاکٹروں اور پولیس کی موجودگی میں قلمبند کیا جاتا تھا اور اُسی کی بنیاد پر ایف آئی آر درج کی جاتی تھی، عموماً مظلومین کا قریباً ۲۰ فیصد جل جاتا ہے، پھر ہسپتال میں رسائی ہوتی ہے یا عموماً قریب المرگ ہونے کی وجہ سے نزاعی بیان نہ دیے جانے پر سسرال والے خودکشی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، طے یہ پایا کہ جائے واردات پر ہی اگر خاتون کوئی بیان دیتی ہے اُسے ہی حرفِ آخر سمجھا جائے گا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تشدد خواہ وہ کسی بھی قسم کا ہو اُس کے نتیجے میں وبائی امراض کی بہ نسبت عورتوں شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔ کشور ناہید کے خیال میں:

> ''سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ۱۸۰۰ افراد ایڈز میں مبتلا ہیں، جن میں عورتوں کی تعداد صرف ۴۰۰ ہے اور بھارت میں 6.3 % لوگ ایڈز میں مبتلا ہیں، تمام ہسپتالوں میں برن یونٹ کے لیے ایک یا دو بیڈ مختص ہیں، جب کہ ہمارے ملک میں جلنے والی عورتوں کی روزانہ تعداد ڈبل ہندسوں میں پہنچتی ہے اور حکومت ان کے لیے کچھ کرنے کا دعویٰ بھی کرتی ہے، مگر موجودہ صورتحال تشویش ناک ہے۔ ۶۱

ابتدا میں یہ خواتین کے مردوں کے مساوی ووٹ دینے کے حق میں اُٹھائی گئی آواز تھی، اس تعریف و وضاحت مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے، اس کا مقصد سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اخلاقی سطح پر عورتوں کے حقوق کا تعین اوران کا حصول ہے۔ تانیثیت خواتین کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی تحریکوں کا موازنہ کرتے ہوئے صنفی امتیازات اور عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر مساوی سلوک کا جائزہ لیتی ہے۔ تانیثیت جنسی برابری کے نظریات کی بھی وضاحت کرتی ہے۔ جدید تانیثیت پسندوں نے سیاسی سطح پر بھی خواتین کے حقوق جن میں ابارشن، اپنی مرضی سے اولاد

پیدا کرنے یا نہ کرنے کے علاوہ بچے کی نگہداشت پر زور دیا گیا ہے، اس کے علاوہ گھریلو تشدد، جنسی طور پر ہراساں کیا جانا، زنا، جائے ملازمت کے حقوق، جن میں میٹرنٹی کی چھٹیاں اور تنخواہ کی برابری کے ساتھ ساتھ دیگر برتے جانے والے امتیازات کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ حقوقِ نسواں عورت کے سماجی اور انسانی حقوق کی غماز ہے، یہ خواتین کے حقوق کی پہلی آواز اور جذبات و احساسات کا کھلم کھلا اعلان تھا، جس کا مقصد مرد کی حاکمیت اور عورت کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تانیثیت کے بنیادی تصورات کا ذکر کیا ہے:

> ''تانیثیت کے بنیادی تصورات دو ہیں، اول یہ کہ بنی نوع انسان کے دو طبقے ہیں، مرد اور عورت، مرد بطور طبقہ عورت بطور طبقہ ایک دوسرے پر ظلم اور زیادتی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان دو طبقات کے باہمی تعلقات اور آویزش کا مطالعہ جنس یا Gender کے اصطلاحی لفظ کے تحت کیا جاتا ہے۔ جنس یا جینڈر Gender کے تصور صنف یعنی Sex کے تصور سے مختلف ہے، یعنی مرد و عورت کے درمیان صنفی اختلاف کی بنیاد پر کسی طبقے کو کم تر یا پھر بہتر نہیں کہا جا سکتا، یہ کہنا غلط ہے کہ عورت بطور صنفِ نازک ہے، مرد کے مقابلے میں کمزور اور کم عقل ہے، یہ بھی کہنا غلط ہے کہ بعض خصوصیات مثلاً نازک دلی، رقیق القلبی، شرم و حیا، ضد وغیرہ۔ عورتوں میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں عورتوں کے تصورات معاشرے میں رائج ہیں اصلاً اور اُصولاً معاشرہ کی وضع کردہ ہیں، حقیقی نہیں۔'' ۶۲

فیمینزم کا لفظ فرانس میں پہلے پہل ۱۸۸۰ میں مروج ہوا، جب کہ برطانیہ میں ۱۸۹۰ میں اور امریکہ میں ۱۹۱۰ میں اسے رواج ہوا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ۱۸۹۴ میں فیمینزم اور بعد میں ۱۸۹۵ میں فیمینسٹ استعمال ہوا، اس سے قبل فیمینزم کی بجائے ''ویمن رائٹس'' کی اصطلاح مستعمل یا استعمال کی جاتی تھی، اس طرح یہ اصطلاح محدود سمجھی گئی۔ اپنے وسیع تر معنوں میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔ تانیثیت کی تعریف خاصا مشکل کام ہے، لیکن اپنے وسیع تر معنوں میں یہ عورت و مرد کے کام، نظریات و خیالات کے اظہار اور ایسی تحریروں کی عکاس ہے، جو خواتین کے مسائل، ان کے حقوق اور معاشرے میں ان سے روا رکھی جانے والی ناانصافی یا معاشرتی و سماجی ناہمواری پر قلم اُٹھاتے ہیں یا مباحثہ کرتے ہیں۔ فیمینزم یا تانیثی شعور سے مُراد مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں مردوں کے قائم کردہ تمام اقدار سے آگاہی ہے، تاہم موجودہ دَور میں خواتین نے اقدار پر مردوں کی غالبیت کے خلاف آواز اُٹھائی ہے، یعنی عورتیں بھی اسی طرح آزاد ہیں جس طرح مرد اور یہ نیا ثقافتی رُجحان خواتین میں فلسفیانہ سطح پر تبدیلی پیدا کر رہا ہے۔ فیمینزم یا ویمن رائٹس کی اصطلاح سے قبل، جو اصطلاح مستعمل تھی، پوسٹ فیمینسٹ کہلاتی تھی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے مطابق یہ خیال کیا جاتا ہے: ''دُنیا میں مرد و عورت کا مساوی ہونا اور سماجی، معاشی اور سیاسی سطح پر تانیثیت نے مغرب میں بہت ترقی پائی، جب کہ پوری دُنیا میں اِس کا پھیلاؤ اور خواتین کے حقوق کی بازیافت کرنے والے اداروں اور تنظیموں کی صورت میں ہوتا ہے۔'' ۶۳

گویا فیمینزم کی تحریک سیاسی، سماجی اور تعلیمی معاملات میں عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کی بازیافت ہے۔ اس کا بنیادی مقصد بے روزگاری کا خاتمہ، تعلیم، بچوں کی نگہداشت، جنسی مسائل اور ابارشن پر قابو پانا ہے۔ مزید برآں، عورتوں

کے لیے جائے ملازمت پر مساوی حقوق کے حصول کے علاوہ خاندانی نظام میں تبدیلی اور خواتین کو ہراساں کیے جانے کے خلاف آواز بلند کرنے کے علاوہ بچوں کی نگہداشت ہے۔ سیمون دی بوروا نے The Second Sex میں عورت کے استحصال کی تمام صورتوں پر روشنی ڈالی ہے کہ عورتیں مرد کے برابر ہیں اور انھیں پابند و محبوس نہیں کرنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ عورتیں کبھی بھی مرد کے برابر نہیں ہو سکتیں۔[۶۴] میری لین فرنچ نے تانیثیت کی تعریف اِس طرح کی ہے:

"زنانہ پس منظر میں خواتین کے اتحاد کے ذریعے کسی بھی گروپ کی عورتوں کے حالات کو بہتر بنانے کا نام تحریکِ نسواں یا Feminism ہے، اگر عورتوں کے خلاف صف آرا طاقتوں کو بہتر بنانے میں ہونے والے کام کو دیکھا جائے، تو یقیناً اسے انتہائی کامیابی قرار دیا جائے گا۔"[۶۵]

ضمیر علی بدایونی نسائی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نسائی شعور دراصل مابعد جدید پوسٹ ماڈرن رویوں کی آگہی کا نام ہے، جو ہماری فکر کا مکمل حصہ نہیں بن سکا، کیوں کہ ہماری قدریں روایتی طور پر مردوں کی فکر کے تابع رہی ہیں، ان میں عورت کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے، اب صورتِ حال یہ ہے کہ عورتیں مرد کی حاکمیت اور ان کے تابع رسم و رواج سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اس آئینے میں دیکھ رہی ہیں، جو ان کا اور ان سے متعلق معاشرے کا سچا اور اصل روپ سامنے لا سکے۔"[۶۶]

ڈاکٹر وزیر آغا کا اِس تحریک کے بارے میں کہنا ہے:

"دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحریک نے مختلف شعبوں میں بہ یک وقت اپنی قوت کا اظہار کیا، یعنی سماجی ، سیاسی ، علمی ،ادبی اور دیگر سطحیں اس سے مستفیض ہوئیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں تعلیم کا حصول سب سے بڑا محرک تھا، تعلیم سے مراد صرف تعلیمِ نسواں نہیں، مردوں میں تعلیم حاصل کرنے کا رُجحان بھی ہے، جو بیسویں صدی میں عام ہوا، حتیٰ کہ اس نے تعلیمِ بالغاں کو بھی اہمیت بخشی۔ تعلیم کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک وہ جو لکھنے پڑھنے کے عمل تک محدود ہے، دوسرا وہ جو معلومات کے حصول پر منتج ہوتا ہے اور الیکٹرک میڈیا کے ذریعے ان لوگوں تک بھی پہنچتا ہے، جو لکھنے پڑھنے کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں۔ خواتین نے اس سے بالخصوص فائدہ اُٹھایا۔"[۶۷]

کشور ناہید کے بقول:

"مرد کے rights and rules ساختیاتی معاشی نظام کے باعث ہی زمانے میں نفسانفسی خود غرضی اور ذاتی نفع حاصل کرنے کی یک طرفہ سوچ ہی حاوی رہی ہے۔ کل طاقت بن جانے کا مردانہ تصور، خود انانیت کے کانٹے بوتا رہا اور یہی سوچ تھی کہ جس نے عورت کو زندگی میں برابر کا ساتھی سمجھنے کی مبادیات سے پوری انسانیت کو ناواقف رکھا۔"[۶۸]

ناصر عباس نیّر کے خیال میں:

''تانیثیت محض ادبی متون ہی نہیں ، پوری انسانی تاریخ اور جملہ ثقافتی مظاہر کے مطالعے کا نیا تناظر فراہم کرتی ہے، یہ نیا تناظر دراصل وہ نئے سوالات ہیں، جنھیں حقوقِ نسواں، آزادیٔ نسواں کی تحریکوں اور تانیثی تھیوری نے گزشتہ صدی میں تشکیل دیا ہے۔ گویا، تانیثیت محض ایک ادبی تھیوری نہیں ہے، اُس کی پہنچ اور دائرہ کار، دونوں عورتوں کی آزادی اور حقوق کی سیاسی وسماجی تحریکوں سے شدید طور پر متاثر ہیں۔''۲۹

یورپ میں جنسی انقلاب بپا ہوا اور مغربی عورت کو اولاد پیدا کرنے یا نہ کرنے کے حوالے سے آزادی دی گئی۔ عورت کے مساوی حقوق کی آواز اُٹھانے والوں کا کہنا تھا، چوں کہ خواتین زندگی کے ہر شعبے سے منسلک ہیں، ان سے وابستہ اوہام، انھیں سیاسی وسماجی سطح پر کمزور اور پس ماندہ بناتے ہیں۔ خواتین کے لباس کے حوالے سے بھی آواز اُٹھائی گئی کہ عورت کو بے لباس کر کے مرد نے اپنی تفریح اور عیاشی کا سامان پیدا کیا ہے۔ ماہرین نے مرد وعورت کی غیر مساوی تخصیص اور ان سے روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو تین رُجحانات کا نام دیا ہے، یہ رُجحانات تانیثیت کی تین بنیادی رَوئیں کہلاتے ہیں۔ تانیثیت کی پہلی رَو کا تعلق انیسویں صدی اور ابتدائی بیسویں صدی سے ہے، یہ انقلابی رُجحان لیے ہوئے ہے۔ تانیثیت کی پہلی رَو کی اولین ترجیح خواتین کو ووٹ دینے کا حق یا حقِ خود اِرادیت تھا۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے، تو تانیثیت کی پہلی رَو سرکاری سطح پر ایسے سانچوں کی ترویج پر زور دیتی ہے، جو غیر مساوی قوانین اور اصولوں پر مشتمل ہیں۔ مرد وعورت کی تخصیص اور غیر مساوی طرزِ عمل کی مذمت کرتے ہیں۔

تانیثیت کی دوسری رَو ۱۹۸۰۔۱۹۶۰ تک ہے۔ تانیثیت کی دوسری رَو خواتین کے حوالے سے ثقافتی ، سیاسی اور سماجی سطح پر غیر مساوی رویوں کی مذمت کرتی ہے اور خواتین کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو منظم کر کے مضبوط سانچوں میں ڈھالیں اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا بھر پور اظہار کریں۔ دوسری رَو کے نمائندگان گھریلو تشدد مار پیٹ گالی گلوچ ، زنا بالجبر کی مذمت کرتے ہیں، اس کے علاوہ اس کے تحت شادی شدہ عورت کی زندگی کے مسائل ان پر کیا جانے والا جنسی تشدد، جائے ملازمت پر جنسی طور پر ہراساں کیا جانا، بچے کی نگہداشت کی ذمہ داری کے معاملات پر بحث کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی تعلیم اور ان میں اپنے حقوق سے متعلق آگاہی اور شعور پر زور دیا ہے۔ دوسری رَو نہ صرف سرکاری سطح پر، بلکہ غیر سرکاری سطح پر بھی روا رکھے جانے والے رویوں کی مذمت کرتی ہے۔ خواتین میں خود آگاہی اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے بھر پور استعمال کی طرف مائل کرتی ہے۔

تانیثیت کی تیسری رَو ۱۹۹۰ سے تاحال جاری ہے۔ تانیثیت کی تیسری رَو خواتین کی عالمگیری پہچان کی نمائندہ ہے اور یہ اعلیٰ متوسط طبقے کی خواتین کو موضوع بحث بناتی ہے، اس رَو کا بنیادی نظریہ پس ساختیات کے تحت مرد وعورت کی تخصیص اور جنسی تفاوت کی نشاندہی کرتا ہے۔ تیسری رَو کے اہم ایجنڈے میں عورت کو بچے کی پیدائش کا حق ،عورت کی زندگی ،جسمانی نشوونما ،دیکھ بال، ہر طبقے کی عورت کے حقوق کا حصول، اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے استحصال کی مذمت شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ تیسری رَو کو دوسری رَو کی تدریجی صورت کہا جاتا ہے۔ تیسری رَو خواتین کی آفاقی شناخت پر زور دیتے ہوئے، اُن میں اپنے جائز حقوق کا شعور اُجاگر کرتی ہے۔ ۱۹۶۳ میں ،جب بیٹی فرائیڈن کی کتاب ''دی فیمنیسٹ مسٹیک''منظرِ عام پر آئی، تو میں اس شعور پر کڑی تنقید کی گئی ہے کہ عورت محض بچے پیدا کرنے اور گھریلو کام

کاج کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ بیٹی فرائیڈن نے اس خیال کی بھی مذمت کی ہے کہ عورتوں کی پہچان محض شوہر اور بچوں کی وجہ سے ہے۔ جنگِ عظیم کے انقلاب نے عورت کو گھر اور ذات کے دائرے سے نکال کر فکرِ معاش کی طرف مائل کیا، تو عورتوں نے عملی طور پر معاشی سرگرمیوں میں تیزی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ ادبی سطح پر بھی تانیثیت کی ان رَوؤں نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ماہرین نے تانیثیت کو مختلف اقسام میں منقسم کیا ہے، مثلاً کنٹمپریری فیمینزم، لبرل فیمینزم، ریڈیکل فیمینزم، بلیک فیمینزم، پوسٹ سٹرکچرل فیمینزم، سوشلسٹ اور مارکسی فیمینزم، پوسٹ کولونیل فیمینزم، تھرڈ ورلڈ فیمینزم، ایکوفیمینزم، سیپراٹسٹ فیمینزم، سیکس پازیٹو فیمینزم، انڈیوجولسٹ فیمینزم، پوسٹ ماڈرن فیمینزم، پوسٹ فیمینزم، پرو فیمینزم، اینٹی فیمینزم، ایمازون فیمینزم، چیکانا فیمینزم، کرسٹین فیمینزم، کلچرل فیمینزم، ڈیفرنس فیمینزم، ایکویٹی فیمینزم، جینڈر کمپلیمنٹیرٹی، سوشلسٹ فیمینزم، ایکویلٹی فیمینزم، فیٹ فیمینزم، جیوش فیمینزم، لسبین فیمینزم، نیوفیمینزم، ٹرانس فیمینزم، سوشلسٹ فیمینزم، ویمنزم، اسلامک فیمینزم وغیرہ۔ یہ فیمینزم کے مختلف قسم کے فلسفیانہ رُجحانات ہیں، جن کے مطابق عورت بھی مرد کی طرح انسان ہے، جب کہ عموماً اس تحریک کو مرد مخالفت اور متعصبانہ تحریک قرار دیا ہے۔ فیمینسٹ تھیوری، فیمینزم کی نظریاتی اور فلسفیانہ انداز کی توسیعی شکل ہے، یہ خواتین کے کردار، زندگی کے تجربات، سیاسیات، معاشیات، خواتین کے حوالے سے جینڈر اسٹڈیز، فیمینسٹ ادبی تنقید اور فلسفے کی وضاحت کرتی ہے۔ فیمینسٹ تھیوری قوت اور جنسی برتری کی نفی کرتی ہے، اس نظریے کے مطابق صنفی امتیازات و تفاوت اور سٹیریو ٹائپ رویوں کی مزمت کرتے ہوئے استحصال، کے خلاف ردِعمل ظاہر کیا جاتا ہے۔ لبرل فیمینزم مرد و عورت کے سیاسی اور قانونی برابری پر زور دیتا ہے، ان کے مطابق خواتین کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانے میں بالکل آزاد ہوں۔ لبرل فیمینسٹ میں پیدائش اور ابارشن کے حقوق، جنسی تشدد، ووٹ کا حق، تعلیم، مساوی کام کا مساوی معاوضہ، قابلِ برداشت حد تک بچوں کی تربیت اور صحت کے مسائل ہیں، اس کے علاوہ یہ خواتین پر ہونے والے جنسی اور خانگی تشدد کی بھی وضاحت کرتا ہے۔ ریڈیکل فیمینزم جنسی سطح کے علاوہ خواتین کے ہر قسم کے استحصال کو موضوعِ بحث بناتی ہے، اس کے تحت خواتین صرف اس وقت خود کو آزاد کر سکتی ہیں، اگر وہ نسل در نسل ہونے والے استحصال اور حاکمانہ نظام کو توڑ سکیں۔ ریڈیکل فیمینزم کے تحت مرد کی حاکمیت والے معاشرے اور اس کو قوت و طاقت کا سرچشمہ قرار دینے والے نظام کے نتیجے میں استحصال اور غیر امتیازی رویوں اور تفاوتوں کا باعث قرار دیا ہے اور جب تک یہ درست نہیں ہوگا معاشرے میں ترقی نہیں کر سکے گا۔ ریڈیکل فیمینزم کے تحت اس بات کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ جاگیردارنہ نظام کے نتیجے میں استحصال پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ تر فیمینسٹوں کا کہنا یہ ہے کہ معاشرے کی از سرِ نو تشکیل ہی سے بہتر نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ بلیک فیمینزم جنسیت اور نسلی تفاوت، برتری کو ختم کرنے پر زور دیتا ہے، بلیک فیمنسٹوں کا مئوقف ہے کہ بلیک ویمن کی آزادی دیگر لوگوں کی طرح نسلیت، جنسیت اور طبقاتی استحصال سے ماورا ہونی چاہیے۔ پوسٹ سٹرکچرل فیمینزم مارکسی اور نیو مارکسی نظریات کے تحت تحلیلِ نفسی پر زور دیتے ہوئے مارکسی اور نیو مارکسی نظریات، تعلیم، سیاست اور زبان دانی کی اہمیت تسلیم کرتی ہے۔ سوشلسٹ اور مارکسی فیمینزم یہ اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح عورتوں کو ان کی جائے ملازمت اور گھر میں استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جسم فروشی، گھریلو کام کاج، بچوں کی پرورش اور شادی وغیرہ ہر سطح پر عورت استحصال کا شکار ہے۔ سوشلسٹ فیمینسٹس ہر اُس نظام کو توڑنا چاہتے ہیں، جو عورت کے مقام میں کمی کا باعث

ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ انفرادی کی بجائے اجتماعی سطح پر پورے معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ پوسٹ کولونیل فیمنزم ریڈیکل فیمنزم اور لبرل فیمنزم کے تحت عالمی سطح پر عورتوں کے تجربات اور اُن سے روا رکھے جانے والے سلوک کی نمائندگی کرتی ہے۔ پوسٹ کولونیل فیمنزم مختلف معاشروں پر تہذیبی و ثقافتی اثرات کا مطالعہ کرتی ہے۔ استحصال یا دباؤ پری کولونیل کلچر کا نتیجہ ہے، جس کے تحت طاقت کی تسکین ہی جینڈر کے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مرد و عورت کی تخصیص کے نسل در نسل منتقل ہونے والے مسائل کا مطالعہ کرنا ہے۔

تھرڈ ورلڈ فیمنزم تحریک فیمنسٹوں کے تیار کردہ نظریات کا گروہ ہے، جو تیسری دنیا کی نام نہاد فیمنسٹ سیاست میں پائی جاتی ہے۔ چندرا تلپید کے مطابق تیسری دُنیا کی خواتین یہ محسوس کرتی ہیں کہ مغربی فیمنزم کی بنیاد خواتین کو اندرونی نسلیت، طبقاتی درجہ بندی اور ہوموفوبیا میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ایکو فیمنزم کے مطابق ماحول کا غلبہ انسانوں پر ہوتا ہے۔ مرد عورت کا استحصال محض اپنے فائدے، کامیابی اور خوشی کی خاطر کرتا ہے۔ مرد کی حاکمیت اور غلبے والے معاشرے میں عورت استحصال شدہ اور تباہ حالت میں ہوتی ہے۔ ایکو فیمنسٹوں کا کہنا ہے کہ عورتیں اس پر قابو اس طرح پا سکتی ہیں کہ وہ صحت مند ماحول بنانے کی طرف قدم اُٹھائیں اور زمین کو تباہی و بربادی سے بچانے کی کوشش کریں۔ سپر اسٹ فیمنزم کے ماننے والوں کے خیال میں جنس پرستی یا شہوت پرستی اور کیثر الزوجی، جنسی نا آسودگی کا سبب بنتے ہیں، مرد اس تحریک میں مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سیکس پازیٹو فیمنزم ہر قسم کی جنسی آزادی پر زور دیتا ہے۔ انڈیو جیولسٹ فیمنزم کی بنیاد انفرادیت کے تصورات پر ہے، اس کے ماننے والے جینڈر کی اہمیت کو قانونی سطح پر تسلیم کرتے ہوئے ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت ذاتی جائیداد، قانونی معاونت وغیرہ ہر سطح پر برابری کا حق دار ہے، یہ لوگ عورتوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگیوں کی خود ذمہ دار ہیں، یہ لوگ بالغوں پر گورنمنٹ کی کسی قسم کی اجارہ داری کے خلاف ہیں۔ پوسٹ ماڈرن فیمنزم عورتوں کے سٹیریو ٹائپ کردار کی عکاسی کرتی ہے۔ پوسٹ فیمنزم کے تحت پوسٹ فیمنسٹ ایکٹ جو ۹۰۔۱۹۸۰ تک منظرِ عام پر آیا، اُس کے مطابق فیمنزم آج کے معاشرے سے زیادہ عرصے تک منسلک نہیں رہ سکتی۔ پرو فیمنزم کو فروغ دینے والے مردوں کے اِس گروہ نے، لڑکوں کے تعلیمی اداروں اور جائے ملازمت پر مختلف ورکشاپس منعقد کیں اور کونسلنگ کے ذریعے تعلیمی تحریکیں چلائیں اور گھریلو تشدد اور زنا بالجبر کے خلاف کرائسس سنٹرز بھی کھولے۔ اینٹی فیمنزم تانیثیت کی مخالفت میں چلائی جانے والی تحریک ہے، یہ فیمنسٹ نظریات کو ہدفِ تنقید بناتی ہے، بعض کے خیال میں شادی کا حق قابلِ تنقید ہے، کیوں کہ شادی کے ذریعے عورتوں کو غلام بنا دیا جاتا ہے۔ شادی کے بندھن کو توڑ کر ہی عورت آزاد ہو سکتی ہے اور یوں فیملی سسٹم شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے، ان کے خیال میں اس طرح نشہ آور ادویات کا استعمال جنسی بے راہ روی اور ناجائز اولادوں کا پیدا ہونا، بغیر باپ کے بننے والے گھروں میں زیادہ ہوتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جن بچوں کو باپ کی شفقت اور محبت زیادہ میسر آتی ہے وہ جنسی بے راہ روی کا شکار کم ہوتے ہیں۔

ایمازون فیمنزم یہ عورت کو آرٹ و لٹریچر میں، ناول و افسانے کی ہیروئن کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس کے علاوہ اتھلیٹس، مارشل آرٹس اور دیگر مہارتوں سے عورت کو طاقتور بنا کر پیش کرتے ہیں، یہ بھی مرد کی غالبیت کا ردِ عمل ہے۔ چیکانا فیمنزم لاطینی امریکہ میں عورت کو ادنیٰ سمجھا جاتا تھا، اس کے مطابق عورت باپ، بھائی اور شوہر کی مکمل اجارہ داری بننے کے ساتھ ساتھ بچوں کی دیکھ بال تک محدود تھی، اِن کے خیال میں عورت محض بکاؤ مال نہیں اور مرد کے ہر طرح آزاد

ہونے وجہ سے یہ آواز اُٹھائی گئی۔مزید یہ کہ، مرد کی مادر پدر آزادی اور سیاہ فاموں عورت میں نسل پرستی کی بھی مذمت کی گئی۔کرسٹین فیمنزم میں عیسائیت کے نظریے کے تحت مردوعورت کو اخلاقی ، معاشرتی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی گئی، ان کے خیال میں خدا نے حیاتیاتی لحاظ سے مرد وعورت کی تخصیص روانہیں رکھی۔ کرسچین میرج کے مطابق عورت کو اخلاقی اور صلاحیتوں کے اعتبار سے کمتر وکمزور سمجھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس مکتبِ فکر کے لوگ فیمنزم کی اصطلاح کے خلاف ہیں۔ چرچ میں بھی عورتوں کو نن یا عام شخص کے طور پر محدود کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی عورت پادری نہیں بن سکتی ،ان کے خیال میں عورت اخلاقی لحاظ سے مرد سے کمتر ہے۔ ابارشن کو یہ مردوعورت دونوں کے لیے قابلِ جُرم قرار دیتے ہیں۔ بائبل میں بھی عورتوں کے نمایاں کردار، خواہ شادی ہو یا چرچ اس کی مذمت کی ہے۔کلچرل فیمنزم ان کے مطابق عورت مرد میں بنیادی سطح پر اور نفسیاتی طور پر خاصا فرق پایا جاتا ہے۔خواتین حیاتیاتی سطح پر اور دیگر دوسرے معاملات میں مرد پر فوقیت رکھتی ہیں اور یہ کہ عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ مہربان اور شریف ہوتی ہیں۔ کلچرل فیمنزم درحقیقت مرد وعورت کی تخصیص پر زور دیتا ہے۔خواتین زیادہ امن پسند ہوتی ہیں، کرسٹینا ہووف سومرز نے اپنی کتاب ''ہُوسٹول فیمنزم'' میں بیان کیا ہے کہ فیمنزم نوجوان نسل کو بگاڑ رہی ہے، یہ دراصل لڑکوں کے خلاف اُکسانے کی مہم ہے،یہ رُجحان خواتین کے استحصال ، چائلڈ کسٹڈی، جنسی طور پر ہراساں کیا جانا، طلاق کے مسائل اور تنخواہ کے مسائل وغیرہ پر بحث کرنے کے علاوہ سیاسی ، قانونی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں جینڈر کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے۔ڈیفرنس فیمنزم بنیادی ، حیاتیاتی، جذباتی، سائیکولوجیکل یا روحانیت کے فرق کو دونوں جنسوں میں روا رکھتی ہے۔جینڈر کمپلیمنٹیریٹی مردوعورت ایک دوسرے کی تکمیل ہیں کے نظریے کے قائل ہیں۔ایکویٹی فیمنزم اس کا مقصد سول اور قانونی طور پر جینڈر فیمنزم سے فرق کرتا ہے،یہ سیاست اور تعلیم کو اہم قرار دیتے ہیں۔ ایکویلٹی فیمنزم اس کے ماننے والوں کے خیال میں مردوعورت دونوں ہی برابر ہیں ، اگرچہ حیاتیاتی اور ساختیاتی سطح پر مختلف ہیں۔موروثی طور پر نر اور مادہ، ماں اور باپ دونوں سے ہی خصائص پاتے ہیں، اس لیے دونوں نیوٹرل اور برابر ہیں۔فیٹ فیمنزم زیادہ وزن رکھنے والی عورتیں معاشی طور پر، تعلیمی اور سماجی سطح پر نقصان اُٹھاتی ہیں، یہی وجہ ہے یہ فیمنزم عورتوں کے سائز و وزن کی مخالفت کرتا ہے۔ جتنی ماڈلز دکھائی جا رہی ہیں وہ صحت کے لحاظ سے خطرے سے دوچار ہوتی ہیں۔ایک عام عورت اس وزن وساخت سے اپنی روزمرہ کی زندگی کی ضروریات پوری نہیں کرسکتی جس کی وجہ سے بہت سے مسائل حتیٰ کہ موت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ جیوش فیمنزم تحریک مجوسیت کی قائم کردہ مذہبی ، قانونی، سماجی اصولوں پر عورتوں کے لیے معیارِ زندگی قائم کرتی ہے، اس کا آغاز ۱۹۷۰ء میں ہوا،یہ عورتوں سے گواہی اور طلاق کا حق چھین لینے پر زور دیتے ہیں، ان کے ہاں مردوعورت کی برابری کی کوئی گنجائش نہیں۔لسبّین فیمنزم ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۰ اوائل تک جنوبی امریکہ اور مغربی یورپ میں بڑی مقبول ہوئی اس کے ماننے والوں نے ہم جنس پرستی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اُسے قانونی حیثیت دینے پر زور دیا۔ نیوفیمنزم کے تحت مردوعورت دونوں کو ایک دوسرے پر فوقیت نہیں ، بلکہ دونوں برابر ہیں۔ یہ برابری کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ان کی عظمت کے قائل ہیں،ان کے خیال میں خواتین کو بھی مردوں کے برابر روزگار کے مواقع ملنے چاہئیں۔ٹرانس فیمنزم اس کا مرکزی خیال فیمنزم کی تیسری رَو ہی ہے،ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کو مساوی حق ملنے چاہیں۔جینڈر کو یہ بھی محض عورت کو دبانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وِیمنزم خصوصاً جنسی استحصال کو اس تحریک نے موضوع بنایا ہے۔ یہ تحریک زیادہ تر سفید پوش مڈل کلاس عورتوں کی زندگی کے مسائل اور استحصال سے

متعلق ہے۔ سوشلسٹ فیمینزم پبلک اور پرائیوٹ حلقوں میں خواتین کی زندگی اور آزادی کو موضوع بحث بناتے ہیں اور معاشرتی و معاشی اور ثقافتی سطح پر ان کے استحصال کی مذمت کرتے ہیں۔ اسلامک فیمینزم کے تحت مغربی تانیثی رُجحان کی مذمت کی گئی ہے۔ اسلامی اقدار کی روشنی میں اسلامک فیمینزم کے کردار کو اُجاگر کیا گیا، اس کے ماننے والوں نے قرآن حدیث اور شریعت کی روشنی میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔

چوں کہ تانیثیت خواتین کے حقوق کے حصول کے لیے چلائی جانے والی تحریک ہے، جس کا کام نہ صرف حقوق کا حصول ہے، بلکہ خواتین کے ہاں شعور و آگاہی پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنی ذات سے مخلص ہوں۔ اپنے حقوق و فرائض کو سمجھیں، ان کی زندگی محض فرائض ہی پر منتج نہیں، بلکہ بہ حیثیتِ انسان اس کے کچھ حقوق بھی متعین کیے گئے ہیں۔ مرد و عورت دونوں ہی زندگی کی اساس ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی تکمیل ہیں اور برابر بھی ہیں۔ ہندوستان میں ادبی سطح پر بھی تانیثی طرزِ اظہار کو مردوں خصوصاً عورتوں نے دانستہ اپنایا اور اظہار کی قوتوں کو ڈھال بناتے ہوئے اپنا کتھارسیس کیا اور جہاد بالقلم کے مصداق ذاتی احساسات و تجربات کو پیش کرنے کے علاوہ اجتماعی جمود میں شعور کے گوہر پھینکے، جن کی ارتعاش کا دائرہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ''عصمت'' اور'' تہذیبِ نسواں'' ان کی تحریروں کے نمائندہ رسائل بن گئے۔ علامہ راشد الخیری کی رُجحان ساز شخصیت نے آگہی کے نئے دَر وا کیے۔ خواتین نے مضامین، کہانیوں، چٹکلوں اور شاعری کے ذریعے عورتوں کو اُن کے حقوق سے آگہی دِلوانے کی کاوش شروع کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید رنگارنگی پیدا ہونے لگی:

> ''یہ اصطلاح ایلین شولٹر نے متعارف کرائی، اس کے تحت خواتین کی تحریروں مثلاً ناول شاعری، مضامین، خطوط و رسائل وغیرہ شامل ہیں، باالفاظ دیگر تانیثی تنقید خواتین کے تصورات، زبان اور تجربات کے ادبی مطالعے کا نام ہے، یعنی اس میں تحریر کے در پردہ، خواتین کا تنقیدی و تانیثی شعور تلاش کیا جاتا ہے۔''[۷۰]

عابدہ سمیع الدین تانیثیت کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''تانیثی شعور سے ہماری مراد، مرد کی حاکمیت والے معاشرے جس میں تمام اقدار مردوں کے قائم کردہ ہیں۔ اس سے آگاہی ہے، تاہم موجودہ دَور میں خواتین نے اقدار پر مردوں کی غالبیت کے خلاف آواز اُٹھائی ہے، یعنی ان کا کہنا ہے کہ عورتیں بھی اسی طرح آزاد ہیں، جس طرح مرد اور یہ نیا ثقافتی رُجحان خواتین میں فلسفیانہ سطح پر تبدیلی پیدا کر رہا ہے۔''[۷۱]

تانیثیت کے حوالے سے ضمیر علی بدایونی کا کہنا ہے:

> ''تانیثی شعور موجودہ دَور کا غالب رُجحان ہے، اِس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی سطح پر انفرادیت کا حامل یہ رُجحان اَب باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ تانیثی مکتبِ فکر سے وابستہ مصنفین کے لیے یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے، جو مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں حقوقِ نسواں کے حوالے سے شعور و آگہی اور بیداری کا سبب بنتا

ہے۔ تانیثی شعور سے ہماری مُراد مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں آگاہی کا سفر ہے جہاں تمام حاکمانہ اقدار و رویات کی نفی کی جاتی ہے۔ موجودہ دَور میں خواتین نے اِن رویوں کی مخالفت کی ہے، جو اُن کی انفرادیت اور خود مختاری کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، وہ ایک ایسے ثقافتی رُجحان کی تشکیل چاہتی ہیں، جو بلا تخصیص مرد و عورت کے مساوی حقوق کا متقاضی ہو۔'' ۲ے

تانیثی مفکرین و ناقدین کو عموماً دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اینگلو امریکن مفکرین، جن کے مطابق خواتین تخلیقات اور اقدار کی ترویج میں برابر کی حصہ دار ہیں۔ دوسرے فرانسیسی تانیثیت پسندوں کی روایت کے مطابق خواتین کی تحریروں اور اندازِ فکر میں عموماً مسلمہ روایات کے خلاف بغاوت پائی جاتی ہے، ان کے خیال میں تحریر ایک خود مختار ذہنی سرگرمی ہوتی ہے، عموماً مرد و عورت تربیت اور ذہنی نشو و نما میں بڑا تفاوت برتا جاتا ہے، جس کی وجہ دونوں کی سوچ کا انداز، زندگی کے حالات و واقعات کو سمجھنے اور ان کے اظہار کی صلاحیت دونوں میں مختلف ہوتی ہے، اس کی بنیادی وجہ تخمتال اور اوہام ہیں، جو ایک دوسرے سے منسوب کر دیے جاتے ہیں۔ وقت کے بدلتے ہوئے تناظرات، علم کی روشنی میں بہت بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ مرد کا کام صرف کمانا اور عورت کا گھر داری، معاشی مسائل کی آماجگاہ تھا۔ اب تعلیم جہاں دل و دماغ کو منور کر دیتی ہے، خواتین نے دستِ نگر ہو کر استحصال کے بدترین صورتوں کو گوارہ کرنے جیسی ناگزیر صورتحال پر قابو پانے کی کاوشیں شروع کر دیں ہیں اور بیشتر لڑکیاں اور خواتین زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر محض گھر داری میں وقت گزارنے کی بجائے مختلف اِداروں میں نوکریاں کر رہی ہیں، لیکن ساتھ ساتھ معاشی طور پر ہاتھ بٹانے اور خود مختار ہونے کی قیمت بھی اسے چکانا پڑ رہی ہے۔ اب شادی بیاہ کے معاملات میں جہیز کی اہمیت بڑھ گئی ہے کہ لڑکی کتنا کماتی ہے، اس کی نوکری پکی ہے یا کچی، اس کے برعکس مردوں نے اپنی غیرت وحمیت اور کمائی، جو اُس کا حُسن شمار ہوتی ہیں، اسے سستی و کاہلی اور آرام طلبی کی نذر کر دی ہے۔ گھر کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے کنبے کی کفالت اور بیوی بچوں کے نان و نفقہ کی تمام ذمہ داری اسلامی تعلیمات کے مطابق اس کے سپرد ہے، لیکن مردوں نے عورتوں کو زندگی کا ساتھی، مونس و غم خوار سمجھنے کی بجائے اُسے دبانا اپنا حق سمجھا ہے، جب کہ سمجھ دار مرد بیوی سے اعتماد اور دوستی کی فضا برقرار رکھتا ہے۔ یوں گاڑی کے دو پہیے مخالف سمت میں چلنے کی بجائے ایک ہی سمت میں رواں دواں ہوتے ہیں اور زندگی کی منازل شاداں و فرحاں طے کیے جاتے ہیں۔ گھریلو تشدد، مرد کے غاصبانہ اور ظالمانہ رویے اپنی تمام تر بدصورتیوں سمیت شعرا و ادبا کی تحریروں میں کچھ خارج تھے۔ خواتین لکھاریوں نے انھیں بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ حقائق خواہ تلخ ہوں یا خوش کن ان کا منظرِ عام پر آنا، مسائل کے حل کی طرف پہلا قدم ثابت ہوتا ہے۔ ایک تانیثی ناقد یا تانیثی تخلیق کار اپنی تحریروں میں واضح یا درپردہ انھیں پہلوؤں کو اُجاگر کرے گا، جن کا تعلق تانیثیت سے ہوگا، کیوں کہ مسائل کے بیان کرنے سے حقائق منظرِ عام پر آنے کے علاوہ پڑھنے سننے والوں میں آگاہی پیدا ہوتی ہے۔ ان تحریروں کے تنقیدی جائزے کو گائنو کریٹی سِزم کا نام دیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گائنو کریٹی سِزم کیا ہے؟ ضمیر علی بدایونی اپنے انگریزی مضمون میں لکھتے ہیں۔ اسے تانیثی تحریک کا لب لباب بھی کہ جا سکتا ہے:

''نسائی شعور دراصل مابعد جدید پوسٹ ماڈرن رویوں کے آگہی کا نام ہے، جو ہماری فکر کا

مکمل حصہ نہیں بن سکا، کیوں کہ ہماری قدریں روایتی طور پر مردوں کی فکر کے تابع رہی ہیں، ان میں عورت کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ عورتیں مرد کی حاکمیت اور ان کے تابع رسم و رواج سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اس آئینے میں دیکھ رہی ہیں، جو ان کا اور ان سے متعلق معاشرے کا سچا اور اصلی روپ سامنے لا سکے۔"۳ے

عورت کی ادبی حیثیت کے حوالے سے کشور ناہید کا کہنا ہے:

"نصیحت آموز آدب کا زمانہ ختم ہوا تو عورت نے لحاف کے باہر اور اندر کی داستان لکھنی شروع کی۔ انسان ہونے کی کوشش میں حائل عذابوں کو شعر اور کہانی میں تحلیل کیا۔ برصغیر میں تو ۱۹۳۰ سے ادب میں تبدیلی اور معاشرے کو اس ڈھنگ سے دیکھنے کا مرحلہ شامل تھا، جہاں مرد کے علاوہ دُنیا میں عورت کے وہ محسوسات تھے، جنھیں رومانوی اور اخلاقی ادب نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا، البتہ مغرب میں دہلیز پار کرنے کی داستاں سیمون دی بوروا کی The Second Sex پر بحث سے شروع ہوئی، یہ کتاب تھی، جس کے بیانیے کو سارتر نے بھی ناپسند کیا تھا۔ برصغیر میں ۶۰ کی دہائی میں لسانی تشکیلات ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ کے ساتھ کافکا کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے نقادوں اور عصری تخلیق کاروں نے دیکھا کہ لکھنے والیاں نہ صرف عددی طور پر زیادہ ہیں، بلکہ نئی نہج کو سر بلند کیے اس بات پر مُصر ہیں کہ ان خواتین کی تحریروں میں زنانہ پن تلاش کرنا بند کرو۔"۴ے

افتخار عارف کے خیال میں عورت نے مظلومی اور محرومی کی فضاؤں سے شعور و آگہی اور اختیار و اعتبار کا سفر بڑی جدو جہد سے کیا ہے: "پاکستان میں گزشتہ پچاس پچپن برسوں میں ہماری خواتین نے اپنے حق کے لیے اور من حیث القوم بنیادی انسانی حقوق کے لیے بہت مختلف اور بہت کام کیا ہے مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔"۵ے

مندرجہ بالا مباحث سے عمومی تاثر یہ اُبھرتا ہے کہ تحریکِ آزادیٔ نسواں شاید مردانہ مخاصمت یا مرد دشمنی کے نعروں سے لبریز ہے۔ ایسے فیمینسٹوں کی بھی کمی نہیں، جن کا انداز واقعتاً جارحانہ ہے۔ بات حقوق کی بازیابی کی ہے، چوں کہ اللہ تعالیٰ نے حقوق و فرائض کی ادائیگی پر زور دیا ہے اور مرد و عورت دونوں کو بہ حیثیتِ انسان اس خطۂ زمین پر اُتارا ہے، ان دونوں میں سے کوئی بھی حاکم نہیں اور نہ کوئی محکوم۔ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب دونوں ہی کو خمیازہ بھگتنا ہے۔ معاشرہ، چوں کہ مرد کی غالبیت کو فوقیت دیتا ہے۔ اصل بات خواتین ہی پر لاگو ہوتی ہے، جن کی آغوش میں زندگی خواہ مرد ہو یا عورت پروان چڑھتے ہیں۔ عورت اگر بیٹے اور بیٹی کی تفریق نہ کرے اور دونوں بچوں کی تربیت مثبت انداز میں کرے، جس میں کسی کو بھی دوسرے پر فوقیت اور غلبہ حاصل نہ ہو، بلکہ ایک دوسرے کی عزت اور احترام پر زور دیا جائے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک صحت مند معاشرے کی شروعات ہو جائیں گی۔ یہیں سے ایک سوال اور بھی ذہنوں میں اُبھرتا ہے کہ کیا صرف عورتوں کی لکھی ہوئی تحریریں ہی تانیثیت کے زمرے میں آئیں گی یا مردوں کے لکھے ہوئے فن پاروں کو بھی اہمیت حاصل ہو گی؟ اِس کا مؤثر جواب یہی ہے کہ، جس میں تانیثی رُجحان

نمایاں ہواور تانیثی شعور و آگہی کا غماز ہو، وہی اہمیت اختیار کر جائے گا، اِس میں مرد وعورت کی تخصیص نہیں۔
این سٹیونیسن تخلیقی سفر میں قلم کار عورتوں کے مسائل اور مشکلات کے بارے میں لکھتی ہیں:

''ہزاروں ہی تعلیم یافتہ عورتیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کی مائیں بنتے ہوئے ارتقا پذیر شوہروں کے ساتھ ایسے ہی ڈپریشن کا سامنا کرتی ہوں گی۔ وہی احساسِ ناکامی بریک ڈاؤن شاید ایملی ڈکنسن کے باپ نے ایملی سے سچ ہی کہا تھا کہ کتابیں ذہین کو پراگندہ کر دیتی ہیں، مگر میں اب بھی سوچتی ہوں کہ میرا ڈپریشن کس حد تک ایک شادی شدہ عورت کی حیثیت سے میری نا مطمئن کیفیت اور کس حد تک ایک ناسازگار ماحول میں لکھ نہ سکنے کی وجہ سے تھا۔۔۔اس دُنیا میں ایک عورت اور لکھاری کی حیثیت سے، جو مفادات حاصل ہیں وہی دراصل اس کا مسئلہ ہیں، وہ اردگرد کے لوگوں میں سب سے زیادہ ناقص ہیں سو وہ اپنی زندگی میں بہت جلد ہی یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ بہتر ہے کہ وہ ایسی کوئی کوشش ہی نہ کرے۔اپنے خطوط میں وہ ایسی صورتحال کا تمسخر اُڑاتی ہے، جسے اصل زندگی میں بدلنا وہ کبھی برداشت نہ کرتی۔''۷۶

ڈاکٹر وزیر آغا کا مؤقف ہے:

''تانیثیت کی تحریک کے تحت عورت ہزار مرد کی تقلید کرے اور اس کے ہم پلہ ہونے کے لیے مرد عام خصائص کو اپنانے کی کوشش کرے۔ بنیادی طور پر اس کی پہچان وہ نسوانیت ہے، جس میں لچک، خم، سرگوشی، اپنائیت اور محبت کے دیرپا زاویے کومل انداز میں، باہم آمیز ہوتے دکھائی دیتے اور یہ ایک ایسا ورثہ ہے جو اسے ہزاروں نسلوں کے نسائی تجربات سے حاصل ہوا ہے اور جو آخری دم تک اس کا ساتھ دے گا۔ دوسری طرف مرد کے ہاں مہم جوئی اور آوارہ خرامی کا رُجحان ہمیشہ فعال رہا ہے۔ وہ فطری طور پر ایک بے حد بے قرار ہوتا ہے۔ نئے نئے بہانوں کی تسخیر کے رویے کے خلاف جو بغاوت کی ہے وہ تانیثیت کی تحریک کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔آگے چل کر جب یہ تحریک پوری طرح کامیاب ہو جائے گی، تو اس کا مطلب ہوگا کہ مرد کے ہاں تسخیر کرنے کی خُو ختم ہو جائے گی۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ وہ عورت کو ہدف بنانے کے بجائے دیگر اہداف کی طرف زیادہ متوجہ ہوگا اور اپنی فعالیت کو ایک مثبت قدر کے طور پر اسی طرح برقرار رکھے گا، جس طرح عورت نے نسوانیت کی مثبت قدر کو برقرار رکھا ہے۔''۷۷

قلم کار عورتوں کے استحصال کے متعلق راضیہ شمشیر کا کہنا ہے :

''لکھاری عورت کی نصف ذات کی نفی ہو جاتی ہے، چوں کہ یہ عورت محض جسمی نہیں ہوتی، ذہنی Brainy بھی ہوتی ہے۔لہٰذا، محض جسم کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتی۔ کل وقتی عورت نہیں بن سکتی۔ وہ فکری سطح پر بھی مضبوطی سے قدم جما کر جینا چاہتی ہے

اور جب فکری سطح پر اسے شرفِ قبولیت نہیں ملتا، سماج اُس سے محض جسمانی سطح پر جینے کا تقاضا کرتا ہے، اسے محض جنس کا سمبل Symbol یا بار بی ڈول Barbi Doll سمجھنے پر مصر رہتا ہے تو لکھاری عورت کی انا بری طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ بطور ردِعمل وہ منکسر مزاج اور سادیت پسند بن جاتی ہے اور خود اپنے آپ سے انتقام لیتی ہے۔ وہ یوں کہ اپنی قدرتی تخلیقی صلاحیت پر پہرے بٹھا دیتی ہے اور ایک تخلیقی صلاحیت کی قربانی کے عوض، دوسری تخلیقی صلاحیت کے لیے آزادی حاصل کرتی ہے۔ وہ رشتوں ناتوں سے قطع تعلق کر کے اطلاعت گزار مشرقی بیوی اور خدمت گزار ماں بننے سے انکاری ہو جاتی ہے اور اپنی قلمی توانائی کے ساتھ تنہائی کے جزیرے پر عمر کے قیمتی ماہ و سال گزار دیتی ہے۔ پھر وہ انتقاماً سچ بولتی ہے، پورا سچ ۔۔۔ کڑوا کسیلا اور اس کا سچ وہ آئینہ بن جاتا ہے، جس میں سماج کا گھناؤنا چہرہ اپنے بگڑے ہوئے خدوخال کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ تہذیب اور شرافت کا نقاب اُتر جاتا ہے۔" ۸؎

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تانیثیت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جہاں عورت کے سچے احساسات و جذبات اس کی خانگی زندگی میں اس کی نفسیائی اُلجھنیں سماجی مسائل کا پتہ چلتا ہے، ان کے حقوق کے بارے میں آگاہی ہوئی ہے۔ تحریر خواہ مرد کی ہو یا عورت کی، اگر ان میں تانیثی شعور کی جھلک نمایاں ہوگی، تانیثیت کے زمرے میں آئیں گی۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مرد کے بے جا تسخیر کرنے کے منفی جذبات مثبت صورت اختیار کریں گے۔ مرد و عورت ایک دوسرے کو زندگی کا ساتھی سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کی عزتِ نفس ذات کے تشخص کو دبانے کی بجائے اُبھاریں گے اور اس سے ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے گا۔ عورت کو بیگار سمجھنے والے اسے بھی انسان سمجھنا شروع کر دیں گے۔ اس سلسلے میں ادبا اور میڈیا کے علاوہ درسگاہیں اساتذہ اور والدین کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں تب ہی آنے والی نسلیں اچھے اور خوش کن ماحول میں پروان چڑھ سکیں گی: "حقوقِ نسواں کی تحریک کا آرٹ حقیقی آرٹ کے رواں دواں دریا کے ساتھ ساتھ بہنے والی چھوٹی سی معاون ندی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک بے نقص پتھر میں آئی ہوئی دراڑ ہے۔ میرے خیال میں یہ تو پر شوکت آرٹ ہے، جس کی بنیاد نسلِ انسانی کی اکیاون فیصد آبادی کی جنسی تابعداری پر نہیں اُٹھائی گئی، یہی وہ آرٹ ہے، جو محبت، موت، بربادی، دُکھ درد اور تاریخ کے موضوعات کی بنیاد پر تخلیق ہوگا اور کلی طور پر انسانی ہوگا۔۔۔ ہم ایسی دُنیا کا تصور کرتی ہیں، جس میں عورتیں حقیر گالی گلوچ کا نشانہ، استحصال کا شکار، زیادتی کا ہدف اور پیدا ہونے سے پہلے ہی زحمت نہ قرار دی جائیں۔" ۹؎

آئندہ ابواب میں پاکستانی اُردو ادب پر تانیثیت کے اثرات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا، تاکہ اُن قلمکاروں کی تخلیقات منظرِ عام پر لائی جا سکیں، جن میں تانیثی شعور کا احساس نمایاں ہو، کیونکہ ادب ہی زندگی کا آئینہ وعکاس ہے۔ یہ کسی بھی تحریک یا رُجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی کی مثبت قدروں کی آبیاری کرنا ایک ادیب کے قلم کی حُرمت کی متقاضی ہے۔ تانیثی تنقید کے ذریعے خواتین کے تصورات، زبان اور تجربات کا ادبی مطالعہ کے علاوہ مرد کے قائم کردہ حاکمانہ معاشرے کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، یہ نیا ثقافتی رُجحان، خواتین میں سماجی، فلسفیانہ سطح پر تبدیلی کا باعث ہے۔ کشور ناہید کے بقول:

"چوں کہ غیر مغربیت زدہ مذہب آراستہ گروہوں کی جانب سے مخلوطیت کے خلاف

محاذ نکلا ہے، تو پھر یہ بھی مطالبہ آنا چاہیے کہ عورتوں کی الگ اسمبلی ہو، جس میں زچہ گیری سے لے کر ساس بہو کے سارے مقدمے، برقعے کے فوائد و تاریخ پر بحث شامل ہو، مگر جلائے جانے، حدود آرڈیننس کے تحت زبردستی جیل بھجوانے، کاروکاری، قرآن سے لڑکیوں کی شادی اور غیرت کے نام پر قتل کے علاوہ جہیز کی لعنت اور شادیوں کے موقع پر بے جا اسراف کے بارے میں کوئی گفتگو نہ ہو۔''۸۰

مردانہ حاکمیت والے معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ عورت کا جائز مقام متعین کیا جائے۔ اِس حوالے سے نصیر الدین بٹ کا کہنا ہے: ''جب دُنیا کے تمام ملکوں میں سوشل لائف کے اختیار کر کے عورتیں مردوں کی برابری کی بنیاد پر اپنے اپنے ملکوں میں معاشی، سیاسی، سماجی اور تمام معاشرتی شعبوں میں اپنا ۵۰٪ حصہ حاصل کر لیں گی، تو پھر تمام ملکوں میں عورتوں اور مردوں سے ہر سماج میں برابری کی بنیاد پر سلوک ہو گا۔ عورتیں اور مرد دونوں معاشی اور سیاسی میدانوں میں برابر برابر حصہ حاصل کر لیں گے، تو معاشرے میں عورتوں اور مردوں کو مساوی احترام اور عزت ملے گی وہ دونوں ایک اخلاقی معیار پر ماپے جائیں گے، اُنھیں ایک جیسا احترام اور سلوک ملے گا، پھر بین الاقوامی سطح پر زندگی کے تمام شعبوں میں مساوی سلوک اور احترام کی وجہ سے برابری کی بیناد پر اہم ذمہ داریاں عورتوں کو بھی ۵۰٪ کی بنیاد پر ملیں گی، جس کے نتیجہ میں ترقی یافتہ ممالک کے بین الاقوامی سطح پر سلامتی کونسل میں بیٹھے حکمران مردوں کی بجائے پھر ۵۰٪ سے زیادہ عورتیں بھی وہاں موجود ہوں گی، جس کے نتیجہ میں یہ مردانہ آمریتی ادارہ دُنیا میں پھر انسانی تحفظ کا ادارہ ہو گا۔ پسماندہ ممالک کے معصوم مفلس غریب اور تنگ دست عوام اور اُن کے بچے بھی اِنھی ترقی یافتہ ممالک کے بچوں جیسے ہی ہوں گے اور وہ اِن اداروں میں انسانوں کی پرورش تعلیم، صحت اور آرام و سکون والی ضرورتوں کو پورا کرنے پر زور دیں گے۔''۸۱ عورت کے حوالے سے مذکورہ بالا مباحث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر عورت کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کیا جائے، اس کے حقوق کی پاسداری کی جائے، اس کی ذات و تشخص کو مجروح نہ کیا جائے، تو کوئی شک نہیں کہ مرد کی رفیقۂ حیات اس کی بہترین دوست و ساتھی اور معاون ثابت ہو گی۔

حوالہ جات:

۱۔نازیہ بٹ، رع عورت م مرد مترجمہ، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۴، ص ۲۰
۲۔کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۴۲
۳۔حفیظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محمد، قصص القرآن، جلد اول و دوم، لاہور: مکتبہ رحمانیہ، س ن، ص ۴۵
۴۔سعداللہ جان برق، حوّا کی بیٹیاں۔یونا اور اقلیما مشمولہ دخترِ کائنات، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۱۰۲۔۱۰۳
۵۔عبدالرحمٰن خان، ایم، عورت انسانیت کے آئینے میں، لاہور: شیخ اکیڈمی، ۱۹۷۴، ص ۲۸
۶۔ایضاً، ص ۲۸
۷۔عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، اسلام میں خواتین کے حقوق۔جدید یا فرسودہ، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۶، ص ۳

8 : Biologically, women and men are of course not the same. But these differences do not mean that women and men are not of equal value. In the eyes of Allah Muslim women and men are equal participants in all aspects of Islamic life. In several verses in Qur'an (9:71, 4:124, 3.195, 16:97), Allah specifically addresses both women and men, giving them equal roles and responsibilities in spirtual life and in the Islamic struggle and equal rewards and punishment for their actions.(Kishwar Naheed, Women Myth & Realities,Lahore, Sang-e-meel publications,2008,Page:190)

۹۔مجیب، محمد، دُنیا کی تاریخ، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۵، ص ۱۷
۱۰۔مبارک علی، ڈاکٹر: تاریخ اور عورت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۵، ص ۲۱
۱۱۔شمیم مختار، کیا عورت آدھی ہے، لاہور: شاہد پبلی کیشنز، س ن، ص ۵۰
۱۲۔ایضاً، ص ۲۶۔۳۰
۱۳۔ایضاً، ص ۲۶۔۳۰
۱۴۔عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، کیا حجاب عورت کا استحصال نہیں مشمولہ روزنامہ جناح، ۱۲ مارچ ۲۰۰۷، ص ۱
۱۵۔پرویز اختر، خالد ارمان، سیفو، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۳، ص ۹
۱۶۔ابن حنیف، دُنیا کا قدیم ترین ادب، جلد دوم، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۸، ص ۱۹۱
۱۷۔ایضاً، ص ۱۷۵
۱۸۔عبدالکریم ذاکر نائیک، ڈاکٹر، کیا حجاب عورت کا استحصال نہیں، ص ۱

19 : Oneday, Pandora's curiosity got the better of her and she opened the box which Zeus had warned not to open . Out of that box came innumerable"curses" sent by Zeus. Before she could close the box, out came pain , illness, conflict , and anxiety. Once out, they could never be put back into the box. The one thing left in Pandora's box was " hope." But it was too late to

put back the curses that emerged from the box and from then on humans were fated to live with these curses that brought untold suffering . (The Principle of Hope: Keiko Takahashi. Samoh Publishing Co., Ltd. Tokyo , Prologe (xi)

۲۰۔عبدالکریم ذاکر نائیک ،ڈاکٹر،کیا حجاب عورت کا استحصال نہیں ،ص ۱

۲۱۔ایضاً

۲۲۔شفقت مرزا،مسعود اشعر،عورت کے خلاف جنگ ہر محاذ پر مترجمہ مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک مرتبہ کشور ناہید،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص ۹۔۱۰

۲۳۔مبارک علی ،ڈاکٹر،تاریخ اور عورت ،لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۵،ص ۷۱

۲۴۔ایضاً،ص ۱۱۳۔۱۱۴

۲۵۔ایضاً،ص ۴۷

۲۶۔ایضاً،ص ۸۔۹

۲۷۔ایضاً،ص ۹۔۱۷

۲۸۔ایضاً،ص ۱۸۔۱۹

۲۹۔سعد اللہ جان برق،انوکھا لاڈلا مشمولہ دخترِ کائنات،ص ۲۴

۳۰۔رشید احمد،تاریخ مذاہب،کوئٹہ:زُمرد پبلی کیشنز،بار دوئم،۲۰۰۰،ص ۳۲

۳۱۔ایضاً،ص ۱۷۷

۳۲۔رما شنکر یا تھی،تاریخ قدیم ہندوستان،کراچی:سٹی بک پوائنٹ،ایڈیشن سوئم،۲۰۰۶،ص ۴۷

۳۳۔ضیاالدین،پروفیسر،ڈاکٹر،حافظ،سید،عورت۔قبل از اسلام اور بعد از اسلام،کراچی:النور ہیلتھ ایجوکیشن ٹرسٹ،۲۰۰۶،ص ۶۵۔۳۱

۳۴۔عابدہ علی،پروفیسر،ڈاکٹر،عورت قرآن وسُنت اور تاریخ کے آئینے میں،قرآن منزل،لاہور:س ن،ص ۳۵

۳۵۔ضیاالدین،پروفیسر،ڈاکٹر،حافظ،سید،عورت۔قبل از اسلام اور بعد از اسلام،ص ۴۴۔۵۰

۳۰۔ایضاً،ص ۵۶۔۳۱

36 : While Hebrew women were forbidden to wear the same form of clothing as men (Deuteronomy 22:5), female clothing yet carried a somewhat basic pattern to that worn by men...Women of moderate circumstances were abled to produce beautiful garments, "the fruit of her own hands" (Proverbs 31:19). Many articles of female clothing are mentioned in the Bible, some of which cannot be exactly identified.(36-Herbert Lockyer, All the women of the Bible(4th addition), India, Zondervan publishing house, 2005,P:18)

۳۷۔ضیاالدین،سید حافظ،پروفیسر،ڈاکٹر،عورت(قبل از اسلام اور بعد از اسلام)،ص ۵۷

۳۸۔ عابدہ علی، پروفیسر، ڈاکٹر، عورت قرآن وسُنت اور تاریخ کے آئینے میں، لاہور: قرآن منزل، س ن، ص ۳۷
۳۹۔ ضیاالدین، پروفیسر، ڈاکٹر، حافظ، سید، عورت۔ قبل از اسلام اور بعد از اسلام، ص ۶۱۔۶۳

40 : Women had high rank in early states, but only as they were related by blood or marriage to the male ruling class, and usually as men's subordinates. All early states decreed in law that women's bodies--- their sexuality and reproductive capacity --- were men's property and made it difficult or impossible for women to own or transfer property. (Kishwar Naheed, Women Myth & Realities,Lahore, Sang-e-meel publications,2008,Page:16)

۴۱۔ حمیر ہاشمی، عورت اور نفسیات مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، ص ۲۹۷
۴۲۔ ایضاً، ص ۳۰۸۔۳۰۹
۴۳۔ ایضاً، ص ۳۱۰
۴۴۔ ایضاً، ص ۳۱۲
۴۵۔ ایضاً، ص ۳۱۴
۴۶۔ ابوالکلام آزاد، مولانا، مقدمہ مشمولہ مسلمان عورت، لاہور: مکتبۂ جمال، ۲۰۰۶، ص ۱۶
۴۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۱۷۹۔۱۸۰
۴۸۔ ارشاد احمد پنجابی، پنجاب کی عورت۔ حیات وثقافت، لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، ۱۹۷۶، ص ۳۰۹۔۳۵۱
۴۹۔ رابعہ الرُبا، عورت۔ مصائب، وجوہات، نفسیات، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۲۸
۵۰۔ صبیحہ حفیظ، ڈاکٹر، لوریاں، لوک رسوم اور سماجی تفریق مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، ص ۲۲۴
۵۱۔ ایضاً، ص ۲۲۹
۵۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تانیثیت مشمولہ ماہنامہ کاغذی پیرہن، لاہور: مارچ، اپریل، ۲۰۰۷، ص ۹

53 : In the lower classed, women are less secluded but lead a life of continuous drudgery in which no control over the fruit of their own sweat is accorded to them, Their economic dependence is almost absolute and the men are the virtual masters of their brawn and brain; men are often referred as gods-on-earth (majazi Khuda, literally shadow gods) for their wives. (Rashid Mahmood,Langrial, Story of the fair sex socioeconomic conditions of women through time, Lahore, Takhleeqat, 1995, P:161.162)

۵۴۔ حمیر ہاشمی، ڈاکٹر، عورت اور نفسیات مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، ص ۳۱۸
۵۵۔ راضیہ شمشیر، کچھ کتاب کے بارے میں مشمولہ لکھاری عورتیں اور دوسرے مضامین، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰، ص ۱۶۔۱۷

۵۶۔کشور ناہید،عورت کے خلاف جنگ مترجمہ شفقت تنویر مرزا۔مسعود اشعر مشمولہ مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک،ص ۱۳

۵۷۔کشور ناہید،ڈاکٹر نوال السوداوی،غلاموں کی آزادی مترجمہ شفقت تنویر مرزا مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک،ص ۱۳۵۔۱۳۶

۵۸۔فاخرہ تحریم،عورت کا المیہ،لاہور:تخلیقات،۱۹۹۹،ص ۱۱۶

۵۹۔بشیر طارق(مترجم)تحفظِ نسواں۔فوجداری ترمیم،ایکٹ ۲۰۰۶،لاہور:ایسٹرن لا بک ہاؤس،۲۰۰۷،ص:۱۴،۱۵۔۱۴،۱۹۔۲۰

۶۰۔زاہد محمود،ڈاکٹر،گھریلو تشدد۔وجوہات،اثرات اور انسداد،لاہور:نگارشات،۲۰۰۶،ص ۲۵۔۲۶

۶۱۔کشور ناہید،بارہ دن ڈاکٹروں کے درمیان مشمولہ ورق ورق آئینہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶،ص ۴۸

۶۲۔شمس الرحمٰن فاروقی،تانیثیت Feminisim کی تفہیم مشمولہ ادبیات،سہ ماہی،اسلام آباد:اکادمی ادبیات،پاکستان،جلد ۱۵۔۱۴،شمارہ ۶۰،۵۹،جنوری تا جون،۲۰۰۲،ص ۱۷

63 : The belief in the social, economic and political equality of the sexes Feminism orignated largerly in the west but is manifested world wide and is represented by various institutions committed to activity on behalf of women's rights and interests.(The New Encyclopedia Bertinica valume 19, 15th edition, Page:160)

۶۴۔یاسر جواد،عورت مترجمہ،لاہور:فکشن ہاؤس،۱۹۹۹،ص ۲۹

۶۵۔عورت کے خلاف جنگ ہر محاذ پر:میرلین فرنچ،مترجمہ شفقت تنویر مرزا/مسعود اشعر،مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک،ص ۱۳

۶۶۔ضمیر علی بدایونی / فاطمہ حسن،نسائیت کی تحریک اور اُردو ادب،مکالمہ(کتابی سلسلہ ۱۰)،کراچی:اکادمی بازیافت،جنوری تا جون،۲۰۰۳،ص ۲۱

۶۷۔وزیر آغا،ڈاکٹر،تانیثیت مشمولہ تضمین(سہ ماہی)،لاہور:حافظ جمیل پرنٹنگ پریس،اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۷،ص ۷

۶۸۔کشور ناہید،عورت خواب اور خاک کے درمیان،ص ۱۹۰

۶۹۔ناصر عباس نیر،تانیثیت اور جدید اُردو نظم مشمولہ سمبل،راولپنڈی:ایف آئی پرنٹرز،شمارہ ۱،جلد ۱،جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲،ص ۶۰

70 : The term was coined by Ellen Showalter to describe the writings of women that is noval, drama, essays,letters and Journals edited by women. Gynocritical studies deal with Feminist language and the experience of women expressed in female imaginations, literature.67 Muslim Feminism and feminist movement (Central Asia) edith by Abida Samm Ud Din , R.Khanam global vision publishing house, India (P-vi)

71 : By feminist consciousness,we mean an awareness of modern movement in this male

governed society. When all values are male oriented.However,at present,women donot allow the continuation of the male governed system of values.Women are as free and independant as men and this new caltural trend is becoming a philosophical start point of women. (Muslim Feminism and feminist movement (Central Asia) edith by Abida Samm Ud Din , R.Khanam globol vision publishing house, India (P-vi)

72 : Feminist consciousness is emerging as a spirit of the age and become a global trend. No doubt, in the beginning it was an individual trend, but it has now become a movement or school -of - thought popular among the writers of modern sensibility . By feminist consciousness , We mean an awareness of modern movement on this male-governed society where all values are male- oriented . However, at present , women don't allow the continuation of the male.governed system of values . Women are as free and independent as men, and this new cultural trend is becoming a philosophical standpoint of women.(Feminist movement and urdu literature by Zamir Ali Badaiyuni , Dawn Magazine, January 12 , 2003).

۷۳۔ شاہدہ حسن، نسائیت کی تحریک اور اردو ادب، مترجمہ مشمولہ مکالمہ، ص ۲۱

۷۴۔ کشور ناہید، ابتدائیہ کے تین رُخ۔ دوسرا رُخ مشمولہ ادبیات، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۷، ص ۱۵

۷۵۔ افتخار عارف، پیش لفظ مشمولہ ادبیات سہ ماہی، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، جلد ۱۴۔۱۵، شمارہ ۵۹۔۶۰ جنوری تا جون، ۲۰۰۲، ص: ۱۳

۷۶۔ خالدہ حسین، عورت اور لکھنا مترجمہ مشمولہ ادبیات سہ ماہی، ص ۲۵، ۲۷

۷۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تانیثیت مشمولہ تضمین سہ ماہی، ص ۹۔۱۰

۷۸۔ راضیہ شمشیر، کچھ کتاب کے بارے میں مشمولہ لکھاری عورتیں اور دوسرے مضامین، ص ۴۷۔۷۵

۷۹۔ قاضی ذوالفقار احمد، حسن فطرت اور میری ماں مشمولہ جنس کی سیاست، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۷، ص ۳۱

۸۰۔ کشور ناہید، ورق ورق آئینہ، ص ۷۱

۸۱۔ نصیر الدین بٹ، پدرسری معاشرے مظلوم انسانیت اور سامراجی خونی ڈریکولاؤں کی خفیہ بین الاقوامی آمریت مشمولہ مردانہ معاشرہ۔ مظلوم عورت اور جمہوریت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۸، ص ۴۷۔

باب دوم

تانیثیت اور پاکستانی اُردو شاعری

(اجمالی جائزہ)

شاعری جذبات واحساسات کا برملا اظہار ہے۔ شعروادب اپنے زمانے کی ادبی رَو، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی حالات کے علاوہ فرد کے ذاتی نظریاتِ حیات اور طرزِ فکر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے: ''شاعری کی سرحد میں ہر طبقہ اور شخصیت کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں، نہ یہ عورت کی میراث ہے نہ مردوں کی جاگیر، بلکہ عام انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔'' [۱]

مرد کے حاکمانہ معاشرے کے تاریخی مدارج میں عورت کا وجود نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ ماضی میں مردوں پر فوقیت حاصل کرنے والی اور دیوی کی حیثیت سے پرستش کی جانے والی اِس مخلوق کو انسانیت کے درجے سے بھی محروم کر دیا جاتا رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عورت کھیتی باڑی سے لے کر میدانِ جنگ اور حکمرانی سمیت تجارت و مشاورت جیسے اہم اُمور انجام دیتی رہی ہے، ازمنہ قدیم سے عورت شاعری کا موضوع رہی ہے۔ عورت کو محض حسن و جمال کا مرقع سمجھنے والے ظاہر بیں شعرا نے اپنے تخیل و تصور کی بنیاد پر عورت کو پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے عورت محض دل لگی، تعیش اور جنسی تسکین کا سامان دکھائی دیتی ہے، ماضی میں عورت کے مستقبل، اِس کی معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی حیثیت کی تصویر کشی شاعری میں تقریباً مفقود ہو گئی تھی، لیکن گزرتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اِس میں عورت کو احساساتی سطح پر پیش کیا جانے لگا۔ کلاسیکی شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عورت جہاں عشق و عاشقی اور گل و بلبل کے قصوں کا مرکزی کردار رہی ہے، وہیں داستانوں اور مثنویات کے نسوانی کردار مثالیت کے حامل زندہ کردار ہیں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ شمالی ہند میں، غزل کی جو روایت ملتی ہے، اس پر فارسیت کا غلبہ تھا۔ جنوبی ہند میں دکنی غزل عورت کے احساسات کی ترجمان بنی جس پر لوک گیت اور لوریوں کے اثرات بھی مرتب ہوئے، کیوں کہ اُس دَور میں عورت اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار لوک گیتوں اور لوریوں کی صورت میں کرتی تھیں، اِس کے علاوہ شادی بیاہ کے گیت، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، جیسا کہ امیر خسرو کی شاعری کا خاص موضوع تھیں۔ ان کی چھاپ بھی دکنی شاعری میں جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ لکھنوی دَور میں ریختی کو رواج ہوا۔ یہ وہ صنفِ شاعری ہے جس میں عورت کو موضوع بنایا گیا، لیکن اِس کا اظہار مردوں کی زبان سے کیا گیا، یعنی مردوں نے عورت کے جذبات کی عکاسی اُنھی کی زبان سے کی۔ لکھنؤ ہی میں مرثیہ کی صنف تیزی سے پروان چڑھی، اس میں عورت کو اُس کے اصل روپ میں پیش کیا گیا، یعنی اُس کے کردار کے ساتھ عزت و احترام کا پہلو اُجاگر کیا گیا۔ اُسی دَور میں برصغیر میں مثنوی کو عروج حاصل ہوا۔ مثنویات میں عورت کے احساسات کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی جنسی اور جذباتی کیفیات کو بھی پیش کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی شائع کردہ داستانوں میں میر امن کی ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرور کی ''فسانۂ عجائب'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، جس میں مافوق الفطرت عناصر کے علاوہ گوشت پوست کے زندہ کردار چلتے پھرتے دِکھائی دیتے ہیں، اس کے علاوہ دیا شنکر نسیم کی

مثنوی سحرالبیان بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے اس کے کردار بھی زندگی سے قریب تر محسوس ہوتے ہیں، کیوں کہ نسوانی کرداروں میں جذبات کی عکاسی حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے۔ جہاں تک اُردو شاعری میں عورت کے استحصال کی بات ہے ،تو ہجویات میں شعرا نے معاصرانہ چشمک میں ایک دوسرے کی ماؤں ، بہنوں کو خوب لتاڑا ہے، بعض مقامات پر تو مغلظات اور دشنام طرازی سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ عورت بہ حیثیتِ بیوی ہمیشہ سے پوری شعری روایت میں طنز و تعریض کا نشانہ بنی رہی ہے، اُس کے بارے میں تضحیک کا رویہ عام ہے۔ مثلاً مرزا اسداللہ خان غالب نے بھی ایک مقام پر شادی کو ''حبسِ دوام''، بیوی کو ''بیڑی'' اور اولاد کو ''ہتھکڑی'' قرار دیا ہے۔ شعروں میں بھی جگہ جگہ اس کے حوالے موجود ہیں۔

بیشتر تذکرات شعرا کے اذکار سے بھرے پڑے ہیں، جب کہ شاعرات کا ذکر آٹے میں نمک کے برابر ہے، مثلاً میر حسن دہلوی کا تذکرہ شعرائے اُردو میں صرف ایک شاعرہ بیگم بدر النساء کا ذکر ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرہ ہندی (فارسی) میں صرف پانچ شاعرات دُلہن بیگم، جینا بیگم، زینت بیگم اور دُر موتی کا ذکر ہے۔ خوب چند ذکا کے تذکرے عیار الشعرا میں شاعرات صرف پانچ ہیں۔ میر قدرت اللہ قاسم کے فارسی تذکرے میں صرف پانچ شاعرات کا ذکر ہے۔ مصطفیٰ خان شیفتہ کے تذکرے گلشنِ بے خار میں شاعرات صرف چھ، گارساں دتاسی کے تذکرہ میں صرف ۱۵، شاعرات کا ذکر ہے، جب کہ سعادت خان ناصر کے تذکرہ معرکہ خوش زیبا میں شاعرات صرف ۱۲، ہیں۔ کریم الدین کے تذکرہ طبقات الشعرا میں صرف سات شاعرات کا ذکر ہے۔ منشی کریم الدین کے تذکرے گلدستۂ نازنیناں میں ۹ شاعرات کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے تذکرہ یادگارِ شعرا میں صرف چھ شاعرات کا ذکر ہے۔ عبدالغفور نساخ کے تذکرہ سخن و شعرا میں صرف ۳۸، شاعرات ہیں[۲]۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں بعض تذکرے ایسے بھی ملتے ہیں جن میں شاعرات کا ذکر نسبتاً زیادہ ہے، مثلاً فصیح الدین کا تذکرہ بہارستانِ ناز مکمل طور پر شاعرات سے متعلق ہے اور ان کی تعداد ۱۷۲ ہے۔ درگاہ پرشاد کا چمن انداز میں ۱۴۱ شاعرات ہیں۔ مولوی عبدالحیٔ کے تذکرہ شمیم سخن میں کل ۱۴۴ شاعرات کا تذکرہ ہے، بیسویں صدی میں مولوی عبدالباری آسی کے تذکرۃ الخواتین کے حصہ اول (اُردو) میں ۲۱۶ شاعرات اور حصہ دوم (فارسی) میں ۸۰ شاعرات کا بیان ہے۔ فصیح الدین بلخی کے تذکرۂ نسواںِ ہند کے پانچ حصے ہیں۔ حصہ اول میں ۲۸۶ شاعرات کا ذکر ہے، جن میں ۲۴ فارسی اور ایک پنجابی زبان کی شاعرہ امرتا پریتم شامل ہیں، باقی ۲۶۱ شاعرات اُردو میں ہیں۔ محمد جمیل احمد کا تذکرہ شاعراتِ اُردو ضخیم ترین تذکرہ ہے، اس میں ۲۱۴ شاعرات کا کلام و حالاتِ زندگی کے علاوہ بیسویں صدی کی شاعرات کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کا مرتب کردہ تذکرہ نعت گو شاعرات ۱۹۸۴ میں ۵۰ نعت گو شاعرات کا ذکر ہے۔[۳]

ادبی تذکروں میں خواتین کا ذکر کم ہونے کی وجہ عبدالباری آسی نے ایک قسم کی ناانصافی اور صریحاً ظلم ہے قرار دیا ہے۔

برصغیر میں، چوں کہ عورتیں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ تدریسی مواقع تو کجا انھیں ان کے بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا گیا تھا، خصوصاً لکھنا پڑھنا اُن کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سامراجی و استبدادی نظام کی شکار خواتین میں سے بعض نے پرِ پرواز نہ رکھنے کے باوجود اپنے احساسات و جذبات کو اظہار کے سانچوں میں ڈھالا۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کے بقول:

> ''خواتین کی تخلیقی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے سے بے اعتنائی برتنے کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اٹھارہوں اور انیسویں صدی میں بے شمار تذکرے لکھے گئے مگر انیسویں صدی کے وسط تک اُردو میں مشقِ سخن کرنے والی خواتین پر توجہ نہ دی گئی اور نہ ہی شاعرات کے الگ

تذکرے مرتب ہوئے، البتہ بعض تذکروں میں ضمنی طور پر شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے۔'' ۴

ایک عام عورت کی بہ نسبت ایک طوائف اس دَور میں اظہار کی آزادی کی حامل تھی۔ گھٹن کے اُس دَور میں خواتین نے شاعری کو اپنی سوچ و افکار کا آئینہ دار بنایا۔ بہت سی پردہ نشیں شاعرات نے اپنا تخلص مردانہ رکھا، تا کہ ان کی پہچان نہ ہو پائے، اگر چہ تخلص میں مرد و عورت کی تخصیص نہیں لیکن ذاتی تجربات اور زندگی کے نظریات اور رویہ جات، چوں کہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے اظہار کے سانچوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ محبوب کے لیے واحد غائب کا صیغہ مذکر استعمال ہوتا ہے، کیوں کہ محبوب مجازی اور حقیقی دونوں معنی رکھتا تھا۔ تانیث کا صیغہ استعمال کرنے کی حقیقی معنویت باقی نہیں رہتی تھی۔ سماجی قدغنوں کی وجہ سے خواتین کا حجاب اور چار دیواری میں مقید رہ جانے کی کیفیت نے عورت کی سوچ اور احساسات، اُس کی ذہنی ونفسیاتی اُلجھنوں کو ابہام کی نذر کر دیا، جس کی وجہ سے، بعض جرأت مند خواتین نے مروجہ روایات سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے خیالات کو شعری سانچوں میں ڈھالا، لیکن یہاں بھی لاشعوری خوف کی وجہ سے دانستہ و غیر دانستہ طور پر اپنے ناموں کو پوشیدہ رکھا اور مردانہ تخلص استعمال کیا اور تحریکِ حقوقِ نسواں کے نمائندہ رسائل 'عصمت' اور 'تہذیبِ نسواں' میں بھی، اُن کا کلام شائع ہوا، تاہم تذاکر میں ایسے نام بھی ملتے ہیں، جن کے ہاں تانیثی احساس بڑی شدت سے موجود ہے، مثلاً عزیز جہاں بیگم کی نظمیں ''مجھے تنہا رہنے دو'' اور ''بیزاری''۔ دوسرا یہ کہ مسلم معاشرے کے تہذیبی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے خواتین کا ذکر نمایاں طور پر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، چناں چہ شاعر مرد ہو یا عورت دونوں محبوب کے لیے ایک ہی صیغہ استعمال کرتے تھے، اس لیے اظہارِ عشق میں جن جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جاتی تھی، وہ دونوں جنسوں کے لیے ایک سے تھے۔ غزل میں اس کا ایک خاص رکھ رکھاؤ تھا، لیکن گیت ہندی مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے قدرے مختلف تھا اور اس میں عورت کے جذبوں کی ترجمانی بھی ہوتی تھی۔ ۵ تذکروں میں شاعرات کو نظر انداز کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نفسیاتی طور پر مرد تفاوتی رُجحان رکھتا ہے۔ وہ غالبیت کی لاشعوری خواہش عورت کے بہت سے شخصی خصائص، نقائص اور عیوب میں ڈھال دیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عورت کے حُسن و جمال کا بیان عیاشی و ہوسنا کی کی دلیل بن جاتا ہے: ''مگر رندی و ہوسنا کی کے مارے ہوئے شاعروں نے اسے 'بنتِ عنب' کی حیثیت دی ہے اور میخانۂ دل میں بیٹھ کر اس سے اپنے اپنے جامِ عشق بھرتے رہے۔'' ۶ اسی حوالے سے عنبرین صلاح الدین لکھتی ہیں:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر دَور میں، بہت سی لکھاری خواتین اور شاعرات موجود رہی ہیں، لیکن ادب کی دُنیا میں نثر کے علاوہ شاعری میں ہمیں بہت کم خواتین دِکھائی دیتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد ہی قلم پر حاوی رہا ہے۔ اُسے یہ بات پسند نہ تھی کہ خواتین ادبی دُنیا میں شہرت پائیں۔'' ۷

گویا! ہر مقام پر خود کو زیادہ باصلاحیت اور احساسِ برتری کے شکار مرد عورت کی برابری کس طرح مان سکتے ہیں وہ ہر اُس چیز کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا چاہیں گے، جس کے بارے میں اندیشہ ہو گا کہ اِن کی حیثیت ماند پڑ جائے گی، چناں چہ دفاعی میکانیت کے تحت لاشعوری طور پر اِس خوف کو چھپانا اِن کی مجبوری بن گئی، تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح سبھی شعرا و ادبا کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا نہیں جا سکتا، اس کے برعکس بہت سے ادیبوں نے عورت کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کرتے ہوئے، ان کی فطری صلاحیتوں کو سراہا ہے اور ان کے خلاف برتی جانے والی ناانصافی کو احاطۂ تحریر میں لائے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔

تاہم، ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے عورتوں کے خلاف تعصب کے برخلاف اور معاشرے میں ان کے ساتھ برتے گئے غیر مساوی اور ناروا سلوک کو موضوعِ سخن بنایا ہے کہ کس طرح خواتین جبر و ستم سہے جا رہی ہیں، اُنھیں زندگی کی بہت سی نعمتوں سے محروم رکھا جا رہا ہے، اس کی شخصیت یا ذات کو قبول کرنا در کنار اسے انانیت و حاکمیت کی تسکین کی خاطر کچلا جا رہا ہے۔ کھور ذہنیتوں کے مالک مرد، عورت کو اپنی مرضی اور سوچ کے آئینے ہی میں جیتا دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے حکم و خواہش سے سرِ موانحراف، عورت پر عذاب کی صورت میں ٹوٹتا ہے، اس کے برعکس اپنی ذات و شخصیت کے بڑے بڑے عیوب و نقائص اور برائیوں سے یکسر پہلو تہی کی جاتی ہے۔ ایسے موضوعات کو بھی شعرا نے شاعری کا موضوع بنایا ہے، جن میں عورت کے مسائل کو روایات و اقدار کی، چوں کہ شاعرات کی بہ نسبت شعرا کے ہاں تانیثی رُجحان کم دکھائی دیتا ہے۔ شاعرات کے ہاں تو تانیثیت باقاعدہ موضوع کے طور پر موجود ہے، خصوصاً غزل کی بہ نسبت نظموں میں اِس کی عکاسی بہت زیادہ ہے، اس کی بنیادی وجہ ہئیت ہے۔ غزل دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، جن میں اپنا مدعا بیان کرنا خاصا دشوار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ غزل کی بہ نسبت نظم تانیثی رُجحان کے ابلاغ کا موثر ذریعہ ثابت ہوئی۔ شاعرات پر لکھے گئے تذکروں میں صرف تانیثی رُجحان کی حامل شاعرات کا کلام جو بظاہر نہ ہونے کے برابر ہے نئے لکھنے والوں کے لیے ایک بنیاد ثابت ہوا، مثلاً مہ لقا چندا بائی رسالہ اُمید کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ بھی کہلائیں، لیکن بعد میں محققین نے لطف النسا کو پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ قرار دیا کیوں کہ ان کا کلام مہ لقا سے پہلے چھپ گیا تھا۔ تذکروں میں جن تانیثی فکر کی نمائندہ شاعرات کا ذکر ملتا ہے اُن میں جعفری، حیا، حرماں، فاطمہ، اختر، امراؤ، نازنین، کنیز، عزیز جہاں، آہ، بشیر، بیگم رضا، پروین تسنیم جمال، حمیدہ دہلوی، حور، زریں، ذھرا، زُہرہ، زیب عثمانیہ لدھیانوی، ساجدہ، شمیم ملیح آبادی، صفیہ حیدری، عذرا عصمت، قمر جہاں بیگم، نسیم اچپل، احمدی بیگم، بُو (ط)، حارث، پکھراج، حجاب، حجاب (ط)، غنی، سائرہ سردار، شباب (ط) نازک (ط) نازنین وغیرہ، بعد میں لکھنے والیوں میں بیگم رضا کی نظم ''علاجِ گردش لیل و نہار کر نہ سکی'' تانیثی رُجحان کی حامل ہے۔ زینت پروین نے نظم ''معصوم بچیوں سے خطاب'' لکھی۔ حمیدہ سلطان دہلوی نے آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں پہلا زنانہ مشاعرہ منعقد کرایا، ان کی نظم ''جاگو جاگو بہنو جاگو'' میں مروجہ استحصالی نظام اور قوتوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ ''آرزوئے موہوم'' اور ''خاتونِ وطن'' بھی اِس سلسلے میں اہم ہیں۔ حیا لکھنوی کی نظمیں 'گلاب' اور 'ماں' کے عنوان سے مختلف رسائل میں شائع ہوئیں اور اُنھیں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ خورشید آرا بیگم امراوتی (برار) ان کی نظم 'عورت' حقوقِ نسواں کے حوالے سے اہم ہیں۔ سکندر جہاں رفعت نے 'پردہ' کے عنوان سے نظم لکھی، جس میں پردے کی ضرورت و اہمیت کو سمجھتے ہوئے بالغ نظری سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ قوموں کی ترقی میں پردہ حائل نہیں ہوتا۔ اِس دَور کے تانیثی رُجحان رکھنے والی شاعرات میں نہایت اہم نام ز۔ خ۔ ش کا ہے، اُنھوں نے خواتین کی زبوں حالی اور خانگی زندگی کے مسائل کے انبار میں دب کر تپ دق کی بھینٹ چڑھ جانے والی خواتین کی کیفیات بیان کی ہیں۔ مجموعۂ کلام ''آئینۂ حرم'' میں اُنھوں نے عورت سے روا رکھے جانے والے سلوک کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح ہر دَور میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے، ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی جاتی ہیں، حتیٰ کہ عورت کو اپنے اندر کی گھٹن کو نکالنے کے مواقع فراہم نہیں کیے جاتے۔ مسلسل تناؤ، ذہنی الجھنوں اور خوف و ہراس میں رہنے کی وجہ سے عدم تحفظ کا احساس اس کے اندر شدید تر ہوتا جاتا ہے اور بالآخر مختلف امراض کا شکار ہو کر موت کی وادیوں میں دھکیل دی جاتی ہے۔ حقوقِ نسواں کا عمومی تاثر یہ اُبھرتا ہے کہ شاید یہ مرد دشمنی کا شاخسانہ ہے عورت

کو مذہب کی آڑ میں بھی غلط تشریحات و توضیحات کے ذریعے استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور زندگی کے ہر میدان میں کمتر وحقیر گردانا جاتا ہے۔

زہرہ: کے۔ ایف خاتون، زہرہ تخلص تھا۔ شادی پر رخصتی کے وقت غربت کے عالم میں بوڑھے باپ کی اپنی بیٹی کو نصیحت کو موضوع بنایا ہے۔ معاشرتی رسوم ورواج جو عورت کی زندگی پر حاوی کر دیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ مرد بہ حیثیتِ باپ اور بھائی بھی عورت کو اپنے حقوق سے لاتعلقی اور پسپائیت کی تلقین کرتا ہے، باپ کی بیٹی کو یہ نصیحت استحصالی نظام پر گہری چوٹ بھی ہے، کیوں کہ اُس کی مصیبتِ پیہم کا اُسے باخوبی اندازہ ہوتا ہے، وہ بھی مردانہ حاکمیت والے معاشرے کا پروردہ ہے اور اپنی حاکمیت کے جوہر دکھا چکا ہے۔ شمیم ملیح آبادی کی نظم 'عورت' میں نسوانی عظمت کا احساس اُجاگر کیا گیا ہے۔ عصمت جہاں بیگم جن کا زیادہ تر کلام مخترِ خیال میں شائع ہوا، اُنھوں نے خانگی زندگی کی اُلجھنوں اور مرد کی بے اعتنائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا۔ زیب نے اپنی نظم 'عورت' میں عورت کی عظمت کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قمر جہاں بیگم اپنی نظم ''تہذیب جدید کا نوحہ'' میں معاشرے میں مروجہ ظالمانہ رسم ورواج اور رویوں کے علاوہ اسلام کے عائلی قوانین پر روشنی ڈالتے ہوئے نہایت جرأت مندی سے حقائق کو منظرِ عام پر لائی ہیں۔

اسی طرح احمدی بیگم، پارسا، سائرہ، سردا بیگم، محمدی خاں طوائف، فاطمہ وغیرہ کے نام تانیثیت کے لحاظ سے اہم ہیں۔ بعد کے لکھنے والیوں میں زاہدہ خاتون، سلمہ تصدق حسین، رابعہ خاتون، صفیہ شمیم حنفی، پروین ناز اور نجمہ خان وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ صفیہ شمیم کی نظم ''شاعرہ کی موت'' میں قوتِ متخلیہ کے ذریعے ایک تاثریہ پیش کیا ہے کہ جب وہ مرے گی تو اس کے ساتھ ساتھ فطرت کا ذرہ ذرہ اس کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے نوحہ کناں ہوگا۔ ہر انسان اپنے آپ کو دُنیا کا اہم فرد تصور کرتا ہے اور کائنات کا پہلا اور اہم ترین شخص سمجھتے ہوئے زندگی خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں میں بسر کرنا چاہتا ہے اور حقائق کی تلخیوں کو بھول جاتا ہے۔ انسان بدل جاتا ہے مناظر نہیں بدلتے۔ وقت کی گرد، عزیزوں اور پیاروں کی یاد پر چھا جاتی ہے اور دُھندلائی ہوئی یادیں وقت کی آندھیوں میں بکھر جاتی ہیں۔ بنتِ مجتبیٰ مینا، نے اپنی نظم ''تشویش'' میں اس ذہنی کشمکش کی عکاسی کی ہے جب زندگی کے ساتھیوں میں ذہنی ہم آہنگی کا فقدان ہو تو بہت سے نظریاتی بعُد پیدا ہو جاتے ہیں، جو دونوں کی زندگی میں تلخی، ناآسودگی اور عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیتے ہیں۔ لہٰذا، خوشگوار زندگی کے لیے ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ عورت مرد کو قائل کرنے میں کوشاں رہتی ہے اور مرد اپنی آزادیِ فکر میں اسے بہت بڑی رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ وہ خود تو آزاد و خود مختار رہنا چاہتا ہے، لیکن اس غرور میں اپنی زندگی کی ساتھی کی آزادی و حقوق سلب کر لیتا ہے۔ پروین ناز نے نظم 'الوداع' میں اپنی سہیلی کی رُخصتی کا بیان کیا ہے کہ لڑکی کی زندگی دو بڑے ادوار میں منقسم ہوتی ہے۔ پہلا دَور والدین کے گھر کا ہوتا ہے اور دوسرا دَور سُسرال کا، دونوں ادوار ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، معاشرہ عائلی زندگی کا تمام تر بوجھ عورت کے کندھوں پر ڈالتا ہے۔

ہندوستان میں تحریکِ علی گڑھ کے تحت لکھے جانے والے ادب کا ایک رُخ تانیثی احساس کی غمازی کرتا ہے، اگرچہ اس اصلاحی ادب کا مقصد مرد و عورت کی تہذیبی و اخلاقی اقدار کی روشنی میں تربیت کرنا تھا۔ تعلیم کو آگاہی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھنے والوں نے عورت کی سماجی حیثیت و کردار پر تو روشنی ڈالی لیکن اس کی سوچ وفکر، جذبات واحساسات مؤثر انداز میں نہ پیش کر سکے۔ تانیثی شعور کی جھلکیاں مولانا الطاف حسین حالی کے ہاں دکھائی دیتی ہیں، اُنھوں نے عورت کے مسائل کو

موضوعِ سخن بناتے ہوئے، ستّی کی مکروہ اور ظالمانہ رسم کے خلاف آواز بلند کی حالی تحریکِ علی گڑھ کے سرگرم رُکن تھے، ان کا نقطۂ نظر اصلاحی تھا، اِس لیے خواتین کی تعلیم اور اصلاح پر، اُنھوں نے زیادہ زور دیا۔ ہندوستان میں تحریکِ علی گڑھ کے تحت لکھا جانے والا نسائی ادب میں خواتین کی خانگی زندگی اور مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ تانیثی احساس کی غمازی کرتے ہوئے اس اصلاحی ادب نے مرد و عورت کی تہذیبی و اخلاقی اقدار کی روشنی میں عورت کی تربیت پر زور دیا، لیکن سماجی حیثیت اور کرداراس کی سوچ و فکر، جذبات و احساسات کو مؤثر انداز میں پیش نہ کر سکا۔ حالی کی "مناجاتِ بیوہ"، "چپ کی داد" وغیرہ جیسی نظمیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

اے ماؤں! بہنوں! بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں، قوموں کی عزت تم سے ہے ۸

مردوں کی بہ نسبت عورتوں کو تعلیم سے محروم کیے جانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات — ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب — دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب ۹

حالی وہ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے عورت کو قوم کی عزت قرار دیا، اِس کے باوجود حالی کا نقطۂ نظر خاصا روایتی ہو جاتا ہے، جب وہ لڑکی کو سسرالیوں کے ساتھ رہنے کا رنگ ڈھنگ اختیار کرنے کا کہتے ہیں:

بدلے نہ شوہر کی نظر، سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر ۱۰

سماجی قدغنوں کی وجہ سے خواتین کا حجاب اور چار دیواری میں مقید رہ جانے کی کیفیت نے عورت کی سوچ اور فکر، اُس کی ذہنی و نفسیاتی اُلجھنوں کو ابہام کی نذر کر دیا، جس کی وجہ سے بعض جرأت مند خواتین نے مروجہ روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنے خیالات کو شعری سانچوں میں ڈھالا، لیکن یہاں بھی لاشعوری خوف کی وجہ سے دانستہ و غیر دانستہ طور پر اپنے ناموں کو پوشیدہ رکھا اور مردانہ تخلص اختیار کیا، جن شاعرات کے ہاں تانیثی احساس کی جھلکیاں نمایاں ہیں، اُن میں سے بیشتر کا کلام تحریکِ حقوقِ نسواں کے نمائندہ رسائل عصمت اور تہذیبِ نسواں میں شائع ہوا، مثلاً عزیز جہاں بیگم کی نظموں "مجھے تنہا رہنے دو" اور "بیزاری" میں جذباتی و استحصالی رویے کی وجہ سے مایوسی اور بے اعتمادی کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ محترمہ بشیر النسا حیدر آبادی نے اپنی نظم "محسنِ اعظم" میں تحریکِ حقوقِ نسواں کے بانی علامہ راشد الخیری کی خدمات کو سراہنے کے ساتھ ساتھ عورت کی سماجی حیثیت کو نمایاں کیا ہے، اُن کے خیال میں مغربی تعلیم کی بے جا تقلید زہرِ ہلاہل ہے، جو لادینیت اور مادر پدر آزادی کے فروغ کا باعث بنتی ہے۔ سسرال اور اہلِ سُسرال کے ظلم کی چکی میں پستا ہندو معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے بدترین اثرات میں سے ایک ہے۔ ناحق ایک انسان پر اس قدر بوجھ ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ ہمہ وقت اسی عذاب میں مبتلا رہتی ہے۔ توقع رکھی جاتی ہے کہ اس کا کوئی قول و فعل اہلِ سُسرال اور شوہر کی مرضی و خیالات سے ذرا سا بھی مختلف نہ ہو، بلکہ تابع داری کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہے، گویا شادی نہ ہوئی کوئی بیگار ہوئی، جس میں ہر لمحے کی قیمت

لڑکی کو ادا کرنا پڑتی ہے، اس قسم کے استحصالی سماجی ڈھانچے کا ذکر اسلام میں نہیں:

''یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے، کیوں کہ شریعت میں نہ ساس نندوں کا ذکر ہے، نہ کسی کے حقوق کا، بلکہ ساس کے مروجہ معنوں میں ساس کا وجود ہی نہیں تھا۔ شادی کے ساتھ ہی ایک نیا گھر، جو چاہے ایک کمرے پر مشتمل ہو یا ایک خیمے پر، آزادانہ بنیادوں پر وجود پالیتا، چناں چہ ساس، بہو اور نندوں، بھاوجوں کا کوئی بھی مقدمہ آپؐ کے سامنے نہیں آیا اور نہ ہی خلفائے راشدین کے سامنے۔ بُرے حالات، تو اسلام سے دُوری کی وجہ سے پیدا ہوئے۔''[۱۱]

اکثر مرد دانستہ ہرجائی پن اختیار کر کے عورت کو عدم تحفظ کا شکار کرتے ہیں، اُن کے خیال میں عورت کو قابو میں رکھنے کا یہی طریقہ ہے، چوں کہ عورت کی بہ نسبت مردوں کی شرح، خانگی تشدد کے حوالے سے زیادہ ہے، اس لیے غالب اکثریتی رُجحان مردوں کی حاکمانہ ذہنیت کی پیداوار ہے اور عورت کا اس رُجحان کے خلاف ردِعمل فطری ہے۔ عورت بہ حیثیتِ انسان اپنی پہچان و مقام چاہتی ہے۔ اپنے حقوق کا حصول ہی اس کی شعوری و لاشعوری کاوش ہے۔ اسے محض مرد دشمنی کا نام دے کر تمسخر کی نذر نہیں کیا جاسکتا، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنے حقوق آشنا عورت، خواتین کے حق کے لیے آواز بلند کر رہی ہے، اگر چہ اسے بہت سے القابات، طعنہ و تشنیع اور طنز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن آگاہی کا یہ سفر جاری و ساری ہے۔ دوسری طرف ایسی خواتین بھی ہیں، جو نام نہاد جدیدیت اور مساوی حقوق کے نعرے لگا کر منفی رُجحانات کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی ہیں، اِس صورتحال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مرد بھی ماڈرنزم کا نعرہ لگا کر عورت کو مزید خود فریبی میں مبتلا کر رہے ہیں اور کم فہم عورتیں مردوں کے ہاتھوں کھلونا بنتے ہوئے اپنی عزت و عفت، عزتِ نفس، وقار اور تقدس اپنے ہاتھوں کھو رہی ہیں۔ مغرب زدہ یہ مرد و عورت تہذیب و اخلاق اور سماج کی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں، یہی لوگ تحفظِ حقوقِ نسواں کے لیے زہرِ ہلاہل ثابت ہو رہے ہیں اور اس رُجحان کی غلط تشریح و توضیح کا سبب بن رہے ہیں۔ ہر باشعور مرد و عورت بخوبی آگاہ ہے کہ ان دونوں کے حقوق و فرائض کی حدیں کہاں ہیں اور اُن کا حصول کیوں کر ممکن ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کے بقول: ''جہاں تک مرد ادیبوں کی تحریروں میں عورت کے امیج کا سوال تو اس سلسلے میں طبقاتی سماج کی ناہمواریوں کی نشان دہی کے دعوے دار شاعروں تک کے یہاں طبقۂ اُناث سے بے انصافی کثرت سے ملتی ہے۔''[۱۲] ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کے اس مؤقف اگر اُردو شاعری ہی کے تناظر میں پرکھا جائے تو لاتعداد ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن میں توہین آمیز پیرائے میں عورت کو طنز اور تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا ہے، مثلاً نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم 'سمدھن' کو لے لیجیے۔ مزاح نگاری کے چکروں میں اُنھوں نے سمدھن کے قابلِ احترام اور معزز رشتے کو ابتذال کی نذر کر دیا ہے:

کروں کس منہ سے اے یارو بیاں میں شان سمدھن کی — لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

- - - - - - - - - - - - -

سنہری تاش کا لہنگا، روپہلی گوٹ کی انگیا — چمکتا حسن جو بن کا جھمکتی آن سمدھن کی
ملائی سا شکم، سینہ مصفا، خوشنما ساقیں — صفا زانو کا آئینہ، ملائم ران سمدھن کی

- - - - - - - - - - - - -

بڑا احسان مانیں ہم تمھارا آج سمدھی جی — میسر ہو اگر صحبت ہمیں ایک آن سمدھن کی
ہمیں ایک دو گھڑی کے واسطے دولہا دِلا دو — جو کچھ لہنگے کے اندر چیز ہے پنہاں سمدھن کی

نظیر اب آفریں ہے یار تیری طبع کو ہر دم
کہی تو تعریف تو نے خوب عالی شان سمدھن کی[۱۳]

مردوں نے شاعری میں عورت کا ویسا ہی تصور تخلیق کیا ہے، جیسا روزمرہ زندگی میں وہ چاہتے ہیں، اس لیے کبھی اسلام کے نام پر تو کہیں سماج اور معاشرتی روایات کے نام پر عورت کی پابند کرتے ہوئے استحصال کا نشانہ بنایا ہے۔ عورت کی ترقی علم اور خود انحصاری ایسے شعرا کے نزدیک بہت بڑی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہے۔ اکبرالہ آبادی نے نشتریاتِ اکبرالہ آبادی کے زیرِ عنوان انگریزی تہذیب کی مادہ پرستی اور مرد و عورت کو ماضی کا آئینہ دکھاتے ہوئے مستقبل کی نئی تہذیب کے مُضر اثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

علامہ اقبال آزادیٔ نسواں کے قائل تو تھے، لیکن حدود و قیود کے اندر مادر پدر آزادی کے وہ سخت خلاف تھے۔ تہذیب مغرب کے مضر اثرات کے مخالف تھے۔ وہ عورت کو گھرداری اور بچوں کی اچھی تربیت دینے والی ماں کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے چراغِ خانہ بننے کو ترجیح دیتے تھے، کیوں کہ آغوشِ مادر ہی انسان کی اولین درس گاہ ہے۔ فیمنیزم کی تحریک کے زیرِ اثر مغربی عورتیں جس قسم کی مادر پدر آزادی کا شکار تھیں اس کے اثراتِ بد سے بالواسطہ طور پر برصغیر کی خواتین بھی متاثر ہو رہی تھیں۔ علامہ اقبال کے خیال میں ہر وہ تعلیم مُضر اثرات کی حامل ہے، جو بھٹکا دینے والی ہے۔ وہ عورت کو گھر کی زیب و زینت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نظریۂ آدمیت کے مطابق عورت ہر لحاظ سے قابلِ صد احترام ہے ماں کی عظمت کو ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' سراہا گیا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں[۱۴]

علامہ اقبال تاریخ میں عورتوں کے کارہائے نمایاں کے معترف تھے، لیکن تعلیم کے معاملے میں وہ قدامت پسند تھے اور عورتوں کے لیے محض دینی تعلیم ہی کو اہمیت دیتے تھے۔ نظم ''عورت اور تعلیم'' عورت کے لیے جدید تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقبال کا تانیثی نقطۂ نظر آغوش مادر، نئی نسل کی پرداخت اور ترقی کے لیے ہے:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت[۱۵]

علامہ اقبال عورت کو کائنات کی اساس قرار دیتے ہیں، اُن کے خیال میں دُنیا کے رنگ اپنی اَفادیت کھو دیں گے، اگر عورت کا وجود مٹا دیا جائے، تمام حسن و خوبصورتی اور حیاتِ انسانی کا سرچشمہ عورت ہی ہے:

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ — آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند![۱۶]

چکبست لکھنوی کی نظم ''پھول مالا'' میں لکھنوی جدید تعلیم کو عورت کے لیے زہرِ ہلاہل تصور کرتے ہیں اور عورتوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس دوران وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ پڑھی لکھی مائیں بچوں کو ایک اچھا ماحول دیتی ہیں اور یہ کہ بچہ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا اس کی پرورش کی ذمہ دار محض عورت نہیں، بلکہ مرد بھی ہے، کیوں کہ مرد کی عدم توجہی بچوں کی شخصیت میں بہت بڑا خلا پیدا کرتی ہے۔ جس کا ردِعمل ہمیں نظم ''رامائن کا ایک سین'' میں ماں کی محبت کو ٹھکرانے اور حتیٰ کہ اپنی بیوی کی محبت اور وفا کی نظرانداز کرنے کا رُجحان بھی ملتا ہے۔ شوق قدوائی کے ہاں عورت اپنے حقوق کا شعور و ادراک

رکھتی ہے، مثلاً ''عالمِ خیالی'' میں بیوی شوہر کا خط پالینے کے بعد فرطِ جذبات سے معمور ہو جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ لوٹ آئے۔ تانیثیت کے حوالے سے صرف ایک قطعہ کلیاتِ فانی میں دستیاب ہے، جس میں صنفی امتیازی سلوک کی عکاسی کے علاوہ ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کے اُصول کی شدید مذمت کی گئی ہے، اُن کے خیال میں جہاں لاٹھی ہوتی ہے وہاں انصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر نے ''دعائے اسیر'' اور ''دعائے یتیم'' میں عورت بہ حیثیت بیٹی اور اس کے خصائص بیان کرتے ہوئے ذمہ داریوں کو نبھانے کی تلقین کی ہے۔ نظم ''دعائے اسیر'' میں اسیری کی دوران اپنی بیٹی کی علالت کا سن کر نظم لکھی اور خدا کے حضور عاجزی اور انکساری اور اپنی اسیری کو دردناک انداز میں پیش کیا، جو اس کی شفقتِ پدری کی دلیل ہے۔ جوش ملیح آبادی نے مزدور اور محنت کش عورتوں کو اپنی نظم ''حسن اور مزدوری'' کا موضوع بنایا ہے۔ صنفِ نازک کہلائی جانے والی مخلوق کس طرح تپتی دوپہروں میں کنکر کوٹتی ہیں، مزدوری کرتی ہیں۔ عظمت اللہ خاں ''مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا'' میں اس معاشرتی المیے کی طرف اشارہ کیا ہے، جب لوگ اعلیٰ تعلیم کے حصول کی بجائے تفریح، عیش وعشرت اور معاشقوں کے چکروں میں دھوکا دے جاتے ہیں اور اپنی خوشیوں میں گم ہو کر اپنوں کو بھلا دیتے ہیں۔ پنڈت نرائن مُلا نے اپنی نظم ''تم مجھے بھول جاؤ گے'' میں بیان کیا ہے کہ جو مرد اپنے بعض رویوں کی وجہ سے عورت کو عدم تحفظ کا شکار کیے رکھتا ہے، تو عورت اس سے نفسیاتی طور پر ہراساں اور ہمہ وقت تشویش کا شکار رہتی ہے، حتیٰ کہ موت اس کی اس تشویش میں کمی کا باعث نہیں بنتی۔ حفیظ جالندھری کے ہاں تانیثی احساس کی جھلکیاں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ نظم ''رقاصہ'' میں گھریلو عورت پر ڈھائے جانے والے جور وستم کو موضوع بناتے ہوئے ظلم ڈھانے والوں کو شرم وغیرت دلائی گئی ہے۔ اکبر واقبال کی طرح حفیظ جالندھری بھی عورت کی بے جا آزادی اور عریانی کے خلاف تھے، یہی وجہ ہے کہ تہذیبِ مغرب کے مضر اثرات سے نالاں تھے وہ مغربی تہذیب کو ہدف بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اخبار میں حفیظ جالندھری کی ایک مضحکہ خیز نظم ''ترانۂ جم خانہ'' شائع ہوئی، جس میں اُن لوگوں پر تنقید کی گئی ہے، جو ایک طرف قائداعظم کے ارشاد کی تعمیل اور دوسری طرف جہادِ کشمیر پر معمور تھے، لیکن ساتھ ساتھ شراب ورقص کے بھی رسیا تھے:

ناچنے کی شرط یہ ہے کہ مرد وزن دونوں ہوں غیر
بس وہی اپنا ہے جو بیگانہ جم خانے میں ہے

- - - - - - -

گھر کجا دفتر میں بھی اُن کا نہیں ملتا پتہ
اصل میں صاحب کا دولت خانہ جم خانے میں ہے [۷۱]

اختر شیرانی نے ''انتظار'' اور ''بیوی سے'' میں اُن عورتوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے، جن کے شوہر اعلیٰ تعلیم، بہتر مستقبل اور خوشحالی کے نام پر پردیس میں عیش کرتے ہیں، جب کہ اُن کے اہلِ خانہ، بیوی بچے اُن کی صورت دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ احساسِ محرومی اور جدائی، اُن کی زندگی کا کرب بن جاتی ہے، علاوہ ازیں اختر شیرانی نے عورتوں کے مردانہ فیشن کو طنزیہ انداز میں ''ذوقِ ہم رنگی'' قرار دیا ہے، اُن کی نظمیں ''مرد وعورت کی یک رنگی''، ''انقلاب معنیٰ''، ''بہار وخزاں'' اور ''لطفِ تمثیل'' اس حوالے سے اہم ہیں، دراصل عورتوں میں گیسو بُریدگی لاشعوری طور پر مرد کے غاصبانہ اور حاکمانہ رویے کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ پابند اور گھٹے ہوئے ماحول سے یہ بغاوت درپردہ مرد کی ہمسری کا شاخسانہ تھی۔ ''نغمۂ حرم'' میں

خواتین کے حوالے سے بھی نظمیں لکھی گئی ہیں، ان میں ''شمعِ حرم''، ''نارضا مندی کی شادی''، ''ماں''، ''نور جہاں'' ''انجامِ ہستی''، ''ایک لڑکی کا گیت''، ''مدرسے کی لڑکیوں کی دعا''، ''ایک سہیلی کی یاد میں''، ''ایک عزیزہ کی شادی پر'' ''عورت اور پردہ''، ''شوہر کے تابوت پر''، ''پہلا خط''، ''عورت'' اور ''ماتا'' طبقۂ نسواں کے حوالے سے اصلاحی رُجحانات لیے ہوئے ہیں۔ نظم ''پردیسی پی کی یاد میں'' میں ایسے لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، جو فکرِ معاش، حصولِ تعلیم کی آڑ میں پردیس تو کاٹتے ہیں، لیکن دیس والوں کو بھول جاتے ہیں:

کسی کا ہجر ہے، بے تابیاں ہیں اور دل میرا
سیہ راتیں ہیں اور بے خوابیاں ہیں اور دل میرا ۱۸

نظم ''نارضامندی کی شادی'' میں زبردستی کی شادیوں کے بُرے انجام کی نشاندہی کی گئی ہے:

جواں روحوں کی خاموش قتل گاہ ہے یہ
خدا کے نام پہ سب سے بڑا گناہ ہے یہ ۱۹

نظم ''عورت'' میں آفاقی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ایک کامیاب مرد کی کامیابیوں میں عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، ایک سماجی بُرائی ذہنی آوارگی ایسی بات سے جنم لیتی ہے، جب مرد اپنی بیوی کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر عورتوں میں دلچسپی، معاشقے، دل لگیاں، دوستانے و یارانے گانٹھتا ہے، تو خانگی و ازدواجی زندگی یقینی طور پر انتشار اور بے یقینی کا شکار ہوتی ہے۔ دَورِ حاضر کے اِس ناسور کی غمازی نظم ''عورت'' میں بخوبی کی گئی ہے۔ اِس کے برخلاف مرد کی حاکمیت کے بارے میں عورت میں پائے جانے والے باغیانہ رویے کی عکاسی بھی شیرانی کے ہاں ملتی ہے:

وہ چاہے تو مٹا دے جوشِ بحرِ زندگانی کو — وہ چاہے تو اُلٹ دے پردہ دُنیائے فانی کو!
وہ چاہے تو بدل دے رنگِ بزمِ آسمانی کو — وہ چاہے تو جلا دے نخلِ زارِ حکمرانی کو ۲۰

اسرار الحق مجاز تانیثی طرزِ فکر و احساس کے شاعر ہیں، اُنھوں نے عورتوں خصوصاً مزدور اور خانہ بدوش عورتوں کی زندگی کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تصویر کشی کی ہے۔ اسرار الحق مجاز کی نظموں ''خانہ بدوش''، ''دِلی سے واپسی''، ''نوجوان عورت سے''، ''پردہ اور عصمت'' اور ''سرمایہ داری'' وغیرہ میں تانیثی رُجحان موجود ہے:

پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں ۲۱

نظم ''نوجوان عورت سے'' میں مجاز نے عورتوں کو جدوجہدِ آزادی میں اپنا حصہ لینے کی طرف مائل کیا ہے اور اُن میں جزبۂ حریت اور حب الوطنی اُجاگر کرنے کی کاوش کی ہے:

یہ تیرا زرد رخ، یہ خشک لب، یہ وہم، یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا
دل مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل
تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

- - - - - - - - -

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا ۲۲

ن۔م۔راشد کے ہاں عورت کا کردار ایک زندہ گوشت پوست کی عورت کا کردار ہے، لیکن راشد نے عورت کو محض جنس اور جنسی تسکین تک محدود کر دیا ہے۔ لمحاتی سکون کی تلاش اور حقائق سے فراریت کا راستہ اسے عورت کی آغوش میں لے جاتا ہے۔ راشد عورت کو عزت وتکریم دینے کو تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ عورت کے مختلف روپ ''اجنبی عورت''، ''داشتہ''، ''سپاہی''، ''بے جان محبوبہ'' اور ''جہاں زاد'' کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ راشد کے ہاں عورت زندگی سے فرار کے ردِعمل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ نظم ''انتقام'' میں راشد کے ہاں ایک فاتح ملک کا سپاہی مفتوح عورت سے انتقام لیتا ہے۔ تانیثی نقطۂ نظر سے راشد کے تصورِ عورت پر بہت بڑی زد پڑتی ہے، اُن کے ہاں مرد کا احساسِ کمتری، احساسِ برتری کی بدترین شکل اختیار کر جاتا ہے:

اُس کا چہرہ اُس کے خد وخال یاد آتے نہیں
اِک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم،
میرے ''ہونٹوں'' نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے ۲۳

راشد عورت کو اس کا معاشرتی، سماجی اور نفسیاتی مقام و مرتبہ دینے کو تیار نہیں، اگرچہ عورت تصورات کے بجائے حقیقی وجود رکھتی ہے۔ عورت اُن کے نزدیک ایک ایسی اُلجھن ہے، جسے سلجھایا نہیں جاسکتا۔ راشد جیسے لوگوں کی سوچ کے مالک عورت کی ذات کے بارے میں اپنے خیالات کا پرچار کر کے عورت کے بارے میں منفی پروپیگنڈا کرتے ہیں، نظم ''حسن کوزہ گر'' میں لکھتے ہیں:

ہر ایک شے سے پہلے آپ ہوں!
اگر میں زندہ ہوں تو کیسے ''آپ'' سے دغا کروں؟
کہ تیری جیسی عورتیں، جہاں زاد،
ایسی اُلجھنیں ہیں
جن کو آج تک کوئی نہیں ''سلجھا'' سکا
جو مَیں کہوں کہ مَیں ''سلجھ'' سکا تو سر بسر
فریب اپنے آپ سے!
کہ عورتوں کی ساخت ہے وہ طنز اپنے آپ پر
جواب جس کا ہم نہیں ۲۴

میراجی کے ہاں عورت کا تصور تخیلاتی ہے، حقیقی عورت سے وہ نا آشنا ہیں۔ وہ عورت کو محض ایک خیالی پیکر سمجھتے ہیں، جو

فکر واحساس سے عاری ہے، محض جنسی تسکین کا خوبصورت احساس ہے، چوں کہ نارسائی اُن کا مقدر تھی اِس لیے، اُنھوں نے اپنے تمام احساسات عورت کے خیال ہی سے وابستہ رکھے، کیوں کہ حقیقی زندگی سے فراریت کا یہ راستہ بظاہر سہل تھا، لیکن اس سے میراجی کی ذات ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی تھی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ اپنے احساسات کی شدت کو محسوس کرنے والا عورت کے جذبات واحساسات کو سمجھنے سے قاصر رہا اور ساری زندگی اپنی یاسیت اور حزن وملال کا مرجع عورت کو قرار دیتا رہا، تاہم کہیں کہیں اُن کے ہاں ایک فعال اور باہمت عورت بھی دکھائی دیتی ہے، ''ادھورا گیت'' اِس حوالے سے اہم نظم ہے:

ہنگامہ لذت کا سماں چھایا ہوا تھا یکدم
رادھا بولی مجھے تم اپنا سہارا دو گے
عمر بھر کے لیے کیا اپنا سہارا دو گے
سن کہ یہ شیام چلے بن میں کہیں کھو ہی گئے
رادھا مبہوت تھی جیسے پل میں
کسی ساحر نے بنا ڈالا ہو سنگین مورت ۲۵؎

بدکرداری کی سزا میں عام طور پر مرد بے قصور اور عورت قصوروار ٹھہرائی جاتی ہے۔ عورت کی کوکھ میں پلنے والے حرام وجود اِسے ہی سنگسار کرنے کا باعث تو بن جاتے ہیں، لیکن فریقِ ثانی سماج کی نظروں میں صاف بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اعظم خورشید نے اِنھی خیالات کا اظہار نظم ''سنگسار ہونے والی لڑکی کے آخری الفاظ'' میں اس طرح کیا ہے:

جس نے مجھ کو
لفظوں کے اک ڈھیر پہ لا کے
کھڑا کیا تھا
جس نے مجھ سے پیار کیا تھا
جس نے کہا تھا، تو اچھی ہے
جس نے کہا تھا، تو رانی ہے
جس نے کہا تھا، مر جاؤں گا
جس نے کہا تھا!
جس نے کیا کیا کہا تھا
پہلا۔ پتھر۔ وہ۔ تھا سہیلی ۲۶؎

نظم ''بھوک''، ''گیلی مٹی'' میں عورت کے ثقافتی وسماجی استحصال کی نمائندگی کی ہے، اسی طرح ''قسم خدا کی'' اور ''یقین جانو'' میں لڑکیوں کی شادی کے مسائل اور مشکلات اور ناآسودہ خواہشوں میں سلگتی عورتوں کی داستانِ غم کی ترجمانی کی گئی ہے:

ہم ستر ہیں
ستر ہیں ہم
جب چاہو اوڑھ لو ۲۷؎

اِسی طرح عورت کی مجبوری و بے کسی کی تصویر کشی نظم ''رِم جھمی شب میں'' میں کی گئی ہے۔ غربت اچھے سے اچھے نگینوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ بہت سی لڑکیاں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتی ہیں، اُنھیں اپنے سے بھی زیادہ کمتر حیثیت کے ماحول میں زندگی کی ناؤ کھینا پڑتی ہے:

رِم جھمی شب میں
کچے گھر کی
اک لڑکی نے
ہلکے مکاں سے
شادی کر لی ۲۸

جاں نثار اختر نے ''مزدور عورتیں'' لکھ کر بھٹہ مزدوری کرنے والی عورتوں کی زندگی کے وبال اور اُن افراد کی بے بسی کی داستان پیش کی ہے:

گلنار! دیکھتی ہے یہ مزدور عورتیں
میلے پھٹے لباس ہیں محروم شست وشو
تو اور عطر و عنبر و مشک و عبیر و عُود
مزدور کے بھی خون کی آتی ہے اس میں بُو ۲۹

اختر الایمان عورت کی سرشت کے اصلاحی پہلو کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے کہ ماں قدم قدم پر اپنے لختِ جگر کو حقائق سے منکشف کرتی چلی جاتی ہے، تا کہ ابہام اس کی اولاد کو دھوکے میں مبتلا نہ کر دیں اور اس کی زندگی کی راہ کھوٹی نہ ہو جائے۔ صحیح راہ پر چلنے والے کو دنیا بیوقوف کہتی ہے، جو لوگ خود پستیوں میں گھرے ہوں، بلندی کا سفر کرنے والوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں، کیوں کہ جو چیز اپنی رسائی میں نہ ہو، تو رقابت پیدا ہوتی ہے۔ نظم ''تحلیل'' اور ''گونگی عورت'' اِسی کی عکاس ہیں:

کیوں حیرت سے تکتی ہے ایک ایک چہرے کو
کیا تجھ کو شکوہ ہے تیری گویائی کی طاقت
چھین کے قدرت نے بے انصافی کی ہے؟

- - - - - - -

میں تجھ کو اپنی گویائی دیتا ہوں!
یہ میرے کام نہیں آئی کچھ
میں ایسا بزدل ہوں جو ہر بے انصافی کو چپکے چپکے سہتا ہے
جس نے 'مقتل' اور قاتل دونوں دیکھے ہیں
لیکن دانائی کہہ کر
اپنی گویائی کو گونگا کر رکھا ہے! ۳۰

احسان دانش نے نظم ''جشنِ بے چارگی'' میں دُخترِ مزدور کی رُخصتی کے منظر کو بیان کیا ہے اور روایتی انداز برتتے ہوئے

باپ بٹی کے کندھوں پر شادی شدہ زندگی کی تمام ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے، نظم ''آزادی کے بعد'' میں غریب اور محنت کش طبقے کی عورت کی قربانیوں اور استحصال کی مختلف صورتوں کو پیش کیا ہے:

ہم نشیں شاعرِ مزدور سے حالات نہ پوچھ — کیسی جم جم کے ہوئی خون کی برسات نہ پوچھ

اِس قیامت کا تیرے دل پہ اثر ہے کہ نہیں — کس قدر کٹ گئے ساونت خبر ہے کہ نہیں

کتنے غم ہیں دلِ صد چاک میں معلوم بھی ہے؟ — عصمتیں کتنی ملیں خاک میں معلوم بھی ہے؟

کتنے کوثر کے کنول ٹوٹ گئے عام ہوئے — کس قدر پھول سے عارض تھے کہ نیلام ہوئے

کتنی ماؤں کے چھنے لختِ جگر یاد بھی ہے؟ — کتنے تاریک ہوئے شمس و قمر یاد بھی ہے

کتنی بے پردہ خواتین کے نکلے ہیں جلوس — جن میں اب کوئی سہاگن تھی نہ بیوہ، نہ عروس؟

اپنے بچوں کو بچاتے ہوئے انسان کٹے — حد یہ ہے دودھ ٹپکتے ہوئے پستان کٹے

جن کے گھر فخر و مباہات کے روشن تھے دیے — درِ شیطان پہ وہ مجبور ہیں سجدوں کے لیے

گال پچکے ہوئے مٹی کے پیالوں کی طرح — پتلیاں آنکھوں کی رستے ہوئے چھالوں کی طرح [۳۱]

فیض احمد فیض نے سماجی چیرہ دستیوں کی شکار عورتوں کے دُکھ اور کرب کو بڑے دل دوز انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً نظم ''خدا وہ وقت نہ لائے'' اور ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' میں لکھتے ہیں:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
اَن گنت صدیوں کے تاریک، بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ [۳۲]

صوفی تبسم نے ازدواجی زندگی کے بہت بڑے مسئلے میاں بیوی کی ہم آہنگی کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ہم آہنگی نفیِ ذات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ عام طور پر عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہی ان کٹھن مراحل سے گزرے گی، مرد اپنے پندار کے بتوں کو مضبوط سے مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔ نظم ''اپنے شوہر سے'' میں شادی شدہ زندگی کے اس اہم مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ بے تابیِ شوق
اتنی شدت

اتنی حدت

لے کے اک تودۂ گل

کوئی سی شکل بنا

اپنی صورت کی طرح، میری صورت کی طرح

دونوں کوتوڑ دے تو

ریزہ انھیں کر

کر کے پھر پانی سے تر

دونوں کو خوب ملا، خوب ملا

تا کہ بن جائے پھر اک تودۂ گل

اور اس تودے سے تو

ایک بت اپنا بنا

ایک بت میرا بنا

دونوں کو عذر سے پھر دیکھ ذرا

مری صورت سے عیاں

کچھ تری صورت ہوگی

تری صورت سے عیاں

کچھ مری صورت ہوگی ۳۳

گھر کی بربادی بھی ہے، گھر کی نگہبانی بھی   خانۂ زیست کا آساں نہیں درباں ہونا ۳۴

احمد ندیم قاسمی ہمہ جہت و ہمہ رنگ ادیب ہیں، اِن کے ہاں تانیثی شعور و ادراک غالب رُجحانات میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ قاسمی کے ہاں مقامی و بین الاقوامی سطح پر ہونے والے عورت کے استحصال کی داستان ملتی ہے، یہ استحصال سماجی ہو یا قابض افواج کی چیرہ دستیوں کی عکاسی اُن کی نظموں میں نمایاں ہے، مثلاً ''۲۵ الفاظ (بنگلہ دیش کی پہاڑی آبادی کے خطوط)''، ''سیاح کی ڈائری کا ایک ورق''، ''ویت نام کا دعوت نامہ''، ''ریستوران''، ''نیا ایشیا''، ''عرش و فرش'' وغیرہ اہم ہیں، اِسی طرح ''لڑکیو!''، ''سہاگن بیوہ''، ''میرے افسانے''، ''آخری سجدہ''، ''ستی''، ''عورت''، ''محرومی''، ''مغویہ''، ''آزادی کے بعد'' اور ''دختر فروش سے'' میں معاشرتی بے حسی اور سماجی ناہمواری کی داستان رقم کی ہے:

دھجیاں اپنی حمیت کی، چھپاؤ گے کہاں   سر سے نوچی ہوئی بیٹی کی ردا مت ڈھونڈو ۳۵

''کس کو آواز دوں

کس سے یہ راز کہہ دوں

کہ میں مذہب و نسل کے چند رنگیں غباروں کے بدلے میں بیچی ہوئی

ایک عورت ہوں

بیٹی ہوں

بیوی ہوں

ماں ہوں

بہن ہوں

میں اک مغویہ ہوں'' ۳۶

آزادی کے بعد کے مسائل و انسانی بے حسی اور خود غرضی کو نظم ''آزادی کے بعد'' میں پیش کیا ہے:

روٹیاں بوٹیوں سے تُلتی ہیں

عصمتوں کی سجی دُکانوں پر

پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے

خون کا ذائقہ زبانوں پر ۳۷

غربت و افلاس کے ہاتھوں عصمتوں و عفتوں کے سودے کرنے والوں کی مذمت نظم ''دختر فروش'' میں بیان کی گئی ہے:

فاقے بے شک کھینچتا جا، لیکن اے مفلس کسان

اپنی اِس مغموم اور معصوم بیٹی کو نہ بیچ

اُس کی آنکھوں میں وہ انداز محوِ خوابِ ناز

جن کے آگے لوگ شاہی کو سمجھ لیتے ہیں ہیچ ۳۸

مروجہ روایات کی شکار عورتوں میں بغاوت کا پیدا ہونا فطری عمل ہے۔ مرد کی بے حاکمیت اور جبر کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرنے والی خواتین بے حد مشکلات سے دوچار ہوتی ہیں، لیکن اُن کا تعینِ ذات کا سفر طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے، عورت کو نہ سمجھنے والوں کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی نے نظم ''عورت'' لکھی ہے، جس میں عورت کی پہچان اور حقوق کی بازیافت کی متمنی نظر آتی ہے:

سر بسر ایک ساز تیری ذات

پھر بھی صدیوں کا راز تیری ذات

راز آواز کی تلاش میں ہے

اور وہ ساز کی تلاش میں ہے ۳۹

کلیات 'رنگ، خوشبو، روشنی' (غزلیات) میں قتیل شفائی نے عورت کے حوالے سے ہر قسم کے سماجی رویوں اور استحصال کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اِن کے خیال میں مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں، تو پھر ادنیٰ و اعلیٰ اور کمتر و طاقتور کی تخصیص کیا، دونوں مساوی ہیں، ایک کا حق دوسرے پر یکساں ہے۔ زندگی کی گاڑی ان دونوں سے رواں دواں ہے، تو پھر مغائرت پیدا کرنے سے کیا حاصل۔ بھوک و افلاس کے ہاتھوں برہنہ ناچتی زخمی روحیں سماج کی روایتوں پر بدنما داغ ہیں بانجھ عورتوں کی زندگی میں گھولے جانے والے زہر کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔ بانجھ مرد کو تو معاشرہ ہر طرح تحفظ دیتا

ہے، لیکن بانجھ عورت سے جینے کا حق چھین لیتا ہے۔ شادی شدہ عورت کی زندگی کے مسائل، زبردستی کی شادی اور والدین اور ماں باپ کی بیٹی سے برتی جانے والی بے رُخی کے عذاب کو بھی قتیل شفائی نے شعری پیرائے میں بیان کیا ہے:

جو وہ حوا کی بیٹی ہے تو میں آدم کا بیٹا ہوں　　مجھے اُس کی ضرورت ہے اُسے میری ضرورت ہے ۴۰

آج کل سہاگن ہے نام اُس براگن کا　　صبر جس کا آنچل ہے، جبر جس کا گہنا ہے ۴۱

ننگی ہو کر ناچ رہی ہے بھوکی روحوں کی مجبوری　　جھانک سکو تو جھانک کے دیکھو جسموں کے انبار کے پیچھے ۴۲

قتیل جتنے بھی ہیں مصلحت کے سوداگر　　وہ زندگی کو چھپا کر گھروں میں رکھتے ہیں ۴۳

دوزخ تھی جس کی زندگی، جس کا کوئی بچہ نہ تھا　　شوہر کے گھر وہ بے نوا اک سوت جن کر آ گئی ۴۴

زبردستی سے جب ہیریں بٹھائی جائیں ڈولی میں　　جنازے اُن کو کہتے ہیں وہ باراتیں نہیں ہوتیں ۴۵

قتیل اہل و عیال اپنے جنھیں فرصت نہیں دیتے　　دُکھی بہنوں کو اکثر یاد وہ ماں جائے آتے ہیں ۴۶

اختر حسین جعفری نے ذہن اور باشعور عورت کے نہ سمجھے جانے کا نوحہ نظم بہ عنوان ”خدیجہ مستور کے لیے“ میں پیش کیا ہے:

کہارو! روک لو ڈولی
کہ آگے ایک صحرائے زیاں ہے منہدم گفتار کا، مسمار لفظوں کا
پریدہ رنگ، محمل، پھول اُس دشتِ تہی آثار سے واپس نہیں آتے
کہارو! روک لو ڈولی کہ دُلہن نے ہجومِ نوحہ خواں کے شور میں، چُپ میں
مرا حرفِ شکیبائی، مری تشبیہ کا گہنا
نہیں پہنا، نہیں پہنا
اگر پردیس میں گھبراؤ تو میکے چلی آنا
پُرانا ہو نہیں سکتا ترا گہنا مری بہناں ۴۷

نظم ”اکیلی چڑیا“ اُس عورت کی نمائندہ ہے، جو زندگی کے روز و شب میں شریکِ حیات ہونے کے باوجود تنہا رہ جاتی ہے۔ اُس کی آرزوئیں ہونٹوں تک آتے ہی دم توڑ جاتی ہیں۔ اپنائیت اور محبت سے سرشار لفظوں کی تراوٹوں سے محروم یہ عورت اپنے آنسوؤں کی کتھا سناتی ہے:

اکیلی چڑیا!
اکہری چھت ہے

اکہری چھت پر نمی بہت ہے
ترے بچھونے کی گھاس گیلی، پُرانا شہتیر بے حرارت
ٹپکتی کھپریل کے بروں میں از مین تا آسمان دیوارِ آئینہ ہے
نہ ڈھونڈ بستر کی سِلوٹوں میں، حسِ پریشاں میں
ان پروں کا نشانِ سایہ
برستی بُوندوں کے آئنہ ساز گنبدوں میں محال بھیگے
پروں سے اُڑنا

- - - - -

اکیلی چڑیا! سوال تیرا، ٹپکتی چھت پر قدم دھرے
تو پُرانا شہتیر بولتا ہے
اکیلی چڑیا! اکہری چھت ہے
اکہری چھت پر نمی بہت ہے ۴۸؎

نعیم صدیقی کے ہاں تانیثی رُجحان غالب ہے، اُنھوں نے عورتوں کو نہ صرف اُن کے حقوق سے آگاہ کیا ہے، بلکہ اُنھیں ان حقوق کے حصول کے لیے کاوش پر اُکسایا ہے۔ عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم زیورِ تعلیم سے محروم کرنا، باپ اور بھائیوں کے جرائم کی بھینٹ چڑھنا، غیرت کے نام پر قتل کیا جانا، زبردستی کا نکاح وغیرہ ان کا موضوعِ خاص ہے۔ نعیم صدیقی نے خواتین کو اس ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ نظم ''فِدیہ'' میں لکھتے ہیں:

جاگتا ہو دل میں عورت کے اگر
اپنی نسوانی حمیت کا شعور
تو۔۔۔ یہ جوشِ انتقام!
اس میں آجاتی ہے اک درندگی!
ایک ایسے باپ کی بیٹی ہوں میں
ایک ایسے بھائی کی آپا ہوں میں
ٹھنڈے دل سے دل کے فدیہ میں مجھے
اپنی جانوں کو بچا آئے ہیں
ہاں بچا کر آنکھ، عزت کو اڑا لے آئے ہیں

- - - -

میں نے بھی باپ اور بھائی کی طرح
حفظِ جاں کا جو ہوا ساماں کیا!
قوم کی غیرت کی کل تاریخ کو،

خاندانی آبرو کے پاس کو
اپنی نسوانی حیا کے جوش کو
چند سانسوں کے لیے فدیہ میں ہنس کر دے دیا! ۴۹

اسی طرح ''رُخصتی''، ''آمیزشِ مسرت وغم''، ''تم''، ''اگر تم ساتھ نہ دو''، ''اگر میں چاہوں تو'' اور ''بہن کی تصویر نہ بیچ'' وغیرہ نظمیں تانیثی رُجحان کی عکاس ہیں:

جنسِ عفت مری، اے صاحبِ تشہیر نہ بیچ
شرم کر بھائی! مری عظمتِ تقدیر نہ بیچ ۵۰

ظہیر کاشمیری کی نظموں ''ناچ رہی رقاصہ'' اور ''میڈم فی فی'' میں جوگلیمر کی دنیا کی چکا چوند اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے والیوں کی تصویر کشی کی ہے، جو بالآخر وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے بے اعتنائی و بے حسی کا شکار ہوتی ہیں:

ملا کو ایمان مبارک دھرم کو اپنی بھاشہ
بیچو جسموں کی مہکاریں نیلم ہو یا آشا
ناچ رہی رقاصہ ۵۱

شہرت بخاری کے ہاں استحصال شدہ عورت کو ہلو کے بیل کر طرح روزمرہ زندگی کے کاموں میں اِس طرح دھنسی ہوتی ہیں، جس میں اپنی ذات کا شعور اور اپنے حقوق سے آگاہی کا تصور کم دکھائی دیتا ہے۔ سماج کی روایتوں میں پسی ہوئی یہ عورت شہرت بخاری کے خیال میں بے جان روح بننے کی بجائے، جبرِ مسلسل کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائے، تو سماجی انقلاب کے علمبردار بن جائے گی:

دیکھیں کیسے اُٹھ جانے پہ روتا ہے زمانہ　　　تم جبرِ مجسم ہو، میں تسلیم کا پیکر
دل ہیں نہ دماغ اُن کے، زبانیں ہیں نہ آنکھیں　　　آباد ہوئی کون سی مخلوق یہ گھر گھر ۵۲

شہرت اُنھی کے شوق میں گھلتا رہا ہے دل　　　جن سے ہمارے حق میں سدا غفلتیں ہوئیں ۵۳

ساحر لدھیانوی تانیثی طرزِ احساس کے شاعر ہیں، اِنھوں نے معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک اور استحصالی رویوں کی مذمت کی ہے۔ ''سرزمینِ یاس''، ''گریز''، ''چکلے''، ''طلوعِ اشتراکیت'' ''پھر وہی کنجِ قفس''، ''پرچھائیں''، ''یکسوئی''، ''صبحِ نوروز'' اور ''غزل'' وغیرہ میں خانگی تشدد اور سماجی استحصال کی مختلف صورتوں کی نشاندہی کی گئی ہے:

کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو ۵۴

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقاں کی بیٹی

افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے ۵۵؎

غزل میں محبوب کا حُسن اور معاملاتِ عشق موضوع بنتے ہیں، ساحرلدھیانوی نے اِسی محبوب کو ماورائیت سے قطعِ نظر حقیقی روپ دیا ہے، اِن کی نظم بہ عنوان ''غزل'' میں عورت اور سماجی استبداد کے علاوہ استحصالی رویے نمایاں ہیں:

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا
تُلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے، جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
مردوں کے لیے ہر ظلم روا، عورت کے لیے رونا بھی خطا
مردوں کے لیے ہر عیش کا حق، عورت کے لیے جینا بھی سزا
مردوں کے لیے لاکھوں سیجیں، عورت کے لیے بس ایک چتا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
جن سینوں نے ان کو دودھ دیا ان سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اُگے کونپل بن کر اس تن کو ذلیل و خوار کیا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
سنسار کی ہر اک بے شرمی غربت کی گود میں پلتی ہے
چکلوں ہی میں آ کر رکتی ہے، فاقوں سے جو راہ نکلتی ہے
مردوں کی ہوس ہے جو اکثر عورت کے پاپ میں ڈھلتی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
عورت سنسار کی قسمت پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پر لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا ۵۶؎

جمیل الدین عالی نے روایتی انداز سے ہٹ کر بیوی کی تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنانے کی بجائے اُس کی محبت اور چاہت کو برملا تسلیم کیا ہے:

عالیؔ تیرا بھید ہے کیا ہر دوہے پر بل کھائے　　　　میں جانوں ترے پاپی من کو گھر والی یاد آئے ۵۷

عورت، بھوک و افلاس کے ہاتھوں جہاں جسم فروشی پر مجبور کر دی جاتی ہے وہیں باپ اور بیٹے عزتوں کے رکھوالے اپنے اغراض، جوا، نشہ اور عیاشی کے لے ماں، بیٹی، بہنوں کا سودا کر دیتے ہیں:

گاؤں کی سب سے سُندر بلا مار گئے سرکار　　　　گاؤں کی نمبر اوّل لے گئے تھانے دار ۵۸

بھوکی آنکھ سے بیٹا دیکھے خالی پیٹ ہو باپ　　　　ساوتری ماں بیٹی لاج سے روز کرائے پاپ ۵۹

زمیندار و مزارع اور کمی کمین کہلائے جانے والے انسانوں کے طبقے کی عورتیں، زمینداروں، ساہوکاروں اور ٹھیکیداروں کی عیاشی کا سامان بنتی ہیں:

کھیت کٹا تو لے گئے ٹھاکر، منشی، ساہوکار　　　　گھر پہنچے تو بھوکی بہو اک برچھی سی دے مار ۶۰

اے بھیّن تر اُجلا سا چہرہ ان کے رنگ بڑھائے　　　　اے بھیّن تری اپنی عورت دوجے کے گھر جائے ۶۱

کس کس ماں کی کوکھ جلے کس کس دلہن کا سہاگ　　　　ایک پرانی چنگاری سے کب تک جلے گی آگ ۶۲

ڈاکٹر وزیر آغا کثیر الجہاتی صفات کے مالک ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں اُن کا فہم و ادراک سماجی رویوں کی نقاب کشائی کی طرف مائل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تانیثیت کا موضوع بھی ان کی باریک بیں نظر سے پوشیدہ نہیں، مثلاً ''لفظوں سے مت تولو مجھ کو''، ''سانتا کلاز'' اور ''مسافر چلتے رہتے ہیں'' اہم نظمیں ہیں:

تولنا ہے تو مجھ کو تو لو
ریشم کی اک کترن سے
یا خوشبو کی اک چٹکی سے
یا بادل کے اک اُڑتے پر سے
لفظوں سے مت تولو مجھ کو ۶۳

کھلونوں کے اور ٹافیوں کے
حسیں خواب تکتی ہوئی سوگئی ہے
اُس کی چھوٹی سی کھٹیا کے پائے سے
لٹکا ہوا سبز تھیلا مجھے ڈھونڈنا ہے
مجھے سبز تھیلے کو بھرنا ہے

اِن موتیوں سے بنے
چھچھاتے کھلونوں سے جو
اپنی آنکھوں کے اندر چھپا کر میں لایا ہوں
کہنا ہے اُس سے:
مرے ہاتھ اَب کے برس کچھ نہیں لا سکے میری بیٹی،
مگر میری آنکھیں تو خالی نہیں ہیں! ٦٤

میں نے تم کو جنم دیا ہے
''ماں'' کو کہہ کر
تم مجھے پکارو!
اور وہ اُس کے
ریشم ایسے ہاتھوں میں رونے لگتے ہیں
بچھڑی ماں کی
دودھ بھری چھاتی کی خاطر
اک کہرام مچا دیتے ہیں
لیکن وہ سنتی ہی کہاں ہے
اپنے بنجر سینے سے چمٹا کر اُن کو
پورے زور سے چیختی ہے
تم میرے ہو تم میرے ہو! ٦٥

احمد فراز کی نظموں ''مجسمہ''، ''منسوبہ سے''، ''منصور'' اور ''شہرِ آشوب'' کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار میں تانیثیت کی عکاسی ملتی ہے۔ غالب نے اپنی بیوی کو پاؤں کی بیڑی اور بچوں کو ہتھکڑی کہا تھا، جب کہ احمد فراز نے تسلیم کیا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس یا پیرہن ہیں۔ اب تک عورت بہ حیثیتِ بیوی تضحیک و تنقید کا نشانہ بنی رہی، لیکن احمد فراز نے اس کے وقار اور عظمت کو تسلیم کیا ہے، جو اسے ودیعت کیا گیا ہے:

وہ پیرہن تھی مگر جسم و جاں رہی میری　　　　کہ جو بھی جیسا بھی موسم تھا حسبِ حال تھی وہ ٦٦

نظم ''شہرِ آشوب'' میں بھی سماجی ایسے کی نشاندہی کی ہے کہ مرد کے لیے، تو کتھارسس کے کئی مواقع ہیں، لیکن عورت گھر کی چاردیواری میں مقید رہتی ہے اور کولہو کے بیل کی طرح امورِ خانہ داری سرانجام دیتی ہیں:

کتنے بے گہنوں کے گلے پر
روز کمندیں پڑتی ہیں
بوڑھے بچے گھروں سے غائب

بیبیاں جیل میں سڑتی ہیں ۶۷

''منسوبہ سے'' میں احمد فراز نے وٹہ سٹہ، شادی کے نام پر لڑکی کو بیچنا اور بے جوڑ شادی کی شدید مذمت کرتے ہوئے اِس استحصالی کا نشانہ بننے والی لڑکیوں کو اِن رسُومات سے بغاوت کرنے پر اُکسایا ہے:

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم وحیا کی مہریں
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا
کالے بازار میں نیلام اُٹھا کر تیرا
سبز باغوں کے تصور پہ تجھے تول دیا

- - - - - - - - - - - -

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتۂ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ ان کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اُتر جائے گی ۶۸

مجید امجد نے جہاں فطرت کو اپنی شاعری کا موضوعِ خاص منتخب کیا ہے، وہاں سماجی اور معاشرتی حقائق کو بھی منظرِ عام لانے کی کوشش کی ہے۔ نظم ''شرط'' اور ''بیاہی ہوئی سہیلی کا خط'' میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کی مذمت کرتے ہوئے عورتوں میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ خاموش دکھوں کو سہنے کی بجائے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرے:

کیا یہ سچ ہے میری سہیلی کہ تم جلد ہی اب بیاہی جاؤ گی
اِک نئی زندگی میں اترو گی اِک نئی قید گہہ بساؤ گی
آج تک جن سے تم بچھڑ نہ سکیں ان کو اس طرح چھوڑ جاؤ گی
ایک گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپ کر زیست کی قید کاٹ جاؤ گی ۶۹

جو تو نہ ہوتی تو یوں درخشندہ شمعِ بزمِ جہاں نہ ہوئی
وجودِ ارض وسما نہ ہوتا نمودِ کون ومکاں نہ ہوئی
بشر کی محدودیت کی خاطر ترستی عالم کی بیکرانی ۷۰

ماں کے مرنے کے بعد چچی کے عتاب کا شکار ہونے والی بچی کی داستان جسے باپ بھی نہیں پوچھتا، نظم ''چچی'' میں اِسی موضوع پر لکھتے ہیں:

کیوں نہ ہو اس دُکھ کی ماری کے لیے جینا وبال
اک چچی کے ہاتھ میں ہو جس کے گھر کی دیکھ بال
باپ جس کا کارخانے میں کہیں مزدور ہو
اپنی اکلوتی جواں بیٹی سے کوسوں دور ہو

جس کی ماں پھر لوٹ کر فردوس سے آتی نہ ہو

وہ ابھاگن! جس بچاری کا کوئی بھائی نہ ہو ؎۱

ننگی موت کے بھینٹ ہوا جب بیس روپے کا دان

جڑے تڑے پنجر پر ڈال کے سرد سفید کفن

قبر میں جھونک دیے لوگوں نے اک دکھیا کے پران

- - - - - - - - - -

میری روح کو ڈھانپ گیا اک زہر بھرا طوفان

ننگی موت کے بھینٹ ہوا جب بیس روپے کا دان ؎۲

ساقی فاروقی صفِ اول کے تانیثی رُجحان کے شاعر ہیں ، اِن کی نظموں ''داشتہ''، ''پیرا سائیٹ''، ''بہن کی موت''، ''بریسٹ کینسر''، ''بانجھ''، ''کمِٹ مِنٹ''، '' شہناز بانو دختر شہباز حسین''، '' بندۂ مومن کا ہاتھ''، '' باجوا''، ''بدگمانی''، ''فینٹیسی'' اور ''حمل سرا'' وغیرہ میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم، جنسی تشدد کی مختلف صورتوں اور سماجی روایات کے شکنجے جانے کا نوحہ پیش کیا ہے، اُنھوں نے نظم ''حمل سرا'' میں بیوی کے استحصال کا رزمیہ بڑی مہارت سے بیان کیا ہے، شوہر اپنا رعب اور دھاک جمانے کی خاطر عورت کو دبائے رکھنا اپنا شیوہ سمجھتا ہے یہ سمجھے بغیر کہ وہ حقیقی عورت کا قتل کر کے ایک کٹھ پتلی پیدا کر رہا ہے:

دادی اماں ۔۔۔۔

(بستی کے سب سے ممتاز

گھرانے کی بیٹی ۔۔۔۔

سب سے معتزز

آنگن کی دلہن ۔۔۔۔

ماشااللہ

ستر کے پیٹے میں ہوں گی)

- - - - -

اِن کے اندر تنہائی کا زہر اُترتا چلا گیا

(اور زمانہ

اردگرد سے

پرچھائیں کی طرح گزرتا چلا گیا)

سوگ میں ہیں،

تریاق مانگتی ہیں ۔۔۔

ایک جنم تک
اندھی گونگی بہری بن کے
اپنے ہی گھر میں بے دخل،
بے قدری کے ''سخی حسن'' میں دفن رہیں
آج نئے آفاق مانگتی ہیں
دادی اماں طلاق مانگتی ہیں۔۔۔ ۳ے

نظم ''پیراسائیٹ'' میں عورتوں کی قربانی کا ذکر ہے، جو سماج ہمیشہ اُس سے توقع کرتا ہے کہ گھر آباد کرنے میں صرف عورت کی قربانی ہی کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ تمام جذباتی بوجھ اسی کے کندھوں پر لادا جاتا ہے۔ اُس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہی سب کچھ سہارے مرد کی بے حسی، سسرال والوں کی منافقت اور حسد ورقابت، فتنہ وفساد، غرض ہر بات پر مورد الزام ٹھہرائی جاتی ہے۔ مرد کی آوارگی، بے عملی، بے روزگاری، نشہ وجوا وغیرہ، جیسی دیگر اخلاقی بیماریوں کو سہارنا اس کی ذمہ داری ، بلکہ فرض تصور کیا جاتا ہے۔ پھر گھر بار کی دیکھ بال اور اولاد کی ذمہ داریاں بھی اسی کے ناتواں کندھوں پر ڈال دی جاتی ہیں۔ مرد کی عدالت میں ہر وقت پیشی بھگتنے والی ہار جاتی ہے، اس کا وجود شکستہ ہو کر بکھرنے لگتا ہے، اس کا اصل مونس وغم خوار کوئی نہیں ہوتا۔ محض اغراض کی ڈور میں بندھی ہوئی یہ عورت، بالآخر اپنی ہی خوشبو میں ڈوب کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہے:

جو سہاگن بیل
برسوں جان رس پیتی رہی
دو بدن کے موسموں کی آگ سے
کمھلا گئی

رات کی چمنی سے اُتری ہے نجات
پھر محبت اپنے جادو گھر میں
تنہا ہو گئی

اپنی خوش بو سے لپٹ کر سو گئی ۴ے

عموماً بے اولادی کی تمام تر ذمہ داری عورت کے سر ڈال دی جاتی ہے۔ مرد خود اپنی خامیوں کو تسلیم کرنے کی بجائے نکاح پر نکاح کیے جاتا ہے۔ اس ظلم میں اس کے اہلِ خانہ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ نظم ''بانجھ'' اس استحصال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مغرب کی طرح مشرق میں بھی محرم کے ساتھ زنا کی شرم ناک وبا عام ہے۔ نظم ''شہناز بانو دختر شہباز حسین'' بقول ساقی فاروقی یہ نظم لاکھوں کروڑوں بے زبانوں کو زبان دینے کی ایک کوشش ہے:

سوچتے سوچتے
سبز آنکھوں میں خون اُتر آیا
اور بارہ گھنٹوں میں بارہ صدیاں بیت گئیں
اپنی آگ میں لوٹ پوٹ۔۔۔۔

۔۔۔اچانک اُٹھ کر
باپ کے کمرے میں درّانا چلی گئی
ڈری ڈری سی باہر آئی
دائیں ہاتھ میں لال چھری تھی
بائیں ہاتھ میں ایک مردہ سا
ختنہ شدہ ساچوہا تھا
اور ابا جی
بَھل بَھل بہتے خون میں لَت پَت
پڑے ہوئے تھے ۵؎

سلیم احمد کی شاعری میں کہیں کہیں تانیثی رنگ نمایاں ہے، مثلاً ''مسٹر ایکس کی ڈائری''، ''میں اور وہ'' اور ''نثرے'' میں عورت سے برتی جانے والی سماجی ناانصافی کا ذکر ملتا ہے، اِن کی شاعری میں گھریلو تشدد کے علاوہ شادی کے نام پر غلامی کا طوق پہنائے جانے کی شدید مذمت پائی جاتی ہے:

میں، تنہائی
اور خالی بستر سے
گھبراتی ہوں
گھر میں 'ایکس' مین ہوتا ہے ٦؎

ترے نوجوانوں میں ہر ایک
اپنے پڑوسی کی بیوی پہ
یوں ہنہناتا ہے
جیسے شہوت سے گل جائے گا ٧؎

سلیم احمد نے ''نثرے'' کے ذریعے اپنا مدعا بیان کیا ہے:

''موت کا انتظار فلیٹوں کے تنگ و تاریک کمروں میں وہ پاک باز عورتیں بھی کرتی ہیں جن کی بکارت کا معاوضہ مہر کے پیسوں اور درجن بھر بدصورت بچوں کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔۔۔ہمیں طوفان اور موت کے درمیان زندگی یولیسس کے سفر کی طرح بامعنی معلوم ہوتی ہے۔'' ٨؎

''حوا کی بیٹی کا کام مستقبل کی تخلیق ہے ورنہ جنت کے بعد تو کوئی گھر آباد نہ ہوتا، خود کلامی اور ماضی کی محبت آدم کے پچھتاووں کا نام ہے۔''٩؎

شہزاد احمد کے ہاں کہیں کہیں تانیثی احساس نمایاں ہے۔لڑکیوں کو ہراساں کیے جانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

راہ چلتی کوئی لڑکی کہ سگ آوارہ　　　کون محفوظ ہے، رستے میں کھڑے لوگوں سے ۸۰

اور تو کیا دے سکیں گی در بدر کی ٹھوکریں　　　یہ زمانہ اس کی آنکھوں کی حیا لے جائے گا ۸۱

کانچ کی گڑیاں طاق میں کب تک آپ سجائے رکھیں گے　　　آج نہیں تو کل ٹوٹے گا، جس کا نام کھلونا ہے ۸۲

جاوید شاہین نے اپنے منفرد انداز میں تانیثی سوچ کی عکاسی اشعار کی صورت میں بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ مرد و عورت بہ حیثیت شریکِ حیات ایک دوسرے کو نظر انداز نہ کریں، تو زندگی آسانیوں اور خوشیوں کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ جاوید شاہین نے خانگی زندگی کا کامیابی اور خوشحالی کا حل تلاش کرتے ہوئے مفاہمت کی راہیں ہموار کی ہیں اور ایک عورت کے سچے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے بُرے دنوں کو اپنے کمرے کی چار دیواری اور پوشیدہ راتوں کو آنگن سے نکال دینے کا مشورہ دیا ہے میاں بیوی کا آپس کا کوئی راز، راز نہیں ہوتا، بلکہ ایک دوسرے کے ہمراز و محرم ہیں، یہی خانگی زندگی کی کامیابی ہے:

ہزار گھِرے رہے، جبر کا حصارِ سیہ　　　کہ بابِ راہِ اماں درمیاں سے نکلے گا ۸۳

گم سُم رکھے گی تجھ کو کہاں تک وہ ایک یاد　　　منہ سے ہٹا کے پہلی سی چادر بھی دیکھ لے ۸۴

اس شور میں جینے کی یہی ایک ہے صورت　　　اب چار طرف جسم کے دیوار بھی رکھ لے ۸۵

سب سے پہلے یہ بُرے دن مرے کمروں سے اُٹھا　　　پھر یہ پوشیدہ سی راتیں مرے آنگن سے نکال ۸۶

اتنے سارے خوابوں کا چوری ہو جانا
اور شور نہ مچنا
اتنے سارے خوابوں کا قتل ہو جانا
اور سراغ نہ ملنا
اتنی ساری لاشوں کا دریا میں بہا دیا جانا
اور پانی کا رنگ نہ بدلنا
کیسے ممکن ہے
تمھاری مرضی کے بغیر
تمھاری شرکت کے بغیر
پھر وہ گود میں اُٹھایا ہوا چاند
میری طرف بڑھا کر بولی!

''اس کے سر پر ہاتھ رکھو

اور قسم کھاؤ

اپنی بے گناہی کی

اپنی معصومیت کی۔۔۔''

اور میں اس کا منہ تکتا رہ گیا ۸۷؎

انور مسعود نے ''ہو چکی ترقی'' میں عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے والی تنظیم APWA کے کردار و خدمات سے قطعِ نظر اس بات کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح حقوق آشنا اور سوشل ورکرز خواتین ہمیشہ سے ہدفِ تنقید بنی رہی ہیں۔ عورت پر سماجی سطح پر سب سے بڑی چوٹ پردے کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ پردے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مغرب کی اندھی تقلید میں بے پردگی کا ہر کوئی باشعور مرد و عورت مخالف ہی ہے، لیکن عورت کے ساتھ برتے جانے والے ناروا سلوک، تشدد، سماجی استحصال، قتل، تیزاب یا جلایا جانا، جائیداد اور جائز حقوق سے محروم کیے جانے کے خلاف بھی اس قسم کا شدید ردِ عمل آنا چاہیے، تاکہ ان سماجی برائیوں کی بیخ کنی کی جا سکے:

اپوا کی پُر خلوص مساعی کے باوجود

اب تک ہے اک رویۂ پسماندگی یہاں

انور مجھے تو فکرِ ثقافت نے آ لیا

باپردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ۸۸؎

انور مسعود نے نہایت مہارت کے ساتھ اس دَور میں عورت کے روا رکھے جانے والے سلوک اور استحصالی رویے پر طنز کیا ہے، عورت کی خود مختاری کی آڑ میں مرد نے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ عورت کے کندھوں پر ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی پرورش و تربیت کے علاوہ پڑھی لکھی عورت کے دفتری اور ملازمتی اُمور سے لے کر بل جمع کروانے تک کی تمام ذمہ داریاں ڈال دی جاتی ہیں۔ مرد نے بظاہر اپنے لیے سہل راستہ چنا ہے، لیکن اس میں وہ اپنے فطری جوہر غیرت و حمیت اور حصولِ رزق کے لیے کاوش، اپنے کنبے کی کفالت اور دیکھ بھال جیسی ذمہ داریوں سے بری الزمہ ہوتا جا رہا ہے۔ نتیجۂ آج کی عورت زیادہ بااعتماد ہو رہی ہے اور مرد انفعالیت کا شکار ہو کر قدرت کی ودیعت کردہ برتری کے جوہر سے مستثنیٰ ہو رہے ہیں۔ مثلاً نظم ''شانہ بشانہ'' میں مردوں کی بے عملی کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے:

چھوڑ دینا چاہیے خلوت نشینی کا خیال

وقت بدلا ہے تو ہم کو بھی بدلنا چاہیے

یہ بھی کیا مَردوں کی صورت گھر میں ہی بیٹھے رہیں

عورتوں کی طرح باہر بھی نکلنا چاہیے ۸۹؎

انور مسعود نے طنزیہ و مزاحیہ پرائے اور ہلکے پھلکے انداز میں سماجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے، جیسا کہ مرد گھر کے کام میں ہاتھ بٹانا اپنی توہین سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ سنتِ نبوی ہے۔ مرد کا یہ متعصبانہ رویہ اجتمائی لاشعور کا حصہ ہی تو ہے۔ ''پدر تمام کند'' میں لکھتے ہیں:

بھینس رکھنے کا تکلف ہم سے ہو سکتا نہیں
ہم نے سُوکھے دُودھ کا ڈبا جو ہے رکھا ہوا
گھر میں رکھیّں غیر محرم کو ملازم کس لیے
کام کرنے کے لیے ابّا جو ہے رکھا ہوا ۹۰

انیس ناگی منفرد طرزِ احساس کے شاعر ہیں، اُنھوں نے ادب اور زندگی میں، نئے اسالیب کے استعمال سے، نیا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی اور روایت پرستی اور قدامت پرستی سے قطع نظر نئے اندازِ فکر اختیار کیا اور تانیثیت کے حوالے سے بہت سے سماجی حقائق کی نقاب کشائی کی ہے۔ مثلاً ''میری دُلہن کی نائیکہ''؛''دیکھنے کی خواہش میں جینا'' ''ہذیان کی رات''؛''مسخ چہرے''؛''نارسنگھ کی آواز''؛''کس طرح ہو''اور''ایک نیک عورت'' وغیرہ میں انیس ناگی بعض جگہ تمثیلی انداز اختیار کیا ہے اور معصوم بچیوں کی خواہش یعنی نئے فیشن کے کپڑے نہ ملنے پر رونا اور بچوں کا من بھاتا لباس کے نہ خریدنے کی استطاعت رکھنے ملنے کی صورت میں والدین کے درد و کرب کا بیان کیا ہے۔ اسی طرح نظم ''دیکھنے کی خواہش میں جینا'' اور ''ہذیان کی رات'' میں نارسائی کا نوحہ بیان کیا ہے:

خواہش اور حنا سے متلی،
اور متلی سے میرا جسم جاگ اُٹھا تھا

- - - - -

خواہش اور ننگے پن میں بس ایک نگاہ کا رشتہ قائم
آنکھوں میں تاریک اجالا، دھندلا اور مدھم
اور دُور کہیں روتی آوازوں کا ماتم۔۔
مت رو دلہن میں بیمار نہیں ہوں

- - - - - - - -

کل شام لرزتے ہاتھ سے میں نے تیرے لیے بس
ایک جنم کی خاموش اطاعت، مایوسی کا زیور اور سو سال پُرانا صندوق لیا تھا
گھر بار بسانے کی خاطر اس نے کتنا سامان دیا تھا!
دلہن میں بیمار نہیں ہوں
اقرار کروں تو کیسے؟
انتڑیوں میں آگ، لہو میں شعلے روشن، آنکھوں میں تاریکی اور تاریکی میں
بے انت خاموشی، رگ رگ میں غصہ اور غصے میں نامردی کی جھاگ
شرافت اور نیکی کے ماتم میں شام سویرے رنگ بدلتی ہے ۹۱

انیس ناگی نے جہاں مرد کے ذہنی و قلبی تضاد کو موضوع بنایا ہے وہیں عورت کے تضادات کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہیں جس کی خاطر کسی نے جنس و ہوس کی باتیں چھوڑیں وہی اپنا برقعہ بستر پر بھول گئی۔ ''ایک نیک عورت'' ایسی آزادیوں پر طنز

ہے، جو برقعوں کی آڑ میں سامانِ تلذذ کرتی ہیں:

میں نے بھی ایک عورت سے بے کیف محبت کی تھی
وہ مجھ سے ملتے ہی مذہب اور اخلاق کی باتیں کرتی تھی
پیروں فقیروں کی روحانی طاقت کی
اور کہتی تھی
مرد حرامی ہوتے ہیں
بروقت وہ بستر سے اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا،
واپس آیا تو وہ کہیں نہیں تھی
اور اپنا برقعہ بستر پر بھول گئی تھی۔ ۹۲

''کس طرح ہو'' میں ان سماجی ناسوروں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو عورت کو تشدد کا نشانہ بنا کر اپنی مردانگی کی تسکین کرتے ہیں۔ عورت کو اپنی متاع، غلام اور دستِ نگر سمجھتے ہوئے مارنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ عورت پر ہاتھ اُٹھانے سے ان کی انانیت اور جذبۂ فوقیت کو تسکین ملتی ہے۔ ایسے گھناؤنے جُرم میں ملوث افراد کی نشاندہی انیس ناگی نے بڑی چابکدستی سے کی ہے:

ایسے خطوں میں
جن کے شب و روز میں ابتری ہے
جہاں آدمی بے وقعت ہے
جہاں تھانوں میں عورتوں کو
برہنہ زدوکوب کرنے کا دستور ہے
کیا کروں؟
کس طرح میں رہوں گا؟
کہ میرے تعاقب میں قسمت لگی ہے۔ ۹۳

خورشید رضوی نے لڑکیوں کی شادی سے پہلے قائم کردہ رنگین خوابوں کے پل پل ٹوٹنے کے کرب اور استحصال کی عکاسی کی ہے۔ لڑکیوں کو آنکھ کھولتے ہی اگلے گھر کے سندیے دیے جاتے ہیں، یہی تصور اُبھرتا ہے، جس کی وجہ سے ایسا تصور اُبھرتا ہے کہ وہ ایسا شخص ہوگا، جو درحقیقت نجات دہندہ ہوگا، لیکن بہت جلد اتنے ارمانوں اور خواہشوں کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرنے والی کرب و بلا کی اذیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ خوابوں کے طلسم ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ارمانوں سے خاک اُترنے لگتی ہے۔ اُن پر بھیانک حقیقتیں چھا جاتی ہیں:

میں اِس لیے نہیں کہ تجھے شادماں رکھوں   میری عطا یہ ہے کہ ترا دل دُکھاؤں میں ۹۴

لڑکیاں قید میں سیلی ہوئی دیواروں ہیں   شاہزادہ کوئی آیا نہ کوئی شاہسوار ۹۵

نظم ''فیصلہ'' میں استحصال شدہ عورت کی ذہنی کشمکش کی عکاسی ملتی ہے:

اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں
اجنبی پھر نہ کوئی درپے آزار آ جائے
ایک دستک میں مری ساری فصیلیں ڈھا جائے
اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں
ایک احرام نہ چُن لوں صفتِ دُودِ حریر
کوئی آئے تو بس اک گنبدِ در بستہ ملے
رازِ سر بستہ ملے
لاکھ سر پھوڑے صدا کوئی نہ مجھ تک پہنچے
قاصدِ موجِ ہوا کوئی نہ مجھ تک پہنچے
اب کے دیوار میں دروازہ رکھوں یا نہ رکھوں ۹۶

اختر شمار کے خیال میں عورت مجہول یا بے بس نہیں ہوتی، بلکہ بنادی جاتی ہے۔ اِسے جیتا جاگتا انسان تصور کر کے بہت سی اُلجھنوں اور مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ مرد کی شریکِ حیات و شریک سفر زندگی کے ہر میدان و ہر قدم پر محرم راز ہوتی ہے، لیکن پھر بھی نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ موجودہ دَور کی عورت نہ صرف زندگی کی ساتھ ہے، بلکہ اُمورِ زندگی میں بھی ہم قدم ہے، اور فکرِ معاش میں ان تھک ساتھی ثابت ہوتی ہے۔ اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے والوں کی اختر شمار نے شدید مذمت کی ہے:

خونی رشتہ اور نہ قبیلہ دیکھتی ہے
اب تو دُنیا، دولتِ دُنیا دیکھتی ہے
سر کی سفیدی لحہ لحہ دیکھتی ہے
جب بھی وہ لڑکی آئینہ دیکھتی ہے
روتے روتے خواب میں اِک بنتِ مزدور
ارمانوں کا اُٹھتا جنازہ دیکھتی ہے
جانے کون ہے شام ڈھلے جو پنگھٹ پر
گُم صُم بیٹھی سُونا رستہ دیکھتی ہے
آج کی لڑکی بھی ہے کتنی بھولی شمارؔ
اب بھی شہزادے کا سپنا دیکھتی ہے ۹۷

یہ شعر سماجی نوحہ ہے۔ جبر اُ شادیاں، یک طرفہ عشق یا احساسات کا مرجانا وغیرہ، جیسے مسائل کا عکاسی ہے:

ہم اُس کے گانو میں پہنچے تو اور منظر تھا — وہاں پڑا تھا جنازہ بجائے ڈولی کے ۹۸

اختر شمار دیگر اقدار کی طرح خاندانی نظام اور اس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں، وہ شریکِ حیات افراد کو ایک دوسرے کی منزل قرار دیتے ہیں، اِن کے خیال میں، جو شخص اس حقیقت کا انکاری ہوتا ہے، تمام عمر وہ لق و دق صحرا میں بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ لہٰذا، اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے شریکِ سفرِ زندگی ہی کو محبوب مان لیا جائے، تو زندگی جنتِ ارضی سے کم نہیں ہوتی، ورنہ ایک کی

آوارگی دوسرے کی جذباتی موت بن جاتی ہے، عموماً عورت ہی مرد کے خودساختہ اور خودغرضانہ افکار کی بھینٹ چڑھتی ہے:

میں زندگی کے سفر میں تھا مشغلہ اُس کا　　وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے مجھ کو گنوا دیا کرتا

اُسے سمیٹتا میں جب بھی ایک نقطے میں　　وہ میرے دھیان میں تتلی اُڑا دیا کرتا ۹۹

اغراض کی بھینٹ چڑھائی جانے والی لڑکیوں، عورتوں کی زندگی کا المیہ اختر شمار کی نظموں سے اوجھل نہیں ہوا۔ جبر واستعداد کے اس کھیل میں وُنی، ولوَر، وٹہ سٹہ، زبردستی کی بے جوڑ شادیاں اور عورتوں کو مختلف صورتوں بیچا جانا، پنچائیتوں کے فیصلوں پر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا جانا، نہایت کربنا کی کو ظاہر کرتا ہے:

وقت کے قاضی نے رکھی　　اب کے میری کھال پر آنکھ ۱۰۰

اختر شمار نے عورت کے ارمانوں کی موت کا نوحہ ''مجبور دوشیزاؤں کا گیت'' میں بیان کیا ہے۔ مرد محض اُسے اپنی مرضی سے چلانے کے لیے کل پُرزوں کی طرح سمجھتے ہیں، یعنی ایسی کٹھ پتلی، جس کی طنابیں، جب چاہیں کھینچی جاسکتی ہیں:

ہمارا حُسن وہ چشمہ ہے جس پر
درندوں کا تسلّط ہے جنہیں پہچاننا مشکل
کُھلی آنکھوں سے جن کو دیکھ کے بھی دیکھنا مشکل
ہمارے دل ہمارے بس میں ہیں لیکن بدن پر
بے بسی آسیب کی صورت
حواسوں پر کسی کی حکمرانی
بڑھاپے کی طرح جیسے جوانی
ہمارے خواب، پانی میں اُترے چاند کی صورت
بکھرتے شور میں چُپ چاپ گُم سُم
ہم اپنے آپ میں گُم سُم
یہ زنجیریں جو ہم نے پہن رکھی ہیں
انھیں زیور کہا جائے
مگر اے کاش!!
زنجیریں نظر آئیں کسی کو! ۱۰۱

مظہر الاسلام نے ۱۹۷۱ کے واقعات کو نظم کر کے حالاتِ حاضرہ کا دلدوز منظر نامہ پیش کیا ہے، جس میں عصمتوں کے لٹنے کے لرزہ خیز واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جنسی ہوسنا کی کا شکار ہونے والی یہ خواتین کسی خاص طبقے یا عمر سے تعلق نہیں رکھتیں، اِن میں معصوم و کم سن بچیاں، شادی شدہ و غیر شادی شدہ خواتین، ان پڑھ اور پڑھے لکھے طبقے کی خواتین بھی شامل ہیں۔ مظہر الاسلام کے تانیثی رُجحان کی حامل نظموں میں ''موت سے چند قدموں کے فاصلوں پر آنکھوں کی کالونی میں رہتی ہے''، ''قدموں کی چاپ میں مسافر ایک بھی نہیں'' اور '' آخری دعا'' وغیرہ ہیں:

جب پھول کھلنے کا موسم تھا

آنگن میں
سبز پتوں سے بھری بیل
کسی چڑیا کی طرح چھچھاتی تھی
تو ننھی سمیرا کے ساتھ کیا ہوا
بہار کے دنوں میں
پھول پہننے کی رُت میں
گھر کے اُداس گل دان میں
سمیرا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بجی
اے خدا تو ہی بتا
پوسٹ مارٹم رپورٹ اور
پولیس کی رپورٹ میں فرق کیوں ہے
پھر مئی میں
جب ابھی ہوا گئی رُت کے
پھولوں کی آس اُوڑھ کر پھرتی تھی
تو سرگودھا میں
پولیس نے شہناز کے والدین کو
حوالات میں کیوں بند کیا
شہناز کی عزت کس نے لوٹی
اِس مقدمے کا کیا بنا
اے خدا
پھر اکتوبر لٹا
اُس کے ہاتھ سے کوئی
لالٹین چھین کر لے گیا
اُس کی آنکھیں
جنازے اُٹھانے میں بیت گئیں
اے خدا تو ہے بتا
پار سال اکتوبر میں
سفینہ بیگم کے دوپٹے کو
کس نے زہر میں رنگا

بابا مالی کی بیٹیوں کے ساتھ

کیا ہوا

نبیلہ کوثر کا باپ کہتا ہے

اُس کی بیٹی قتل ہوئی

پولیس کہتی ہے

اُس نے خودکشی کر لی

اے خدا تو ہی بتا

نومبر کی جیب سے

کس نے گیت چُرایا

خوشیاں بانٹنے والے ڈھولی کی

بیوی اور بیٹی کے ساتھ

پولیس نے کیا کیا

لودھراں کی جنت بی بی کے ساتھ

کیا ہوا

نومبر میں

بزرگ سیاست دان کی آنکھیں

آنسوؤں سے کیوں بھر گئیں

وینا حیات کا دوپٹہ

کس نے چھینا ۱۰۲؎

پہاڑی عورتوں کے سیاحوں کے ہاتھوں استحصال اور روزگار کی خاطر شہروں کا رُخ کرنے والے اپنے پیچھے، جو داستانیں چھوڑ جاتے ہیں، اُس کی جھلکیاں بھی ''اے خدا'' میں اور ''۱۹۸۵ کی آخری دعا'' میں ملتی ہیں۔ عورتوں کے حقوق کی سلبی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں کی ہنرمند خواتین کی دستکاروں کی نام نہاد خواتین کی انجمنوں کی سربراہان سستے داموں خرید کر دگناہ معاوضہ اپنی جیبوں میں ڈالتی ہیں اور محنت کش کو اُس کی محنت کا صلہ برائے نام ملتا ہے، مثلاً نظم ''قدموں کی چاپ میں مسافر ایک بھی نہیں'' میں مظہر الاسلام نے اِس پہلو پر روشنی ڈالی ہے:

اے خدا

شہروں کے اُس پار

کچے گھروں کی خوشبو میں بسی

بھولے بھالے من کی جفاکش عورتیں

وقت کے کنارے بیٹھی

دل کے چرنے پر جان لیوا موسموں کی
خوشیاں کاتتی ہیں

- - - -

شہر میں کچھ عورتوں کو انجمنیں
اُن کے نام کی رسید دے کر
اپنے لیے مفادات وصول کرتی ہیں
اُن کے ہاتھ
مٹی، گارے اور گوبر کا مقدر ہو گئے ہیں
مگر
اُن کی اس محنت کا پھل
شہر کی عورتوں نے آپس میں بانٹ لیا ہے [۱۰۳]

اظہر غوری آزادیِ حقوقِ نسواں کے حامی ہیں، اِن کے کلام میں تانیثیت کی مثالیں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ اظہر غوری کی نظم ''رخصتی'' اِس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عورت کی زندگی میں ہجرت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو جانے کا عمل اس کی زندگی کو دو حصوں میں منقسم کر دیتا ہے۔ ایک طرف ماں باپ بہن بھائی کی محبت و شفقت، بے غرض اور لاپرواہی اور بے خوف و خطر مستقبل کے اندیشوں سے دور زندگی گزارنے کا پُر تحفظ احساس رخصتی کے بعد احساسِ عدم تحفظ میں بدل جاتا ہے۔ ہر قدم محتاط اور معنویت سے مبرا دکھائی نہیں دیتا۔ بے لوث کی بجائے مصلحتوں کے رشتے زندگی کو اندیشوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہونے کا احساس روح کو پارہ پارہ کر دیتا ہے:

اپنے کمرے کے کھلے در کی انوکھی قیدی
آج تو سرخ جہنم میں ہے پابندِ عذاب
ہتھکڑی ڈال کے لے جاؤں گا جانم تجھ کو
اور یہ پھول تو اجنبی کہلائیں گے

- - - -

ہاں وہی گھر جو ترا اپنا گھر تھا
تیری خاموشی میں اک عہدِ پُرانا جاگا
تیرے کمرے میں گلابوں کا سنہری گل دان
کون آنکھوں سے اُسے سینچے گا۔۔۔کون؟ [۱۰۴]

اظہر غوری کے نقطۂ نظر میں مرد و عورت کے رشتے کی پائیداری کا انحصار غیر مشروط محبت پر ہے۔ میاں بیوی کے لیے یہ باہمی ہم آہنگی، اخلاص اور وابستگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ محبتوں کے معاملے میں اگرچہ اِس رشتے پر اغراض کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے، جب کہ حقیقی زندگی میں اکثریت ایسے افراد کی ہے، جو اغراض پر اخلاص کو اہمیت دیتے ہیں، اس کا بین ثبوت ان

رشتوں کی پائیداری کا ہے، جو معاشرے میں خوش حال اور آسودہ نظر آتے ہیں۔ آسودگی کا تعلق اشیا سے نہیں، بلکہ باہمی وفا سے ہے۔ اظہر غوری ایسی ہی وفا کے متمنی ہیں، اس ضمن میں اِن کی نظمیں ''عہد''، ''کیفیات''، ''قیمت''، ''انصاف''، ''ناگفتہ بہ''، ''حقوق''، ''کم مائیگی'' وغیرہ اہم ہیں:

مُقدّمے کی سماعت مُکمّل ہونے پر
فریقین کے گواہوں کے بیانات ریکارڈ ہونے کے دوران
مَیں تصوّر کرتا ہوں، کہ
میری ایک جُنبشِ قلم سے کیا کچھ ہو سکتا ہے؟
یہ مردانہ حاکمیّت کے خلاف اِحتجاج کرتے ہوئے
آزادیِ نسواں کے جُلُوس کی علَم برداری کرے، تو
اِس سے تُمھارے چلن کی رسّی اِتنی دراز ہو سکتی ہے، کہ
جفا پرست تُمھارے نام کی تسبیح کریں
اور اگر یہ روایات کی اقدار کو بحال رکھنا چاہے، تو
بدن کا لباس چھین کر تُمھارے رُوح کو
اِس کٹہرے میں برہنہ بھی کر سکتی ہے
مگر مَیں کرسیِ انصاف پر سر جُھکائے بیٹھا ہُوں [۱۰۵]

قیامِ پاکستان سے قبل مسلم ہندو سماج میں پائی جانے والی سماجی مسائل کی شکار عورت کو موضوع بنانے والے شعرا نے عورت کے فکر و جذبہ کی عکاسی کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کے لیے راہیں متعین کی ہیں۔ ۷۱ء کے آس پاس اُبھرنے والے جدید شعرا کے ہاں تانیثی رُجحان کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان کی بہ نسبت شاعرات کی بڑی تعداد سامنے آئی ہے، جن کے کلام میں تانیثیت کی اثرات نمایاں ہیں۔ شعرا کی طرح شاعرات نے بھی اپنے جذبات و احساسات، نفسیاتی الجھنوں پیچیدگیوں، معاشرتی و سماجی ناہمواریوں اور مرد کی حاکمانہ مزاج کے خلاف ردِعمل کو موضوع بنایا ہے۔

ادا جعفری تانیثی شعور و ادراک کی نمائندہ شاعرہ ہیں۔ ادا جعفری کی شاعری جرأتِ اظہار کی شاعری ہے۔ تانیثیت کی حامل صفِ اول کی شاعرہ کا کلام متانت و سنجیدگی، عالمگیر تانیثی شعور کا عکاس اور اُن کی انفرادیت کا غماز ہے، اُنھوں نے تانیثیت کے مقبولِ عام مفہوم کو اُچھوتے اور نادر انداز میں پیش کیا ہے، اُن کا تانیثی عرفان مغربیت زدہ تانیثیت کی نفی کرتے ہوئے عورت کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کیے جانے پر زور دیتا ہے۔ عورت اُن کے ہاں محض خوش وقتی، بہلاوے اور جسم کا نام نہیں، بلکہ احساسات و جذبات، وجدان اور شعور و ادراک سے مزّین ہے۔ اِس میں زندگی کی حرارت بھی ہے، اظہار کی تپش اور سوچ و فہم بھی، اُن کے خیال میں عورت کو محض نجی ملکیت اور عیش لمحوں کا سامان سمجھنے کی بجائے زندگی کا ساتھی سمجھنا چاہیے۔ اگر مرد و عورت ایک دوسرے کے مونس و غم خوار، ایک دوسرے کو سمجھنے والے نہ ہوں تو آنے والی نسلوں کو اِس کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ زندگی کے ساز میں نغمۂ سرمدی اُسی وقت بھرا جا سکتا ہے، جب اِس میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، یعنی زندگی کی ترنگ میں انسانی ذہین عروج چاہتا ہے۔ معاشرے میں انقلاب بپا کرنے کے لیے سماج کی غلط رسوم و قیود کے

خلاف برسرِ پیکار ہونے کے لیے جرأت مندی کا ہونا ضروری ہے، لیکن اکثر و بیشتر وقت کی گرد فرد کو مفاہمتوں اور مصلحتوں کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے۔ عورت کے حقوق کی بازیافت کی متلاشی شاعرہ ہونے کی وجہ سے ادا جعفری کے ہاں اسی ہی عورت کا تصور ملتا ہے، جو خود آگاہ بھی ہے اور روایت شکن بھی، بعض اوقات اُسے ایک ایسے شخص کی تلاش رہتی ہے، جو اُس کی روح کو سمجھے:

مگر میں ڈھونڈتی رہی

مجھے وہ سازِ دل نواز آج تک نہ مل سکا ۱۰۶

ادا جعفری کے نقطۂ نظر کے مطابق رسوم کی تپش زندگی کو جھلسا دیتی ہے، اُن کے خیال میں شادی ایک ایسا بندھن ہے جس میں عموماً قربانی کا سرچشمہ عورت کو قرار دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی ضرب اُس کے حصارِ ذات اور عزتِ نفس پر پڑتی ہے۔ عورت کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی ہو جاتی ہے۔ پے در پے تضحیک و تحقیر، مضمحل وجود کو جنم دیتی ہے چوں کہ عورت نفسیاتی طور پر مرد کی نجات دہندہ سمجھتی ہے، اِس لیے جب زندگی کی ناؤ کا ملاح اِسے بے رحم لہروں کی نظر کر دیتا ہے تو مستقبل کے اندیشے، اِس کے لیے بے اعتباری اور تشویش کا سبب بنتے ہیں:

وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں

نظامِ نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں ۱۰۷

نظم ''ماں'' اور ''ناداں لوگ'' میں ادا جعفری نے عورت کے مختلف روپ و کردار میں سے معتبر رشتے ماں کے بارے میں لکھا ہے کہ عورت محض ''خوابِ دل آویز کی تشکیل'' اور ''لذتِ تخلیق کی تکمیل'' ہی نہیں، بلکہ اللہ نے اسے تو ''خالق و کوزہ گرِ رضا'' بھی بنایا ہے، اس کا یہ روپ سب سے حیران کن اور مثال کن ہے، لیکن یہی عورت جب بیٹی، بہن اور خصوصاً بیوی کے روپ میں ہوتی ہے تو ہزار قربانیوں کے باوجود مرد کی جبریت، بے حسی اور استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ مرد اپنی ماں کو تو تکریم دینے کے لیے تیار ہوتا ہے، لیکن اپنی بیوی کو جو اس کے بچوں کی ماں بھی ہوتی ہے، اسے اس کا مقام دینے میں تجاہل کرتا ہے، بلکہ اپنے جور و ستم کا نشانہ بنائے رکھتا ہے۔ ادا جعفری عورت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ماں کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ جس طرح وہ اپنا گھر بچانے کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے، اسی طرح اپنا وطن بچانے کی خاطر اپنی گود اُجاڑ دیتی ہے اپنے ہی ہاتھوں بیٹوں کی قربانی پر رضامند ہو جاتی ہے۔ ماں، چوں کہ علامت ہے خالق کی تخلیق کی، منزل کی تلاش کی، اس کے باوجود اس میں محرومی رچی بسی ہوتی ہے۔ معاشرہ بے روح بدن تو برداشت کر لیتا ہے، لیکن باشعور ذہن نہیں دوسروں کو ہدایت دینے والی نیک راستے پر چلانے والی بالآخر انھی کے رحم و کرم پر ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کی کڑوی کسیلی برداشت کرتی ہے، پھر بھی نادان کہہ کر خود کو مایوسی سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ خود بھی نکلتی ہے اور دوسروں کو بھی بچا لیتی ہے:

گرد صدیوں کے سفر کی مرے بالوں میں اَٹی

پاؤں چھلنی ہیں، نگہ زخمی ہے، دل ہے خالی ۱۰۸

ادا جعفری نے عورت کے حوالے سے روایتی اندازِ فکر اور طرزِ عمل کے خلاف بغاوت ہے۔ ''ساز'' علامت ترنم و موسیقی اور نغمات کے ماخذ کی، یعنی جس کے سروں میں نغمۂ آزادی کی لَے سنائی دے سکے، جب بہار اپنی ترنگ پر ہوتی ہے تو ہر طرف جنوں نواز بدلیوں، مرغزاروں، طیور کی نغمہ سنجیوں میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ حیات بھی مسکرا اُٹھتی ہے۔ اپنی تمام دلنوازیوں کے باوجود کسی نغمے کی منتظر ہے، جس کے سُر حیات کا اصل مفہوم واضح کر سکیں۔ عورت دُکھ اور تکلیف کو سہہ لیتی ہے، لیکن اپنے

مرد کی بے رُخی، بے وفائی اور جدائی کو نہیں سہہ سکتی، ''ماتھے پر لہو کا قشقہ'' سے مراد شادی شدہ زندگی کی ہے۔ اسے بہت کچھ اپنی ذات پر برداشت کرنا پڑا۔ دُکھ اُٹھانے۔ انجانی اور بیرونی عناصر خوشحال زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں اور اکثر اوقات ساتھی کی جدائی یا موت ہمیشہ ہمیشہ کا روگ بن جاتی ہے۔ زندگی کی کٹھنائیاں اور خاروکانٹے خود پلکوں سے چننا پڑتے ہیں:

جانے کس ہاتھ نے، تو جانتا ہے
میرے آنگن کے اُجالوں میں لہو گھول دیا
اور میں زندہ ہوں
زندگی کے کہیں مجھ سے بھی ہدف دیکھے ہیں؟ ۱۰۹

ادا جعفری نے نظم ''میرے گیت ادھورے'' میں عورت کی کیفیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ عورت کی زندگی کی تمام خوشیاں اس کے شوہر سے وابستہ ہوتی ہیں، اس کا ہار سنگھار اس کی راج بہار اسی کے دم سے ہے۔ دوسری طرف مرد اپنے مقام سے جب نا آشنا ہو جاتا ہے، اس کا ہرجائی پن اور ڈال ڈال بھنبھنانے کا سفر ختم ہونے کو نہیں آتا ہے۔ عورت موت تک مرد کی طرف سے عدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔ مرد اس نفس پرستی کی وجہ سے نظروں سے گر جاتا ہے اپنی عزت اور وقار کھو دیتا ہے، جب کہ عورت زیادہ تر وفا کا پیکر بنی رہتی ہے۔ مردوں کے بارے میں یہ تاثر وہ جو بھی اخلاقی اصول توڑے یا خود غرضی کا پیرہن بنے معاشرہ اس کی اجازت دیتا ہے، اس کے برعکس عورت کے جائز حقوق بھی پورے کرنے سے گریزاں ہوتا ہے، یہ تو اٹل حقیقت ہے جو اپنی شریکِ حیات و شریکِ سفر کا نہیں بنتا وہ کسی کا کیا بنے گا۔ نظم ''کہ وہ اب تک نہیں پلٹا'' میں ادا جعفری کی ذاتی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ایسے شخص کی یاد کا نوحہ ہے، جو ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ واپسی کے راستے خوابِ محض بن کر رہ جاتے ہیں۔ عورت رجائیت، انانیت اور محبت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی ہے، اور اسی کے سہارے آس کا دیا جلائے رکھتی ہے:

اُجالا سسکیاں لیتا رہا گھر میں
دیا دہلیز پر جلتا رہا ۱۱۰

ادا جعفری کے ہاں عورت، خواب دیکھنے کے حق کے باوجود مستقبل کے سپنوں سے لرزاں ہے، اس کی حالت اُس پرندے کی سی ہے، جس کے پر کٹے ہوں اور پرواز کے لیے کہا جائے، سرشاریِ شوق اور بے نیازی کے زیور سے آراستہ ہونے کے باوجود اس کی راہ میں اَن دیکھی رُکاوٹیں ہوتی ہیں۔ شبِ ہجراں ہے کہ کٹنے کو نہیں آتی اس کی کوئی سحر نہیں ہوتی۔ مستقبل کا احساس اس کے لیے مٹ چکا ہے اور مایوسیوں نے نا تمام خواہشات کو پروان چڑھایا ہے۔ نظم ''گواہی'' کے مطابق عورت کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ایک اچھا گھر ہے، جہاں ذہنی سکون اور آرام میسر ہو۔ شوہر اور بچوں کی محبت کا گہوارہ، اس کی چھت اور سائباں ہی اس کی پناہ گاہ بن جائے، لیکن زمانے کے حوادث اس کو جائے سکون میسر نہیں آنے دیتے اگر نا حق اس کی زندگی تلخیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ نظم ''شام و سحر کے درمیاں'' میں ادا جعفری نے عورت کی نفسیاتی گتھیاں سلجھائی ہیں کہ عورتوں کو مضبوط سہارے کی صورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ زندگی کی اساس محبت پر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہو جاتی ہے، اس نظم کی عورت اپنے مرد سے مخاطب ہے کہ جس محبت کی آگ میں جلی ہوں کیا تم بھی اس کا ایندھن بنے۔ زندگی کے تمام رنگ تم سے وابستہ ہیں۔ میاں بیوی میں احساس کا رشتہ قائم رہتا

ہے۔ اس میں دوہری اور منافقانہ روش، خواہ وہ مرد اختیار کرے یا عورت حیات تلخی کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ نظم ''ایک اور منظر'' میں زندگی کے اس رُخ کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ جس کا تقریباً ہر لڑکی کو سامنا کرنا پڑتا ہے نئی امنگوں اور آرزوؤں اور ارمانوں کے ساتھ شروع کیا جانے والا زندگی کا سفر اس وقت تلخ ہو جاتا ہے، جب بے وفائی اور جدائی حائل ہو جائے پھر تنہا عورت کو لہورنگ آنکھوں اور دوپٹے پر کاجل کے دھبوں کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ مصلحتوں کے قفل اسے جینے نہیں دیتے کوئی ہمدرد چہرہ یا دل کی آواز سننے والا نہ ملے تو سراپا احتجاج بن جاتی ہے:

لہورنگ آنکھوں

دوپٹے پہ کاجل کے دھبوں

ہتھیلی کے بجتے گلاسوں کا قصہ

- - - - -

وہاں اس قدر شور تنہائیوں کا رہا

کہ اب اتفاقاً

کسی نے کبھی اس سے احوال پوچھا

مخاطب ہوا تو

وہ اک چیخ بن کر بکھر جائے گی۔ [۱۱]

ادا جعفری کے خیال میں عورت کی زندگی قدم قدم پر احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے۔ دائروں کے اس سفر میں اسے کولہو کے بیل کی طرح جُوتا جاتا ہے، اس عورت کو ہر لحاظ سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کا شعور بیدار ہو۔ خود آگاہ ہو۔ اسے دبانا سر پھرا قرار دینا اور انا کو کچلنا کمپلکس کے مارے مردوں کی ترجیح بن جاتا ہے، اس وقت تک مظالم کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، جب تک عورت تھک ہار نہیں جاتی۔ ایسی عورت کو معاشرہ جینے کا حق دیتا ہے، جو زندگی کی چند خوشیاں مستعار لینے کی خاطر آنکھوں پر بے خبری کی پٹی باندھ لیتی ہے:

معلوم تھا کہ میرا سفر دائروں میں ہے　　　میں وہ وفا شعار کہ چلنا پڑا مجھے [۱۲]

اس کے برعکس عورت اس بات کی دعوے دار ہوتی ہے کہ اس سے سچ بولا جائے۔ وہ جھوٹ، منافرت و منافقت اور بے وفائی سے نفرت کرتی ہے:

اگرچہ اتنا ظالم ہے تو ہم سے جھوٹ ہی بولو　　　ہمیں آتا ہے پت جھڑ کے دنوں گلبار ہو جانا [۱۳]

''نظمیہ'' میں مرد عورت کو دکھوں کی تاریکیوں کی نذر کر کے خود جھلملاہٹ کا متلاشی ہوتا ہے۔ چہرے کی شادابی چھین کر اس پر تفکر، تشویش، عدم تحفظ کے احساس کے بادل بکھیر دیتا ہے۔ وقتی طور پر خود کامیاب سمجھنے والا دُنیا کا ناکام ترین انسان ہوتا ہے، جو باغبان اپنے باغ کی حفاظت نہیں کر سکتا اُس نے کیا کسی کو تحفظ دینا ہے۔ وہ تو خود عدم تحفظ اور احساسِ کم تری کا شکار ہوتا ہے، اس کی شخصیت در حقیقت کھوکھلے پن اور احساسِ ندامت میں دبی ہوتی ہے۔ بظاہر خوشیاں کشیدہ کرنے والا اپنے ضمیر کی عدالت میں بہت بڑے عذاب سے گزرتا ہے:

میرے بدن کا رواں رواں چھل گیا ہے

وقت کی چھلنی میں
تھوڑی سی ریت باقی ہے
کیا اب بھی میرے زخموں کے لیے
کسی مرہم کی ساعت نہیں آتی ۱۱۴

نظم ''صدیوں کا سفر'' عورت سے متعلق اجتماعی لاشعور اور تخمتثال کی داستان ہے۔ عورت کا وسیع النظر ہونا اس معاشرے میں زہرِ ہلاہل کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس پر اس قدر پابندیاں ہوتی ہیں کہ وہ معاشرے میں دوسرے درجے کے شہری محسوس ہوتی ہے، اس کی وسعتِ نظری اور اس کی خود آگاہی کا انتقام اس طرح لیا جاتا ہے کہ اُسے کنویں کا مینڈک بن جانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، اس کے لیے آسمان دیکھنے کی اتنی ہی اجازت ہوتی ہے جتنا کہ روزنِ زنداں سے دیکھا جا سکے، تنگ نظر اور محدود ذہنیتوں والے مرد عورت خواہ ماں بیٹی، بیوی یا بہن ہو مٹی کا مادھو تصور کرتے ہیں پھر اسی بات پر طعنہ زنی کی جاتی ہے:

مرا حصہ بس اک محدود جلوہ ہے
یہ آنکھیں وسعتِ افلاک کی
رعنائیوں کو داد کیسے دیں
کہ میں نے آسماں کو
روزنِ زنداں سے دیکھا ہے ۱۱۵

نظم ''سفر ہے شرط'' میں ادا جعفری شکوہ کرتی نظر آتی ہے کہ کیا ہم پھول سے بچھڑی خوشبو ہیں، جو بکھر جائے تو سمٹ نہیں سکتی۔ عورت ہر گھڑی، ہر گام، ہر قدم جینا چاہتی ہے خوشیوں سمیت، لیکن خوشیوں کا یہ سفر کیوں محدود اور ادھورا ہوتا ہے، کیوں اسے بیچ دوراہے پر چھوڑ دیا جاتا ہے:

وقت بدلا ہے مگر
ہم تو وہی ہیں اب بھی
جنھیں جینے کا چلن آتا ہے

- - -

دیر سہی
پھر پلٹ کر
وہ تجلی وہ سہانی رُت بھی
کسی دن تو ہمیں مل جائے گی ۱۱۶

حیا لکھنوی کی نظمیں ''مجبور بیوی کی عید''، ''سپاہی کی دلہن''، ''شوہر کا تحفہ''، ''ہمدمِ بدخو'' وغیرہ میں عورت کے حوالے سے مختلف سماجی رویوں کی عکاسی کی ہے، خصوصاً شادی شدہ عورت کی زندگی کی مسائل کو حیا لکھنوی نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے، مثلاً ''ہمدمِ بدخو'' میں ایسی عورت کا المیہ پیش کیا ہے، جس کا شوہر بے راہ روی کا شکار ہے، اُس کی عدم توجہی بیوی کے لیے سوہانِ روح ہے:

کس لیے روتی ہے؟ منہ اشکوں سے کیوں دھوتی ہے تو
اے پرستارِ وفا کیوں زندگی کھوتی ہے تو
سوگ میں تو کس لیے اپنا گنواتی ہے شباب
ہمدمِ بدخو کی خاطر کیوں مٹاتی ہے شباب

- - - - - -

آرزو کے خون میں ڈوبا ہوا تیرا سہاگ
بیوگی کے سوگ سے بدتر ہے یہ اجڑا سہاگ ۱۱۷

زہرہ نگار ادب وفنون سے گہری وابستگی رکھنے والی شاعرہ ہیں، اُنھوں نے غزل کے علاوہ نظم خصوصاً آزاد نظم کو وسیلۂ اظہار بنایا، اِن کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں تانیثیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اِن کے کلام میں مشرقی عورت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت موجود ہے، اِن کے کلام میں عورت کے جذبات، احساسات اور اِس کے اندازِ سوچ وفکر کی جھلک جا بجا نمایاں ہے، اِن کے مجموعہ ہائے کلام میں شام کا پہلا تارا ادبی اُفق پر اِن کا نسائی شعور، سماجی روایات اور قدغنوں کے ردِ عمل کی آواز بن کر اُبھرا ہے۔ زہرہ نگار بے جا رسوم وقیود سے آزاد اور بااعتماد عورت کا تصور پیش کرتی ہے۔ عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم خواہ وہ معاشرے کی دین ہوں یا افرادِ معاشرہ کی، سب کو بڑے مؤثر اور متنوع انداز میں پیش کرنا ہی اِن کی شاعری کا حُسن اور دلکشی قرار پایا ہے، اِن کی شاعری بے حسی اور یاسیت کے سکوتِ بحرِ بیکراں میں تلاطم پیدا کرتی ہے اور موجوں کی سرکشی سماجی جمود کو تہس نہس کر دینے کی خواہاں ہے، اِن کی یہ بغاوت اور مزاحمت استحصال کے خلاف محض احتجاج اور غلغلہ ثابت نہیں ہوتی، بلکہ شعور اور آگہی کی نئی راہیں بھی متعین کرتی ہے۔ نظم ''مجرمِ وعدہ'' میں عورت کی ذات اور نئی نسل کی پرداخت کی نگہداشت کا وعدہ قرار دیا گیا ہے۔ زہرہ نگار کے خیال میں بہتری کی طرف سوچنا اور اُس کی طرف اُٹھایا ہوا ہر قدم روایات کے جمود کو توڑنے کا باعث بنتا ہے، کیوں کہ زندگی کے حقائق کو محض خیالات کے جھولوں میں بہلا کر سُلایا نہیں جا سکتا۔ بچہ مستقبل کا خواب ہوتا ہے:

مری آنکھیں کسی پہچان کے زخموں سے بوجھل تھیں
تمھارا مسکن ان زخموں کا مرہم تھا ۱۱۸

زہرہ نگار کے خیال میں عورت زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں اس وقت گزرتی ہے، جب زندگی کی شروعات میں کیے گئے وعدوں پر جھوٹ اور بے وفائی کی گرد جمنے لگتی ہے۔ عورت کی روح زخمی ہونے لگتی ہے، اِس کی زندگی عدم تحفظ کے خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نظم ''کایا کلپ'' میں عورت کی زندگی کے مختلف بہروپ بیان کیے ہیں، جو معاشرہ اس پر لاگو ہوتا ہے۔ نظم ''تراشیدم وشکستم'' میں آفاقی حقیقت کو بڑے نادر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن کامیابی کے نشے میں چُور مرد یہ بھول جاتا ہے کہ فریقِ ثانی نے اس کے لیے کیا کیا دُکھ اُٹھائے اور کیا کیا مصیبتیں وتکالیف جھیلیں۔ مرد کا عورت کے ساتھ حقیرانہ برتاؤ بغاوت کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے:

مجھے ڈر ہے اس کا یہ انداز مجھ کو
غرور وتکبر کا آغاز مجھ کو

مرے شاخِ بیجاں کے مانند ٹوٹے ہوئے بازوؤں کو
تنفر کی طاقت کا وہ زور دیدے
کہ اِک ضرب سے میں اسے توڑ ڈالوں ۱۱۹

زہرہ نگار کے نقطۂ نظر کے مطابق مرد و عورت، جب ایک دوسرے کے دل و ذہن کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں تو نا آسودگی جنم لیتی ہے، عموماً عورت کو اس جاں گسل عذاب تنہا ہی سہنا پڑتا ہے، کیوں کہ ہر بُرائی، ہر کمی اور کوتاہی کی بنیاد اُسی کو قرار دیا جاتا ہے، اس کی وجہ سے بغاوت اور سرکشی پیدا ہوتی ہے، اس طرح عورت کی حساسیت اور مادرانہ شفقت کو بیان کرتے ہوئے نظم ''ایک لڑکی'' میں جسم کی سوداگر لڑکی جسے سماج نے سڑک کے کنارے لا کھڑا کیا کو راہِ راست پر لانے کی تمنا کا اظہار ہے:

مجھ کو یوں لگا ایسے!
جیسے میری بیٹی ہو
میری ناز کی پالی
میری کوکھ جائی ہو

- - - - - -

کھو گئی ہو میلے میں
بہہ گئی ہو ریلے میں
اور پھر اندھیرے میں
اپنے گھر کا دروازہ
خود نہ دیکھ پائی ہو! ۱۲۰

فہمیدہ ریاض صفِ اول کی فیمیسٹ شاعرہ ہیں۔ استحصال کے نتیجے میں عورت پر ٹوٹنے والے مظالم اور اس کی ذات کی شکستگی اور نفیِ ذات اِس کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ انسانی شخصیت میں جنس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، عموماً نفسیاتی طور پر مرد خود کو مردانگی کے بہت اعلیٰ مقام پر رکھتا ہے اور عورت کے بارے میں اس کی ظاہر بین نظر، اونچے درجات مقرر کیے ہوتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے عورت کو محض جسم سمجھنے والوں کو بڑے طنزیہ انداز میں نظم ''مقابلۂ حسن'' میں پیش کیا ہے، اس سے قبل اس قسم کا خیال ہماری شعری روایت میں ناپید ہے، جس میں جسم کے اعضا کی پیمائش کا واشگاف لفظوں میں ذکر ہے۔ فہمیدہ ریاض اِس قسم کے پراگندہ ذہنیتوں کا جواب اُسی انداز میں دیتی ہیں، یہاں اِن کا قلم خاصا بیباک ہو گیا ہے، اِس سے قطع نظر کہ وہ عورت ہے وہ مرد و عورت کو ایک انسان تصور کرتے ہوئے بے لاگ انداز میں، جن میں در پردہ بغاوت کے علاوہ نفرت پوشیدہ ہے، مرد کے منفی خیالات کی مذمت کرتی ہیں، اس سے قبل اور مابعد کسی بھی شاعرہ نے اس جرأت مندی اور حوصلے سے عورت کی تذلیل کا بدلہ نہیں لیا۔ نظم ''مقابلہ حسن'' میں عورت کو اشتہار اور شوکیسوں میں سجانے اور شہوت و دلگی کی خاطر کھلونا بنانے والے مکروہ انسانوں کو بے نقاب کیا ہے، جو عورت کو محض ایک شے سمجھتے ہیں:

کولہوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے
سر میں بھی ہے جستجو کا جوہر

تھا پارۂ دل بھی زیرِ پستاں
لیکن مرا مول ہے جو ان پر
گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو نا پو! ۱۲۱

طوائف لذت کوشی ولذت پرستی اور شہوت پرستوں کی دلدادہ ہونے کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بربادیوں اور ذلتوں پر آنسو بہاتی ہے، کیوں کہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ خالی رہ جاتے ہیں۔نظم ''وہ اِک زنِ ناپاک'' میں طوائف کی نفسیات بیان کی ہے:

ہر نوکِ خارِ راہ سے
بندِ لحم سب کٹ چکے
اس کے بدن کی شرم
تقدیس کا سایہ نہیں
لیکن خدائے بحر و بر
ایسا کبھی دیکھا نہیں
فرمان تیرے سب روا
ہاں اِس زنِ ناپاک کے
لب پر نہیں کوئی دُعا
سر میں کوئی سجدہ نہیں ۱۲۲

نظم ''میں مٹی کی مورت ہوں'' میں عورت کو مٹی کی مورت کہا گیا ہے، جس کا وجود شکستہ ہے۔ ناتمام آرزوئیں اور اُدھورے ارمان اُسے دیتے ہیں۔ عورت کو انسان نہ سمجھے جانے کا نوحہ ہے:

میں تو مٹی کی مورت ہوں
کیا ہوا اگر اِس مورت میں
بہتا ہے لہو کا اک دریا
اور دریا میں طغیانی ہے
وہ تیری یاد کا چاند چڑھا
بڑھ بڑھ کر لہریں آتی ہیں
ساحل سے ٹکرا جاتی ہیں
اِن اُٹھتی گرتی لہروں سے
کیا پھل پائے گا بدن میرا

میں تو مٹی کی مورت ہوں
مٹی گھلتی جائے گی
گھٹتا جائے گا بدن میرا ۱۲۳؎

معاشرے کی پروردہ مرد کی حاکمیت کے زیرِ اثر تباہ ہونے والی عورت اگر شعور اور آگہی کی شمع اپنے اندر بیدار کر لے، تو اُس کی زندگی سوہانِ روح ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی یہ کہنہ عمارت، جس میں عورت ہی کو رگیدا جاتا ہے۔ آخر ٹوٹ بھی سکتی ہے، جبر و خوف واہموں اور مصلحتوں کی بنا پر عورت کی زندگی زیادہ تلخ ہو جاتی ہے۔ نظم ''ایک لڑکی سے'' میں ایسی کیفیات کی نمائندہ ہے:

سنگدل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں!
اک صدائے مستانہ!
ایک رقصِ رندانہ!
یہ عمارتِ کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے ۱۲۴؎

''آج شب''، ''گرہستن''، ''اک پل ٹھٹھکا میرے دوار''، ''لوری''، ''چادر اور دیواری''، ''روبرو'' وغیرہ میں فہمیدہ ریاض کے تانیثی شعور کی عکاسی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ نظم ''پلاٹ'' میں عورت کو دھرتی کے مشابہ قرار دیا ہے، اس بات کی منتظر ہیں کہ کوئی نجات دہندہ تو آئے گا، جو دکھوں کے بوجھ کو ختم کر دے گا:

میں اپنے حمل کا بوجھ لیے
دھرتی کو ڈھونڈتی آئی تھی
پر دھرتی کہاں ہے میں جس پر یہ بوجھ لے کہ
وہ جنموں کی سنگوں میری
جس کی مٹی میں جذب ہوا تھا دودھ مرا
وہ جس کی اتھاہ گرائیوں میں بے کل ہیں نمو کی تحریکیں ۱۲۵؎

خواہشیں دم توڑ جائیں، تو تعلقات محض دکھاوا بن کر رہ جاتے ہیں۔ مردوں کی بے حسی اور استبداد اور جبریت مایوسیت پیدا کرتی ہے۔ آرزوؤں اور خواہشوں کی نارسائی کا اظہار بھی فہمیدہ ریاض کی غزلوں میں ملتا ہے:

پتھر سے وصال مانگتی ہوں   میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں
شاید پاؤں سراغِ الفت   مٹھی میں خاک بھر رہی ہوں
ہر لمس ہے جب تپش سے عاری   کس آنچ سے یوں پگھل رہی ہوں ۱۲۶؎

کشور ناہید تانیثیت کے حوالے سے اہم ترین نام ہے۔ وہ پاکستان کی صفِ اول کی فیمینسٹ اور تانیثی شعور رکھتی ہیں ان کا تانیثی رُجحان انتہا پسندانہ نہیں، بلکہ وہ مرد و عورت کی تخصیص اور صنفی تفریق کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ حقوقِ نسواں کے نام پر خواتین کی مادر پدر آزادی کی قائل ہونے کی بجائے عورت و مرد کی بہ حیثیتِ انسان تسلیم کرنے کے

حق میں ہیں، اِن کے خیال میں مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں عورت کو بہت سے مسائل کے علاوہ سماجی ناانصافیوں ذہنی دباؤ، ہراساں کیا جانا، خانگی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مزید براں، مرد کے غاصبانہ حاکمانہ اور معاندانہ رویے نے اس کا دائرۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ عورت خواہ امیر ہو یا غریب، خواندہ ہو یا ناخواندہ، خاتونِ خانہ ہو یا ملازمت پیشہ خواتین، ہر حالت میں کسی نہ کسی صورت میں ذہنی وجسمانی تشدد کا سامنا کر رہی ہیں، انھیں سماجی متصبانہ رویوں کے خلاف ردِعمل میں بعض خواتین مرد دشمنی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اخلاقی حدوں کو پھلانگ رہی ہیں اور اپنی دانست میں آزادی اور مساوی حقوق کے نعروں کی نذر ہو رہی ہیں۔ کشور ناہید عورت کے اس رویے کے خلاف ہیں، اِن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عورت کسی قسم کے ذہنی دباؤ، ڈپریشن عدم تحفظ کا شکار ہوتی ہے اور اس کے اثرات افرادِ خانہ سے معاشرے میں کیسے منتقل ہوتے ہیں۔ کشور ناہید کے ہاں غیر ضروری جذباتیت نہیں پائی جاتی۔ وہ عورت کی عزت و ناموس اور وقار کی خواہاں ہیں۔ جدیدیت کی آڑ میں، بعض تانیثیت پسندوں کے ہاں اخلاقی اقدار کی پامالی اور بے جا آزادی کا تصور ملتا ہے، جب کہ کشور ناہید بڑے باشعور طریقے سے، اِن مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ وہ روز مرہ زندگی کے مسائل ہوں یا نام نہاد حکمرانوں اور سیاستدانوں، جاگیرداروں اور وڈیروں، بھٹہ مالکان کے جور وستم ہو یا عالمی سطح پر جنگوں کے نتیجے میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم ہوں، انھیں بڑی کامیابی سے بیان کیا ہے۔ کشور ناہید نے عورت سے روا رکھے جانے والے تکذیبی رویے کی مذمت کی ہے، اِن کے خیال میں جدید دَور کے تقاضوں کو بروئے کار لائے بغیر زندگی بڑے چیلنجوں سے عہدہ برا نہیں ہوا جا سکتا، یعنی جو عوامل استحصالی معاشرے میں پنپ جاتے ہیں، اِن کی بیج کنی کیے بغیر ایک متوازن وصحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا، اگرچہ مرد وعورت نے جدید تقاضوں کے پیشِ نظر مروجہ روایتی رشتوں کی معنویت میں تبدیلی لانا شروع کر دی ہے اور حاکم ومحکوم اور ظالم ومظلوم کی روایتی ڈگر سے ہٹ کر میاں بیوی برتر، کم تر کی نام نہاد درجہ بندیوں سے نکل کر ایک دوسرے کے دوست اور دُکھ سُکھ کے ساتھی کا رُوپ دھار رہے ہیں، جن کا ساتھ خانگی زندگی کی خوشگواری کے لیے ناگزیر ہے، اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے، تاہم جمود وبے حسی کے بحرِ بیکراں میں ایک ادنیٰ کنکر ہی سہی، جو چار سو چھائے ہوئے پُرسکوت آب پر موجِ مضطرب ہی کا باعث ہیں، یہ چھوٹی لہریں ہی بڑی موجوں کے بننے کا سبب ہوتی ہیں، یہی انقلاب کی طرف پہلا قدم ثابت ہوئے ہیں، کیوں کہ کشور ناہید کے خیال میں مرد کو اپنی عورت کو اعتبار واعتماد دینا ہوگا۔ اُسے اپنا سچا لائف پارٹنر سمجھتے ہوئے قدم سے قدم ملا کر چلنا ہوگا، بصورتِ دیگر تشنگی ناآسودگی اور تناؤ کا سامنا کرنا پڑے گا، یہی وجہ ہے، اِن کے ہاں عورت روایتی سانچوں میں ڈھلنے کی بجائے باشعور اور حقوق آشنا دکھائی دیتی ہے، ان کے لہجے میں پسپائیت نہیں، بلکہ زمانے کی منفی قوتوں سے ٹکرا جانے والی با حوصلہ مند اور با اعتماد عورت ہے، جو حالات کی تلخیوں کو جان کر، اِن کی رو میں بہنے کی بجائے باغیانہ روش لیے ہوئے ہے۔

کشور ناہید کی شاعری کا نمایاں ترین پہلو یا خانگی تشدد کی مختلف صورتیں ہیں، جو عورت کے ساتھ روا رکھی جاتی ہیں لڑکیوں کی پیدائش، بچپن اندازِ تربیت میں امتیازی سلوک سے پیدا ہونے والی نفسیاتی گرہیں، شادی اور شادی شدہ زندگی کی معاملات میں جبر واستبداد کے مختلف پہلوؤں کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے، ان کی ذکی الحس، ذہانت اور قوتِ مشاہدہ نے عورت کی سوچ اور فکر کے مختلف پہلوؤں اور اس کے جذبات واحساسات کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے، ان کے دائرہ فکر میں ہر مکتب اور شعبۂ زندگی کی عورت شامل ہے، خواہ وہ کھیتوں میں کام کرنے والی، سڑک پر پتھر کوٹنے والی محنت کش

عورت ہو یا کم پڑھی لکھی و اعلیٰ عہدوں پر فائز ہر ایک کی نفسیاتی اُلجھنوں کی گرہ کشائی کی ہے۔ مادیت پرستی اور ہمہ ہمی کے اِس دَور میں زندگی پیچیدگیوں کی آماجگاہ بنتی جارہی ہے۔ کشور ناہید نے دیہی علاقوں میں فکرِ معاش اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اُلجھنوں اور مسائل کو موضوعِ سخن بنایا ہے کہ کس طرح فصل کی کٹائی کا موسم ارمانوں اور اُمنگوں کا پیش خیمہ ہے۔ جہیز کی عدم دستیابی سے بہت سی لڑکیاں ہاتھوں پر مہندی رچنے کی آس میں بوڑھی ہو جاتی ہیں:

جوان گیہوں کے کھیتوں کو دیکھ کر رو دیں وہ لڑکیاں کہ جنھیں بھول بیٹھیں مائیں بھی ۱۲۷

گیلی سلگتی لکڑی عورت سیل زماں میں مدغم ہوگئی ۱۲۸

نظم ''خود کلامی'' نسائی احساس بیدار کرنے کی کوشش ہے، لیکن کاوش کا یہ سفر 'خارِ مغیلاں' سے اٹا ہوتا ہے:

انا کی قندیل گل کرو بھی
یہ دوہری صورت کے رنگ یک جان کر بھی ڈالو
بدل بھی ڈالو لباسِ عادت
یہ اِدّعائے وفا نما کس لیے ہے آخر!! ۱۲۹

نظم ''کشور ناہید'' میں کشور نے عمرِ رفتہ کے اُن دکھوں کو بیان کیا ہے، جو وقت انسان کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ اِس کربنا کی کے شکار مرد و عورت اغراض و نام نہاد مصروفیات کے عذاب کو جھیلنے پر مجبور ہوتے ہیں:

کشور ناہید!
تمھیں خاموش دیکھنے کی چاہت
قبروں سے بھی اُمڈی آرہی ہے
مگر تم بولو!
کہ یہاں سننا منع ہے
مجھے جن جذبوں نے خوف زدہ کیا تھا
اَب میں اُن کے اظہار سے
دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں ۱۳۰

خانگی تشدد کے حوالے سے کشور ناہید کی ، جو نظمیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں ، اُن میں ''ہوم سویٹ ہوم'' ''تھکان سے پہلے کا لمحہ''، ''شیشے کا زخم'' ، ''پُرانا کھاتہ''، ''اپنے قتل کا اعتراف''، ''فیئر ویل ٹو یوٹرس'' ، ''تابوت'' ''دائروں میں پھیلی لکیر''، ''عمر کے لمبے سائے''، ''میں ہوں تم ہو اور وہ سب ہیں''، ''آئینہ میرے اور تمھارے درمیاں'' ''خوابوں کی البم''، ''موم محل ''، ''ماضی میرے کندھوں پر''، ''جنگل میں ژالہ باری کا منظر''، ''کھیل سرائے'' ''یورپ میں نہ پگھلنے والی نظم''، ''صفحہ پلٹتے ہوئے''، ''نیلام گھر''، ''سُن ری سہیلی'' وغیرہ وغیرہ:

ناخنوں کی پوروں تک دہکتے خون
اور آنکھوں کی لووں تک پھیلے جذبوں کو

شادی کا نام دیتے ہیں ۱۳۱؎

خانگی تشدد کشور ناہید کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ نظم ''نیلام گھر'' میں بیوی کو انسان کے بجائے محض ایک شے متصور کرنے والے مردوں کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے:

وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر
میرے منہ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر
یہ جتانا چاہتا ہے
کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے

- - - - - -

تم حق والے لوگ ہو
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے ۱۳۲؎

نظم ''سن ری سہیلی'' میں حالات کے ہاتھوں پژمردگی کی شکار خواتین کو بیداری روح کی طرف قائل کیا اور عورت مرد پر مکمل انحصار کرتی ہے، اسی بات کو عورت کی کمزوری سمجھتے ہوئے مرد اپنی حاکمیت جتاتا ہے، کشور ناہید کے خیال میں آسودگی و نارسائی حسرتوں کو جنم دیتی ہے۔ نظم ''تیرے بیچ میری ڈھیل'' میں مردوں کی لاپرواہی اور عورت کی مجبوری و مصلحت کوشی کا اظہار ملتا ہے۔ مرد کی دھوکا دہی اور جگہ جگہ منہ ماریاں کرنا درحقیقت، اُس کے خود اعتمادی کے فقدان کو ظاہر کرتا ہے۔ مذکورہ نظم میں کشور ناہید نے بے وفائی کے مرتکب شخص کی بیوی کی کیفیات کی عکاسی کی ہے، جو مرد کی بے راہ روی سے بغاوت پر آمادہ ہے، پس اُس کی آخری حدیں دیکھنا چاہتی ہے کہ آخر نفس کا گھوڑا اُسے کس حد تک دوڑاتا ہے:

میں تو یہ سوچ رہی ہوں
تمھاری پتنگ کٹے گی تو تمھارے مانجھے سے
لوگوں کے سروں کی چادریں نہ کٹ جائیں
گردنیں نہ کٹ جائیں
بس اسی لیے
میں اپنی اُونچی پتنگ کو اور ڈھیل دیتی جا رہی ہوں ۱۳۳؎

نظم ''روزنامچہ'' میں طنز کا پیرایہ اختیار کرتے ہوئے عورت کو کمتر گردانے والوں کو تاریخ کے آئینے میں حال و فردا کی تصویر دکھائی ہے، اسی طرح دوسری پیدائش میں عورت کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ کشور ناہید کے خیال میں اپنے مرد اور گھر والوں کی خاطر اپنی تمام زندگی تیاگ دینے والی عورت میں نسائی شعور کی بیداری نے عورت کی حالتِ زار بدل دی ہے، آج کی عورت زیادہ بااعتماد ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر پڑھی لکھی لڑکی کی انا کچلنے کے لیے ایسے حربے استعمال کیے جاتے ہیں، جو اُس کی عزتِ نفس مجروح کرنے کا باعث بنتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑھی لکھی اور ورکنگ کلاس خواتین کو بے انتہا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مرد تمام تر نالائقیوں اور نااہلیوں کے انبار، اِس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے:

سب نیچ لوگ ہیں

کہ ہماری مائیں، ہماری بیٹیاں
ہماری بیویاں، ہماری بہنیں
صرف غرض اور ہوس کی بھٹی کا ایندھن ہیں۔ ۱۳۴

باشعور خود آگاہ، ذہین اور پڑھی لکھی لڑکیاں افرادِ معاشرے کے ستم کا زیادہ شکار بنتی ہیں، کیوں کہ نفسیاتی طور پر لوگ ،اُن کے ساتھ انتقامی رویہ روا رکھتے ہیں، تاکہ اپنی نارسائیوں کی در پردہ تسکین کی جا سکے۔ غالب و مغلوب کی اِس کشاکش میں تخلیقی ذہن رکھنے والی خواتین زیادہ کرب سے گزرتی ہیں۔ کشور ناہید نے انھی خیالات کا اظہار جابجا کیا ہے، مثلاً ''خود کلامی''، ''جاروب کشی''، ''میں کون ہوں''، ''تمھاری خاموشی میرا جرم''، ''ہم گنہگار عورتیں'' اِس حوالے سے اہم نظمیں ہیں، جن میں استحصالی رویوں کے خلاف طنز اور بغاوت پائی جاتی ہے:

یہ ہم گنہگار عورتیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں ۱۳۵

جنسی تشدد، گینگ ریپ، زنا بالجبر، کاروکاری، ونی کی شکار خواتین کو بھی کشور ناہید نے موضوعِ سُخن بنایا ہے۔ نظم ''وینا حیات اور آسیہ ایوب کی فردِ جرم'' میں قانون نافذ کرنے والوں کے ہاتھوں زیادتی کا شکار ہونے والی لڑکیوں کی داستان رقم کی گئی ہے:

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
اُن ہاتھوں نے
جن کی انگلیاں بندوق کی لبلبی پہ
اور مٹھیاں بیعتِ زر کے لیے
کھلی رہتی ہیں

- - - -

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
اُن چہروں نے
جن کے لعین خون کو دیکھ کر
خنزیر بھی نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں
جن کے شیطان ارادوں سے
طوفان پناہ مانگتے ہیں
جن کے ثبوتِ جرم کی گواہی دینے کے لیے

سفیدِ سحر کی جلوتوں سے لے کر
طلوعِ شب کی سیاہیوں کا ذرہ ذرہ
صف آرا ہے
اور تم!
ضعیفیٔ احساس کے مردہ خوارو
لوحِ بدن کو مسخ کرنے والو
تم مجھ سے ہی پوچھتے ہو
مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا ۱۳۶

نظم ''چارج شیٹ ۱۹۹۰'' میں کشور ناہید نے افسوسناک سماجی رویے اور بگاڑ کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح باشعور اور صاف ادراک ہونے کے باوجود افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کے ہاتھوں تباہی و بربادی کا شکار ہو رہے ہیں۔ عورت، بہن، بیٹی، ماں وغیرہ ہر حیثیت میں حقوق کی پائمالی کا شکار ہیں۔ قوانین قاعدے اور ضوابط محض فائلوں کی حد تک نظر آتے ہیں ورنہ، بیشتر مسائل کا حل محض عورت کی پسپائیت کو سمجھا جاتا ہے، اگر چہ آج کی عورت اپنے حقوق کے حصول کی بات کر رہی ہے۔ عفتوں اور عصمتوں کے لیٹروں کو سرِ عام بے نقاب کرتے ہوئے اربابِ اختیار سے ٹکرا رہی ہے، مگر پھر اُس کی شنوائی کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے:

میں آزاد ہوں کہ قید
میں خوش ہوں کہ آزردہ
میرے سر پہ چادر ہے اور بدن برہنہ ہے
میرے سر پہ تاج ہے اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں
زنا سے لے کر آدھی گواہی تک
سب دشنام میرے نام،
اور یہ انعام میرے نام
کہ میں شہر میں داخل ہونے والی پہلی عورت ہوں

- - - - - - -

میری چارج شیٹ بہت لمبی ہے ۱۳۷

پروین شاکر کی شاعری کا لہجہ معروضی طور پر تانیثی ہے اور منفرد بھی ہے، اُنھوں نے روایتی زبان سے انحراف نہیں کیا، ان کی شاعری میں اظہار پانے والی نسائیت مرد معاشرہ کی منافقت اور ریاکاری کا پردہ چاک کرتی ہے:

میری چھٹی ہوئی رودادے بھی گئی بیاں مگر　　　　فیصلہ رک گیا ہے ایک اور گواہ کے لیے ۱۳۸

پروین شاکر نے عورتوں بالخصوص نوجوانوں کی نفسیاتی اور حسیاتی اُلجھنوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ ایسی شاعرہ ہے، جس نے اُردو ادب کی تاریخ میں طبقۂ نسواں کی شاعری کو وقار اور اعتبار بخشا۔ اُنھوں نے اپنے دَور کا اثر قبول کرتے

ہوئے قلم کی جنبش سے ایسے نقش بنائے، جو مختلف بھی اور منفرد بھی ہیں۔ نظم ''اوتھیلو'' میں لکھتی ہیں:

اپنے فون پر اپنا نمبر
بار بار ڈائل کرتی ہوں
سوچ رہی ہوں
کب تک اس کا ٹیلی فون انگیج رہے
دل کڑھتا ہے
اتنی اتنی دیر تلک
وہ کس سے باتیں کرتا ہے ۱۳۹؎

پروین شاکر نے نکاح و مہر کے معاملات عورت کو نظر انداز کیے جانے کے رُجحان کی شدید مذمت کی ہے۔ سماجی رسومات قدامت پرستی، روایات اور مذہب کے نام پر عورت کو اِس کے بنیادی حق سے محروم کر دیتی ہیں۔ عورت کے سماجی و ثقافتی استحصال کی تصویر کشی اُن کے تانیثی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ نظم ''ایک معقول نکاح'' اِسی موضوع کی نمائندہ ہے:

تو فی الوقت مہرِ معجّل ہی کافی ہے
فکرِ مؤجّل تو تب ہو
کہ مطلوبہ ویرانیاں مشتبہ ہوں
یہاں تو مکانات کچھ ایسی سرعت سے کھنڈرات میں ڈھل رہے ہیں
کہ ہم سات پشتوں تک اپنے بسیرے کی فکروں سے آزاد ہو جائیں گے
اب نہ کھیتوں میں فصلوں کی ہے بدشگونی
نہ آنگن میں گڑیا لیے ہوئی بچی ۱۴۰؎

نظم ''صرف اے لڑکی'' میں سرد کمرہ معاشرتی بے حسی کی علامت ہے۔ اِس میں عورت کی زندگی کے بہت بڑے المیے اور ناسور کی نشاندہی کی گئی ہے، جو اُس کی روح کو گھلا کر پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ مرد اِس کے اعتبار کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ شادی زندگی کا ایک ایسا بنیادی حصہ ہے، جس پر معاشرے کی بنیاد اُستوار ہے۔ خانگی زندگی کی کامیابی کا دارومدار میاں بیوی کی ہم آہنگی، اعتبار و اعتماد پر ہوتا ہے، جو لوگ بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں، اِن کی اپنی زندگی، تو غیروں کی ٹہل سیوا میں بسر ہوتی ہے، لیکن اُن کا دامن نا آسودگیوں سے بھر جاتا ہے، اِس کے برعکس اِن سے وابستہ عورت بہ حیثیت بیوی سب سے زیادہ استحصالی کا شکار ہوتی ہے۔ ذہنی کرب میں گزرتی ہے۔ بے وفائی کا تکلیف دہ احساس ہمہ وقت روح کو کچوکے لگا تا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب وفائیں انتقام کی صورت اختیار کر لیتی ہیں ایسی عورتیں اپنے شوہروں کی بے وفائی کا بدلہ غیر مردوں سے دوستانے اور انتہائی صورت میں ناجائز تعلقات کی شکل میں لیتی ہیں، جو بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتیں وہ گھل گھل کر زندگی کی بازی ہار جاتی ہیں۔ مرد کی زندگی کے اِس شرمناک پہلو کی عکاسی، جو جیتے جاگتے انسان کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، پروین شاکر نے اپنی شاعری میں جابجا کی ہے:

سنگ دل رواجوں کے

آہنی حصاروں میں

عمر قید کی ملزم

صرف ایک لڑکی ہوں ۱۴۱

اِسی طرح نظم ''مقدر'' میں لکھتی ہیں:

میں وہ لڑکی ہوں

جس کو پہلی رات

کوئی گھونگھٹ اُٹھا کے یہ کہہ دے

میرا سب کچھ ترا ہے، دل کے سوا! ۱۴۲

عورت زندگی کے عذابوں کی زد میں غیر مطمئین ہی رہتی ہے، اِن کا مقابلہ کرنا یا پسپا ہونا اپنی ذات کو حوادث کے سامنے منقسم کر لینے کے مترادف ہے۔ نظم ''ڈیوٹی'' میں سماج کے مکروہ رُخ کی نقاب کشائی ہے۔ عورت کے کرب کی داستان ہے:

''جان!

مجھے افسوس ہے

تم سے ملنے، شاید اس ہفتے بھی نہ آسکوں گا

بڑی اہم مجبوری ہے!''

جان!

تمھاری مجبوری کو

اب تو میں بھی سمجھنے لگی ہوں

شاید اس ہفتے بھی

تمھاری چیف کی بیوی تنہا ہوگی ۱۴۳

اِسی طرح نظم ''دوست چڑیوں کے لیے کچھ حرف'' میں لکھتی ہیں:

سوچ رہی ہوں

ساری مائیں ایک سا مقدر کیوں لاتی ہیں

گودیں ہیں پھولوں والی!

آنگن پھر بھی خالی! ۱۴۴

نظم ''پروین قادر آغا'' میں پروین شاکر نے اُن حالات کی عکاسی کی ہے، جب عورت بیوگی یا طلاق کے دردناک کیفیات سے گزرتی ہے، تو ایسی مشکل کی گھڑی میں اپنوں کی بے حسی، پرایا پن اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کرب اور مشکلات کی نمائندگی احسن طریقے سے کی گئی ہے:

جب میرے سر سے چادر اُتری

تو میرے گھر کی چھت میرے لیے اجنبی ہوگئی

''تم ہمارے لیے مرچکی ہو''

- - - - -

سر پہ پہاڑ سی رات
چاروں طرف بھیڑیے
اور عورت بُو سونگھتے ہوئے شکاری کتے
''ہمیں گھاس نہ ڈالنے کا نتیجہ'' کہتی آنکھیں
''ہمیں موقعہ دو'' کہنے والے اشارے ۱۴۵

شبنم شکیل کی شاعری کا اہم موضوع نسائی شعور ہے، اُنھوں نے عورت کو درپیش مسائل اور اُن کے نفسیاتی محرکات کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے، اُن کا مجموعۂ کلام ''شب زاد'' سماج میں عورت کی کم تر حیثیت کی تصویر کشی اور ہر قدم پر اِس کے استحصال کی داستان ہے۔ وہ معاشرے کی معاشی و سماجی صعوبتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے بھرپور احتجاج پر زور دیتی ہیں، اِن کی شاعری معاشرے کی جکڑ بندیوں اور پس ماندگی کے خلاف ردِ عمل ہے۔ شبنم شکیل نے مرد کے اُس رویے کی نشاندہی کی ہے تضادات کا شکار ہے۔ خوش گفتاری و خوش اخلاقی جو انسانی شخصیت کا بہت بڑا وصف سمجھی جاتی ہے اسے ڈھال بنا کر خیالات کی پراگندگی کو چھپایا جاتا ہے، انھوں نے عورت کی فطری ہمدردی اور جلد دھوکا کھا جانے والے رویے کی بھی نشاندہی بھی کی ہے، انھوں نے خانگی و سماجی سطح پر عورت کے بارے میں استحصالی رویوں پر شدید احتجاج بھی کیا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی مستقبل کے اندیشے اِس کا مقدر کیوں بنتے ہیں اس کے برعکس مرد کی برتر حیثیت کو برملا تسلیم کیا جاتا ہے:

ہر لحظ زندگی کی عنایات اور وہ ہر لمحہ ایک مرگِ مفاجات اور میں ۱۴۶

اُس کی جھولی میں سب کھوٹے سکے ڈالے جائیں گے جانتی ہے یہ اندھی بھکارن پھر بھی دن بھر مانگتی ہے ۱۴۷

بچپن سے سب سہنے کی عادت ماں نے ڈالی تھی ۱۴۸

عورت کی ازلی خواہش گھر اور مستقل ٹھکانے کی ہوتی ہے، لیکن پہلے باپ، بھائی اور پھر شوہر کا گھر عورت کی زندگی کے مختلف بہروپ بن جاتا ہے، اکثر و بیشتر عورت یہ ہی سوال اُٹھاتی نظر آتی ہے کہ اس کا اصل ٹھکانہ یا گھر کہاں ہے؟:

میں جس میں رہ کے ایک مسلسل سفر میں ہوں اک واہمہ سا ہے کہ وہی میرا گھر نہ ہو ۱۴۹

سسرال کے سب طعنے چُپ چاپ سہے جاؤں میکہ جو نہیں میرا، اس گھر میں ہی رہنا ہے ۱۵۰

برسوں سے جس مکاں میں مری بود و باش ہے اب کیا لازمی ہے وہی میرا گھر بھی ہو ۱۵۱

شبنم شکیل نے ایک مشرقی عورت کے اپنے شوہر کے بارے میں نظریات اور سُسرالی رشتے داروں سے سمجھوتا کرنے کی ناگزیر صورتِ حال کو بھی بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مزید براں، مشروط محبتیں و شادیاں اور مرد کی

لاپروائی و آوارگی عورت کو تمام عمر ناتمام حسرتوں کی بھٹی میں سُلگاتی رہتی ہیں۔ نظم ''ورثہ'' نسل در نسل استحصال کی زنجیروں میں جکڑی عورت کی داستان ہے:

دیکھی ہیں میں نے ایسی بھی دُکھیا سُہاگنیں   بیاہی ہیں اور مانگ میں سیندور بھی نہیں ۱۵۲؎

خود سے بیگانگی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو بسا اوقات آگہی کو جنم دیتی ہے۔ کولہو کے بیل کی طرح خانگی اُمور میں اُلجھی ہوئی عورت کی داستان اس طرح بیان کی گئی ہے:

میرے ہونے کا احساس دلا دے مجھ کو   میں بھی زندہ ہوں کوئی آ کے بتا دے مجھ کو ۱۵۳؎

عورت اپنے ساتھ برتی جانے والی ناانصافی کے لیے جب بھی آواز بلند کرتی ہے اس کی آواز انصاف کے دریچوں میں بھٹک کر رہ جاتی ہے:

کسی سے کس طرح انصاف مانگنے جاؤں   عدالتیں تو بہت ہیں عدیل کوئی نہیں ۱۵۴؎

غیروں کے نظریات کے مطابق زندگی کی ناؤ کھینا انتہائی دشوار کام ہے:

چھوٹی سی تھی جب خود سے جدا کر دی گئی میں   فرقت کے مہ و سال بہت دیکھ چکی ہوں ۱۵۵؎

منکہ اصغری خانم میں بیٹی کے لیے یہی درس ہے، جو زندگی اپنی مرضی اور نظریات کے مطابق گزارنا چاہے ذلت و رسوائی اِس کا حصہ بنتی ہے:

جس نے رستہ اک الگ اپنے لیے چاہا یہاں   اُس کے حصے میں یہاں آئی فقط رُسوائیاں
کوئی سودا سر میں رکھنے میں ہے عافیت کہاں   اِس جگہ خوابوں کی اُڑ جاتی ہیں اکثر دھجیاں ۱۵۶؎

گویا! شبنم شکیل کے ہاں تانیثی تصور مختلف رنگوں میں پایا جاتا ہے، ان کے ہاں عورت ایک طرف سماجی قوتوں اور اپنوں کی بے حسی کا شکار ہے تو دوسری طرف باطنی اور ذہنی کشمکش اُس کا سکون غارت کرتی ہے۔ باشعور ذہن کی حامل خواتین دوہرے عذاب میں مبتلا ہیں، کیوں کہ آگہی کا عذاب سب ابتلاؤں سے بھاری ہوتا ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے کچھ نہ کر سکنے کی مجبوری، ذہنی تناؤ کا باعث بنتی ہے اِس سے شخصیت شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہے:

میں کہاں اور کہاں یہ سمجھوتے   میرے پردے میں دوسرا ہے کوئی ۱۵۷؎

شبنم شکیل نے عورت کی ازلی خواہش گھر کے بارے میں خیال پیش کیا ہے کہ اُس کی تلاش میں سرگرداں رہنے والی گھر کو استحکام تو دے دیتی ہیں، لیکن اپنی ذات سے بیگانہ ہو جاتی ہیں، اُن کی اس بیگانگی اور نفیِ ذات کے خلاف در پردہ ردِعمل کا اظہار کیا گیا ہے:

ڈھونڈتی رہتی ہیں گھر کی چابیاں   شبنم اپنے آپ کو ڈھونڈیں ذرا ۱۵۸؎

رضیہ فصیح احمد نے دیارِ غیر کی شخصی اور سماجی آزادی کے باوجود اپنی زمین سے ناتا نہیں توڑا، بلکہ اپنی مٹی سے اپنائیت کو برقرار رکھا ہے، لیکن ان کی بعض نظمیں ایسی ہیں، جن میں اپنی داخلی کیفیات کی عکاسی کے علاوہ معاشرے کی فرسودہ رسوم و رواج پر بھی طنز کیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے خیال میں، عموماً مرد، عورت کو اپنے خیال کے سانچوں میں ڈھالنا چاہتا ہے، یہ سوچے بغیر کہ وہ بھی فکر و خیال کی حامل زندہ انسان ہے۔ عورت کو ناسمجھ میں آنے والا معمہ قرار دینے والے ہر وقت عورت کو استفسارات کی اَنی پر لرزاں رکھتے ہیں، جب کہ ان کی اپنی حاکمانہ ریاست میں عورت کے لیے اِذنِ سوال کی بھی اجازت

نہیں ہوتی، کیوں کہ ان کا پندار اس بات کی اجازت نہیں دیتا:

ایک اُجلی مسکراہٹ اوڑھ کر　　　جو نہیں ہیں وہ نظر آتے ہیں ہم ۱۵۹

مرد عموماً عورت سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی ہر غلط بات کو درست تصور کرے، خود کسی بھی اخلاقی اصول اور قاعدے قانون کی پابندی کو اپنی آزادی کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کی خودسری کی انتہا یہ ہے کہ ان قباحتوں کو ذاتیات کا نام دے کر دھونس جماتا ہے۔ اس کے برعکس اپنی بیوی کی جانب سے ہر طرح کی خاموشی اور تعارف کا متمنی ہونے والے کی لاف زنی پر کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ اسی طرح چولہا پھٹنے کی آڑ میں جلائے جانے والی دُلہنوں اور سسرال والوں اور شوہر کے ہاتھوں جلائی جانے والیوں کو ہی موردِ الزام ٹھہرا کر خودکشی کا یا اتفاقی حادثے کا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے:

حکم یہ ہے کہ رہو جیت میں چپ، مات میں چپ　　　یہ کوئی بات ہے، کہتے ہو ہر اک بات میں چپ

اس کو دیکھو کہ بناتے ہیں جلانے کو دُلہن　　　کس طرح صبر سے بیٹھی ہے رسومات میں چپ

- - - - - - - - -

کچھ کے ہاتھوں میں تو خود رنگِ حنا بولتا ہے　　　اور کچھ لوگ کہ ہے جن کی ہر اک گات میں چپ ۱۶۰

ہر کامیاب مرد کی کامیابی میں ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن ہر عورت کی زندگی کی محرومیوں میں کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟ عموماً اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے:

وہ مہر کی طرح بڑھ رہا ہے　　　میں چاند کی طرح گھٹ رہی ہوں ۱۶۱

رضیہ فصیح احمد نے ان مرد و عورت کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے، جو دِلوں میں کسی اور کو بسائے ہوتے ہیں اور زندگی کسی اور کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ تضاد اور اغراض کی شکار یہ محبتیں، خلوص و وفا کو دوغلے پن کی بھینٹ چڑھا دیتی ہیں، یہ مقتول جذبات بکھر کر شخصیت کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں، عموماً اس شکستگی کا شکار زیادہ تر عورتیں ہوتی ہیں، کیوں کہ غیر عورتوں سے معاشقے، دوستانے اور یارانے گانٹھنا مرد نے اپنے لیے خودساختہ حق تصور کر لیا ہے، حالاں کہ یہ مرد کے لیے بھی اتنی ہی ممنوع ہے جتنی کہ عورت کے لیے۔ مرد کی اس خیانت کو رضیہ فصیح احمد نے عمر بھر کی مسافتوں کا دُکھ قرار دیا ہے:

لوگ سینے میں لے کے مرتے ہیں　　　چاہتوں میں خیانتوں کے دُکھ ۱۶۲

حقوق آشنا عورت کبھی بھی استحصال کو خاموشی سے نہیں سہتی ہے، بلکہ سچ سننے اور کہنے کے لیے درکار اخلاقی جرأت اور حوصلے کی طالب ہوتی ہے۔ رضیہ فصیح احمد محض مرد دشمنی کی قائل نہیں ہیں، ان کا خیال ہے، اگر مرد و عورت باہمی مفاہمت سے ایک دوسرے کو انسان تصور کریں، تو زندگی کی کٹھن راہوں سے بآسانی گزر سکتے ہیں:

سِل گئے ہونٹ جو پابندیِ اظہار کے ساتھ　　　بات پھر کیسے کریں گرمیِ گفتار کے ساتھ ۱۶۳

گر ہمیں سانس وہ لینے دیں سکوں سے رضیہ　　　ایسا جھگڑا بھی ہمارا نہیں اغیار کے ساتھ ۱۶۴

رشیدہ عیاں عورت کے جذبات کی نمائندہ شاعرہ ہے، وہ عورت کی وفاؤں کو اس کے مجسم ایثار، جاں نثاری اور وقار کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ شوہر سے محبت اور دِلی وابستگی فضاؤں میں اس کی بکھری خوشبو کو بھی محسوس کر لیتی ہے۔ اس حوالے سے نظم ''شمیم کے نام'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ مزید برآں، رشیدہ عیاں نے ''زہرِ قربت'' میں ازدواجی

زندگی کے سب سے بڑے مسئلے توجہ کے نہ ہونے کا اظہار کیا ہے، جو خانگی زندگی کی کربنا کی میں شدت کا باعث بنتا ہے۔ مرد عموماً اپنی شریکِ حیات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہر غلط بات کو کیموفلاج کرنا بخوبی جانتا ہے۔ نظم ''زہر قربت'' میں لکھتی ہیں مرد اپنی معاشقوں کے فخریہ اظہار میں اپنی عورت کی ذات کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیتے ہیں۔ عورت تمام عمر کی ریاضت ایک باوفا ساتھی اور ایک پُرسکون گھر کی خواہش میں ذلیل ورُسوا ہوتی ہے۔ تمام دُکھ سہتی ہے اور پھر بھی خالی ہاتھ رہ جانے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ نظم ''تلاش'' اور ''بھول'' میں اس موضوع پر لکھا ہے:

اپنا اک چھوٹا سا گھر
ایک ساتھی ایک ہم راہی
کوئی سچا رفیق
زندگی بھر کے لیے
ساتھی کی اس کو تھی تلاش
ڈھونڈتے ہی ڈھونڈتے اک روز قحبہ ہوگئی ۱۶۵

ماں زندگی کے مصائب سے ٹکرا کر اولاد کو گرم وسرد سے بچاتی ہے اور نفیِ ذات کے مراحل سے گزرتی ہے، جب کہ باپ کی لاپروائی گھر سے عدم دلچسپی اور دُوری اولاد کے دل میں نفرتوں کے الاؤ جلا دیتی ہے۔ نظم ''گناہِ نبودہ'' اسی موضوع کی ایک کڑی ہے:

تربیت کا مری ہر بوجھ اُٹھایا تنہا
گھر چلانے کو شب وروز کمایا تنہا
تھکی ماندی سی جونہی لوٹ کے گھر آتی ہے
لب پہ جبراً ہی سہی رنگِ طرب لاتی ہے
پھر مجھے کھانا کھلاتی ہے تو اصرار کے ساتھ
خود کو مصروف یونہی رکھتی ہے گھر بار کے ساتھ
مجھ کو سوتے ہوئے تو دیکھ کے اُٹھ جاتی ہے
اپنی تنخواہ جو پائی ہے، اُٹھا لاتی ہے
اب کرایہ بھی ہے، بجلی کا بھی، پانی کا بھی بل
دال روٹی کا چلانا بھی ہے کتنا مشکل

- - - - - -

صرف عورت ہی تشدد کا ہدف ہوتی ہے
کیوں کہ طینت میں وہی مثلِ صدف ہوتی ہے ۱۶۶

ہائیکوز ''عورت'' میں بھی رشیدہ عیاں نے تانیثی شعور کی عکاسی کی ہے:

یہی ہے مری ساکھ
سارا جیون جل جل کاٹا

پھر بھی ہوئی نہ راکھ ۱۶۷

پروین فنا سید تانیثی رُجحان کی شاعرہ ہیں، اُنھوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر احساساتی سطح پر عورت کی سوچ اور فکر کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے حقیقت پسندانہ قلم سے عورت کی اُن نفسیاتی گرہوں کو کشا کیا ہے، جن تک رسائی عموماً بے وقعت سمجھی جاتی ہے اور عورت کو محض جذباتیت کے لبادے میں پیش کرنے کی بجائے اِن عوامل کو بھی منظرِ عام پر لائی ہیں، جو اُس کے احساسِ ناموسِ ذات کو کچلنے کا باعث بنتے ہیں۔ پروین فنا سید کے ہاں عورت نہ صرف حقوق آشنا ہے، بلکہ اُس کا دائرۂ فکر ونظر ذاتی احساسات سے نکل کر آفاقی جذبات کے وسیع تر دائرے میں مدغم ہوجاتا ہے، یہاں اِس کا دُکھ ذاتی نہیں رہتا، بلکہ زمانے کا کرب بن جاتا ہے۔ فرد سے اجتماع تک کا سفر پروین فنا سید کے تانیثی شعور کی بالیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ مسلمہ روایات اور نام نہاد اُصولوں کے خلاف ردِعمل اِسی آگاہی کا شاخسانہ ہے۔ 'حرفِ وفا'، 'تمنا کا دوسرا قدم'، 'لہو سرخ ہے' اور 'یقیں' اُن کی فکر ونظر کے اظہار کا بھرپور ذریعہ ہیں۔ پروین فنا سید کے عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی نہایت جرأت مندی سے اِن کا لہجہ بڑا مدہم اور پرسکون ہوجاتا ہے، اُنھوں نے زندگی کے حقائق کی تلخیوں کو تسلیم کرتے ہوئے عورت کے دُکھوں کی داستان رقم کی ہے اور نہایت غیر جانبداری سے ان عوامل کی نشاندہی بھی کی ہے جو عورت کے خود ساختہ ہیں یا معاشرے کی غلط رسوم وقیود کی دَین ہیں، گھریلو تشدد بھی اُن کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ بیٹی کی جدائی، اُس کے دکھ اور کرب کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ماں کے اندیشے اور وسوسے جو بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے اُس کے دل و ذہن منڈلاتے ہیں، اِن کی نظموں 'کاغذی پھول'، 'مجھ کو کیوں زنجیر کیا'، 'رخصتی'، 'مہندی لگے پاؤں کا فیصلہ' میں نمایاں ہے۔ زندگی کس قدر مجبور و بے بس کر دیتی ہے۔ عورت سے حق کی بات کجا زندگی کا حق چھینا جاتا ہے۔ 'مہندی رنگے پاؤں کا فیصلہ' نظم خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ 'رباعی' میں بیان کیا گیا ہے کہ عورت جس کی خاطر اپنی انا کو ختم کرتی ہے۔ سارے زمانے سے ٹکرا جاتی ہے۔ ہر طرح کی سختی اس کے لیے برداشت کر لیتی ہے، لیکن جس کی خاطر انا نیزے پر دھری ہو اُسی کے ہاتھ میں کُند چھری دیکھ کر انسان نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے، بلکہ چھلنی وجود کے ساتھ روح بھی گھائل ہوتی رہتی ہے:

چھلنی تھا مرا جسم، تو گھائل تھی وفا
اس حال میں بھی ذوقِ طلب کم نہ ہوا
دیکھا تو اُسی ہاتھ میں تھی کند چھری
جس کے لیے نیزے پہ دھری اپنی انا ۱۶۸

نظم ''برزخ'' میں عورت کی قربانی کے اس جذبے کی عکاسی کی ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی ذات کی نفی کر دیتی ہے محبت کی خاطر اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی کی خاطر زمانے سے ٹکرا جاتی ہے، اپنا آپ مٹا ڈالتی ہے۔ اسے حرفِ حق کی سزا نہایت کڑی ملتی ہے اور ماہ وسال جدائی کی نذر ایسے گزرتے ہیں جیسے شہرِ سکوت میں زندگی سلگتی ہو:

بغیر تیرے
یہ دَور مجھ پر گزر رہا ہے
کچھ اس طرح سے
کہ جیسے شہرِ سکوت پر

ماہ وسال گزریں

کوئی نہ بولے

کہ حرفِ حق کی سزا کڑی ہے ۱۶۹؎

اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی قیمت عورت کو یہ چکانا پڑتی ہے کہ اپنے گھر کی چھت بھی بعض اوقات اس کے لیے اجنبی بن جاتی ہے، کیوں کہ لب کھولنے کی قیمت نہایت مہنگی ہوتی ہے۔ دوسروں کو اس اذیت کا احساس نہیں ہوتا یہ تو وہی جانتا ہے، جو اس تکلیف واذیت کی کٹھنائیوں سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اِن خاروں کی چبھن انھی کے پیروں میں ہوتی ہے، جو اِن پر چلتے ہیں۔ نظم ''جیسے'' اور ''شکستِ انا'' میں اِس کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ''شکستِ اَنا'' میں زنجیرِ وفا کا اک اِک حلقہ بے رُخی اور بے حسی کی بھینٹ چڑھ کر پندار کے ٹوٹے ریزوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے:

میں نے زنجیرِ وفا پہنی

تو سوچا بھی نہ تھا

کہ رگِ جاں میں اُتر جائے گا

اک اک حلقہ

دست وبازو پہ لہو بن کے اُبھر آئیں گے

میرے پندار کے ٹوٹے ریزے ۱۷۰؎

عرفانہ عزیز کے مجموعہ ہائے کلام میں ''برگ ریز''، ''کیفِ بہار'' اور ''حرفِ شیریں'' شامل ہیں، جن میں تانیثی احساس نمایاں ہے۔ نظم ''سخنوری کا عذاب'' میں لکھتی ہیں:

میرے دِلِ زار پر خدایا

سخنوری ہے عذاب ایسا

جو فہم وادراک کے لبوں سے

ہر ایک لحظہ نقدِ فکرِ رسا کا طالب

مگر میرا ذہن آج مفلس

تو میرا کشکولِ فن تہی ہے

میں جورِ خامہ سے تھک چکی ہوں

مری فقط التجا یہی ہے

قلم کے بدلے مجھے خیابانِ داد دے دے

مجھے شگوفوں کی اِک دکان مستعار دے دے! ۱۷۱؎

ظلم کا بازار گرم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اس کی مخالفت کرنے والے اکثر کرتے ہیں۔ ظالم خود بھی ظلم کا شکایتی بن جاتا ہے، جو کہ نہایت افسوس ناک بات ہے:

سر کی چادر اُتارنے والا   دادخواہوں میں لوٹ آئے گا ۱۷۲؎

عرفانہ عزیز کے خیال میں خودغرضی وانانیت کے دائرے ذات کی شکست وریخت کر دیتے ہیں، ان کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا انتہائی تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ خودغرضی وانانیت کے زہر سے زندگی دائروں میں بٹ جاتی ہے، جب دلوں پر کائی جم جائے تو تمام حقائق ڈوب جاتے ہیں۔ زندگی کی سچائیاں اذیتوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ آرزوئیں منجمد ہو جاتی ہیں۔ نظم ''فریسکوز'' کا ترجمہ، استبداد کی مختلف صورتوں کو اجاگر کرتی ہے، خصوصاً ماحول کی گھٹن اور اذیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ زندگی برہنہ پا ہو جاتی ہے، جب کینہ پروری اور خودغرضی بڑھ جاتی ہے، تمام ماحول بوجھل ہو جاتا ہے۔ ماحول ومعاشرت اور لوگوں کے رویوں سے انتہائی مایوسی کا شکار ہیں، جب دل ٹوٹ جائے سوچ بکھر جاتی ہے۔ منتشر سوچ کے ساتھ سکون کے لحات کھو جاتے ہیں، محض کرب واضطراب رہ جاتا ہے۔ ماں کی آغوش میں پلنے والے دکھوں کی داستانوں کو تلمیحی انداز میں پیش کیا ہے۔ مرد اگر چاہے تو زندگی کو جنت بنا سکتا ہے، کیوں کہ اِس کا عمل اور سوچ بہت سی زندگیوں کو متاثر کرنے کا باعث بنتا ہے، اس سے وابستہ لوگوں کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ بہت تلخ نکلتا ہے، نظم ''شوکیس'' اِس حوالے سے اہم ہے:

ایک گوشے میں ایزل دھرا تھا
وہ شاید پکاسو کے انداز میں
کوئی تصویر پھر
کینوس پر ادھوری دکھا کر
کسی نقشِ تازہ کے اعجاز کو
دار پر کھینچنا چاہتا تھا
وہ اپنی جفاؤں سے ناآشنا
خود پرستی کے زنداں میں مصور تھا[۱۷۳]

عرفانہ عزیز کے خیال میں مردوں کے استبداد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورت زندگی کی سچی خوشی سے محروم ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسے مردوں پر کاری چوٹ لگاتے ہوئے لکھتی ہیں:

مجھے تو حرفِ شناسائی کی تمنا تھی — رہوں گی تیری نگاہوں میں اجنبی کب تک[۱۷۴]

شاہدہ حسن فیمنیسٹ رُجحان کی حامل شاعرہ ہے۔ ''اک تارا ہے سرہانے میرے''، ''یہاں کچھ پھول رکھے ہیں''، میں تانیثی طرزِ فکر کی جھلکیاں نمایاں ہیں، اُن کے خیال میں حال کی تلخیوں سے بچ نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے، ماضی کی خوش یادوں میں بسیرا اس کی وجہ سے انسان وقتی طور پر وقت کے تناؤ سے نکل جاتا ہے۔ مثلاً ''اک تارا ہے سرہانے میرے'' کے اشعار، انھی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں:

میں نے اُن سب چڑیوں کے پر کاٹ دیے — جن کو اپنے اندر اُڑتے دیکھا تھا

- - - - - - - -

اُس کی رفاقت کی شرطیں آسان نہ تھیں — راہ جاتی بھی تھی، تیز بھی چلنا تھا[۱۷۵]

شاہدہ حسن کے ہاں جارحیت کی بہ نسبت تانیثی تصورات کا ناپاتلا انداز ملتا ہے۔ مایوسی اور احتجاج کی لے جہاں کہیں موجود ہے تاثیر لیے ہوئے ہے۔ نظم ''کون کہاں ہے'' میں تانیثی کیفیت نمایاں ہے:

آنکھ کہاں ہے!
میکے کے سونے دالان میں
یا خاوند کے ہاتھ میں ٹھنڈی چائے کی پیالی پر! ۱۷۶

خود ڈھ گئی وہ دیوار مگر گرتے ہوئے گھر کو تھام چلی ۱۷۷

یہ اعتبارِ رفاقت بہت ہے میرے لیے کہیں کہیں وہ مری راہ میں رُکا بھی ہے ۱۷۸

دُنیا کے ہر خطے میں عورت استحصال کا شکار ہے۔ جدید عورت کا سب سے بڑا المیہ ذمہ داریوں کا انبار، تنہائی، لمحہ بہ لمحہ ذہنی و جذباتی موت، بے وقعت اور بے حیثیت ہونے کا احساس، استحصالی قوتوں کے خلاف باغیانہ رویے کی عکاسی بھی شاہدہ حسن نے بڑے مؤثر انداز میں کی ہے:

تھک گئی ہوں بول کر بہت اب میں اپنے ہونٹ سی کے دیکھ لوں ۱۷۹

خانگی زندگی کی تلخیوں اور رنجشوں کو بھی اُنھوں نے بے نقاب کیا ہے، جو رشتہ دارروں میں رخنہ پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ کامیاب خانگی زندگی عورت کو کٹھ پتلی کی طرح انگلیوں پر نچانا سمجھتا ہے:

چھوٹی چھوٹی رنجش پر کنبہ بٹ جاتا ہے ایسی باتیں ہوتی ہیں بس دل کٹ جاتا ہے ۱۸۰

جہاں جی میں آیا ہے رکھا مجھے جہاں سے بھی چاہا ہٹا دی گئی
کسی گھر سے مجھ کو اُٹھایا گیا کسی گھر میں لا کر بٹھا دی گئی ۱۸۱

چلو کہ چل کے دیکھ لیں عدالتوں میں وقت کی ہمارے حق میں فیصلے بحال ہو گئے ہیں کیا؟ ۱۸۲

نظم ''خواتین کے عالمی دن پر'' میں شاہدہ حسن لکھتی ہیں:

میں اپنی صبح کا آغاز کرتی ہوں
کسی تازہ تکلّم سے
مری ہر بات میں، ہر تجزیے میں
فکر کا اک رنگ ہوتا ہے
میں اب دانش وری کی میز سے اپنے مقابل کو
مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مرے دِل سے
مری ماں کی بہت گہری خموشی میں گزاری عمر کا دُکھ کم نہیں ہوتا ۱۸۳

فاطمہ حسن تانیثی شعور کی حامل شاعرہ ہیں، ان کی شاعری نسائی جذبات واحساسات، ذہنی کیفیات، الجھنوں، خانگی زندگی کے مسائل کی ارتقائی داستان ہے۔ وہ عورت کے مقام و مرتبے کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اسے گوشت پوست کی

زندہ مخلوق تسلیم کیے جانے کی متمنی ہے۔فاطمہ حسن کے خیال میں گھر ایک مضبوط پناہ گاہ کی علامت ہے۔عدم تحفظ کا احساس فرد کی زندگی کی سب سے بڑی تلخی شمار ہوتا ہے، اِن کے خیال میں یہ ایسی عمارت ہے، جس کی بنیاد مرد و عورت ہی ہیں۔کسی ایک فریق کی عدم دلچسپی، بیگانگی و بیزاری غیر ہم آہنگی، ناپائیداری کا سبب بنتی ہے، اِن کی نظم ''گھر'' عورت کے صحیح اور سچے جذبات کی علامت ہے، نظم ''مجھے ڈر لگتا ہے'' میں آگاہی کے خوف سے اور اس کی تلخی کی طرف اشارہ ہے کہ حقائق کس طرح انسان کے لیے عذابِ جان بن جاتے ہیں:

لوگوں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہیں
اور مجھے ڈر لگتا ہے
کہ اب یہ تعبیر پوچھیں گے ۱۸۴؎

فاطمہ حسن نے گھریلو تشدد اور مرد کی حاکمیت کے خلاف شعور اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، اِن کے ہاں ایسی عورت کا تصور بھی ملتا ہے، جو مرد کے استبداد کے آگے سینہ سپر ہو جاتی ہے، عورت کی یہ بغاوت اِس کے استحصال کا منہ بولتا ثبوت ہے:

وہ لڑکی کسی اور بستی کی رہنے والی تھی
جو پتھر پر پھول اُگانے کی خواہش میں
انگلیاں زخمی کر بیٹھی۔'' ۱۸۵؎

''ایک نظم'' میں شوہر کی حاکمانہ طبعیت و جبریت کو موضوع بنایا گیا ہے:

میں تمھیں تمھارے باپ کے خلاف بولتے دیکھ کر
بہت خوش ہوئی
کہ اب میں تمھاری پناہ میں آنا چاہتی ہوں ۱۸۶؎

فاطمہ حسن کی شاعری محض تانیثی اظہار، مرد دشمنی اور احتجاج، بغاوت کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ اِن کے وقار اور سلجھاؤ پایا جاتا ہے، اِن کے لہجے کی توانائی اِن کے خیالات کو بے معنی نہیں ہونے دیتی، بلکہ قارئین کو متاثر بھی کرتی ہے۔'' بہتے ہوئے پھول''، ''دستک سے در کا فاصلہ'' اور نظم ''دو اسکیچز'' عصری شعور، تانیثی طرزِ فکر اور معاشرتی ناہمواریوں کا مؤثر اظہار ہے۔مرد کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے والی اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔محض ذات کے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، جن کی کرچیاں روح کو زخمی کر دیتی ہیں۔عورت گھر کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہے۔گھر سنورتے بھی عورت سے ہی ہیں، لیکن ناقدری کا احساس اسے شدید گھٹن اور کرب میں مبتلا رکھتا ہے:

سنوارتی رہی گھر کو مگر یہ بھول گئی   کہ مختصر ہے یہ عرصہ یہاں سکونت کا ۱۸۷؎

گھر اور عورت لازم و ملزوم ہیں، اس کے باوجود عورت کے دل کے کی دُنیا میں جو چیز فوقیت اختیار کر جاتی ہے وہ مرد کی ذات ہے، یعنی شوہر کے بغیر سہولتیں اور آسائشیں سبھی بے معنی ہو جاتی ہیں۔مرد عورت کا سنگھار ہوتا ہے۔نظم ''گھر'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے:

ایک مکان اور بستر سے
اور برتن سے

کیا گھر بنتا ہے
گھر بنتا ہے تم سے ۱۸۸؎

فاطمہ حسن نے زندگی کی تنہائی کا دُکھ نظم ''گڑیا'' میں بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

تنہا جب ہوتی
بچی اپنی گڑیا سے
دکھڑے سب روتی ۱۸۹؎

یاسمین حمید تانیثی شعور کی حامل شاعرہ ہیں، ان کے ہاں پسپائیت کے بجائے اثباتی رُجحان ملتا ہے، یعنی وہ حقائق کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔ عورت کا استحصال، نا آسودگی، احساسِ نارسائی کے علاوہ مرد کے استبدادی رویے کے خلاف اُن کی شاعری میں بغاوت پائی جاتی ہے۔ وہ عورت کو بے ٹھکانہ قرار دیے جانے کے حوالے سے معاشرتی وسماجی بے اعتدالی، ناہمواری کی مذمت کرتی ہیں، اِن کی نظمیں ''پس آئینہ''، ''حصارِ بے در و دیوار ہوں'' اور ''آدھا دِن آدھی رات'' استبداد اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی یاسیت، بے عملی اور انحراف کی کیفیت پیدا نہیں کرتی، بلکہ حقائق کو کھلی آنکھوں سے تسلیم کرنے کی طرف احساس دلاتی ہے:

بہت ہی تیز ہے خنجر کسی کے لہجے کا
مرے سلے ہوئے ہونٹوں کو کھولنا چاہے ۱۹۰؎

بعض مقامات پر حالات کی تلخیوں اور رویوں کی بدصورتیوں کے مقابل پسپائیت وکمپورمائز کا انداز نمایاں ہے:

جس سے دُنیا خوش ہو بات وہی ہے سچی
آگ کو پانی، موم کو پتھر کہنا ہوگا ۱۹۱؎

مایوسی وخوف کے ملے جلے جذبات کی عکاسی یاسمین حمید کی شاعری کا خاص موضوع ہے، اُنھوں نے عورت سے روا رکھے جانے والے بُرے رویوں کے اثرات کی بھرپور عکاسی کی ہے، جس کا ردِ عمل عورت کے دِل ودماغ میں رشتوں اور جذبات واحساسات کی شکستگی کا دکھ اور کرب کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ مرد کی بے حسی وخودغرضانہ رویے کی نشاندہی، بڑے مؤثر انداز میں کرتی ہیں:

سلاخیں توڑ کر بھی کیا ملے گا
سزا فیصلہ تو ہو گیا ہے ۱۹۲؎

دل بھی جب سلگتے ہیں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے
انقلاب آتا ہے جب دماغ جلتے ہیں ۱۹۳؎

روشنی کو اپنے ذمے لے لیا
مجھ کو دے دی پاسبانی رات کی ۱۹۴؎

یاسمین حمید نے عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی بدلی ہے:

تصرف میں تو آئے مرہم آسودگی بھی
اُسے بھی زخم دوں اور خود بھی گہری چوٹ کھاؤں ۱۹۵؎

'مرہم آسودگی' ایسا احساس ہے، جو زخموں کا مداوئی کرتا ہے۔ آسودگی اُسی وقت ممکن ہے، جس آگ میں وہ جلے اُسی میں جل کر خاکستر ہو جانا، خودسپردگی کی انتہا ہے:

مرے وجود ہی میں بت شکن بھی ہے
مرے وجود ہی میں سومنات بھی ۱۹۶؎

احساسِ تشنگی اور نہ سمجھے جانے کا دُکھ بہت گہرا ہوتا ہے۔ شعور و آگہیِ ذات جب اندیشوں کی نذر ہو جاتی ہے، تو محض واہمات اور من گھڑت نام نہاد حقائق ذات کے حصار کو توڑ کر اصلیت تک رسائی پانے سے رہ جاتے ہیں اور محض غلط فہمیاں دل و ذہن میں جاگزیں ہوتی ہے، اِس کے برعکس مرد کی توجہ اور محبت عورت کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ دیتی ہے، عورت جو ایا صرف وفا کی متمنی ہوتی ہے۔ جس عورت کو مرد کا تحفظ حاصل ہو وہ غموں سے دُور ہو جاتی ہے:

قتل کر کے مرے گواہوں کو　　　　اس نے خاموش کر دیا مجھ کو ۱۹۷

اِسی طرح انسانی ظرف میں اگر کجی آ جائے تو تمام تر گفتگو بہک جاتی ہے، بہکتی ہوئی گفتگو کا انداز اسی بات کی غمازی کرتا ہے۔ مرد عورت کو صمٌ بکمٌ کا حامل گردانتا ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ اُسے اظہار کی آزادی ہو، اِس پر کسی قسم کی کوئی قدغن ہو۔ وہ اپنی خواہشات کے بتوں کو لفظوں کا جامہ پہنا سکے۔ مرد لفظوں کے تیر و نشتر چبھو کر خود کو ہلکا پھلکا تو کر لیتا ہے، یہ سمجھے بغیر لفظوں کے گھاؤ روح کو زخمی کرتے ہیں اور جلد مندمل نہیں ہوتے۔ ذہن کے دریچوں میں، ان کے سنگریزے مطالب کے گورکھ دھندے بن جاتے ہیں:

روشنی کو اِس طرح ہوگی اندھیرے سے شکست　　　　ختم ہو جائے گی شب، جلتا دیا رہ جائے گا ۱۹۸

نظم ''کیوں؟'' اور ''تقدم'' عورت کے استحصال کی تصور کشی ہے۔ اِس نظم میں ظلم سہنے کے خلاف احتجاج اور رویوں کے خلاف طنزیہ انداز پایا جاتا ہے۔ گردشِ دوراں کے جبر کو سہے جانا آساں نہیں۔ لہجوں کی تلخی، لفظوں کے گھاؤ، استبداد اور ظلم کے عکاس ہو جاتے ہیں۔ نظم ''ڈپریشن'' ایک عمدہ نظم ہے، جس میں موجودہ دَور کی الجھنوں کا شکار عورت جس کے پاس کوئی حل موجود نہیں محض ذات کے حصار سے اُلجھنے سے بچ جائے تو حالات و سماج کے تانے بانے اُلجھا دیتے ہیں۔ عکس کو روشن کرنے والا آئینہ انسان کے ضمیر کے مترادف ہے، بہت سے بے معنی و بامعنی اندیشے جمع ہونے لگتے ہیں۔ گھٹن زدہ فضا میں اپنی ہی صدا گونج کر واپس لوٹ آتی ہے، اِس کی گونج قبر کی گیلی مٹی کی طرح وجود پر جم جاتی ہیں:

کیوں مری بات
مرے لہجے کی نرم سے گریزاں ہو کر
اپنا مفہوم بدل لیتی ہے
کیوں یہ تقصیر بھی میری ہے
کہ یہ روح، یہ بینائی، یہ الفاظ
مرے بس میں نہیں ۱۹۹

عورت کا استحصال مسخ چہروں پر لکھے ایسے صحیفے بن گے ہیں، جن سے کچھ لوگوں نے شعور پایا اور کچھ نے نہیں۔ آج تک کتنی ہی خواتین استحصال کا شکار ہوئیں۔ گھریلو تشدد، جنسی تشدد، زندہ جلانا، تیزاب پھینکنا، مار پیٹ، ذہنی و جسمانی اذیتیں، سسرال کے جھگڑے اور مظالم، غرض یہ زمانہ کتنی روحوں کی مضطرب قبر بن چکا ہے، مثلاً نظم Feminist عورت کے شعور اور اُس کی بے بسی کی تصویر ہے:

چار بچوں کی ماں کی آبروریزی کرنے والا
کتنی دیر مطمئن رہا؟

ہیروں کا برادہ پھانکنے والی عورت نے کہا:
بھوک کا کنواں کیسے بھرتا ہے؟

- - - - -

ایک عورت روز صبح جلوس نکالتی ہے
اور شام کو گیدڑ کو سونگھتی ہوئی چوپایہ بن جاتی ہے
ایک عورت دن بھر ہیروں کا برادہ پھانکتی ہے
اور رات کو بھوکی سو جاتی ہے ۲۰۰

منصورہ احمد، مشرقی عورت کے احساسات کی ترجمان ہے۔ لڑکپن اور بچپن ماں باپ، خصوصاً ہر بچی کے لیے باپ سے جذباتی وابستگی ہوتی ہے، بہن بھائیوں کا پیار، چھوٹی عمر میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک اور پھر باپ کی دہلیز سے سُسرال کی چوکھٹ تک کا سفر اور اُن کی تلخیاں اور کٹھنائیاں اِن کا خاص موضوع ہے، مثلاً ''اپنے بابا کے لیے''، ''میں گڑیوں سے نہیں کھیلتی''، ''تلاش''، ''مجھے آزاد کردو''، ''کتبہ''، ''موسم بدلتے تک''، ''تقسیم کار''، ''ایک سوال''، ''صرف ایک لمحہ''، ''تمھیں گلہ ہے''، ''احتیاط''، ''فیصلہ'' عام طور پر لڑکوں کو لڑکیوں پر فوقیت دے دی جاتی ہے، بے جا لاڈ پیار اور توجہ کی وجہ سے احساسِ تحفظ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لڑکیوں کو لڑکپن ہی سے عدم تحفظ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پرایا دھن سمجھا جاتا ہے، عموماً اِن کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینا اور روپے پیسے خرچ کرنا کھانے سے سوا سمجھا جاتا ہے، چوں کہ لڑکوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت و توجہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے اِن میں احساسِ تفافر، قوت و طاقت کا احساس، احساسِ برتری میں بدل جاتا ہے، من مانی کی عادت پڑ جاتی ہے، جو تاحیات قائم رہتی ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی تربیتوں کے انداز آرکی ٹائپیل ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے استحصال اور احساسات کی قدر نہ کرنا، خود سری اور انا پرستی جیسے منفی رُجحانات اسی قسم کی غلط تربیتوں کا نتیجہ ہیں۔ منصورہ احمد نے اِسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بھائی جب بہن کا استحصال کرتا ہے، اس پر حق جتاتا ہے، حتیٰ کہ اِس کے کھلونے توڑتا ہے، تو لڑکی کے احتجاج کا حق بھی سلب کرلیا جاتا ہے، کھلونے بھی اِس کے ٹوٹتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیا جاتا، بلکہ سختی سے خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی ہے، یہ بات لڑکے کی غلط عادت کی پختگی میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہے کہ وہ مستقبل میں یہی طرزِ اختیار کرتا ہے:

میرے بھائی مری گڑیوں کی ٹانگیں اور بازو توڑ دیتے تھے
میرے آنگن میں اک سورج کا گھر تھا
جہاں سارے کھلونے اور غبارے بھک سے اُڑ جاتے ۲۰۱

باپ کی شفقت کو موضوع بنایا گیا ہے، جو بچپن میں پیدا ہونے والے تمام تر ڈر اور خوف کو اپنی آغوش میں چھپا لیتا ہے۔ ''کاغذ کی ناؤ'' میں وہ آرزوئیں اور خواہشات ہیں، جن کے بل بوتے پر مستقبل کا سفر طے کیا جاتا ہے، باوجود یہ کہ کشتی عارضی ہے، لیکن وقت گزرنے پر ناؤ حالات کے ہاتھوں شکستگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ وقت کی گزران بہت کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ماں باپ کی شفقت محبت کی چھاؤں میں پروان چڑھنے والیاں، گھر کے آنگنوں میں خوشیاں اور قہقہے بکھیرنے والیاں دوسروں کے دریچوں کو مہکا رہی ہوتی ہیں۔ وقت کی گردش رویوں میں تبدیلی لے آتی ہے۔ مناظر کی طرح رشتے اور سوچ و فکر

کے انداز سب بدل جاتے ہیں:

اپنوں کے چھتنار میں لاکھوں چھید پڑے تھے
سکھیاں جیسے ہنستا ہنسانا بھول گئی تھیں
ریتلے لفظوں والی آوازوں سے محفل اُونگھ رہی تھی
رسمی پُرسش،
باسی لہجے،
موسم کی تلخی کے قصے،
جس میں گھٹتی اِن سانسوں سے
دردِ رفاقت کیسے بانٹیں؟
رشتے دار اور انساں مر جائیں تو بوجھل ہو جاتے ہیں[۲۰۲]

نظم ''صدیوں پیچھے'' میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو ظاہر کرتی ہے، جو زمانہ قدیم سے مروج ہیں:

رسموں کے ٹھیکے داروں نے
جُرمِ تمنا کی پاداش میں حکم سنایا
اَب دُنیا میں آنے والی ہر حوّا کو
پہلے دِن سے لوہے کے جوتے پہناؤ

- - - -

سوچ رہی ہوں
صدیاں کیسے اتنا پیچھے لوٹ آتی ہیں
چین کی سرحد کیسے میرے گھر آنگن تک آ پہنچی ہے
لوہے کے جوتوں میں جکڑے میرے پاؤں
آنگن کی دہلیز اُلانگ کے
اپنی دُنیا تک جانے سے انکاری ہیں! [۲۰۳]

''میں مجرم ہوں'' میں لڑکی اپنے باپ دِل کا حال بھی کہہ رہی ہے اور اپنی مجبوریوں کو بھی بیان کر رہی ہے، ایسی بے بسی کا نوحہ پیش کرتی ہے کہ میں مجرم ہوں کہ میں اپنے باپ کی تربیت ہمیشہ سچ بولنا کی لاج نہیں رکھ سکی، کیوں کہ میرے باپ کے اصولوں کی اِس کی چار دیواری کی حد تک رسائی ہے۔ چار دیواری کے باہر سماج ہے، جو اپنی کجیوں کے مقابل اچھائیوں کو برداشت نہیں کر سکتا ہے، خود لتھڑے لوگ سب کو اپنے رنگ میں رنگ کر نفسیاتی تسکین حاصل کرتے ہیں:

بابل میرے! میں مجرم ہوں!
تم سے میرے سارے وعدے جھوٹے نکلے
میں نے تم سے کہا تھا، سچ بولوں گی

میں نے جتنے سچ بولے

تیشۂ جاں سے

اونچے اونچے پربت کاٹے ۲۰۴

نظم ''میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں'' میں زندگی کے بارے میں لوگوں کے رویے بیان کیے گئے ہیں، ایسے گھروں کا قصہ جہاں نئی زندگی کو سانس لینے سے پہلے ہی مر جانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ ذمہ داری کا خوف، رقابت، جائیداد میں حصہ داری وغیرہ کے خوف سے ٹینشن اور بھوک کی نذر ہوتے ہوئے موت کی وادیوں میں چلے جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے موت کی وادیوں میں کھو جاتا ہے اور ماں کے لیے زندگی بھر کا روگ دے جاتا ہے:

میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں

جن کے بچے پیدا ہونے کی پاداش میں

پیدائش کے ساتھ ہی سولی پر آویزاں ہو جاتے ہیں

اور ہر لمحہ رسہ کھنچنے کی دہشت میں

ہونٹوں کی سوکھی پپڑی سے

موت کی سیلن چاٹتے چاٹتے اک دن نیچے گر جاتے ہیں ۲۰۵

مائیں جو کچھ سہتی ہیں، جو دُکھ برداشت کرتی ہیں۔ بچیوں کے نازک ذہن ان کا اثر لیتے ہیں۔ باپ کا ناروا رویہ، ماں کے آنسو اور گھر والوں کی بے انصافیاں لڑکیوں کو شادی سے خائف کر دیتی ہیں۔ ماں جانتے بوجھتے بھی کہ شادی شدہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ کو چاہتی ہے کہ بیٹی زندگی کے اِن تجربات سے ضرور گزرے:

ماں کو شاید یہ اُلجھن ہے

اُس نے اپنی ماں سے

جتنے دُکھ ورثے میں پائے تھے

چپکے چپکے جل جانے کے جتنے قول نبھائے تھے

میں اُن سب سے کیوں باغی ہوں

کتنی بھولی سیدھی ماں ہے

آگ کے ورثے سے انکار پر روٹھ گئی ہے ۲۰۶

ثمینہ راجا تانیثی نظریے کی حامی شاعرہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جہاں کہیں عورت کے حوالے سے بات ہوتی ہے وہ مرد کی بے رُخی، بے حسی اور عورت کی جانب اس کی حاکمیت اور انانیت وغرور کو اپنا موضوع بناتی ہے، اِن کے خیال میں معاشرے میں مردوں کی تربیت ہی اس انداز میں کی جاتی ہے کہ وہ خود کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔ اپنی برتری کے زُعم میں وہ عورت کے بہت سے احساسات کو کچلتا چلا جاتا ہے۔ عورت ومرد کی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے:

میرے پندار سے نہ کھیلنا تم — ترکِ اُلفت کا حوصلہ ہے مجھے ۲۰۷

''اور وصال کہاں'' میں ثمینہ راجا نے خانگی زندگی کے ایسے نقطے کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں مرد اپنے ماں باپ،

بہن بھائیوں کی چغلیوں اور فریب کاریوں کے جال میں اُلجھ کر بیوی کے حوالے سے غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ خانگی زندگی کی تباہی کا ایک بہت بڑا سبب میاں بیوی کے مابین غلط فہمیاں پیدا کرنا اور پھوٹ ڈلوانا ہے، اِس کے لیے پروپیگنڈا سب سے زیادہ فعال کردار ادا کرتا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی میں اُس کے خلاف زہر اُگلا جاتا ہے، تا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے بدظن کیا جا سکے، کیوں کہ ذہنی ہم آہنگی کامیاب زندگی کی نشانی ہے، اِس بدگمانی کا سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچتا ہے کہ تھوڑی سے تگ و دو سے ساری زندگی میں زہر گھولا جا سکتا ہے۔ میاں بیوی کی سوچ میں یکسانیت کی کوشش بچوں کے مستقبل اور گھر کی تعمیل و تشکیل میں خود انحصاری کی علامت ہوتی ہے، اِس وجہ سے شوہر کی توجو بیوی بچوں کی طرف مرکوز ہونا فطری عمل ہے، جو سُسرالی یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اُن کا بیٹا اُن سے چھین رہا ہے، اُنھیں نظر انداز کر رہا ہے، خاصہ تکلیف دہ امر ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بیوی کو نا قابلِ اعتبار اور مشاورت یا کسی بھی بات چیت کے لیے نا اہل قرار دینے کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، دوسرا یہ کہ بیوی بچوں کو آزادی میں بہت بڑی رُکاوٹ اور بے جا مصروفیات کا متبادل قرار دیے جانے پر زور دیا جاتا ہے۔ تا کہ، مغائرت پیدا کی جا سکے، سمجھ دار مرد اِس قسم کے پروپیگنڈے کی بھینٹ نہیں چڑھتے، وہ اِس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی کی اصل اساس اور مستقبل بیوی بچوں سے وابستہ ہے اور اُن پر یہ بات بھی مکمل طور پر عیاں ہوتی ہے کہ وہ نئی نسل کی پرداخت کے امین ہیں۔ ''اور وصال کہاں'' میں ثمینہ راجا نے خانگی زندگی کے اِس ناسور کی نشاندہی دیگر نظموں میں بھی کی ہے، مثلاً ''ہویدا'' میں، ''گنبد بن جاؤ'' اور ''کیا جاناں کنم'' میں مختلف ہاتھوں میں کھلونا بنتی ہوئی عورت کی داستان رقم ہے:

پتھر تلے اگر دبی ہوں ۲۰۸
پتھر ہی بنا لیا خود کو

نظم ''آسماں کے نیچے'' خانہ بدوشوں کی زندگی کا خاکہ ہے کہ کس طرح زندگی بسر کرنے کے لیے کھلے آسمان تلے موسموں کی سختیاں برداشت کرتے ہیں۔ چھت والوں کے لیے برسنے والے بادل موسم کی خوشگواری کی علامت ہے، جب کہ اِن کے لیے تباہی کی۔ عورت چاہے امیر ہو یا غریب اولاد کے لیے اچھی سہولتیں پہنچانے کا سوچتی ہے اور جو بھی نعمتیں دیکھتی ہے چاہے اِس کی رسائی میں ہو یا نہ ہو اولاد کو دینے کا سوچتی ہے اور حالات کے ٹکرا جانے کا عزم نئے سرے سے اپنے اندر محسوس کرتی ہے۔ تیز دھوپ حالات کی تلخی اور ''رستہ کافی لمبا ہے'' سے مُراد تلخیاں اور سختیاں ہیں۔ اچھا وقت دُور ہونے کے باوجود عورت اپنے بچے کا پیٹ بھرنا چاہتی۔ خود بھوکی رہتی اِس کو کھانا دیتی ہے۔ نظم ''پتھر'' عمدہ نظموں میں شمار ہوتی ہے، اِس میں ماحول کی بے حسی سے تنگ آ کر اپنی ذات کے حصار میں بند ہونے والی اور اردگرد پتھر کی سِلیں ایستادہ کرنے کی خواہش شدید ہو جاتی ہے۔ تا کہ، شخصیت اور ذات کے حوالے سے کوئی آنچ نہ آ سکے، اِس کے احساسات کے نازک آبگینوں کی طرح ہوتے ہیں، انھیں ہر قدم کچلا جاتا ہے، بلکہ لمحہ بہ لمحہ اِن کی آرزوؤں کا گلہ گھونٹا جاتا ہے۔ شیشے کے محلوں میں شیشے کی کرچیوں سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے طعنے پتھروں کا کام کرتے ہیں:

میں اپنے گرد
پتھر کی فصیلیں کیوں نہ ایستادہ کروں
احساس کے شیشے کے محلوں میں
مجھے یہ لوگ رہنے ہی نہیں دیتے

کوئی آنسو بھی آنکھوں میں چمک جائے

تو یہ پتھراؤ کرتے ہیں ۲۰۹

نظم ''اصل کہانی'' میں خانگی زندگی کی تصویر کشی اساطیری انداز میں کی گئی ہے۔ معمولی بات بعض اوقات زیادہ اہمیت اختیار کر جائے ،تو تلخیاں جنم لیتی ہیں، اس لیے شہزادے اور شہزادی کی کہانی سے کپڑوں کے نہ دھلنے کی معمولی سی شکایت رنجشوں کا باعث بن جاتی ہے۔ درحقیت شاعرہ کا مؤقف مرد وعورت کو سمجھانا ہے کہ ایک دوسرے کی عزتِ نفس کا تحفظ ہی کامیاب زندگی کا راز ہے:

اک دن کھانا ٹھیک نہیں تھا

شہزادے نے راجے کی بیٹی کو جھڑکا

اک دن کپڑے دھلے نہیں تھے

شہزادے نے راجے کی بیٹی کو ڈانٹا

وہ بھی راجے کی بیٹی تھی

جوش میں آئی اور میکے جانے کے لیے تیار ہوئی

تب شہزادے نے راجے کی بیٹی کو پیٹا

اور راجا کو گالی دی

اَب بچو!

دونوں لڑتے اور اک دوسرے کو کنکر اور پتھر مارتے ہیں

اور بچو، اُن کا شیش محل

کرچی کرچی ہو کر راہوں میں بکھرا ہے ۲۱۰

شہناز مزمل نے اپنے کلام میں محض عورت کے دُکھوں کی داستان رقم نہیں کی، بلکہ وقت کی گزران اور زندگی میں پیش آنے والے مختلف حوادث اور انسانی زندگی پر اِن کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ شہناز مزمل کا شمار اُن فیمینسٹ شاعرت میں ہوتا ہے، جو محض عورت کے دُکھوں، کلفتوں، سماجی ناہمواریوں اور ناروا سلوک کو پیش نہیں کرتیں، محض مرد دشمنی پر زور نہیں دیتیں، بلکہ مرد وعورت دونوں کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کرتی ہیں، اِن کے نظریات کے مطابق 'انا' محض مرد ہی کی نہیں، بلکہ مرد وعورت دونوں کا زیور ہے، یہی وجہ ہے کہ یقینِ ذات کے ساتھ ساتھ احساسِ ذات اور عزتِ نفس کو ملحوظ رکھنا دونوں کے لیے ضروری ہے۔ ''بپتا اک عورت کی'' عورت کے مصائب کی داستان ہے۔ شہناز مزمل کے خیال میں بہت کم مرد ہوتے ہیں، جو اپنی عورت کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کو سمجھتے ہیں۔ بیشتر مرد اپنے تناظر میں عورت کو پرکھتے ہیں، جس کا عمومی پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ عورت محض تابع داری اور جی بہلانے کے علاوہ بچوں کو پیدا کرنے اور گھر داری کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے ہے، وہ جب چاہیں اِس پر نااہلی کی مہر ثبت کر دیں اور اُس کی خوبیوں کو بھی خامیوں میں بدل دیں اور زندگی کی خوشیوں سے محروم کر دیں:

تو جو عورت ہے ترے ذمے ہے دُکھ ہی سہنا

بے زبان رہنا زباں سے نہ کبھی کچھ کہنا

پا بریدہ تمھیں گر گر کر سنبھلنا ہو گا
اپنے ہر خواب کو آنکھوں میں کچلنا ہو گا

- - - - -

مگر کیوں کرتی ہے اے عورت بدذات بتا
سب ہیں چالاکیاں کچھ بھی تو نہیں تجھ کو ہوا
تو سمجھتی ہے پسند آئے گی تیری یہ ادا
تیری اِس چال پہ ملتی ہے ابھی تجھ کو سزا
ہے مرے پاس یہ حق آج ہی دے دوں گا طلاق
تو تو عورت ہے تجھے اور بھگتنا ہے عذاب ۲۱۱

عورت پر ہونے والے مظالم اور استحصال کے خلاف بغاوت اور اُس کے حقوق کی بازیابی کی اُمید ''چلتی پھرتی لاش'' بن جاتی ہے:

روزِ اول سے محکومی کی
چکی میں
پستی ہے عورت
ظلم کی روشن آگ میں زندہ
جل کر مر جاتی ہے عورت
محرومی کا پھندا پہنے
گھٹ گھٹ کر جیتی ہے عورت
کھلی قبر میں
چلتی پھرتی لاش کی صورت
دیکھتی عورت ۲۱۲

نظم ''خود ساختہ اندھا نگر'' میں اُن لوگوں کو نشانہ تنقید بنایا گیا ہے، جو کہ مردوں کی خود ساختہ دُنیا میں اندھیر نگری اور لاقانونیت کا شکار ہوتی ہیں، اِس معاشرے میں صرف اور صرف مردوں کو جینے کا حق ہے، انھی کے نظریات کے تحت تمام سماجی اصول و قواعد و ضوابط متعین کیے جانے پر معاشرے کے بے حس طبقے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ عورت بطور فنکار بہت سے مصائب کا شکار ہوتی ہے، اِس کی تخلیقات کو کارِ بے کاراں قرار دیا جاتا ہے۔ حساس ذہنیت کی حامل عورت کے احساسات کی عکاسی نظم ''کل آج کل'' میں کی ہے:

غلط سمجھا تھا میری سوچ پر پہرے بٹھا دو گے
غلط سمجھا تھا میری فکر کو بنجر بنا دو گے
غلط سمجھا کٹ پتلی بنا کر تم نچا دو گے

غلط سمجھا تھا مجھ کو میرے ہونے کی سزا دو گے

- - - - -

نہیں ممکن میری تو قیر داؤ پر لگا دینا
نہیں ممکن مجھے زنجیر پہنا کر بٹھا دینا
نہیں ممکن لگا کر زخم جینے کی سزا دینا
نہیں ممکن ہے ناممکن کو ممکن سے ملا دینا ۲۱۳

معاشرہ عورت سے نفیِ ذات کا متقاضی ہوتا ہے:

مٹی لے کر ہاتھ میں اپنے
کب سے بیٹھی سوچ رہی ہوں
میں بھی مورت مٹی کی ہوں
مجھ کو ڈھالا رب نے میرے
میں یہ مٹی کیسے ڈھالوں
کوزے ڈھالوں
یا بت ڈھالوں
گھر میں لگواؤں
گور بناؤں
مٹی یہ بھی
مٹی میں بھی
کیوں کہ اب میں دور کی سوچوں
مٹی کھیلوں، مٹی پہنوں
اور مٹی ہو جاؤں ۲۱۴

آ گہی اور شعور عورت کی خصوصیت کی بجائے معاشرے کے علاوہ خود عورت کے لیے اذیت ناک ہوتا ہے، کیوں کہ حقائق کی دُنیا وا ہو جاتی ہے۔ حقائق کسی بھی شکل میں ہوں ان کی چُبھن تکلیف دہ ہوتی ہے۔ آ گہی بہت بڑا جرم بن جاتی ہے۔ نظم ''جرمِ آ گہی''، ''جی چاہتا ہے خود یہ مجھے اختیار ہو''، ''زاویے'' اور ''بے کلی'' ذات کی قید اور آ گہی کے موضوع کی عکاسی کرتی ہیں:

میں جانتی ہوں کہ
آ گہی کا یہ گہرا ساگر
مجھے ہی آواز دے رہا ہے
مگر نہ جانے میں آجکل کیوں
عجیب سا شہرِ بے صدا ہوں

مرے تصور کے سب جزیرے بھی منجمد ہیں
میں وقت کی ڈور میں بندھی کیوں
اُلجھ گئی ہوں
میں سوچتی ہوں سراب ہے سب
یہ آگہی کا عذاب ہے اب

- - -

نہ سوسکوں میں نہ روسکوں میں
تمھیں بتاؤ کہ کدھر میں جاؤں
سکون آخر کہاں میں پاؤں
کہاں پہ یہ آئینے چھپاؤں ۲۱۵

زندگی مفاہمتوں کا دوسرا نام ہے، جب تک دِل کی سچی آواز ہونٹوں پر آتی ہے اُسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ منافقانہ معاشرے کے تقاضے بھی دوہرے ہیں۔ سماج کے جھمیلوں میں اُلجھ کر انسان اپنی ذات بھول جاتا ہے۔ پرسونا اور شیڈو کے امتزاج میں زندگی جھوٹ اور سچ کا ملغوبہ بن جاتی ہے۔ عورت کا خدا سے شکوہ کیا ہے کہ مجازی خدا کے ہاتھوں میں کھلونا کیوں بنا دیا، حالاں کہ اللہ نے تو اِس کے حقوق متعین کر رکھے ہیں۔ آج عورت اپنے جائز حقوق کی بات کرتی ہے، تو اُسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ عورت کا زندگی کے ہر میدان میں اخلاص اور وفا کی متلاشی ہوتی ہے۔ عزت و وقار اِس کی منزل ہوتا ہے، لیکن جب یہی میسر نہ ہو تو ذات کے حصار میں خود سے اُلجھتی کڑھتی رہتی ہے:

میں خود سے کیا کیا فرار چاہوں ۔۔۔ سکون مانگوں قرار چاہوں ۲۱۶

زندگی کے سنگ ریزے چنتے ہوئے ہاتھ زخمی ہو جاتے ہیں، لیکن دُنیا ہے کہ اِس کے زخموں کو شمار ہی نہیں کرتی۔ افسوس تو اِس بات کا ہے کہ دُکھ دینے والوں میں سرِ فہرست اپنے ہی ہوتے ہیں:

جہاں سنگ ریزے ہیں ہاتھوں میں سب کے ۔۔۔ وہیں کانچ کا میں مکان ڈھونڈتی ہوں
میں اب کاسئہ دل میں ارماں سجا کر ۔۔۔ بدلتی رتوں کا سماں ڈھونڈتی ہوں ۲۱۷

مرد سے شکوہ و شکایت اور سوال کیا گیا ہے، جب اُس کی خاطر سب کچھ کیا جاتا ہے، تو پھر کیوں مائل بہ کرم نہیں ہوتا، بلکہ نعمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے ظلم و ستم روا رکھتا ہے۔ اپنے فرائض سے صرفِ نظر رکھتا ہے:

ہر نقش کے پیچھے ہے مرا نقشِ کفِ پا ۔۔۔ کیا تجھ کو ملے گا یوں مرا نام مٹا کر ۲۱۸

شاہین مفتی کے مجموعہ ہائے شعری ''امانت'' اور ''مسافت'' میں جا بجا تانیثیت کی مثالیں ملتی ہیں، جو ذات و سماج سے آگاہی کی دلیل ہیں۔ ہر دَور اپنی آزمائش ساتھ لاتا ہے۔ پڑھی لکھی عورتوں کی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ تنہائی اور آگہی کا عذاب ہے، جو ہر لمحہ اُسے ڈسے چلے جاتا ہے۔ مفاہمتوں کے اژدھوں کے زہر کو گوارہ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ زندگی کے معاملات میں مردوں کی عدم توجہی، فرائض سے کوتاہی اور سہل پسندی نے پڑھی لکھی ورکنگ کلاس خواتین کی زندگیوں کو کٹھن بنا ڈالا ہے اور ذمہ داریوں کا انبوہِ عظیم اس کے نازک کندھوں پر ڈالا ہے۔ بظاہر خود مختاری اس کی پاؤں کی

آہنی بیڑیاں بنتی جا رہی ہے۔ مردوں کی ذہنی آوارگی، اِس کی بیوفائی اور سرد مہری زرد رو بیوی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ''امانت'' کی نظمیں ''عذاب رُت''، ''تغافل آشنا''، ''مراجعت''، ''گواہ ایسے''، ''وہ جو میرا کوئی نہیں ہے'' ''جو نہ مڑ کے دیکھے گا''، ''انگلیاں فگار اپنی''، ''اندھے تناظر کی ایک نظم''، ''اساطیری لڑکی''، ''قبلۂ جاں کا ایک منظر'' ''کوئی اُس سے کہہ دو''، ''خالی پنجرے'' اِس سلسلے میں اہم ہیں۔ نظم ''مفاہمت'' عورت کے مزاج کی عکاس ہے، کیوں کہ سمجھوتوں ہی کے تانے بانے میں پل بڑھ کر جوان ہوتی ہے۔ اپنی چھوٹی آرزوؤں کے ساتھ ساتھ تمام تر خوابوں کے بکھرنے تک کا مرحلہ، جو کٹھن بھی ہوتا ہے اور جان گسل بھی، لیکن اُسے مفاہمتوں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ باہمی چپقلش میں عموماً مرد کی استحصال کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے، بالآخر عورت ہی اِس کی منفی پہلوؤں کو گوارہ کرتی ہے:

ہم کہ عریاں بہت ہیں
تماشا نہ بن
اپنی ضد چھوڑ دے
میں تجھے اوڑھ لوں
تو مجھے اوڑھ لے ۲۱۹

مرد و عورت کی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ عورت تمام تکالیف اپنی ذات پر برداشت کرتی چلی جاتی ہے، اگر مرد کا اُسے تعاون، توجہ اور محبت حاصل ہو تو اذیت اذیت نہیں رہتی، بلکہ ہر حال میں گوارہ ہو جاتی ہے۔ عورت ٹوٹ کر بکھرتی ہی اُس وقت ہے، جب مرد اُس کا ساتھ نہ دے، بلکہ اُس کے جذبات اور احساسات کا خیال کیے بغیر اپنی اُلجھنوں اور مسائل کا ملبہ اُتارتا چلا جائے:

اذیتوں کے
تمام نشتر
مری رگوں میں
اُتار کر وہ
بڑی محبت سے
پوچھتا ہے
تمھاری آنکھوں کو کیا ہوا ۲۲۰

عورت کی وفا اور مرد کی بے وفائی کا تذکرہ ''وہ جو میرا کوئی نہیں ہے'' میں کیا ہے، جب کہ نظم ''مراجعت'' میں بغاوت کے انداز کے ساتھ ساتھ تنبیہی انداز بھی اختیار کیا گیا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا، جب پانی اِس پیاسی سرزمین تک پہنچے گا۔ مراجعت سے مُراد لوٹ آنا کے ہیں، بادل اپنے اندر جب بارش سموئے ہوئے ہوتے ہیں، جو صرف پہاڑوں پر برستا ہے چوں کہ بادل اپنی منزل کا تعین نہیں کرتے، بلکہ ہوا کی دوش پر اُڑتے چلے جاتے ہیں، جو شخص وقت کی رفتار کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ سوچ اور فکر کے اعتبار سے خیالی دنیاؤں کا اسیر ہو جاتا ہے، اِس کے پاؤں زمیں پر نہیں ہوتے:

وہ بادل

فقط جو
پہاڑوں پر برسے
اُسے یہ خبر دو
کہ اک دن یہ پانی
ترستی زمیں تک ضرور آئے گا ۲۲۱

شاہین مفتی نے ذات سے سماج تک کے سفر کی تمام باریکیوں اور نزاکتوں کو کمال مہارت سے پیش کیا ہے۔ تحفظِ ذات کی متلاشی عورت کو شاہین مفتی نے بڑی عمدگی سے شعری پیرائے میں پیش کیا ہے۔ نسائی احساسات مرد کی بے وفائی اور خود غرضی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اضطراب اور کشمکش کے علاوہ سماجی آگاہی اور استحصالی قوتوں سے ٹکرا جانے کی خواہشِ ناتمام اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے بسی، ڈپریشن اور ناآسودگی، جو آج کی عورت کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے، شاہین مفتی کا خاص موضوع ہے، اِن تمام مایوس کن حالات کے باوجود اُن کی شاعری میں ایک ایسی عورت بھی دکھائی دیتی ہے، جو حالات سے مایوس نہیں، بلکہ اپنے ہاتھوں میں جگنو لیے پرسکون زندگی کی خواہاں ہے۔ خوابوں کا بنجر اور بے آباد ہو جانا ایک المیہ ہے، اِس سے زیادہ المناک وہ کیفیت ہے، جب کیسۂ خواب میں کچھ باقی نہ رہے۔ خواب بن برسے بادلوں کی طرح گزر جائیں، دل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے۔ ایسے میں فرد کی مونس و غم خوار تنہائی بن جاتی ہے اور انا کا صحرا وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عورت اِس وقت معاشرتی بے حسی کا شکار ہوتی ہے، جب اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہے۔ تحفظِ ذات کے لیے مضبوط مؤقف پر ڈٹ جاتی ہے۔ اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔ چاہتوں کے تمام بندھن ٹوٹ کر شکار ہونے لگتے ہیں۔ شکستگی اُس وقت مزید بڑھتی ہے، جب زندگی کا ساتھی زمانے کی زبان بالنے لگے:

کیسۂ خواب میں اب کچھ بھی نہیں
دلِ درماندہ سے لپٹی ہوئی تنہائی ہے
ایک صحرائے اَنا ہے جس میں
چلتے رہنے کی سزا پائی ہے ۲۲۲

''کوئی حد'' میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان ہے۔ اُدھورے خواب سے مُراد، ارمان و آرزوئیں ہیں، جو ایک دوسرے سے وابستہ کی جاتی ہیں اور پوری نہیں ہوتیں۔ ایک باوفا جیون ساتھی ہی عورت کی زندگی کا خواب، جو اُس کی تیرہ شبوں کو اُجالوں میں بدل دے:

ایک ادھورے خواب کے بدلے
مجھ سے میری آنکھیں لے لیں
ظلم کی کوئی حد ہوتی ہے ۲۲۳

نظم ''آدھی لڑکی'' ایسی لڑکی کی طرف اشارہ ہے، جو نامکمل ہے، جس کے معاشرتی، سماجی سطح پر حقوق کی پامالی ہوتی ہے اور باطنی سطح پر اُس کی روح پر کچوکے لگائے جاتے ہیں۔ موم، پتھر، جنگل و صحرا، دریا، چھت و آنگن، موت و حیات، آنکھ و سپنا کی تقسیم اِس ناہمواری کے استعارے ہیں، جو عموماً روا رکھے جاتے ہیں، اِس کی ذات کو مختلف حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے:

میرے دھیان میں
رہنے والے
چھوڑ یہ پاگل پن کی باتیں
میں تو آدھی لڑکی ہوں

- - -

آدھی پیاس اور آدھا دریا
آدھی چھت اور آدھا آنگن
آدھی موت اور آدھا جیون
آدھی آنکھ اور آدھا سپنا
سوچ ذرا
کوئی آدمی چادر اوڑھ کے بھی
سو سکتا ہے [۲۲۴]

نظم ''اپنے بغیر ایک دن'' ذات کے بچھڑنے کا نوحہ ہے اور عورت کے اُن احساسات کی نمائندگی ہے، جو مرد کی وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ شام ڈھلے سے مُراد دن بھر کی مسافت ہے۔ شام کو لوٹ آنے والے پرندے پناہ گاہوں کو لوٹتے ہیں، جو اُمیدیں ٹوٹ جائیں، تو آنکھ سفر سے بوجھل اور خواب کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں۔ بستر پر سلوٹ بے وفائی، ذہنی اضطراب اور کشمکش کی علامت ہے، جب آنکھوں سے خواب چھین لیے جائیں، تو بے خوابی مقدر بن جاتی ہے:

شام ڈھلے
جب لوٹ کے آئے
آنکھ سفر سے بوجھل تھی
اور خواب کے پاؤں زخمی تھے
جانے رات کے کس حصے میں
کس نے کس کو
مار دیا
صبح ہوئی
تو بستر پر
اِک سلوٹ تھی [۲۲۵]

نظم ''رفاقت'' میں رفاقت کے بارے میں عورت کے خیالات کی عکاسی ملتی ہے:

اندھیرا ہے تو کیا ہے
میں تمھارے ساتھ جاؤں گی

تمھیں رستہ دکھاؤں گی
میری مٹھی میں
جگنو ہے ۲۲۶

نوشی گیلانی کی شاعری کا اصل موضوع عورت اور مرد کے ادبی رشتے کی ناہمواری ہے، اُن کے خیال میں بدگمانی کا سرد موسم ہاتھوں کو نیلا کر دیتا ہے۔ سماجی بندھنوں میں جکڑی ہوئی عورت کی نفی ذات کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق کو تاراج کیا جاتا ہے۔ قحط الرّجال کی بدنما صورت یہ ہے کہ جاہل و خواندہ میں کوئی تخصیص نہیں۔ معاشرہ عورت کی معاشی، خانگی و سماجی ہر سطح پر استحصال کرتا ہے۔ ماں کی بے بسی، اُس پر ڈھائے جانے والے مظالم، بیٹی کے دل و دماغ میں مستقبل کے خدشات کے علاوہ نا آسودگیوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ نظم 'ورثہ' اس حوالے سے اہم ہے:

بیٹیاں بھی تو ماؤں جیسی ہوتی ہیں
میں جو گئے دنوں میں
ماں کی خوش فہمی پر ہنس دیتی تھی
اب خود بھی تو
عمر کی گرتی دیواروں سے ٹیک لگائے
فصل خوشی کی بوتی ہوں
اور خوش فہمی کاٹ رہی ہوں
جانے کیسی رسم سے یہ بھی
ماں کیوں بیٹی کو ورثے میں
اپنا مقدر دے دیتی ہے ۲۲۷

میں اپنی عمر کے سارے اثاثے نئے ڈھب سے برتنا چاہتی ہوں ۲۲۸

جب یقین کی بانہوں پر شک کے پاؤں پڑ جائیں چوڑیاں بکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے ۲۲۹

جھوٹ اور عدم اعتمادی خانگی زندگی کی بربادی کا باعث بنتی ہے:

اَب کہاں چھوئے گی اُس کے دل کو سچ کی روشنی جس کے ہاتھوں میں ابھی تک جُھوٹ کی تلوار ہے ۲۳۰

مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں آگہی اور شعور ہنر کی بجائے عیب بن جاتے ہیں:

شعورِ آگہی اک المیہ ہے اِسے نیلام کرنا چاہتی ہوں ۲۳۱

نظم ''نارسائی'' میں سماجی روایات اور لوگوں کے طرزِ عمل کا بیان ہے، جو بہت سی ناکامیوں کا سبب بنتے ہیں:

عجب رشتہ ہے یہ ترک وطلب کا
کہ جو اَب تک رویوں کی ٹھٹھرتی

برف کی چادر میں اپنا منہ چُھپائے
اپنے ہونے کی لڑائی لڑ رہا ہے
اور ایسے بے دَر و دیوار زنداں میں مقید ہے
جہاں معصوم روحیں فکرِ فردا سے ہراساں ہیں ۲۳۲

نسرین انجم بھٹی کی شاعری محض جذباتیت کی حامل نہیں، بلکہ شعور وادراک کی شاعری ہے، اُنھوں نے اپنی شاعری کو محض عورت کے محسوسات کی نمائندگی اور مرد دشمنی کا شاخسانہ نہیں بنایا، بلکہ اپنے اردگرد پائے جانے والے سماجی حقائق کی تلخیوں کو بعینہٖ صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا اور کسی بھی قسم کے تعصب سے قطعِ نظر اپنے گرد رونما ہونے والے واقعات کو بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے۔ خانگی زندگی کے مسائل، گھر اور اُلجھنیں، اِن کی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔ عصری شعور اور نسائیت کی آمیزش نے اُن کے کلام کو منفرد بنا دیا ہے۔ ازدواجی زندگی کی تلخیوں، ناآسودگیوں اور ناہمواریوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ عموماً عورت کی جذباتی اور ذہنی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بے کلی اور تشنگی جنم لیتی ہے، جو ڈپریشن اور ذہنی تناؤ کی صورت اختیار کر جاتی ہے، یہ نہ صرف عورت کے وجود، بلکہ زندگی کے بارے میں مثبت طرزِ فکر کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ نتیجۃً مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مایوس اور تھکا ہارا فرد اپنی ہی اُلجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ نئی نسل کی پرداختہ خود شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ نسرین انجم بھٹی جا بجا مرد کی بالادستی اور بے جا حاکمیت کو للکارتی نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں اِن کا قلم بے لاگ اور سفاک ہو جاتا ہے، اِن کے پورے کلام میں ایسی عورت نظر آتی ہے، جو حقوق آشنا ہے اور استبدادی قوتوں سے ٹکرانا جانتی ہے، مثلاً نظم ''رونے کا حق'' اِس حوالے سے اہم ہیں:

قبر کے پھول سازشوں کا شکار ہوئے ___
زندگی الاؤ ہے کہ
روشنی کا گھاؤ ہے ___ چاہے نہ بتاؤ
مگر مجھے رونے کا حق تو دو ۲۳۳

اِن کی نظمیں ''بند''، ''ٹریجڈی''، ''تانبے کی عورت''، ''انتریامی'' اور ''ہم لڑکیاں'' عورت سے برتے جانے والے ناروا سلوک کے خلاف احتجاج اور شکوہ و شکایات کی داستان ہیں۔ نظم ''کس کا لہو ہے کون مرا'' میں بتایا گیا ہے کہ گھر بسانے کی خواہش کا استحصال کس کس انداز میں کیا جاتا ہے، اِس کے لیے عورت کو جس ذہنی اذیت اور کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اِس کا یقینی ردِعمل مسلمہ روایات سے بغاوت ہی ہے:

''آلھنے بنانے کا ہنر کس خانہ خراب نے ایجاد کیا کہ اب
جامنی درختوں میں دِلوں کو پھانسی دی جاتی ہے، بے خطا، بِنا موسم
کوئی وقت نہیں ہوتا
گرم بارشوں کے پر بھیگتے ہوں
اُڑ جانے کی آرزو کسی درخت کی تلاش میں ہے کہ پھانسی چڑھ جائے'' ۲۳۴

اسی طرح ''اقرار'' میں انسان کی شکستگی کی داستان رقم کی گئی ہے۔ عورت کو محض آسودگی کا سامان سمجھنے والے اور نسلوں

کی پرداخت اور روزمرہ زندگی کی ناؤ کھینے والی کو بہ حیثیت انسان نظر انداز کرنے والوں پر گہری چوٹ کی گئی ہے:

میرے دونوں پاؤں میں ایک ہی جوتی تھی اور دونوں ہاتھوں میں ایک ہی چوڑی تھی

دوپہر کو کتوں نے اپنی ماداؤں کو نالیوں میں گھسیٹا

تو مجھے اپنا آپ یاد آیا

سورج اور مٹی دونوں نے مجھ پر تھوکا، میرے وصل کو کبھی بستر نصیب نہ ہوا

ہوا، میری آرزو سے پرے ہٹ گئی'' ۲۳۵

نظم ''پھر وہی دل پھر وہی میں'' میں لکھتی ہیں:

''میں تو کہوں دہلیزیں عورتوں کی طرح اپنا آپ کیوں

سارے کا سارا انھیں سونپ دیں

جنھیں پھر نہیں آنا۔۔۔'' ۲۳۶

نظم ''شناخت کا دن''، ''تم نے'' اور ''عورتوں کے عالمی دن پر'' میں عورت کی بے بسی کا ذکر کیا ہے:

کس رُت آئے ہو؟

کہ تمھیں خوش آمدید بھی نہیں کہہ سکتی

درمیان حائل

آنکھوں میں آنسو تمھیں دیکھنے نہیں دیتے

ماتھے پر ٹیکا کہ سر نہ اُٹھا سکوں

ہاتھوں میں چوڑیاں ہتھکڑیاں ہیں، بج اُٹھیں گی

پاؤں میں جھانجریں ____ بیڑیاں ہیں

چلوں گی تو پکڑی جاؤں گی

بھاری لباس کی سرسراہٹ سازشوں اور سزاؤں کو جنم دے گی اور گھونگھٹ گردن کو کبھی

اُٹھنے نہیں دے گا ____ کبھی نہیں شاید

ناک میں نتھلی

سانس کے ساتھ مجھے گائے کی طرح گھسیٹتی ہے

کس رُت آئے ہو

کہ میں لڑکی سے پھر گائے بن چکی ہوں ____ ۲۳۷

مرد کے دیے گئے ستم جب حد سے بڑھ جاتے ہوں تو بیزاری کا سبب بنتے ہیں۔ عورت ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر بکھرنے، ٹوٹتے آشیانوں کو بچاتی ہے، لیکن خود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہے۔ Cease fire، ''نارسائی''، ''اگر مجھے یقین ہوتا''، ''یہ پہلے طے نہ تھا''، ''ریت کے سفر پر''، ''سوالوں میں ایک سوال''، ''اُداس نظموں میں سے ایک''، ''شینا''، ''زر۔زن۔زمین''، ''شناخت''، ''ریت کا سفر''، ''آٹھواں دروازہ'' اور ''اب تک شادی شدہ زندگی کی ناآسودگی'' استحصال

اور جبر کی داستان ہے۔ اِس میں شکوہ صرف اُس مرد سے ہے جس کے ساتھ زندگی کی ڈور بندھی ہے۔ ان اذیتوں کا بیان ہے، جو اِس کی بے حسی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہے، نظم ''تم مگر'' میں:

دلہن کو سلامی میں محبت نہیں درندگی دینا
گھبرائی ہوئی دلہن
روتی ہوئی دلہن، رُلاتی ہوئی دُلہن
آئینے کے سامنے بھی جھوٹ بولتی ہے، جھوٹ سنتی ہے
جھوٹ دیکھتی ہے
اور جھوٹ دکھانے کی کوشش میں خود جھوٹی ہو جاتی ہے ۲۳۸

مجموعہ زنداں کے گیت میں جنگ و جدل کی تباہ کاریوں میں جہاں نسلِ انسانی کو بہت سے عذابوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں عورتوں پر بربریت اور ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ انتقامی فوج جنسی تشدد سے اپنی تسکین کا سامان پیدا کرتی ہے اور فتح کے نشے سے دو چار ہوتی ہے۔ ''میں اک بے بس ماں''، ''سڑک کے اُس پار''، ''آسماں سایہ کرتا ہے'' ''مانگو حساب''، ''عورت کا احترام کرو'' اسی سلسلے کی اہم نظمیں ہیں:

U.N.O نے بھی آنکھ ہے چرالی
کوئی ایکٹ نہیں کوئی پیکٹ نہیں
آئین عدالت نہ کچہری
پردھان ہے بربریت
جبر موت
حقوق کا استحصال ہے
میرے اردگرد
میں چیونٹی نہ ذرہ
میں تو بدتر ہوں ہوا کے
جھونکے سے بھی
کیا ہم حیوان ہیں؟
یا پھر میری کوکھ سے
اُگنے والے انسان نہیں ۲۳۹

سارا شگفتہ انتہائی حساس شاعرہ ہیں، اُنھوں نے مردم گزیدہ اور اعتبار شکستہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی معنویت کو کھو دیا۔ زندگی کے تلخ تجربات نے اعتماد کے رشتوں میں زہر بھر دیا، اُس کی زندگی میں آنے والے تینوں مردوں کی بے حسی، انا کے کچلنے کے احساس کی شدت نے اُنھیں شدید بغاوت اور معاندانہ رویہ اختیار کر کے مرد معاشرے سے انتقام لینے پر اُکسایا، غم و غصے کی یہ کیفیت انتہائی صورت میں خود سے انتقام یعنی خودکشی کی حد تک پہنچی۔ ''آنکھیں'' میں اول تا آخر مرد

کے جبر اور بے رُخی کے علاوہ سسکتی تڑپتی مامتا دکھائی دیتی ہے:

تجھے جب بھی کوئی دُکھ دے
اُس دُکھ کا نام بیٹی رکھنا
جب میرے سفید بال
تیرے گالوں پہ آن ملیں، رولینا

- - - - - - -

میں کتنی بار ڈری بیٹی
ابھی پیڑوں میں چھپے تیرا کمان ہیں بیٹی
میرا جنم تُو ہے بیٹی
اور تیرا جنم تیری بیٹی
تجھے نہلانے کی خواہش میں
میری پوریں خون تھوکتی ہیں ۲۴۰

سارا شگفتہ کے ہاں الیکٹرا کمپلیکس کی جھلکیاں بھی نمایاں ہیں، اِس ضمن میں سارا شگفتہ کی نظم "ہونٹ میرے گداگر" خصوصی اہمیت کی حامل ہے:

وفاداری کی گلیوں میں کتیا کم
اور کتا زیادہ مشہور ہے
مالکوں کو میں اپنے فٹ پاتھ کا نمبر لکھ دوں
کہ سرِ شام سورج انکار کرنے لگتا ہے
میرے گھر کی سلاخوں سے
کتنے کتوں کی زنجیریں بنتی ہیں
میں اپنی تلافی میں تمھیں شریک نہیں کروں گی
انسان دوسری غلطی کبھی نہیں کرتا
میں پھر خدا کو تیسری بار دُہراتی ہوں
کھلونے کا مقدر زیادہ سے زیادہ ٹوٹنا ہے ۲۴۱

سارا شگفتہ نے ناآسودہ ازدواجی زندگی کی عکاسی نظم "رات کی دو آنکھیں" میں کی گئی ہے:

عورت تو انسان کو جنم دینے کے بعد بھی
کھری نہیں ہوتی
رات انسانی سرائے میں خرچ ہوگئی

- - - - - - -

ڈر کے اتنے نخرے ہیں
کہ خواجہ سرا رات رات بھر تنگ کرتے ہیں
اور بار بار بھول جاتی ہوں
کہ کتا ہڈی دیر تک چباتا ہے
میں اس جسم کو تھوک دوں گی
کہ آخری گالی تک میں نے صبر کا وعدہ کیا تھا
اور جہاں گواہی ہو وہاں انسان کا کیا کام ۲۴۲

نظم ''عورت اور نمک'' میں زندگی کے تلخ تجربات اور عورت کے حوالے سے سماج اور افرادِ معاشرہ کے منفی اور استبدادی رُجحان کو نہایت طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے کہ ایک ایک حرف میں، تلخی اور نا آسودگی کی جھلک نمایاں ہے:

عزت کی بہت سے قسمیں ہیں
گھونگھٹ، تھپڑ، گندم
عزت کے تالوں میں قید کی میخیں ٹھونکی گئی ہیں
گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک ہمارا نہیں

\- - - - - -

تم کس کنبے کی ماں ہو
ریپ کی، قید کی، بٹے ہوئے جسم کی
یا اینٹوں میں چُنی ہوئی بیٹیوں کی
بازاروں میں تمھاری بیٹیاں
اپنے لہو سے بھوک گوندھتی ہیں
اور اپنا گوشت کھاتی ہیں ۲۴۳

فکشن ہاؤس والوں نے مذکورہ اقتباسات کا عنوان ''زندگی کی کتاب کا آخری صفحہ'' خود تجویز کیا، یہ سارا شگفتہ کی آخری تحریر تھی، کیوں کہ اس کے بعد اُس نے ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی تھی:

دیکھتے ہی دیکھتے کشتی زمین سے جا ملی
ابھی تو اور سمندر ڈھونا تھا
رات بہت تڑپی زمین پہ میں
ماں خاموشی سے بیٹھی بجھ رہی تھی ۲۴۴

خود غرضی اور بے بسی کی کشاکش کی بہترین مثال نظم ''آدھا کمرہ'' ہے۔

اس نے اتنی کتابیں چاٹ ڈالیں
کہ اس کی عورت کے پیر کاغذ کی طرح ہو گئے

وہ روز کا غذ پہ اپنا چہرہ لکھتا اور گندہ ہوتا ۲۴۵

عذرا عباس نے نظم ''عورت اور دُکھ'' میں زندگی کے دُکھ اور سُکھ سے عبارت ہے۔ دُکھوں کے بارے میں مرد و عورت کے مختلف ردِ عمل کو بیان کیا گیا ہے:

بچی ہنستی ہے
(عورت)
دُکھ
عورت پر حملہ کرتا ہے
اور اُسے
غلام بنالیتا ہے ۲۴۶

''میں تمھیں اور بانٹنا نہیں چاہتی'' عذرا عباس کی اہم نظم ہے، جس میں عورت کے نفسیاتی کی عکاسی کی گئی ہے:

لیکن تم
نہ تو آئینہ ہو
نہ کوئی ساز
نہ ہی ایک گھر
یا کوئی اور چیز
تم ہو
ایک انسان ہو
بٹے ہوئے
اور سوچتے ہو کے
کسی اور کے حصے میں آئے ہوئے
میں تمھیں
اور تقسیم کرنا
یا بانٹنا پسند نہیں کروں گی ۲۴۷

نیلما سرور تانیثی رُجحان کی حامل شاعرہ ہیں، انھوں نے عورت کی معاشرتی استحصال کی داستان رقم کرتے ہوئے بے جا جذباتیت سے کام نہیں لیا، بلکہ سماجی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کیا ہے، اِن کے نزدیک شعور یا آگہی، بے حسی معاشرے میں بذاتِ خود عذاب بن جاتی ہے اور معاشرہ جنگل کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جہاں ہر طرف نفسا نفسی، طاقتور کا کمزور پر چھا جانا، تاریکی اور مشکلات کا پھیل جانا معمول بن جاتا ہے۔ فرد کی ذات میں آگہی کی آگ بے حسی اور ظالم معاشرہ فرد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرد کے لیے دونوں کیفیات میں جل مرنے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ باہر نکلو تو جنگل اور ذات کے حصار میں چھپ جاؤ تو اپنی ہی آگ میں جل کر راکھ ہو جانا ہے، چوں کہ معاشرہ اظہار پر پابندی لگاتا ہے۔ بے جا قدغن عورت کو

معاشرے سے خائف کر دیتی ہے اور اِس میں خود پر ہونے والے ظلم وستم سے آگہی اور کچھ نہ کر سکنے کی قوت کی وجہ سے بے حس وحرکت اور بے یار و مددگاری کی کیفیت بڑھا دیتی ہے:

میرے باہر جنگل تھا
اور میرے اندر آگ
آگ نکالوں
سب جل جاتے
آگ چھپالوں
خود جل جاؤں ۲۴۸

نیلما سرور کے خیال میں عموماً خواتین کی مٹی کا مادھو سمجھا جاتا ہے، جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس سے یہ بھی توقع رکھی جاتی ہے کہ اسے جس رنگ میں ڈھالا جائے، ڈھل جائے۔ روٹی، کپڑا، مکان کی حدوں کے علاوہ بھی عورت ذہن رکھتی ہے، نظم ''میں اِک ذہن ہوں'' میں عورت جذبات واحساسات کی حامل ہے:

میں اِک ذہن ہوں
جسم نہیں ہوں
میرے ذہن کی پیائش میں
مجھ کو جسم نہ جانو
بس انسان پہچانو ۲۴۹

جنسی تشدد کا شکار بننے والی عورت کو معاشرہ بھی دھتکارتا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنا آپ بچا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تب بھی مجرم تصور کی جاتی ہے، جس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، بلکہ دونوں صورتوں میں تباہی اس کا مقدر بنتی ہے۔ لوگوں کی نگاہیں اس کی روح کو گھائل کرتی ہیں۔ نظم ''عورت اپنا آپ بچالے'' اور ''ایک خبر'' میں جنسی تشدد کی شکار عورت جس کا پورا جسم سگریٹوں سے داغا گیا تھا، اس لڑکی کی جلی ہوئی لاش بیمار معاشرے کی کچلی انسانیت کا استعارہ ہے۔ گندے اور خراب سماجی نظام کی وجہ سے عدم تحفظ کا احساس عورت کو ہراساں کیے رکھتا ہے۔ دوسرے درجے کی شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے کی مجبوری زہر کی صورت اِس کے وجود میں سرایت کر جاتی ہے:

عورت اپنا آپ بچالے
تب بھی مجرم ہوتی ہے
عورت اپنا آپ گنوالے
تب بھی مجرم ہوتی ہے ۲۵۰

دُنیا میرا گھر تو نہیں ہے
پہلے باپ کے گھر میں تھی

اب ساجن کے

گھر میں ہوں ۲۵۱؎

نیلما سرور کے منفرد اندازِ فکر نے عورت کی گواہی کی طنزاً موضوع بنایا ہے۔ انصاف کے قوانین مرد و عورت کے لیے مختلف ہیں۔ مرد بڑے سے بڑا جرم کر لے تو معاشرہ اسے معاف کر دیتا ہے اور عورت کی ذرا سی خطا اسے ہمیشہ کے لیے غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ عموماً نصف گواہی کو طنزاً پوری زندگی پر حاوی کر دیا جاتا ہے کہ ہر معاملے میں اسے پست و کمتر قرار دیا جاتا ہے۔ نظم ''میری گواہی آدھی ہے تو'' میں اسی بے حسی کے خلاف باغیانہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:

میری گواہی آدھی ہے تو

میرا جرم بھی آدھا ہوگا

میرا حصہ آدھا ہے تو

میری سزا بھی آدھی ہوگی ۲۵۲؎

''میرے سارے جسم پہ آنکھیں اُگ آتی ہیں'' اور ''میرے چاروں طرف دیواریں پھیل رہی ہیں''، میں لوگوں کی بے حسی، بے اعتنائی اور ظلم کے خلاف ردِعمل کی مثالیں ہیں، کیوں کہ بغاوت کی یہ آگ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ مزید ناانصافی کی گنجائش نہیں رہتی۔ عورت سوچ کے تمام رشتے ختم کر کے محض انتقام بن جاتی ہے۔ بغاوت اس انتہا تک پہنچ چکی ہے کہ عورت اپنی آنکھیں تک پھوڑ ڈالنا چاہتی ہے، جس میں مستقبل کے خواب کیوں دیکھے جا رہی ہے اسی طرح نظم ''میری ہر طرف پھیلا ہوا ہے اندھیرا'' میں مایوسی و تاریکی اور بے انصافیوں کے نتیجے کا حاصل صرف بے بسی ہے، جب کہ ''اپنی لاش اُٹھا کر سر پر''، ''میرے ہاتھ بہت چھوٹے ہیں'' میں قانون کی ان شقوں کی نشاندہی کی ہے، جن کی وجہ سے قانون بھی عورت کی مدد میں غیر معاون ثابت ہوتا ہے، لمبے ہاتھوں والے ہی قانون شکنی کا مؤجب بنتے ہیں، کیوں کہ قانونی باریکیوں کو بخوبی جانتے ہوئے چور دروازے تلاش کر لیتے ہیں:

میرے سارے جسم پر آنکھیں اُگ آئی ہیں

مجھ کو اور اذیت نہ دو

اپنی سوچیں واپس لے لو

میرے ذہن کو مر جانے دو

اپنے سارے رستے مجھ پر بند کر دو

آنکھیں پھوڑ لوں اپنی

خود کو تڑپاؤں

آس کا رشتہ توڑ کے

خود ہی مر جاؤں ۲۵۳؎

ہمہ وقت مشقِ ستم بننے والی عورت کا استحصال کبھی بہن بھائیوں کے ہاتھوں کبھی سسرال والوں، عزیز و رشتہ داروں، کبھی محبوب اور شوہر کے ہاتھوں تو کبھی مالک اور آقا کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اس کی بجھی آنکھیں ہر خواہش کا مدفن

بن جاتی ہیں۔ نیلما سرور نے آوارہ مزاج مردوں کے ہاتھوں عورت کی زندگی پر مرتب ہونے والے بھیانک اثرات، بھوک وافلاس کی وجہ سے غیرتوں کے جنازے، خشک ہونٹوں پر جمی پیاس اور لفظوں کے نشتر کو موضوعِ خاص بنایا ہے، اِن کی نظمیں ''حدِ نظر تک کہرے کے بادل''، ''میری ماں کی سوکھی ہوئی چھاتیاں'' اور ''جب نہر کنارے شام ڈھلی'' انھی کیفیات کی عکاس ہیں۔ نیلما سرور نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر عورتوں کو درپیش سماجی مسائل کو حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے اور اُن محرکات کی نشاندہی کی ہے، جو خواتین کے خلاف جرائم یا عورتوں کو جرم اور گناہ کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں:

میری ماں کی سوکھی ہوئی چھاتیاں
غریبوں کے جنازے اُٹھاتے ہوئے
خشک ہونٹوں پہ بھوکوں کا سیلاب ہے
اور میرا باپ بالوں کو رنگے ہوئے
اُس طرف جا رہا ہے جہاں
سانولی ران جیسی چمکتی سڑک پر
وہ موٹی ڈائن!
ہمارا لہو اپنے منہ پہ سجا کر
بہت دیر سے صرف پیسوں کی خاطر
اُس کی منتظر ہے ۲۵۴

ناہید قاسمی نے ''منصِف'' میں نسوانی جذبات کا اظہار منفرد انداز میں کیا ہے:

اونچے اونچے نیل گگن نے
میرا ہاتھ پکڑنے سے انکار کیا تھا
لیکن گہرے گہرے سمندر کی لہروں نے
نیل گگن کی ساری نیلاہٹ کو قیدی کر کے
میرے بھیگے بھیگے پاؤں تلے ڈالا ہے ۲۵۵

نظم ''بند مٹھی'' میں لکھتی ہیں:

بیشک ایک الاؤ کی لاکھ زبانیں تم نے کٹوا دی ہیں
اور پھر دھوئیں کی لڑتی کونجیں ڈار کی ڈار شکار ہوتی نہیں
لیکن ٹھنڈے ٹھنڈے موسم!
میری بند مٹھی میں اب تک
اک چنگاری دبی ہوئی ہے!! ۲۵۶

نظم 'مجبوری' میں ایسے جذبوں کی نشاندہی کی ہے، جو ظاہر بین حیلوں بہانوں سے منزلوں تک پہنچنے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، جب کہ اخلاص، مادیت پرستوں کے کوچے میں رسوا ہوتا ہے:

ڈھونڈنے کا تو ڈھونگ رچا رکھا ہے!

ورنہ جانتی ہوں

تو کہاں چھپا ہے

کسی ندی کا ہاتھ پکڑ کر پاؤں پاؤں چلتی تیرے گھر تک جا سکتی ہوں

کسی مہک کے پنکھ لگا تیرے باغ میں آسکتی ہوں

اور تجھ پر منڈلا سکتی ہوں

گا سکتی ہوں

جانتی ہوں

پر ڈھونڈنے کا تو ڈھونگ رچانا ہوگا!! ۲۵۷

نسیم اختر کے ہاں جہاں مرد کی بے اعتنائی اور جور و استبداد کا ذکر ہے وہاں اولاد کے ہاتھوں عورت کی داستانِ حیات کی تلخیاں بھی ملتی ہیں۔ ''حسرتوں کے آئینوں میں''، ''درد کا اک شہر'' اور ''ادھورے سفر'' میں عورت بہ حیثیتِ ماں، بیوی، بیٹی جس حد تک جبر و تشدد کا شکار ہوتی ہے، اُس کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ نسیم اختر کے خیال میں دھوکے سے دوسروں پر فتح پانے والوں کو وقتی طور پر کامیابی تو ہو جاتی ہے، لیکن یہ عیاریاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، جب شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ جھوٹ پر تعمیر کی گئی عمارت کبھی بھی سچائیوں کی آماجگاہ نہیں بنتی:

وہ ناداں سب سمجھتا ہے اسے کیا اور سمجھانا — نسیم اچھا ہی ہوتا لفظ میرے گونگے بن جاتے ۲۵۸

آزادیِ حقوقِ نسواں اور مساوی حقوق کے حصول کی خواہش بعض اوقات بغاوت پر آمادہ کرتی ہے:

بلند عزم کی چادر رہی ہے سر پہ مرے — مہکتے جذبوں کی تنویر بننے والی ہوں ۲۵۹

عورت کا ٹھکانہ کیا ہے، اِس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کیوں کہ یہ سوال اُس وقت اُبھرتا ہے، جب لڑکی باپ کے گھر اور بھائیوں کی مضبوط پناہ گاہ سے رُخصت ہو کر شوہر کے گھر آجاتی ہے، لیکن یہ گھروندا بھی ہمہ وقت لرزاں و خیزاں رہتا ہے۔ تمام زندگی کٹھ پتلی کی طرح زندگی بسر کرنے والی حالات کے ہاتھوں ہار جاتی ہے:

عمر بھر تو میں بے گھر بھٹکتی رہی — لا مکانی مرا سائباں بن گئی ۲۶۰

مقصد سمجھ رہی ہوں میں اپنی زندگی کا — یہ اور بات اب بھی بہلائی جا رہی ہوں ۲۶۱

نسیم اختر کے خیال میں جدیدیت کی آڑ میں عورت تہذیبی روایات اور شرم و حیا کی بازی لگانے والیاں غیرت کے جنازے نکال دیتی ہیں۔ مادر پدر آزادی کو حقوقِ نسواں قرار دینا کسی طرح مناسب نہیں:

زینت دکھاتی پھرتی ہیں گھر گھر کی عزتیں — آنکھوں میں شرم، روح میں غیرت نہیں رہی ۲۶۲

بات بات پر بگڑنے والوں کو نسیم اختر تنبیہ کرتے ہوئے مؤقف اختیار کرتی ہے کہ یہ سب خود پسندی اور خود کو دُرست سمجھنے کا نتیجہ ہے، کیوں کہ مرد عموماً اپنی غلطی تسلیم کرنا گوارہ نہیں کرتے:

دبلی پتلی سی اور چھوٹی سی

کوئی معصوم سی وہ لڑکی تھی
یوں پکڑ کر وہ باپ کی انگلی
چل رہی تھی سڑک کے ایک طرف
جیسے معلوم ہو اُسے یہ بات
نرم و نازک سی اُس کی یہ انگلی
آ کر اِک روز چھوٹ جائے گی ۲۶۳

اولاد کے لیے تو میں زر کی مشین ہوں
سب نوکروں کو میرا ہی افسر بنا دیا ۲۶۴

عشرت آفریں نے معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھی جانے والی بے انصافی کو بیان کیا ہے اور عورت کی اُن قربانوں کا ذکر کیا ہے، جو بالعموم اُس کی ذات سے وابستہ سمجھی جاتی ہیں:

جو دُکھ مجھے ملے تھے اپنی ماں سے ورثے میں　　　　کیا لازم ہے یہ پونجی میں بیٹی کو بھی دوں ۲۶۵

نظم ''سنِ یاس'' منفرد انداز کی نظم ہے، یہ مضمون اُردو شاعری میں قریباً ناپید ہے:

میں اپنے خالق سے یہ تو پوچھوں
خدائے ستار
عصمتوں کو ہزار پردوں میں رکھنے والے
صفات میں تیری عدل بھی ہے
تو پھر مرے اور میرے محرم کے بیچ تفریق کا سبب کیا؟
وجود کی کیمیا گری میں
یہ بانجھ پن کا عتاب تنہا مرے لیے کیوں؟
یہ خشک سالی کا ایسا اعلانِ خاص
قحطِ نمو کا عریاں عذاب تنہا مرے لیے کیوں؟
اے میرے ستار و کیمیا گر
یہ روز و شب کا حساب تنہا مرے لیے کیوں؟ ۲۶۶

حمیدہ شاہین تانیثی رُجحان کی حامل شاعرہ ہیں، اِن کی شاعری اپنے دور کے سماجی بُحران، اخلاقی رویوں کی بدصورتی رشتوں کی کج سرشتگی، عدم اعتمادی کی داستان ہے، ان کا تانیثی زاویۂ نظر، عورت کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافی اور تخصیصی رویوں کا عکاس ہے، اِن کے ہاں عورت کی ذات اور شخصیت کے حوالے سے مروجہ بیشتر تصورات اور غلط نظریات اجتماعی لاشعور کی علامت بن گئے ہیں، اِن کی تانیثی آگہی، زندگی کے کٹھن حالات کو بیداریٔ شعور اور مضبوط قوتِ ارادی سے نمٹنے پر زور دیتی ہے۔ وہ محض عورت کی مظلومیت اور مرد کے مظالم کا بے جا پرچار نہیں کرتی، بلکہ حقوق و فرائض کا

یقین کرتے ہوئے بہ حیثیتِ انسان ایک دوسرے کو تسلیم کیے جانے پر زور دیتی ہیں۔حمیدہ شاہین نے عورت اور مرد کے مابین نفسیاتی جنگ کو موضوعِ سخن بنایا ہے، جو اغراض اور ایک دوسرے کی نفیِ ذات کا نتیجہ ہے۔ وہ مرد و عورت دونوں کے مقام و مرتبے کو تسلیم کرتی ہے، اِن کے نزدیک دونوں میں سے نہ کوئی اعلیٰ ہے اور نہ ہی ارفع دونوں کے حقوق و فرائض متعین کردہ ہیں، ان کی ادائیگی اور عدم ادائیگی ہی انھیں اچھا یا بُرا بناتی ہے، ان کے ہاں ماں کی ممتا ایک بڑی قوت و طاقت بن کر اُبھرتی ہے، جو اِن کے خیال میں وفا عائلی زندگی کے استحکام کی علامت ہے۔''دستک'' اور ''دشتِ وجود'' تانیثی اثرات کے بھرپور غماز ہیں۔اگر تخلیقی سفر اسی طرح جاری رہا، تو حمیدہ شاہین کا متوازن تانیثی شعور انھیں بہت جلد صفِ اول کی تانیثی رُجحان کی شاعرات کی صف میں لا کھڑا کرے گا:

ہم فرائض کی بھٹی کا ایندھن سہی، سوختہ تن سہی — اپنی مرضی سے کچھ دیر تو جل بجھیں، آؤ کچھ تو جئیں
میری حیثیت کو مان بھی، منوا بھی — کہاں کہاں، کیا ہے میری اہمیت لکھ ۲۶۷؎

میرے ہر خُلیے پر تیرا حق تسلیم — اپنی ذات کو بھی میری ملکیت لکھ ۲۶۸؎

زندگی ہوگئی سلوٹ زدہ ملبوس مگر — اس کے ماتھے کی شکن پھر بھی نہ ہموار ہوئی ۲۶۹؎

معاشرے کا گھن چکر جو عورت کو ہی پیستا چلا جاتا ہے:

میں اپنی ماں کی کہانی کو تب سمجھ پائی — جب اس کے لفظ مقدر نے مجھ پہ دہرائے ۲۷۰؎

زندگی بھر نہ جس نے لب کھولے — اپنی بیٹی کے واسطے بولی ۲۷۱؎

میں نے توقیر کا سوال کیا — اس نے تحقیر میں کمال کیا ۲۷۲؎

نظم ''تمکنت'' میں لکھتی ہیں:

اونچی دستاریں بوٹوں کے نیچے ہیں — اب کچھ شانوں کے اوپر سر رہتے ہیں ۲۷۳؎

مرد کی نفسیات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

میری چھوٹی چھوٹی بات پکڑنے والا — اپنی ہر لغزش رکھتا ہے بھول کی مد میں ۲۷۴؎

فاخرہ بتول کے ہاں عورت کے کومل جذبات کے بیان کے علاوہ اِن کے استحصال کی کہانی تانیثی طرزِ فکر کی عکاسی کرتی ہے، اُنھوں نے گھریلو تشدد کے علاوہ سٹریٹ وائلنس یعنی گھر سے باہر عورت کو درپیش مسائل کی مختلف صورتوں کو موضوع بنایا ہے، اِن کے خیال میں عورتوں کو اپنی ملکیت سمجھنے والے مرد نہ صرف گھر کی چار دیواری میں اسے دبانا اور جبر کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں، بلکہ چادر و چار دیواری کے تحفظ کو بالائے طاق میں رکھتے ہوئے عورتوں کا ڈرانا، دھمکانا، جنسی طور پر ہراساں کرنا آوازے کسنا، اغوا، زنا بالجبر کے علاوہ جائے ملازمت پر عورتوں کو سامانِ تعیش یا جنسی آسودگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، معاشرے کے ایسے ناسوروں کی حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے، مثلاً اِن کی نظم ''کتے'' مندرجہ بالا موضوعات کی عکاسی کرتی ہے:

یہ دندناتے ہوئے سے کُتّے
اُنھی کے ڈر سے
گھروں سے باہر نکلنے والی ہر ایک بیٹی، بہن کہ ماں ہو
قدم اُٹھاتے ہوئے جھجکتی ہے، سہم جاتی ہے
خوف کھاتی ہے، کانپتی ہے
خبر ہے اس کو ہر اک گلی میں، ہر اک نکڑ پہ
ہر اک محلے کے چوک پر یہ، زبانیں باہر نکال کر اور
اپنے دانتوں کو کچکچا کر
اور اپنی آنکھوں میں مکروہ سی آرزو سجا کر
جو بھونکتے ہیں
یہ رال ٹپکا کے ماؤں بہنوں کو روکتے ہیں
اور ان کے آنچل کو قتل کرنے کا سوچتے ہیں ۷۵؎

گھریلو تشدد کے علاوہ سڑیٹ وائلنس کی مختلف صورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے، عورتوں کو اپنی ملکیت سمجھنے والے نہ صرف گھر کی چار دیواری میں دبانا اور جبر کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں، بلکہ چار دیواری سے باہر بھی عورت کو ڈرانا، دھمکانا، جنسی طور پر ہراساں کرنا، اس لحاظ سے ''ڈائناسور''، ''تکمیلِ آدم''، ''چار موسموں کا جھوٹ، اور ''سرطان'' اہم ہیں:

سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے
اِن میں کچھ کمٹیڈ بھی ہوتے ہیں
لیکن سُنا ہے اَب یہ قسم نایاب ہوگئی ہے
جیسے ''ڈائناسور'' ۷۶؎

''کوٹھیوں میں کام کرنے والے مائیاں'' میں فاخرہ بتول نے کوٹھیوں میں کام کرنے والی مائیوں اور لڑکیوں کو ڈرانا دھمکانا، جنسی طور پر ہراساں کرنا، زنا بالجبر یا جنسی آسودگی کا ذریعہ سمجھنے والے ایسے مردوں کی دھونس اور جبر کا شکار ہونے کے موضوع پر بات کی ہے۔ نظم ''سنبھل جاؤ''، فیمینزم کا نعرہ ہے۔ استحصال کرنے والوں کو 'ہوا' سے اور خواتین کو چراغ کے مماثل قرار دیا ہے، اگر اِن میں حقوق کی جنگ چھڑ جائے، تو مرد تہی دامن ہو جائے گا، اُس کے تمام رویوں کی بدصورت بے معنی ہو کر رہ جائے گی، اِسی لیے اس نظم میں در پردہ بغاوت کا تاثر موجود ہے:

''چراغوں کا ہواؤں سے
تصادم ہو گیا تو کیا کرو گے تم
ابھی بھی وقت ہے جاناں!
سنبھل جاؤ۔۔۔'' ۷۷؎

نظم ''ابھی سے کس لیے پتھر اُٹھاتے ہو'' میں عورت انصاف کی متمنی ہے اور انصاف ہے کہ ملتا ہی نہیں۔ مصنف بھی

انصاف کر پاتا ہے کہ نہیں حق کے لیے آواز بلند کرنا بھی ناگوار گزرتا ہے:

ابھی کچھ مرحلے باقی ہیں ان کو طے تو ہونے دو
یہیں ہوں میں
یہیں ہو تم، مجھے سنگسار کر لینا
ابھی سے کس لیے پتھر اُٹھاتے ہو؟ ۲۷۸

مرد کا ہرجائی پن جان کا روگ بن جاتا ہے، اِس کا دم بھرنے والے اِن مردوں کا قصہ ''دزدیدہ نگاہی''، ''ہرجائی'' اور ''مجھ کو دیر بھی ہو سکتی ہے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ محبت کی آڑ میں دھوکا دیتے ہیں۔ ایک طرف چاہتوں کا ذکر اور دوسری طرف معاشقے ظاہر کرتے ہیں کہ اِن کی توجہ کا مرکز متزلزل ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کا دُکھ اور ناسور عورت کو گھلا دیتا ہے۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جاتی ہے:

اب کے جاتے جاتے اُس نے
پلٹ کے دیکھا اُن نظروں سے
جیسے اُس کو یہ کہنا ہے
راتوں کو تم جاگ جاگ کے
میرا رستہ اَب مت تکنا
مجھ کو دیر بھی ہو سکتی ہے ۲۷۹

یاسمین گل کا شعری مجموعہ ''اعتراف'' جسے پروین شاکر ایوارڈ سے نوازا گیا، محبت کی صداقتوں کے علاوہ تانیثی احساس کی نمائندگی بھی کرتا ہے، اِن کے ہاں ایک ایسی عورت ملتی ہے، جو بظاہر آزاد ہے، لیکن ہر قدم پا بہ زنجیر ہے، وہ اس سماجی روایات کی مذمت کرتی ہیں، جو علاقوں کو پابندِ سلاسل کرتی ہیں۔ یاسمین گل مرد و عورت کی اُس برابری کے قائل نہیں، جو مغرب زدہ ہے، جس میں عورت مادر پدر آزاد ہو، وہ ایسی آزادی و برابری کی قائل ہے، جس میں مرد و عورت کے جبلی و فطری تقاضوں کو مدِ نظر رکھا جائے، اِن کے ہاں استبدادی اور استحصالی قوتوں کے خلاف جارحانہ ردِ عمل کی بجائے مصالحانہ انداز نمایاں ہے، اِن کی نظمیں ''ہم لڑکیاں بھی کیا ہیں؟''، ''مائیکل اینجلو''، ''اگر''، ''ساحلِ ادراک'' اور ''جبلتوں کی نفی نہ کرنا!'' تانیثیت کے حوالے سے اہم ہیں۔ تحفظ کی خواہش ہی عورت کو اکثر واقات اِس کی شخصی آزادی سے محروم کر دیے جانے کا سبب بنا دی جاتی ہے:

یہ ٹھہری شرط، چلنا بھول جاؤ　　　وہ میرے ہاتھ پاؤں کھول دے گا ۲۸۰

اے ہونٹ سلی لڑکی! عادت ہے کہ مجبوری؟　　　چہرے پر سکوں لیکن آنکھوں میں دھواں رکھنا ۲۸۱

تھا جرم ایک سا لیکن روایتوں کے طفیل　　　میں پائمال ہوئی اور وہ معتبر ٹھہرا ۲۸۲

صنفی امتیازی سلوک کی نفی کرنے کے باوجود مرد و عورت کی فطری تخصیص کی قائل ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں عورت قصوروار دکھائی دیتی ہے، اُس کی نشاندہی بھی کی ہے اور جہاں مرد حق تلفی کرتا ہے، اُسے بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ

مردوعورت کے تعلقات میں غیر متعصبانہ سوچ وفکر کی حامل ہیں، تاہم مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں عورت کے خلاف منفی پروپیگنڈے کی نفی کرتی ہیں، ان کے نزدیک دُکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جس پر بھروسہ کیا جائے، اگر وہی اعتماد کو دھوکہ دے، تو زندگی بھی اعتبار چھوڑ دیتی ہے:

وہ شخص جس کے تحفظ پہ ناز تھا مجھ کو　　اُسی کے ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے ۲۸۳

انا کو بیچ کر، جو چھت خریدیں　　ہیں ایسی لڑکیاں شامل ہمیں میں ۲۸۴

تم ایسے لوگوں کا بارِ احسان کیوں اُٹھاؤں　　کہ جن کا شیوہ ہے اپنا اک اک ثواب گننا ۲۸۵

بسمل صابری کے کلام میں تانیثیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ بسمل صابری نے مرد کی حاکمیت کے علمبردار معاشرے میں اس کے نام نہاد اصولوں کے خلاف بغاوت کی ہے، جس نے عورت کو نہ صرف اپنی ذات کے حصار میں حبسِ بے جا کی مانند رکھا ہے، بلکہ تمام سماجی اصولوں کا اس حد تک پابند کر دیا ہے کہ اُس کا سانس لینا بھی دشوار ہو گیا، مرد کو صرف ایسی ہی باتوں اور سوچ وفکر کی ضرورت ہے، جو اِس کے سوچ لگا کھاتی ہے۔ تمام اصول، جو اس کے مفاد کے منافی ہیں، اُن کی قطعاً اجازت نہیں، جب کہ خود سارے اصول بلائے طاق میں رکھ دیتا ہے:

توڑ کر جسم کی دیوار، نکل سکتی ہوں　　میری حد بندیاں، پرکار سے کرنے والے ۲۸۶

اِن کے خیال میں مرد اپنی خود غرضی اور منافقت سے عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ عورت ظلم سہہ کر تنگ آ جائے تو بغاوت سر اُٹھانے لگتی ہے:

تری یہ شرط کہ میں تیرے ساتھ ساتھ چلوں　　مجھے یہ خوف کہ رستہ نہ تو بدل جائے ۲۸۷

اپنے لہجے میں بات کر میری　　میں اگر بول اُٹھی غضب ہوگا ۲۸۸

آج کی عورت، اگر چہ مالی طور پر خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے، اس کے باوجود وہ اسے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا کر خود زندگی کے مزے لوٹتا ہے۔ اس پر بسمل صابری اللہ سے شکوہ کرتی دکھائی دیتی ہے:

جبر کی رسم ہی دنیا سے اُٹھالے یارب　　آدمی پاؤں پہ گرتا نہیں اچھا لگتا
خود پسندی کی قبا جسم پر بسمل ہو اگر　　کوئی کتنا بھی ہو اچھا نہیں اچھا لگتا ۲۸۹

بشریٰ فرخ کے ہاں بندشوں اور رکاوٹوں میں جکڑی ہوئی عورت کا بیان ہے۔ نظم ''مقافاتِ عمل''، ''وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے''، ''عورتوں کے عالمی دن کے موقع پر''، ''آدم وحوا''، ''یاد''، ''آئیڈیل'' اس حوالے سے اہم ہیں:

حضرتِ آدم جو نکلا خلد سے
حوا کی خاطر ایک بار
آج تک ہر ابنِ آدم
بنتِ حوا کو سزا دیتا رہا اِس جرم کی

اُس کو بہکاتا رہا

اور ہر حوا کی بیٹی کو وہ جنت سے نکلواتا رہا ۲۹۰؎

بلقیس محمود نے غزل سے زیادہ آزاد نظم اور پابند نظم میں طبع آزمائی کی، اِن کے شعری مجموعے'' مجھے بولنے دو'' ''بابل کا گھر'' اور ''میرے چاند'' ہیں۔ بلقیس محمود کے ہاں معاشرے کی مسلمہ رویات ورسوم اور رواج کے خلاف باغیانہ انداز ملتا ہے۔ احساسِ ذات کا تحفظ ان کے خیال میں زندگی کا ضامن ہے،ان کے تینوں مجموعوں میں عورت کے ساتھ ناروارویوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اُس کے مصائب کا برملا اظہار ملتا ہے۔نفیِ ذات اورانا کو مجروح کیے جانے کی تلخی کونظم ''شکست''، ''مجھے بولنے دو''، ''مجھے مرنے نہ دو''، ''آبلے پھٹنے لگے'' اور ''آشوبِ آگہی'' وغیرہ میں بیان کیا ہے:

مجھے بولنے دو

کہ میں سننے اور دیکھنے کی اذیت

خموشی سے سہہ نہ سکوں ۲۹۱؎

نظم ''لڑکیو!'' میں زندگی کے خواب بنتی لڑکیوں کے لیے سماج کے تلخ حقائق زندگی کے کینوس پر تکلیف دہ نقوش بکھیرتے ہیں:

ہر آنگن

کچہری استغاثے

کاروائی ہائے یک طرفہ میں تم

تعزیر در تعزیر

اندر۔اور اندر

بھیجی جاؤ گی ۲۹۲؎

نظم ''شوگر کی مریضہ'' بلقیس محمود کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اِس میں شوگر کے مرض میں مبتلا عورت کی نفسیاتی کیفیات کو بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔نظم ''خبر نامہ'' میں ہر اخبار میں چھپنے والے عزت کے بے گوروکفن لاشے، بے بسی ومایوسی اور عدم تحفظ کے احساس اور احتجاجی رویے کی نشاندہی کی گئی ہے:

فقط انسان ہوں

انسان کا درجہ دو

اے قوامو! تحفظ دو

تقدس کی ضمانت دو

یہ ہر اخبار میں

عزت کے بے گوروکفن لاشے

یہ ہر بازار میں

ناموس کے بے آبرو قصے

نہ گھر محفوظ عورت کو

نہ گلیوں میں حفاظت ہے

کوئی معصوم لٹتی ہے

کوئی دانا تڑپتی ہے ۲۹۳ؔ

شبینہ رفعت مکاں سے زیادہ مکینوں کو اہمیت دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ رشتوں اور محبتوں کا مرکز، اِن کے خیال میں گھر ہوتا ہے۔ آگہی، شعور اور تعلیم افرادِ معاشرہ کے لیے ناقبول ہیں، بلکہ جن خواتین کو یہ نعمتیں حاصل ہیں، اُن کی زندگی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ نظم ''گانٹھیں''، ''رزم گاہ''، ''اندھیرے کا سراپا''، ''سرخ کنارے''، ''سانحہ''، ''محصور''، ''ہیجانی چیخ''، ''مکالمہ''، ''بے بنیاد''، ''وقت''، ''اعتراف''، ''پہلا خیال'' تانیثیت کے حوالے سے اہم ہیں:

جسم کو جسم سمجھتے ہو بس

رب کا نام لو نہ بے فائدہ

بھائی

چادر بن جاتے ہیں

باپ

کفن بھی ہو جاتا ہے

کاش تمھیں کوئی باندھے رشتہ

کاش! تمھاری بیٹی ہوتی!! ۲۹۴ؔ

ثریا شہاب کے ہاں تانیثی رو کے اثرات نمایاں ہے۔ نظم ''پتھر کی لڑکی'' اس حوالے سے اہم ہے:

وہ لڑکی

جسے پھولوں سے پیار تھا

جس نے نرم ریشمی بیلوں

خوش بو بھری وادیوں میں جینے کی تمنا کی تھی

پھر یوں ہوا کہ

اُسے سنگلاخ زمینوں

تپتے ہوئے صحراؤں میں تنہا چھوڑ دیا گیا

کہ تیری چاہت ۔۔۔ تری خواہش کا ہی صلہ ہے

اُس دن سے وہ لڑکی

نہ روئی، نہ ہنسی ہے

پتھر کی بن گئی ہے ۲۹۵ؔ

رُباب انجم کے ہاں شرافتوں کے لبادوں میں لپٹے ہوئے مرد و عورت کا ذکر ہے، جو اپنی چال بازی اور شاطر پن سے

وقتی طور پر حقائق کو جھٹلانے میں کامیاب تو ہو جاتے ہیں، لیکن بالآخر پستیاں ان کا مقدر ہوتی ہیں۔ رُباب انجم اِن دونوں طبقوں کی عکاس ہیں، اِن کی نمایاں نظمیں جن میں تانیثی احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، ''عرضِ حال'' ''میری شام میرے گھنگرو''، ''برداشت''، ''میری دوستی میں'' ہیں:

کوئی تو ہو جو دکھوں سے بچالے عورت کو　　　　　کوئی تو ایسا ہو، میدان کا جس کو مرد لکھوں ۲۹۶؎

رخشندہ نوید دَورِ حاضر کی نو آمیز شاعرہ ہیں، اِن کے مجموعۂ کلام ''کسی اور سے محبت'' میں جابجا تانیثی احساس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ رخشندہ نوید نے زندگی کی اُلجھنوں اور مسائل کا برملا اظہار کیا ہے۔ حقائق کی تلخیاں اور لحاتی قربت بھی جب مغائرت بن جائے تو ذہنی اذیت ناقابلِ بیان ہو جاتی ہے۔ زیور اور زنجیریں پاؤں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں۔ تانیثی شعور اور ادراک میں اس اُبھرتی ہوئی شاعرہ کو تانیثیت پسندوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ رخشندہ نوید کی نظر میں آپس کی تلخیاں اور دِل شکنیاں وجود کو گھلا کر مار ڈالنے کے مترادف ہیں:

ساری رات میں اپنے بازو پر سر رکھے روتی رہی
وہ بے خبری کی چادر اپنے تن پر اوڑھے سوتا رہا
اس کے دامن کی وسعت میں
دل کا پانی
پلکوں میں
اشکوں کے اُجلے اُجلے پھول پروتا رہا
میں روتی رہی وہ سوتا رہا ۲۹۷؎

سیدہ عظمیٰ گیلانی کے ہاں عورت کی قربانی اور مرد کی بے مروتی کا ذکر ہے، اِن کی نظموں میں ''اتنی سی بات''، ''سیراب'' ''بیٹی''، ''میرے ہاتھ خالی ہیں''، ''تم جھوٹے ہو''، ''ایک خانہ بدوش عورت کے لیے''، اور ''میری بستیوں کی سنڈریلا'' اہم ہیں:

اکثر ملنے والے لوگ
تمھارا ذکر کرتے ہیں
میں سب کے چہرے پڑھنے والی
گونگی سے ہو جاتی ہوں
تم کیسی کتاب ہو آخر ۲۹۸؎

شاہدہ لطیف کے ہاں عصری شعور کے علاوہ تانیثی احساسات اور زندگی کے تلخ تجربات کی مختلف جھلکیاں ملتی ہیں، جن میں سماج کی بہت سی رسوم کو بے نقاب کیا ہے، جو معاشرے کے چہرے پر بدنما داغ ہیں، مثلاً جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر لڑکیوں کا گھروں سے بھاگ جانا، کاروکاری، وَنی، وَٹہ سٹہ، بے جوڑ شادیاں، جہیز کی لعنت وغیرہ کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے، نظم ''چیخ'' اور ''جہیز'' اِس حوالے سے اہم ہیں:

رات کے اندھیرے سے
چوہدری کے ڈیرے سے

ایک چیخ اُبھری تھی
اور پھر رہا شب بھر
موت کا سا سناٹا
گھر میں آج غربت کے
کتنا ڈھیر تھا آٹا ۲۹۹؎

کیسی کیسی بیٹیاں
باپ کی دہلیز پر
پیلی پیلی ہوگئیں
شام غم میں کھوگئیں
کیسی کیسی بیٹیاں ۳۰۰؎

شبہ طراز کے ہاں عورت کی زندگی کے حوالے سے مختلف احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔آزاداورنثری نظموں کے علاوہ شبہ طراز نے ہائیکوز میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ اِن کی نثری نظم ''آدھی نیند کی دعا'' اور نظم ''ابھی تو دن ہے'' تانیثیت کی نمائندگی کرتی ہیں:

سپنوں کا سحر ٹوٹا
لڑکی بنی کٹھ پتلی
جب باپ کا گھر چھوٹا ۳۰۱؎

فرحت صفدر فرح کے ہاں نسائی جذبات کی عکاسی ملتی ہے، ان کا عصری شعور بہت پختہ ہے۔تخلیق کار عورتوں کی زندگی کے مسائل ، بچیوں کے رشتوں کے معاملات، ''ناطقہ سر بہ گریباں''، ''عورت گرہستی اور فن''، ''روگِ مسلسل'' ''فضائیں دیکھ کر پرواز کرنا''، ''ون وے'' اور'' ابا تم نے جھوٹ کہا تھا'' نظمیں تانیثی احساس کی عکاس ہیں:

ماں کی آنکھوں میں وسوسے جاگے
باپ کی چال لڑکھڑائی ہے
یوں تو بیٹی خدا کی رحمت ہے ۳۰۲؎

معاشرے کے دوہرے معیارات کی عکاسی بڑے منفرد انداز میں کی ہے، جو اِس سے قبل کسی شاعرہ کے ہاں شاذ و نادر ہی پائی جائے:

میرا بیٹا، میرا یہ چاند کا ٹکڑا
بڑا ہی 'بیبا' بیٹا ہے
اُسے معلوم ہے ماں کا ہے کیا رُتبہ
نہایت ہی شفقت سے، محبت سے

یہی ہستی ہے جو پروان بچوں کو چڑھاتی ہے

میری مرضی بنا اِس گھر کا پتا بھی نہیں ہلتا

بہو میری، میری مرضی سے سوتی جاگتی ہے

اور میرا بیٹا میرے ہاتھوں میں ہی اپنی کمائی لا کے دیتا ہے

بہت خوش ہوں بہت ہی مطمئین ہوں کہ

میرا یہ چاند سا بیٹا بڑا ہی 'بیبا' بیٹا ہے

- - - - - - - - -

مگر خالہ! میں اپنی لاڈلی بیٹی کی خاطر خون کے آنسو بہاتی ہوں

بڑا ہی سنگ دِل داماد ہے، کانوں کا کچا ہے

ہمیشہ ماں کی سنتا ہے

کمائی ساری اپنی ماں کے ہاتھوں میں ہی دیتا ہے

کوئی حق اس میں بیوی کا نہیں تسلیم وہ کرتا

وہ اپنی ماں کی ہر ایک بات پر سر جھکا تا ہے

خدا سے تم دعا کرنا

کہ میری بھی خدا سے رات دن یہ ہی گزارش ہے

خدا اُس کو ہدایت دے ۳۰۳

میمونہ روحی کی شاعری کا تانیثی پہلو عدم تحفظ کا احساس، طعنہ زنی، عورت کی شکستگی کا باعث بنتا ہے۔ نظم ''روز کی خلش'' ''تقسیم شدہ محبت کا نوحہ''، ''ایک غلط فیصلہ''، ''حاصل''، ''دوری میں ضائع ہوتی عمر''، ''انجان راستوں کی اکیلی مسافر'' ''مجروح انا کی آندھی'' اور ''شاعرہ دوست کے لیے'' وغیرہ جیسی نظمیں نسائی استحصال کی بھرپور عکاس ہیں:

ایک تقسیم شدہ محبت کا کرب سہنا بھی عذاب ہے

عمر کی رات تاریک ہے۔ - -

اور میں جانے کب سے ایک گمشدہ ہمسفر کی راہ تک رہی ہوں

مجھے انتظار ہے کہ گزری رُتیں کبھی اگر مجھ سے معذرت کریں گی اور مجھے منالیں گی ۳۰۴

نئی لکھنے والیوں، مثلاً ارشاد احمد عرشی، تنویر انجم، حمیرا رحمان، زاہدہ صدیقی، شہناز پروین، شائستہ حبیب، صائمہ خیری طاہرہ شمیم، عذرا وحید، عشرت آفریں، محمودہ غازیہ، نوشابہ نرگس، وحیدہ نسیم، بلقیس محمود، شگفتہ نازلی، صبا ارشد، سحر بلوچ وضاحت نسیم، مسرت جبیں زیبا، حنا اظہر، کلثوم طاہری برنی، شمیم عثمانی، رضیہ عثمانی، صبا ارشد، ثریا شہات، اُمتہ القوم عنبر وغیرہ نے اگر مشقِ سخن کا سلسلہ جاری رکھا، تو اِن میں سے بہت سے نام تانیثیت کی بھرپور نمائندگی کریں گے اور یہ ادب میں یقیناً اچھا اضافہ ہوگا۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ محمد جمیل، تذکرہ شاعرتِ ہند، بریلی: قومی کتب خانہ بریلی، ۱۹۴۴، ص ۳۶۳

۲۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر پاکستانی اہلِ قلم خواتین: ایک ادبی جائزہ، اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۲۰۰۳، ص: ۱۵

۳۔ ایضاً، ص: ۱۶

۴۔ ایضاً، ص: ۱۴

۵۔ نوازش علی، ڈاکٹر، پاکستان کی اُردو شاعرات مشمولہ پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال، راول پنڈی: گندھارا بکس، ۲۰۰۵، ص: ۹۵

۶۔ نعیم صدیقی، افشاں مرتبہ، دیباچہ، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران، ۲۰۰۶، ص ۱۵

7. There is no doubt,in each era there were many women writers and poetesses.But in world of literature,porse as well as poetry, we see very few women.The reason was that the men always knew the custodians of the pen and they never liked the idea of prominent women names in the world of literature.7(Feminism in modern urdu poetesses(1857-2000) by Ambreen Sallah ud Din west Pakistan Urdu Acadamy,2005,Pages: 71,72 .)

۸۔ الطاف حسین حالی، مولانا، چُپ کی داد مشمولہ کلیاتِ نظمِ حالی مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۰، ص ۴۶

۹۔ ایضاً، ص: ۵۱

۱۰۔ ایضاً، ص: ۴۷

۱۱۔ نعیم صدیقی، افشاں، ص ۳۱۔۳۲

۱۲۔ ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر، تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر مشمولہ دریافت، اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ص ۲۷۴

۱۳۔ کلیاتِ نظیر، نظیر اکبرآبادی، لاہور: مکتبۂ شعروادب، س ن، ص ۴۷۳

۱۴۔ علامہ اقبال، عورت مشمولہ کلیاتِ اقبال (اُردو)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۷۳، ص ۵۵۶

۱۵۔ علامہ اقبال، عورت اور تعلیم مشمولہ کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۵۵۸

۱۶۔ علامہ اقبال، آزادیٔ نسواں مشمولہ کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص ۵۵۷

۱۷۔ حفیظ جالندھری، ترانۂ جم خانہ مشمولہ کلیاتِ حفیظ جالندھری مرتبہ خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۲۷۱۔۲۷۲

۱۸۔ اختر شیرانی، پردیسی پی کی یاد میں مشمولہ کلیاتِ اختر شیرانی مرتبہ ڈاکٹر یونس حسنی، لاہور: ندیم بک ہاؤس، ۱۹۹۳، ص ۲۵

۱۹۔ اختر شیرانی، نارضامندی کی شادی مشمولہ کلیاتِ اختر شیرانی، ص ۳۱

۲۰۔ اختر شیرانی، عورت مشمولہ کلیاتِ اختر شیرانی، ص ۸۸

۲۱۔ اسرار الحق مجاز، خانہ بدوش مشمولہ کلیاتِ مجاز، لاہور: مکتبہ اُردو ادب، س ن، ص ۱۱۳
۲۲۔ اسرار الحق مجاز، نوجوان عورت سے مشمولہ کلیاتِ مجاز، ص ۱۳۱
۲۳۔ ن۔ م۔ راشد، انتقام مشمولہ کلیاتِ ن۔ م۔ راشد، لاہور: ماورا پبلی کیشنز، بار دوئم، ۱۹۹۱، ص ۱۰۷
۲۴۔ ن۔ م۔ راشد، حسن کوزہ گر مشمولہ کلیاتِ ن۔ م۔ راشد، ص ۴۸۹۔ ۴۹۰
۲۵۔ میرا جی، ادھورا گیت مشمولہ کلیاتِ میرا جی مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶، ص ۵۷۶
۲۶۔ اعظم خورشید، سنگسار ہونے والی لڑکی کے آخری الفاظ مشمولہ حرف ہالے، لاہور: لودھی پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص ۴۳
۲۷۔ اعظم خورشید، یقین جانو مشمولہ حرف ہالے، ص ۱۴۹
۲۸۔ اعظم خورشید، رِم جھمی شب میں مشمولہ حرف ہالے، ص ۱۶۳
۲۹۔ جانثار اختر، مزدور عورتیں مشمولہ کلیاتِ جانثار اختر، لاہور: مکتبۂ عالیہ، س ن، ص ۳۰۴۔ ۳۰۶
۳۰۔ اختر الایمان، گونگی عورت مشمولہ کلیاتِ اختر الایمان مرتبہ سلطانہ ایمان، بیدار بخت، دہلی: ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰، ص ۴۱۲۔ ۴۱۳
۳۱۔ احسان دانش، آزادی کے بعد مشمولہ فصلِ سلاسل، لاہور: دانش آباد: طبع اول، ۱۹۸۰، ص ۱۷۸۔ ۱۷۹
۳۲۔ فیض احمد فیض، مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ مشمولہ نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن، ص ۶۱
۳۳۔ صوفی تبسم، اپنے شوہر سے مشمولہ کلیاتِ صوفی تبسم، لاہور: ماورا، بار اول، ۱۹۹۰، ص ۶۴۰۔ ۶۴۱
۳۴۔ صوفی تبسم، کلیاتِ صوفی تبسم، ص ۲۳۱
۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی غزلیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۵۱
۳۶۔ احمد ندیم قاسمی، مغویہ مشمولہ ندیم کی نظمیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۵۹۷
۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، آزادی کے بعد مشمولہ ندیم کی نظمیں، ص ۶۸۷
۳۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''دختر فروش سے'' مشمولہ ندیم کی نظمیں، ص ۱۳۳
۳۹۔ احمد ندیم قاسمی، عورت مشمولہ ندیم کی نظمیں، ص ۱۳۱۴
۴۰۔ قتیل شفائی، رنگ، خوشبو، روشنی (کلیات)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۳۱۵
۴۱۔ ایضاً، ص ۳۶۷
۴۲۔ ایضاً، ص ۴۴۸
۴۳۔ ایضاً، ص ۵۳۴
۴۴۔ ایضاً، ص ۳۰۷
۴۵۔ ایضاً، ص ۸۳۷
۴۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷
۴۷۔ اختر حسین جعفری، ''خدیجہ مستور کے لیے'' مشمولہ جہاں دریا اُترتا ہے، لاہور: فرد پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳، ص ۷۶۔ ۷۷

۴۸۔اختر حسین جعفری، اکیلی چڑیا! مشمولہ جہاں دریا اُترتا ہے، ص ۱۱۷۔۱۱۸

۴۹۔نعیم صدیقی، فدیہ مشمولہ افشاں، ص ۵۶۔۵۷

۵۰۔نعیم صدیقی، بہن کی تصویر نہ بیچ مشمولہ افشاں، ص ۱۲۵

۵۱۔ظہیر کاشمیری، ناچ رہی رقاصہ مشمولہ کلیاتِ ظہیر، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص ۲۱۲

۵۲۔شہرت بخاری، شبِ آئینہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷، ص ۱۱۹

۵۳۔ایضاً، ص ۳۰۰

۵۴۔ساحر لدھیانوی، یکسوئی مشمولہ کلیاتِ ساحر، لاہور: علم و عرفان پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۳۶

۵۵۔ساحر لدھیانوی، صبحِ نوروز مشمولہ کلیاتِ ساحر، ص ۶۹

۵۶۔ساحر لدھیانوی، غزل مشمولہ کلیاتِ ساحر، ص ۴۵۷۔۴۵۹

۵۷۔جمیل الدین عالی، انتساب مشمولہ دوہے، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی (کوپرا)، ۲۰۰۳،

۵۸۔ایضاً، ص ۵۳

۵۹۔ایضاً، ص ۵۳

۶۰۔ایضاً، ص ۵۴

۶۱۔ایضاً، ص ۵۵

۶۲۔ایضاً، ص ۵۵

۶۳۔وزیر آغا، ڈاکٹر، لفظوں سے مت تولو مجھ کو مشمولہ چُنا ہم نے پہاڑی رَاستہ، لاہور: کاغذی پیرہن، طبع اول، ۱۹۹۹، ص ۱۲

۶۴۔وزیر آغا، ڈاکٹر، سانتا کلاز مشمولہ چُنا ہم نے پہاڑی رَاستہ، ص ۳۰

۶۵۔وزیر آغا، ڈاکٹر، مسافر چلتے رہتے ہیں مشمولہ چُنا ہم نے پہاڑی رَاستہ، ص ۴۸

۶۶۔احمد فراز، شہرِ سخن آراستہ ہے، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۳۸۱

۶۷۔احمد فراز، شہر آشوب مشمولہ شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۹۱۱

۶۸۔احمد فراز، منسوبہ سے مشمولہ شہرِ سخن آراستہ ہے، ص ۱۱۱

۶۹۔مجید امجد، بیاہی ہوئی سہیلی کا خط مشمولہ کلیاتِ مجید امجد مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۲۳۶

۷۰۔مجید امجد، عورت مشمولہ کلیاتِ مجید امجد، ص: ۲۱۰۔۲۰۹

۷۱۔مجید امجد، چچی مشمولہ کلیاتِ مجید امجد، ص ۲۴۵

۷۲۔مجید امجد، کارِ خیر مشمولہ کلیاتِ مجید امجد، ص ۲۴۵

۷۳۔ساقی فاروقی، حمل سرا مشمولہ سرخ گلاب اور بدرِ منیر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۱۹۳

۷۴۔ساقی فاروقی، پیرا سائیٹ مشمولہ سرخ گلاب اور بدرِ منیر، ص ۱۰۹

۷۵۔ساقی فاروقی، شہناز بانو دختر شہباز حسین مشمولہ سرخ گلاب اور بدرِ منیر، ص ۱۹۷۔۱۹۹

۷۶۔سلیم احمد، مسٹر ایکس کی ڈائری مشمولہ کلیاتِ سلیم احمد، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۲۰۷

۷۷۔ سلیم احمد، میں اور وہ مشمولہ کلیاتِ سلیم احمد، ص ۳۹۱
۷۸۔ سلیم احمد، نثرے مشمولہ کلیاتِ سلیم احمد، ص ۲۵۸۔۲۵۹
۷۹۔ سلیم احمد، نثرے مشمولہ کلیاتِ سلیم احمد، ص ۶۶۲
۸۰۔ شہزاد احمد، دیوار پہ دستک، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۵۴۲
۸۱۔ ایضاً، ص ۵۵۵
۸۲۔ ایضاً، ص ۵۶۵
۸۳۔ جاوید شاہین، عشقِ ناتمام، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱
۸۴۔ ایضاً، ص ۳۳
۸۵۔ ایضاً، ص ۲۵۴
۸۶۔ ایضاً، ص ۲۵۸
۸۷۔ جاوید شاہین، میں نے رات سے پوچھا مشمولہ عشقِ ناتمام، ص ۲۹۲
۸۸۔ انور مسعود، ہوچکی ترقی مشمولہ قطعہ کلامی، لاہور: گورا پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۸۳
۸۹۔ انور مسعود، شانہ بشانہ مشمولہ قطعہ کلامی، ص ۱۰۱
۹۰۔ انور مسعود، پدر تمام کند مشمولہ قطعہ کلامی، ص ۱۸
۹۱۔ انیس ناگی، ہذیان کی رات مشمولہ بیگانگی کی نظمیں، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۰ء، ص ۵۳
۹۲۔ انیس ناگی، ایک نیک عورت مشمولہ بیگانگی کی نظمیں، ص ۵۱۱
۹۳۔ انیس ناگی، کس طرح ہو مشمولہ بیگانگی کی نظمیں، ص ۳۹۴۔۳۹۵
۹۴۔ خورشید رضوی، سرابوں کے صدف، لاہور: دستاویز مطبوعات، اشاعتِ اول، ۱۹۹۵ء، ص ۲۵
۹۵۔ ایضاً، ص ۴۴
۹۶۔ خورشید رضوی، فیصلہ مشمولہ سرابوں کے صدف، ص ۱۱۱
۹۷۔ اختر شمار، دھیان، لاہور: ملٹری میڈیا افیئر ز، اشاعتِ اول، ۲۰۰۵ء، ص ۵۳
۹۸۔ اختر شمار، یہ آغازِ محبت ہے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، بار اول، ۱۹۹۴ء، ص ۹۶
۹۹۔ ایضاً، ص ۳۳۔۳۴
۱۰۰۔ ایضاً، ص ۹۵
۱۰۱۔ اختر شمار، مجبور دوشیزاؤں کا گیت مشمولہ یہ آغازِ محبت ہے، ص ۱۰۸۔۱۰۹
۱۰۲۔ مظہر الاسلام، موت سے چند قدموں کے فاصلوں پر آنکھوں کی کالونی میں رہتی ہے مشمولہ اے خدا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۷۷۔۷۹
۱۰۳۔ مظہر الاسلام، قدموں کی چاپ میں مسافر ایک بھی نہیں مشمولہ اے خدا، ص ۱۰۳۔۱۰۴
۱۰۴۔ اظہر غوری، رخصتی مشمولہ غیر مشروط محبت، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر ز، ۲۰۰۰ء، ص ۸۶

۱۰۵۔ اظہر غوری، اِنصاف مشمولہ غیر مشروط محبت، ص ۳۲۴۔۳۲۵
۱۰۶۔ ادا جعفری، میں ساز ڈھونڈتی رہی مشمولہ موسم موسم کلیات، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲، ص ۱۲۵
۱۰۷۔ ادا جعفری، میں ساز ڈھونڈتی رہی مشمولہ موسم موسم، ص ۱۲۵
۱۰۸۔ ایضاً، ص: ۱۷۵
۱۰۹۔ ادا جعفری، تو جانتا ہے مشمولہ موسم موسم، ص ۳۷۷
۱۱۰۔ ادا جعفری، کہ وہ اب تک نہیں پلٹا مشمولہ موسم موسم، ص ۵۲۰
۱۱۱۔ ادا جعفری، ایک اور منظر مشمولہ موسم موسم، ص ۶۹۴
۱۱۲۔ ادا جعفری، حرفِ شناسائی مشمولہ موسم موسم، ص ۶۹۵
۱۱۳۔ ایضاً، ص ۶۹۷
۱۱۴۔ ادا جعفری، نظمیہ مشمولہ موسم موسم، ص ۷۰۸
۱۱۵۔ ادا جعفری، صدیوں کا سفر مشمولہ موسم موسم، ص ۷۰۹
۱۱۶۔ ادا جعفری، سفر ہے شرط مشمولہ موسم موسم، ص ۷۲۸
۱۱۷۔ حیا لکھنوی، ارمغانِ حیا، کراچی: فرائیڈے پبلی کیشنز، ۱۹۹۶، ص ۱۷۰
۱۱۸۔ زہرہ نگار، جرمِ وعدہ مشمولہ شام کا پہلا تارا، کراچی: گولڈن بلاک ورکس لمیٹڈ، ۱۹۸۰، ص ۲۴
۱۱۹۔ زہرہ نگار، تراشیدم شکستم مشمولہ شام کا پہلا تارا، ص ۵۲
۱۲۰۔ زہرہ نگار، ایک لڑکی مشمولہ شام کا پہلا تارا، ص ۱۰۲۔۱۰۳
۱۲۱۔ فہمیدہ ریاض، مقابلۂ حسن مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸، ص ۱۵۹
۱۲۲۔ فہمیدہ ریاض، وہ اِک زنِ ناپاک ہے مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، ص ۱۶۰۔۱۶۱
۱۲۳۔ فہمیدہ ریاض، میں مٹی کی مورت ہوں مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، ص ۱۷۶۔۱۷۷
۱۲۴۔ فہمیدہ ریاض، ایک لڑکی سے مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، ص ۲۳۱۔۲۳۳
۱۲۵۔ فہمیدہ ریاض، پلاٹ مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، ص ۱۸۵۔۱۸۷
۱۲۶۔ فہمیدہ ریاض، بدن دریدہ، لاہور: مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۴، ص ۱۱۹
۱۲۷۔ کشور ناہید، دشتِ قیس میں لیلیٰ (کلیات)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۹۸
۱۲۸۔ ایضاً، ص ۱۱۲
۱۲۹۔ کشور ناہید، خود کلامی مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۲۵۶
۱۳۰۔ کشور ناہید، کشور ناہید مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۴۶۷
۱۳۱۔ کشور ناہید، سانپ کینچلی مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۸۷۹
۱۳۲۔ کشور ناہید، نیلام گھر مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۴۷۳۔۴۷۴
۱۳۳۔ کشور ناہید، تیرے پیچ میری ڈھیل مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۷۳۹۔۷۴۰

۱۳۴۔ کشور ناہید، تمہاری خاموشی ۔ میرا جُرم مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۲۶ ۷
۱۳۵۔ کشور ناہید، ہم گنہگار عورتیں مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۹۷۲
۱۳۶۔ کشور ناہید، وینا حیات اور آسیہ ایوب کی فردِ جرم مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۱۰۴۶۔۱۰۴۸
۱۳۷۔ کشور ناہید، چارج شیٹ ۱۹۹۰ مشمولہ دشتِ قیس میں لیلیٰ، ص ۱۱۴۱۔۱۱۴۲
۱۳۸۔ پروین شاکر، ماہِ تمام (کلیات)، اسلام آباد: مراد پبلی کیشنز، س ن، ص ۹
۱۳۹۔ پروین شاکر، اوتھیلو مشمولہ ماہِ تمام، ص ۱۸۱
۱۴۰۔ پروین شاکر، ایک معقول نکاح مشمولہ ماہِ تمام، ص ۲۶۰
۱۴۱۔ پروین شاکر، صرف اے لڑکی مشمولہ ماہِ تمام، ص ۹۴
۱۴۲۔ پروین شاکر، مقدّر مشمولہ ماہِ تمام، ص ۹۷
۱۴۳۔ پروین شاکر، ڈیوٹی مشمولہ ماہِ تمام، ص ۱۲۴
۱۴۴۔ پروین شاکر، دوست چڑیوں کے لیے کچھ حرف مشمولہ ماہِ تمام، ص ۱۲۹۔۱۲۸
۱۴۵۔ پروین شاکر، پروین قادر آغا مشمولہ ماہِ تمام، ص ۱۸۸
۱۴۶۔ شبنم شکیل، شب زاد، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص ۱۰
۱۴۷۔ ایضاً، ص ۲۷
۱۴۸۔ ایضاً، ص ۲۹
۱۴۹۔ ایضاً، ص ۵۰
۱۵۰۔ ایضاً، ص ۹۹
۱۵۱۔ ایضاً، ص ۹۳
۱۵۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵
۱۵۳۔ ایضاً، ص ۱۲۱
۱۵۴۔ شبنم شکیل، اضطراب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص ۴۳
۱۵۵۔ ایضاً، ص ۶۳
۱۵۶۔ شبنم شکیل، منکہ اصغری خانم مشمولہ اضطراب، ص ۷۹۔۸۰
۱۵۷۔ شبنم شکیل، اضطراب، ص ۱۲۹
۱۵۸۔ شبنم شکیل، مسافت رائیگاں تھی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۶۸
۱۵۹۔ رضیہ فصیح احمد، چاکِ قفس، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳، ص ۲۰
۱۶۰۔ ایضاً، ص ۶۷۔۶۸
۱۶۱۔ ایضاً، ص ۱۰۲
۱۶۲۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۶۳۔ایضاً،ص ۱۲۷

۱۶۴۔ایضاً،ص ۱۲۸

۱۶۵۔رشیدہ عیاں،تلاش مشمولہ آئینوں کے چہرے،کراچی:دنیائے ادب،۱۹۹۶،ص ۷۶

۱۶۶۔رشیدہ عیاں،گناہ نبودہ مشمولہ آئینوں کے چہرے،ص ۱۱۸۔۱۲۰

۱۶۷۔رشیدہ عیاں،ہائیکو مشمولہ آئینوں کے چہرے،ص ۱۳۷

۱۶۸۔پروین فنا سید،رباعی مشمولہ تمنا کا دوسرا قدم،راولپنڈی:ایس۔ٹی پرنٹرز،۱۹۸۵،ص ۸۱

۱۶۹۔پروین فنا سید،برزخ مشمولہ تمنا کا دوسرا قدم،ص ۱۱۴

۱۷۰۔پروین فنا سید،شکستِ انا مشمولہ تمنا کا دوسرا قدم،ص ۱۲۲

۱۷۱۔عرفانہ عزیز،سخنوری کا عذاب مشمولہ کفِ بہار،کراچی:مکتبۂ افکار،۱۹۸۵،ص ۷۷۔۷۸

۱۷۲۔عرفانہ عزیز،کفِ بہار،ص ۲۱۰

۱۷۳۔عرفانہ عزیز،شوکیس مشمولہ کفِ بہار،ص ۱۵۴

۱۷۴۔عرفانہ عزیز،مشمولہ حرف شریں،لاہور:خزینۂ علم وادب،اشاعت اول،۲۰۰۲،ص ۹۳

۱۷۵۔شاہدہ حسن،ایک تارا ہے سرہانے میرے،لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۱۹۹۵،ص ۳۷

۱۷۶۔شاہدہ حسن،کون کہاں ہے مشمولہ ایک تارا ہے سرہانے میرے،ص ۱۲۸

۱۷۷۔شاہدہ حسن،ایک تارا ہے سرہانے میرے،ص ۱۴۶

۱۷۸۔ایضاً،ص ۲۲۳

۱۷۹۔شاہدہ حسن،یہاں کچھ پھول رکھے ہیں،کراچی:شہزاد،۲۰۰۲،ص ۳۵

۱۸۰۔ایضاً،ص ۴۹

۱۸۱۔ایضاً،ص ۵۱

۱۸۲۔ایضاً،ص ۳۷

۱۸۳۔شاہدہ حسن،خواتین کے عالمی دن پر مشمولہ یہاں کچھ پھول رکھے ہیں،ص ۶۶

۱۸۴۔فاطمہ حسن،مجھے ڈر لگتا ہے مشمولہ دستک سے در کا فاصلہ،لاہور:الرزاق پبلی کیشنز،۱۹۹۹،ص ۸۷

۱۸۵۔فاطمہ حسن،بائیس سال بعد(دیباچہ)مشمولہ بہتے ہوئے پھول،لاہور،الرزاق پبلی کیشنز،۱۹۸۹،ص:۲۲

۱۸۶۔فاطمہ حسن،ایک نظم مشمولہ بہتے ہوئے پھول،ص ۲۹۔۳۰

۱۸۷۔فاطمہ حسن،دستک سے در کا فاصلہ،لاہور:الرزاق پبلی کیشنز،۱۹۹۹،ص ۵۸

۱۸۸۔فاطمہ حسن،گھر مشمولہ دستک سے در کا فاصلہ،ص ۷۱۔۷۲

۱۸۹۔فاطمہ حسن،گڑیا مشمولہ دستک سے در کا فاصلہ،ص ۱۰۴

۱۹۰۔یاسمین حمید،پسِ آئینہ،لاہور:بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز،۱۹۸۸،ص ۴۶

۱۹۱۔ایضاً،ص ۵۰

۱۹۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۹۳۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۹۴۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۹۵۔ یاسمین حمید، حصارِ بے درودیوار، لاہور: جنگ پبلی شرز، ۱۹۹۱، ص ۱۸

۱۹۶۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۱۹۷۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۹۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۱۹۹۔ یاسمین حمید، کیوں مشمولہ حصارِ بے درودیوار، ص ۱۳۵

۲۰۰۔ یاسمین حمید Feminist مشمولہ فنا بھی ایک سراب ہے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۱۹۸۔۱۹۹

۲۰۱۔ منصورہ احمد، میں گڑیوں سے نہیں کھیلی مشمولہ طلوع، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۷، ص ۶۱

۲۰۲۔ منصورہ احمد، صدیوں پیچھے مشمولہ طلوع، ص ۱۰۱۔۱۰۲

۲۰۳۔ منصورہ احمد، صدیوں پیچھے مشمولہ طلوع، ص ۱۲۴۔۱۲۵

۲۰۴۔ منصورہ احمد، میں مجرم ہوں مشمولہ طلوع، ص ۱۳۴

۲۰۵۔ منصورہ احمد، میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں مشمولہ طلوع، ص ۱۵۶

۲۰۶۔ منصورہ احمد، بھولی ماں مشمولہ طلوع، ص ۱۷۵

۲۰۷۔ ثمینہ راجا، باغِ شب، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۱۲۱

۲۰۸۔ ثمینہ راجا، اور وصال کہاں، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص ۲۳

۲۰۹۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۱۰۔ ثمینہ راجا، مشمولہ شہرِ سبا، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۷، ص ۴۱

۲۱۱۔ شہناز مزمل، بنتا اک عورت کی مشمولہ میرے خواب ادھورے ہیں، لاہور: عمیر پبلشرز، ۱۹۹۵، ص ۸۴۔۸۸

۲۱۲۔ شہناز مزمل، چلتی پھرتی لاش مشمولہ عشق تماشا، لاہور: ندا پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۹۹۔۱۰۲

۲۱۳۔ شہناز مزمل، کل آج کل مشمولہ عشق تماشا، ص ۱۰۶۔۱۰۸

۲۱۴۔ شہناز مزمل، مٹی مشمولہ موم کے سائباں، لاہور: پاک بک ایمپائر، ۱۹۹۴، ص ۴۲۔۴۳

۲۱۵۔ شہناز مزمل، بے کلی مشمولہ موم کے سائباں، ص ۴۴۔۴۶

۲۱۶۔ شہناز مزمل، موم کے سائباں، ص ۱۶۳

۲۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔۱۷۴

۲۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۲۱۹۔ شاہین مفتی، مفاہمت مشمولہ امانت، لاہور: نقوش پریس، ۱۹۸۱، ص ۴۹

۲۲۰۔ شاہین مفتی، تغافل آشنا مشمولہ امانت، ص ۵۰

۲۲۱۔شاہین مفتی، مراجعت مشمولہ امانت، ص۵۱
۲۲۲۔شاہین مفتی، کسیۂ خواب میں اَب کچھ بھی نہیں مشمولہ مسافت، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۸، ص۲۵
۲۲۳۔شاہین مفتی، کوئی حد مشمولہ مسافت، ص۵۵
۲۲۴۔شاہین مفتی، آدھی لڑکی مشمولہ مسافت، ص۹۳۔۹۴
۲۲۵۔شاہین مفتی، اپنے بغیر ایک دن مشمولہ مسافت، ص۹۵
۲۲۶۔شاہین مفتی، رفاقت مشمولہ مسافت، ص۱۰۵
۲۲۷۔نوشی گیلانی، ورثہ مشمولہ، اُداس ہونے کے دن نہیں ہیں، لاہور: گیلانی پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص۴۳۔۴۴
۲۲۸۔نوشی گیلانی، اُداس ہونے کے دن نہیں ہیں، ص۴۵
۲۲۹۔نوشی گیلانی، اُداس ہونے کے دن نہیں ہیں، ص۲۴
۲۳۰۔نوشی گیلانی، پہلا لفظ محبت لکھا، لاہور: جے بی ڈی آرٹ سیکشن، ۲۰۰۳، ص۵۲
۲۳۱۔ایضاً، ص۶۹
۲۳۲۔نوشی گیلانی، نارسائی مشمولہ پہلا لفظ محبت لکھا، ص۱۳۳۔۱۳۴
۲۳۳۔نسرین انجم بھٹی، رونے کا حق مشمولہ بن باس، لاہور: پلس کیمونی کیشنز، ۱۹۹۴، ص۳۸
۲۳۴۔نسرین انجم بھٹی، کس کا لہو ہے کون مرا مشمولہ بن باس، ص۸۵
۲۳۵۔نسرین انجم بھٹی، اقرار مشمولہ بن باس، ص۹۸
۲۳۶۔نسرین انجم بھٹی، پھر وہی دل پھر وہی میں مشمولہ بن باس، ص۱۱۲
۲۳۷۔نسرین انجم بھٹی، عورتوں کے عالمی دن پر مشمولہ بن باس، ص۱۲۳۔۱۲۴
۲۳۸۔نسرین انجم بھٹی، تم مگر مشمولہ بن باس، ص۲۵۸
۲۳۹۔نسرین انجم بھٹی، میں اک بے بس ماں مشمولہ زنداں کے گیت، لاہور: بکسن پرنٹرز، ۲۰۰۰، ص۵۱
۲۴۰۔سارا شگفتہ، (انتساب) شیلی بیٹی کے نام مشمولہ آنکھیں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۶
۲۴۱۔سارا شگفتہ، ہونٹ میرے گداگر مشمولہ آنکھیں، ص۴۰۔۴۱
۲۴۲۔سارا شگفتہ، رات کی دو آنکھیں مشمولہ آنکھیں، ص۴۴۔۴۷
۲۴۳۔سارا شگفتہ، عورت اور نمک مشمولہ آنکھیں، ص۵۰۔۵۲
۲۴۴۔سارا شگفتہ، زندگی کی کتاب کا آخری (اقتباسات) صفحہ مشمولہ آنکھیں، ص۹۶
۲۴۵۔سارا شگفتہ، آدھا کمرہ مشمولہ آنکھیں، ص۱۳۸
۲۴۶۔عذرا عباس، عورت اور دُکھ مشمولہ خواب مجھے دیکھتے ہیں، لنڈن: پیکیمیس پریس، س ن، ص۲۵
۲۴۷۔عذرا عباس، میں تمھیں اور بانٹنا نہیں چاہتی مشمولہ خواب مجھے دیکھتے ہیں، ص۸۰۔۸۱
۲۴۸۔نیلما سرور، میرے باہر جنگل تھا مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، لاہور: کلاسیک، س۔ن، ص۲۶
۲۴۹۔نیلما سرور، میں اِک ذہن ہوں مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، ص۳۲

۲۵۰۔ نیلما سرور، عورت اپنا آپ بچالے مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، ص۳۴

۲۵۱۔ نیلما سرور، دُنیا میرا گھر تو نہیں ہے مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، ص ۵۸

۲۵۲۔ نیلما سرور، میری گواہی آدھی ہے تو مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، ص۶۳

۲۵۳۔ نیلما سرور، میرے سارے جسم پہ آنکھیں اُگ آتی ہیں مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، ص ۶۵

۲۵۴۔ نیلما سرور، میری ماں کی سوکھی ہوئی چھاتیاں مشمولہ جب نہر کنارے شام ڈھلی، ص ۹۷

۲۵۵۔ ناہید قاسمی، منصف مشمولہ بنجر دِل سیراب کرو، لاہور: مکتبۂ فنون، بار اول، ۱۹۹۱، ص ۱۵۴

۲۵۶۔ ناہید قاسمی، بند مٹھی مشمولہ بنجر دِل سیراب کرو، ص ۱۵۸

۲۵۷۔ ناہید قاسمی، مجبوری مشمولہ بنجر دِل سیراب کرو، ص ۱۶۰

۲۵۸۔ نسیم اختر، کلیاتِ نسیم اختر، لاہور: خزینۂ علم وادب، ۲۰۰۴، ص ۴۱

۲۵۹۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۶۰۔ ایضاً، ص ۲۴۶

۲۶۱۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۲۶۲۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۲۶۳۔ نسیم اختر، چھوٹی سی ایک نظم مشمولہ کلیاتِ نسیم اختر، ص ۹۷

۲۶۴۔ نسیم اختر، درد کا اِک شہر مشمولہ ادھورے خواب، لاہور: خزینہ علم وادب، ۲۰۰۳، ص ۶۴

۲۶۵۔ عشرت آفریں، دھوپ اپنے حصے کی، کراچی: سمیع سنز پرنٹرز، ۲۰۰۵، ص ۱۰۶

۲۶۶۔ عشرت آفریں، سنِ یاس مشمولہ دھوپ اپنے حصے کی، ص ۱۱۲

۲۶۷۔ حمیدہ شاہین، دشتِ وجود، لاہور، ملٹی میڈیا، ۲۰۰۶، ص ۴۰

۲۶۸۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۶۹۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۷۰۔ ایضاً، ص ۷۷

۲۷۱۔ ایضاً، ص ۸۱

۲۷۲۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۲۷۳۔ حمیدہ شاہین، تمکنت مشمولہ دشتِ وجود، ص ۱۵۲

۲۷۴۔ حمیدہ شاہین، دشتِ وجود، ص ۱۵۹

۲۷۵۔ فاخرہ بتول، کتے مشمولہ سمندر پوچھتا ہوگا، لاہور: خزینۂ علم وادب، ۲۰۰۱، ص ۳۲۔ ۳۳

۲۷۶۔ فاخرہ بتول، ڈائنا سور مشمولہ سمندر پوچھتا ہوگا، ص ۶۴

۲۷۷۔ فاخرہ بتول، سنبھل جاؤ مشمولہ دُور مت نکل جانا، لاہور: خزینۂ علم وادب، ۲۰۰۲، ص ۹۷

۲۷۸۔ فاخرہ بتول، ابھی سے کس لیے پتھر اُٹھاتے ہو مشمولہ دُور مت نکل جانا، ص ۱۳۷

۲۷۹۔فاخرہ بتول، مجھ کو دیر بھی ہو سکتی ہے مشمولہ اَب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو، لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۰، ص ۹۲
۲۸۰۔یاسمین گل، اعتراف، لاہور: مکتبۂ اساطیر، ۱۹۹۵، ص ۳۳
۲۸۱۔ایضاً، ص ۳۴
۲۸۲۔ایضاً، ص ۳۹
۲۸۳۔ایضاً، ص ۴۷
۲۸۴۔ایضاً، ص ۷۰
۲۸۵۔ایضاً، ص ۱۵۰
۲۸۶۔بسمل صابری، پانی کا گھر، لاہور: نمیر انٹرنیشنل، ۱۹۹۸، ص ۲۲
۲۸۷۔ایضاً، ص ۷۱
۲۸۸۔ایضاً، ص ۸۹
۲۸۹۔ایضاً، ص ۹۹
۲۹۰۔بشریٰ فرح، آدم و حوا مشمولہ اک قیامت ہے لمحۂ موجود، لاہور: ملت ایجوکیشنل پرنٹرز، ۲۰۰۰، ص ۱۲۳
۲۹۱۔بلقیس محمود، مجھے بولنے دو، لاہور: کمبائن پرنٹرز، ۱۹۹۷، ص ۳۰
۲۹۲۔بلقیس محمود، لڑکیو! مشمولہ مجھے بولنے دو، ص ۴۸۔۴۹
۲۹۳۔بلقیس محمود، خبرنامہ مشمولہ مجھے بولنے دو، ص ۲۴۹
۲۹۴۔شبینہ رفعت، ہیجانی چیخ مشمولہ لوری دِل دُکھاتی ہے، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر ز، ۲۰۰۵، ص ۹۹
۲۹۵۔ثریا شہاب، پتھر کی لڑکی مشمولہ خود سے ایک سوال، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۱۸۰
۲۹۶۔رُباب انجم، تنہائیوں میں خدا، لاہور: عظیم علیم پرنٹرز، ۲۰۰۰، ص ۱۲۴
۲۹۷۔رخشندہ نوید، شب بھر جاگے کوئی مشمولہ کسی اور سے محبت، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۱۵۶
۲۹۸۔سیدہ عظمیٰ گیلانی، تم کیسی کتاب ہو آخر مشمولہ کرچیاں مگر نہیں سمٹیں، لاہور: عروج پرنٹرز، ۲۰۰۰، ص ۱۲۹
۲۹۹۔شاہدہ لطیف، چیخ مشمولہ معجزہ، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰، ص ۷۸
۳۰۰۔شاہدہ لطیف، جہیز مشمولہ معجزہ، ص ۸۸
۳۰۱۔شبہ طراز، ہائیکو مشمولہ جگنو ہنستے ہیں، اسلام آباد: تجدیدِ اشاعت گھر، ۲۰۰۲، ص ۱۳۹
۳۰۲۔فرحت صفدر فرح، ہائیکو مشمولہ فضائیں دیکھ کر پرواز کرنا اسلام آباد: گلوبل پبلی شرز، ص ۱۲۰
۳۰۳۔فرحت صفدر فرح، وَن وے مشمولہ فضائیں دیکھ کر پرواز کرنا، ص ۱۵۷۔۱۵۸
۳۰۴۔میمونہ روحی، تقسیم شدہ محبت کا نوحہ مشمولہ کانٹوں میں جگنو، فیصل آباد: سلیم نواز پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۸، ص ۶۵

باب سوم

تانیثیت اور پاکستانی اُردو نثر

ا۔ تانیثیت اور پاکستانی اُردو ناول

کہانی سننا اور سنانا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے، تخیّل کی بلند پروازی کی وجہ سے انسان کٹھن سے کٹھن مہمات ومسائل بآسانی حل کرتا چلا جاتا ہے، یہ کتھارسیس کے علاوہ قوتِ متخیلہ کی تعمیر وتشکیل میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ چوپال کے قصے یا کہانیاں، ماضی میں نہ صرف انسان کی دن بھر کی تھکن دُور کرنے کا باعث تھیں، بلکہ اس کی مہماتی فطرت کے لیے باعثِ اطمینان تھیں۔ قصہ کہانی نے چوپال سے کتاب تک کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا۔ تخیلاتی اور مافوق الفطرت داستانیں بہت جلد ایسے زمینی قصے بن گئیں، جن کا ہیئتی سانچہ، پلاٹ، کردار، مکالمے اور مناظر و ماحول، تو کم وبیش ایک سے رہے، لیکن طوالت واختصار کے پیشِ نظر انھیں مختلف اصنافِ نثر مثلاً ناول، ناولٹ، افسانہ، مختصر افسانہ وغیرہ میں منقسم کر دیا گیا۔ لہٰذا، کہانی عشق و عاشقی کے قصّوں کے علاوہ حیاتِ انسانی کی مختلف سطحوں کی ترجمان بن گئی، زندگی کے معیارات رُجحانات، فرد کے حیاتی تجربات، سیاسی وسماجی محرکات نے ادب میں نئی راہیں وا کیں۔ تحریکِ علی گڑھ کے تحت لکھا جانے والا اصلاحی ادب، تعلیمِ نسواں کی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تعلیمِ نسواں کی ترویج واشاعت کے لیے علمی تصانیف کے تراجم کے علاوہ دوسری کتب کے نئے سلسلے بھی مرتب کیے گئے۔

انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کے فقدان سے مسلم معاشرہ جہالت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ توہم پرستی، ہندوانہ رسوم ورواج وغیرہ نے عورت کی سماج میں ثانوی حیثیت کو مزید کم تر درجے پر لا کھڑا کیا تھا۔ حقوقِ نسواں کے لیے بلند کی جانے والی آواز رفتہ رفتہ عام لوگوں تک پہنچنے لگی اور بہت سی تحریکوں اور رُجحانات کے طوفانِ بلاخیز میں سماجی اور اخلاقی سطح پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں مثلاً معاشرتی اصلاح خصوصاً عورت کے حقوق کی بازآفرینی اور تشخصِ ذات کی کاوشیں تیز تر ہو گئیں۔ ابتداً قصہ کہانیاں، خصوصاً ناول میں اصلاح اور مقصدیت کا عنصر غالب رہا، جب کہ بعد میں لکھے جانے والے ادب پر عالمی تحریکوں کے بہت سے رُجحانات نمایاں رہے، مثلاً حقیقت نگاری، آدرش پسندی یا آئیڈیلزم، نفسیاتی وجنسی رُجحان فنتسیائی رُجحان، تاریخی و اسلامی رُجحان، تاریخی وسیاسی رُجحان، ناسٹلجیائی رُجحان، مزاحیہ رُجحان، رومانی وعشقیہ رُجحان خودسوانحی رُجحان اور دستاویزی رُجحان وغیرہ [۱]

کمپیوٹر ایج میں پوری دُنیا گلوبل ولیج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی اور مواصلات کی جدت نے براعظمی وملکی حدوں کو ختم کر دیا ہے۔ عالمی ادب میں رونما ہونے والی بہت سی تحاریک ورُجحانات کے اثرات دُنیا کے دیگر زبان وادب کی طرح اُردو پر بھی مُرتسم ہوئے، دیگر اصناف کی طرح اُردو ناول نے بھی مغربی اثرات قبول کیے، لیکن یہ تقلیدِ محض کی بجائے اپنے ماحول و معاشرت کے قالب میں ڈھالے گئے۔ تانیثیت کے زیرِ اثر اُردو ناول میں انسانی جذبات واحساسات خصوصاً عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم، استحصال، جبر وتشدد، بدسلوکی اور بُرے رویوں کی عکاسی

کی گئی ہے اور اُن محرکات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جو اِس استبداد کا باعث ہیں۔ اِس تناظر میں اجمالی جائزہ درج ذیل ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تحریکِ علی گڑھ کے تحت لکھے جانے والے ادب میں لڑکیوں کی سماجی و اخلاقی اور مذہبی اصلاح کے علاوہ تعلیم و تربیت پر زور دیا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد اِس تحریک کے اہم رُکن تھے، جنھوں نے اِس اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک کتاب ''مراۃ العروس'' لکھی۔ نذیر احمد کے خیال میں عورت کی بے وقعتی کا سبب معاشرتی زندگی میں تعلیم، جہالت اور ہنر کی کمی ہے۔ ''بنات النعش'' کا خاص موضوع معلوماتِ علمی ہے۔ نذیر احمد نے عورتوں کے قلوب و اذہان کو جاہلانہ توہمات سے پاک کر کے مذہبی و معاشرتی گمراہیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور شہری و دیہاتی معاشرت کا تقابل کرتے ہوئے، پردے کی سختی پر تنقید کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کو نفسیاتِ انسانی پر عبور تھا، مسلم معاشرے میں عورتوں کی دردناک حالت کے پیشِ نظر ''مراۃ العروس'' میں لکھتے ہیں:

> ''خانہ داری بدون عورت کے ایک دِن نہیں چل سکتی۔ مرد کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو ممکن نہیں کہ عورت کی مدد کے بدون گھر چلا سکے، یہی وجہ ہے کہ عورت کے مرنے کو خانہ ویرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔۔۔ خانہ داری میں جو کام کرنے پڑتے ہیں اُن کی فہرست منضبط نہیں ہو سکتی، شادی، غمی، تقریبات، مہمان داری، لین دین، نسبت نامہ، پینا، پکانا، سینا پرونا خدا جانے کتنے بکھیڑے ہیں، جس نے گھر کیا ہو اُسی کو کچھ خبر ہو گی، لیکن اس خانہ داری میں اولاد کی تربیت بھی ہے اور کسی کام میں عورتوں کو علم کی ضرورت شاید نہ بھی ہو، مگر اولاد کی تربیت تو جیسی چاہیے بے علم کی ہونی ممکن نہیں۔''[۲]

''فسانۂ مبتلا'' میں مرد کی آوارگی اور بے راہ روی کی وجہ بڑے روایتی انداز میں عورت کے سر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، یہاں نذیر احمد یہ بات یکسر بھول گئے ہیں کہ محض عورت ہی اُس کی ذمہ دار نہیں، بلکہ مرد کے کردار کی کمزوری بہت بڑی وجہ ہے۔ شادی جیسا مقدس مذہبی فریضہ باقاعدہ ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس میں مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے پابند اور امین ہوتے ہیں، جب اِس کی پاس داری نہ کی جائے، تو بہت سی بُرائیاں جنم لیتی ہیں۔ نذیر احمد نے مبتلا کی خیانت کو روایتی انداز میں اُس کی بیوی کے کندھوں پر تو ڈال دیا ہے، لیکن اِس حقیقت سے انکار نہیں کہ غیر عورت پر مرد جتنی عنایات خوش گفتاریاں اور اپنی وفاداریاں نچھاور کرتا ہے، بیوی کے معاملے میں یکسر فراموش کر دیتا ہے، بے وفائی کا مرتکب ہو کر محض اُسے موردِ الزام ٹھہرا کے نصیب و تقدیر کی آڑ میں تلخ حقیقت سے پردہ پوشی کر کے، ضمیر کی خلش سے بچنے کی کوشش محض اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوتی ہے۔ ناول کے اختتام پر اگرچہ نذیر احمد نے مبتلا کا ابتر حال دکھا کر قارئین کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیوی بچوں کو زندہ درگور کرنے والا کیا رحم کا مستحق ہے؟۔

علامہ راشد الخیری نے تحریکِ اصلاحِ نسواں کا باقاعدہ آغاز کیا، وہ پہلے فیمینسٹ تھے جنھوں نے ''حیاتِ صالحہ'' ''بنت الوقت''، ''جوہرِ قدامت''، ''نوحۂ زندگی''، ''عروسِ کربلا''، ''صبحِ زندگی''، ''شامِ زندگی''، ''شبِ زندگی''، ''سیلابِ اشک'' ''جوہرِ عصمت''، وغیرہ جیسے میں عورتوں کے مسائل اور اُن کی سماجی اُلجھنوں کے علاوہ جذبات کی بھرپور عکاسی کی اور ''مصورِ غم'' کے خطاب سے نوازے گئے، ''بنت الوقت'' میں علامہ راشد الخیری نے اس دَور میں جدیدیت کی حامل اُن خواتین کو بھی موضوع بنایا ہے، جو انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید میں حقوقِ نسواں کا نعرہ تو لگاتی ہیں، لیکن اپنے اصل حقوق سے محروم

ہو جاتی ہیں۔علامہ راشد الخیری نے ''بنت الوقت'' کی فرخندہ کو ایسی خواتین کی نمائندہ قرار دیا ہے، جو اپنی اقدار اور روایات کو یکسر فراموش کرتی ہوئی، مادر پدر آزادی کو حقوقِ نسواں کا نام دیتی ہے اور بالآخر وقتی عروج کے بعد انتہائی کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کرنے کے لیے تنہا رہ جاتی ہے۔''بنت الوقت'' میں احمدی بیگم اور بنت الوقت، عورتوں کو قائل کرنے کے لیے بہت سے سماجی حقائق منکشف کرتی ہیں:

> ''کاش ہماری طرح تم بھی آزاد ہوتیں اور تمھارا پالا بھی ایسے شوہر سے پڑتا، جو عورت کی قدر و منزلت سے واقف ہوتا۔۔۔تم لوگ، تو ایک پیسہ بھی بلا اجازت نہیں اُٹھا سکتیں، کیسے افسوس کی بات ہے کہ بیوی شوہر کے قبضہ میں اس بری طرح پھنس جائے کہ سوائے چند محدود تعلقات کے دُنیا کے کسی معاملے سے واسطہ ہی نہ ہو۔''[۳]

علامہ راشد الخیری کے خیالات کو آگے بڑھاتے ہوئے نثار عزیز بٹ نے برصغیر میں مسلمانوں کی مجروح عظمت اور دم توڑتی تہذیب میں عورت کی مجبوری اور بے بسی کو موضوع بنایا ہے، اُن کا ناول ''نے چراغ نے گلے'' صوبہ سرحد کی عورتوں کی ذہنی اُلجھنوں اور کشمکش کا عکاس ہے، جو عبوری دَور کی پروردہ خواتین کی شخصی آزادی سے محرومی پر مبنی ہے، مثلاً مرکزی کردار، جمال اَفروز اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتی اور اندر ہی اندر گھٹ کر مر جاتی ہے۔جمال اَفروز خانم کی بڑی بیٹی ہوتی ہے، جو سخت گیر ہونے کے علاوہ عورت کو تعلیم دلوانے اور آزادی کے خلاف ہے، اس کی بیٹی اپنے اس شوق کو چپکے چپکے پورا کرتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے ضیا اللہ سے اپنی منگنی خاموشی سے کرا لیتی ہے، لیکن اپنی ناپسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار اپنی سہیلی پدما سے کرتی ہے، یہاں مصنفہ نے عورت کی تعلیم اور آزادیٔ رائے کے حق سے محرومی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح اونچے طبقے کے گھرانوں میں بھی تعصب موجود ہے۔اِسی طرح 'کاروانِ وجود' بھی تعلیم کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔'کاروانِ وجود' کی ثمر اور اُس کی والدہ زینت اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سرگرداں ہے اور زندگی میں تعلیم و ترقی اور شخصی آزادی کو مرد و عورت کے لیے اہم تصور کرتی ہے:

> ''لڑکیوں کی تعلیم پر خرچ کر کے والدین سمجھتے تھے، کہ پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔لڑکوں کی تعلیم تو بہر صورت ان پر فرض تھی، چناں چہ لڑکے فراخدلی سے خرچ کرتے۔نوکروں کو انعام اکرام دیتے، چناں چہ کوئی پالش کر رہا ہے، کوئی بھاگ کر ہوٹل سے بُھنے گوشت کی قابیں لا رہا ہے، مہمان آ جا رہے ہیں۔''[۴]

عورت ہمیشہ سے ظلم اور جبریت کا شکار رہی ہے۔تاریخی و سماجی تناظرات میں دیکھا جائے، تو ہر دَور میں اِسے جبریت کے عذابوں سے گزرنا پڑا۔تانیثی طرزِ فکر کے حامل بہت سے ناول نگاروں کے ہاں ہمیں معاشرے میں عورت سے برتے جانے والے ناروا سلوک کی جھلکیاں ملتی ہیں، مثلاً علامہ راشد الخیری ''بنت الوقت''، ڈاکٹر احسن فاروقی ''سنگم''، جمیلہ ہاشمی ''دشتِ سوس''، خالدہ حسین ''کاغذی گھاٹ''، نثار عزیز بٹ ''کاروانِ وجود''، ''دریا کے سنگ'' اور بلقیس ریاض کا ''بادبان'' وغیرہ میں یہ احساس نمایاں ہے۔علامہ راشد الخیری نے خواتین کے نمائندہ رسائل ''عصمت''، ''تمدن''، ''سہیلی''، ''جوہرِ نسواں'' بھی جاری کیے اور مسلمان بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ادارہ 'تربیت گاہِ بنات' قائم کیا، جس میں مسلمان بچیوں کی اصلاح و تربیت اس انداز سے کی جانے لگی کہ وہ معاشرے کی توہم پرستی، قبیح روایات اور فضول رسوم و رواج کی

پرچھائیوں سے محفوظ رہ سکیں، تاکہ آئندہ زندگی میں باشعور اور متمدن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے حصول کے علاوہ زندگی کے ہر میدان میں حصہ لے سکیں: ''تاریخ پڑھو اور غور کرو حضور اکرم کا عہد، خلیفہ دوم کا دَور دورہ، عباسیوں کا جاہ وجلال تم کو بتا دے گا، کہ ترقی کرنے والی قوم کی عورتیں دَورانِ کامیابی میں بساطِ حیات پر کیا پایہ رکھتی تھیں اور ان کا تعلق مذہب سے کیا تھا۔'' ۵؎ منشی خلیل الرحمٰن نے 'عذرا، عذرا کی واپسی' میں زمانۂ قدیم کی عورت کے بارے میں قائم نظریات کی وضاحت کی ہے:

> ''مجھے ایک تازہ فکر پیدا ہوگئی، دیکھیے یہ عورت مہذب دُنیا میں، پہنچ کر کیا کیا گُل کھلاتی ہے اور کیا کیا فساد برپا کرتی ہے، اِس کی طاقت کا تو اندزہ کر ہی چکا تھا، مجھے یقین ہوگیا کہ اِس کا غرور اور بلند نظری دُنیا پر قبضہ کیے بغیر چین نہ لے گی اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کمبخت نہ خود مرے اور نہ کسی کے مارے ماری جائے، تو اِس صورت میں، جو کچھ چاہے گی کر گزرے اور اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ دُنیا پر قابض ہو کر ایک بڑی مضبوط سلطنت قائم کرے گی۔'' ۶؎

ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے ناول ''سنگم'' میں استحصال کی شکار عورت کے بارے میں لکھا ہے، جس کی دِلدوز نگاہیں مسلم کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتی ہیں اور وہ بے بسی کی تصویر بنا ماضی کے دریچوں میں اپنے اسلاف کی قربانیوں اور آنے والی نسلوں کی بیگانگیوں کو مایوسی سے دیکھتا ہے، تاریخی وتہذیبی عروج وزوال کی اِس داستان میں جتنے بھی اُتار چڑھاؤ آئے، اِن میں کہیں انسانیت معراج کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، تو کہیں پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتی چلی گئی۔ ایک نسل اور قوم کی قربانی دوسرے کے مستقبل کی بنیاد بنتی ہے، لیکن نئی نسل آبروریزی، لوٹ مار، ماردھاڑ اور استحصال کو نام نہاد انقلاب کا لازمہ سمجھ لیں، تو محض بربادی ہی حصے میں آتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مسلم، عہدِ غزنوی سے قیامِ پاکستان کے بعد ۹۱۸ برس کے طویل سفر کا نمائندہ ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے مسلم کی زبان سے تاریخی حقائق بیان کیے ہیں: ''محمد شاہ اور بھی زیادہ رنگیلا ہوتا گیا۔ عورتیں، ناچ رنگ میں محو رہتا، ہر عورت پر عاشق ہو جاتا، سونے کے ٹاپے بنوائے تھے اُن میں ننگی عورتیں بند ہوتیں، یہ ٹاپوں کے پاس جا کر پر جھاڑتا، بانگ لگاتا، ٹاپہ اُٹھا کر اندر ہو جاتا۔'' ۷؎ تاریخی ناولوں میں جمیلہ ہاشمی نے بھی 'دشتِ سوس' میں حکمرانوں کی عیاشیوں کی تصویر کشی کی ہے، جن کے لیے عورت محض سامانِ تعیش تھی: ''حامد بن عباس کا کمرۂ ملاقات خالی تھا جہاں شمعیں روشن تھیں اور نیم عریاں کنیزوں کے پرے دیواروں کے ساتھ تازہ گلاب کی بیلوں کی طرح آرائش محفل تھے، چوکیوں اور بند دریچوں کے سامنے صراحیاں اور شیشے سجے تھے۔'' ۸؎

نثار عزیز بٹ نے اپنے ناول 'نے چراغ نے گلے' میں منموہن کے الفاظ میں ہندو معاشرے پر طنز کیا ہے، جو شوہر کے مرنے کے بعد عورت کو زندہ رہنے کا حق دینے کو تیار نہیں، اِسی طرح ناول 'کاروانِ وجود' میں قبائلی معاشرے کی عورت سے برتے جانے والے ناروا سلوک اور قباحتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے دَورِ جہالت کے مسلم حرم سراؤں کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ اُن کی ذہنی وجذباتی زندگی میں عدم توازن پایا جاتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے گھر اور بچوں کو بھرپور توجہ نہیں دے پاتے جس کا نتیجہ فراریت کی مختلف راہوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ 'دریا کے سنگ' میں نثار عزیز بٹ کے خیال میں جدید قومیں، جو اپنے آپ کو مہذب تصور کرتی ہیں، اخلاقی سطح پر انتہائی پستی کی شکار ہیں۔ عورت کے حقوق کی آواز بلند کرنے والے سب سے زیادہ عورت کے استحصال کے مُرتکب ہوتے ہیں اور اسے محض تفریح کا سامان بنا لینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں

رکھتے۔ جمیلہ ہاشمی تہذیبی تناظر میں عورت کے کردار کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''گزشتہ چند صدیوں سے جو طرح طرح کے اثرات ہندوستانی عورت کی زندگی میں نمودار ہوئے تھے، وہ عالیہ کی مختصر زندگی میں بھی کارفرما تھے، مسلمان معاشرے میں مسلمان عورت کا روپ یا تو مکمل طور پر مثبت ہو گیا یا مکمل طور پر منفی، یعنی جب وہ شریف قرار پائی تو ایثار، نیکی اور وفا، ضبطِ نفس اور تعلیم جیسے سب اوصاف اس میں اکٹھے ہو گئے جب وہ شرافت کا دائرہ چھوڑ کر باہر نکلی، تو لالچ اور عیش پرستی، حسن وغمزہ، ناز وادا، شان وشوکت اور شہوانیت کی پتلی بن گئی، جب مغربی تہذیب ہندوستان میں وارد ہوئی، عورت کے کردار سے روایت دور ہونے لگی، جوں ہی شریف عورت نے گھر کی چار دیواری کے باہر قدم نکالا معاشرہ اسے مستند طوائف کی چکا چوند کر دینے والی قبیح شخصیت مفقود ہونے لگی، جدید لڑکی میں شرافت اور تنوع پھر یک جا ہونے لگے، جو ہندو تہذیب کے زیرِ اثر کٹ کر الگ الگ ہو گئے تھے۔ اب 'چراغِ خانہ' ہوتے ہوئے بھی عورت اتنی دلچسپ ہو سکتی تھی کہ شوہر کے حواس کو پوری تسکین پہنچا سکے اور ذہنی طور پر اس کی ساتھی بنے۔''[۹]

خالدہ حسین نے ''کاغذی گھاٹ'' میں مرد وعورت کی ابتدائی عمر میں تربیت کی اہمیت پر زور دیا ہے کہ لڑکی کو آغاز ہی میں پرائے گھر جانے کی تربیت دی جاتی ہے، اُن کے خیال میں ہر عورت جانتی ہے کہ اس کی بیٹی کے لیے آنے والے وقت میں کیا آزمائش در پیش آئیں گی۔ سکول میں بھی اساتذہ ایسی ہی مثالیں بچیوں کو دیتی ہیں، جن میں عورت کی قربانیوں اور تکلیفوں کا بیان ہوتا ہے، جیسے مس سیٹھی اپنے لیکچر میں کہتی ہیں: ''پدمنی کو حاصل کرنے کے لیے اس (علاؤالدین خلجی) نے ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجادی، مگر وہ راجپوت عورتیں بھی خوب تھیں کہ جوہر کی رسم ادا کرتے ہوئے جل کے راکھ ہو گئیں۔''[۱۰] ''ثمینہ'' کی ثمینہ عرف مینا کے ذریعے رضیہ بٹ نے جائے ملازمت پر خواتین کو درپیش مسائل و مشکلات کو بے نقاب کیا ہے کہ دولت کی ہوس نے اُسے ایسی شکست دی کہ وہ فرعون کی ممیوں کی طرح دولت کے انبار میں زندہ درگور ہو گئی، جہاں مردوں کی حریصانہ نگاہیں اور لاف زنی اِن کا تعاقب کیے رہتی ہیں، ان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''چند ایک ایسے بھی تھے، جن کی آنکھوں میں جنسی تشنگی تھی اور وہ جب گرسنہ نظروں سے مینا کو دیکھتے تھے، تو اِس کے سارے وجود میں سرد سرد سی لہریں اُٹھنے لگتی تھیں، جی چاہتا جوتا اُتار کر اتنی بے باکی سے اپنے اوپر مرکوز ہونے والی نظروں کو دکھا دے، لیکن وہ ضبطِ تحمل سے کام لیتی۔۔۔۔ غصہ، تو اسے پوری طرح ناصر صاحب پر آتا تھا، جن کی عمر کم از کم پچاس سال تھی، سر کے بال کھچڑی تھی اور مسلسل محنت نے جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا رکھا تھا، وہ اِس کے اندازے کے مطابق کم از کم آٹھ بچوں کا باپ تھا، لیکن جب وہ بھی اس کی طرف دزدیدہ اور بھوکی نظروں سے تک کر ہونٹوں پر زبان پھیرتا، تو اس کا جی چاہتا کہ یا تو اس آدمی کا سر پھوڑ ڈالے یا خود استعفیٰ دے کر چلی جائے، یہی حال مسعود کا بھی تھا وہ پینتیس چھتیس سالہ آدمی تھا۔ اچھی خاصی خوبصورت اور پڑھی لکھی بیوی تھی، دو بچے بھی تھے، لیکن

وہ بھی تاک جھانک کا عادی تھا، بینا سے، تو بات کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا تھا۔'' ۱۱

بلقیس ریاض کے ناول ''بادبان'' میں ازدواجی زندگی اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ میاں بیوی ایک ہی ناؤ کے سوار ہوتے ہیں۔ زندگی کے تمام اُتار چڑھاؤ، سرد و گرم اکٹھے جھیلتے ہیں، تمام مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے چھپر چھاؤں بناتے ہیں، تا کہ اولاد کو مصیبتیں نہ جھیلنی پڑیں، عارفہ اور رومادو مختلف مزاجوں کی بہنیں، چوں کہ ایک ہی ماحول کی پروردہ ہیں اس لیے شوہر پرست ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان تلخی اُس وقت پیدا ہونا شروع ہوتی ہے، جب دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرتے ہیں، خصوصاً جو شوہر اپنی مصروفیت کی آڑ میں بیوی کی طرف توجہ نہیں دے پاتے اور اپنی روزمرہ روٹین کو ہی فوقیت دیتے ہیں، اُن کے خیال میں بیوی ہی کو مفاہمت سے کام لینا چاہیے چوں کہ مرد گھر سے باہر جاتے ہیں، ملازمت میں مختلف لوگوں سے ملنا جلنا ہے، اس کا کتھارسیس کسی حد تک ہو جاتا ہے جب کہ بیوی سارا دن گھر اور گھرداری میں منہمک، تمام اُمور نبٹاتی ہے کہ وہ شوہر کے گھربار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے:

> ''عورت، تو ازل سے ہی مجبور ہے۔۔۔ آخر وہ مجبوریوں کے بوجھ میں کیوں دبی رہتی ہے، وہ اپنا حق کیوں نہیں منواتی۔۔۔ اپنی مرضی سے زندگی کیوں گزارتی۔۔۔، وہ اپنی زندگی بدل کیوں نہیں سکتی اس لیے نہ، کہ وہ مرد کے تابع ہوتی ہے۔۔۔ کمزور ہستی۔۔۔ سسکتی رہتی ہیں۔۔۔ اور آدمی چین کی میٹھی نیند سوتے ہیں وہ کیا جانے۔۔۔ ایک بے بس عورت کے دل میں کیا بیت رہی ہے۔۔۔ مجبور اور بے بس عورت، جو پھڑ پھڑا تو سکتی ہے، لیکن زندگی کی تلخیوں اور مشکلات سے فرار نہیں پا سکتی۔'' ۱۲

'دل کی چوکھٹ پر' کی کہانی خود ساختہ قانونِ وراثت کے گرد گھومتی ہے، جس میں بیٹی کو باپ کی وراثت کا حصہ نہیں دیا جاتا:

> ''یہ دیکھو وراثت کے قوانین۔ بات کے ترکے میں بیٹا بیٹی دونوں حقدار ہیں، وہ دوسری بات ہے کسی مصلحت کی بنا پر بیٹی کو بیٹے سے آدھا حصہ ملے گا۔ یہ قرآن کی رو سے ہے اور ہمارے قبیلے میں پتہ نہیں کب سے، کئی نسلوں سے یہ رائج ہے کہ باپ کے ترکے میں سے بیٹی کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ زمینیں، جائیدادیں، مال ڈنگر گھر کا ساز و سامان سب بیٹوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ آج تک ایسے ہزاروں فیصلے ہم نے خود سناڈالے اور اُن پر عمل بھی کرایا گیا۔ پھر یہ دیکھو۔ عائلی والا مسئلہ ہم نے کیسے دونوں پر مسلط کیا اور قرآن میں ہے نہ بالغ عورت پر نہ مرد پر کوئی جور و جبر نہیں۔ کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہیے۔ پر ہمارے ہاں پنچائیت کرتی رہی۔'' ۱۳

فسادات ادب کا بہت بڑا موضوع ہے اور قحط کے دُوران خواتین پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان بہت سے مصنفین کا موضوع رہا ہے۔ فضل کریم فضلی کا ''خونِ جگر ہونے تک'' میں قحطِ بنگال کے حوالے سے لکھا گیا ناول ہے، جب بنگال کی جھیلوں میں سیلاب آنے سے چاول کی فصلیں تباہ و برباد ہو گئیں، تو ہر طرف قحط پھیل گیا۔ بھوک و افلاس کی عفریت نے انسانوں کو نگلنے کے ساتھ ساتھ عزتوں و عصمتوں کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا، تو ساہوکاروں، منشیوں، زمینداروں نے اپنے ہی

گاؤں کی عزتوں کو چند دانوں کی عوض بھینٹ چڑھا دیا۔ سرکاری اہلکاروں کی لائی ہوئی امدادی کیمپوں میں پتلی گرم کھچڑی فاقہ زدوں کے لیے موت کا پیالہ بن جاتی تھی۔ فضل کریم فضلی نے ''خونِ جگر ہونے تک'' میں اُن لوگوں کا المیہ بیان کیا ہے جو تقدیر کے ہاتھوں نادار ہو کر اپنی اولاد کو دوسروں کے ہاتھوں فروخت کر رہے تھے اور کچھ لوگ جانوروں کو مجبوراً بیچ رہے تھے۔ ہاجرہ غربت و افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئی، یہ خود دار عورت ہر مرتبہ ہاتھ پھیلاتی ہے۔ فضل کریم فضلی نے سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے بنگالی مسلمانوں کی زندگی کے مختلف تجربات کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ کہانی دوسری جنگِ عظیم سے شروع ہوتی ہے اور جنگ کے خاتمے تک چلتی ہے۔ ریلیف بنک میں غریب خانے، دواخانے، یتیم خانے وغیرہ، لاشوں کے کفن دفن کا انتظام کرتے اور سرکاری لنگر خانے بھی اس طوفان اور قحط میں وبا پھوٹنے کے نتیجے میں خوراک کی مساوی تقسیم میں ناکام رہتے ہیں۔ استحصالیوں کے گروہ، جس طرح لوگوں کی زندگی سے کھیلتے تھے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، کھوکھلی نعرے بازی نے نچلے طبقے کے بنگالیوں کی زندگی کو تمسخر بنا دیا۔ گو کہنے کو تو ممتا کا لازوال جذبہ وقتی طور پر ماند پڑ گیا اور کلثوم بچی کو بیچ تو دیتی ہے، لیکن اس کی جُدائی کے غم میں زندگی کی بازی ہار جاتی ہے اِسی گھر کی دیوار کے سائے میں، جہاں اس کی لاڈلی بیٹی موجود تھی، اسی طرح غربت و افلاس کے ہاتھوں بے بس و لاچار کلثوم اپنے بیٹے کی موت پر دل ہار جاتی ہے اور چند ٹکوں کے عوض اپنی لاڈلی بیٹی کو بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے، یہ سوچ کر کہ بچی کو کھانے کو تو کچھ ملے گا، اگر زندہ رہی، تو دوبارہ مل جائے گی، لیکن مامتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ قحط و افلاس، تہذیب و اخلاق کو کھا جاتے ہیں: ''یکا یک اس کی نظر ایک بوڑھی عورت کی لاش پر پڑی، بڑھیا بالکل ننگی تھی، جسم پر ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ جبیر باپ نے منہ پھیر لیا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ بڑھیا ننگی کیوں تھی۔ ضرور کسی نے اس کے مرنے کے بعد اس کا کپڑا اُتار لیا ہوگا۔''[۱۴] قرۃ العین حیدر کے ناول 'میرے بھی صنم خانے' میں قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کرنے والوں کی بہو بیٹیوں پر، جو کچھ گزری اور جس طرح وہ استبدادی قوتوں ہندو و سکھوں کے مظالم کا شکار ہوئیں، قرۃ العین حیدر نے اس کا نقشہ بیان کیا ہے:

> ''سینکڑوں، ہزاروں ہنر مند عورتیں اور لڑکیاں زینبؓ کے نانا کی امت کی بیٹیاں، جو چلتے چلتے تھک گئی اور شرم و غیرت سے نڈھال ہو کر سڑک پر بیٹھ جاتیں، تو کوئی ان کی پروانہ کرتا، کارواں آگے بڑھتا چلا جاتا، پیچھے سے کوئی فوجی، کوئی مرد مجاہد، کوئی خالصہ کوئی بوڑھا قریب آ کر اُنھیں جلتی زمین پر رگید ڈالتا یا پھر آگے دھکیل ڈالتا۔ امریکن نامہ نگاروں کے کیمرے کلک کلک کرتے۔''[۱۵]

کرشن چندر کے ناول ''غدار'' میں ہندوؤں کی بربریت کا شکار ہونے والی مسلمان لڑکی کی دلدوز کہانی بیان کی گئی ہے:

> ''یہاں کیا راشن ملتا ہے؟، وہ نوجوان ہنسا، بولا: 'ہاں، یہاں sex کا راشن ملتا ہے!'، 'کیا مطلب'، وہ بولا: 'ایک مسلمان لڑکی ہتے چڑھی ہے۔ ہم لوگ اِس کی بے عزتی کر رہے ہیں۔' میں نے سامنے کے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا۔ مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آ کے کھڑے ہو گئے۔۔۔ 'یہ کب تک رہے گا؟' میں نے اسی نوجوان سے پوچھا۔ 'جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی؟' نوجوان نے

جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک تو میں کیو میں کھڑا رہا۔ لوگ باری باری آگے بڑھتے تھے۔ پھر
بھی کیو بہت لمبا تھا اور اِس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔'' ۱۶

قدرت اللہ شہاب نے ''یا خدا'' کے ذریعے ہندوستان سے لٹے پٹے آنے والے قافلوں پر گزرنے والے ابتر حالات کا جائزہ لیا ہے کہ ان کی سچی تصویر آنکھوں کے سامنے اُبھر آتی ہے۔ مرکزی کردار'دلشاد' جنسی ہوس پرستی وتشدد کی شکار بننے والی لڑکیوں وعورتوں کی علامت بن گئی ہے، اِس کا استحصال کرنے والوں میں ہندوؤں، سکھوں کے ہاتھوں لٹنے والیوں کی داستانیں اس وقت مزید تلخی کا شکار ہوئیں، جب وہ پاکستانی کیمپوں میں پہنچیں، تو رہبروں نے لٹیروں کے روپ دھار لیے، قدرت اللہ شہاب کے نزدیک عورت پر ڈھائے گئے مظالم کی انتہا کر دی گئی تھی، اکثریت کا محکوم اقلیتوں پر جنسی تشدد انتقام کی تسکین کا سامان حیوانیت کی انتہا ہے، لیکن ان مہاجروں کا شکار کرنے والے، خدام خلق، قوم کے لیڈر اور سیاستدان کی اصلیتوں اور ہوس پرستی کے نتیجے میں بہت سی دلشادیں اور زبیدائیں جنم نہ لیتیں:

> ''میری گنہگار آنکھوں نے کراچی کے عیدگاہ میدان میں دیکھا، جہاں بے خانمانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، یہیں دلشاد یا اس نام کی عورتیں مجھے پکوڑے تلتی، بیچتی نظر آئیں، ساتھ والی سے کہا' بہن ذرا میرے بچے کا دھیان رکھنا، میں بیسن لے آؤں' اور کسی کے ساتھ بیسن لینے چل دیں، یہ پکوڑے برسوں تلے جاتے رہے اور بکتے رہے، شاید اب بھی ان میں سے باقی ہوں۔ یہ بچے اب تیرہ چودہ برس کے ہونہار قلی، مزدور یا بھیک منگے، اس ارضِ موعود کے شہریوں میں شامل ہیں۔'' ۱۷

اس طرح بربریت کی شکار اِک لڑکی، جس نے خط کے ذریعے اپنی بپتا سنائی اور جسم فروشی پر مجبور اس عورت کے الفاظ بعینہٖ قدرت اللہ شہاب نے پیش کر دیے ہیں: ''میں ان مجبوروں میں سے ہوں، جو ہنسی خوشی پکوڑے نہیں تل سکتیں، بیسن نہیں لاسکتیں اور اس پاک سرزمین میں سینکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔'' ۱۸ مہاجر خانے میں سٹور کا مالک اپنے آرام میں خلل کے پیشِ نظر ٹھٹھرتے کانپتے، بھوکے اور نادار لوگوں کو کمبل وبستر دینے سے انکار کر دیتا۔ مسٹر مصطفیٰ خاں سیمابی نے مہاجر خانے کے لیے امداد کا سامان کیا اور دِلشاد کو رحیم خاں سے ملوانے کا یقین دِلا کر اپنے بنگلے میں لے گیا اور اپنے حج کے ارکان پورے کر کے واپس کیمپ میں چھوڑ گیا، جہاں ننھے محمود نے اپنی توتلی زبان میں دلشاد کو سمجھایا کہ زبیدہ باجی بھی موٹر میں بیٹھ کر دادا میاں کو ڈھونڈنے گئی ہے اسی طرح چیلا رام اور خوشی محمد دلال، جو کہ لٹی پٹی عورتوں اور لڑکیوں کے بیوپاری تھے، اس سانحے نے ان کا کاروبار خوب چمکایا۔ کشمیر کی اندھی دوشیزہ سیٹھ قائم علی قائم کی ہوس پرستی کا سامان ہوئی: ''یہاں دِلشاد کے لیے ہر روز ایک رحیم خاں پیدا ہو جاتا تھا، زبیدہ کے لیے ہر روز ایک نیا دادا جنم لیتا تھا، بیٹیوں کے لیے نئے نئے باپ تھے، بہنوں کے لیے نئے نئے بھائی، جسم کا رشتہ جسم سے ملتا تھا، خون کا رشتہ خون سے۔'' ۱۹ 'خاک اور خون' میں نسیم حجازی نے ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم وتشدد کا شکار ہونے والے مسلمانوں کے قافلے کی روداد اِس طرح بیان کی ہے:

> ''اگر کسی بوڑھے باپ کو درخت کے ساتھ باندھ دیا جائے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے وحشت اور بربریت کے ہاتھوں میں اُس کی نوجوان بیٹیاں، تڑپنے، چیخنے اور چلانے کے بعد ختم ہو جائیں اور پھر اُن کی لاشوں کے ساتھ بھی ___ سلیم! میں نے یہ سب کچھ دیکھا

ہے، اُنھوں نے مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ میں حیران ہوں کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں۔''۲۰

''زیتون'' بلاشبہ فیمنیسٹ سوچ وفکر کا نمائندہ ناول ہے۔'زیتون' میں تانیثی احساس اول تا آخر موجود ہے، کشور ناہید نے عورت کو درپیش آنے والی مشکلات، لوگوں کے ظالمانہ رویے اور اسے محض ایک چیز کے طور پر تصور کرنے والے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ قیامِ پاکستان کے دَوران لوٹ مار، بلوے اور اغوا کے نتیجے میں طوائف بنا دی جانے والی عورتوں کی زندگی کے المیے کی بھی شکار شریف زادیوں کو تشدد کے ذریعے کوٹھوں کی زینت بنایا گیا:

''چھوٹے قد کی اس عورت کی کمر بھی چوڑی تھی وہ اپنی کمر بے ہودگی سے نچا رہی تھی، ایک مرد، کہ جو اس کے ساتھ کھڑا تھا، بار بار چیخ کر کہتا تھا، ناچ۔۔۔ناچ۔۔۔ ننگی ناچ اور ہر دفعہ اسے وہ چھڑی سے مارتا بھی جاتا تھا۔ مار کھا کر وہ لڑکی اپنے بدن اور بازوؤں کو ایسے بل دیتی، کہ لگتا ڈانس کر رہی ہو، اس کا بدرونق چہرہ فق ہو رہا تھا اور اس کی زرد آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں۔ قاسم کو یہ دیکھ کر بڑا خوف آیا۔ اس نے سوچا اس مدقوق مریضہ کے ساتھ ان میں سے کوئی شخص ہم بستری بھی کرے گا۔ کتنے بے رحم، غیر انسانی خصلتوں کے لوگ تھے، کیا چھڑی والا شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کے مارنے اور زیادتی کرنے سے لوگوں کی حسیات بھڑک اُٹھیں گی۔ عورت کا بے روح جسم کو لچکانا، کولھوں کو مٹکانا اور ہونٹوں کو لٹکانا جاری تھا، چاروں طرف ہذیانی ہنسی کا شور تھا۔ قاسم کو لگا یہ سب لوگ اس کا مذاق اُڑا رہے تھے، ایک شخص نے انتہائی وحشیانہ طریقے پر اس کے بدن کو ہاتھ لگا کر اسے بندری کہا تھا، کچھ اور لوگ ہنسے، اُنھیں یہ کھیل اچھا لگ رہا تھا۔''۲۱

'جانگلوس' میں سکینہ کی واپسی کے حوالے سے رضا کاروں، قانون کے محافظوں کے سیاہ کرتوت بے نقاب کیے گئے ہیں:

''رضا کاروں نے اُسے ایک کنجری کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، یہ اطلاع بھی وارث ہی نے دی تھی، ماں کو پتہ چلا، تو وہ اُس کنجری سے سکینہ کو واپس لینے ہیرا منڈی پہنچی پر اُس نے واپس کرنے سے انکار کر دیا، ماں نے ناراض ہو کر شور شرابہ کیا، کنجری اور اُس کے دلوں نے ماں کو مارا پیٹا اور دھکے دے کر اپنے گاؤں سے نکال دیا۔۔۔ ایسے ذور سے اُسے دھکا دیا کہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی دُور جا کر گری کمر میں ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اُس سے اُٹھا بھی نہ گیا، زمین پر پڑی ہائے ہائے کرتی تھی۔''۲۲

مار پیٹ، ظالمانہ رُسوم، جبر و تشدد اور استحصال کے خلاف عورت کی بغاوت فطری امر ہے، اِس ردِ عمل کی عکاسی کرنے والے ناول نویسوں میں منشی پریم چند ''گئودان''، حجاب امتیاز علی ''اندھیرا خواب''، ''پاگل خانہ''، عزیز احمد ''ایسی بلندی ایسی پستی''، شوکت صدیقی ''جانگلوس''، ممتاز مفتی ''علی پور کا ایلی''، رضیہ فصیح احمد ''یہ خواب سارے''، خالدہ حسین 'کاغذی گھاٹ'، احسن فاروقی ''سنگم''، محمد سعید شیخ ''ایک اور دریا''، بلونت سنگھ ''رات چور اور چاند''، بشریٰ رحمٰن ''لازوال''، ''لگن''، ''پارسا''، اصغر ندیم سید ''آدھے چاند کی رات'' وغیرہ شامل ہیں۔ پریم چند نے ''میدانِ عمل'' میں جہاں مزارعوں اور

زمینداروں، منشیوں اور ساہوکاروں کی کشاکش کو موضوع بحث بنایا ہے، وہیں تانیثی اندازِ فکر سے کام لیتے ہوئے شوہر کے مظالم اور دھونس کے خلاف مزاحمانہ رویے کی نشاندہی کی ہے، جس میں عورت اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتی نظر آتی ہے۔ مثلاً ''میدانِ عمل''، میں ظلم سہنے والی عورت بالآخر کہہ اُٹھتی ہے: ''ایشور وہ دن نہ لائے کہ تمھاری تباہی کا باعث بنو، لیکن جلنے کے لیے خود اپنی چتا بنانا مجھے منظور نہیں، میں جانتی ہوں کہ تھوڑی سے عقل سے کام لے کر تم اپنے اصولوں کی تعمیل اور فرض کی پابندی بھی کر سکتے ہو۔'' ۲۳ مرد کی طرف سے برتی جانے والی بے انصافی کا ردِ عمل ظاہر کر کے پریم چند نے اِس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ جو مرد عورت کو کم تر سمجھتے ہوئے اُس کا استحصال اور تشدد کرنا مردانگی کا جوہر قرار دیتے ہیں وہ دراصل کمزور اور بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عورت تشدد کا سامنا کرتے کرتے بالآخر باغیانہ روش اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے دیہاتی عورتوں میں اپنے حقوق کا تحفظ اور خودداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

> ''عورت نے اسی استقلال سے کہا: 'میں تیرے گھر ت سات جنم نہ جاؤں گی۔ چاہے بوٹی بوٹی کاٹ ڈال۔' 'میں تیرا گلا کاٹ لوں گا'، 'تو پھانسی پاؤ گے'، مرد نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ مردانگی انتہائی حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس کے آگے اب وہ بھی نہ جا سکتی تھی۔ ایک لمحے میں وہ پھر کھڑا ہوا اور ہاری سی آواز میں بولا۔ 'تو چاہتی کیا ہے؟' عورت بھی اُٹھ بیٹھی اور نہ دبنے والی آواز میں بولی۔ 'میں یہی چاہتی ہوں کہ تو مجھے چھوڑ دے'، 'کچھ منہ سے کہے گی بھی، کہ کیا بات ہوئی؟'، 'میرے بھائی باپ کو کوئی کیوں گالی دے۔'، 'کس نے گالی دی تیرے بھائی باپ کو؟'، 'جا کر اپنے گھر میں پُوچھ'، 'چلے گی تب ہی، تو پوچھوں گا'، 'تو کیا پُوچھے گا؟ کچھ دم بھی ہے۔ جا کر اماں کے آنچل میں منہ چھپا کر سو رہ! وہ تیری ماں ہوگی، میری کوئی نہیں ہے، تو اس کی گالیاں سن، میں کیوں سنوں؟ ایک روٹی کھاتی ہوں، تو چار روٹی کا کام کرتی ہیں۔ کیوں کسی کی دھونس سہوں؟ میں تیرا ایک پوت کا چھلا بھی نہیں جانتی۔'' ۲۴

راجندر سنگھ بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' کی رانو جو اکثر و بیشتر شوہر اور ساس کے تشدد کی شکار ہوتی ہے، رانو جس میں بغاوت سر اُٹھا چکی تھی، ٹرنک سے کپڑے نکالے اور انجانے راستوں پر چل نکلی۔ اُسے اِس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ نسل در نسل عورت کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا رہے گا: ''بیٹی، تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان، ذرا بڑی ہوئی، ماں باپ نے سسرال دھکیل دیا، سسرال والے ناراض ہوئے، مائیکے لڑھکا دیا، ہائے یہ کپڑے کی گند میں اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے، تو پھر سڑ ھکنے جوگی بھی نہیں رہتی۔'' ۲۵

حجاب امتیاز علی نے بھی گھریلو تشدد کی نشاندہی کے علاوہ بچوں کی ذہنی نشوونما میں والدین کے کردار کی اہمیت پر زور دیا ہے، اُن کے خیال میں ماں باپ بچوں کے آدرش، آئیڈیلز ہوتے ہیں، ان کے کردار کی خرابی اولاد کے لیے سوہانِ روح ہوتی ہے۔ معاشرے کی طنزیہ اور تضحیک آمیز نگاہیں مستقبل کے خواب اور خواہشوں کو چکنا چور کر دیتی ہیں۔ ''اندھیرا خواب'' میں کم سن لڑکی صوفی کی ذہنی اور نفسیاتی اُلجھنوں کے اُنھی محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرنے والی صوفی، اپنے باپ کی شخصیت کے بدترین پہلو یعنی غیر لڑکیوں اور عورتوں میں دلچسپی، دوستانے و یارانے کی وجہ سے ذہنی

کرب کا شکار ہے، اس کا باپ اکثر و بیشتر نشے میں دُھت اس کی ماں سے دست درازی اور گالی گلوچ کرتا ہے۔ باپ کی سُرخ آنکھیں اور ماں کے آنسو اس کی روح کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ صوفی کے دل میں باپ کے خلاف نفرت شدید ہو جاتی ہے اور وہ تمام مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے، اکثر ماں سے بھی شکایت کرتی ہے کہ وہ کیوں اپنے شوہر کے غصہ، مار پیٹ کو برداشت کرتی ہے، حالاں کہ اُس کی ماں اس کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے۔ ماں کی اس مجبوری کا ادراک کسی حد تک صوفی کو ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس دل میں ترحم کی جذبات بھی جنم لیتے ہیں۔ باپ کی بے راہ روی کا خمیازہ یہ لڑکی نفسیاتی طور پر بھگتتی ہے۔ شریف اور سلجھے ہوئے مردوں کی طرف اس کا میلان کم اور بُروں کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ باپ جسے وہ نیک و مضبوط سمجھتی تھی ہوش مند ہونے پر اس کی اخلاقی بُرائیوں سے آگاہ ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ انتقاماً وہ ایسے شخص کی اسیر ہوتی ہے، جو بد کردار، شرابی، مجرم اور چور ہوتا ہے، اس کی نفسیاتی توجیہہ یہ بھی ہے کہ لاشعوری طور پر وہ باپ کی تصویر دل میں بسائے ہوتی ہے۔ باپ سے شدید محبت کی بنیاد پر اس کے کردار کی خرابی سے خائف۔ الیکٹرا کمپلکس کی شکار اس لڑکی کے لاشعور میں یہ بات ٹھہر جاتی ہے کہ بچپن میں اُس سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہوا تھا، جس کی پاداش میں اُس کا باپ نہ صرف اس کی ماں پر تشدد کرتا ہے، بلکہ خود اس کو بھی نظر انداز کرتا ہے۔ باپ کی پیدا کردہ تلخیوں کی وجہ سے یہ بچی تمام عمر خوف اور عدم تحفظ کی شکار رہتی ہے۔ حجاب امتیاز علی کا یہ ناول ان کے تانیثی شعور اور بالیدگی احساس کی علامت ہے۔ روحی اور شوشوئی کی گفتگو میں روحی کے خیالات کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

> ''قانوناً باپ روٹی مہیا کرتا ہے، لیکن اکثر وہ قانون کی حکم عدولی کرتا دیکھا گیا ہے۔ ایسی کٹھن منزل پر ماں ہی اُسے روٹی مہیا کرتی ہے، پھر باپ کا حق اور اس کا وجود برائے نام ہی رہ گیا نا؟۔۔۔ زمانے کے ساتھ عالمی قانون پر نظرثانی کی اشد ضرورت ہے، خصوصیت سے اس زمانے میں عورت آپ اپنی کفیل ہو رہی ہے اور بہ وقتِ ضرورت اپنے بچوں کی بھی کفیل ہوتی ہے۔'' ۲۶

بلونت سنگھ کا ناول ''رات، چور اور چاند'' میں دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، خصوصاً نوجوان لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی اور جنسی گراوٹوں کو بھی بے نقاب کیا ہے، خصوصاً منہ بولی بہن جنتو سے ناجائز تعلقات قائم کرنے والے شخص کو نشانۂ تنقید بنایا ہے:

> ''اس کا مکان پُر اسرار تھا، بیوی بچے تھے نہیں، اپنی زمین تھی، گائے، بھینس بھی پالتا تھا، رشتے داروں میں ایک اُس کے رشتے سے بہن تھی جنتو، جو اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس نے بہن ہی کو گھر میں بسا لیا ہے۔ علانیہ یہ بات کسی کو کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی ایک بار گاؤں سے پرے مرا ہوا نوزائیدہ بچہ پایا گیا، ان دنوں جنتو بیماری کے بہانے کئی روز تک بستر پر پڑی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ اس نے جنا ہے، بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے، کہ جنتو خود ڈاکے ڈالنے کے لیے ہوتی ہے۔'' ۲۷

عصمت چغتائی نے ''ٹیڑھی لکیر'' میں ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی ہے، جسے ماں باپ کی توجہ اور محبت نہیں ملتی، بچوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ لڑکی بہن بھائیوں کے رحم و کرم پر پروان چڑھتی ہے اور انتقاماً ہر کسی کو تنگ کر کے نفسیاتی سطح پر

اپنے لیے تسکین کا سامان کرتی ہے:

''بڑی آپا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آ کر وہیں ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھی۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے میں دوڑ گئی، کچھ یونہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خرانٹ ساس اِس کے منہ پر بار بار حقارت سے اِس گزرے ہوئے سانپ کا تمسخر اڑاتی۔ وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطرے کی حدود سے نکل رہی تھی، اسی لیے تو اس نے کٹھن زمانہ گزارنے کے لیے میکے بھیج دیا تھا کہ کچھ کو باپ بھیوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔ وہ اب اسے اپنا ہم عمر سمجھنے لگی تھی بات بات پر اُسے گردن توڑ بخار کی طرح چڑھتے ہوئے بڑھاپے کی طرف متوجہ کر کے رہی سہی زندگی بھی نچوڑ لینے کی کوشش کرتی۔ بڑی آپا ایک زندہ شہید کی طرح سر اونچا کیے خاموش رہ جاتی۔ اُسے اِس ساس سے کافی نفرت تھی، یہی تو وہ ڈائن تھی، جس نے شادی شدہ زندگی کے تین مختصر سال طعنوں اور اعتراضات سے حد درجہ مکدر بنا دیے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ دُنیا اتنی مختصر زندگی لے کر آئے گی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ آخر ایک دن وہ ہوگی اور اُس کا میاں، اگر اُسے اُس دن کی خبر ہوتی تو بڑھیا کے منہ پر خاک ڈال اِن تین سالوں کو کلیجے سے لگا رکھتی۔ بڑھیا اکلوتے بیٹے پر دیوانی تھی، مگر جب کبھی وہ بیوی کی طرف زیادہ راغب نظر آتا تو جل کر خاک ہو جاتی۔'' [۲۸]

عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں عورت و مرد کی جنسی گراوٹوں کو موضوع بنایا ہے، اس میں عورت اپنے شوہر کی جنسی بے راہ روی اور غیر عورتوں سے تعلقات کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے فیصلہ کرتی ہے کہ اگر مرد جنسی گراوٹوں اور معاشقوں کو اپنا حق سمجھتا ہے، عورت بھی اخلاقی پستی پر اُتر سکتی ہے، اِن کے خیال میں جنسی جذبہ دونوں افراد پر یکساں غالب آتا ہے اور ناآسودگی کا ردِ عمل بھی دونوں میں یکساں اور یقینی ہے، ناول میں یہ کردار لاحاصلیت اور بے علیت کا شکار ہیں، مثلاً آوارگی کا شکار مشہدی اپنی بیوی کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ انتقاماً مشہدی کے راستے پر چل نکلتی ہے، اُس کا شوہر اسٹیٹس کے چکر میں اُسے افسروں اور دوستوں سے ملواتا رہتا ہے، لیکن جب بیوی کی توجہ کسی اور کی طرف مبذول ہوتی ہے، تو اپنی تمام اخلاقی بُرائیوں کے باوجود اُسے اپنے غیض و غضب کا نشانہ بناتا ہے۔ جواباً مشہدی کا حد درجہ احترام کرنے والی اُس کی بیوی اُس کی آوارگی اور سے تنگ آ کر اُس کے مدِ مقابل آ جاتی ہے: ''تو ہو گا حرامزادہ، ذرا زبان سنبھال کے بات کر، مجھ کو اپنی لونڈی سمجھ لیا ہے خود تو اول درجے کا چھٹا ہوا آوارہ بدمعاش ہے اور اُلٹا ہر وقت میری جان کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔'' [۲۹] زبیدہ خاتون کے ناول ''ہما'' کی نیلوفر نے شادی بیاہ کے معاملات میں شخصی آزادی کا نعرہ بلند کیا ہے: ''جب ایک شریف مرد منگنی کر کے بڑی آسانی سے توڑ سکتا ہے، تو یقیناً یہ حق اِک لڑکی کو بھی ہے اس میں کوئی بُری بات نہیں ہے، اکثر شادی ہو جانے کے بعد بھی علیحدگی ہو جاتی ہے، عورت کو بھی پوری اجازت ہے۔'' [۳۰]

عبداللہ حُسین نے ناولٹ ''نشیب'' میں مرد کے ہاتھوں عورت کے قتل اور عورت کے ہاتھوں مرد کے قتل پر بھی عورت ہی کو قصوروار ٹھہرائے جانے کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ طرفہ معاشرہ ہمیشہ عورت ہی کو ہر جرم کی وجہ قرار دیتا ہے:

''جب ایک مرد اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگا کر اُسے ہلاک کر دیتا ہے تو وہ عورت ساری خدائی کی نظروں میں بدکار ہو جاتی ہے۔۔۔ جب مرد عورت کو ہلاک کرتا ہے، تو بھی عورت بدکار ہوتی ہے، جب عورت مرد کو ہلاک کر دیتی ہے تو بھی وہ بدکار ہوتی ہے۔ عدالتیں صرف جرم کا فیصلہ کرتی ہیں۔ عورت کی بدکاری مسلم ہوتی ہے۔۔۔ مردوں کی نظروں میں تو وہ بدکار ہوتی ہے، ان عورتوں کی نظروں میں بھی بدکار ہو جاتی ہے، کتنا بڑا ظلم ہے۔ اِس کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔'' [۳۱]

شوکت صدیقی کا ناول ''جانگلوس'' سماجی استبداد اور چیرہ دستیوں کی داستان ہے، جس میں ہر طبقے خصوصاً نچلے طبقے کے مسائل اور مشکلات کے علاوہ نفسیات کی بھرپور عکاسی کی ہے، بعض جگہ شاداں جیسی عورت استحصال کا انتقام لیتی نظر آتی ہے۔ وہ بالے کو قتل کر دیتی ہے، جس کی خاطر وہ اپنا گھر بار اور بال بچے چھوڑ آئی تھی۔ شاداں کو مارتا پیٹتا تھا اور جو پیسے وہ اپنی بھینس کا دودھ بیچ کر اور نمبردار کی کوٹھی میں کام کر کے حاصل کرتی تھی، چھین لیتا تھا اور کئی کئی مہینے غائب رہتا، شاداں اس کے اِس رویے سے تنگ آ گئی اور ایک روز سوتے میں اُس کا گلا کاٹ کر اُسے مار ڈالتی ہے اور رحیم داد کی مدد سے کوٹھڑی ہی میں گڑھا کھود کر اس کی لاش دفنا دیتی ہے:

''کہتا تھا شاداں! تیرے بنا زندہ نہیں رہ سکتا، ریل کے نیچے لیٹ جاؤں گا، گلے میں پھندہ ڈال کر مر جاؤں گا۔ عورت کے لہجے میں تلخی بڑھتی چلی گئی، اُس کا چہرہ وحشت ناک ہو گیا' جھوٹا مکار، مجھے چھوڑ کے اُس کنجری کے ساتھ چپکے سے نکاح کر لیا، ہفتوں نہ آتا، ہتھ پھیلائے ہوئے، کچھ لیے بنا نہ ٹلتا، میں جان بوجھ کر دھوکہ کھاتی رہی۔۔۔ اُس نے ایک ایسی بات کہی، میں غُسے سے پاگل ہو گئی۔ چھری دیکھ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا، جب ہنس چکا، تو منہ ٹیڑھا کر کے بولا، بوڑھی ڈھگی کے گلے پر تو کسائی چھری چلاتا ہے، میں ایسا کام نہیں کرتا، کسائی کے پاس چلی جا جج میرے حوالے کر دے، سُنا توں نے۔'' [۳۲]

ممتاز مفتی نے ''علی پور کا ایلی'' میں ایلی کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے واقعات کا مرقع مذکورہ ناول میں پیش کیا ہے، جو کہ نفسیاتی ناول کی بہترین مثال ہے۔ ناول میں مفتی نے داخلی مکالمہ نگاری کو بروئے کار لاتے ہوئے ایلی کے کردار کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ شہزاد مردوں کے ساتھ خصوصاً ایلی کے ساتھ اٹھکیلیاں اور ہنسی مذاق، تو کرتی رہتی ہے، لیکن اس کے اندر کی عورت زندہ ہے، جسے عزت کی زندگی درکار ہے۔ اپنی ان کیفیات کا اظہار ایلی سے بڑے دُکھ بھرے انداز میں کرتی ہے۔ مفتی نے شہزاد کی زبان سے اس کی ہر کسی کے ساتھ دلگی، چھیڑ چھاڑ اور دامِ اُلفت میں پھنسائے رکھنے کے مشغلے کی وضاحت کی ہے کہ ماضی کے تلخ حقائق مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں، اس کے شوہر کے معاشقے لاشعوری طور پر شہزاد کو باغیانہ انتقام پر اُکسانے کا سبب بنے۔ جس کا برملا اظہار کرتی ہے:

''یہ میری بدقسمتی ہے، خاوند ملا، جو پہلے ہی کسی کی محبت میں پاگل تھا، اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں، جب بھی وہ میرے پاس آیا، تو اس کی نگاہ میں میں نہیں انور ہوتی تھی، گویا وہ اور انور اکٹھے ہوتے تھے، وہ انور۔۔۔ وہ یوں ہنستی جیسے چینی کا پیالہ تڑقتا ہے اور میں

میں،تو کہیں تھی ہی نہیں، اکیلی ساتھی کے بغیر انور سے ملانے کے لیے مجھے استعمال کیا جاتا تھااور اب تم ہو۔۔۔تم سادی کو بھولنے کے لیےتم۔۔۔ مجھے استعمال کر رہے ہو۔''۳۳

''یہ خواب سارے'' میں مختلف طبقے کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کی حقیقتوں کو رضیہ فصیح احمد نے بڑے جامع اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے، یہ کردار زندگی کی محرومیوں کا حل تلاش کرتے نظر آتے ہیں، مثلاً سمن جو پی ایچ۔ڈی کی طالبہ ہے، نیشنل ویمن اسٹیڈی پروگرام کے تحت ہونے والی کانفرنس کی رُوداد بتاتے ہوئے، جس میں ہنری جیمس کی سوانح کا حوالہ دیتی ہے، جس کالُبِ لباب یہ ہے:'' آج کی عورت اپنے بدن سے شرمسار نہیں ہے، وہ اس پر اپنا حق چاہتی ہے، اس کی چھاتیاں اس کے بچوں کی ملکیت نہیں ہیں، اس کی کوکھ اس کی اپنی ہے، اس لیے اسے بچہ پیدا کرنے یا گرانے کا حق ہے اور جنس میں صاف گوئی اور ایمانداری، فرسودہ روایات سے زیادہ اہم ہے۔''۳۴

بانو قدسیہ کے ناول ''حاصل گھاٹ'' میں ارجمند، جو نئے خیالات کی مالک ہے، اس کے والد کے ساتھ بیٹے اور بیٹی کی محبت کے حوالے سے سوال کیا گیا، کہ دونوں میں سے کسے زیادہ چاہتے ہیں، باپ کی رائے کے مطابق اس کی بیٹی مردوعورت کے حیاتیاتی فرق اور جداگانہ رولز کو نہیں سمجھتی:

> ''ہر وہ آدمی، جو Male chauvanism میں یقین رکھتا ہے، ایسے ہی سمجھتا ہے۔ابو کہ مرد مظلوم ہے اور عورت اب آپے سے باہر ہو رہی ہے۔۔۔یہ عورت سے بے انصافی ہے سراسر بے انصافی۔۔۔صدیوں سے مرد نے عورت کو Domestic servent کی طرح استعمال کیا ہے ابو۔۔۔اب تھوڑا سا ہاتھ ہٹا کر کیسے چیں چیں کرتا ہے اور تو اور باپ بھی اس Discrimination میں شامل ہو گیا ہے، وہ بھی بیٹی کا ساتھ نہیں دے سکتا، کیوں کہ وہ بھی بالآخر مرد ہے۔''۳۵

اِسی طرح کشور ناہید نے ناول ''زیتون'' میں کیرل کے الفاظ میں اپنی فیمینسٹ سوچ پیش کی ہے اور عزت یا غیرت کے نام پر قتل ہونے والی قبائلی لڑکی کے مارے جانے کے محرکات پر گہرا طنز کیا ہے:

> ''عورت ابتدائے آفرینش سے ہر زمانے میں ہی قتل ہونے کی ہی دعوت دیتی رہی ہے قتل زنا بالجبر استحصال، مار، دھمکیاں، وراثت سے محرومی، گویا ہر طرح کی غلامی، بے عزتی اور دُکھ، تو عورت کے لیے قدرت کی طرف سے دی گئی سزائیں بن جاتی ہیں۔ بھلا، اس قبائلی لڑکی نے کون سے ایسی خطا، ایسی حرکت، ایسی غلطی کی تھی، کہ اسے یہ سزا ملی! کیا وہ کسی غلط آدمی سے عشق کرنے لگی تھی یا پھر اسے محض انتقام کا نشانہ بنایا گیا ہے، اس کے بھائی نے شائد اپنی بیوی کو قتل کیا ہو اور اس بیوی کے رشتہ داروں نے اسے مار دیا ہو۔۔۔ اس قتل کے، تو کئی محرکات ہو سکتے ہیں۔''۳۶

''لازوال'' میں بشریٰ رحمٰن نے شہباز کے بزدلانہ اور غیر مساوی رویے کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ نایاب کے رویے پر بھی تنقید کی ہے کہ اگر وہ مزید قوتِ برداشت سے کام لیتی، تو شاید نوبت گھر ٹوٹنے تک نہ پہنچتی، کیوں کہ اسے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے تھی کہ ہمارے سماج میں عورت کو ہی سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔عورت ہی گھر بناتی ہے، مرد چند

لمحوں میں اس عمارت کو ڈھا سکتا ہے۔ مرد کے اس غیر ذمہ دارانہ اقدام کو عائلی زندگی کے لیے زہرِ ہلاہل قرار دیا ہے۔نایاب کی ماں ''خدیجہ بیگم'' بھی طبقۂ نسواں کا فرد ہے، جسے آنکھ کھولتے ہی زندگی کے اُلجھاوؤں میں ناحق اُلجھنا پڑا، اگر چہ اس کا باپ جانتا تھا کہ خواجہ عبدالقدوس کی آمدن کم ہے اور وہ مزاج کا بھی تلخ ہے، پھر بھی بیٹی کو اس سے بیاہ دیتا ہے، یہاں بیٹی کی مرضی خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں اس کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتی: ''کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے، اس کے منہ میں بھی زبان ہے، اس کے بھی جذبات ہیں، وہ بول سکتی ہے، وہ سہہ سکتی ہے، سب لوگوں نے اُسے صرف سننے کا آلہ سمجھ رکھا ہے۔''۳۷

اصغر ندیم سید نے ''آدھے چاند کی رات'' میں بروکن فیملیز کے مسائل کو موضوع بنایا ہے، ماہ رُخ، بشیر احمد سکول ٹیچر اور اس کے شوہر بشیر احمد کی علیحدگی ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس کا شوہر رنگین مزاج ہونے کے علاوہ شادیاں رچانے کا شوقین ہے۔ ماہ رُخ اُس سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ وہ ماہ رُخ کو خلع کے بعد شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ صرف اُسے دھمکیاں دیتا ہے، بلکہ سکول پرنسپل کے سامنے اُسے بدکردار اور ادارے کے لیے بدنامی کا داغ قرار دیتا ہے، اُس کا شاگرد عامر کا باپ فیصل بھی جو اُس سے شادی کا دعوے دار ہوتا ہے، اس کے ساتھ وقت گزاری کے بعد مصروفیت کی آڑ، باہر جا کر بھول جاتا ہے اور وطن واپس آنے پر پھر ماہ رُخ سے رابطہ بحال کرنا چاہتا ہے، جس پر ہو برملا کہہ اُٹھتی ہے: ''بہت دیر ہو چکی ہے فیصل صاحب، میں کتاب نہیں ہوں، جسے آپ جہاں رکھ کے گئے تھے وہیں پڑی ہوئی ملے گی۔''۳۸ ڈاکٹر صادق کمال نے ناول ''خانم'' کی ابتدا 'حوا کی ایک بیٹی کے نام' کے موضوع سے کی ہے، جس میں عورت کی معصومیت سے لے کر عورت کی سنگدلی تک کی منازل کو تحریر کیا ہے، آیا اِسے تعریف، تخلیق، تنقید یا تذلیل کے زمرے میں لیا جائے گا، بیان سے قاصر ہیں: ''جو میری زندگی میں ایک خواب بن کر داخل ہوئی، جس کی معصوم مسکراہٹوں نے مجھے ابدیت کا پیغام دیا، جس نے نہ بچھڑنے کی قسم کھائی، لیکن شادی کے بعد اُس کی حیران کُن نظروں نے مجھے یہ احساس دِلا دیا کہ زہر، چھری، تباہی، موت اور عورت ایک ہی چیز کے مختلف روپ ہیں۔''۳۹ سلمیٰ کنول کے ناول ''دل کی چوکھٹ پر'' میں بے جا سماجی رسم و رواج کی بھینٹ چڑھنے والی عورتوں کا المیہ پیش کیا گیا ہے:

> ''میری شادی بھی تو رسم و رواج کو نباہنے کے لیے ہوئی تھی۔ دیور موجود تھا۔ گھر کی عزت گھر میں رکھنا مقصود تھا۔ نہ عمر دیکھی نہ مزاج۔ کچھ ملتا بھی ہے یا نہیں۔ بڑے کڑوے اور ترش سے لہجے میں فرحت نے تفصیل اُسے بتا دی۔ روایات کی خاطر سولی پر چڑھا دیا، دونوں ہی کو، زندگیاں ہی ختم کر دیں دونوں کی کوئی دیور جیٹھ موجود نہ ہوتا تو میں بھی سفید لباس اور ننگی کلائیوں کے ساتھ منحوس کہلاتے ہوئے میکے کے گھر میں زندگی گزار رہی ہوتی، اِس طرح بھی زندگی عورت کی فنا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا یہی مقام ہے اور یہ عزت قدر اور یہی قیمت۔''۴۰

مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں عورت بہ حیثیتِ انسان تسلیم کرنا چاہیے۔ عورت کیا سوچتی ہے، اِس کی نفسیاتی اُلجھنیں کیا ہیں۔ مرد و عورت کی نفسیات میں کیا فرق ہے اور مرد کے حاکمانہ رویے کا خمیازہ عورت کس انداز میں بھگتتی ہے۔ صنفی امتیاز برتنے والے استحصالی رویوں کی بہت سے ناول نگاروں نے عکاسی کی ہے اُن میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، بانو قدسیہ

عزیز احمد، محمد سعید شیخ، کشور ناہید، اے آر خاتون، نثار عزیز بٹ، خالدہ حسین، رضیہ بٹ وغیرہ شامل ہیں۔ عصمت چغتائی مردانہ حاکمیت والے معاشرے کی نفی کرتی ہیں۔ وہ ہراُس رویے کی مذمت کرتی ہیں، جس کے مطابق عورت کو کمتر و کمزور گردانا جاتا ہے، وہ عورت کے بارے میں قائم کردہ مفروضات کو بھی قابلِ اعتراض سمجھتے ہوئے احاطۂ تحریر لائی ہیں:

> ''پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں۔ شاید اِس طرح خود ان کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا، بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، مگر عورت؟ عورت اِس حاکم کی طرح جو پُرجا کا چاکر بن کر انھیں الو بناتی ہے، اس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پراسرار ہیں! بجائے شرمندگی کے اسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔''[۴۱]

انتظار حُسین نے عورت کو کمتر سمجھے جانے کے تصور کی نفی کرتے ہوئے ''چاند گہن'' میں اُس کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ عورت وہ خفتہ طاقت ہے، جو معاشرے کو استحکام بخشتی ہے: ''یہ بھی آکر مغالطہ ہی نکلا کہ میں عورت کو شکست دے سکتا ہوں مجھے دُنیا کی ہر کمزور طاقت نے شکست دی۔ عورت بھی دُنیا کی ایک کمزور طاقت ہے۔''[۴۲]

''راجہ گدھ'' بانو قدسیہ کا ادبی شہکار ہے۔ اِس میں انسانی ذہن پر اثر انداز ہونے والی سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو موضوع بنایا ہے اور حلال و حرام کا فرق کو واضح کرتے ہوئے رزقِ حلال کی اہمیت اُجاگر کی ہے۔ رزقِ حرام ہو یا حرام کاری، بانو قدسیہ کے خیال میں، انسانی جین میں منفی تغیر و تبدل کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ بانو قدسیہ معاشرے میں موجود جرائم اور خودکشی اور اخلاقی بیماریوں کا مؤجب رزقِ حرام کو ہی قرار دیتی ہیں، ان خیال میں رزقِ حرام نسلوں کی بربادی، دماغی خلل، ذہنی انتشار کا باعث ہوتے ہیں۔ افراد کے علاوہ یہ نسلوں کی بربادی کا سبب بھی بنتے ہیں، اِن کے خیال میں سماجی و اخلاقی حدود و قیود سے آزادی، سماجی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ احساسِ تنہائی اور ناآسودگی ایسے افراد کی ذات کا بہت بڑا المیہ قرار پاتا ہے، اُنھوں نے جذبات و احساسات کو دھوکا دینے والے دوغلے انسانوں کو گدھ کے مشابہہ قرار دیا ہے، جو مُردار کھاتا ہے، بانو قدسیہ کے خیال میں شخصی نفی اور ذات کی تذلیل لذت کا باعث بن جائے تو جسم کی حرمت اور عزت کا تصور ختم ہونے لگتا ہے اور بعض مرد اِس تلخی سے بچنے کے لیے شراب و شباب کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن تاحیات ناآسودگی کا زہر اُن کے وجود میں سرائیت کر کے روح کو کھوکھلا کر دیتا ہے:

> ''مرد کو اپنی شناخت کے لیے تخلیق میں شناوری کی بھی ضرورت رہتی ہے، وہ اپنے آپ کو منوانے کے لیے بڑے جتن کرتا اور پاپڑ بیلتا ہے، جب ایک بار انا کا کوبرا آپ کے پیچھے لگ جاتا ہے، تو پھر اس سے جان بچانا مشکل ہے، لیکن عورت بچے کے سہارے، اس کی پرورش کے چتوا پکڑ کر اس کے مسائل میں کھوئی اپنی ذات سے نجات پالیتی ہے، چوں کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، عورت کو بھی وہ ساری Depression، Frustration تنہائی، ٹوٹ پھوٹ کی ضرورت ہے، جو پہلے صرف مرد کا مقدر تھا، پہلے عورت کے لیے دردِ زہ کافی تھا، اب اس نے دردِ دل اور غمِ روزگار بھی پال لیا ہے اور غزل کے شعر کی طرح اپنی چھوٹی سی کائنات میں طوفان اٹھائے پھرتی ہے۔''[۴۳]

عابدہ کی زبان سے بانو نے ایسے شوہروں کی تنقید کی ہے، جو اپنی بیویوں کو توجہ اور محبت سے محروم رکھتے ہیں، اُن کی بیویاں بالآخر نا آسودگی کی زہرناکی سے نجات پانے کے لیے غیر مردوں میں دلچسپی لیتی ہیں اور دوستیاں گانٹھنا شروع کر دیتی ہیں۔ عابدہ کی زبان سے بانو نے بیوی کی خواہشات اور آرزؤں کو بیان کیا ہے۔ سیمی کی ماں کا کردار ایسی مجبور عورت کا ہے جو اپنا گھر بچانے کی خاطر اپنے شوہر کی متضاد شخصیت میں ڈھلنے کی کوشش میں خود بھی متضاد ہو جاتی ہے، اِن دونوں کی عدم توجہی سے ان کی بیٹی انتشار، بدنظمی اور محرومی کا شکار ہو جاتی ہے، جو بعد میں تمام سماجی و اخلاقی حدوں کو توڑ کر اور لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور جسمانی تعلقات پیدا کرنے کی صورت میں سامنے آتا ہے، اس کی انتہائی حد اُس وقت سامنے آتی ہے، جب سیمی خود کشی کر لیتی ہے، اپنی ماں کی مجبوری اور اپنے باپ کی عیاشی کو بخوبی سمجھتی ہے، اس کا باپ اپنی بیوی کو شراب اور محفلوں میں جانے پر مجبور کرتا ہے، اس کی ماں، اگرچہ ان باتوں کے بہت خلاف ہے، لیکن تضاد کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے، لیکن اپنی بیٹی کو اس آگ سے بچانا چاہتی ہے، لیکن بے سود: ''تھوڑ دلے مرد کی ایک نشانی ہے صاحب جی، وہ عورت کو ضرورت کی ہر چیز لا دیتا ہے، لیکن عیاشی کا کوئی سامان نہیں کرتا، زیور، کپڑا، سینما، پھول، تعریف سب اس کے لیے بیکار چیزیں ہوتی ہیں۔''[۱۴۹]

بشریٰ رحمٰن نے اپنے ناولوں میں عورت کی نفسیات، جذبات و احساسات کی عکاسی کے علاوہ سماجی و تہذیبی عوامل کی بھی نشاندہی کی ہے، جو رسوم و رواج کی صورت اختیار کرتے ہوئے ہمارے رویوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، ''لگن'' تانیثی احساس لیے ہوئے ہے، اگرچہ بظاہر یہ ایک عام کہانی ہے، جس مین ایک امیر زادی اپنے بے راہ رویوں، آزاد خیالی اور مادر پدر آزادی کی وجہ سے جگہ جگہ معاشقے لڑاتی ہے اور بے جا لاڈ پیار سے بگڑی ہوئی اپنی ضدی اور خود سر طبعیت کے لیے سامانِ راحت پیدا کرتی ہے۔ ناول ''پیاسی'' کا بنیادی موضوع محبت میں دھوکہ ذلت و رسوائی اور جگ ہنسائی کا باعث بنتا ہے، اس کے علاوہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ گھر والوں کے بے جا لاڈ پیار اور ہٹ دھرمی، اُولاد کی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کر دینے سے خواہشات بے لگام ہو جاتی ہیں اور انسان بھٹکنے لگتا ہے، اِس ناول کے مرکزی کردار آمنہ اور حماد ہیں۔ بجیلہ کا کردار ایک زمیندا گھرانے سے ہے، جو اپنی دوست ڈولی کے بھائی عابد حسین کی محبت کی اسیر ہو جاتی ہے۔ عابد حسین محض وقت گزاری کرنے والا ایک خود غرض انسان ہے، اسی طرح متوسط طبقے کی سکینہ کی شادی امیر گھرانے میں ہوتی ہے، تو اسے اپنے گھر بار، ماں باپ، بہن بھائیوں میں عیب ہی نظر آنے لگتے ہیں، اس کا یہ احساسِ کمتری اس وقت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ اپنے ہی گھر میں سو عیب نکالتی ہے۔ ''لگن'' کی مرکزی کردار فلک ناز ایسی ہی امیر زادی ہے، جو ماں باپ کی عدم توجہی کی وجہ سے اپنے ہی گھر میں کم سنی میں گھریلو ملازم کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے، اس کی ماں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مادیت پرستی اور عیش پسندی فلک ناز پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اونچے طبقے کی آزاد خیال یہ لڑکی آفاق نامی شخص سے ضد میں آکر شادی، تو رچا لیتی ہے، لیکن جلد ہی بیزار بھی ہونے لگتی ہے۔ آفاق اپنے تئیں اس کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتا ہے اور اسے گھر کے کام کاج کرنے پر مجبور کرتا ہے، اِس کا رویہ بیوی کے ساتھ بڑا سخت ہوتا ہے۔ قدم قدم پر وہ اس کی تذلیل بھی کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ صرف نکاح کے دو بول عورت کو اس قدر مجبور بنا دیتے ہیں اور آدمی اتنا بڑا حاکم بن جاتا ہے کہ اس کی مرضی و آرزو کا کچھ خیال بھی نہیں کرتا۔ ناول ''پارسا'' کی کہانی دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے خاندانوں کے گرد گھومتی ہے۔ ایک طرف وحیدہ عرفان اور عرفان اللہ مسلم گھرانہ ہے، تو دوسری طرف ٹینا

اگروال اوراحسان اگروان کا عیسائی گھرانہ ہے۔ پارسا، جو کہ ایک نڈر، بے باک اور منہ پھٹ اور آزاد خیال لڑکی ہے، جو والدین کی بے جا آزادی اور لاڈ پیار کا نتیجہ ہے۔ روایت سے بغاوت کرنے والی تھی۔ تسخیر کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مشرقی آدابِ زندگی کو منافقت کا نام دیتی ہے، جب کہ ڈیوڈ قدم قدم پر اسے ڈانٹتا، دھتکارتا رہتا ہے مذہب و روایت سے بغاوت اور تضحیک کا احساس خالی پن اور مایوسی پیدا کرتا ہے اور اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔ ٹیٹا اگر وال اپنے بیٹے کو قصور وار سمجھتی ہے اور ممکن سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ شادی میں سمجھوتہ بہت اہمیت رکھتا ہے، ایک دوسرے کو سمجھنے اور عزت دینے سے زندگی کا یہ سفر آسان ہو جاتا ہے۔ یورپی ممالک میں بین المذاہب ہونے والی شادیوں اور ان کی ناکامیوں کی وجوہات اور ان کے نتیجے میں آنے والی نسل، جو خمیازہ بھگتتی ہے: ''آخر عورت کے بارے میں یہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے، کہ وہ صرف کھانا پکانے اور بچے پیدا کرنے کے لیے دُنیا میں بھیجی گئی ہے۔'' ۴۵ ''شرمیلی'' میں سونیا کی تقدیر میں مرد کی حاکمیت والے معاشرے کی اپنی تقریر میں نشانۂ تنقید بناتی ہے، اِس طرح شرمیلی (شفو) اولیس سے ایک روز شادی کرتی ہے اور اپنے شوہر سے صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ اس کی دستِ نگر ہو کر اپنی زندگی نہیں گذارنا چاہتی، اِس لیے کبھی ،اگر وہ اِس کے کیریئر میں حائل ہوا، تو وہ راستہ بدل لے گی او محبت جال بھی اُس کے ارادوں کو نہیں توڑ سکے گا:

> ''گھر میں مرد فقط محبت کا سہارا اِس لیے نہیں کہ وہ اس لفظ کا سنہری پنجرہ بنا کر اس میں اپنی بے وقوف بیویوں کو عمر قید کی سزا دیں، لیکن خود باہر نکل کر کیا کرتے ہیں۔ سارے کوٹھے انھی شادی شدہ مردوں کے دم سے آباد ہیں۔ ہوٹلوں اور رستورانوں میں یہ اپنی معشوقاؤں کے ساتھ پائے جانے اور دفتر کے اوقات میں زیادہ تر کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی لڑکیاں اِن کی امین ہوتی ہیں۔'' ۴۶

محمد سعید شیخ کے ناول ''ایک اور دریا''، ''رنگِ جہاں'' اور ''اقبالِ جُرم'' میں عشق و رقابت، لڑائی جھگڑے بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کرتے ہوئے واقعاتی صداقتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ زمینداروں وڈیروں، کسانوں اور نو دولتیہ طبقے کی بُرائیوں کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔ مزید برآں، اُنھوں نے کرداروں کی نفسیاتی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے اور انسانی تضادات کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ عورتوں پر گھریلو تشدد، نسوانی کرداروں میں جنسی ناآسودگی، عورت کو اس کے جائز حق سے بھی محروم کرنا، اُسے تہمتوں کی بھینٹ چڑھانا تانیثی طرزِ فکر کی نمائندگی ہے۔ ''ایک اور دریا'' کا شیدا جس نے چوہدری کی ایما پر عرفان کی ماں کو قتل کیا تھا۔ جیل ہونے پر اس کی بیوی عرفان کو اپنی دامِ فریب میں مبتلا کر لیتی ہے، شوہر سے دُوری کی وجہ سے جذباتی ہیجان سائے کی صورت اختیار کر جاتا ہے، جس کا اظہار شیدے کی بیوی ان الفاظ میں کرتی ہے: ''شیدا آ جائے، تو میں ٹھیک ہو جاؤں گی، جن عورتوں کے مرد اُن کے پاس ہوتے ہیں نا، اُن پر کبھی سایہ نہیں آتا۔'' ۴۷ اِسی طرح ایک جنگی قیدی کی بیوی بشریٰ کن مصائب کا شکار ہوتی ہے، اتنی بربریت اور انسان سوز سلوک دیکھ کر دل پر جمود طاری ہو جانے کی وجہ سے اکثر فوجی سرد مہری و بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں: ''مجھے، تو وہ کھوکھلا ملا تھا، جس میں سے زندگی کا ہر جذبہ نکال لیا گیا تھا، میں نے اسے زندہ کرنے کی بہت کوشش کی، کبھی بیوی بن کر، کبھی ماں بن کر، کبھی اپنے جسم سے، کبھی پیار سے، کبھی اپنی ممتا سے مگر اس کی راکھ میں کوئی چنگاری نہیں تھی۔'' ۴۸

عورت کو ہراساں کرنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنے والی ہر عمر کی لڑکی، عورت خواہ وہ تعلیم، روزگار

یا خریداری کے لیے جاتی ہے، اُسے مردوں کی حریصانہ نظروں، کٹیلے جملوں اور تعاقب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کے اس رویے کی مذمت بہت سے ادیبوں نے کی ہے۔ کشور ناہید نے ''زیتون'' کا ترجمہ کرتے ہوئے جنسی طور پر ہراساں کیے جانے پر کڑی تنقید کی ہے، مثلاً کیرل امریکن لڑکی جو میجر فرخ کی بیوی ہے، اُسے قبائلی بڑی بے باکی سے نظروں میں تولتا ہے، تو اُس میں پیدا ہونے والے جنسی خوف و ہراس کی شکار اُس عورت کی کیفیات کی عکاسی اس طرح کی ہے:

''اب اس کی آنکھیں اسی بے شرمی اور بے رحمی کے انداز میں عورت کے وجود میں اُتر رہی تھیں، کیرل کو پہلی دفعہ خوف میں ملبوس بے عزتی کا طمانچہ لگتا محسوس ہوا، اس کی نظریں اس وحشی کی طرح اس کے بدن کو روند رہی تھیں، ان کی نظر میں وہ ایک گائے، ایک بندریا، مرد کے مقابلے میں ایک حقیر شے ایک بے چہرہ فرد اور ایک وہ شے کہ جس کو جب چاہو، جیسا چاہو استعمال کرو اور پھینک دو۔'' ۴۹

اے آر خاتون نے ناول ''تصویر'' میں انسانیت کے اعلیٰ درجے پر عورت ہوتی کہ مرد، عورت پر مردوں کے جور و ستم اور رویوں کی بدصورتی اور مرد و عورت کی کرپشن اور متشددانہ رویے کا موازنہ کیا ہے:

''کیا مرد اپنے دشمن سے انتقام نہیں لیتے، عورت تو پھر بھی صبر کر کے خاموش ہو جاتی ہے، لیکن مرد تو فوراً مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، سینکڑوں عورتیں ایسی ہیں، جو اپنے اوپر جبر کر کے شوہروں اور اُن کی دوسری عورتوں کے بے جا مظالم برداشت کرتے کرتے اپنی زندگی ختم کر دیتی ہیں اور اپنی زبان سے اُف نہیں نکالتیں، کیا کوئی مرد اتنا حوصلہ کر سکتا۔ وہ تو اگر اپنی بیوی کو کسی غیر مرد سے ہنس کر بات کرتے ہوئے دیکھ لے تو جان لیے بغیر نہ چھوڑے۔'' ۵۰

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں عورت مختلف روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کہیں وہ شرافت و شرم و حیا کا پیکر نظر آتی ہے، کہیں اچھے گھرانوں کی پڑھی لکھی اور تمیز و تہذیب کے زیورات سے آراستہ ہے، کہیں طوائف و بکاؤ مال کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ وقت کے جبر کا شکار یہ عورتیں محبت و توجہ کی متلاشی ہیں، لیکن اونچی سوسائیٹی کی پروردہ عورت مردوں سے بحث و مباحثہ کرتی جام لنڈھاتی اور سگریٹ، شراب پیتی ہے۔ قراۃ العین حیدر نے ''آگ کا دریا'' میں معاشرتی اور تہذیبی زوال کی عکاسی کی ہے۔ ناول میں چمپا مڈل کلاس عورتوں کی علامت بن جاتی ہے، جو پڑھی لکھی اور باشعور ہیں۔ انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے پھر بھی اظہار محبت میں ہچکچاہٹ کا شکار ہے اور اس وجہ سے گمنامی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے، ہندوستانی عورت کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کہا جاتا ہے عورت، تو محض دُکھ سہنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس میں عورت کی عظمت ہے، جس کی ساری عمر مرد کے ٹہل کرنے میں بیت جاتی ہے اور پھر بھی مرد اس سے خوش نہیں ہوتے، پتی ورتا عورتیں، بال ودھوائیں، یتیم لڑکیاں، جن کو ورثہ نہیں ملتا عورت جو گائے کی طرح بے زبان ہے، جو ستی ہو کر جل مرتی ہے کہ اسی میں اس کی شان ہے، مگر چمپا کو دیکھو، جو خود جل مرنے کی بجائے دوسروں کو جلا جلا کر مارتی ہے۔ ۵۱

''میرے بھی صنم خانے'' میں قرۃ العین حیدر نے عورت کی ذہنی و معاشی اور سماجی آزادی کے علاوہ مردوں کے بنائے

سماج کی زیادتیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ''گردشِ رنگِ چمن'' کی مشہور خانم اور نگار خانم، ''آخرِ شب کے ہمسفر'' کی اُوما اور ''چاندنی بیگم'' کی بیلا ان حوالے سے اہم نام ہیں، گھٹن زدہ ماحول کی پروردہ بیشتر متوسط و غریب گھرانوں کی عورتیں مالیخولیا، ہسٹریا، تپ دق اور سیل جیسے مرض میں مبتلا نظر آتی ہے، لیکن بعض مقامات پر ہی عورتیں محبِ وطن بھی ہیں۔ معاشرت و سماج کے استحصالی رویے کے پیشِ نظر عام عورت کے احساسات کی نمائندگی اس طرح کی گئی ہیں: ''ہمارے سماج میں زیادہ تر عورتوں کی زندگیاں ہمیشہ سے ٹریجک رہی ہیں اور انھیں مزید بیوقوف بنانے کے لیے، اُنھیں ستی ساوتری' وفا کی پتلی' ایثار کی دیوی کے خطاب دے دیے جاتے ہیں اور وہ خوش ہو جاتی ہیں۔'' ۵۲؎

عزیز احمد نے 'آگ' میں گھر کی چار دیواری میں مقید عورتوں کی توہم پرستی کا ذکر کیا ہے، وہ جن بھوتوں، بدروحوں اور آسیب پر یقین رکھتی تھیں، اس کے علاوہ اس میں لکھنوی میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ پہلوانوں کی کشتی، امام مہدی کے جشنِ ولادت کی رونق، شبِ برات کے علاوہ شادی بیاہ، ولادت، مجلس عزاداری وغیرہ کا بیان بھی ہے، اسی مناسبت سے بھانڈ اور بہروپیے بھی موجود ہیں، جعلسازی سے کام لینا والا ایک کردار عبداللہ ہے، جو اپنے جعلی دستاویز کے ذریعے طرح طرح کے غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، نواب صفی اپنے بڑے بھائی کو جائیداد سے محروم کرنے کے لیے قتل کروا ڈالتا ہے، جہاں تک نسوانی کرداروں کا تعلق ہے، تو ان کا دائرہ کار محض گھر اور چولہے چوکے تک محدود ہے، یہی وجہ ہے جب کوئی اُفتاد پڑتی ہے، تو یہ خواتین اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر پاتیں، یہی فضلی سونے کے زیورات، جو سکندر جُو نے اپنی ایک رات کی دلہن کے چُرائے تھے، اُن کے عوض اپنے گھر کی چار دیواری میں اپنا جسم بیچ دیتی ہے، جب کہ سکندر جُو کی دلہن بتول اپنے شوہر کی آوارگی سے بےخبر تمام رات محو رہتی ہے: ''بتول کے چہرے سے صرف ایک کیفیت نمایاں تھی، انتظار کی کیفیت، خواب میں بھی وہ انتظار کر رہی تھی، جس طرح کشمیر کی عورت، ایشیا کی عورت ہمیشہ انتظار کرتی رہتی ہے۔'' ۵۳؎

اے۔ آر خاتون نے ''افشاں'' میں جائنٹ فیملی سسٹم، مشترکہ خاندانی نظام کی قباحتوں کو موضوع بنایا ہے۔ مزید برآں، جدید طرزِ زندگی کے خواہاں اپنے ملک کو تیاگنے والوں اور اُن سے وابستہ لوگوں کی زندگی کے المیے کو موضوع بنایا گیا ہے، جانے والے بیرونِ ملک تعلیم اور روزی کے لیے جانے والے عام طور پر وہاں کی رنگینوں اور مصروفیات میں کھو جاتے ہیں، پیچھے رہ جانے والوں ہیں اُن کی نگاہیں ہر وقت دروازوں پر لگی رہتی ہیں، خصوصاً بچے باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں، اِن کی شخصیت میں خلا رہ جاتا ہے، ''افشاں'' میں علی رضا اور اس کا متاثرہ خاندان کے اس کرب سے گزرتا ہے۔ ''افشاں'' میں پاربتی کچوری والی کا بھی ذکر ہے، جو صبح صبح لوگوں کے گھروں میں پوری، کچوریاں لاتی تھی، لاوارث تھی بچپن میں شادی ہوئی اور اُسی زمانے میں بیوہ ہو گئی، اس نے تمام عمر محنت و مشقت سے روزی کمائی اور ایک روز اپنی ہی کوٹھڑی میں دم توڑ گئی، کوئی بھی اس کا پُرسانِ حال نہ تھا، ایک روز جب کوٹھڑی سے بدبو کے بھبھوکے اُٹھنے شروع ہوئے، تو اہلِ محلہ نے پولیس کو بلوا کر دروازہ توڑا۔ اے۔ آر خاتون نے ''تصویر'' میں ایسے نوجوانوں کا نقشہ کھینچا ہے، جو جدید تعلیم اور اپنے معاملے میں جدید طرزِ فکر کے، تو پیروکار ہیں، لیکن عورت کے بارے میں اِن کے رویے وہی جاہلانہ اور دقیانوسی چلے آ رہے ہیں، جن کے مطابق عورت کم تر درجے کی چیز ہے اور پاؤں کی جوتی ہے، جسے کسی بھی وقت کسی بھی بہانے سے بدلا جا سکتا ہے، اسی بات کو اے۔ آر خاتون نے نجمی کی زبان سے کہلوایا ہے:

''ہاں ٹھیک ہے ہندوستانی عورت، گویا ایک بے جان چیز ہے، تم نے یہ بہانہ کر دیا کہ

والدہ کو راضی کرنا تھا، ڈپٹی صاحب نے مجبوری بتائی کہ پہلی بانجھ تھیں، اولاد کے لیے دوسری شادی کی، رضوی صاحب نے فرمایا ان کی پہلی بیوی کے بچے زیادہ ہو گئے وہ بڑھیا معلوم ہونے لگیں، کہیں ساتھ جاتی ہیں، تو لوگوں کو اماں کا شبہ ہوتا ہے، شوکت کو اپنی پہلی بیوی پسند نہیں تھی، عسکری صاحب نے عذر کیا کہ اُن کی بیوی بیمار زیادہ رہتی ہے۔''۵۴

اِس مسئلے کی نشاندہی نثار عزیز بٹ نے'' کاروانِ وجود'' میں بھی کی ہے: ''مرد اپنی زندگی کی سمت خود متعین کرتا ہے، جب کہ عورت کے لیے یہ ممکن نہیں۔''۵۵ مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں صنفی امتیاز برتنے کی مذمت کی ہے کہ مرد و عورت ایک جیسے انسان ہیں، کمتری و برتری کے رویے سماجی اختراع ہیں: ''یہ جو معاشرے سراسر مرد کے حق میں قوانین وضع کرتے رہتے ہیں اور عورت کو پابند بناتے رہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت اور فطرت عورت کی طرف دار ہے، اس کا خون، اس کا دودھ پوری انسانیت کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔''۵۶

خالدہ حسین نے'' کاغذی گھاٹ'' میں دُہریت کے شکار مرد کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے، ایک طرف ظاہری ٹپ ٹاپ ہے اور دوسری طرف دماغ کا خنّاس، زمانہ شناس اور چرب زبان اور دوسروں کو جلد اپنی باتوں کا اسیر کر لینے میں ماہر ہے لیکن یہ ظاہرداری زیادہ عرصہ قائم نہیں رہتی، جلد ہی اُس کی شخصیت کا بدنما پہلو بے نقاب ہو جاتا ہے:

> ''یہ سب ذرّے ہیں انھیں آفتاب مت سمجھ اور دُنیا کمینے لوگوں سے بھری پڑی ہے، یہ تمھیں بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوگا، وہ حسن کی تلخی سے لرز جاتی، یکدم وہ اسے ایک عام سطحی انسان نظر آنے لگتا، سب لوگوں کی طرح، باوجود یہ کہ وہ روحانی کیفیات اور باطنی واردات کا شناسا تھا، مگر بنیادی طور پر وہ بھی ایک عام، کمینگی کے قریب قریب پہنچ جانے والا شخص تھا۔ وہ جس میں سنگدلی بھی تھی اور دوسروں کی تحقیر کرنے کی ترغیب بھی۔ متلی کا ایک مرغولہ اس کے گلے میں اُٹھتا۔ کاش وہ اس سے نہ ملی ہوتی۔''۵۷

بانو قدسیہ نے ناول'' حاصل گھاٹ'' میں'' ارجمند'' کے ذریعے اپنے موّقف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ صدیوں سے مرد نے عورت کو گھر میں مرد نے اپنی حاکمیت کے بل بوتے پر غلام بنا کر رکھا ہے۔ اِسی طرح'' شہرِ بے مثال'' میں مرد کے حوالہ سے مروجہ نظریات پر طنز کیا ہے، کیوں کہ مرد اپنی ہر خامی کو کیموفلاج کرنا اپنی مردانگی کے عین مطابق سمجھتا ہے، اسی طرح انوری پر ڈھائے جانے والے مظالم کے حوالے سے رشو کا یہ کہنا ہے:

> ''یہ ساری دُنیا مرد کی ہے، یہاں عورت ڈھور ڈنگر کی طرح ہے، ذرا پھن اُٹھایا، تو پتھر مار کر کچل دی جائے گی، ذرا خدمت گزاری سے کام نہ لیا، اطاعت نہ کی، نیک پروین بن کر نہ دکھایا، تو تھڑی تھڑی ہو جائے گی، اِس میں عافیت ہے کہ کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر اندھیاریاں پہنے اسی ڈگر پر چکر لگاتے وقت گزر جائے، گادی والے کو علم نہ ہو کہ بیل اس گردشِ پیہم سے تھک گیا ہے۔ بیل کے اندر بھاگ جانے کا ہر دا نہیں، اس کھلی فضاؤں میں اکیلے پھرنے کی سکت نہیں ورنہ وہ اس رُوں رُوں کی زندگی کو کبھی کا چھوڑ جاتا۔''۵۸

کشور ناہید ناول'' زیتون'' میں نوجوان لڑکیوں کی بوڑھوں سے شادی، پرانی دشمنیوں کو ختم کرنے کا اور قرض کے خاتے

کا شاخسانہ بن جاتی ہے۔ مرد کی حاکمیت کے حوالے سے کشور ناہید لکھتی ہیں:

''مرد کو کل طاقت، سمجھنے کی بے رحم عادت، کہ جو قرن ہا قرن سے ستم گاری کی راکھ بکھیرتی ہوئی عورتوں اور مردوں کی آسودہ اور ناآسودہ خواہشوں کو نوحوں میں بدلتی رہی تھی، یہ بالکل اسی طرح تھا، جیسے تاریخ کے رُخ سے نقاب الٹو، تو ایک نسل کی دوڑ کی خواہش سارے زمانوں میں عورتوں کو کم درجے کی مخلوق بنا کر ہی لذت حاصل کرتی ہے۔'' ۵۹

''خوبصورت'' میں بشریٰ رحمٰن نے عورت کو خلاف مخاصمانہ رویے اور سماجی ناہمواریوں کی نشاندہی کمال مہارت سے کی ہے۔ مرد کی حاکمانہ طبعیت کی شکار ''کیسریٰ'' تمام عمر مجازی خدا سمجھنے کے باوجود اس کی توجہ اور محبت سے محروم رہتی ہے اس کا خیال ہے: ''مرد کا کردار اور عادات واطوار ہی بالآخر عورت کو مسخر کر لیتے ہیں، ضروری نہیں کہ ہر اچھی شکل کے پیچھے اچھا مرد ہو۔'' ۶۰ اسی خیال کو فرخندہ لودھی نے ''حسرتِ عرضِ تمنا'' میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے: ''بیٹی عورت کا مقدر ایک سے زیادہ جیون ہیں، ایک سے زیادہ مرن۔'' ۶۱ رفعت مرتضٰی نے بھی ''آدم کی پسلی'' میں نصرت احمد اور فوزیہ کے مابین گفتگو میں حقوقِ نسواں کو اُجاگر کرنے اور کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات کے ذریعے سے بھی اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

''شوہر ہمارے جسم و جان کے مالک، ہمارے دِل و دماغ کے مالک ہماری سوچ ہمارے خیالات کے مالک کتنی عورتیں ہیں، جو اپنی مرضی سے کسی کو خط بھی نہیں لکھ سکتیں اپنے ماں باپ کو بھی نہیں، پہلے انھیں شوہر سے اجازت لینی پڑتی ہے، خود میرے خط میری ساری ڈاک، کاغذات میرا شوہر کھول لیتا ہے، جب چاہے اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیتا ہے، اِس لیے یہ اِس کا حق ہے، مجھے کوئی چیز، کوئی انسان، اچھا نہیں لگنا چاہیے، اگر وہ میرے شوہر کو ناپسند ہے، میں اپنی مرضی سے تنہا کہیں جا نہیں سکتی، نوکری نہیں کر سکتی، اس لیے کہ میرے شوہر کی اجازت نہیں۔'' ۶۲

عورت پر جنسی تشدد اور دیگر سماجی مسائل، جن میں لڑکے، لڑکیوں کے رشتے، تعلیم و تربیت کے مسائل، مشترکہ خاندانی نظام کے مسائل و مشکلات کالج کی لڑکے، لڑکیوں کی بے راہ روی، معاشقے، ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل، جائے ملازمت پر جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کے واقعات باس اور لیڈی سکیرٹریوں یا اسسٹنٹوں کو باس کا اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے، شادیوں کا جھانسہ دے کر لوٹنا، سوتیلے باپ کا سوتیلی بیٹیوں کو حرص و ہوس کا نشانہ بنانا اور عورت کو بہ حیثیتِ ملکیت اور کٹھ پتلی سمجھنا۔ معاشرتی المیہ ہے، محرم رشتوں کے تقدس کی دھجیاں بکھرنے والے ناسور عناصر بہت سے قلم کاروں کے ہاں بے نقاب ہوئے ہیں، مثلاً رضیہ بٹ نے 'اِک لڑکی' میں سوتیلے باپ کی ہوس کی آگ بجھانے میں ناکامی پر ردِعمل بیان کیا ہے:

''لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ اِس بات کی تشہیر میں کبھی نہ ہونے دوں گا، سمجھیں، تم دونوں نے کسی کے سامنے اشارتاً بھی کوئی لفظ منہ سے نکالا، تو میں تم دونوں کو شوٹ کر دوں گا اور یہ بھی سُن لو کہ تم اس گھر ہی میں رہوگی، اگر یہ سوچ لیا ہے کہ ماں بیٹی یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤ گی اور یوں میری بدنامی کا باعث بنوگی، تو میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا، تمھاری بیٹی

جا سکتی ہے، لیکن تم میری بیوی کی حیثیت سے یہاں سے باہر قدم نہیں لے جا سکتیں۔'' ۶۳؎

فاطمہ مبین کا ناول ''ایرانی'' میں شاہد محمود، جو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ فلرٹ کرنے میں گزار چکا ہے، دوست واحباب کے کہنے پر نیلوفر شاہد سے منگنی پر بظاہر رضامند ہو جاتی ہے، کیونکہ اُس کے پیشِ نظر اُس کے ماں باپ کی خوشی اور عزت ہوتی ہے، اِس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی شادی پر راضی ہو جاتی ہے، لیکن پچھتاوے کی آگ اُسے کسی پل چین نہیں لینے دیتی کیوں کہ شاہد محمود کا ماضی اُس کے سامنے عیاں تھا:

> ''نیلوفر نے یہ سمجھ کر اپنی رضامندی دے دی تھی کہ آہستہ آہستہ شاہد سے محبت کرنے لگے گی، مگر اُس کو ہر کوشش میں ناکامی ہوئی، بجائے اُنسیت اور محبت کے اُس کی وحشت بڑھنے لگی۔ شاہد کے نام پر اُس کو جھرجھری سی آجاتی اور وہ اُس کے خیال سے گھبراتی، وہ جنجال سے نکلنے کی بجائے دلدل میں پھنس گئی تھی، جتنا اوپر اُبھرنے کی کوشش کرتی اُتنی ہی گہرائی میں جاتی معلوم ہوتی۔ منگنی ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ کوئی رات ایسی نہ جاتی تھی جب نیلوفر اپنے کیے پر پچھتاتی اور آنسو نہ بہاتی۔'' ۶۴؎

عموماً مرد کی جبریت اور بے رُخی کی شکار گھریلو عورت کے لیے اِس جبر کو سہنا اور گوارا کرنا حاصلِ زندگی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت سے زندگی بسر کرتی ہے، جس کی ہر جنبش مرد کے مزاج، پسند و ناپسند اور حکم کی تابع ہوتی ہے۔ حکم کی بجا آوری میں تاخیر و تبدل مرد کو ناگوار گزرتی ہے۔ اِس تانیثی رویے کے نمائندہ ناول نگاروں میں اہم نام جمیلہ ہاشمی ''تلاشِ بہاراں''، بلقیس ریاض ''بادبان''، عزیز احمد ''ایسی بلندی ایسی پستی''، شوکت صدیقی ''خدا کی بستی'' عبداللہ حسین ''رات''، ''باگھ''، بانو قدسیہ ''حاصل گھاٹ''، زبیدہ خاتون ''ہما''، کشور ناہید ''زیتون''، محمد سعید شیخ ''ایک اور دریا'' اور الطاف فاطمہ ''دستکشانِ محفل'' ہیں۔ رفعت مرتضیٰ ''آدم کی پسلی'' میں نصرت احمد اور فوزیہ کے مابین گفتگو میں حقوقِ نسواں کو اُجاگر کرنے اور کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات کے ذریعے سے اپنا مدعا بیان کیا ہے:

> ''اِک لڑکی، جو اپنے گھر کو، ماں، باپ کو، بہن بھائیوں کو چھوڑ کر آجائے، ایک نئے گھر اور ماحول میں اِس کا اُسرا، اِکا سہارا اِس کی قوت اور اعتماد اِس کا شوہر ہوتا ہے، اگر وہی اِس کو کہہ دے کہ وہ، تو اِس کے لیے کچھ بھی نہیں، وہی اِس کو کہہ دے کہ اِس کی خواہشوں کا احترام وہ نہیں کرتا، کبھی بھی، کسی بھی وقت، کیسے بھی حالات میں اِس پر ترجیح دیتا ہے، تو پھر اس لڑکی کے پیروں تلے کوئی زمین رہے گی کیا؟'' ۶۵؎

بلقیس ریاض کے ناول ''بادبان'' کا کردار عاطف اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے، وہ محسوس کر لیتا ہے کہ اسے اپنی بیوی کو توجہ و محبت دینی چاہیے:

> ''روما، تمھارے جانے کے بعد مجھے واقعی احساس ہوا، میں تمھیں بہت چاہتا ہوں، شدت سے، بلکہ اپنی روح کی گہرائیوں سے، تم میری نس نس میں میرے دل و دماغ میں حکومت کرتی ہو، یقین جانو، زندگی میں پہلی بار میں سنجیدگی سے پریشان ہوا ہوں، مجھ سے کوئی کام نہ ہو سکا وہ گھر، اُداس دکھائی دیتا تھا، خدا کے لیے اب کبھی گھر چھوڑ نہ آنا، ٹھیک ہے، میری بھی

غلطی ہے، میں تمھاری طرف سے بے پروائی برتتا رہا، لیکن یہ تم نے کیسے جان لیا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا تھا، محبت، جو میرے سینے میں دفن تھی، تمھارے جانے کے بعد اپنی تمام تر طاقتوں سے باہر نکلی اور تم کو واپس لانے کے لیے اُکسانے لگی، تم نے روما مجھے میرے غرور میری انا کو شکست دی ہے، پگلی تم میرا ادبان ہو، مجھے کیوں چھوڑ کر چلی آئی۔'' ۶۶

جمیلہ ہاشمی ''تلاشِ بہاراں'' میں ہیروئن کنول فکر انگیز تحریک کی پیروکار ہے، جس کا مقصد ''انسانیت بچاؤ'' ہے۔ کنول تمام عمر مرد کی قائم کردہ برتری کے خلاف سراپا احتجاج بنی رہی اُس نے سیاست اور تعلیم کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور ثابت کیا کہ جب شوہر ظلم و ستم اُٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑے، تو سُسرال والوں کے لیے اُس کی بیوی ایک آسان شکار بن جاتی ہے، جس کے خلاف کسی بھی وقت لاف زنی کی جاسکتی ہے۔ تشدد کیا یا کروایا جاسکتا ہے۔ شوبھا جب اپنے ظلم کی داستان ایڈیٹر کے نام بھیجتی ہے، تو مایوسی کے عالم میں لکھتی ہے:

''تم مرد ہو اور مردوں کے خلاف کوئی بھی بات سن کر یقیناً بھڑک اُٹھو گے، کیا کروں کہ عورت کی کہانی میں مرد کا نام بار بار آتا، اِس کہانی کی تکمیل اور تخریب مرد کے نام سے ہے۔ آخر خدا کسی اور طریق سے بھی دُنیا بنا سکتا تھا، اسے حوا کو آدم کی پسلی سے نکال کر کیا ملا، دیکھتے ہو دل کے قریب سے، جو امانت نکلی اس کا کیا حشر کر رہا ہے وہ۔'' ۶۷

سلمیٰ کنول کے ناول ''اِس دیوانگی میں'' خاندانی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ہونے والی شادیاں کو موضوع بنایا گیا ہے:

''عورت کا ایک ہی روپ ہوتا ہے بہو بیگم! محبت! اور محبت قربانیوں کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتی۔ 'کیا؟' سمن چونکی۔ یہ وہی الھڑ سی پہاڑن بول رہی تھی۔ 'میرا ایک ہی بھائی ہے۔ بہو بیگم اور اس سے مجھے بوت پیار ہے۔' سمن ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئی تھی۔ گل خانم بھی پاس ہی زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ 'اُسے اپنے گاؤں کی پشمینے سے پیار ہو گیا اور ہمارے ہاں تب رستہ ہوتا ہے، جو کسی کی لڑکی لیں تو اپنے بدلے میں دیں اور جس کے ہاں لڑکی نہیں ہوتی وہ پھر پیسہ دیتے ہیں، ہاں! بعض بعض علاقوں کے ایسے رسم و رواج ہوتے ہیں۔'' ۶۸

جسم فروش عورتوں اور طوائفوں کی طرزِ زندگی اور نفسیات ادب کا اہم موضوع رہی ہے، ان میں خاندانی پیشہ ور طوائفیں بھی ہیں، شادی کا جھانسے میں آکر گھر بار چھوڑنے والی لڑکیاں، جن کے لیے واپسی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جسم کا سودا کرنے والی عورتیں، قحط و فسادات کے دوران بربریت کی شکار دھندے پر مجبور کی جانے والی عورتیں مشغلے کے طور پر یا عادتاً جسم فروشی کرنے والی کرپٹ عورتیں، شرافتوں کے لبادوں میں یہ گھناؤنا کاروبار کرنے والی عورتوں کے نمائندہ ناولوں میں مرزا ہادی رُسوا ''امراؤ جان ادا''، فضل کریم فضلی ''خونِ جگر ہونے تک'' قرۃ العین حیدر ''میرے بھی صنم خانے''، عزیز احمد ''آگ''، قدرت اللہ شہاب ''یا خدا''، شوکت صدیقی ''جانگلوس''، ''چار دیواری'' کشور ناہید ''زیتون''، ڈاکٹر سلیم اختر ''ضبط کی دیوار''، بانو قدسیہ ''راجا گدھ''، زبیدہ خاتون ''نادرہ'' اور رضیہ بٹ کا ''اِک لڑکی'' اہم ہیں۔ مرزا ہادی رُسوا کا ناول 'امراؤ جان ادا' معاشرتی المیے اور تہذیبی نوحے کا غماز ہے۔ کم عمری میں باپ کے دوست دلاور کے

ہاتھوں انتقاماً اغوا ہونے والی معصوم بچی امیرن، لکھنؤ کے بازار میں بیچ دی جاتی ہے۔ خانم کا کوٹھا لکھنؤی تہذیب کی بہت سی جھلکیاں لیے ہوئے ہے۔ اغوا شدہ لڑکیوں، خورشید، امیرن وغیرہ کے علاوہ خانم کی بیٹی بسم اللہ بھی اپنے فن کے جوہر دکھاتی ہے۔ امراؤ اکثر سوچتی ہے کہ اسے تو زبردستی طوائف بننے پر مجبور کیا گیا ہے، لیکن بسم اللہ تو خانم کی اپنی بیٹی ہے اُس نے اس رستے پر اُسے کیوں لگایا، یہی امراؤ جب اپنے پڑوس میں گانے کے لیے جاتی ہے، تو گھر کو پہچان لیتی ہے، لیکن اس کے گھر والے سب کچھ جاننے کے باوجود اس سے آنکھیں چُرا لیتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی گود میں پلنے والا لاڈلا بھائی اس پر قاتلانہ حملہ کر دیتا ہے۔ اغوا شدہ اس لڑکی کو معاشرہ تو کیا خود اس کے گھر والے سماج کے خوف سے اپنانے کو تیار نہیں ہوتے:

> ''ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دِل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھُسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں میں گر پڑوں، وہ گلے لگا لیں گی، مگر جُرأت نہ ہوتی تھی، اِس لیے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے بہت ہی پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے! صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ اُدھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں اُن کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ ایک نظر دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے!۔''[۶۹]

''آگ''، وادیِ کشمیر میں سیاحوں کے ہاتھوں کھلونا بننے والی عورتوں کی داستان ہے، جن کی جسم فروشی کے دھندے میں اُن کے شوہر، باپ اور بھائی بھی سرپرستی کرتے ہیں مثلاً فضلی کے حوالے سے عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''فضلی کا حسن بڑا ملکوتی تھا، لیکن سرشت شیطانی تھی، ہر گاہک مزدور موقعہ دیکھ کے کوئی چھیڑ کی بات کرتا، وہ منہ بناتی، امدو نے بہت سُراغ لگانا چاہا، مگر اُس کے کسی یار کا پتہ نہ چلا۔ اُس کے باپ نے اُسے ایک آدھ کے ہاتھ ایک آدھ رات کے لیے بیچنا چاہا، مگر اس سے زیادہ خود اُس کی ماں شیرنی بن کے رجبا کو وہ گالیاں دیتی اور چیخ چیخ کر سارا محلّہ سر پر اُٹھا لیتی کہ پھر رجبا کو ایسی کوئی تجویز کہیں کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔''[۷۰]

شوکت صدیقی نے ''چار دیواری'' میں بیسویں صدی کے اوائل کے لکھنؤ کے انحطاط پزیر جاگیردار طبقے کے گھریلو ماحول اور معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے، اس میں نوابانِ اودھ کی روایتی تعیش پسندی، طرزِ بود و باش، عادات و خصائل رسوم و رواج اور توہم پرستی اور ضیف الاعتقادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی ایسے گھرانے کے گرد گھومتی ہے، جن کا خاندانی وقار اور طنطنہ تو چھن گیا ہے، لیکن ظاہر داری کا بھرم قائم ہے۔ نواب تقی کی بیوی، چوں کہ جہیز میں کئی گاؤں، مکانات اور قیمتی زیورات و جواہرات لائی تھی، اِس لیے ان میں فکرِ معاش تو دامن گیر نہ تھی۔ نوکروں کی بہتات و فراغت اُن کا زیادہ تر وقت طوائفوں کے کوٹھوں اور بالا خانوں میں بسر ہوتے، اِن کے چھوٹے بھائی نواب صفی بگڑے رئیس تھے اور پیسے پانی کی طرح بہاتے، یہی عیاشی اور طوائف الملوکی اِن کی تباہی کا سبب بنی، چوں کہ بے عملی کا شکار تھے اور ہاتھ سے کام کرنا عار سمجھتے تھے۔ چار و نا چار اپنی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کے لیے بھڑوے بن جاتے تھے:

> ''خدا بخشے نواب صاحب مرحوم کو میں نے کتنا کہا کس کسی طرح نہ سمجھایا، مگر وہ تو اُس وقت ہوا

کے گھوڑے پر سوار تھے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ ساری جائیداد رہن رکھ دی، میرا زیور تک نہ چھوڑا اور جب ڈگری ہوئی اور قرقی گھر پر آئی، تو خود شرم سے زہر کھا کر سدھار گئے، مجھے اِن بچے بچیوں کو دُکھ جھیلنے کے لیے چھوڑ گئے، جس فخر النسا بیگم کی کسی نامحرم نے آواز تک نہ سُنی تھی، اب خانگی کہلاتی ہے، جوان بیٹیوں کی خرچی کھاتی ہے، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔''[۱]

''راجہ گدھ'' میں بانو قدسیہ مرد و عورت کی جذباتی خیانت کے اور جنسی گراوٹ کے حوالے سے حلال و حرام کے تصور اور نظریات پیش کیے ہیں، جو صحیح معنوں میں طبی و اسلامی نقطۂ نظر سے حقائق پر مبنی ہے:

''مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی Gene کو متاثر کرتا ہے۔ رزقِ حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے، جو خطرناک ادویات، شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزقِ حرام سے، جو Gene تغیر پذیر ہوتے ہیں، وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے، بلکہ نا اُمید بھی ہوتے ہیں۔ نسلِ انسانی سے یہ Genes، جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں، تو اِن Genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے، جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو، رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں ایسا ہوتا ہے، من حیث القوم رزقِ حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے، وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں، کیوں اب بتاؤ یہ بات مغرب کے علم سے مستعار ہے کہ مشرق سے۔''[۲]

سلیم احمد کا نفسیاتی ناولٹ ''ضبط کی دیوار'' دو کرداروں ارشد اور سرفراز کے گرد گھومتا ہے، جو کہ متوسط طبقہ کے عام نوجوانوں کے نمائندہ ہیں۔ سرفراز اُونچے طبقے کی تقلید میں قریب قریب تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، جب کہ ارشد کی مجبوری اور جھجک، اس کی گھریلو تربیت، مذہبی ماحول، اس کے آڑے آتے ہیں۔ دونوں کی شخصیات تضاد کی شکار ہیں۔ اس میں تیسرا اہم کردار طوائف کا ہے، جو جسم فروش ہے اور دھندے ہی سے روزی روٹی کماتی ہے، اس کا بیٹا جوان ہونے پر اس سے نفرت کرتا ہے اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ہائی سکول کے لڑکوں کا گروپ، جو مختلف گھرانوں کے پروردہ ہیں۔ مختلف محرومیوں اور تضادات کے ہمراہ زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ ارشد، جو کہ صوفی صاحب کا بیٹا ہے۔ شرافت ان کے خاندان کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوستوں کی غلط صحبت کے نتیجے میں جنسی گھٹن کا شکار ہوتا ہے اور جب اُنھی لڑکوں کے اُکسانے پر ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے پاس پورا گروہ جاتا ہے۔ طوائف اس گروپ کے نوخیز لڑکوں سے اپنی پیشہ وارانہ مہارت سے کھل کھیلتی ہے۔ ارشد کے آڑے اس کی تربیت آ جاتی ہے اور وہاں سے بھاگ نکلتا ہے، لیکن دوستوں کے تمسخرانہ قہقہے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے، پھر ایک روز طوائف کے بُلانے پر تن تنہا اپنے اوپر لگایا گیا بُزدلی کا داغ دھونے کے لیے چل نکلتا ہے۔ طوائف اُسے دیکھ کر پوچھتی ہے کہ تم کسی شریف خاندان کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہو، باپ کا نام معلوم ہونے پر چونکتی ہے کہ اچھا تم حاجی صاحب کی لڑکے ہو۔ پھر سوالات پوچھتی ہے کہ کس جماعت میں پڑھتے ہو وغیرہ وغیرہ، وہ طوائف سے یک دم ماممتا میں ڈھل جاتی ہے اور اپنی جمع پونجی میں سے اُسے چند روپے نکال کر دیتی ہے اور اُسے

کہتی ہے کہ وہ اسے اپنی ماں بنالے، اپنے پاس رہنے کے لیے بضد ہوتی ہے، لیکن ارشد اُسے دھکا دے کر بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے:

''میرے بیٹے، میرے چاند، وہ اسے دیوانوں کی طرح لپٹائے تھی۔۔۔وہ بھی تم سا ہوتا، میرا اکبر۔۔۔وہ اگر مجھ سے نہ بھاگتا، تو آج میں بھی اُسے کالج میں پڑھاتی میں اُسے بابو بناتی۔۔۔میرے چاند، میرے اکبر۔۔۔میرے بچے اسی لیے، تو اُس دن میں نے تمھیں خراب نہ کیا تھا۔۔۔تم آوارہ لڑکوں کے ساتھ یہاں پہلی مرتبہ آئے تھے، آج اس طرح تمھیں عادت پڑ جاتی۔۔۔تم شریف آدمی کے بیٹے ہو، بلکہ حاجی کے۔''[۳۳]

صدیق سالک نے ''پریشر ککر'' میں جدیدیت کی آڑ میں مختلف طبقوں کی عورتوں کی بے جا آزادی کے حوالے سے سماجی رویوں کی نشاندہی کی ہے:

''اَب اوپر والے طبقے کو لے لو، وہاں اتنی آزادی ہوتی ہے کہ ایک امیر آدمی اپنے دوست کی آزاد منش بیوی کو اِس کے شوہر کے سامنے اپنی گاڑی پر بیٹھا کر لے جاتا ہے اور کوئی احتجاج نہیں ہوتا، اِسی طرح کانونٹ کی پڑھی ہوئی لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے سکوٹر پر بیٹھی ہوئی یونی ورسٹی سے گھر آجاتی ہے اور کوئی انگلی نہیں اُٹھاتا، لیکن جب متوسط طبقے کی اِک لڑکی کسی مجبوری کے تحت کسی کی گاڑی میں لفٹ لے کر ہسپتال پہنچ جاتی ہے، تو اُس کا سکینڈل بن جاتا ہے۔ لوگ اُسے بدمعاش اور بدکردار سمجھنے لگتے ہیں، بعض اوقات اُنھی شبہات کی بنیاد انگلیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ شادیاں رُک جاتی ہیں، خاندانوں کی ناموس خاک میں مل جاتی ہے۔''[۳۴]

فرخندہ لودھی کے ناول ''حسرتِ عرضِ تمنا'' میں مندرا کے کوٹھے پر سپنا اس کی ہر طرح التجائیں کرتی ہے کہ اُسے جانے دے، لیکن وہ نہیں مانتی۔ مندرا گھاگ عورت ہے، وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے سپنا کا دِل جیت کر اُس کا اعتماد بحال کر لیتی ہے۔ مندرا اُسے ناچ گانے کی تربیت دینا شروع کر دیتی ہے۔ تیغے کے بارے میں مندرا بتاتی ہے، اِسی طرح پونا کی بیوی تارا، اپنی بیٹی کو شادی سے قبل زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہے:

''میں وہی چاہتی ہوں، جو مائیں بیٹیوں کے مستقبل کے لیے چاہتی ہیں۔ ایک گھر، ایک قابلِ اعتماد ساتھی۔۔۔کوئی عورت اِس سے زیادہ نہیں چاہتی۔ مرد باپ ہو یا شوہر، بھائی ہو یا بیٹا، وہ ہوا کا جھونکا ہے، اگر کمزور ہے، تو عورت گرد کی طرح نیچے بیٹھ جائے گی، مٹی میں مل جائے گی، جاندار ہے، تو اِس کے سنگ سنگ گھومتی پھرے گی۔''[۳۵]

زبیدہ خاتون نے ''ہما'' میں اُن لوگوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، جن کی منگنیاں اور شادیاں، تو کہیں اور طے ہوتی ہیں، لیکن وہ منڈلاتے کسی اور کے پیچھے رہتے ہیں، کرن، نادرہ، عروسہ، ہما، ماہم، ترنم وغیرہ میں روزمیرہ زندگی کی جھلکیاں نمایاں ہیں، اِن کی مرکزی نسوانی کردار ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اکثریت ایسی ہے جنھیں بچپن ہی سے یتیمی و مسکینی کا دُکھ اُٹھانا پڑا، چوں کہ وہ اسے خاندانی نظام کی عکاسی کرتی ہیں، جس کے تمام کردار ایک دوسرے کو سنبھالا دیتے

دکھائی دیتے ہیں، تاہم منفی کردار اپنی ریشہ دوانیوں میں برسرِ بیکار دکھائی دیتے ہیں، مثلاً نجمہ کی سازشوں کی وجہ سے ریاض محل چھوڑنے والی نادرہ کا گھر نجمہ برباد کرتی ہے اور ریاض کی منظورِ نظر بن کر تمام روپیہ پیسہ زیور لوٹ کر لے جاتی ہے:

> ''توبہ توبہ اِس ڈھائی تین مہینے میں سارے گھر کا ناس کر گئی، بھلا ایسی عورتیں کہیں کسی کی ہو کر رہتی ہیں؟ وہ، تو پیسے کی ہوتی ہیں، اپنے منھ کو ولایتی روغن سے سرخ و سفید کر کے مالدار لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانس لیتی ہیں اور اپنا الّو سیدھا کرنے کے بعد، پھر نئے شکار کی تلاش میں چل دیتی ہیں۔ اَب دیکھنا یہ کسی اور موٹی آسامی کے لیے کسی دوسری جگہ جا کر جال ڈالے گی۔''[۶۷]

انسانی زندگی میں شادی اہم موڑ ثابت ہونے کے علاوہ معاشرے کی اساس ہے۔ اِس میں فریقین کی باہمی رضامندی کا ہونا ضروری ہے، عموماً معاشرہ شرافت کے نام پر عورت سے اِس کا یہ بنیادی حق چھین لیتا ہے اور عورت نا چاہتے ہوئے بھی یہ تلخی گوارا کرتی ہے، جبراً شادی لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی، وٹہ سٹہ، قرآن سے شادی اور بے جوڑ شادی کی وجہ سے عورت استحصال کی شکار ہوتی ہے۔ بہت سے ناول نگاروں نے اِس سماجی برائی یعنی نارضامندی کی شادی کی مذمت کی ہے۔ منشی پریم چند ''پردۂ مجاز''، بانو قدسیہ ''شہرِ بے مثال''، کشور ناہید ''زیتون''، نثار عزیز بٹ ''نگری نگری پھرا مسافر'' ''محمد سعید شیخ'' ''ایک اور دریا'' اِس حوالے کی اہم کڑی ہیں، اسی طرح کم جہیز لانے پر عورت کے ساتھ برتا جانے والا ناروا سلوک اور شادی سے پہلے لڑکی کو بکاؤ مال کی طرح نظروں میں تولنا ایسی قبیح، سماجی رسم کی شکل اختیار کر گیا ہے کہ والدین نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی اولاد کو بردکھاوے کے لیے پیش کرنے پر مجبور ہیں، اگر لڑکی کم پڑھی لکھی اور گھریلو ہے، تو اُس سے زیادہ جہیز کی توقع لگائی جاتی ہے اور اگر تعلیمیافتہ ملازمت پیشہ ہے تو تنخواہ کے حساب سے اِسے اہمیت دی جاتی ہے، مثلاً منشی پریم چند ''نرملا''، قرۃ العین حیدر ''سفینۂ غمِ دِل''، ''آگ کا دریا''، شوکت صدیقی ''خدا کی بستی''، ''جانگلوس''، بلقیس ریاض ''تجدیدِ وفا''، بانو قدسیہ ''راجا گدھ''، کشور ناہید ''زیتون''، نثار عزیز بٹ ''کاروانِ وجود''، ''بشریٰ رحمٰن ''لازوال'' ''خوبصورت''، عبداللہ حسین ''قید''، خالدہ حسین ''کاغذی گھاٹ''، رضیہ بٹ کا ''اِک لڑکی''، اے آر خاتون ''کہانیاں'' بلونت سنگھ ''رات چور اور چاند'' اور اصغر ندیم سید کا ''آدھے چاند کی رات'' میں اِن سماجی بُرائیوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ پریم چند نے ''نرملا'' میں کم عمری کی شادیوں سے پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا ہے، جس کا انجام المناک ہوتا ہے، خاندانی لڑائی جھگڑوں، بعض صورتوں میں قرض کی ادائیگی نہ کر سکنے اور اکثر و بیشتر وٹہ سٹہ کے ذریعے بے جوڑ شادیوں کو رواج دیا جاتا ہے۔ نرملا، اگرچہ مثالی بیوی تھی، لیکن وہ سوتیلی اولاد کے لیے وہ سوتیلی ہی رہی اس کے دو بچے مر گئے اور تیسرے کو سادھو اُٹھا کر لے گیا، نرملا کی شادی جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بھون موہن منہا سے طے کر دی گئی، اِس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ لڑکے کے باپ نے کہہ دیا تھا:

> ''جہیز دیں یا نہ دیں مجھے اس کی پرواہ نہیں، البتہ بارات میں، جو لوگ جائیں اُن کی خاطر تواضع بخوبی ہونی چاہیے، تاکہ میری اور آپ کی بدنامی نہ ہو، بابو آورے بھان لال تھے تو رئیس، مگر دولت جمع کرنا نہ جانتے تھے، جہیز دینا ان کے لیے ایک مشکل مسئلہ تھا، اس لیے جب لڑکے کے والد نے کہہ دیا کہ مجھے جہیز کی پرواہ نہیں تو گویا اُنھیں آنکھیں مل گئیں

خوف تھا کہ نہ جانے کس کس کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑیں۔ دو تین مہاجنوں سے معاملہ ٹھیک کر رکھا تھا، اُن کا قیاس تھا کہ ریت کرنے پر بھی بیس ہزار سے کم خرچ نہ ہوں گے، یہ تشفی پا کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔''۷ے

بلونت سنگھ نے بیٹی کی شادی کے مسائل کے حوالے سے لکھا ہے:

''دیکھ میری بیٹی، تو شاید نہ سمجھتی ہو کہ تو نے ہماری عزت اور آبرو کو کس قدر خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ماں باپ یہ جانتے ہوئے کہ لڑکیاں پرایا دھن ہیں، اُنھیں لاڈ چونچلے سے پالتے ہیں، اِن کا بھی یہ فرض ہونا چاہیے کہ اگر وہ والدین کی خدمت نہ کر سکیں، تو کم از کم کوئی ایسی حرکت بھی تو نہ کریں، جس سے خوامخواہ ان کی بدنامی ہو۔''۸ے

قرۃ العین حیدر نے لڑکیوں کی زبردستی نارضامندی کی شادی کی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ''آگ کا دریا'' پڑھی لکھی لڑکیوں کو خاندان کے نکمے لڑکوں سے زبردستی بیاہا جاتا تھا، تاکہ گھر کی جائیداد گھر میں رہے۔ ''سفینۂ غمِ دل'' میں لڑکی مروجہ استبدادی رُسوم کے خلاف بغاوت دکھائی دیتی ہے، جو شادی کے روز گھر سے فرار ہو جاتی ہے، قرۃ العین حیدر نے عورت کے مقدر اس کی مجبوری و بے بسی اور اس پر ہونے والے استحصال کی مذمت کرتے ہوئے مؤقف اختیار کیا ہے۔ نسوانی کردار نہ تو مردوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی اوپر ہونے والے جور و ستم اور ناانصافیوں کا رونا روتے ہیں، بلکہ وقت کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ چمپا ایسی عورت ہے، جس کی محبت کو بھول کر اپنی دُنیا میں گم ہو جاتا ہے اور تنہائی اور مجبوری اس کا مقدر بنتی ہے:

''شہنشاہی اور جاگیردارانہ سماج میں عورت کو آزادی محض اُسی وقت میسر ہوتی ہے، جب وہ بازار میں آ کر بیٹھ جائے، تب اُس کو عزت بھی ملتی ہے، دولت بھی، پھر اُس کے لیے شعر و شاعری کرنا بھی جائز ہے لکھنا پڑھنا بھی ورنہ علیحدہ سے اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چمپا بائی اُسی نظام کی پروردہ تھی اور گوتم اِس حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھا، کیوں کہ وہ خود اِس نئے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا، جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا اور جاگیردارانہ ڈھانچے سے ہٹ کر اپنی اقتدار الگ بنا رہا تھا اور متوسط طبقہ بڑی شدت سے اخلاق پرست ہوتا ہے۔''۹ے

''جانگلوس'' میں شوکت صدیقی نے نچلے طبقے کے لوگوں کی نفسیات، سوچ و فکر، سماج کی بُرائیوں اور ناہمواریوں کے علاوہ حالات کے جبر و استبداد کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' میں نیاز اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے رضیہ کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر گاہے بگاہے اُن کے گھر جاتا ہے، تحائف، کھانے پینے کی اشیا کے علاوہ ان کے معاملات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے، خوش گپیوں کے جو ہر بھی بکھیرتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے، جب نیاز کی طرف سے لایا گیا ہار، جو دراصل سلطانہ کے لیے ہوتا ہے، اُس کی ماں کو تحفۃً دیتا ہے، تو سلطانہ لااُبالی پن میں اُسے اپنے گلے میں پہن لیتی ہے۔ رضیہ سیخ پا ہو کر اسے خوب ڈانٹتی ہے۔ ''خدا کی بستی'' کی رضیہ نیاز کی نیت کے فتور سے بے خبر نہیں ہوتی، وہ نیاز سے نکاح سے پہلے سلطانہ کو سلیمان سے بیاہنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور رات ورات سلطانہ کو رخصت کر دینا چاہتی ہے۔ اپنے ارمانوں اور بے بسی کا ذکر بیٹی سے اِس طرح کرتی ہے، اسی طرح ماجھا کے الفاظ میں دیہی عورت کی

حیثیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ سالہا سال تک اُس کی شریکِ حیات رہی تھی۔ وہ ایک اچھی اور محبت کرنی والی بیوی تھی۔ کھیتی باڑی کے کاموں میں برابر سے اُس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دِن رات محنت کرتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اِس کے بچوں کی ماں تھی، جو بالکل بے قصور تھے اور اپنی ماں کے ساتھ غربت اور ناداری کی دن گزار رہے تھے۔'' ۸۰ے

شوکت صدیقی کی طرح بانو قدسیہ نے بھی گھریلو عورت کی ناقدری کی داستان رقم کی ہے۔ گھریلو عورت کولہو کے بیل کی طرح روزمرہ اُمور میں اُلجھی رہتی ہے، پھر بھی اِس کے نصیب میں شوہر اور سُسرال کی گالی گلوچ اور مار پیٹ ہوتی ہے۔ ہر قدم پر نظر انداز کی جاتی ہے۔ پورے گھر اور کنبے کی دیکھ بال کرنے والی اپنی ذات بھول جاتی ہے:

''وہ سرجی کئی چکیوں میں پستی ہے کبھی شوہر کی چکی میں کبھی غربت، کبھی اُدھار کی چکی میں۔ تیس تک پہنچتے پہنچتے، تو صرف اس کا چھچھڑا باقی رہ جاتا ہے، ہڈیوں پر۔۔۔ آپ کو ایسی طوائف نظر آئے، تو آپ ناک پر رومال رکھ لیں، یہ جو آپ ادیب شاعر لوگ ہیں، وہ کبھی ایسی طوائف کی کہانی نہ لکھیں گے، اِن پر غزل کون کہے۔'' ۸۱ے

قدامت پسندانہ سوچ اور جدید فکر کی حامل رکھنے والی لڑکیوں کے مابین گفتگو کے ذریعے نثار عزیز بٹ نے عورت کی موجودہ حالت پر تبصرہ کیا ہے: ''کتنی عورتیں ہیں، جو شادی کے بعد اپنی مرضی کی زندگی گزارتی ہیں، قسمت والیوں کے سر پر چھت ہوتی ہے، گود میں بچے، لیکن خوشی اور خود مختاری کس کو ملتی ہے؟'' ۸۲ے مرزا اعظیم بیگ چغتائی کے ناول ''چینی کی انگوٹھی'' میں غریب مزارعے کی بیٹی ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر سے بیاہ دی جاتی ہے اور کم عمر لڑکی کو سمجھانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اُس کے مرنے کے بعد اِس کے وارثے قتل کی دھمکیاں دے کر روپیہ پیسا لوٹ کر اُسے دو بچوں کے ہمراہ گھر سے نکال دیتے ہیں، ماموں کے پاس آتی ہے، تو ماموں نے اپنے مقدمے کی کامیابی کے لیے کنواری لڑکی کو بڈھے مختار سے بیاہنے کا فیصلہ کرلیا، ممانی اُسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے: ''بن بیاہی کنواری لڑکی بھلا کیا جانے کہ جوان میاں اچھا ہوتا ہے یا بڈھا، تو گھبراتی کیوں ہے۔'' ۸۳ے ''تجدید وفا'' میں بلقیس ریاض دھوکے سے شادی کرنے والوں کے مختلف روپ بے نقاب کرتے ہوئے عورت کے جذباتی وجنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے، کہ عورت خواہ دُنیا کے کسی بھی خطے کی ہو، مرد کی دوستیاں، یارانے اور معاشقے اس کے لیے سوہانِ روح ہوتے ہیں، جس طرح مرد حد درجہ شکی اور غیر مرد کے لیے رقابت محسوس کرتا ہے، اسی طرح عورت بھی احساسات رکھتی ہے۔ دوستانے اور معاشقے عائلی زندگی میں تباہی کا مؤجب بنتے ہیں۔ ساری زندگی مرد کے ہاتھوں کھلونا بننے والی امتل اپنی زندگی کی کہانی اس طرح بیان کرتی ہے:

''اب میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں، تو اس نے شادی سے انکار کردیا ہے، لاکھ کوشش کی کہ اس بچے کو باپ کا نام دے دو، مگر وہ، یہی کہتا ہے کہ والدین کی مرضی سے وہ شادی اپنی کزن سے کرے گا، اس کو والدین کے پاس چھوڑ کر، پھر مجھ سے شادی کرے گا، لیکن میں کہتی ہوں کہ یہ فراڈ ہے، دھوکے باز ہے، تم اس سے بچ جاؤ، یہ تمھیں بھی بچے کی ماں بنا کر شادی نہیں کرے گا، میں تمھارا بھلا کرنا چاہتی تھی۔'' ۸۴ے

قبائلی لوگ صُلح و دوستی کی خاطر بے جوڑ اور کم عمری کی شادیوں سے نہیں چوکتے۔ جوان لڑکیوں کی آٹھ نو سال کی عمر نابالغ لڑکوں سے شادی اس طرح نو جوان لڑکیوں کی بوڑھوں سے شادیاں معمول ہیں۔ نکاح کا انداز بھی عموماً غیر شرعی ہوتا ہے اور عورت کی رضا کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ افشاں اور قاسم کی شادی بھی پرانی دشمنیوں کو ختم کرنے کا، قرض کے خاتمے کا شاخسانہ تھی:

''اور سردار نے یہ بات باوثوق ذرائع سے معلوم کر لی تھی کہ لڑکی بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ایسی لڑکی کی قرض کی رقم کے عوض وصولی، کوئی بڑا سودا نہ تھا، کیا تم قاسم ولد ارباب کو بطور شوہر قبول کرتی ہو اور ہر دفعہ اس کی بوڑھی خالہ نے اس کی طرف سے آہستگی سے ہاں کہا تھا، اس کو بتایا گیا تھا کہ اس کا ہونے والا دولہا بہت چھوٹا ہے، مگر اس نے سوچا تھا کہ کتنا بھی چھوٹا کیوں نہ ہو، اس کی عمر اس کے قد اور اس کے جتنا، کم از کم پندرہ سال کا، تو ہوگا۔''۸۵

''خانم'' میں شادی کے نام پر ہوس کی آگ بُجھانا بگڑے امیر زادوں کا وتیرہ ہے، جو ہر وقت نئے شکار کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں:

''ایک عیاش امیر زادہ ہے، جس کو کسی غریب کی بہو بیٹی کی عصمت کے تقدس کی قیمت کا اندازہ نہیں، جو اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر اپنے نیم بسمل شکار کو تڑپتا اور پھڑکتا چھوڑ کر دوسرے شکار کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اِس کی اصلیت، جبلت اور فطرت کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ اب وہ بھروسے اور اعتماد کے قابل نہیں رہا۔''۸۶

سلمیٰ کنول کے ناول ''اکیلی'' کی کومل، عدیل اور فری روزمرہ زندگی کے کردار ہیں، عدیل فری کا کلاس فیلو ہے اور کومل فری کی بڑی بہن ہے۔ کومل کے عشق میں گرفتار ہو کر عدیل اُس سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چاہتوں کے وعدوں کے باوجود کومل جب بسترِ علالت پر ہوتی ہے، تو عدیل اپنی سالی، دوست اور کلاس فیلو فری کے آجانے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ روزانہ فری کے ساتھ گھومتا پھرتا، سیر سپاٹے اس کا معمول بن جاتے ہیں۔ وہ کومل کو بھول جاتا ہے۔ کومل فری اور عدیل کی رومینٹک گفتگو سن لیتی ہے، جس میں وہ اعتراف کرتا ہے کہ کومل سے شادی وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر کی تھی۔ کومل بالآخر اُسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے، تو اُس کی منت سماجت پر اُتر آتا ہے:

''مجھے اب تم سے بچھڑنے کے بعد اپنی زندگی پر تمہاری سدا کی جدائی کا سایہ منڈلاتے ہوئے دیکھ کر احساس ہوا ہے کومل کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ سب سے زیادہ سب سے گہری میں تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا، میری زندگی کو یوں ویران نہ کرو کومل! ابھی تو اس میں آرزوؤں کے پھول بھی نہیں کھلے۔ ابھی ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا بھی نہیں۔ واپس آجاؤ کومل! میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ کومل، عدیل! مجھے تمہاری ذہنیت پر ہنسی آتی ہے۔ تم کس قسم کی محبت کے قائل ہو، جس کا احساس صرف جدائی کے بعد ہوتا ہے۔ یہ محبت تو نہیں یہ تو نقصان کا افسوس ہے کسی بھی چیز کے کھو جانے کا صدمہ۔''۸۷

غیر رضامندی یا جبراً شادی سماج کا بہت بڑا المیہ ہے۔ جائیداد کے حصول یا قتل و خاندانی جھگڑوں کے تصفیے کے طور پر

چھوٹی بچیوں سے لے کر بیاہتاؤں کو اِس مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، شادی کے نام پر بھینٹ چڑھنے والی یہ مظلوم لڑکیاں اور عورتیں تمام عمر زندگی کی بیگار دیتی ہیں۔ پریم چند نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ہندو معاشرے میں موجود بہت سے مسائل، توا ہمانہ رسومات کی مذمت کی، خصوصاً دیہی اور نچلے متوسط طبقے کی عورت کو درپیش مشکلات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ پریم چند کی تانیثی سوچ اور افکار کی جھلکیاں جابجا اُن کی تحریروں میں نمایاں نظر آتی ہیں، مثلاً غیر رضامندی اور بے جوڑ شادی کے مسئلے کو ''پردۂ مجاز'' میں بڑی مہارت اور چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ لونگی اپنی کم عمر بیٹی کی شادی بوڑھے دولت مند آدمی سے طے کرنے پر اپنے شوہر رائے صاحب سے جھگڑتی ہے، کیوں کہ وہ جھنکو نامی بہروپیے کو جوتشی بنا کر اپنے گھر لاتا ہے، جو یہ خبر دیتا ہے کہ اس کی لڑکی کی شادی، جس بوڑھے سے کی جائے گی، تو خوب دولت ہاتھ آئے گی، لونگی یہ سُن کر آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر سے خوب جھگڑا کرتی ہے:

> ''بس چلے ہی جاو، میرے گھر سے، دغا باز جالیا کہیں کا، بڑا جوتشی ہے، تو بتا میری عمر کتنی ہے، تم سب لوگ کیوں میری کنیا کو کنویں میں ڈھکیل رہے ہو، کیوں اس کے دشمن بنے ہوئے ہو، تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ بوڑھے آدمی کے ساتھ کوئی لڑکی کیسے رہ سکتی ہے، دھن پا کر بوڑھے جوان تو نہیں ہو جاتے۔۔۔ لگا دو آگ گھر میں، گھونٹ دو لڑکی کا گلا، ابھی مر جائے گی مگر جنم بھر کے دُکھ سے، تو چھوٹ جائے گی، دولت اور رُتبہ اپنی مرضی سے ملتا ہے۔ لڑکی کو بیچ کر نہیں کمایا جاتا میں تمھیں اتنا خود غرض نہ سمجھتی تھی۔'' ۸۸

عصمت چغتائی کی تحریروں کے وسیع کینوس میں اداکاروں کی نجی زندگی، بیوی بچوں پر عدم توجہی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور مشکلات کو موضوع بنایا ہے:

> ''انڈسٹری جسے اپنے سونگھ لینے کی طاقت پر بڑا ناز ہے، اِس بار دھوکہ کھا گئی۔ دھرم اور منگلا کے ظاہری ملاپ سے سب مرغوب نظر آتے تھے۔ بجائے اِس کی حماقتوں پر ہنسنے کے اس کی دُور اندیشی کی داد دیتے تھے۔ فلمی بیویوں کا سہاگ تو سوئی کی نوک پر ٹکا رہتا ہے۔ وہ منگلا کی اِس جیت کو اپنی ذاتی فتح سمجھتیں کہ کوئی تو ستی ساوتری نکلی، جو بجائے ماتم کرنے کے یم دوت سے بھڑ گئی اور اپنے پیارے پتی کو صحیح وسالم نکال لائی۔ چوٹ بھر جاتی ہے پر نشان نہیں مٹتا۔ جیت تو ہوئی، مگر چہرے پر سے وہ بے ساختہ اطمینان اور بھروسے کی چمک اُڑ گئی۔'' ۸۹

ہمارے معاشرے میں شادی شدہ عورت کو جہاں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن میں سے نہایت نازک مسئلہ ازدواجی جنسی دست درازی ہے، جو مرد جذباتی اُبھار میں فریقِ ثانی کی رضامندی واحساسات کا خیال نہیں رکھتے، اسی زمرے میں آتے ہیں۔ میریٹل ریپ کے حوالے سے بھی بانو قدسیہ نے اپنے تانیثی شعور اور بالیدگی کا اظہار کیا ہے کہ خانگی زندگی میں میاں بیوی کے درمیان عورت کی زبردستی کی مفاہمت مرد کی خواہشات کی تکمیل تو کر دیتی ہے، لیکن اس کی اپنی ذات ناآسودگیوں کی نذر ہو جاتی ہے:

> ''کوئی عورت، جب محض مرد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ سوتی ہے، تو

سحر کے وقت اس کے دل میں اس مرد کے لیے بالکل ایسی ہی نفرت اُٹھتی ہے، ایک ایک
مسام سے گرمی کے پسینے کی طرح پھوٹتی ہوئی ۔۔۔ باہر نکلتے ہوئے سانس میں کاربن ڈائی
آکسائیڈ کی طرح گھلی ہوئی ۔۔۔ یہ نفرت لکڑی کے جالے کی طرح نازک، لیکن فولاد کی
طرح مضبوط ہوتی ہے، وہ بار بار خوشنودی حاصل کرتی ہے اور بار بار اس شکنجہ میں اپنا وجود
کسواتی ہے نہ خوشنودی کی گرہ نیم کھلتی ہے نہ نفرت کا بازار سرد پڑتا ہے۔'' ۹۰

نثار عزیز بٹ کے خیال میں حساس ذہن رکھنے والی لڑکی ہے، اُس کی شخصیت اور وجود کو اُس کی ذات سے وابستہ مرد کی خودغرضی اور بے اعتنائی کے اژدھے نگلنے لگتے ہیں، کیوں کہ اپنی انانیت و حاکمیت کے نشے میں چُور مرد عموماً اپنے جذبات ہی کو فوقیت دیتا ہے اور اپنے پندار کی نظر میں اسے اپنا آپ درست دکھائی دیتا ہے۔ ہزار ہا غلط نظریات کے حامل ایسے افراد خود ساختہ توجیہات سے خود کو مطمئن رکھتے ہیں۔ افگار کی ذات بھی ایسی ہی مشکلات سے ہم کنار ہوتی ہے:

''اُس کے اعصاب اِس روزمرہ کے کھچاؤ سے لوہے کی تاروں کی طرح جھنجھنا اُٹھے تھے
کچھ اس لیے بھی زیادہ کہ توجہ کے لیے کوئی اور راہِ فرار نہیں تھی یا بیماری کی ذلت تھی یا پھر یہ
ذہنی تذلیل۔ زندگی کے لیے کچھ دیر پہلے، جو ایک کسک، ایک تڑپ اس کے دل میں پیدا
ہوئی تھی وہ بجھے انگاروں کی آخری کھوکھلی راکھ کی طرح سرد پڑ گئی، وہ چپ چاپ آکر اپنے
بستر پر لیٹ گئی۔'' ۹۱

محمد سعید شیخ کے ناول ''اقبالِ جُرم'' اور ''ایک اور دریا'' میں الماس، جسے اس کے بھائی محض زمینوں اور جائیدادوں کے حصول کی خاطر بوڑھے چوہدری سے بیاہ دیتے ہیں:

''بھوکے آدمی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، یہ کسی نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا، لوگ پیٹ بھرنے
کے لیے اپنی بیٹیاں بیچ دیتے ہیں، حالاں کہ کوئی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا، ہم نے
برسوں ان حقیقتوں کو ماننے سے انکار کیا ہے، ناانصافی اور ظلم اپنے بھائی سے بھی کیا جائے
تو اس کا بھی رشتوں سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ مذہب سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔'' ۹۲

عبداللہ حسین کے ''قید'' میں تانیثیت کا رنگ اُس وقت نمایاں نظر آتا ہے، جب وہ عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر مساوی اور ظالمانہ رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عبداللہ حسین کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ کرداروں کو بے جا ہمدردی کی آڑ میں چھپانے کی بجائے اُن عناصر کو بے نقاب کرتے ہیں، معاشرے کے یہ ناسور چھپے ہوتے ہیں۔ حقائق کے اچھے اور بُرے محرکات و نتائج پر روشنی ڈالتے چلے جاتے ہیں، اِسی طرح رضیہ سلطانہ کی زبان سے صنفی تفاوت کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں:

''ہم لوگ احساسِ کمتری لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی ہاتھ لگا جائے، تو دوسروں کے منہ کی
طرف دیکھتی ہیں۔ مردوں کے منہ پر بال نکلتے ہیں، تو فخر سے دُنیا کو دکھاتے ہیں ہمارے
منہ پر ایک بال اُگ آئے، تو شرم سے سر جھکا لیتی ہیں، ہماری چھاتیاں کھلتی ہیں، تو شرم
سے سر جھکا لیتی ہیں۔ خون جاری ہوتا ہے، تو شرم سے جھک جاتی ہیں۔ شادی کی

رات گزرتی ہے،تو شرم سے باہر نہیں نکلتیں،اس سے بڑی غربت کیا ہوتی ہے؟'' ۹۳

خالدہ حسین کے ناول ''کاغذی گھاٹ'' میں سماجی رسوم پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔عورت کے لیے مرد ان کیفیات کو سمجھنے میں قاصر ہوتے ہیں۔میکہ کیا اہمیت رکھتا ہے،کیوں کہ زندگی کا بیشتر حصہ وہ اپنے گھرانے،اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزرتا ہے،اسے کی کسی قسم کی جُدائی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا،جب کہ لڑکی جہاں اس نے اپنی زندگی کا سنہری دَور گزارہ ہوتا ہے،اُس کے اہلِ خانہ،گھربار،دوست احباب،سہیلیاں،عزیز رشتے دار سب شوہر اور سُسرالیوں کی اجازت کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں،عورت کی ایک گھر و ماحول سے دوسرے گھر اور ماحول کی ہجرت کے حوالے سے خالدہ حسین کا کہنا ہے:

''عورت کے دل سے میکے کی جُدائی کا غم کبھی نہیں مٹتا۔بیٹی،اپنے بابل سے فریاد کرتی ہے،پھر اُسے دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اسے اس گھر سے بے دخل نہ کردے،وہ اسے بتاتی ہے کہ تمھارے محل کے تنگ دروازے سے میری ڈولی نہیں نکلتی مگر بابل آنسو پونچھتے ہوئے اصرار کرتا ہے کہ وہ دروازے کی ایک ایک اینٹ نکلوادے گا،تاکہ وہ اپنے گھر خیر و عافیت سے جاسکے۔بیٹی اُسے یاد دلاتی ہے کہ اس کے جانے سے اس کا صحن سونا ہوجائے گا،وہ چلی گئی،تو وہاں چرخہ کون کاتے گا۔بابل کے پاس اس کا جواب بھی موجود ہے،اس کے بعد اس کی پوتیاں اس صحن کو آباد کریں گی۔اُسے،تو ہر حال میں رخصت ہونا ہی ہے۔عورت کا یہ ازلی و ابدی غم،یہ سدا بہار دردِ جدائی،یہ ہمیشہ سرسبز رہنے والا ناسٹلجیا نسل درنسل منتقل ہوتا چلا جاتا ہے،یہ گھمبیر اُداسی عورت کی اساس ہے،غم جس کا کوئی مداوا نہیں،آنسو جن کی کوئی انتہا نہیں،ایک گہرا دکھ،جو بوند بوند جی جان کو گھلاتا ہے،ہجر فراق،جدائی برپا کرتا ہے،شاید فراق ہی زندگی کی اصل ہے۔ہر شے کی ماہیت بشنو چواز نے حکایت می کنیم۔وز جدائی ہاشکایت می کنیم۔'' ۹۴

بشریٰ رحمٰن کے ناول ''لازوال'' میں محبت کے رشتوں،جذبوں،محرومیوں،پچھتاووں کی داستان ہے،بعض اوقات ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے عورت کو بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے،اس میں متوسط طبقے سے لے کر اعلیٰ طبقے کے افراد اور انقلابِ ایران سے لے کر یورپی ممالک کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر کے علاوہ سیاسی حالات کو بھی منظرِ عام پر لائی ہیں۔اِس ناول کے مرکزی کردار نایاب اور شہباز ہیں۔خواجہ عبدالرحیم ہر قدم پر بیٹا کی مدد کرتا ہے،لیکن تین بھائیوں کی اس اکلوتی بہن کو گھر میں بہت زیادہ اصول و ضوابط کا پابند بنانے کی کاوش کی جاتی ہے۔گھر کا ہر فرد اُسے نصیحتیں کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے،ماں باپ خصوصاً باپ اپنی کم سِن پانچ سالہ بچی پر بڑی سختی کرتا ہے۔بات بات پر سرزنش کی وجہ سے ''نایاب'' چڑچڑے پن کا شکار ہوجاتی ہے اور باپ کا ہر وقت اُسے تولتے رہنے کو بُرا ناپسند کرتی ہے:''ابا جی،تو اُسے نظروں میں تولتے رہتے،وہاں کیوں گئی،اُدھر کیوں بیٹھی تھی،بیٹھک میں کیوں جھانک رہی تھی۔چار پانچ سال کی بچی کے لیے ایسی سرزنش اس پنکھے کی مانند ہوتی ہیں،جو کوئلوں کو ہوا دے کر دہکاتا ہے۔'' ۹۵

اے۔آر۔خاتون نے اپنے ناولوں ''شمع''،''افشاں''،''تصویر''،''کہانیاں''،''چشمہ'' وغیرہ جیسے ناول لکھے،اِن کے ناول ''افشاں'' اور ''شمع'' ڈرامائی تشکیل کے بعد جب پی ٹی وی پر قسط وار ٹیلی کاسٹ ہوئے تو انھیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی

اِن کے بیشتر ناولوں میں دلی کی تہذیبی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ 'کہانیاں' کی دادی بچیوں کو مختلف قصے کہانیاں سناتی ہیں، جن میں مختلف مسائل ومصائب کی شکار ہر طبقے کی عورت کی کہانی بیان کی ہے۔ بچیوں کا جدید تعلیم کے حصول کی طرف راغب ہونا دادی کے نزدیک وقت کا زیاں تھا۔ سماج میں لڑکیوں کے حوالے سے مختلف رویہ جات کی عکاسی کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

''سب سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ رشتے آنے بند ہو جاتے ہیں، اکثر لڑکیاں شادی سے انکار کر دیتی ہیں، لیکن عورت کی زندگی میں ایک ایسا، وقت آتا ہے کہ وہ شادی کی کمی کو محسوس کرتی ہے، اُس کا دل چاہتا ہے، بال بچے ہوتے، کوئی زندگی کا شریک ہوتا، بہت سی، تو اسی آرزو میں میں بوڑھی ہو جاتی ہیں، اکثر بیوی بچوں والے کے پیچھے لگ جاتی ہیں، کوئی ایسی بھی دیکھی ہیں، جو اپنے سے دس پندرہ برس چھوٹے کسی اُلو ناتھ کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہیں، مگر دو چار برس کے بعد وہ دھوکا دے جاتا ہے۔'' ۹۶

فرخندہ لودھی کے ناول ''حسرتِ عرضِ تمنا'' میں نسوانی کردار حلیمہ اور اُس کے شوہر کی زندگی میں ساس اور نندیں حائل رہتی ہیں۔ مردہ بچے کو جنم دینے کے بعد سوا سال کے اندر اندر چودہ پندرہ سال کی یہ لڑکی بیوہ ہو جاتی ہے۔ سُسرال والے اُسے نکال باہر کرتے ہیں۔ اِس کے اپنے میکے میں بھی اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی، سگی ماں بھی ہر وقت کوسنے دیتی ہے: ''چڑیل ہے، ڈائن ہے، شوہر بھی کھا لیا، اولاد بھی کھالی۔'' ۹۷ زاہدہ حنا کے ناول ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' میں، اگرچہ اول تا آخر ناسٹلجیائی کیفیت لیے ہوئے ہے، اِس میں بچپن سے لڑکے لڑکیوں کو ایک دوسرے سے منسوب کرنے کی داستان ہے۔ خاندان کے بزرگ عموماً رشتہ داریوں کی مضبوطی کے نظریے کے تحت بچوں کو پیدا ہوتے ہی منسوب کر دیتے ہیں، لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے خیالات میں خاصی تبدیلی آجاتی ہے۔ برجیس جس نے ایم۔اے کرنے کے بعد اپنے شوق کے تحت میوزک سیکھا تھا، پرویز نے مزاج کے فرق کی وجہ سے اُسے خودسری کا نام دے کر بہانہ بناتے ہوئے نسبت توڑ ڈالی، مثلاً: ''برجیس کی پیدائش پر، جب پرویز کی ماں نے دائی کے ٹھیکرے میں چاندی ڈالی تھی اور نوزائیدہ بچی کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا، تو سب ہی خوش ہوئے تھے کہ محبتوں کے رشتے اَب اور مضبوط ہو جائیں گے۔'' ۹۸

اصغر ندیم سید کے ناول ''آدھے چاند کی رات'' میں ماہ رُخ، جب عامر کے باپ کی باتوں میں آکر شادی کا فیصلہ کرتی ہے، تو اس کا شوہر اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے اور اسے کسی مرد کے متعلق سوچنے کا کوئی حق نہیں:

''مرد چاہے عورت کو اپنے سے الگ کیوں نہ کر دے، طلاق دے دے یا علیحدگی اختیار کرے لیکن اس کے اندر کا آدمی یہی چاہتا ہے کہ وہ عورت کسی اور مرد کے متعلق سوچنے کا تصور بھی نہ کرے، بس اس کی داسی بن کر بیٹھی رہے۔ سنسان ہو جائے، اُجاڑ ہو جائے، عجب بات ہے، اس کا شوہر کسی اور کا شوہر بن چکا ہے اور ایک آباد زندگی گزار رہا ہے، لیکن ماہ رُخ ابھی بھی اس کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے۔ غلامی کا ایک کڑا اُس کے پاؤں میں پڑا ہوا ہے۔'' ۹۹

دُردانہ نوشین خان کے ناول ''اِندر جال'' میں انسانی رویوں کی مختلف حالتوں کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر شہاب اور فریحہ کے گرد گھومنے والی یہ کہانی محض رومانوی قصہ نہیں، بلکہ اس میں جائے ملازمت پر خواتین اور لیڈی ڈاکٹرز، نرسز وغیرہ کو

درپیش مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہر کوئی اُنھیں اپنا تر نوالہ بنانا چاہتا ہے۔ اپنے گھر کے افراد کی کفالت کرنے والی لڑکیاں اپنے باپ اور بھائیوں کی نہ صرف معاشی طور پر معاونت کرتی ہیں اور بعض صورتوں میں اپنا تن من دھن تیاگ کر کنبوں کی پرورش میں زندگی بتا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر فریحہ ایسے ہی کنبے کی رُکن ہے، جو اپنی تمام بہنوں کو بیاہ لیتی ہے۔ زچہ کا باپ جوان بچیوں کے نکاح کی ذمہ داری سے انکاری ہے اور خود تبلیغی جماعت میں جانے کو اپنے فرائض کی ادائیگی سے زیادہ ترجیح دیتا ہے، بن ماں کی اِن بچیوں کو اِن کے حال پر چھوڑ دیتا ہے، اِس کا سب سے بڑا شکوہ یہی ہوتا ہے کہ لڑکیاں اُسے کما کر کیوں نہیں دیتیں:

''ساری غلطیاں میری ہیں، سارے گناہ میں نے کیے ہیں، میں پوچھتا ہوں تم لوگوں سے کچھ ڈھکا چھپا ہے؟ تم نہیں جانتے ہم نے وقت کیسے کاٹے، لڑکیوں کو کس طرح تعلیم دلوائی، کیا حیلے وسیلے نہ کیے، جب وہ کچھ کمانے کے لائق ہوتیں، تو ایک سال بھی کما کر نہ کھلا سکیں۔ چلو مجھے نہ کھلاتیں، مگر اپنے گھر کی حالت تو سنوارتیں، اپنے باپ کے قرض اُتارتیں، شادیاں ہوتی رہتی ہیں، کہیں گم نہ ہو جاتی شادی۔ بس میرا منہ نہ کھلواؤ۔۔۔ یہ اِس شادی میں ایک پائی نہ دوں گا نہ شریک ہوں گا، یہی غنیمت جان لو کہ چپ ہوں، تم اپنی پیاری بھابھی سے پوچھ لو کہ طے تھا یا نہیں؟ پھر آ کر مجھ سے بات کرو کیا رولا ڈالا ہوا ہے۔ آئندہ کسی کو بھی اِس موضوع پر مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، ماشاءاللہ حمایتی ننھیال موجود ہے، سرپرست ہیں فکر کس بات کی۔''[۱۰۰]

آمنہ مفتی ''جرأتِ رندانہ'' میں منیر اپنی بہن شہلا، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جدیدیت کی حامل ہے، جب کہ اِس کا بھائی شادی کے لیے اُسے قائل کرتا ہے تو شادی شدہ زندگی کے سماجی مسائل اور سماجی رویوں کی وجہ سے شادی سے خائف یہ لڑکی معاشرتی روایات کی نفی کرتی ہے:

''How dare you منیر! تم سے بڑی ہوں میں۔ اپنی جہالت مجھ پر مت جھاڑو۔ اپنے جیسے میٹرک فیل دوستوں ہی میں کیا کرو ایسی تھرڈ کلاس باتیں۔ سمجھتے کیا ہو تم مجھے کہ نسیم شاہ کی طرح گھر بٹھا کے 'بی بی صاحب' مشہور کر دو گے کہ مجھ پر جن آتے ہیں، پری کی حاضری ہوتی ہے یا خدیجہ ملک کی طرح قرآن پہ ہاتھ رکھوا کر نکاح کا حق معاف کروا لو گے۔ damn it منیر! میں اُن میں سے نہیں ہوں۔ تم لوگوں کے پاس بیٹھ کر یا تو پرانے ذکر کر کے روئے جاؤں یا پھر ان دیواروں سے سر پھوڑوں۔ اسی لیے یہاں نہیں آتی میں، اِس کنویں میں ٹرانے کو آپ دونوں کافی ہیں۔''[۱۰۱]

عورت کے لیے شادی کے بعد سے عام طور پر سب سے بڑی مشکل سُسرالی مظالم کی صورت میں نازل ہوتی ہے۔ شوہر، ساس سُسر، نندیں، دیور، جیٹھانی، دیورانی اور دیگر سُسرالی رشتہ دار ہر وقت طنز و تعریض اور تمسخر اُڑانا، لڑکی اور اُس کے گھر والوں کو کمتر متصور کرتے ہوئے طعنہ زنی کا بازار گرم رکھنا۔ شوہر کی طرف سے نان نفقہ کی برائے نام ادائیگی یا عدم ادائیگی، ذہنی اذیتوں کے علاوہ جسمانی تشدد، کم جہیز لانے کی پاداش میں جلا دیا جانا معمول سمجھا جاتا ہے اور عورت کو ہر حال

میں گزارا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ظلم کا یہ بازار گرم ہی رہا ہے، اسی طرح اگر عورت بانجھ ہو تو زندگی کے تمام راستے اِس پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ بانجھ مرد کے عیب کو جانتے ہوئے بھی اہلِ خانہ بے اولاد ہونے کا طعنہ عورت کے سر منڈھ دیتے ہیں اور مرد اسی آڑ میں شادیوں پر شادیاں کیے جاتا ہے۔ بیوہ، مطلقہ اور بانجھ عورتوں کے مسائل کو بہت سے ناول نگاروں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اِن میں فضل کریم فضلی کا ''خونِ جگر ہونے تک''، شوکت صدیقی ''خدا کی بستی''، ''جانگلوس''، رضیہ بٹ ''معاملے دل کے''، اے آر خاتون ''کہانیاں''، ''افشاں'' وغیرہ شامل ہیں۔ قتل و جائیداد کے حصول، پرانی دشمنیوں کے خاتمے کے لیے بھی عورت ہی کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ سلیمان بٹ کے ناول ''گھائل روحیں'' میں قتل کا معاملہ نپٹانے کے لیے مخالفوں کی عورتوں کو بھینٹ چڑھائے جانے کا ذکر بھی ملتا ہے: ''معاملہ خراب ہو چکا ہے، وہ صلح کے بدلے زمین اور دو کنواری لڑکیاں بھی مانگ رہے ہیں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اگلے جمعے سے پہلے پہلے اِن کے کچھ بندوں کو اٹھوالوں، شاید وہ ضد سے باز آ جائیں۔''[۱۰۲]

صدیق سالک کے ناول ''پریشر ککر'' میں فطرت کا باپ چوہدری کرم دین ایک دیانتدار لائن مین تھا۔ ایک روز کھمبے چڑھ کر تاریں ٹھیک کر رہا تھا کہ ایک راہگیر لڑکی کو اکیلا پا کر غنڈے زبردستی گاڑی میں اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کرم دین فوراً لڑکی کی مدد کے لیے پہنچا، لڑکی کی جان و عزت، تو بچ گئی، لیکن خود شدید زخمی ہو کر ہسپتال میں چل بسا، اِس کی بہادری پر حکومت کی طرف سے ایک گولڈ میڈل اور خصوصی اعزاز دیا گیا۔ چک نمبر ۲۳۰ گ۔ب میں موجود کرم دین کا بڑا بھائی اشرف عرف اشرفو نے ساری جائیداد پر قبضہ کر کے بھائی کی بیوی بچوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ ریشماں کے میکے سے ایک شخص نے آ کر سمجھایا کہ اپنا پیسہ اور زیور بنک میں جمع کروا دو، تاکہ رقم بھی محفوظ رہے اور خرچے کے لیے سود بھی آتا رہے گا۔ ریشماں نے اعتماد میں آ کر اپنی جمع پونجی اُس کے ہاتھ میں دے دی اور وہ شخص غبن کر کے فرار ہو گیا۔ چوہدری کرم دین کی بیوہ، جب اپنی کھوئی ہوئی رقم کی تگ و دو میں تنہا کاوشیں کرتی ہے، تو اِس کا جیٹھ شرفو اُسے نشانہ تنقید بناتے ہوئے بے انتہا تشدد کرتا ہے:

> ''میں اِس گاؤں کا چوہدری ہوں، کرموں کا بھائی ہوں، تم جس طرح روز معصوم بچوں کو اندر بند کر کے پھرتی رہتی ہو، کبھی بنک میں جاتی ہو، کبھی تحصیل میں جاتی ہو، کبھی مولوی صاحب سے ملتی ہو، کبھی کسی اور کے پاس چلی جاتی ہو، تم نے، تو ہمارے خاندان کی ناک کٹوا دی ہے، ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے، 'عزت کے رکھوالے بنے پھرتے ہو ذلیل، کتے، ہٹ جاؤ میرے راستے سے،' ہائیں تیری یہ جرأت' یہ کہہ کر شرفو نے سرِ عام رشیماں کو پیٹنا شروع کر دیا، وہ نڈھال ہو کر گر پڑی۔ گاؤں والوں نے بڑھ کر اِس کی جان بچائی، وہ گاؤں جسے ادیب اور شاعر جنتِ نظیر لکھتے ہیں، ریشماں اور اُس کے دو بچوں کے لیے دوزخ بن گیا، وہ آخر کار چھتے، طعنے، چیختے فاقے جنس زدہ مولوی اور انا خوردہ شرفو کو پیچھے چھوڑ کر کوچ کر گئی، کرموں کی ڈیوڑھی پر تالا پڑ گیا۔''[۱۰۳]

رفعت مرتضٰی کے ناول ''آدم کی پسلی'' میں حقوقِ نسواں کے تحفظ کے حوالے سے ہونے والے ایک اجلاس میں شریک خاتون مقالہ نگار نے طلاق کے حوالے سے اپنا مؤقف پیش کرتی ہے:

''عورتیں طلاق لے رہی ہیں، اتنی شادیاں نہیں ہو رہیں، جتنی طلاقیں ہو رہی ہیں، میں نہیں کہتی یہ غلط ہے، ضرور ایسے ہی ہو رہا ہوگا، مگر یہ پوچھنا ہم ضرور بھول جاتے ہیں کہ غلطی پر کون ہے، ماں، باپ، جنھوں نے لڑکی سے پوچھے بنا اس کی شادی کر دی؟ لڑکی، جو ابھی ذہنی اور جذباتی طور پر اتنے بڑے قدم کے لیے تیار نہیں تھی؟ شوہر، جس نے جسمانی قربت کو ذہنی قربت سے پہلے طے کر لیا؟، معاشرہ، جو غیر شادی شدہ، آزاد خیال، خود کفیل عورتوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا۔'' ۱۰۴

رضیہ فصیح احمد کے ناول ''انتظارِ موسمِ گل'' میں جلد بازی اور چوری چھپے کی شادیوں کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے:

''یہ لوگ بیٹیوں کی شادیاں اِن کا سکھ دیکھ کر نہیں اپنا سکھ دیکھ کر کرتے ہیں، اُن کی شادیاں نہیں کرتے۔ اَب بڑے صاحب، تو بڈھے ہو ہی گئے ہیں۔ چھوٹے صاحب کا کوئی بچہ ہے نہیں، اگر خدا نہ کرے چھوٹے صاحب کو کچھ ہو جائے، تو یہ ساری جائیداد کس کے قبضے میں جاتی ہے۔۔۔ آپ بھی ذرا ہوشیار رہا کریں۔ سو دوست سو دشمن، کوئی عورت ایسی ویسی چیز کھلائے، تو کبھی نہ کھائیں۔۔۔ اپنے گاؤں کی کوئی عورت اگر حلوہ یا پان وان دے، تو آپ نہ کھائیں، بعض دفعہ یہی کٹنیاں مل جاتی ہیں دشمنوں سے۔'' ۱۰۵

''حسرتِ عرضِ تمنا'' میں فرخندہ لودھی نے ظلم، نا انصافی، جبر اور منافقت، ریا کاری اور سماجی ناہمواری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے، خصوصاً عورت کے ساتھ رکھے گئے ناروا سلوک کی شدید مذمت کرتے ہوئے ہر طبقے کی عورت کی زندگی کے مسائل اور اُس کی اُلجھنوں کو بڑے بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے:

''پونا کی پھوپھی بوڑھی کنواری مر گئی، اس کے بدن کو کسی مرد نے نہیں چھوا، وہ بیوہ تھی، ہاں بیوہ۔ بچپن میں نکاح ہوا، رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ میاں مر گیا، میاں کے ساتھ ہی اِس کے لیے لوگوں کے دِلوں میں احساسات و جذبات مر گئے، وہ کب جوان ہوئی؟ اِس کے شباب کی شان کیا تھی؟ کب زندگی کا چمک دار وہ پہلا دِن سیاہیوں کی آغوش میں چلا گیا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔'' ۱۰۶

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے خانگی زندگی کی خوشحالی کا مظہر میاں بیوی کی ذہنی مطابقت، ایک دوسرے کی خاطر اپنی خواہشات کی قربانی اور ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ جانے کو قرار دیا ہے:

''کیا ایک شوہر کا فرضِ اولین نہیں کہ اپنی چہیتی بیوی کی خوشی میں شریک ہو؟ کیا بیوی کے رنج و غم اور ہنسی اور خوشی میں شوہر کا شریک ہونا لوازمات میں سے نہیں ہے؟ ضرور ہے اور بالضرور۔ سچے دِل سے بیوی کی ہر خوشی میں شریک ہونا چاہیے۔ لہٰذا، مجھ کو بھی سچے دِل سے مجبوراً خوش ہونا پڑا! چناں چہ فوراً ہی میں نے سب سے پہلے خانم کی اِس رائے سے اتفاق کیا کہ خوشی کا موقع ہے۔'' ۱۰۷

شوہر کی حادثاتی موت اور شوہر کی قید کے باعث عورت کو معاشرہ تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے: ''منحوس ہے یہ، جس جس

گھر میں پہنچی کوئی مرد رہا ہی نہیں، سنا ہے پیدا ہوئی تو باپ مر گیا۔ خالہ نے بیٹی بنالیا تو خالو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پھر خالہ کے بیٹے کے ساتھ ناتا بندھا، وہ قتل ہو گیا۔ دوسرے کے ساتھ نکاح ہوا تو اُس نے طلاق دے دی، جو بچ گیا ورنہ اُس نے نہیں رہنا تھا۔''۱۰۸ شوہر کی بے اعتنائی اور بے رُخی کی تصویر کشی ''جرأتِ رندانہ'' میں کی گئی ہے:

''اُسے خوب یاد تھا کہ جب اِن دونوں کی شادی ہوئی تو چودھری صاحب بڑے بانکے جوان تھے۔ سنہری شیروانی، چیئر میں نخنے کی شلوار، اونچا کلاہ اور یہ بڑا سا ہاتھ اور اِس میں یہ انگوٹھی۔ سارا کمرہ گلابوں سے مہک رہا تھا۔ آج بھی وہ کہیں دیسی گلابوں کی مہک سونگھتی تھی، تو اُسے اپنا دلھا یاد آجاتا تھا اور یہ چودھری۔۔۔؟ یہ تو کوئی اور تھا۔ وہ دولھا جو چند گھنٹوں کے لیے آیا اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ باسی پڑتے گلابوں کی تھکی تھکی مہک میں یہ چودھری اس کے سامنے تھا۔ ایک بند لفافہ جس کے اندر کی سر بمہر تحریر کو نہ کبھی اُس نے پڑھنے کی کوشش کی اور نہ کبھی چودھری صاحب نے اپنا اندر ظاہر کیا۔''۱۰۹

خانگی تشدد میں شوہر اور سُسرال کا تشدد عام ہے دیکھنے میں آیا ہے وہی عورت زیادہ ظلم وستم کا شکار ہوتی ہے، جس کا شوہر اُس کی عزتِ نفس کی محافظت نہیں کرتا، نہ صرف خود اُس کی ذلت ورسوائی کا باعث بنتا ہے، بلکہ اُسے اہلِ خانہ کے ہاتھوں بھی بے عزت کراتا ہے۔ عورت پر سُسرالوں کا یہ تشدد دراصل احساسِ کمتری اور ہر طرح سے دبائے رکھنے سے تسکین پانے کی کوشش ہے۔ عصمت چغتائی کے ناول ''معصومہ'' کا کردار عدم اعتمادی اور ناکامی کے خوف سے دوچار ہے اُس کا احساسِ کمتری اُسے سگے رشتوں کے علاوہ، خود ساختہ رشتے داریوں کو نبھانے اور نفسیاتی سطح پر خود کو مصروف اور اہم سمجھنے کی ادنیٰ کاوش کو حاصلِ زندگی سمجھتا ہے، لیکن ناکامیاں اُس کا مقدر بن جاتی ہیں:

''جب پتیلا چمچہ بن جائے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اُسے چمچہ بازی کے تمام گُر آتے تھے۔ وہ مختلف پروڈکشنز میں رہا، جس کے ساتھ کام کرتا بس اُسی کا ہو رہتا۔۔۔ جس کے گھر میں رہتا، رشتہ دار بن کر رہتا، اُس کی بیوی سے فوراً ماں بہن یا بھابی کا رشتہ لگا لیتا۔ اُس کی ماں کو اماں کہتا۔ اُس کی ساس سے بالکل دامادوں کی طرح ملتا، اُس کی بہنوں کو کنوارپنے کا غم غلط کرنے میں مدد دیتا، اُس کے بچوں کو باپ کی مصروفیت کی وجہ سے شفقتِ پدری دیتا اور شوہر کی جدائی میں آنسو بہانے والی بیوی کے سرد ہاتھ گرماتا اور اُس کے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لیتا۔ ایک طرف وہ اپنے مالک کو داشتہ سپلائی کرتا دوسری طرف اُس کی بیوی کے سینے میں بھڑکتی ہوئی سوت کی جلن پر مرہم رکھتا، اگر بیوی کو آپا کہتا تو داشتہ کو فوراً بھابی بنالیتا، اِس لیے اُس سے سب خوش تھے۔''۱۱۰

راجندر سنگھ بیدی کے ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں رانو کا شوہر تلوکا بے جا مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ، گالی گلوچ اور رُعب داب سے کام لیتا تھا، رانو ساس کے دھکے اور مار پیٹ سہتی رہتی، لیکن جب اُسے گھر سے نکالا جانے لگا، تو بے اختیار رو پڑی، رانی پر ساس کے مظالم کا ذکر بیدی نے اِس انداز سے کیا ہے:

''رانی کو، تو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تنکلے کھڑے ہو جاتے اور وہ رانی پر اپنی

گالیوں کے چھاجوں کے چھاج خالی کر دیتی: رنڈیے! چڑیلے! میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب، تو سب کو کھانے کے لیے منہ پھاڑے ہوئے ہے۔ چلی جا۔ جدھر منہ کرتا ہے کر لے، اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے لیے۔۔۔ رانو، جسے اپنے شوہر کے مرنے پر رونا نہ آیا تھا ایک دم بلک اُٹھی۔۔۔ میں کیوں جاؤں؟ کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی؟۔۔۔ اس گھر میں رہے بھی تو کیسے؟ بچے اب پل چکے تھے اور قاعدے سے وہ اب تلو کے کے تھے۔ اس کے تھوڑے ہی تھے، جس عورت کا پتی مرجائے اسے اُس کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔''[۱۱۱]

عزیز احمد کے ''گناہ و رنگین'' میں خانگی زندگی کی تباہی کا بہت بڑا سبب ناجائز تعلقات و معاشقے ہیں۔ حرام کاری کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد معاشرے میں جینے کے قابل نہیں ہوتی، بلکہ سماج کی پیشانی پہ بدنما داغ ہوتی ہے:

''بات وہی تھی اگر رفعت سے اُس کی شادی ہوئی ہوتی تو کوئی حرج نہیں تھا، مگر اب؟ بظاہر وہی بات تھی، مگر دُنیا کے نزدیک دونوں صورتوں میں بہت فرق تھا۔ غلط فرق سہی مگر فرق تھا اور مصیبت یہ کہ رفعت کل جارہا ہے۔ ورنہ شاید نکاح جلد ہوسکتا۔ یہ داغ چھپ سکتا۔ خدا کرے اور زیادہ بُرے نتیجے پیش نہ آئیں، اس گناہ کا وہ خمیازہ نہ ملے، جس کو گناہ کی وجہ سے خمیازہ کہتے ہیں، لیکن اگر شادی ہو چکی ہو تو وہ اولاد کہلاتا ہے۔''[۱۱۲]

شوکت صدیقی کے ناولوں کا اہم ترین موضوع استحصال زدہ عورت ہے، ایک ایسی عورت، جسے محض تفریح کا کھلونا سمجھا جاتا ہے، جس کی بے بسی اور مجبوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے اذیتوں سے دوچار کیا جاتا ہے ''خدا کی بستی'' میں نوشا کی ماں اور سلطانہ ایسی ہی بے بس اور لاچار عورتوں کی تصویر ہیں، جنھیں نہ، تو سماجی روایات جینے دیتی ہیں اور نہ ہی معاشرے کے لوگ، اکیلا جان کر ہر کوئی ان پر حق جمانا مردانگی سمجھتا ہے۔ نیاز جیسا کمینہ اور گھٹیا انسان کرایے کے عوض اپنی خباثتوں کو عملی جامہ پہنانے کی کاوشوں میں لگا رہتا ہے۔ نوشا کی ماں رضیہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد اپنے تینوں بچوں نوشا، سلطانہ اور انو کی خاطر محنت مزدوری کرتی ہے اور افلاس اور مجبوریوں سے تنگ آ کر نیاز جیسے خبیث انسان کو، جو اس کا مالک مکان بھی ہے، گھر میں بٹھانے اور بات چیت کرنے پر مجبور ہوتی ہے، جب کہ نیاز کی نظر ماں کی بجائے اُس کی بیٹی سلطانہ پر ہے۔ سلطانہ کے حصول میں سب سے بڑی رُکاوٹ اس کی ماں رضیہ ہے، چناں چہ وہ اپنی شیطانی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رضیہ سے شادی کا منصوبہ بناتا ہے۔ اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے رضیہ کا اعتماد حاصل کرنے کی خاطر گاہے بگاہے، اُن کے گھر جاتا ہے، تحائف، کھانے پینے کی اشیا کے علاوہ ان کے معاملات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے، خوش گپیوں کے جوہر بھی بکھیرتا رہتا ہے۔ رضیہ مصلحتاً نیاز سے شادی کرنے پر راضی ہو جاتی ہے، لیکن وہ اس کی نیت کے فتور سے بے خبر نہیں، وہ نیاز سے نکاح سے پہلے سلطانہ کو سلیمان سے بیاہنے کے لیے سلیمان کو راضی کرتی ہے، تا کہ راتوں رات سلطانہ کو رُخصت کر دے۔ رضیہ نے نیاز کی ایما پر لگائے جانے والے زہریلے انجکشنوں کے زیر اثر زندگی کی بازی ہارنا شروع کر دیتی ہے، جب وہ انجکشن لگوانے سے انکار کرتی ہے، تو جواباً اُسے گالی گلوچ اور مار پیٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

''اسی سالے بھڑوے نے، تو تمھارا دماغ خراب کیا ہے، مُرے ہوئے کو گالی دیتے تم کو

شرم نہیں آتی ؛ حرام زادی سر پر چڑھے چلی جا رہی ہے تیری تو، اس نے گندی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ 'اچھا تو اب تم مجھ پر ہاتھ بھی اُٹھاؤ گے'، نیاز نے کئی گالیاں دیں اور اس کے منہ پر زناٹے کا ایک تھپڑ رسید کیا، پھر دوسرا، تیسرا، اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا، وہ کاموش کھڑی مار کھاتی رہی، نیاز نے اس کی کمر پر کئی لاتیں ماریں اس نے دیکھا ماں فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی اور نیاز اس کے قریب کھڑا اخچر کی مانند اور زور سے ہانپ رہا تھا، اس کی آنکھیں خونخوار ہو رہی تھیں، منہ سے کف جاری تھا۔'' ۱۱۳

ناول ''رات'' میں عبداللہ حسین نے خانگی زندگی میں عورت و مرد کو درپیش مسائل کو موضوع بنایا ہے، کہ عورت ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ محض ایک کل پُرزہ نہ سمجھا جائے، جس نے صرف گھریلو اُمور انجام دینے ہیں، مرد کی خدمت کرنی اور بچوں کی پرورش کرنا ہے۔ ایسے میں عورت کی اپنی ذات اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور وہ خود سے بیگانہ ہونے لگتی ہے، کیوں کہ ۲۴ گھنٹوں میں اس کا بیشتر وقت انھی اُمور کی انجام دہی میں گزرتا ہے اور معمولی سی بات پر اسے سرزش کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، ثروت بھی ایک ایسا کردار ہے، جو عورت کو زندہ گوشت پوست کی انسان ہے۔ مرد کو اسے اپنے جیسا سمجھنا چاہیے۔ ''اُداس نسلیں'' میں پہلی جنگِ عظیم سے لے کر تقسیم ہند کے واقعات کو پیش کیا گیا ہے، اِس کے نسوانی کرداروں میں عذرا، ''باگھ'' کی یاسمین، ''قید'' کی رضیہ اور ''نادار لوگ'' کی سکینہ اظہارِ محبت میں بہت بے باک اور نڈر ہیں اپنے جنسی جذبے کے اظہار میں گھٹن کا شکار نہیں ہیں۔ مرد کا احساسِ برتری عورت میں خوبیوں کا متلاشی، تو ہوتا ہے، لیکن تسلیم نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ گاہے بگاہے اس کے احساسات کو کچلنے سے گریز نہیں کرتا۔ مرد کی برتری کا غیر معمولی احساس نا آسودگیوں کو جنم دیتا ہے۔ عبداللہ حسین کے نسوانی کردار زیادہ متحرک بھی ہیں اور زندہ بھی یہ کردار ایک دوسرے سے جسمانی حظ اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔ عورتوں کی بے با کی اور جرأت مندی غیر معمولی ہے۔ عورت کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت بھی مردوں کے دِلوں میں وہ مقام نہیں بنا پاتی اور وہ اس کی بے رُخی کا شکار نظر آتی ہے، مثلاً ''اُداس نسلیں'' میں عذرا اور نسیم ایسے کردار ہیں۔ عذرا تمام عمر وفائیں نبھا کر بھی تنہا رہتی ہے اور نسیم اپنی تمام تر ذہنی اور وقت گزاریوں کی وجہ سے ایسے توجہ نہیں دے پاتا اور رصلے میں توقعات اِس سے وابستہ رکھتا ہے، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کی گھر بار سے عدم دلچسپی کے اس کی بیوی پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں، وہ محض یہی سمجھتا ہے کہ اس کا اندازِ فکر درست ہے۔ ''نشیب'' ایاز کی داستانِ حیات ہے، جس کا تعلیمی سفر کسمپرسی کی نذر ہوا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم سے لگن پیدا ہوئی اور وہ نامور بیرسٹر بن گیا۔ اِس میں سب سے اہم کردار اِس کی بیوی نسیم کا ہے، جو بڑی متحرک و فعال ہے۔ ایاز کے دوست واحباب کی بڑی اچھی مہمان داری کرتی ہے۔ گھر ہستی کی خاطر کالج کی نوکری چھوڑ دیتی ہے اور اپنا تمام وقت اپنے شوہر پر وقف کر دیتی ہے، دیگر مردوں کی نزدیک ایک مثالی کردار ہے، لیکن اپنے شوہر کی نظر میں اس کی حیثیت معمولی تھی۔ جس کی وجہ ایاز کا احساسِ کمتری تھا، کیوں کہ وہ اس کی بہ نسبت زیادہ فعال اور ہر دلعزیز تھی، اس کا مدح ہونے کے ساتھ ساتھ ایاز نفسیاتی طور پر اس کی شخصیت سے خائف بھی تھا، اِس کے برعکس نسیم نے ایاز کی برتری کو ہمیشہ تسلیم کیے رکھا: ''تم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میں بھی کوئی ہوں، تمہاری طرح، دوسروں کی طرح، ایک انسان ۔۔۔ اور دیکھتی بھالتی ہوں، سوچتی ہوں، محسوس کرتی ہوں، کوئی وجود رکھتی ہوں، جیسے ہر کوئی رکھتا ہے، جیسے تم رکھتے ہو۔ ۱۱۴

''راجہ گدھ'' میں قیوم کا کردار راجا گدھ کی مانند ہے، جو سیمی کے علاوہ کئی لڑکیوں، شادی شدہ عورتوں سے جسمانی تعلقات پیدا کر چکا ہے۔ عابدہ ہو یا امتل سب گِدھوں کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں، جو نہ صرف اپنے شوہروں کو دھوکا دیتی ہیں، بلکہ اپنی ذات کو بھی فریب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ ''قیوم'' ایسا کردار ہے، جسے بچپن میں ماں باپ نے نظر انداز کیے رکھا اس کی ماں شوہر کی طرف سے نظر انداز کیے جانے، عدم توجہی اور غیر عورتوں کو مرکزِ نگاہ بنائے رکھنے کی وجہ سے بددل ہوگئی تھی اور انتقاماً غیر مرد سے تعلقات اُستوار کر بیٹھی۔ شوہر کی بے اعتنائی اور سسرال والوں کا اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک اس بات کا اہم محرک ثابت ہوا اِس کا اندازہ اس کی ماں کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ مرد کی بیوی بچوں سے عدم توجہی بہت بڑے خانگی بحران کا سبب بنتی ہے، بانو قدسیہ نے اِس حقیقت کو ''راجہ گدھ'' میں بڑی مہارت سے پیش کیا:

> ''کتنے ہی سال سسرال میں رہو، کتنے ہی بچے جنو۔۔۔ کیسے کیسے کاف سنوارو، کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ سسرال میں، تو شوہر بھی اپنا نہیں ہوتا، دوسروں کا گلہ کیسا؟ چوں کہ میں اس وقت صرف ساتویں میں پڑھتا تھا اور پوری شادی کے قابل نہیں ہوا تھا، اس لیے میں رونے لگا، میں ماں کی باتیں سمجھ نہیں رہا تھا، صرف ماں کی آواز میں نے اس کے دُکھ تلے ماں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔'' ۱۱۵

بیوی کی حق تلفی کر کے ماں کو فوقیت دینے والوں کی بیویاں عموماً اُنھیں ناپسند کرتی ہیں۔ بیوی کی اپنی حیثیت ہوتی ہے اور ماں کا اپنا مقام، اِن دونوں میں توازن بہت ضروری ہوتا ہے، عموماً بیوی کے حقوق، اِس کی ضروریات اور فرائض کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو قطعی نامناسب ہے اور انتشار کا موجب ہوتا ہے۔ عابدہ بھی ایسے ہی متضاد رویوں کا شکار ہے:

> ''خدا کی قسم قیومی ایسے مرد سے کبھی شادی نہ ہو جسے ابھی اپنی ماں کی کچھڑ کا شوق ہو۔ بڈھے پھونس ہو جائیں گے، لیکن گودی کا شوق نہیں جائے گا۔ بکری کے میمنے کی طرح ماں ماں کرتے مریں گے، نسیم ویسے تم مانو نہ مانو ساری مرد ذات ماں کی خصم ہوتی ہے، یہ وحید ہے نا، جب یہ مرے گا، تو میں اس کے کتبے پر لکھواؤں گی، یہاں ایک ماں کا یار دفن ہے۔'' ۱۱۶

''لازوال'' میں بشریٰ رحمٰن نے خدیجہ بیگم کے برعکس ایسی بھی عورتیں ہیں، جو اپنے غم و غصے کا نشانہ دوسروں کو بنائے رکھتی ہیں، مثلاً نایاب کی ساس، جرنیل آپا نے تمام عمر نہ صرف اپنے شوہر، بلکہ بچوں کو بھی اپنی انا کی بھینٹ چڑھائے رکھا اس کی رقابت بہو کے ساتھ عروج پر پہنچتی ہے۔ ماحول کے لیے باغیانہ رویے کی وجہ سے صنفِ مخالف کی طرف مائل ہونے لگی، تو اس کی شادی شہباز سے کر دی جاتی ہے۔ ساس اور بہو کی ازلی کشاکش اور حسد یہاں بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک ماں اپنے بیٹے کی توجہ کا مرکز بہو کو بنتا دیکھ کر بہت زیادہ حسد اور رقابت محسوس کرتی ہے اور جب وہ اس کے بچے کی ماں بننے لگتی ہے، تو اسے طرح طرح کے چرکے لگاتی ہے اور اذیتوں سے دوچار کرتی ہے۔ ایک جگہ، تو اس کا حسد اس قدر نمایاں ہوتا ہے، جب کہتی ہے: ''خدا غارت کرے اِس ذلیل لڑکی کو، نحوست کا سایہ بن کر ہمارے گھر آ گئی تھی، مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔'' ۱۱۷ ضیہ بٹ نے ''معاملے دل'' کے میں اسد ماں باپ کا چہیتا، لاڈلا بیٹا، جب باپ کے مرنے کے بعد اپنی ماں عصمہ اور بہن مومنہ کے ساتھ کبھی ددھیال اور کبھی ننھیال کی مار پھٹکار کھاتا ہے، اِس کے اندر نفرت اور بغاوت کا

لاوا پکنے لگتا ہے، جس کا نشانہ عموماً اُس کی ماں بنتی ہے۔ وہ خود کو کوستی ہے اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی ہے، جب اُس نے سُسرالیوں سے جائیداد کے حصول کی بات کی تو سب ہی اُس کے دُشمن ہو گے:

> ''میں کیا کروں، سسرال میں دیورانیوں نے شکوک و شبہات ظاہر کر کر کے جینے نہ دیا تھا، یہاں بھابیاں برداشت نہیں کر رہیں، معاملہ عصمہ کے حق میں نہ رہا، دیوروں نے آپس ہی میں بندر بانٹ کر لی تھی، سہارا اِس بات کا لیا تھا کہ رشید کی موت، چوں کہ باپ کی زندگی ہی میں واقع ہوگئی تھی، اس لیے جائیداد پر اُس کے بچوں کا کوئی حق نہ تھا۔ ۱۱۸

''چشمہ'' میں اے۔ آر خاتون نے شادی کے بعد لڑکی کو سُسرال میں درپیش مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنی بیوی کے قدردان مردوں کو بھی سراہا گیا ہے:

> ''یہ تو بہت اچھا ہے، اگر ساس ہوتیں، تو چھ مہینے میں لڑکی کو دق لگ جاتی، میں خوب جانتی ہوں قصبہ کی عورتیں بہوؤں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتیں اور خاص کر شہر کی لڑکیوں کو تو نکو بنا دیتی ہیں، اگر مرد عقلمند ہوتا ہے، تو کبھی گھر میں کسی قسم کے جھگڑے نہیں ہونے دیتا، ماں بہنیں اپنی جگہ، بیوی اپنی جگہ۔'' ۱۱۹

لڑکی کی شادی اور جہیز کے مسائل کو ڈاکٹر صادق کمال نے ''خانم'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''یہ ایک درخواست ہے جو قصرِ شیریں سے آئی ہے اور اِس کے بھیجنے والی ایک غریب بیوہ ہے وہ رقم طراز ہیں کہ اِس کی نوجوان لڑکی کی شادی کا معاملہ جہیز کے نہ ہونے کی وجہ سے رُکا ہوا ہے۔ اِس کے پاس اتنا اثاثہ نہیں کہ وہ اپنی بچی کے ہاتھ پیلے کر سکے۔ بیٹی کی جوانی اِس کی راتوں کی نیند کو مسلسل منتشر کر رہی ہے۔ اِس لطیف فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے وہ آپ کی مدد کی طالب ہے۔'' ۱۲۰

بیوہ، مطلقہ، غیر شادی شدہ اور بانجھ عورتوں کے مسائل مختلف ناول نگاروں کے ہاں ملتے ہیں، خانگی زندگی کے یہ وہ مسائل ہیں، جن میں مبتلا عورت کو نہ تو معاشرہ جینے دیتا ہے اور نہ ہی اُس کے اپنے اِس کا خیال رکھتے ہیں۔ معاشرہ بانجھ مرد کو تو برداشت کر لیتا ہے، بلکہ اُسے ہر طرح کا تحفظ دیتا ہے کہ کہیں اِس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، حتیٰ کہ اس کے گھر والے اِس کی دوسری جگہ شادی بھی ٹھہرا دیتے ہیں، لیکن نتیجہ ظاہر ہے، وہی نکلتا ہے اور اُس سے وابستہ عورت پر بانجھ کا لیبل لگا کر اِس کا جینا دشوار کیا جاتا ہے اور جب عورت واقعی بانجھ ہو، تو اُس کا کرب اور اذیت کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ ہر لمحے عدم تحفظ کا احساس کے علاوہ عزتِ نفس کو کچلا جانا، اُس کا نصیب بن جاتا ہے۔ ''آتشِ رفتہ'' میں بیٹے کی پھانسی کی خبر، جب دادی کو پہنچتی ہے، تو وہ کمال حوصلے کا مظاہرہ کرتی ہوئی، صبر کا دامن سمیٹتی ہے، تو گاؤں بھر کی عورتیں اُسے بُرا بھلا کہتی ہیں، جب کہ مرد اُس کی حوصلہ مندی کی داد دیتے ہیں:

> ''عورت نہیں پتھر ہے، اتنا سخت دِل، تو واہگرو کسی کا نہ کرے، ڈائن ہے ڈائن! خصم مرا تو تب نہ روئی اور اب اتم سنگھ کو پھانسی ہونے والی ہے۔ پر اِس کی آنکھوں میں ایک آنسو نہیں۔ ہر ایک کو پانی پلاتی ہے، خاطر کرتی ہے، جیسے اس کے گھر بدھائی دینے گئے ہوں

اور کل پرسوں برات آنے والی ہو، چوپال کی بھیڑ بھاڑ میں بیٹھا سردار مہر سنگھ کہتا ہے۔
بلے بلے بھئی عورت ہے پر مردوں سے بھی زیادہ حوصلے والی، دھیان پور والے ہی ایسی
شیرنی پیدا کر سکتے تھے۔ ہمارے گھر کی سوانیاں تو چوہے سے بھی ڈر جائیں۔ پردوں میں
بیٹھنے والیاں جو ہوئیں، بھئی ہم سردارنی کرتار کور کا مقابلہ کر سکتے ہیں بھلا؟، پھر وہ طنز سے
ہنستا اور سارے بیٹھنے والے یا تو اُس کا ساتھ دیتے یا چپ کر کے منہ پھیر لیتے اور رفتہ رفتہ
چوپال میں وہ جوش اور ولولے کی باتیں نہ ہوتیں۔'' ۱۲۱

رضیہ فصیح احمد کے ناول ''انتظارِ موسمِ گل'' کا طاہر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ جائیداد کی خاطر کزن سے شادی رچاتا ہے اور خود بانجھ ہونے کے باوجود تھوڑے ہی عرصے کے بعد اولاد کا بہانہ بنا کر اپنی کلاس فیلو سے معاشقہ لڑا کر، اپنی مظلومیت کے قصے سنا کر اُسے دامِ فریب میں گرفتار کر لیتا ہے، لیکن قدرت ایسے موقعوں پر خاموش تماشائی زیادہ عرصے تک نہیں بنتی، بلکہ بہت جلد حقائق کھل کر سامنے آجاتے ہیں، جب گاموں کو قتل کے مصنوعی مقدمے میں پھنساتا ہے، تو نوری غصے میں آکر اس کا تمام پول کھول دیتی ہے: ''گامو میرا او ہی ہے، جو گلزاراں تمھاری ہے صرف میں اس کے ساتھ سوتی نہیں تھی، جیسے تم گلزاراں کے ساتھ سوتے ہو، جتنا مارنا چاہتے ہو مارلو، پر جب سگے باپ کی اولاد مانوں گی، جو کہہ دو کہ رات تم گلزاراں کے ساتھ نہیں سوئے اور شادی کی رات تم اس کے پاس نہیں گئے تھے۔'' ۱۲۲

''معاملے دل کے'' میں رضیہ بٹ نے بیوہ عورت کے مسائل کو بیان کیا ہے، مثلاً جس مالک مکان کے پاس عصمہ کرائے دار ہوتی ہے، وہ اماں جی، جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ عصمہ غیر مردوں سے دوستانے بڑھاتی ہے اور چپکے چپکے میں ملاقاتوں کے سلسلے بڑھنے لگتے ہیں تو مالک مکان جو خود بھی بیوہ ہوتی ہے اُسے اپنی زندگی کی کہانی سنا کر راہِ راست پر لانا چاہتی ہے، تاکہ وہ عصمت کی اولاد رُسوائی کا زہر پینے اور نہ دوسروں کے گھر برباد ہوں:

> ''وہ بھی تقریباً عصمہ ہی کی عمر میں بیوہ ہوئی تھے، گو مالی طور پر وہ اتنی مستحکم تھیں، کہ اپنی اور دونوں بیٹوں کی ضروریات کے لیے اُنھیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا، نہ نوکری کرنا پڑی، لیکن پھر بھی بیوگی اور یتیمی کی محرومیوں سے اُنھیں قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑا تھا تکلیفیں اُنھوں نے بھی جھیلی تھیں، اذیتیں بھی سہی تھیں، لیکن ثابت قدم رہی تھیں، رشتے ان کے لیے بھی آتے تھے، لیکن اُنھوں نے دوسری شادی کا اس لیے نہیں سوچا تھا کہ بچوں کی نفسیات بگڑ سکتی ہے، جیسے تیسے وقت گزر رہی گیا تھا، اب بچے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔'' ۱۲۳

''افشاں'' میں نصیرہ بیگم ایسا کردار ہے، جس کا میاں انتہائی لالچی ہے۔ ہر وقت کی مار پیٹ اور تھکا فضیحتی کی وجہ سے اس کی اولاد بھی اس کے بس میں نہیں رہتی، حسن آرا کی نند ہے، لیکن ہمہ وقت تمام خاندان میں لگائی بجھائی کرنا، میاں بیوی میں پھوٹ ڈلوانا، جھوٹے الزامات اور بہتان طرازی کے جن میں ماہر ہے، اس کی دروغ گوئی کا یہ عالم ہے کہ معمولی باتوں پر خود کو بچانے کے لیے اللہ، رسول اور قرآن وکلمہ کی قسمیں کھانے سے گریز نہیں کرتی۔ افشاں کا نکاح فسخ قرار دیے جانے اور زرتاج کے ساتھ مل کر افشاں کو طلاق دلوانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے، ان دونوں کی در پردہ خواہش ہی ہوتی ہے کہ

اپنے نالائق اور ناخلف بیٹوں سے اسے بیاہ دیا جائے، تا کہ ایک بہت بڑی جائیداد اِن کے ہاتھ آ جائے اور زندگی کے بقیہ دن آسودگی وخوشحالی میں گزر جائیں۔ اے۔ آر خاتون نے ناول ''کہانیاں'' میں لکھتی ہیں، ایک وزیر اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دیتا ہے کہ اُس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ سُسرال کے علاوہ لونڈیاں، مہترانیاں میاں کی ناقدری کی وجہ سے اسے نشانۂ طنز وتمسخر بناتی رہتی ہیں:

> ''اِن بے چاری کی طرف سے وزیر نے، تو بے رخی اختیار کر لی، صورت تک دیکھنی گوارا نہیں تھی، ساس کے پاس رہنے لگیں، وہ ہر وقت طعنے دیتی تھیں، اپنی نئی بہو کی تعریفیں کرتی رہتی تھیں۔ ایک سال کے بعد اُس کے ہاں بیٹا ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، ان کی اور بھی ناقدری ہو گئی، محل کے ایک کونے میں پڑی رہتی تھیں۔ مغلانیاں، لونڈیاں تک مذاق اُڑاتی تھیں۔ ساس، تو ہر وقت منحوس سبز قدم ہی کہا کرتی تھیں، آخر مجبور ہو کر ساری کیفیت بھائی کو لکھ کر بھیجی، وہ خود گئے اور طلاق دلوا کر لے آئے۔''۱۲۴

''اقبالِ جرم'' میں بانجھ مرد کی جنسی نا آسودگی کی شکار عورت گاؤں کے نوجوان یوسف سے ناجائز تعلقات اُستوار کر لیتی ہے۔ درپردہ اولاد کی خواہش اُسے جرم کرنے پر آمادہ کرتی ہے، جس میں یوسف موت کی سزا پا لیتا ہے اور یہ عورت اولاد:

> ''یوسفے! تم نے مجھے بھر دیا ہے۔ مکمل کر دیا ہے میں تو ویران کھیتی تھی۔ تمھیں پتا ہے ویران کھیتی کا دُکھ کیا ہوتا ہے؟، یوسف خاموش رہا۔ میں ماسے، مامی اور فیقے کو کاٹنے کو دوڑتی تھی مجھے دورے پڑتے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے تھے، وہ مجھے پیروں فقیروں کے ڈیروں پر لیے پھرتے تھے۔ میں راتوں کو گھر سے باہر نکل جاتی تھی۔ کپڑے پھاڑ دیتی تھی۔ میرے اندر ویرانی جب جلتی تھی تو ساری ساری رات صحن میں نلکے کی دھار کے نیچے بیٹھی اپنی اِس آگ کو ٹھنڈا کرتی رہتی تھی۔''۱۲۵

عورت بہ حیثیتِ ماں بھی استحصال کا شکار ہوتی ہے، اپنی بسیار قربانیوں کے باوجود اولاد کے ناپختہ ذہنوں میں ماں کے خلاف پروپیگنڈہ نفرتوں کا بیج بو دیتا ہے اور اولاد لاشعوری طور پر ماں سے متنفر ہونے لگتی ہے، شوہر اور اُس کے عزیز واقارب اپنی تمام بے انصافیوں اور مظالم کے بچوں کی ہمدردی وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اولاد کی تربیت اس کی نالائقیوں کی تمام ذمہ داری ماں ہی کے کندھوں پر لاد دی جاتی ہے۔ بلونت سنگھ کے ناول ''رات، چور اور چاند'' کا کاہن سنگھ جس کی یتیمی پر ترس کھا کر ایک عورت نے اپنا بیٹا بنایا تھا، وہ اس کے ساتھ سلوک کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''بڑا چلتا پُرجا ہے، وہ عورت جس نے اسے بیٹا بنایا ہے، رنڈوی تھی، اکیس بائیس برس کی مجاج چنچل تھا، اِس کا کچھ مال بھی تھا، ادھر کاہن سنگھ یتیم تھا، لیکن ویسے بڑا حرام کا تکھم تھا عورت نے اُسے بیٹا بنا لیا، دو چار برس باد، جب اُس کی داڑھی مونچھ پھوٹنے لگی، تو ایک رات اندھیرے میں اِس عورت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا، 'وے کاہن' یہ کیا کرتا ہے، تو اُس حرامی کے پلے نے جباب دیا، بے بے جرا دیر باد پوچھ لیتی، تو تیرا کیا بگڑ جاتا

اِس پر عورت نے نہ اُسے کچھ کہا اور نہ کوئی سوال جواب کیے۔"۱۲۶

"جانگلوس" میں پنجاب کے جاگیردار اور زمیندار طبقے کی عکاسی بڑی حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے، اس کے علاوہ سیاست دانوں، افسرانِ بالا کی بے انصافی، بالا دستی، دھاندلی، لاقانونیت کے علاوہ غریب اور جفاکش عوام کی مظلومیت اور کسمپرسی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور شہری اور دیہی زندگی کے مصائب اور مسائل کا موازنہ بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے، یہ ناول جیل سے مفرور ہونے والے دو قیدیوں بدلی اور رحیم داد کی سرگزشت ہے، جن کو درپیش مسائل دراصل ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی لاقانونیت، استحصال و جبر کی داستان ہے۔ ناول نگار نے پنجاب کے دور دراز علاقوں، ساہیوال، ملتان اور بھکر کا انتخاب کرتے ہوئے جاگیردار طبقے پر ہماری معیشیت اور سیاست کے اوچھے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ایسے زمینداروں کے بھی بھید کھولے ہیں، جن کی جدی پشتی زمین انگریز سرکار سے "وفاداری اور نمک خواری" کا نتیجہ ہے، یہ لوگ جب چاہیں کسی کی زمین پر قابض ہو جائیں یا کسی کو اپنا غلام بنالیں، عورتوں کو اغوا کر کے اُنھیں اپنی رکھیل بنالیں اور جب چاہیں مظلوم مزارعوں کی فصلوں کو اُجاڑ دیں، ڈھور ڈنگر اور مویشوں پر قابض ہو جائیں، پنجاب کے دور دراز علاقوں کے جاگیرداروں کی ذاتی جیلیں، عدالتیں اور کچہریاں تھیں، جہاں کے قاعدے وقوانین ان کے اپنے ہیں۔ حکومت خود بھی ان کے معاملات میں مداخلت کرنے سے گریز کرتے ہیں، یہ زمیندار و جاگیردار اس قدر لالچی ہیں کہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادیاں اس ڈر سے نہیں کرتے تھے، کہ جائیداد گھر سے باہر چلی جائے گی۔ کبھی قرآن مجید سے نکاح کر دیتے، اگر لڑکیاں کسی کے ساتھ فرار ہو جاتیں، تو سخت سزا کی مستحق ٹھہرائی جائیں اور مار دیا جاتا یا وَنی کر دیا جاتا۔ اس ناول میں استحصال زدہ عورت کا عکس دکھائی دیتا ہے، خواہ وہ میاں محمد حیات کی بیوی ہو یا کسی معمولی مزارع کی جاہل اور ان پڑھ بیوی، اُسے معاشرے میں باعزت مقام حاصل نہیں ہوتا، وہ ہر طرح سے مردوں کے استحصال کا شکار ہوتی ہے، اُسے پالتو ڈھور ڈنگر کی طرح سمجھا جاتا ہے اور یا پھر خلوت کدوں کا سامان آرائش ہر جگہ وہ مظلوم و بے کس اور بے بس دکھائی دیتی ہے۔ میاں محمد حیات کی بیوی ناصرہ پڑھی لکھی باشعور اور بڑے گھر کی بیٹی ہونے کے باوجود خاوند کے جور و ستم کا شکار ہوتی ہے، اس کا خاوند بارسوخ سیاستدانوں سے اُس کے ذریعے تعلقات بڑھاتا ہے، وہ سماجی بندھنوں میں اس حد تک جکڑی ہوئی ہے کہ اپنے شوہر سے طلاق لے کر اپنی جان بھی نہیں چھڑا سکتی، ایک جگہ لالی اُسے مشورہ دیتا ہے، تو کہتی ہے۔ "خدا کی بستی" میں شوکت صدیقی نے مرد کی جبریت اور بے رُخی کی شکار سلیمان کی ماں کا ذکر کیا ہے، جو تمام عمر شوہر کی خدمت کے باوجود جلی کٹی اور کڑوی کسیلی باتیں سہتی رہی، جس اولاد کی خاطر زندگی کی سختیاں جھیلیں، وہی جوان ہو کر اسے نظر انداز کرنے لگا۔ مسلسل ذہنی دباؤ اور ٹینشن سے اس کی ماں وقت سے پہلے ہی بوڑھی لگنے لگی، مایوسی جب حد سے بڑھ جاتی ہے، تو آنسوؤں پر اختیار نہیں رہتا، اس کی ماں کے مزاج میں بھی چڑ چڑا پن آ گیا تھا۔ اسے بیٹے سے شکایت یہ تھی کہ اگر سکائی لارک بننے کی بجائے دل جمعی کے ساتھ اپنا کام دیتا، حصولِ تعلیم پر توجہ کرتا اور بامقصد زندگی گزارتا، تو آج اس کے بھی بیوی، بچے اور گھر ہوتا۔ اس طرح اُس کی ایک بیٹی نے گھرداری کی آڑ میں سارا انتظام سنبھال کر اُسے اپنے ہی گھر میں بے گھر کر دیا تھا، جو پیسہ بچتا اپنے میک اپ اور کپڑوں پر خرچ کر دیتی اور سہولت کی لیے ماں کے پاندان کا خرچ کم کر دیتی:

"کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی، مگر اب اسے کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایسے ایک کونے میں بیٹھا دیا گیا تھا، وہ ایک کوٹھڑی نما مختصر کمرے میں پڑی کھانسا

کرتی، پان چبایا کرتی اور چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پیکوں سے اس نے دیواروں پر خوب گلکاریاں کی تھیں، وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا، تو اس کے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا جاتا، اس لیے وہ بڑی بے سروپا باتیں کرتی تھی، اِس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کی بجائے پھوہڑ پن ٹپکتا تھا، وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی، جو بہت معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے، جن کو سات پردوں میں چھپانے کو کشش کی جاتی تھی۔'' ۱۲۷

''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں عورت جبر کے خلاف سینہ سپر ہوتی ہے، خواہ مقابل میں اُس کے اپنے ہوں یا پرائے، جب سلطان حسین آوارگی سے منع کرنے پر اپنی بیوی پر ہاتھ اُٹھاتا ہے، تو اُس کی ماں اُسے آڑے ہاتھوں لیتی ہے:

''میاں کیا شریف گھر کی لڑکی سے اسی لیے شادی کرتے ہیں، کہ اس کو رکھی ہوئی رنڈی یا لونڈی کی طرح ماریں، پھر تم اپنے آپ کو شریف کہتے ہو، تھو ہے تم پر۔۔۔ تیری وجہ سے آج میری بوڑھی ماں اور بیوہ بہن کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ تھو ہے تیری اوقات پر، تو کسی لڑکی کو ذلیل کرے گا، تو کوئی تیری ماں، بہن کو چھوڑے گا۔ ۱۲۸

رفعت سراج نے روزمرہ زندگی کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ''شہرِ یاراں'' کے شیخ صاحب مردانہ حاکمیت کا جیتا جاگتا مرقع ہیں، جن کی تمام زندگی من مانیاں کرتے، بیوی بچوں کو اذیتیں دیتے، دھونس جماتے اور دھمکیوں، گھرکیوں سے اپنی بات منوانے میں صرف ہوئی۔ زبردستی اپنی بچیوں کی شادی بغیر اُن کی رضامندی اور بیوی سے مشورہ کے طے کر دیتا ہے، کہیں دولت دکھائی دیتی ہے، تو کہیں مرتبہ، یہ بے جوڑ شادیاں، بچیوں کا بوجھ اُن کے کندھوں سے، تو کم کر دیتی ہیں، لیکن اُن کی اولاد تمام عمر کانٹوں کا سفر طے کرتی ہیں، لیکن باپ کی بے جا حاکمیت کے آگے اُف کرنے کی جرأت نہیں پاتی۔ ''گلابی کاغذ اور زرد پھول'' میں نام نہاد اونچے طبقے کی چکا چوند میں چھپی ہوئی کردار کی تاریکیوں کی موضوع بنایا گیا ہے، ماں باپ جدیدیت کی آڑ میں مادر پدر آزادی کا پرچار کرتے ہیں اور اپنی اولاد کو شترِ بے مہار کی طرح معاشرے میں برباد ہونے اور تباہ کر دینے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ فاخرہ ایسی عورت ہے، جو آزاد منشی کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا سمجھتی ہے اور اکلوتی بیٹی یمنیٰ کو ہر طرح کی آزادی دیتی ہے اور بھولے سے بھی اِس کی کمپنی، جس میں اِس کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، جائزہ لیتی ہے، یمنیٰ کی خود سری اور غلط اور بیہودہ لوگوں کی محبت کا نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ شراب پینا شروع کر دیتی ہے۔ غیر مردوں کے ساتھ ہوٹلوں میں پھرنا، شراب پینا، اِس کا معمول بن جاتا ہے، جس کا بھرپور فائدہ اِس کا ڈرائیور نور خان اُٹھاتا ہے، رات گئے نشے میں دھت آنے والی لڑکی کا نہ، تو کوئی منتظر ہوتا ہے اور نہ ہی فکر مند، کسی قسم کی باز پُرس نہیں ہوتی۔ تنہا مدہوش لڑکی کو نور خان نیم بے ہوشی کی حالت میں اُس کے کمرے کا دروازہ کُھلا پا کر ہوس کا نشانہ بناتا ہے، عزت کے ڈر سے نور خان کو پکڑے جانے پر خاموشی سے شہر بدر کر دیا جاتا ہے، یمنیٰ اِس کے مردہ بچے کو جنم دیتی اور ہمیشہ کے لیے بانجھ ہو کر لفظی نکاح کے رشتے میں بندھ کر پچھتاووں کی زندگی گزارتی ہے۔ یمنیٰ کی دادی قدم قدم پر اُس کی ماں کو تنبیہ کرتی ہے کہ بیٹی کے معاملے میں مادر پدر آزادی اِس کی زندگی برباد کر دیتی ہے، لیکن یمنیٰ کی ماں انھی باتوں اور اندیشوں کو دقیانوسی قرار دے کر جھٹلاتی رہتی ہے، جب دادی

رشتہ طے کرنے لگتی ہے، تو یمنیٰ کی ماں جھنجلا اُٹھتی ہے:

"اِس قسم کے فتنوں کے لیے میں نے بیٹی تیار نہیں کی ہے۔۔۔ وہ اپنے ہی اسٹیٹس کے لوگوں کے ساتھ چل سکتی ہے۔۔۔ وہ ماسیوں والے کام نہیں کر سکتی۔۔۔ نہ ہی ہم نے کرائے ہیں۔ ارباب علی۔۔۔ مجھ پر زور زبردستی کر سکتے ہو، مگر بیٹی پر نہیں۔۔۔، اگر کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی ہے، تو بیٹی سے بات کر کے دیکھ لو۔" ۱۲۹

جمیلہ ہاشمی نے "تلاشِ بہاراں" میں پولیس، اعلیٰ سرکاری افسر اور چھوٹے سرکاری اہل کار رشوت ستانی، بدعنوانی اور مجرمانہ سازشوں میں ملوث آتے ہیں، یہی وجہ ہے جب ٹرین کا حادثہ ہوتا ہے، تو کوئی بھی افسر اپنے عشرت کدے سے نکلنے پر راضی نہیں ہوتا، اِس طرح رشوت خور تھانے دار اللہ وسایا کے قتل کے کیس کو دبا دیتا ہے۔ اِحسان شاہ، چوہدری نور الٰہی کے وارثوں اور لالی کو تھانیدار بھاری رشوت دے کر عدالت میں پاگل بنا کر پیش کیا اور ساری عمر جیل کے چریا وارڈ میں سڑنے کے لیے بھیج دیا۔ ایک حادثے کی شکار بوڑھی عورت کی لاش کے ورثا کی تلاش میں لوگ سُراغ لگاتے پھرتے ہیں۔ بڑھیا کی لاوارث لاش کافی عرصے تک وہیں پڑی رہی۔ بسیار تلاش پر جب رابطہ کیا گیا، تو پتہ چلا:

"اسپتال میں اِدھر اُدھر کی کوٹھیوں کو فون کیے گئے شاید اس لاوارث بڑھیا کا کسی کو پتہ ہو کہ وہ کون تھی اور تمھیں سن کر حیرت ہوگی کہ فون کے جواب میں ڈائریکٹر جنرل کی بیگم نے کہا کہ لاش اس کی ساس کی تھی اور میاں کے آنے تک لاش کو بالکل نہ چھیڑا جائے، وہ خود آتیں، مگر مصروف ہونے کے باعث نہ آسکیں گی۔" ۱۳۰

رضیہ بٹ کے ناول "اماں" کی شگفتہ عرف شگو ماں باپ کی لاڈلی اور چہتی اولاد ہے، کیونکہ اپنی بڑی بہن بیلا کی پیدائش کے پانچ چھ سال بعد منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی ہے، باپ کی وفات کے بعد دولت مند ہونے کا اُسے خبط سوار ہو جاتا ہے، اپنے منگیتر طاہر سے بھی واشگاف لفظوں میں کہہ ڈالتی ہے کہ جب تک اِس کی نوکری اعلیٰ نہیں ہوتی اور کمائی زیادہ نہیں ہوتی خواہ وہ ناجائز طریقے ہی سے کیوں نہ ہو، وہ اِس سے شادی نہیں کرے گی۔ دولت کی پجاری یہ نرس بھرتی ہوتی ہے، جہاں ایک خان وڈیرہ کینسر کا بہتر سالہ مریض داخل ہوتا ہے، جس کا مرض آخری اسٹیج پر ہوتا ہے اور چند دن کا مہمان ہے، علاج کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ شگو اسے قائل کرتی ہے، کہ وہ اس کے ساتھ بطور نرس امریکہ جائے گی، لیکن جب اپنی ماں سے بات کرتی ہے، تو وہ اس کے جانے پر پابندی لگا دیتی ہے، لیکن اپنی ضد کی پکی شگو، جسے خان کی دولت کا انبار پُرکشش محسوس ہوتا ہے، زبردستی نکاح کر لیتی ہے اور طاہر کو بھی اپنا ہم خیال بناتی ہے کہ بڈھا مرنے کے قریب ہے وہ ہر طرح اپنی حفاظت کرے گی، چند ہفتوں کی بات ہے، بوڑھا ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق زندگی کی بازی ہار جائے گا، اس کی دولت اِس کے حصے میں آجائے گی، تو پھر دونوں خوب مزے سے زندگی بسر کریں گے۔ خان دو ایک دن کے لیے گھر جاتا ہے اور نئی نویلی دلہن سے اپنا حق وصول کرتا ہے، دو ایک روز شدید بیمار ہو جانے کی وجہ سے امریکہ چلا جاتا ہے اور وہیں مر جاتا ہے۔ خان کے ترکے میں اس کے پاس بہت زیادہ دولت تو ہاتھ لگ جاتی ہے، لیکن وہ اپنا سب کچھ کھو دیتی ہے۔ عدت کے دن پورے کرنے کے بعد طاہر کے ساتھ بنائے گئے منصوبے کے تحت لاہور جا کر شادی کرنا چاہتی ہے، تو خان کا بڑا بیٹا حائل ہوتا ہے اور دوٹوک لفظوں میں کہتا ہے:

> ''آپ کو یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کرنا ہوگی کہ آپ آغا جان کی بیوہ ہیں۔ ہمارے باپ کی بیوہ، ہماری ماں، ہماری غیرت اور عزت، ہم کبھی سوچ بھی سکتے کہ اپنی ماں کی دوسری شادی کریں، یہ ہماری غیرت اور عزت کو چیلنج ہے، لیکن یہ سوچ لیں، کہ اِس رتبے اور تقدس کو قائم رکھنے کے لیے ہم اپنی جانیں بھی نثار کر سکتے ہیں، خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں، اِس آبرو کے تقدس کے لیے۔۔۔ آپ آغا بی بی ہیں، تو ہماری جانیں آپ پر نثار اور جو آپ اِس رشتے کو پامال کرنا چاہیں گی۔۔۔ تو پھر ہماری تلواریں اور بندوقیں اپنا کام دکھانا جانتی ہیں۔'' ۱۳۱

شرافتوں کے لبادوں میں لپٹے بھیڑیے معاشرے کا ناسور ہیں۔ زمینداروں، وڈیروں، ٹھیکیداروں، افسرانِ بالا، حاکموں اور جعلی پیروں، گدی نشینوں کی جنسی گراوٹوں کو بہت سے ناول نویسوں نے موضوع بنایا ہے، جو اپنے دست نگر مزارعین و ملازمین کی عزتوں سے کھیلنا اپنا حق متصور کرتے ہیں، اُن کی بہو، بیٹیاں، بیویاں بہنیں اور ملازمائیں مالِ یغما کی حیثیت رکھتی ہیں، اُن کی مجبوریوں کا زبردستی سودا بھی کیا جاسکتا ہے اور بالا معاوضہ ہوس کی بھینٹ بھی چڑھایا جاسکتا ہے اور کبھی محبتوں اور شادیوں کے دھوکوں میں اُلجھا کر لوٹا جاتا ہے۔ تانیثیت کے اِس پہلو کی عکاسی کرنے والوں میں نمایاں نام شوکت صدیقی کا ''جانگلوس''، جمیلہ ہاشمی: ''روہی'' اور نثار عزیز بٹ کا ناول ''کاروانِ وجود'' ہیں۔ عصمت چغتائی نے ناول ''بہروپ'' میں مردوں کی حرام کاریای کے موضوع کو معاشرے کی ایسی بُرائی کے طور پر ظاہر کیا ہے، جس میں مرد اپنی طاقت کے نشے میں بدکاری بھی کرتا ہے اور اِس بُرائی پر فکر کرتا ہے اور دیکھاوے کے طور پر پچھتاوا کرتا ہے، درحقیقت وہ ایک اور گناہ کے لیے سرگرم ہو رہا ہوتا ہے:

> ''میں بہت کمینہ ہوں۔ دھرم نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ 'کون سی نئی بات بتا رہے ہو۔ مرد کی ذات ہی کمینی ہوتی ہے۔' رندھیر نے فخریہ کہا۔ 'یہی مرد کی شان ہے کہ حرام کاری کرتا ہے، مگر پچھتاتا ہے۔' کمرے میں جھانک کر دیکھا تو زرینہ ساڑھی میں مُنہ چھپائے گڑی مڑی پڑی تھی۔'، اسے گھر بھجوا دو' دھرم نے سہم کر کہا اور خود غسل خانے میں چلا گیا۔'' ۱۳۲

جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاشِ بہاراں'' میں رادھے کرشن کا معمول نئے نئے معاشقے اور لڑکیوں، عورتوں سے دوستیاں گانٹھنا تھا کہ اپنے اندر کے کمزور مرد کی انانیت کو مطمئین کر سکے، یہ کبھی اس کے احساسِ کمتری کی دلیل ہے، یہ شخص اذیت پسندی کا بھی شکار ہے، عورتوں، لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر، ان سے خوب جی بہلا کر ٹھکرا دیتا، اپنے لیے اُنھیں تڑپتا دیکھ کر اُسے ایک خاص قسم کی طمانیت کا احساس ہوتا:

> ''رادھے کرشن کا اپنے گرد روشنی کرنے کا طریقہ بھی عجب ہے، عورتیں اس کے لیے کھلونے ہیں، وہ اچھے کھلونوں کی طرف ایک مقناطیسی قوت سے کھنچتا ہے پھر ان سے چندے خوش ہوتا ہے اور پھر ان کو توڑ دیتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے دوسروں کی راہوں میں بکھر جاتے ہیں اور عورت ایک ٹھیکری کی طرح ایک دروازے سے دوسرے کی طرف

ایک ٹھوکر سے دوسری ٹھوکر کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔''۱۳۳؎

ڈاکٹر احسن فاروقی اپنے ناول ''شامِ اودھ'' میں شادی بیاہ کی رسوم ورواج میں مردوں کی تعیش پسندی کھل کر سامنے آتی ہے، ناچ گانوں کے علاوہ طوائفیں، کنیزیں، لونڈیاں اُن کی ہوس پرستی کا سامان بنتی ہیں:

> ''ناچ شروع ہونے کا حکم دیا گیا، متعدد رنڈیوں نے ایک ساتھ مجرا کیا اور مبارک باد گائی، پھر ایک رنڈی رہ گئی اور اِس کے پیچھے سازندے آگئے، رنڈی مُجرا کرتی رہی اور اس کے بعد کئی اور نے مُجرے کیے۔ خاص محل میں بڑی بہو صاحب اور چھوٹی بہو صاحب نے چھڑیاں مار مار کر سمدھنوں کو اُتروایا تھا اور پھر اُنھیں لا کر انگنائی میں شمگیرے کے نیچے بٹھایا تھا، وہاں بھی ڈومنیوں کا ناچ ہو رہا تھا۔''۱۳۴؎

رضیہ فصیح احمد ''انتظارِ موسمِ گل'' میں عورتوں کی توہم پرستی اور ضیف الاعتقادی کا ذکر ملتا ہے۔ ''ایک ادھیڑ عمر کی عورت ملاجی سے تعویز لے کر آئی، اُس نے کوئی دس مہینے ہوئے اعلان کیا تھا کہ وہ پیٹ سے ہے اور ایک ایک کر کے ساری علامات اپنے اوپر طاری کر لی تھیں، مگر بچہ تھا کہ کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ نوری جس کے ماں باپ بچپن میں فوت ہو چکے تھے، بدزبان، بدمذاج بے باک، نڈر قسم کی مردنما لڑکی تھی۔ طاہر کے ہاں ملازمت کرتی ہے۔ ایک دِن طاہر کی ماں نے اُسے پیٹ ڈالا، نوری کی انانیت پر لگنے والی ٹھیس کو برداشت نہ کر پائی اور الگ کوٹھڑی لے کر رہنے لگی۔ ہر کسی پر بے لاگ تبصرہ بے دھڑک ہو کر کرتی، جب طاہر کے گھر والوں سے ڈرانے کی کوشش کی جاتی، تو بغاوت پر اُتر آئی۔ رضیہ فصیح احمد نے جھگیوں میں رہنے والی خانہ بدوش عورتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو چند ٹکوں کی خاطر اپنا آپ بیچ دیتی ہیں اور اُن کے خریدار عام مزدور، مستری کے علاوہ نام نہاد شرافتوں کے لبادوں میں ملبوس کوٹھیوں، کاروں والے صاحب بھی شامل ہیں، یہاں رضیہ فصیح احمد نے اسرار صاحب کی مثال دی ہے، جو اِن سے کھل کھیلنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، خانہ بدوش جھگیوں والیاں گھر گھر جا کر غیر ملکی کپڑا بیچتی تھیں، اسی طرح ایک روز ایک جھگی والی اسرار صاحب کی کوٹھی پر بھی آئی، اُن کی بیگم سے اسرار صاحب کی تصویر کو دیکھ کر پہچان گئی ہے کہ اکثر اُن کی جھگیوں میں اِن کا آنا جاتا ہے۔ یہ بات اُن کی بیوی پر قیامت بن کر ٹوٹتی ہے۔ اسی طرح ''یہ خواب سارے'' میں رضیہ فصیح احمد نے حقوقِ نسواں کی تحریک کے زیرِ اثر ہونے والے سیمینار میں پڑھے جانے والے مضامین کے حوالے سے پوری دُنیا میں عورتوں پر ہونے والے مظالم پر کڑی تنقید کی ہے اور اِس ضمن میں امریکی خاتون کے مضمون کا حوالہ دیا ہے کہ امریکن خاتون نے عرب خواتین میں ختنے کی رسم پر مضمون پڑھا، جس میں کم عمر لڑکیوں کے ختنوں کے علاوہ نکاح، مردوں کا دوسروں کے سامنے اپنی نو عمر بیویوں سے زبردستیوں کا بھی ذکر کیا۔ آرٹ گیلری میں بھی خواتین پر تشدد کی مختلف صورتوں کو آرٹ کے نمونوں کی شکل میں پیش کیا گیا تھا، جنھیں دیکھ کر سمن کو اپنے دَور کی معصوم لڑکیاں یاد آئیں: ''دشمنی میں ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں پر حملہ کرتے تھے اور کُھلے بندوں عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔''۱۳۵؎ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ناول ''ویمپائر'' میں ریلوے سفر کے دَوران کھو جانے والی لڑکی کی داستان ہے، جس کا نکاح ہو چکا ہے، بھنگی کی وساطت سے ریلوے کے کوارٹروں میں موجود ایک شخص کے ہاں پہنچائی جاتی ہے کہ اس کے گھر والوں سے بلوا دیا جائے گا اور یہ کہ کوارٹر میں خواتین موجود ہیں، لیکن جانے پر پتہ چلتا ہے کہ بابو اکیلا رہتا ہے، وہ زبردستی، جور و تشدد سے اُس کی عصمت وعفت تار تار کر دیتا ہے۔ ظالم کے شکنجے میں پھنسی لاچار لڑکی سوچتی ہے:

''میرا نکاح نہ ہوا ہوتا اور میں کسی اور کی نہ ہو چکی ہوتی، تو میں اس وحشی درندے ہی کو ایسے
موقعے پر قبول کر لیتی، موجودہ صورت میں یہ ناممکن تھا کہ میں اپنی اور اس ظالم کی عزت
ایک کرلوں، میں حیران تھی کہ الٰہی میں کیوں کر اس ظالم سے پیچھا چھڑاؤں۔''[۱۳۶]

''جانگلوس'' میں شوکت صدیقی نے زمینداروں، تحصیلداروں، افسروں اور مالکوں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کیا ہے کہ کس طرح غریبوں مزارعوں اور پتھیروں کی عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ غریب لوگ بیگار کے علاوہ اُن کی ہوس پرستی کا ایندھن بنتے ہیں، جب جی چاہتا ہے اُن کی بیٹیوں، بیویوں، بہنوں کو اُٹھوا لیتے ہیں، اُن میں ارشاد کی بہن سکینہ ہو یا پتھیرے سلامو کی بیٹی رانو، احتجاج کرنے والوں کے خاندان کے تمام مردوں، عورتوں کو برہنہ گاؤں بھر میں پھیرایا جاتا، یہی وجہ ہے مجبور و بے بس مرد اپنا غم و غصہ بیوی اور گھر کی عورتوں کو مار پیٹ کر نکالتے ہیں۔ میاں اسلم اور حنیف ڈوگر کے کارندے جھونپڑی کے باہر سوتی ہوئی پتھیرے سلامو کی ۱۴ سالہ لڑکی رانو کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں اور اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ سلامو اُس کے حصول کے لیے، جب اُن کے ڈیرے پر جاتا ہے، تو وہ اُسے مار پیٹ کر زخمی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں، جب سلامو گھر آتا ہے، تو اُس کی بیوی اُسے تنہا دیکھ کر رونے لگتی ہے، بیوی کے استفسار پر مظلوم پتھیرا اپنی بیوی پر جھپٹ پڑتا ہے اور بُری طرح زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ بے بس ماں دوہرا دُکھ سہتی ہے:

''اُس نے خون خوار نظروں سے اپنی بیوی جگنی کو دیکھا، تیزی سے جھپٹا اور اُس کی کمر پر
اِس زور سے لات ماری کہ وہ دوہری ہوگئی۔ سلامو نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بال پکڑے،
اپنی طرف کھینچا اور پاگلوں کی طرح مارنے لگا۔ کئی مرد ہجوم سے نکل کر جھٹ اُس کے
قریب پہنچے اور پکڑ کر علیحدہ کیا، مگر وہ بار بار اُن کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا، بیوی کو ننگی
ننگی گالیاں دیتا، بپھرتا اور مارنے کے لیے جھپٹتا۔۔۔ صبح ہوئی، تو لالی نے دیکھا، سلامو
سانچوں میں گارا بھر بھر کر اینٹیں بنا رہا تھا، بیوی بھی اُس کے ساتھ کام کر رہی تھی اور رانو
بھی موجود تھی، وہ سر جُھکائے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔''[۱۳۷]

جعلی پیروں کے کالے کرتوت کی نشاندہی شوکت صدیقی نے بھی ''جانگلوس'' میں کی ہے۔ احسان شاہ علاقے بھر کے لیے عذاب الٰہی سے کم نہ تھا۔ زمیندار جائیداد کی خاطر اپنی بیٹیوں کے نکاح چاند، سورج یا قرآن شریف سے پڑھا دیتے تھے۔ احسان شاہ کی دسترس سے کوئی نہ بچ سکا ہر جوان کنواری لڑکی اُس کی چوکھٹ پر لائی جاتی اور وہ مذہب کی آڑ میں سادہ لوح لوگوں کو بہت بڑا دھوکا دے دیتا۔ احسان شاہ سندھ کی دیگر ظالمانہ اور غیر انسانی رسوم کا ذکر اس طرح کیا گیا:

''جس گُڑی کا کران سے نکاح ہو جاتا ہے، اِسے بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے،
اِس کی سخت نگرانی بھی کی جاتی ہے، اگر وہ کسی سے چوری چھپے یاری لگا لے، تو اُسے بہت
بُرا سمجھا جاتا ہے، سزا کے طور پر اُسے اور اُس کے یار دونوں کو کاراکاری کرار دے کر قتل کر
دیا جاتا ہے۔۔۔ سندھ میں ایسی ایک اور رسم بھی ہے۔۔۔ مرید اپنے پیر کی خوشنودی اور
برکت حاصل کرنے کے لیے منت مانتے ہیں۔ اپنی سب سے زیادہ سوہنی گُڑی کو اُس
کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں، اُسے عمدہ عمدہ کھانے کھلاتے ہیں، جب وہ جوان ہو جاتی ہے،

تو ایک روز پیر کو اپنے گھر بُلاتے ہیں، اُس کی دعوت کرتے ہیں، گڑی کا دوہٹی کی طرح خوب سنگھار کرتے ہیں۔ پیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرتے ہیں کہ وہ اِسے کبول کرلے، جب وہ راضی ہو جاتا ہے، تو گڑی کو رات گئے، اُس کے کمرے میں پہنچا دیتے ہیں، وہ ایک رات یا جتنی راتوں تک چاہے اُسے اپنے ساتھ سولاتا ہے۔۔۔ایسی گڑی کو بڑھنی کہتے ہیں۔ پیر تو بعد میں اُس کے پاس کبھی نہیں آتا، پر بڑھنی بھی ایک طرح سے پیرنی بن جاتی ہے، اِس کی اتنی عزت ہوتی ہے کہ لوگ اُس کے پاس مُرادیں مانگنے آتے ہیں، نذرانے چڑھاتے ہیں اور اس کی خدمت کرتے ہیں۔۔۔اگر وہ چوری چوری کسی سے یاری لگالے اور پتہ چل جائے، تو ماں پیو یا بھائی رات کو اُسے گوٹھ سے باہر جنگل میں لے جاتے ہیں، اُس کے سر کے بال کھول دیے جاتے ہیں، دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے جاتے ہیں، اُس کو زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے، سر جھکا کر کسی لکڑ پر ٹکا دیا جاتا ہے کلہاڑی تھام کر گردن پر ایسا بھرپور وار کیا جاتا ہے کہ سر کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔"[۱۳۸]

''نادار لوگ'' میں حمید پارٹی نے دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے مخالفوں کے مردوں پر تشدد اور عورتوں کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ زیادتی کی شکار لڑکی جان کنی سے گزر رہی تھی۔ ڈیرے والے کو بلایا گیا تو یہاں بھی زخمی مرد کو ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا گیا۔ کنیز کو تڑپتا چھوڑ دیا گیا: ''زیادتی کے دوران شاید گلا دب گیا تھا۔ بشیر نے مری ہُوئی آواز میں کہا۔ نیلے نشان پڑے ہُوئے ہیں۔ سانس چل رہی ہے۔ اللہ زندگی دینے والا ہے۔''[۱۳۹] ایم اسلم نے ناول ''نیلماں'' میں ڈوگرہ فوجیوں اور تحصیل دار چرن سنگھ کے کشمیریوں پر ڈھائے گئے مظالم کو بیان کیا ہے کہ کس طرح گاؤں کی کوئی دوشیزہ ان کی دستبُرد سے بچ نہیں سکتی تھی۔ ریشماں کی بارات پر بھی ہلہ بول کر خون خرابہ کیا گیا اور لڑکی کو اغوا کر لیا گیا۔ نیلماں کے باپ صمد نے جب تحصیلدار سے بیٹی کی رُخصتی کی درخواست کی، تو اُس نے قتل و غارتگری شروع کر دی۔ گھروں کو جلا کر مردوں کو گولی مار دی گئی اور لڑکیوں، عورتوں کو برہنہ کر دیا گیا اور مال و اسباب لوٹ کر اپنے ڈیرے پر چلا گیا: ''چرن سنگھ جی''! حاجی نے کہا میری لڑکی کی برات آئی بیٹھی ہے مجھے دو گھنٹے کی مہلت دے دو، میں لڑکی کو رخصت کرلوں، تمھارا داماد، تو میں ہوں چرن سنگھ نے ہنس کر کہا، تم لڑکی کو کس کے ساتھ رخصت کر رہے ہو۔''[۱۴۰]

ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' میں پے در پے جذباتی صدمات نے ایلی کی ماں ہاجرہ کے دل و دماغ پر یاسیت کی ایسی گہری چھاپ لگائی کہ اس کی ذات اور روح بے حسی اور سکوت کی نذر ہوگئی۔ کتنی فضائیں آئیں اور گئیں۔ شوہر سے مایوس یہ عورت، بیٹے کی شکل میں اپنی خواہشات کی تکمیل ڈھونڈنے لگی، کیوں کہ اس کے شوہر کی بدکرداری کی وجہ سے اس کے گھر میں فصلی بٹیروں کا تانتا بندھا ہی رہا، وہ خود جان سے ہار گئی، لیکن آفرین ہے علی احمد پر جس کی آوارگی و عیاشی میں رتّی بھر فرق نہ آیا علی احمد کی ''ہی ہی ہی'' اس کے خود غرضانہ احساسات اور شہوت پرستی کی غمازی کرتا ہے۔ جمعدارنیاں، نوکرانیاں، راہ جاتی عورتیں، بیٹی کی سہیلیاں غرض ہر عمر اور ہر طبقے کی عورت اس کی حریصانہ نظروں سے نہ بچ سکی: ''ہاجرہ کے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کے بالوں اور دوپٹے سے عطر کی خوش بو آنے کی بجائے ہسپتال کی آیوڈین اور پنساری کے کسڑ آئل کی بو آنے لگی، اس کے خیالات میں اپنے گھر کے بجائے ایلی کا گھر بس گیا، جب ایلی جوان ہوگیا، جب اُجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہوگا۔''[۱۴۱]

محمد سعید شیخ کا ناولٹ ''اقبالِ جرم'' میں ریشما اور یوسف کا قصہ ہے۔ ریشماں کا خاوند اسے جنسی طور پر مطمئن کرنے سے قاصر ہے، جب کہ وہ اولاد بھی چاہتی ہے، لیکن معاشرتی جبر اور شوہر کی بے جا حاکمیت کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے، اپنی اس محرومی کا ازالہ یوسف کے ساتھ کھیتوں میں رات گزار کر کرتی ہے۔ یوسف بے گناہ قتل کے الزام میں سزائے موت کی کوٹھڑی میں ہوتا ہے، وہ اس سے ملاقات کرتی ہے اور اطلاع دیتی ہے کہ اس کے بچے کی ماں بننا اس کے لیے باعثِ فخر ہے، جب کہ اس کا شوہر منتیں اور چڑھاوے چڑھاتا ہے کہ اللہ نے اُسے اولاد سے نوازا، محمد سعید شیخ عورت کی اس کرپشن کے محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے، ایسی عورتوں کی دھوکا دہی کو منظرِ عام پر لائے ہیں۔ دوسری طرف ایک اور قیدی کی بیوی کے الفاظ کے ذریعے عورت کی وفا کی نشاندہی کی گئی، جو اپنی نشئی اور لاپرواشوہر، جو نشے کے دھندے میں ملوث ہے، اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے:

> ''اب، تو چھوڑ دے انور یہ نشے کا دھندا، اب، تو تیری پانچ بیٹیاں ہوگئی ہیں، دوسری طرف یوسف کے قریب ہی سے ایک قیدی بڑے ستے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا، یہ بیٹیاں میری مرضی سے، تو نہیں ہوئیں، تم نے ہی اُنھیں پیدا کیا ہے، مجھے، تو پتہ ہی نہیں چلا، کیا پتہ میری ہیں بھی یا نہیں۔۔۔ تمھیں کیا پتہ کہ کس طرح جان مار مار کر تیری ضمانت کا بندوبست کر رہی ہوں، اب، تو میں نے بھی بڑی بیٹی کو صفائی کے کام پر لگا دیا ہے، خدا کے لیے چھوڑ دے یہ نشے کا دھندا، تو جیسا بھی ہے انور میری بچیوں کے لیے ضروری ہے، تیرے بغیر ہم رُل جائیں گے۔ اب کی دفعہ باہر آ جاؤ میں تمھیں چھپالوں گی، تمھیں پال بھی لوں گی، مجھ میں ابھی جان ہے، بس مجھے اپنے گھر میں ایک مرد چاہیے۔[۱۴۲]

اصغر ندیم سید اپنے ناول ''آدھے چاند کی رات'' میں نے بروکن فیملیز کے مسائل پر لکھا ہے، ماہ رُخ، بشیر احمد سکول ٹیچر اور اس کے شوہر بشیر احمد کی علیحدگی ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس کا شوہر رنگین مزاج ہونے کے علاوہ شادیاں رچانے کا شوقین ہے۔ ماہ رُخ اُس سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے۔ وہ خود شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ مرد کی نفسیات کی عکاسی کرتے ہوئے اصغر ندیم سید لکھتے ہیں: ''ہر مرد ہر خوبصورت عورت کو آزاد، اکیلی اور بے رشتہ دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر مرد کے اندر ایک خاص قسم کا حسد اور احساس ملکیت ہوتا ہے، جو اُسے دُنیا کی تمام عورتوں کو صرف اپنے لیے دیکھنا چاہتا ہے۔''[۱۴۳]

سلمیٰ مسعود کے ناول ''خانماں برباد'' میں دیہی علاقوں کی پسماندگی وڈیروں، زمینداروں کے ہاتھوں مزاعوں اور کمیوں کی عزتوں کے جنازے، معاشی طور پر اُنھی مفلوج اور بے حال کر کے بلیک میل کرنے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ غریب طبقہ کو قانون نافذ کرنے والوں کے ہاتھوں درپیش، جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اِس کا ذکر بھی کیا ہے: ''چار سال سے چودہ سال تک کی بچیاں اور کنیزیں، جو بچ گئی تھیں، فوجی درندوں کی جنسی آسودگی کا شکار ہو گئیں۔ فوجی وحشی اُس وقت تک اُن کو چھوڑتے رہے، جب تک وہ خالقِ حقیقی کے ہاں رخصت نہ ہو گئیں۔''[۱۴۴]

سلیمان بٹ کے ناول ''گھائل روحیں'' میں سکول ماسٹر کا بیٹا کالج میں شیزا کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے، لیکن بعد میں لڑکی چوہدری کے بیٹے حکم داد کی دولت کی اسیر ہو جاتی ہے۔ دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے، اِس کے دِل میں اکثر خیال آتا ہے کہ شیزا کو مار دے یا اِس پر تیزاب پھینک دے۔ ایک روز کینٹین پر حکم داد اُسے بُری طرح تشدد کا نشانہ بناتا ہے، اِس کا بدلہ

لینے کے لیے وہ حکم دار کو قتل کر دیتا ہے۔ چوہدری اپنے جوان بیٹے کی موت کا بدلہ پنچایت کے فیصلے کے مطابق اس کی جواں سال بہن کو پنچائیت اور اُس کی نظروں کے سامنے بے آبرو کر دیتا ہے:

''ہوس پوری کرنے کے بعد وہ شلوار کر سیدھا کرتے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوا لو بھی میرا کام تو مکمل ہوا، باقی کا تمھارے سپرد۔۔۔ پل بھر کے لیے مجھے لوگوں کے چہروں پر جمی حقارت اور درندگی نظر آئی، اگلے ہی لمحے میرا وجود اِس حقارت کی بھینٹ چڑھ گیا پہلا پتھر ماتھے سے ٹکرایا، تو یوں لگا، جیسے سر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔ دوسرا پتھر ٹکراتے ہی خون کی گردش رگوں میں تھم گئی، پھر تیسرا پتھر۔۔۔ چوتھا، پانچواں۔۔۔ یکدم میرے جسم پر پتھروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔''۱۴۵

دوسروں کے جذبات واحساسات سے کھیلنے والے کبھی سکون نہیں پاتے، حقیقتیں جب عیاں ہوتی ہیں تو اعتبار کی چوکھٹ لرز جاتی ہے۔ ''خانم'' میں بھی محبت کے نام پہ لوٹنے والوں کا نوحہ بیان کیا گیا ہے:

''شاید تم درست کہتے ہو لیکن اب وہ میرے کسی کام کا نہیں اُس کی ایک جذباتی لغزش نے میری پاک دامنی میں ایک ایسا گہن لگا دیا ہے کہ میں اپنی نظروں میں خود بھی گر چکی ہوں۔ اب میرا کوئی مقام نہیں۔ میں صرف جینے کی خاطر جی رہی ہوں۔ میرے لیے شہباز کی آنکھوں کی ہوس اور عباس کی نگاہوں کا پیار دونوں ایک ہیں۔ دُنیا کے تمام مرد یکساں فطرت اور ذہنیت کے مالک ہیں۔''۱۴۶

محرمات سے دست درازی کا پہلو اُجاگر کرنے والوں نے بڑی چابک دستی اور حقیقت پسندی سے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ شوکت صدیقی کا ''جانگلوس''، قدرت اللہ شہاب ''شہاب نامہ''، رضیہ فصیح احمد ''یہ خواب سارے''، محمد سعید شیخ ''ایک اور دریا''، رضیہ بٹ کا ''اِک لڑکی''، عبداللہ حسین ''اُداس نسلیں''، ''قید'' اور بانو قدسیہ کے ''راجا گدھ'' میں یہ تانیثی پہلو نمایاں ہیں۔ بلونت سنگھ کے ناول ''رات، چور اور چاند'' میں دیہی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں کرتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی اور جنسی گراوٹوں کو بھی بے نقاب کیا ہے:

''اُس کا مکان پُر اسرار تھا، بیوی بچے تھے نہیں، اپنی زمین تھی، گائے، بھینس بھی پالتا تھا رشتے داروں میں ایک اُس کے رشتے سے بہن تھی، جنتو، جو اِس کے ساتھ رہتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس نے بہن ہی کو گھر میں بسا لیا ہے۔ علانیہ یہ بات کسی کو کہنے کی جراَت نہیں ہوتی تھی، ایک بار گاؤں سے پرے مرا ہوا نوزائیدہ بچہ پایا گیا، اُن دنوں جنتو بیماری کے بہانے کئی روز تک بستر پر پڑی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ اِس نے جنا ہے۔''۱۴۷

''خدا کی بستی'' میں رضیہ کے مرنے کے بعد نیاز سلطانہ اور نوشا کو کوٹھی میں لے آتا ہے اور زندگی کی تمام سہولیات فراہم کرتا ہے، اِس کے بدلے میں اس کی عفت وعصمت کی دھجیاں بکھیرتا رہتا ہے۔ بغیر نکاح کے سلطانہ نیاز کے بچے کو جنم دیتی ہے۔ نوشا کے ہاتھوں نیاز کے قتل کے بعد اس کا بھائی فیاض جائیداد کے حصول کے لیے آن موجود ہوتا ہے اور سلطانہ کے ساتھ

دست درازی سے گریز نہیں کرتا، خان بہادر سے سلطانہ، جب مدد کی طلبگار ہوتی ہے، تو وہ بھی اس کی مدد سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں۔ نیاز کے قتل کے بعد اُس کا بھائی فیاض اور اُس کا نوکر تمام دولت پر قبضہ کر کے اُسے جنسی تشدد کا نشانہ بناتا ہے:

''مصیبت یہ ہے کہ نیاز کے ساتھ تمھارا باقاعدہ نکاح بھی نہیں ہوا۔۔۔ وہ ایسا ہے کہ تمھاری ماں، چوں کہ نیاز کی بیوی رہ چکی تھیں۔ لہٰذا، شرعی طور پر نیاز کے ساتھ تمھارا نکاح نہیں ہوسکتا، یہ فقہی مسئلہ ہے میں نے صحیح صورتحال بتادی، تم چاہو تو کسی عالمِ دین سے اس کی تصدیق کرسکتی ہو، خان بہادر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا 'برا نہ ماننا' سچ پوچھو، تو تمھاری حیثیت نیاز کی داشتہ سے زیادہ نہیں۔۔۔ میں تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ فیاض سے نہ بگاڑو، جو کہتا ہے مان لو۔۔۔ اب وہ میرے زیورات اور کپڑے لتے بھی ہتیانا چاہتے ہیں، آخر میرا بھی، تو کوئی حق ہے، پھر میرا بچہ ہے وہ کس کی اولاد ہے؟ کیا باپ کی جائیداد پر اس کا کوئی حق نہیں؟۔۔۔ مگر اس کے باپ کی حیثیت سے، تو ہر جگہ انھی کا نام لکھا گیا ہے۔۔۔ تم کسی کا بھی نام لکھوادو مگر قانون یہ نہیں تسلیم کرے گا کہ اس بچے کا باپ نیاز ہی تھا، اس نے اپنے ہاتھ سے، تو لکھا نہیں کہ یہ میرا بچہ ہے۔۔۔ سلطانہ نے مزاحمت کی، تو فیاض نے اس کے منہ پر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا چپکی پڑی رہ حرامزادی' اس نے دوسرا تھپڑ مارا، فیاض قوی ہیکل آدمی تھا، سلطانہ کے منہ پر دو بھرپور ہاتھ پڑے، تو اس کی بتیسی ہل گئی۔ فیاض دست درازی کرنے لگا، پاگلوں کی طرح اس کا لباس نوچنے لگا۔۔۔ فیاض بے دردی سے مارتا بھی رہا، آخر وہ تھک کر شل ہو گئی، اس نے بے بسی سے فیاض کے آگے ہاتھ جوڑ دیے، بلک بلک کر رونے لگی، مگر فیاض دیوانہ ہو رہا تھا وہ باز نہ آیا۔۔۔ اس کے جاتے ہی کرم الٰہی اسی راستے کمرے کے اندر آ گیا۔ سلطانہ نے جل کر اس کے منہ پر تھوک دیا، مگر وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا اور رنڈی بازوں کی طرح چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سلطانہ نے ایک بار کچکچا کے اس کے بازو پر کاٹ لیا، وہ پھر بھی ناراض نہ ہوا، ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔'' [۱۴۸]

جدیدیت کی آڑ میں مادر پدر آزادی کے قائل مردوں اور عورتوں کے انجامِ بد کو بیان کیا ہے۔ عمیرہ احمد کا ناول ''لاحاصل'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس میں محض شک وشبے کی بنیاد پر اپنی بیوی کو دھتکارنے والا بل آخر بیٹے کی عدالت میں آن کھڑا ہوتا ہے۔ غیر مسلم لڑکی اسلام قبول کرنے کے بعد جب شادی کرتی ہے، تو شوہر اُس کی سابقہ زندگی پر طعنہ زنی کرتا ہے اور دُھتکارتا رہتا ہے، اُس کا بیٹا، بالآخر مقابل آن کھڑا ہوتا ہے:

''میری ماں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی گناہ نہیں کیا، اُنھوں نے ویسی ہی زندگی گزاری ہے، جیسی ایک مسلمان عورت گزارتی ہے، آپ نے میری ماں کو ایک ایسے گناہ کی سزا دی، جو اُن پر مسلط کیا گیا تھا، 'اُس نے مجھے دھوکا دیا مجھ سے سب کچھ چھپایا تھا'، 'کیا زندگی میں آپ نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا، آپ نے کبھی کسی سے جھوٹ نہیں بولا،

آپ نے کبھی کسی سے کچھ نہیں چھپایا؟'، وہ اَب اُن سے سوال کر رہا تھا،' آپ تو پیدائشی مسلمان ہیں پھر بھی کبھی نہ کبھی آپ نے سب کچھ کیا ہوگا اور بھی بہت سے گناہ کیے ہوں گے، کیوں نہ آپ کو بھی یہیں دُنیا میں ہر ایک شخص کے ہاتھوں سزا دی جائے، جس کو آپ نے تکلیف پہنچائی ہو، دھوکا دیا ہو، جھوٹ بولا ہو۔'،'جس عورت میں پارسائی نہ ہو اُسے تھوک دینا چاہیے، اُنھوں نے نفرت سے کہا اور جس مرد میں پارسائی نہ ہو اُس مرد کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، کیا قرآن مرد اور عورت کے لیے کوئی الگ قانون رکھتا ہے'، 'تمہارے ماں زانی تھی'، مظہر نے بلند آواز میں اُنگلی اُٹھا کر کہا۔ ذالعید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، اُس نے اسلام قبول کرنے کے بعد زنا کیا تھا؟، کیا آپ سے شادی کے بعد وہ آپ کو دھوکا دیتی رہی، میری ماں آپ سے شادی کرنے نہیں آئی تھی، آپ گئے تھے، اُس کے پاس شادی کرنے، کیا اُس وقت آپ کو یہ نہیں پتہ تھا کہ آپ کس معاشرے کی عورت کے ساتھ شادی کرنے والے ہیں۔'' [۱۴۹]

رضیہ فصیح احمد کے ناول 'یہ خواب سارے' میں بیگم اسرار کے ملازمین کا دعویٰ تھا کہ اُنھوں نے بڑے بڑے گھرانوں میں کام کیا ہے، بیگم کی عدم موجودگی میں اسرار صاحب نے زینت سے تعلقات بڑھا لیے، بات زیادہ بڑھنے پر دونوں میاں بیوی کو نکال دیا گیا، جب شاہنواز اور زینت کی سچائی تلاش کی گئی، تو ایک بہت لرزہ خیز حقیقت سامنے آئی، زینت نے خود بتایا:

''شاہنواز اس کا سگا چچا تھا اور بچپن سے ہی اسے خراب کر دیا تھا۔۔۔اس کو یہی بتایا تھا کہ ان دونوں کا راز ہے اور وہ اس میں برابر کی شریک ہے کسی کو بتایا، تو ان دونوں کی خیر نہیں، جب وہ پیٹ سے ہوئی اور معاملہ کُھلا تب بھی اس نے شاہنواز کا نام نہ لیا۔ چچا نے پیشکش کی کہ وہ اپنی چہیتی بھتیجی کا گلا خود کاٹے گا، اس طرح وہ اسے لے کر بھاگا۔۔۔اس نے یہ ترکیب نکالی کہ بچے کو کسی اور کے سر منڈھے۔ زینت کو وہ نہ صرف مواقع دیتا تھا، بلکہ بعض اوقات حکم بھی دیتا تھا کہ وہ اسرار صاحب کے کمرے میں جائے۔'' [۱۵۰]

عبداللہ حسین کے ناول ''اُداس نسلیں'' میں نسیم کے ضمیر کی خلش اُسے کہیں کا نہیں رہنے دیتی ہے، یہی کیفیت ''قید'' کی رضیہ سلطانہ پر گزرتی ہے، جس نے اپنے ناجائز بچے کی سنگ زنی کرنے والے تینوں اشخاص کو نہایت بیدردی سے قتل کیا تھا:

''میں گناہگار ہوں، کب انکار کرتی ہوں، رضیہ سلطانہ بولی وہ لوگ بے گناہ تھے، جن کا خون میں نے اپنی آگ بجھانے کے لیے کیا وہ تو تمھارے کہنے پر لگے تھے، ان کا کوئی قصور نہ تھا، مجھے پھانسی دے دو، اصلی قصوروار، تو تم ہو، آج میں نے اقبالِ جُرم کیا ہے۔ تمھیں سب کچھ بتاؤں گی، تم پوچھو گے میں نے تمھیں کیوں چھوڑ دیا۔ میرے دل کی آگ اُن تین بے گناہوں کے خون سے ہی کیوں بجھ گئی، تمھیں میں نے کیوں نہ پکڑا، تو سنو، تمھیں میں نے اس لیے چھوڑ دیا کہ تمھیں، تو اپنے ہی ہاتھوں ہی سزا مل چکی تھی، کان کھول کر سُن احمد شاہ، وہ معصوم، جسے تم نے اپنی زبان سے ملعون کیا، وہ تمھارا پوتا تھا۔ کیا؟

احمد شاہ کھلے منہ اُٹھ کھڑا ہوا، اُس پہ لرزہ طاری تھا۔ پوتا؟ ہاں، فیروز شاہ کا بچہ تھا، اپنے ہاتھوں تم نے اپنی نسل کشی کی، یہ ایسی سزا تھی، جو میں بھی تمھیں نہیں دے سکتی تھی۔''[۱۵۱]

بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' میں زنا اور بدکاری کے عبرت ناک انجام کی نشاندہی اسلام اور سائنس کی روشنی میں کی ہے:

''زنا سے پیدا ہونے والے بچے کو، تو Gene Mutation کا سوفی صد خطرہ ہوتا ہے۔ زنا سے منع کیوں کیا اس لیے، ورنہ جسمانی تعلق کوئی بدل تھوڑی جاتا ہے، شادی کرانے سے، یا نہ کرانے سے، جسمانی تعلق دونوں صورتوں میں وہی رہتا ہے۔''[۱۵۲]

اُردو ناول کے اجمالی جائزے سے سب سے بڑا تانیثی پہلو نمایاں ہوا ہے، وہ مرد و عورت کے ناجائز تعلقات معاشقے، دوستانے اور یارانے ہیں۔ مرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ کرپشن کی شرح اِس میں زیادہ ہے۔ میاں بیوی کا پاکیزہ رشتہ جس میں دونوں مذہبی، اخلاقی اور سماجی طور پر ایک دوسرے کے پابند اور امین ہوتے ہیں زیادہ تر مرد اِن حدود کو توڑتے دکھائی دیتے ہیں اور خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چاہیے یہ خیانت دِل و ذہن کی ہو یا جسمانی سطح پر، اِس کے اثرات عائلی زندگی پر نہایت منفی پڑتے ہیں، کیوں کہ اِس سے براہِ راست جو ذات متاثر ہوتی ہے، وہ عورت بہ حیثیتِ بیوی ہے، جسے ہر قدم پر مختلف توجیہات کی نذر کر کے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے خائن مرد، عورت کے استحصال کا سبب بنتے ہیں، اِن کی عدم توجہی اور لاپروائی کے نتیجے میں عورت میں ڈپریشن، ذہنی تناؤ کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ ایسے مرد محض جسمانی تقاضوں کو پورا کر کے اپنے تمیں تمام حقوق سے دستبردار ہو جاتے ہیں، اِن کے نزدیک عورت انسان نہیں اور نہ ہی اُس کے جذبات و احساسات ہوتے ہیں، بلکہ وہ محض زوجی غلام ہوتی ہے، جسے اُس کے اشاروں اور سوچ کے دھاروں کے مطابق چلنا ہے۔ وہ کیا چاہتی ہے اُسے کبھی محسوس نہیں کرتے۔ قدرت نے گھر کی بنیادوں اور خاندان کو مضبوطی اور پائیداری کے لیے عورت کو اساسی حیثیت دی ہے، جب وہی عدم تحفظ، بے یقینی، عدم اعتمادی اور استحصال کی شکار ہوگئی، تو نئی نسل کیوں کر مثبت انداز میں پروان چڑھ سکے گی۔ پھر اولاد کی نظر میں ماں اور باپ دونوں کی شخصیات آدرش کا درجہ رکھتی ہیں، اُن کی اخلاقی کجی اولاد سے جینے کی تمام اُمنگیں اور اعتماد چھین لیتی ہیں، چوں کہ اکیلے مرد کی بہ نسبت شادی شدہ مرد سے وابستہ بہت سی زندگیاں ہوتی ہیں، اِس لیے اِس کی کج روی عائلی اور خانگی زندگی کی تباہی کے لیے ناقابلِ برداشت حد تک نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بیشتر ناول نگاروں نے اِس حساس موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور اِس کے مصائب اور نقصانات اور بُرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و تشکیل اُسی وقت ممکن ہے، جب بنیادی اور اساسی رشتہ میاں بیوی کا خیانتوں، کج رویوں سے پاک ہوگا، تو اُن کے ہاتھوں پروان چڑھنے والی نسل صحت مند سوچ اور فکر کی حامل ہوگی، دونوں کی مشترکہ سوچ اولاد کو بہتر انداز میں تعلیم و تربیت اور مثبت فکر سے آراستہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ غیر عورتوں سے تعلقات اور معاشقوں کے حوالے سے ممتاز مفتی ''علی پور کا ایلی''، عبداللہ حسین ''اُداس نسلیں''، بلقیس ریاض ''تجدید وفا''، بانو قدسیہ ''پروا'' اور ''راجا گدھ''، محمد سعید شیخ ''ایک اور دریا'' رضیہ بٹ ''معاملے دِل کے''، جمیلہ ہاشمی ''آتشِ رفتہ''، ''اپنا اپنا جہنم''۔ مرد عورت کی عیش پسندی اور آوارگی کے حوالے سے ڈاکٹر احسن فاروقی کا ''شام اودھ''، شوکت صدیقی ''خدا کی بستی''، ''چار دیواری''، جمیلہ ہاشمی ''تلاشِ بہاراں''، محمد سعید شیخ ''رنگِ جہاں اور''، ''اقبالِ جرم''، ''ایک اور دریا''، اصغر ندیم سید ''آدھے چاند کی رات''، ممتاز مفتی ''علی پور کا ایلی''، عبداللہ حسین ''قید'' اہم ہیں، اسی طرح جن ناولوں میں باپ کے معاشقوں سے متاثر ہونے والی اولاد کے کرب اور اذیت کو بیان

کیا گیا ہے، اِن میں جمیلہ ہاشمی ''تلاشِ بہاراں''، ممتاز مفتی ''علی پور کا ایلی''، رضیہ فصیح احمد ''یہ خواب سارے''، بانو قدسیہ ''شہرِ بے مثال''، ''راجا گدھ''، اصغر ندیم سید ''آدھے چاند کی رات''، قراۃ العین حیدر ''آگ کا دریا'' ہیں۔عبداللہ حسین کے ناول ''باگھ'' میں یاسمین کی پکار اس تنہائی کا خوف ہے، جو بیشتر مرد عورت کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح رات میں ریاض اور شوکت دونوں دوستوں کے مابین شوکت اور اُس کی بیوی جنھوں نے پسند کی شادی کی ہوتی ہے۔شوکت کی عدم توجہی کی وجہ اس کی بیوی ''ریاض'' کی طرف مائل ہو جاتی ہے، چوں کہ ہر عورت اپنے خاوند کی توجہ اور پیار چاہتی ہے۔ عورت کی ذہنی و قلبی کیفیات، اُس کے جذبات واحساسات کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، وہ خوبصورت اور دلآویز ستائیشی الفاظ سننے کی متمنی ہوتی ہے، جب کہ مرد عام طور پر روزمرہ زندگی کی روٹین میں عورت کو بوجھل کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے اپنی ذات سے لاپروائی اور پژمردگی عورت کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہے۔عبداللہ حسین نے نہایت چابک دستی سے شادی شدہ زندگی میں ناآسودگی کا سبب، غیر عورت یا غیر مرد کی مداخلت کو قرار دیا ہے، اُن کی یہ عدم توجہی عورت کے لیے زہرِ ہلاہل ثابت ہوتی ہے اور اسے بغاوت پر اُکساتی ہے۔شوکت کی بیوی کا ریاض کی طرف مائل ہونے کا سبب بھی یہی ہے، اسی طرح نعیم، ثروت اور محمود کی تکون میں محمود، ثروت کو نظر انداز کرتا ہے، جب کہ نعیم (جس کی بیوی فوت ہو جاتی ہے) کی توجہ اُسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ ثروت لڑتی جھگڑتی اپنے حقوق کی آواز بلند کرنے والی لڑکی ہے، اسی طرح ''باگھ'' کی یاسمین اور اسدی کے قصے میں اسدی گل چیں ثابت ہوتا ہے اور قیام وطعام کے بعد یاسمین کو تنہا چھوڑ جاتا ہے:

''اس آواز سے، یا کسی انسان یا حیوان کی آواز سے مشابہت نہ تھی، بلکہ ایک بادل پھٹنے کی سی آواز تھی، صرف اسد کو علم تھا کہ یہ آواز یاسمین کی ہے اور اپنے نیم خواب ذہن کے اندر وہ اس آواز کا منتظر تھا، مگر اس پھٹی ہوئی گرج دار آواز کا وہ متوقع نہ تھا۔۔۔ پھر اس آواز کا زور ٹوٹنے لگا، 'مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ' وہ ایڑ لگاتے ہوئے خچروں کے پیچھے اس ہیبتناک آواز میں چکار کر بولی، ''مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔'' ''[۱۵۳]

محمد سعید شیخ نے اپنے ناول ''ایک اور دریا'' میں مرکزی کردار عرفان کی زبان سے اپنے تانیثی نقطۂ نظر کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے، اس کا ایک ایک لفظ، ان کے تانیثی شعور و بالیدگی کی غمازی کرتا ہے۔عورت کو محض تصور تک محدود کرنے والوں کے بارے میں خیالات کا اظہار عرفان کے ذریعے کیا ہے:

''اُنھوں نے یہاں کے دیہات نہیں دیکھے، وہاں عورت بے رنگ ہی نہیں بدرنگ بھی نظر آتی ہے، وہ کائنات میں کیا رنگ بھرے گی، وہاں عورت ایک باندی ہے، ایک لونڈی ہے، کہیں زمیندار کی، کہیں خاوند کی، کہیں اپنے باپ کی۔ یہ جو ابھی ابھی یہاں عورت کی شان میں قصیدے پڑھے گئے ہیں، اُنھیں علم نہیں، اُنھوں نے دیکھا نہیں، گاؤں میں عورت زمین کے ٹکڑے کی قیمت پر بیچ دی جاتی ہے، ایک کھیت کے بدلے اس کا سودا کر دیا جاتا ہے، اسے اپنے باپ کی عمر کے مرد کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ اس خاوند کی خدمت، اس کی عزت اس کا ایمان ہے، اسے ایسے مرد کے ساتھ زندگی کے رشتے میں باندھ دیا جاتا ہے، جو مرد ہوتا ہی نہیں اور پھر اسی عورت کو

کردار کے شبہے میں قتل کر دیا جاتا ہے، اسے مرد کی غیرت پر قربان کر دیا جاتا ہے، اس سائنس کے دَور میں بھی، عورت غلام پیدا ہوتی ہے، اس کی پیدائش پر ماتم کی کیفیت ہوتی ہے، اسے پیدا کرنے والی خود شرمندہ اور شرمسار ہوتی ہے، یہاں عورت خود کو جنم دینے سے ڈرتی ہے، یہ مرد کی دُنیا ہے اور یہ مرد عورت سے پیدا ہونے کے باوجود عوت سے مرد پیدا کر کے خوش ہوتا ہے۔'' ۱۵۴

ناول ''کشتانِ محفل'' میں الطاف فاطمہ نے مشرقی و مغربی تہذیبوں کے تضادات اور ٹکراؤ کو بھی بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے، جو ان کی فنی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مغربی تہذیب کی نمائندہ روبینہ ناآسودگی کا شکار ہے، وہ احساسِ برتری اور محبتوں کے شوق میں تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے:

''بدنصیب! میری بات کو سمجھ لے، تو اتنی زندگیوں کو تباہ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہے۔ یہ ہندوستان ہے، یہاں ایک زندگی کے ساتھ نہ جانے کتنی زندگیوں کے تار منسلک ہوتے ہیں، یہاں لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہاں دلوں کے آبگینے بہت نازک ہوتے ہیں، یہ برف کے سفید تودے نہیں، یہ جلتی ہوئی چنگاریاں ہیں، جو نگر پھونک دیتی ہیں۔'' ۱۵۵

زبیدہ خاتون کے ناول ''ہما'' میں ڈاکٹر کامران ایسے لوگوں کا نمائندہ ہے، جو دل میں کسی اور کی تصویر کو سجائے رکھتے ہیں اور شادی کہیں اور کرتے ہیں، کامران کے دل میں دلکش کا نام کندہ ہے، جب کہ اِس کی زندگی کی محرم اس کی بیوی ہما ہے۔ لحہ لحہ مرنے سے ایک مرتبہ ہی مرنے کو ترجیح دیتے ہوئے ہما کامران کی زندگی سے جدا کرنے کی کاوش میں اُسے چھوڑ کر اپنے عزیز کے ہاں چلی جاتی ہے، ہما کے جانے کے بعد کامران پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اُس کا سب کچھ، تو ہما تھی، کیوں کہ تنہائی میں اُسے ہما کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اس کی ذات کا بھرپور حصہ تھی، اس کے چلے جانے کے بعد زندگی بے معنی و بے کیف ہو گئی تھی، یہاں دلکش کی دلکشی بھی اُسے لبھا نہ سکی، بلکہ وہ بھی عارضی و وقتی محسوس ہوئی۔ کامران ہما کی تلاش میں چل نکلتا ہے اور اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے۔ ہما سے تہہ دل سے معاضی مانگتا ہے اور برملا اظہار کرتا ہے: ''دلکش کا ذکر لے کر کیوں بیٹھ گئیں وہ، تو نقل تھی، جب مجھے اصل مل گئی، تو نقل کی کوئی حقیقت میری نظروں میں نہیں رہی آپ، تو جانتی ہی ہیں، کہ ایک سچے ہیرے اور امیٹیشن میں کیا فرق ہوتا ہے۔'' ۱۵۶

کشور ناہید نے ناول ''زیتون'' میں قبائلی علاقوں میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کی جھلکیاں اس میں نمایاں ہیں۔ قاسم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ، جب قیامِ پاکستان کے وقت سکھوں، ہندوؤں کی غارت گری سے بچنے کے لیے ہجرت کرتا ہے، تو ٹرین بلوے کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک مسافر کی بیٹی قاسم کی بیٹی جتنی پانچ سال کی زندہ سلامت بچتی ہے اسے اپنی بیٹی بنا کر ننکے نامی پہلوان کے ہاں رہتا ہے۔ مصنفہ نے دیوتاؤں سے عقیدت رکھنے والی عورتیں، جو پنڈتوں کی ہوس پرستی کا شکار ہوتی ہیں، ان کی نمائندگی کی ہے:

''ہر سال مجھے مقدس بہار یہ پوجا کے لیے بنارس بلایا جاتا تھا، بن اولاد عورتیں مندر میں جمع ہوتی تھیں کہ شیو کی مہربانی اور مدد سے مائیں بن سکیں، نوجوان پلی ہوئی عورتیں کہ جو

بڈھے کھوسٹ مردوں کو بیاہی جاتی تھیں، بڑا کچھ ہوتا تھا طرح طرح کے منتر کیے جاتے تھے، خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔ آخر کو عورتیں مدہوش سی ہو جاتی تھیں۔۔۔بس اس کے بعد تم ان عورتوں کے ساتھ، جو چاہو کرو۔۔۔ اس طرح برہمن لوگ خوب عیش کرتے ہیں۔ تمھیں پتہ ہے کہ یہ موئے ہندو لالے، یہ بھوکے ہی سوتے ہیں، مجھے،تو کرائے پر بُلایا جاتا تھا،مگر سچ بتاؤں بڑی مصیبت ہے۔۔۔ بڑا کام بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔۔۔ ختنے کیا ہوا شیو،اف،توبہ،خبر نہیں اب میں وہاں پھر جا بھی سکوں گا کہ نہیں سوچتے اور کہتے ہوئے اس کا چہرہ شرارت سے تمتما اُٹھا۔''۱۵۷؎

ڈاکٹر صادق کمال نے''خانم''میں شادی کے جھانسے دے کر لوٹنے والوں کا قصہ بیان کیا ہے:

''تم وہی عباس ہو جو محبوب بن کر اپنی محب کی شاہ رگ کو کند چھری سے ذبح کر آئے تھے۔ تم وہی عباس ہو جو جاتی دفعہ اپنی کہکشاں کی عصمت کا دامن تار تار کر آئے تھے۔ وہ بے ہوشی میں بے بس پڑی تھی اور تم اُسے گدھ کے طرح نوچ گھسوٹ رہے تھے۔ تم نے اُسے بے خبری کے عالم میں لوٹ لیا اور جاتی دفعہ ایک ایسا زہر ہلاہل اس کے جسم میں چھوڑ آئے تھے کہ وہ دُنیا کو منہ دِکھانے کے قابل نہ رہی اور اِس کا خمیازہ جس طرح اس نے بھگتا وہ وہی جانتی ہے۔''۱۵۸؎

فلمی ہیروئنوں کا جنسی استحصال کی عکاسی عصمت چغتائی کے ناول''بہروپ نگر''میں ملتی ہے:

''افوہ مر مر کے تو یہ لڑکیاں شادی کرتی ہیں، پھر اُلٹے طعنے دیتی ہیں۔' بھگوان۔۔۔میں ماں بننے والی ہوں!' ریتا نے اپنی کسی پرانی فلم کا مکالمہ دہرایا اور ایک سانس میں گلاس خالی کر دیا،' شٹ اَپ ریتا،' 'یو شٹ اَپ حرام زادے۔۔۔ کمینے۔' ریتا چنگھاڑی۔' یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو۔ منگلا نے پوچھا۔ کون ہے تمھارے کمرے میں؟'۔' ریتا ہے،' ریتا۔۔۔تمھارے کمرے میں۔۔۔ کیا کر رہی ہو؟' رہ رہی ہے۔' دھرم دیو نے ہنستے ہوئے کہا۔' ہاں۔۔۔ میں مشہور فلم اسٹار ریتا دیوی۔۔ نصیب کو رو رہی ہوں۔' ریتا پر خوب چڑھی ہوئی تھی وہ رسیور پر جھک کر چیخی۔' میں جنم جلی ابھاگن۔۔۔ میں ماں بننے والی ہوں۔' اُس نے رسیور چھیننے کی کوشش کی۔''۱۵۹؎

شادی شدہ زندگی میں نا آسودگی کا بہت بڑا سبب غیر مرد وعورت کی مداخلت ہوتا ہے۔ اِس سے نہ صرف خانگی زندگی عدم عتمادی کا شکار ہوتی ہے، بلکہ تشکیک کا زہر فریقین کے رگ و ریشے میں سرائیت کر جاتا ہے اور ہنستے بستے گھر تباہیوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مختلف ناول نگاروں نے اِس سماجی مسئلے کو خصوصی طور پر ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ مرد کی بے وفائی اور عورت کی بغاوت کو جمیلہ ہاشمی نے کرداروں کی نفسیات کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے کہ ماں بیٹے کی پیدائش پر خود کو مضبوط و مستحکم محسوس کوتی ہے، کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ بیٹی، تو اُسی کی طرح بے بس اور لاچار ہوگی۔ اسے دبایا بھی جا سکتا ہے اور ظلم کے پہاڑ بھی توڑے جا سکتے ہیں اور مرد کے حاکمانہ نظام والے معاشرے میں لڑکے کی پیدائش بھی باپ کے لیے ایک دھمکی

ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ماں کے ساتھ بیٹے کی فطری غیر ضروری وابستگی اس کے کسی بھی قسم کے استحصال کو گوارہ نہیں کرے گی، خصوصاً باپ کی غیر عورتوں میں دلچسپی، دوستیاں و یارانے اور تمام عمر کی ناآسودگی کا سبب بنتے ہیں، اسی صورتِ حال میں جوان ہونے پر بیٹا باپ کے مقابل آن کھڑا ہوتا ہے، اِس کا طرزِ عمل مفاہمانہ کی بجائے انتقامی ہو جاتا ہے۔ نتیجہ پورے گھرانے کی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے، جو مرد اس قسم کی لغویات سے اپنا دامن بچا کر رکھتے ہیں، اُن کی اولاد معاشرے میں سر اونچا کر کے جیتی ہے، اُن کے لیے ماں اور باپ کے کردار کی مضبوطی زندگی کا اعتبار بن جاتی ہے۔ ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' میں ایلی کی ماں ہاجرہ شوہر کی آوارگی سے زندگی کی تلخیوں میں گھل گھل کر اپنی ذات کی نفی کر دیتی ہے، تنہائی کے لمحے اس کے دُکھ میں اضافہ کر دیتے ہیں: ''تو کیوں جی بُرا کرتی ہے اماں، فرحت بولی۔ جی برا وہ رونے لگی۔ میرا دل تو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک اس کی ایلی اُمید رچائے بیٹھی تھی، اس کو دیکھ کر جیتی رہی، خاوند کی بے رُخی برداشت کی، سوکنوں کی خدمت میں لگی رہی، زندگی بھر محنت مزدوری کر کے اسے پالا۔''[۱۶۰]

رضیہ بٹ کے ناول ''معاملے دل کے'' میں عنصر جب اُس بیوہ کے بیٹے کے ساتھ دوستی بڑھاتا ہے، تو یہی اکھڑ اور ضدی، بے لحاظ بچہ سدھرنا شروع ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی اُسے بھنک پڑنا شروع ہوتی ہے کہ عنصر اس کی ماں سے شادی کا اِرادہ رکھتا ہے، تو مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے اور ماں سے جھگڑتا ہے: ''تو پھر کیوں آتا ہے وہ ہمارے ہاں، کیوں بیٹھا رہتا ہے، گھنٹوں آپ کے پاس، کیا باتیں کرتا ہے، کیوں مہربان ہے ہم پر، کیوں پیسے لٹاتا ہے بے دریغ، یہ ہم نہیں، آپ جانتی ہوں گی، آپ۔''[۱۶۱]

بلقیس ریاض کا ناول ''تجدیدِ وفا'' میں بیرونِ ملک جانے والوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ لندن کی آزاد فضاؤں میں عورت آزادی کو جدیدیت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں، مائرہ اور ثمن ایسی ہی پاکستانی لڑکیاں ہیں، جو لندن محض سہولیات اور اچھی طرزِ زندگی امارت اور دولت کی خاطر والدین کے ہمراہ ہجرت کرتی ہیں، جہاں اُنھیں پتہ چلتا ہے کہ کس طرح مذہب کی دیواریں چکنا چور ہوتی ہیں۔ اخلاقیات کا معیار کس انداز سے اُٹھایا جاتا ہے۔ آزادی کے نام پر غیر لڑکیوں اور عورتوں سے دوستانے، یارانے اور جنسی تعلقات کو ماڈرنزم کا نام دیا جاتا ہے، ثمن مائیکل نامی لڑکے سے شادی کرتی ہے، مائیکل پاکستانی رشتوں کے مطابق رشتہ اس کے والدین کے پاس لے کر جاتا ہے اور اس سے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے تاحیات وفاداری کا یقین دلاتا ہے، لیکن شادی کے فوراً بعد اس کی قلعی کھول جاتی ہے اور جولیا، جس کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات بھی ہوتے ہیں، محض دوست کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ بظاہر پاکستان میں سُسرالی نظام، جس میں نندوں ساسوں، جیٹھوں، دیوروں اور خاوند کی بے جا دھونس اور اجارہ داری ہوتی ہے، اس سے فرار حاصل کرنے والی ثمن آزادی کی مکروہ صورتحال کا سامنا کرتی ہے:

> ''میں بہت پریشاں ہوں۔۔۔ سوچا تھا کہ آپ کو نہیں بتاؤں گی۔۔۔، لیکن مجبوری کے تحت بتا رہی ہوں۔۔۔ کہ میں عمران کو پسند کرتی ہوں۔۔۔ اور وہ بھی مجھے کرتا ہے، اب میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں، تو اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔۔۔ لاکھ کوشش کی کہ اس بچے کو باپ کا نام دے دو۔۔۔ مگر وہ یہی کہتا ہے، کہ والدین کے پاس چھوڑ کر۔۔۔ پھر مجھ سے شادی کرے گا۔۔۔ لیکن۔۔۔ میں کہتی ہوں کہ یہ فراڈ ہے۔۔۔

دھوکے باز ہے۔۔۔تم اس سے بچ جاؤ۔۔۔یہ تمھیں بھی بچے کی ماں بنا کر شادی نہیں
کرے گا۔۔۔میں تمھارا بھلا چاہتی تھی۔'' ۱۶۲

بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' کی عابدہ کا ہر لفظ زہر بھرا ہے۔عابدہ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اپنے اندر تلخ حقیقتوں کو لیے ہوئے ہے، اگرچہ وہ کم پڑھی لکھی عورت ہے اور جانتی ہے کہ اس کی بربادی کے اسباب کیا ہیں، لیکن پڑھی لکھی عورت کو بعض اوقات محض تفریح کی خاطر یاریاں دوستیاں گانٹھتی ہے اسے نشانہ تنقید بنایا ہے کہ اپنی وقت گزاری سے کسی کا ہنستا بستا گھر منٹوں میں برباد کروا دیتی ہیں، لیکن یہ برباد کرنے والا، تو مرد ہی ہوتا ہے، اگر وہ اپنے نفس پر قابو رکھے اور ایسے دوستانوں سے باز رہے، تو اس برائی کے خاتمے کی کوئی صورت نظر آسکتی ہے۔بصورتِ دیگر اگر وہ خود ان لمحوں کا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور خوش فہمیوں میں کھو جانا چاہتا ہے، تو بربادی اپنے ڈیرے جمائے رکھے گی۔مجموعی طور پر راجا گدھ میں بانو قدسیہ نے مختلف طبقوں کی عورتوں کی جنسی و نفسیاتی اُلجھنوں اور مسائل کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مردوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جو بعض اوقات بدعورتوں کے پیچھے لگ کر اپنا سب کچھ برباد کر ڈالتے ہیں اور عیاش طبع اپنے فرائض سے غفلت برتنے والے لاپروا اور دوستیاں گانٹھنے والے بیوی بچوں کو نظر انداز کرنے والے اپنے بربادیوں کے ساتھ پوری نسل کو ناآسودگی اور بے اعتمادی دے دیتے ہیں۔مثلاً سیمی اور قیوم کی گفتگو: ''مرنے کی گھڑی، تو اب آئی قیوم اب۔۔۔لیکن آفتاب کے جانے کے بعد، تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا، پر اُمنگ ہر خوشی، اصل میں، تو میں اس کے نکاح والے دن مرگئی تھی۔۔۔غلطی تمھاری تھی۔تم نے ایک مردہ لڑکی سے رابطہ قائم کیا۔'' ۱۶۳ جذباتی سطح پر دھوکہ دینے والے مرد و عورت مردہ احساسات پر سودا کرتے ہیں اور ناخوشی و تلخی سے اپنا دامن بھرتے ہیں۔امتل جو بے راہ روی کی راہ اپناتی ہے، اس کی وجہ بھی اس کا شوہر تھا، جس نے مختلف عورتوں سے راہ و رسم پیدا کر رکھے تھے: ''اس کی دوکان تھی انارکلی میں کپڑے کی۔۔۔ماں تھی، بہنیں تھیں، ایک پچھلی منگیتر تھی، ایک شادی کے بعد کی محبوبہ تھی، اتنی لمبی چوڑی ذات برادری کی عورتیں تھیں، جو آدمی اتنی عورتوں میں بنا رہے وہ بیچارہ بھی خالی ہو جاتا ہے، اس کی زندگی ساری حصہ پتی میں گزرتی تھی۔'' ۱۶۴

محمد سعید شیخ کے ناول ''ایک اور دریا'' میں ایک جنگی قیدی کی بیوہ بشریٰ کن مصائب کا شکار ہوتی ہے، اتنی بربریت اور انسانیت سوز سلوک دیکھ کر دل پر جمود طاری ہو جانے کی وجہ سے اکثر فوجی سرد مہری و بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں: ''مجھے، تو وہ کھوکھلا ملا تھا، جس میں سے زندگی کا ہر جذبہ نکال لیا گیا تھا، میں نے اسے زندہ کرنے کی بہت کوشش کی، کبھی بیوی بن کر، کبھی ماں بن کر، کبھی اپنے جسم سے، کبھی پیار سے، کبھی اپنی ممتا سے مگر اس کی راکھ میں کوئی چنگاری نہیں تھی۔'' ۱۶۵

عصمت چغتائی نے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں ایڈی پس کمپلیکس اور الیکٹرا کمپلیکس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرداروں کا تانا بانا بُنا ہے، اس کی مرکزی کردار الیکٹرا کمپلیکس کی شکار ہے باپ سے نفرت درحقیقت باپ کے جابرانہ، حاکمانہ اور متشددانہ رویے کی وجہ سے ہے اپنی اغراض اور معاشقوں کا شکار بیوی بچوں سے عدم وابستگی، لاپروائی کا مرتکب ہوتا ہے۔ماں باپ کی توجہ اور محرومیوں و نارسائیوں کے شکار بچے ورثے میں محض احساسِ کمتری اور باپ سے نفرت پاتے ہیں۔نفرت کی یہ آگ اُس وقت ماں کی محبت و شفقت بھلا بیٹھتی ہے، جب احساس ہوتا ہے کہ ماں باپ کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی ہے۔اولاد کی خواہشات اور ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہونے کی وجہ سے باپ کی نفرت کا رُخ ماں کی طرف مڑ جاتا ہے اور اولاد کے ذہنوں میں بغاوت اُبھرتی ہے کہ اُن کی ماں کیوں اس قدر بے بس اور لاچار دکھائی دیتی ہے۔وہ اپنے اور اولاد

کے حق کے لیے آواز کیوں نہیں اُٹھاتی:

''وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپ کی چہیتی سہیلی سلمہ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی چھپا چھپ سروئی کریپ کے دوپٹہ پر لچکا ٹانک رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔۔۔ اور یہ سب ابا کا قصور تھا، کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں، ادھر بچہ پیدا ہوا، اُدھر آگرے سے گوالن بلوالی۔ وہ دودھ پلائے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے پھر بھلا بچے کیوں سانس لیتے؟ گھر کیا تھا، جیسے گائے بیلوں کا باڑہ، کھانا ہے تو پتیلوں، پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا، زندگی سے لبریز، چھلکنے کو تیار!۔''۱۶۶

''خوبصورت'' کی رملیٰ بالآخر سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ آخر کیوں وہ اتنے گھٹیا انسان کو اپنے شوہر پر ترجیح دے رہی تھی، اسی طرح ''شان بھائی''، جو املیٰ کا بہنوئی ہے اس کی اصلیت بھی جلد اس پر آشکار ہو جاتی ہے، جسے وہ آئیڈیل شوہر سمجھتی رہی وہ انتہائی پست ذہنیت کا گھٹیا انسان نکلا۔ جلد ہی اس کو اندازہ ہوا کہ اصل خوبصورتی ظاہری نہیں، بلکہ باطن کی ہوتی ہے۔ ناول میں ''بے جی'' کے کردار کے ذریعے مصنفہ نے روزمرہ زندگی کے گھریلو مسائل اور اُلجھنوں کی گرہ کشائی کی ہے۔ ''خوبصورت'' میں اِس کی سہیلی جیدہ کا شوہر، جو نہایت خوش شکل تھا، لیکن کردار کا اُتنا ہی بُرا ہے۔ لڑکیوں کو ورغلانا اور بلیک میل کرنا اس کا من پسند مشغلہ تھا، وہ اپنی بیوی کے ساتھ مل کر رملیٰ کو بھی ورغلاتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے، رملیٰ اپنے خیالی دیوتا کو درندے کے روپ میں دیکھ کر بہت دُکھی ہوتی ہے، جب اس کی سہیلی کا شوہر ان خیالات کا اظہار کرتا ہے:

''بہت دن تک تم نے مجھے ادائیں دکھائیں ہیں، اتنی دیر میں نے کسی لڑکی پر نہیں لگائی، جتنی تم پر، میں جلدی اپنا حساب بے باک کر لیا کرتا ہوں۔ زیادہ دن تک تم پارسائی کا دعویٰ نہ کر سکو گی؟۔ اسے وہ دُنیا کا بدصورت ترین انسان دکھائی دے رہا تھا، اِس کی زندگی کی ساری خباثت اس کے چہرے پر تھی۔''۱۶۷

رفعت سراج کے ناول ''گلابی کاغذ اور زرد پھول'' میں ناجائز آمدنیوں کے پروردہ بگڑے رئیس عورت و شراب ہی میں پناہ لیتے ہیں، یمنیٰ کا بوائے فرینڈ مجازی ایسے مردوں کا نمائندہ ہے، جن کی حرام اولادیں نالیوں، گڑوں یا پھر کوڑے کے ڈھیر کا حصہ بنتی ہیں۔ خود کو تمام باتوں سے بری الذمہ قرار دے کر لڑکیوں کو ہی موردِ الزام ٹھہراتا ہے:

''بعض لڑکیاں بڑی اسٹوپڈ ہوتی ہیں۔۔۔ میں نے ایک انڈین دوست بنائی تھی۔۔۔ تین مہینے بعد ہی وہ مجھے کیچر کرنے لگی، کہ میں Expect کر رہی ہوں۔۔۔ میں نے کہا، تو پھر میں کیا کروں۔۔۔؟ دوستی کرتی ہو، تو اپنا خیال بھی رکھا کرو۔۔۔ یہ میرا ہیڈک نہیں ہے۔۔۔ کہنے لگی ہم شادی کر لیتے ہیں۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔؟ کس قدر بیوقوف تھی۔۔۔ میں نے، تو گڈ بائے کہا اور ایک ہفتے کے لیے اپنے ماموں کے پاس جارڈن چلا گیا۔۔۔ مجھے بچے پیدا کرنے ہوں گے، تو میں پراپر چینل سے شادی کروں گا۔۔۔ بچوں کی ذمہ داریاں قبول کروں گا۔۔۔ ان کو بہترین اور آنرایبل سٹیزن بناؤں گا، وہ اپنے ناموں کے ساتھ میری کاسٹ یوز کریں گے۔۔۔ IllLeagal بچہ، نانسنس۔۔۔! یہ کیسے کنفرم ہو

گا کہ وہ میرا ہے؟ اب میں ایک اسٹوڈیڈ لڑکی کی مدد سے U.S.A جا کر لیب ٹیسٹ کراؤں گا
۔۔۔؟ میرا خیال ہے کہ اُس نے میری دولت کے چکر میں گیم کھیلی ہے۔'' ۱۶۸؎

ماں باپ اولاد کی زندگی کی اساس ہیں ۔ اخلاقی جذباتی اور نفسیاتی طور پر بچے والدین سے زندگی حرارت اور توانائی حاصل کرتے ہیں، جو تاحیات اُن کی ہمسفر رہتی ہے، اُنھیں صحت مند اور ذہنی وجذباتی طور پر مستحکم کرتی ہے، لیکن جب یہی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں، تو کردار کی شکستگی کا باعث بنتی ہیں ۔ ماں اگر جڑ کی مانند ہے، تو باپ کی حیثیت اُس جڑ کو قائم رکھنے کی ہے۔ سماجی اوہام جو باپ کے کردار سے وابستہ کیے جاتے ہیں عموماً باپ کا کام صرف اولاد کو معاشی سطح پر سہولیات پہنچانا متصور کیا جاتا ہے، جب کہ باپ اولاد کی تربیت، رہنمائی اور خود اعتمادی کا باعث بنتا ہے، اُس کے کردار کی خامیاں اولاد کے لیے سوہانِ روح ہوتی ہیں، اس کی وجہ سے نہ صرف ذہنی مسائل بلکہ جنسی بے راہ روی کا مسئلہ عموماً پیدا ہوتا ہے، اسی لیے باشعور اور دُوراندیش ناول نگاروں نے اِس موضوع کو اُجاگر کر کے نئی ادبی جہت کا اضافہ کرتے ہوئے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے کہ باپ کی شخصیت اولاد کے لیے ویسی ہی ناگزیر ہے جیسا کہ ماں کی شخصیت وتربیت ۔ جمیلہ ہاشمی نے ہندو، سکھ، مسلمان گھرانوں کے کرداروں کو موضوع بناتے ہوئے ہر طبقے اور مکتبِ فکر کے لوگوں کے نفسیاتی گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت مرد سے کسی طرح بھی کم تر نہیں، بلکہ اسے قدم قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہے، تا کہ وہ بھی ایک بااعتماد زندگی بسر کر سکے ۔ اس میں عورت کو ماں، بہن اور بیٹی وغیرہ کے رشتوں سے بلند ہو کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اِس کا ہر کردار کسی نہ کسی حوالے سے عورت کے تحفظ، آزادی اور حقوق کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے، یہ ناول ہندوستانی عورت پر ہونے والے ظلم کے خلاف ایک بھرپور آواز ہے، جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے ۔ میرا کا باپ تمام عمر معاشقے لڑانا، عورتوں سے ہنسی ٹھٹھول کرنا، دوستیاں ویارانے پیدا کرنا، اپنا حق سمجھتا تھا، اِسی آوارگی کی وجہ سے اُس کی بیوی روتی کُرلاتی زندگی کی بازی ہار گئی تھی، چوں کہ دُنیا مکافاتِ عمل ہے، اسباب وعلل کی اِس دُنیا میں انجام سے بے خبر آوارگی اور عیش پسندی کے قائل، بالآخر خمیازہ بھگتتے ہیں، اُن کی اولاد اُن کے لیے آزمائش بن جاتی ہے، یا تو یہ خود اولاد کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں یا اولاد اُن کے ہاتھوں جان کی بازی ہار جاتی ہے ۔ میرا کے باپ کو جب اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہے، تو اُسے غصے میں مار ڈالتا ہے:

> ''ان آنکھوں کی گہرائیوں میں حیرت تھی اور ایک التجا تھی، مگر میں نے یہ سب نہیں دیکھا، تاروں کی چھاؤں تلے میری بیٹی کی وہ آنکھیں، جن کو میں غرور سے دیکھا کرتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے التجا کر رہی تھیں اور میں دیکھ نہیں سکتا تھا، میری آنکھوں میں آہنی سختی آتی گئی ۔ میرا کا تڑپتا جسم اور اُس کی کشمکش میرے ہاتھوں کے نیچے ختم ہوگئی، میرا میری اپنی اکلوتی بیٹی میرا مر گئی۔'' ۱۶۹؎

''ویمپائر'' میں ریلوے سفر کے دَوران کھو جانے والی لڑکی، جس کے ساتھ ریلوے کے کوارٹروں میں موجود ایک شخص نے جور وتشدد سے اُس کی عصمت وعفت کو تار تار کر دیا، جب اِس پر بیتے جانے والے سانحے کی خبر سب کو ہوتی ہے، تو اس کی پردہ داری کے لیے شادی پر زور دیا جاتا ہے، مگر باراتیوں کو اس بات کی خبر ہوتے ہی بارات واپس لوٹنے لگتی ہے، تو وہ خود اپنے میاں سے بات کی ٹھان لیتی، اُس کے آنے پر یہ حقیقت کھل گئی اس کی عزت کی دھجیاں بکھیرنے والا وہی تھا'' مجھے لے

چلو۔۔۔تم نے میری مٹی خراب کی۔۔۔تم اول نمبر کے بدچلن اور آوارہ ہو۔۔۔خوب خوب میں نے تمھیں کوسا۔۔۔بڑے آوارہ اور بدچلن ہو تم سخت بدچلن۔'' ۱۷۰ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''یہ خواب سارے'' میں مسلسل ٹینشن اور ذہنی دباؤ کے نتیجے میں، جو بچی پیدا ہوئی اس کے دِل میں سوراخ تھا، اِسی طرح اسرار صاحب کا بیٹا انتہائی خوبصورت تھا، وہ بھی: ''میاں بیوی کی تناتنی اور کھنچاوٹ کی بھینٹ چڑھ گیا'' ۱۷۱ ''انتظارِ موسمِ گل'' میں طاہر جیسے ناسور اپنی ہوس پرستی کی وجہ سے خود سے وابستہ لوگوں کی زندگی عذاب کر دیتے ہیں۔ایسے خودغرضوں کو شے ملنے کی ایک وجہ غیر منصفانہ طرزِ فکر بھی ہے:

''دُنیا میں عورتوں اور مردوں کے لیے اتنی مختلف قدریں کیوں ہیں۔مرد اپنی بے حیائی اور بے وفائی کی داستان بھری محفل میں سناتے ہیں اور لوگ باگ خوش ہو کر سنتے ہیں۔ایسے مرد، مرد مانے جاتے ہیں۔غیر ممالک میں اگر وہ پارسائی پر اُتر آئیں، تو اُن کے ساتھی مذاق اُڑاتے ہیں، اُنھیں ملاجی ہونے کے طعنے دیتے ہیں، مگر عورتوں کے لیے یہ ساری باتیں انتہائی بے شرمی اور بے حیائی کی ہیں، اگر کوئی عورت میاں سے بے وفائی کا قصہ اپنی جگری دوست کو بھی سنائے، تو وہ منہ پر تھوکے گی۔'' ۱۷۲

''راجہ گدھ'' میں قیوم کا باپ اپنی دل پشوریوں میں لگا رہا اور اُس کی ماں نے اس کی عدم توجہی کی وجہ سے کسی غیر سے تعلقات اُستوار کر لیے اور پھر اس کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی، قیوم داستانِ حیات بیان کرتے ہوئے نہایت دُکھ سے کہتا ہے: ''تو۔۔۔کیوں نکلی تھی ماں۔۔۔دیہات میں ہم لڑکے لوگ نکل جانے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔'' ۱۷۳ ایسی آفتاب سے جذباتی وابستگی قیوم سے ناجائز تعلقات کی صورت میں پوری کرتی ہے اور قیوم راجا گدھ کی مانند اس کے وجود سے اپنے نفس کی آگ، تو بجھاتا ہے، لیکن ناآسودگی، جو ہر بُرائی کا منطقی نتیجہ ہے اس کے حصے میں آتی ہے۔ پاکستان کے اُونچے بیوروکریٹ کے لیے آفس فائلیں، اپنی ساکھ، اسٹیٹس، فون کالز، میٹنگیں، اور جوان لڑکی کی تلاش، جنسی بے راہ روی اور خودکشی کی اصل وجہ تھے۔''شہرِ بے مثال'' میں بانو قدسیہ نے گھریلو عورتوں کی آڑ میں چھپی ہوئی طوائفوں اور نائیکوں کو بے نقاب کیا ہے، جو اپنا خرچہ پانی چلانے کی خاطر نیکی اور باپردگی کی آڑ میں ہمدردیاں وصول کر کے غازی جیسے نئے پرندے پھنسوانے میں ماہر ہیں۔گلنار کا کردار ایسی ہی نام نہاد مظلوم اور نیک عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے، اِسی طرح رشیدہ کی ڈائری کے اوراق کے ذریعے عورت کے بارے میں معاشرے میں مروج تصورات بیان کیے گئے ہیں:

''مرد اور اللہ میاں چکی کے دو پاٹ ہیں اور ان میں عورت گیہوں کا دانہ ہے، جو اگر پسنے سے انکار کر دے، تو اس کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ بیچاری جانتی ہے، یہ گھن کیا ہے، یہ وہ دکھ ہے، جو عورت کے دل کو چاٹتا رہتا ہے۔۔۔ساری سہولتیں مرد کے لیے ہیں۔ساری اشرف المخلوقات مرد کے لیے ہے، وہ بے وفا ہے، تو یہ اس کی فطرت ہے، اِس کے رب نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔'' ۱۷۴

''علی پور کا ایلی'' میں ایلی ایسی عورتوں سے متنفر ہوتا ہے، جو ہر غیر مرد کے لیے بظاہر پارسائی کا ڈھونگ رچائے اپنا دروازہ کھول دیتی ہے۔حُرمت کے رشتوں کا نام دے کر بھائی، بہن، بھابھی، خالہ، ماں، چاچی وغیرہ نہ صرف روزمرہ کی ضروریات پوری کرتی ہیں اور کام نکلواتی ہیں، بلکہ بدلے میں ٹوکن کے طور پر تبرک کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں، تاکہ ان

کے نام نہاد خلوص اور میٹھی چاپلوسانہ زبان کے جال میں والد رہائی نہ پا سکے۔ شہزاد نے بھی چھ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود، اپنی مخصوص اداؤں سے ایلی کا لبھائے رکھا اور اسے دھتکار کر اس کے آتشِ عشق کو اور بھی بھڑکاتی ہے۔ ایلی، جو اس کی اولاد کی طرح ہے اس کا اسیر بنا رہتا ہے۔ شہزاد جیسی عورتیں مرد کی نفسیات کو بڑی باریک بینی سے پرکھتی ہیں اور اپنی اداؤں سے جذبات کو ایسا روپ دیتی ہیں کہ ان کا بناوٹی پن نام نہاد اخلاص کی تہوں میں چھپ جاتا ہے۔ مفتی نے علی احمد کے کردار کے ذریعے ایسے مردوں کی نمائندگی کی ہے، جو اپنے بے لگام نفس پرستی سے مختلف عورتوں کو گھیرتے ہیں، دوستیاں گانٹھتے ہیں اور پھر موقع پاتے ہی شبخون مارتے ہیں۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے عورتوں کو اپنے جال میں اُتارنے والا خود اپنے نفس کی آگ، تو بُجھا لیتا ہے، لیکن استحصال ہونے والی عورتوں کو بے کار کاغذ کی طرح ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے، جس جگہ بھی جاتا ہے کوئی نہ کوئی دوستانہ اور معاشقہ رچا لیتا ہے، ان میں بیاہتا بھی شامل ہیں اور غیر شادی شدہ بھی، ان میں آمنہ ہو یا مہترانی ہو یا گھر کا کام کاج کرنے والی، اسکول کی اُستانی، کشمیر کی راجو ہو یا شمیم اس کی دسترس سے بچ نہ سکی: ''اس کے ساتھ، تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہوتی ہے۔ بہن، نئی ہو یا پُرانی تمیز نہیں بس ساتھ ہو۔'' ۵۷ ایلی کا چھ بچوں کی ماں شہزاد کے عشق میں گرفتار ہونا، اس کی جنسی گھٹن، بے راہ روی اور گراوٹوں کے درپردہ ایلی کے بچپن کے ناخوش گوار واقعات ہیں، اُس کا سب سے بڑا محرک ایلی کے باپ علی احمد کا کردار ہے، جو ایلی کی ماں کو محض گھر میں پڑی ہوئی بے جان شے متصور کرتا ہے۔ علی احمد کی عیاش طبعی اور بے لگام جنسی جذبات، اسی کی حریصانہ فطرت، ایلی اور اس کی بہن فرحت کے دل و دماغ میں شدید ترین نفرت کا مؤجب بنتے ہیں۔ ایلی کے گھر کی چار دیواری میں موجود چاروں افراد، اس کی ماں، بہن اور ایلی بے حیثیت کل پُرزے محسوس ہوتے ہیں، جب کہ علی احمد، ایسے انسان کے روپ میں سامنے آتا ہے، جو سرتا پاؤں جنس میں لتھڑا ہوا ہے۔ ایلی اپنے باپ کی عیش پسندی، عورتوں سے معاشقے اور لگاوٹوں اور جنسی ہوس پرستی سے بچپن ہی سے اس حد تک متنفر اور خائف ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری زندگی احساسِ کمتری کی نذر ہو جاتی ہے۔ بچپن ہی سے باپ کی بے راہ روی لاشعوری طور پر احساسِ ذلت میں مبتلا کر دیتی ہے، یہی احساسِ کمتری اور پھر رفتہ رفتہ آوارگی و نفرت، بغاوت اور ذہنی انتشار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ایلی مہندی والے ہاتھوں سے اس لیے نفرت کرتا ہے کہ اس کا باپ صفیہ بیاہ کر لاتا ہے، جس کے ہاتھ مہندی سے لتھڑے رہتے ہیں۔ اس کی ماں ہاجرہ گھر کے نظر انداز کیے جانے والے بے کار سامان کی طرح خدمت کرنے پر مجبور تھی۔ پے در پے جذباتی صدمات نے ہاجرہ کے دل و دماغ پر یاسیت کی ایسی گہری چھاپ لگائی کہ اس کی ذات اور روح بے حسی اور سکوت کی نذر ہو گئی۔ شوہر سے مایوس یہ عورت، بیٹے کی شکل میں اپنی خواہشات کی تکمیل ڈھونڈنے لگی، کیوں کہ اس کے شوہر کی بدکرداری کی وجہ سے اس کے گھر میں فصلی بٹیروں کا تانتا بندھا ہی رہا، وہ خود جان سے ہار گئی، لیکن آفرین ہے علی احمد پر جس کی آوارگی و عیاشی میں رتّی بھر فرق نہ آیا علی احمد کی ''ہی ہی ہی'' اس کے خود غرضانہ احساسات اور شہوت پرستی کی غمازی کرتا ہے۔ بچپن میں جب علی احمد اپنے بیٹے ایلی کو ساتھ لے کر سینما جاتا ہے، تو راستے میں ملنے والی بُرقعہ پوش عورت، جو علی احمد کی دوست کی بیوی ہے، اُسے اپنی چکنی چپڑی اور دلفریب باتوں سے ایسا گھائل کرتا ہے تب سے ایلی کے دِل میں برقع پوش خواتین کے خلاف نفرت بھر جاتی ہے۔ عورتوں کے بارے میں وہ اپنی رائے قائم کر لیتا ہے کہ اگر عورت ڈٹ جائیں، تو دُنیا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں اور پہاڑوں کو چیر دیتی ہیں اور عاجز ہونے لگیں، تو نالی کے کنارے بیٹھ کر رو دیتی ہیں:

''ایلی کی تمام تر جنسیاتی زندگی علی احمد کے محور کے گرد گھومتی تھی، جب کوئی جونک ان کے گھر

آ کر علی احمد کا خون چوسنے کے شغل میں مصروفِ کار ہو جاتی، تو وہ غصے سے بھوت بن جاتا۔
علی احمد کو ایسی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں اسے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے
کا کیا حق ہے؟ کیا اسے ایسی سستی عورتوں کے علاوہ کوئی باعزت عورت نہیں ملتی۔'' ۱۷۶

سلمیٰ کنول کے ناول'' لالہ'' میں عائشہ ،بیٹی کی پرورش اور باپ کے لیے اُس کی تڑپ ، انتظار اور اُس کے معصوم سوالات کے جوابات دیتی زندگی کی دُکھ جھیلتی چلی جاتی ہے اور جب عثمان کے جذبات کی آندھی اُترتی ہے، تو پچھتاوے اُس کا مقدر بنتے ہیں:

'' ہمارے مذہب میں مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے اور یہی بات مردوں کو خراب
کرتی ہے۔ہم سے بیچاری حوا کی بیٹیوں پر ظلم کراتی ہے۔ہم مرد خود غرض بن جاتے ہیں،
کچھ بھی نہ سوچا سمجھا، دِل کا فیصلہ سنا اور اِس پر اڑ گیا، یہ نہ سوچا کہ تم پر کیا گزرے گی اپنی
زبان اور اپنے وعدوں کا بھی خیال نہ رہا اور تو اور اپنی اولاد، جو میرا خون تھی، اس کی پروانہ
رہی، جانے کون ساسحر تھا، کون سا جادو تھا، جو مجھے پستیوں میں گراتا چلا گیا۔'' ۱۷۷

سلمیٰ مسعود کے ناول'' خانماں برباد'' میں سوہنی کے بھائی نورا کو جب اپنی بہن کے بہیمانہ قتل کا پتہ چلتا ہے، تو انتقام کی آگ میں جلنا شروع ہو جاتا ہے، اس کی مجبور ماں ہر وقت دوپٹے سے زہر باندھے رکھتی ہے، تا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے قاتل کو زہر دے سکے۔نواز کہہ اُٹھتا ہے:

'' میرا انتقام دیکھنا، نہ صرف اُس کی بیٹیوں ، بہنوں کی غنڈوں سے بے عزتی کراؤں گا،
اُس کو قتل کر کے کتوں کے آگے اُس کا گوشت پھینکوں گا۔۔۔کہیں ابا نے، تو یہ حرکت نہیں
کی۔۔۔نورے کی منی سے گڑیا سے کھیلتی رہی اور وہ پچاس سالہ بدمعاش جنگلی جانور نورا
چین سے چارپائی پر سوتا رہا اور ماں خاموشی سے اُنھیں لوگوں کی خدمت پر مجبور رہی باپ
اُسی کی بدمعاشیوں کا آلہ کار رہا۔یا اللہ کیا یہ سب میرے باپ کے کرتوتوں کی سزا، تو نے
معصوم بچی کو دی۔۔۔اُس میں غیرت ہوتی، تو دوسرں کی بہو بیٹیوں کو ورغلا کر نواب کے
پاس کیوں لاتا، اُس میں پانچوں شرعی عیب ہیں، اُسے رنڈیوں اور شراب کی لت ہے، جو
نواب کے عطیوں سے حاصل ہوتی ہیں، وہ اتنے جُرم کر چکا ہے کہ نواب اُسے پھنسا دے
گا، وہ تجھے نواب کے خلاف ایک لفظ بھی بکنے نہیں دے گا۔سوہنی کو دو تین سالوں بعد اُس
نے خود نواب کی نذر کر دینا تھا، اُسے اولاد سے، بیوی سے کوئی محبت نہیں۔'' ۱۷۸

اصغر ندیم سید کے ناول'' آدھے چاند کی رات'' میں ماہ رُخ کا شاگرد عامر ہوسٹل میں رہتا ہے، اس کا باپ اُس سے اکثر ملنے آتا ہے۔ہر وقت عامر کی ماں کی تذلیل کرتا ہے اور بیوی بچوں سے عدم توجہی برتتا ہے:

'' آج بھی وہ اپنے باپ سے نہیں ملنا چاہتا تھا، اس نے جب آنکھ کھولی، تو گھر میں کشیدگی
کا ماحول تھا۔۔۔باپ اکثر رات کو آتا اور صبح کو چلا جاتا، ماں ہر وقت اپنے رشتہ داروں
کے گھر میں گھسی رہتی، وہ اس چکی میں پستا رہا، حتیٰ کہ دونوں میں طلاق ہو گئی اور اس کے

نتیجے میں عامر کو یہاں رہنا پڑا۔'' ۱۷۹؎

دُردانہ نوشین خان کے ناول ''اِندر جال'' میں عیاش مردوں کی، جو پڑھے لکھے ہوں یا اَن پڑھ، اِن کی نام نہاد نیک نامی کو آڑ میں چھپی ہوئی شیطانیت کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شہاب کس طرح لڑکیوں، عورتوں کے جُھرمٹ میں اپنا نام بنائے رکھتا ہے اور وقت گزاریاں کرتا ہے، اِسی طرح لڑکیوں کے جذبات سے کھیلنے والے دیگر لوگوں کی عاشقی کا قصہ بیان کیا گیا ہے، جن میں مبتلا لوگ معاشقوں اور دِل لگیوں کو وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اِس کھیل میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی، جو وقت گزاری کے لیے اپنی دُکان سجاتے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ایسے ہی لوگوں کا نمائندہ ہے، جس کی خود ساختہ جذباتی ریاست میں احساسات سے کھیلنا اور کھلانا۔ وقت گزاری کے لیے ناگزیر ہے:

> ''دِل لگی میں، تو کوئی حرج نہیں، مگر تمھیں میں نے غالباً بتایا نہیں کہ میرے اعتباری دوست نے ڈاکٹر ثمرانہ کو شنگریلا میں ایک بدنام رئیس زادے کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھا تھا۔ فریحہ تم تو معصوم ہو، کوئی مرد کسی کو مفت میں نہیں کھلاتا پلاتا، ایسی لڑکی کو میں تو کم از کم بیوی نہیں بنا سکتا۔ ٹائم پاس کر سکتا ہوں۔ ویسے مرتی ہے مجھ پر، وہ تو لٹو ہے، کئی بار کہہ چکی ہے آپ کی ہائیٹ آئیڈیل ہے، اپنی جیسی ہائیٹ والی لائے گا، مطلب سمجھتی ہونا۔'' ۱۸۰؎

ملازمت پیشہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے مسائل، جائے ملازمت پر ہراساں کرنا، باس اور افسروں کا جنسی جبریت کا نشانہ بنانا عام ہوتا جا رہا ہے، اِسی طرح عورت کو ترقی کا زینہ سمجھنے والوں کے مکروہ چہرے بھی بے نقاب کیے گئے ہیں، اس تانیثی استحصال کی نشاندہی کرنے والوں میں خالدہ حسین کا ''کاغذی گھاٹ''، رضیہ بٹ کا ثمینہ، شوکت صدیقی: ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس''، اے آر خاتون کا ''چشمہ'' اور رضیہ فصیح احمد کا ناول ''رفاقتیں کیسی'' نمایاں ہیں۔ ''رفاقتیں کیسی'' میں کی شہلا جنسی ناآسودگی کی شکار عورت ہے، جو خود کو آسودہ کرنے کی خاطر اخلاقیات کو بالائے طاق میں رکھتے ہوئے نت نئے مردوں کو پھانستی اور سامانِ تسکین کرتی ہے، اپنے احساسات کی تشنگی کا ذکر ہر پھانسے جانے والے مرد سے ضرور کرتی۔ ضیا اپنے نئے شکار کو بھی وہی کہانی سناتی ہے، جو اِس کی بے راہ روی کی اصل بنیاد بنی ہے:

> ''میرا شریکِ زندگی شاید جنسی آسودگیاں سمیٹ سمیٹ کر تھک چکا تھا۔۔۔ میرے شوہر کی بے حسی بڑھتی جا رہی تھی میں راتوں کو اِس کی آغوش میں سر رکھ کر جاگنا چاہتی اور وہ بستر پر پڑتے ہی خراٹے لینے لگتا میں نے اس کے پیار میں کبھی جوشیلی شدت نہ پائی، اِس کے ہونٹوں کا لمس ہمیشہ ٹھنڈا اور بے کیف رہا، اِس کے بازوؤں میں شاید اتنی طاقت نہ تھی، کہ مجھے بھینچ کر بے بس کر سکتا اور، پھر وہی ہوا، جواب ہو رہا ہے۔ میرے شوہر نے ایک خوبصورت بیوی کو تجارتی زینے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا اور اس نے یوں بے انتہا دولت کمائی ہے۔'' ۱۸۱؎

''اپنا اپنا جہنم'' بھی اسی غم کی داستان ہے، اُنھوں نے زندگی کے تلخ حقائق اور سماج کے استحصالی نظام کی مذمت کرتے ہوئے، عورت کی مظلومیت اور اس پر ڈھائے جانے والے جبر و ستم کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہانی کا مرکزی خیال بدلے کی آگ ہے۔ عورت، جب حد سے زیادہ ظلم سہہ لیتی ہے، تو اس کے اندر بغاوت جنم لینا

شروع کر دیتی ہے، جس کا انجام فریقین کی موت ہی کی صورت میں نکلتا ہے، اِس کے علاوہ جمیلہ ہاشمی نے لڑکیوں کی تعلیم اور سماجی و سیاسی معاملات میں اُن کی شمولیت کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے، راگھو اور اُس کی بہن اور والدین کی گفتگو اُن کے موٴقف کی نمائندگی کرتی ہے۔ راگھو اپنی بہن کی سلیقہ مندی سے چڑ کر غصے میں پانی کا گلاس پٹختے ہوئے بہن پر چلاتا ہے:

''تم سارا وقت گھر داری کرنے کا رُعب گانٹھتی رہتی ہو، میرا تو اِس گھر سے جی بھر گیا ہے، جس میں آدمی اپنی مرضی سے پانی بھی نہ پی سکے، اُس نے خالی گلاس کو زور سے میز پر پٹخا۔ 'جوش اور طاقت دکھانے کی جگہ یہ نہیں ہے راگھو'، شیام داس نے ملائمت سے کہا، 'اور کدم بہرحال تم سے زیادہ کام کرتی ہے'، 'لڑکیاں ہوتی کس لیے ہیں؟ کیا یہ جلوس میں جائے گی، لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی ہے، گھر داری نہ کرے گی تو کیا کرے گی؟'، راگھو اُٹھتے ہوئے بولا 'میں ذرا اوما ناش کے گھر تک جا رہا ہوں موسی'، 'تم یہاں بیٹھو گے اور میری بات سنو گے'، شیام داس نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر اُنھوں نے دانتوں میں خلال کیا اور اُٹھتے ہوئے بولے میرے ساتھ آؤ'، 'اب آئے گی بھیا کی شامت'، کدم نے خوش دلی سے کہا، 'نہیں کدم اب وقت آ گیا ہے کہ راگھو سے بات کی جائے، مجھے تو یہ کچھ سمجھتا نہیں ہے، کاکا سے بھی بس واجبی ہی ڈرتا ہے، آج کل کی نسل کسی سے نہیں ڈرتی'، 'پر موسی میں تو ڈرتی ہوں'، کدم نے چنتن کو برتن پکڑاتے ہوئے کہا، 'تمہاری بات اور ہے'، تارا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، 'میری بات کیوں اور ہے، آپ نہیں سمجھتیں، آج کی لڑکیاں کیسی ہیں، مجھے تو لڑکیوں کے کالج سے نفرت ہونے لگی ہے۔ اندھرے کونوں میں جمع ہوتی ہیں، چوری چوری ہنستی ہیں، خط بازی کرتی ہیں، پرائی موٹروں میں لَد کر جاتی ہیں، لڑکوں سے مذاق کرتی ہیں، اشارے اور جانے کیا کیا، آپ بھی، تو لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتی ہیں، کیا اِس کالج میں کچھ فرق ہے؟'، ہمارا کالج غریبوں کا کالج ہے، کدم وہاں کوئی موٹروں میں نہیں آتا، لڑکیاں غریب گھروں سے آتی ہیں اور اُن کی زندگی کا مقصد پڑھنا ہوتا ہے، اُنھیں فیشن کے لیے کہاں سے پیسے ملیں گے؟، ہر کوئی لگن سے پڑھتا ہے، تمھیں پتہ ہے کہ اَب کہ ہمارے کالج کی لڑکی نے میوزک فیسٹول میں پہلا انعام لیا ہے، اِسی کالج کی لڑکی نے بی۔اے میں ٹاپ کیا ہے۔''[۱۸۲]

شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' میں یہ بھی بتایا ہے کہ ترقی کے حصول کی خاطر کس طرح عزتیں نیلام ہوتی ہیں اور شوپیس کی طرح افسروں کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ سلیمان جس نے اپنے سکائی لارک والے مشن کی آڑ میں سلطانہ کو ٹھکرا کر اسے تباہیوں اور بربادیوں کی نذر کیا تھا۔ فلک پیا کی تنظیم کا سرگرم رُکن ہونے کے باوجود اپنی بیوی کو ترقی کا زینہ بناتا ہے اور اُس کی فضول خرچیوں کا نشانہ بنتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے، ہر لحاظ سے سلیمان کے طور طریقوں کی مخالفت کرنے والی رخشندہ خود بھی اُسی راستے پر چل نکلتی ہے اور اُسے اپنی بیوی کی گمراہی کو مصلحت پسندانہ رویے کے ساتھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور افسروں کو خوش رکھنے کی خاطر اپنی عزتِ نفس کا سودا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جعفری، سلیمان کا

افسر کسی بھی وقت اُس کے گھر آن موجود ہوتا ہے۔ ابتداً سلیمان اپنی بیوی کو زبردستی اس کی خدمت اور کمپنی دینے پر مجبور کرتا ہے، لیکن جب دونوں کی ملاقاتیں اور سیر سپاٹوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، تو خود پریشان ہو جاتا ہے:

"اسے اپنی بیوی پر شبہ نہیں کرنا چاہیے، وہ جعفری کے ساتھ پکچر دیکھنے، تو گئی تھی، کون سا ایسا بڑا جرم ہو گیا، جس کی وہ یہ سزا دے رہا ہے، اسے رخشندہ پر اعتماد کرنا چاہیے، آخر وہ اس کی شریکِ حیات ہے۔ اس سے پیار بھی کرتی ہے۔۔۔ اسے اپنی زندگی کو اپنے باپ کی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہیے، وہ سخت قدامت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔" ۱۸۳

ایم اسلم نے ناول "ناظمہ کی آپ بیتی" میں نام نہاد جدیدیت کی آڑ میں اپنی بیویوں کو ترقی و شہرت اور دولت کا زینہ بنانے والوں کو بے نقاب کیا ہے اور ایک شوہر کی زبان سے معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی کی ہے، جو اپنی نئی نویلی دُلہن کا دائرۂ حیات اِس لیے تنگ کرتا ہے کہ وہ بیہودگی اور بے راہ روی کی اِس دوڑ میں اِس کا ساتھ نہیں دیتی۔ ہر طرح وہ اپنی بیوی کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ وہی کچھ کرے جسے سوسائٹی پسند کرتی ہے:

"جہاں میں جاؤں تم میرے ساتھ جاؤ، اگر ضرورت ہو، تو میرے دوستوں کے ساتھ جاؤ، خرید و فروخت کے لیے، اگر میں بازار نہ جا سکوں، تو یہ کام تم خود کرو، کلب میں چل کر میرے دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیلو، برج کھیلو، میرے، جو شوق ہیں، اُن میں کسی قسم کی رُکاوٹ مت ڈالو۔۔۔ قصہ مختصر ایک فیشن ایبل عورت بن جاؤ، تمھاری بھی عزت ہو اور میری بھی۔" ۱۸۴

جانگلوس میں ناصرہ زمینداروں کی غیر اخلاقی حرکات کا ذکر کرتی ہے اور اپنے شوہر کے ہاتھوں ترقی کا زینہ بننے پر شدید ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے:

"اِسی بات پر میرا اُس کا جھگڑا شروع ہوا، وہ چاہتا ہے کہ میں اُس کے مہمانوں کا دل بہلاؤں، اُن کے ساتھ سوؤں۔ اُس کی آواز بھرا گئی، اُس نے ٹھنڈی سانس بھری: میں اَب تک آٹھ مہمانوں کے ساتھ سو چکی ہوں، کل رات وہ مجھے نویں کے ساتھ سلانا چاہتا تھا، اسے وہ سیاست کہتا ہے، بادشاہ گری بتاتا ہے، جب میں اُس کی اِس سیاست اور بادشاہ گری میں مدد سے انکار کرتی ہوں، تو مجھے بے رحمی سے مارتا ہے۔ ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے، لہولہان کر دیتا ہے، تجھے کس طرح بتاؤں کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔" ۱۸۵

شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" میں یہی جعفری رخشندہ کا مزید استحصال، اسے اپنے ڈائریکٹر کے سپرد کر کے کرتا ہے اور ترقی پاتا ہے، اس کی اطلاع سلیمان کو نشے میں دھت عنایت دیتا ہے۔ رخشندہ، جعفری کے قتل کی خواہش پر قابو پا کر سلیمان رخشندہ کو طلاق دے دیتا ہے، اِس شرط پر: "میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہر وغیرہ طلب نہ کرے۔" ۱۸۶ اے۔ آر خاتون نے مسعود اور شاد کے مابین گفتگو سے نام نہاد اونچی سوسائیٹی کے مصائب بیان کیے ہیں، جو لوگ اپنی بیوی کو اپنی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، اُن پر طنز کیا گیا ہے، مسعود اسے جدیدیت کا نام دیتے ہوئے شاد کو قائل کرتا ہے:

"ارے میاں تم کس گنبد میں بند ہو، زمانے کی رفتار نہیں دیکھ رہے، آج کل تو یہ دستور

ہے، شادی کے بعد بھی بیویوں کو منتقل کرتے رہتے ہیں، تمھاری بیوی مجھے پسند آ گئی، میں
نے لے لی، میری بیوی تم کو پسند آ گئی، تم نے لے لی۔''۱۸۷؎

مزدور عورت کے مسائل، جائے ملازمت پر روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کی مزمت شوکت صدیقی نے پتھیروں کی زندگی کی جھلکیاں پیش کر کے کی ہیں۔ پتھیروں کی مزدور عورتیں کچی اینٹوں کی قطاروں کی اوٹ میں بچہ جنتی ہیں اور پھر کام اُسی طرح کام پر لگ جاتیں ہیں:

''پتھیرن نے بچہ جنا۔۔۔ اِسی اثنا میں ایک بوڑھی عورت، پتھیروں کی جھونپڑیوں کی جانب سے نمودار ہوئی، نزدیک پہنچی، اُس کے ہاتھ میں چُھری تھی، اُسے سنبھالے ہوئے وہ چادروں کے پیچھے گئی، چھری سے نال کاٹی، بچے کو علیحدہ کیا، ذرا ہی دیر بعد زچہ اُٹھ کھڑی ہوگئی۔۔۔ یہ زچہ مریم تھی اور شاداں کے سامنے بیٹھی ہری مرچ اور نمک کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی، وہ دوسرے پتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدورں کے ساتھ ہی صبح کام پر آ گئی تھی اور مٹی کے گارے سے اینٹیں تیار کر رہی تھی، چلچلاتی دھوپ سے اُس کا جسم پگھل رہا تھا، وہ پسینے سے شرابور تھی۔۔۔ ویسے ہی خالی پیٹ رہنا پڑتا ہے آرام کی سوچنے لگیں، تو بھوک اور ننگ سے مر جائیں۔''۱۸۸؎

خالدہ حسین نے ایک سماجی مسئلہ بھی پیش کیا ہے کہ جب اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو محض گھر داری اور چار دیواری تک محدود کر دیا جاتا ہے، ان کی محنت، علمیت اور ذہانت سب دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، اُنھوں نے لبرل ازم کا نعرہ بلند کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی کی ہے کہ دوسروں کو لڑکیوں عورتوں کی ستائیشی نظروں میں پرکھنے والوں کے اپنی عورتوں کے بارے میں، جو خیالات ہیں۔ دولت وشہرت کی چکا چوند میں عورت کی ذات کی نفی کرنے والوں کی نشاندہی کی ہے اور ایسی تنہائی کی شکار عورت کو نہایت دُکھ اور کرب سے بیان کیا ہے:

''وہ، تو خواب تھے۔ حسیب کو ان سے شدید نفرت ہے، جو کوئی بھی مجھ پر اپنا کوئی حق سمجھے حسیب اُسے برداشت نہیں کرتا۔۔۔ افتتاحی فیتے کاٹ کر اور اپنی تعریفیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کب تک ہوتی رہی گی یہ اور بات کہ رات گئے، تاریک خاموشی میں جب کتے روتے ہیں، تو لگتا ہے یہ میرے دل کی آواز ہے اور اکثر صبح کے وقت میرا تکیہ تر ہوتا ہے، مگر مجھے اطمینان ہے کہ لاہور، کراچی اور دارالحکومت میں میرے عالی شان مکان بن چکے ہیں۔''۱۸۹؎

''پُروا'' میں بانو قدسیہ نے دولت اور روشن مستقبل کی خاطر عورت کو زرینہ سمجھنے والوں پر تنقید کی ہے، جس کا مرکزی کردار اپنی ناتمام خواہشات کی تکمیل کی خاطر دولت مند ماموں زاد سے شادی رچالیتا ہے:

''چچا نے اِس کی زندگی سنواری تھی اور خالدہ کو مدِ نظر رکھ کر سنواری تھی۔ اب وہ خالدہ کا سہارا لے کر اپنا مستقبل سنوارنے چلا تھا۔ اختر کو پیسے کی قدر و قیمت کا علم تھا وہ خوب جانتا تھا کہ روپے کے بغیر زندگی کتنی مشکل ہو سکتی ہے۔ اِسی لیے وہ کراچی سے یہاں آ پہنچا،

ورنہ۔۔ سٹیشن پر کھڑی صوفیہ! لوگوں سے بے نیاز آنسو بہاتی صوفیہ۔'' ۱۹۰؎

صدیق سالک کے ناول ''پریشر ککر'' میں چوہدری کرم دین کے بیوہ ریشماں سُسرالیوں کے تشدد کے بعد بچوں کو شہر لے آئی ایک گھر میں ملازمت کر کے سرونٹ کوارٹر میں رہائش پزیر ہوئی، اس کا بیٹا فطرت سکول جانے لگا۔ بیٹی ذکیہ ایک روز دھاگے لینے گئی، لیکن راستے میں غنڈے اُسے اغوا کر کے لے گئے:

> ''پھر اُس کو دس سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا، جب جاُس کے مرحوم باپ نے ایک اجنبی لڑکی کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی، آج، دس سال بعد اس کی جوان بیٹی کو سرِ بازار اُٹھا لیا گیا اور کسی شخص نے اُسے بچانے کی کوشش نہ کی، کیا دس سالوں میں انسانی قدریں بدل گئی ہیں۔'' ۱۹۱؎

فرخندہ لودھی کے ناول ''حسرتِ عرضِ تمنا'' کی سپنا اپنے شوہر کے ساتھ اسٹیشن جاتی ہے، وہیں اس کا شوہر اس کے لیے برفی لینے جاتا ہے، لیکن واپسی پر حادثے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے۔ سپنا اس کا انتظار بینچ پر بیٹھی کر رہی ہوتی ہے کہ ایک کانسٹیبل اُسے بے ہوش کرنے کے بعد اغوا کر کے، جس جگہ لاتا ہے، وہاں ایک خرافہ پہلے سے موجود ہوتی ہے، اُسے سپنا کا سبھدراں کی حویلی میں سودا کرنے کے لیے بھیجتا ہے: ''تم جانتی ہو، یہ کیسے لوگوں کا ڈیرا ہے، آج کی رات یہاں رہنے کی باری میری تھی، تم جانو تھانیدار، حوالدار، سپاہی منشی اور جانے کون کون اِس سے اپنا حصہ وصول کریں گے، یہ لڑکی یہاں رُک گئی، تو آفت آ جائے گی، کس کس کو انکار کروں گا۔'' ۱۹۲؎

اُردو ناول پر تانیثیت کے اثرات کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں، کہ ابتدا خواتین کی تعلیم و تربیت اور اِس سے شروع ہونے والا اصلاحی ادب تانیثی طرزِ فکر کا ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے، عورت کے مقام و مرتبے مرد و عورت کی عدم مفاہمت کی وجوہات، عورت کو کمتر اور حقیر شے تصور کیے جانے کے سماجی عوامل و محرکات کا عکاس بنا خانگی و ازدواجی زندگی کی مشکلات، مشترکہ خاندانی نظام کے مضر اثرات کی وجوہات، مرد و عورت کی ذہنی و نفسیاتی اُلجھنوں اور مسائل، عدم اعتمادی، نا آسودگی، متلون مزاجی، ذہنی آوارگی و جسمانی تعیش پسندی سے پیدا ہونے والا عدم استحکام عائلی زندگی کے لیے مہلک ثابت ہو رہا ہے۔ مرد و عورت پر اس کے زیادہ مُضر اثرات تو مرتب ہوتے ہی ہیں، لیکن سب سے زیادہ تباہی کے دھانے پر وہ معصوم اور بے گناہ نسل پہنچ رہی ہے، جن کے سامنے ابھی زندگی کا طویل سفر موجود ہے، وہ اپنے معصوم کندھوں پر اپنے بڑوں ہی کی تلخیوں کا بوجھ اُٹھائے پھرتے ہیں، اُن کے سامنے مستقبل کی زہرناکی، مہیب اژدھے کی طرح پھن پھیلائے موجود رہتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول (ہیئت ،اسالیب اور رُجحانات)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۷ء، ص ۷۵

۲۔ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس، لاہور: یو پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۔۱۵

۳۔علامہ راشد الخیری، بنت الوقت، دہلی: عصمت بک ایجنسی، ۱۹۴۲ء، ص ۵۱

۴۔نثار عزیز بٹ، نے چراغ نے گلے مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۵۶۹۔۵۷۰

۵۔علامہ راشد الخیری، بنت الوقت، ص ۵۱

۶۔منشی خلیل الرحمٰن، عذرا۔عذرا کی واپسی مترجمہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۱

۷۔احسن فاروقی، ڈاکٹر، سنگم، م ن، س ن، ص ۲۰۵

۸۔جمیلہ ہاشمی، دشتِ سُوس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۳۵

۹۔نثار عزیز بٹ، نے چراغ نے گلے مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۵۳۰۔۵۳۱

۱۰۔خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۲

۱۱۔رضیہ بٹ، ثمینہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۶۔۳۷

۱۲۔بلقیس ریاض، بادبان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۰۔۱۸۲

۱۳۔سلمیٰ کنول، دل کی چوکھٹ پر، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۴۵۴

۱۴۔فضل کریم فضلی، خونِ جگر ہونے تک، کراچی: انجمنِ ترقیِ ادب، س ن، ص ۲۵۲

۱۵۔قرۃ العین حیدر، میرے بھی صنم خانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۵۶

۱۶۔کرشن چندر، غدار، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۴ء، ص ۸۷

۱۷۔قدرت اللہ شہاب، یا خدا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۹

۱۸۔ایضاً، ص ۱۰

۱۹۔ایضاً، ص ۵۸

۲۰۔نسیم حجازی، میرے پاکستانی بھائیو مشمولہ خاک اور خون، م ن، س ن، ص ۲۸۷

۲۱۔کشور ناہید، زیتون، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص ۲۷

۲۲۔شوکت صدیقی، جانگلوس جلد سوئم، کراچی: رَ کتاب، ۲۰۰۹ء، ص ۵۲۷

۲۳۔منشی پریم چند، میدانِ عمل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۴۵

۲۴۔منشی پریم چند، گئو دان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۳۔۱۶۴

۲۵۔راجندر سنگھ بیدی، ایک چادر میلی سی مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۲۰

۲۶۔حجاب امتیاز علی، پاگل خانہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۵۳

۲۷۔بلونت سنگھ، رات، چور اور چاند، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۷۰۔۷۱

۲۸۔عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، کراچی: بک ٹائم، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۷

۲۹۔عزیز احمد،ایسی بلندی ایسی پستی،لاہور:تخلیقات،۲۰۰۰،ص ۱۷۶۔۱۷۷
۳۰۔زبیدہ خاتون،ہما،کراچی:ویلکم بک پورٹ،۲۰۰۵،ص ۱۰۵
۳۱۔عبداللہ حُسین،نشیب،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴،ص ۲۱۲
۳۲۔شوکت صدیقی،جانگلوس جلد اول،کراچی:رَ کتاب پبلی کیشنز،۲۰۰۹،ص ۳۸۔۳۹
۳۳۔ممتاز مفتی،علی پور کا ایلی،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸،ص ۵۹۷
۳۴۔رضیہ فصیح احمد،یہ خواب سارے،کراچی:دانیال،۱۹۹۲،ص ۳۲
۳۵۔بانو قدسیہ،حاصل گھاٹ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵،ص ۵۰،۵۲
۳۶۔کشور ناہید،زیتون،ص ۲۵۲
۳۷۔بشریٰ رحمٰن،لازوال،لاہور:دعا پبلی کیشنز،۲۰۰۱،ص ۴۹
۳۸۔اصغر ندیم سید،آدھے چاند کی رات،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱،ص ۱۸۷
۳۹۔صادق کمال،ڈاکٹر،حوا کی بیٹی کے نام انتساب مشمولہ خانم،فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۰۶
۴۰۔سلمیٰ کنول،دل کی چوکھٹ پر،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸،ص ۴۲۲
۴۱۔عصمت چغتائی۔ٹیڑھی لکیر،ص ۱۶۹
۴۲۔انتظار حُسین،چاند گہن،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲،ص ۱۶۴
۴۳۔بانو قدسیہ،حاصل گھاٹ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷،ص ۲۲۸
۴۴۔بانو قدسیہ،راجہ گدھ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶،ص ۳۴۴
۴۵۔بشریٰ رحمٰن،پارسا،لاہور:دعا پبلی کیشنز،۲۰۰۲،ص ۷۷
۴۶۔بشریٰ رحمٰن،شرمیلی،لاہور:خزینۂ علم و ادب،۲۰۰۲،ص ۳۰
۴۷۔محمد سعید شیخ،ایک اور دریا،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲،ص ۲۲۰
۴۸۔ایضاً،ص ۳۶۷
۴۹۔کشور ناہید،زیتون،ص ۱۳۲
۵۰۔اے۔آر خاتون،تصویر،کراچی:ویلکم بک پورٹ،۲۰۰۴،ص ۱۷۲
۵۱۔قرۃ العین حیدر،آگ کا دریا،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷،ص ۱۸۲
۵۲۔قرۃ العین حیدر،چار ناولٹ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص ۲۷۰
۵۳۔عزیز احمد،آگ،لاہور:تخلیقات،۲۰۰۰،ص ۷۷
۵۴۔اے۔آر خاتون،تصویر،ص ۵۱
۵۵۔نثار عزیز بٹ،کاروانِ وجود مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹،ص ۸۰۴
۵۶۔ایضاً،ص ۸۰۵
۵۷۔ خالدہ حسین،کاغذی گھاٹ،ص ۱۲۸

۵۸۔ بانو قدسیہ، شہرِ بے مثال، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۳
۵۹۔ کشور ناہید، زیتون، ص ۲۵۲
۶۰۔ بشریٰ رحمٰن، خوبصورت، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۷۸
۶۱۔ فرخندہ لودھی، حسرتِ عرضِ تمنا، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۹
۶۲۔ رفعت مرتضیٰ، آدم کی پسلی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۹
۶۳۔ رضیہ بٹ، اِک لڑکی مشمولہ، مجموعہ رضیہ بٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۷۵۹
۶۴۔ فاطمہ مبین، ایرانی مشمولہ مجموعہ فاطمہ مبین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳۱
۶۵۔ رفعت مرتضیٰ، آدم کی پسلی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۵
۶۶۔ بلقیس ریاض، بادبان، ص ۲۰۴۔۲۰۵
۶۷۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۸
۶۸۔ سلمیٰ کنول، اِس دیوانگی میں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۹۵
۶۹۔ مرزا ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۶
۷۰۔ عزیز احمد، آگ، ص ۵۱
۷۱۔ شوکت صدیقی، چار دیواری، کراچی: رَکتاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۵۔۲۶۶
۷۲۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۲۷۶
۷۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ضبط کی دیوار، لاہور: سکالرز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۹۳
۷۴۔ صدیق سالک، پریشر ککر، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۷ء، ص ۲۲۴
۷۵۔ فرخندہ لودھی، حسرتِ عرضِ تمنا، ص ۷۷
۷۶۔ زبیدہ خاتون، نادرہ، کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۷۸
۷۷۔ منشی پریم چند، نرملا، لاہور: گیلانی الیکٹرک پریس، س ن، ص ۴
۷۸۔ بلونت سنگھ، رات، چور اور چاند، ص ۲۶۲
۷۹۔ قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص ۱۸۲
۸۰۔ شوکت صدیقی، جانگلوس جلد سوئم، کراچی: رَکتاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۴
۸۱۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۳۱۶
۸۲۔ نثار عزیز بٹ، کاروانِ وجود مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۶۱۷
۸۳۔ مرزا عظیم بیگ، چغتائی، چینی کی انگوٹھی مشمولہ مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۴۷
۸۴۔ بلقیس ریاض، تجدیدِ وفا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۵
۸۵۔ کشور ناہید زیتون، ص ۶۔۸
۸۶۔ صادق کمال، ڈاکٹر، خانم، ص ۵۱

۸۷۔ سلمیٰ کنول، اکیلی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء ص ۲۳۸

۸۸۔ منشی پریم چند، پردۂ مجاز، دہلی: لاجپت رائے اینڈ سنز، ۱۹۴۹ء ص ۱۵۰۔ ۱۵۲

۸۹۔ عصمت چغتائی، بہروپ نگر، راول پنڈی، ندیم پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء ص ۱۶۲

۹۰۔ بانو قدسیہ، شہرِ بے مثال، ص ۲۰۵

۹۱۔ نثار عزیز بٹ، نگری نگری پھرا مسافر مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء ص ۱۰۳

۹۲۔ محمد سعید شیخ، ایک اور دریا، ص ۲۷۴

۹۳۔ عبداللہ حسین، قید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص ۱۰۱

۹۴۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، ص ۹۲۔ ۹۳

۹۵۔ بشریٰ رحمٰن، لازوال، ص ۹

۹۶۔ اے۔ آر خاتون، کہانیاں، کراچی: ویلکم بک پورٹ ۲۰۰۱ء ص ۲۲۔ ۲۳

۹۷۔ فرخندہ لودھی، حسرتِ عرضِ تمنا، ص ۳۱۵

۹۸۔ زاہدہ حنا، نہ جنوں رہا نہ پری رہی، ناولٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء ص ۶۲

۹۹۔ اصغر ندیم سید، آدھے چاند کی رات، ص ۵۲

۱۰۰۔ دُردانہ نوشین خان، اِندر جال، فیصل آباد: مثال پبلی شرز، ۲۰۰۷ء ص ۶۶۔ ۶۷

۱۰۱۔ آمنہ مفتی، جرأتِ رندانہ، لاہور: قوسین، ۲۰۰۷ء ص ۱۰۱

۱۰۲۔ سلیمان بٹ، گھائل روحیں، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۵ء ص ۲۳۹

۱۰۳۔ صدیق سالک، پریشر ککر، ص ۳۰

۱۰۴۔ رفعت مرتضیٰ، آدم کی پسلی، ص ۲۰۰

۱۰۵۔ رضیہ فصیح احمد، انتظارِ موسمِ گل، لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۰ء ص ۱۲۳

۱۰۶۔ فرخندہ لودھی، حسرتِ عرضِ تمنا، ص ۱۶

۱۰۷۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی، خانم، لکھنؤ: نظامی پرس، ۱۹۳۵ء ص ۱۰۶

۱۰۸۔ سلمیٰ کنول، دُکھ سُکھ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء ص ۲۹۱

۱۰۹۔ آمنہ مفتی، جرأتِ رندانہ، ص ۱۵۴

۱۱۰۔ عصمت چغتائی، معصومہ، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۲۶ء ص ۵۰۔ ۵۱

۱۱۱۔ راجندر سنگھ بیدی، ایک چادر میلی سی مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء ص ۸۳۵۔ ۸۳۶

۱۱۲۔ عزیز احمد، گُناہِ رنگین مشمولہ مرمر اور خون، لاہور: مکتبۂ جدید، ۱۹۵۱ء ص ۸۵

۱۱۳۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، کراچی: رَ کتاب پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء ص ۲۳۳

۱۱۴۔ عبداللہ حسین، رات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء ص ۹۰

۱۱۵۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص ۲۵۵

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۱
۱۱۷۔ بشریٰ رحمٰن، لازول، ص ۱۹۰
۱۱۸۔ رضیہ بٹ، معاملے دل کے مشمولہ، مجموعہ رضیہ بٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷، ص ۷۹۶، ۷۹۸
۱۱۹۔ اے۔ آر خاتون، چشمہ، کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۰۴، ص ۱۸
۱۲۰۔ صادق کمال، ڈاکٹر، خانم، ص ۵۸
۱۲۱۔ جمیلہ ہاشمی، آتشِ رفتہ (ایک نفسیاتی ناولٹ)، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، باراول، ۱۹۶۴، ص ۵۱۔۵۲
۱۲۲۔ رضیہ فصیح احمد، انتظارِ موسمِ گل، لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۰، ص ۱۳۸
۱۲۳۔ رضیہ بٹ، معاملے دل کے، ص ۹۵۱
۱۲۴۔ اے۔ آر خاتون، کہانیاں، ص ۷۶
۱۲۵۔ محمد سعید شیخ، اقبالِ جرم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۱۶
۱۲۶۔ بلونت سنگھ، رات، چور اور چاند، ص ۲۲۸۔۲۲۹
۱۲۷۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، ص ۳۵۰
۱۲۸۔ عزیز احمد، اسی بلندی ایسی پستی، ص ۱۸۸
۱۲۹۔ رفعت سراج، گلابی کاغذ اور زرد پھول، لاہور: خزینۂ علم وادب، ۲۰۰۸، ص ۱۹
۱۳۰۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۱۹
۱۳۱۔ رضیہ بٹ، اماں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۵۷۵
۱۳۲۔ عصمت چغتائی، بہروپ نگر، راول پنڈی: ندیم پبلی کیشنز، ۱۹۷۴، ص ۱۱۵
۱۳۳۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۷۲
۱۳۴۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، شامِ اودھ، ص ۲۲۶
۱۳۵۔ رضیہ فصیح احمد، یہ خواب سارے، کراچی: دانیال، ۱۹۹۴، ص ۳۳
۱۳۶۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی، ویمپائر مشمولہ مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷، ص ۲۹۴
۱۳۷۔ شوکت صدیقی، جانگلوس جلد سوم، ص ۴۸۲۔۴۸۳
۱۳۸۔ ایضاً، ص ۵۷۶
۱۳۹۔ عبداللہ حسین، نادار لوگ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۱۳
۱۴۰۔ ایم اسلم، نیلماں، لاہور: دار البلاغ، ۱۹۶۲، ص ۳۰
۱۴۱۔ ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، ص ۲۱
۱۴۲۔ محمد سعید شیخ، اقبالِ جرم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۸۰۔۸۱
۱۴۳۔ اصغر ندیم سید، آدھے چاند کی رات، ص ۲۱
۱۴۴۔ سلمیٰ مسعود، خانماں برباد، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳، ص ۵۸

۱۴۵۔ سلیمان بٹ، گھائل روحیں، ص۱۹۱۔۱۹۲
۱۴۶۔ صادق کمال، ڈاکٹر، خانم، ص۴۱
۱۴۷۔ بلونت سنگھ، رات، چور اور چاند، ص۷۰۔۷۱
۱۴۸۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، ص۴۲۵، ۴۲۷
۱۴۹۔ عمیرہ احمد، لاحاصل، لاہور: علم و عرفان پبلی شرز، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء، ص۲۵۱
۱۵۰۔ رضیہ فصیح احمد، یہ خواب سارے، کراچی: دانیال، ۱۹۹۲ء، ص۲۰۸۔۲۰۹
۱۵۱۔ عبداللہ حسین، قید، ص۹۷
۱۵۲۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص۲۷۹
۱۵۳۔ عبداللہ حسین، باگھ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۳۴۵۔۳۴۶
۱۵۴۔ محمد سعید شیخ، ایک اور دریا، ص۱۹۶۔۱۹۷
۱۵۵۔ الطاف فاطمہ، کشتانِ محفل، لاہور: مطبع دار البلاغ، س ن، ص۲۲۸
۱۵۶۔ زبیدہ خاتون، ہما، ص۲۷۵
۱۵۷۔ کشور ناہید، زیتون، ص۴۳
۱۵۸۔ صادق کمال، ڈاکٹر، خانم، ص۱۱
۱۵۹۔ عصمت چغتائی، بہروپ نگر، راول پنڈی: ندیم پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء، ص۶۵
۱۶۰۔ ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، ص۵۶۱
۱۶۱۔ رضیہ بٹ، معاملے دل کے مشمولہ، مجموعہ رضیہ بٹ، ص۸۸۵
۱۶۲۔ بلقیس ریاض، تجدیدِ وفا، ص۱۵۵
۱۶۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص۱۸۵
۱۶۴۔ ایضاً، ص۳۴۶
۱۶۵۔ محمد سعید شیخ، ایک اور دریا، ص۳۶۷
۱۶۶۔ عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، ص۶
۱۶۷۔ بشریٰ رحمٰن، خوبصورت، ص۲۸۲۔۲۸۳
۱۶۸۔ رفعت سراج، گلابی کاغذ اور زرد پھول، لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۸ء، ص۸۰۔۸۱
۱۶۹۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، ص۲۴۱
۱۷۰۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی، ویمپائر مشمولہ مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی، ص۳۴۳
۱۷۱۔ رضیہ فصیح احمد، یہ خواب سارے، ص۲۱۰
۱۷۲۔ رضیہ فصیح احمد، انتظارِ موسمِ گل، ص۱۹۸
۱۷۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص۲۵۶

۱۷۴۔ بانو قدسیہ، شہرِ بے مثال، ص ۱۲۱
۱۷۵۔ ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، ص ۳۳۵
۱۷۶۔ ایضاً، ص ۲۱۸
۱۷۷۔ سلمیٰ کنول، لالہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۲۸۶
۱۷۸۔ سلمیٰ مسعود، خانماں برباد، ص ۱۰۲۔۱۰۴
۱۷۹۔ اصغر ندیم سید، آدھے چاند کی رات، ص ۲۵
۱۸۰۔ دُردانہ نوشین خان، اندر جال، ص ۵۰۰
۱۸۱۔ رضیہ بٹ، رفاقتیں کیسی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۱۹
۱۸۲۔ جمیلہ ہاشمی، اپنا اپنا جہنم، ص ۱۱۷۔۱۱۸
۱۸۳۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، ص ۴۳۴
۱۸۴۔ ایم اسلم، ناظمہ کی آپ بیتی، لاہور: پنجاب بک ڈپو، ۱۹۴۹، ص ۱۲۴
۱۸۵۔ شوکت صدیقی، جانگلوس جلد اول، ص ۱۹۹
۱۸۶۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، ص ۴۶۱
۱۸۷۔ اے۔ آر خاتون، چشمہ، ص ۲۳۶
۱۸۸۔ شوکت صدیقی، جانگلوس جلد سوم، ص ۴۴۸۔۴۴۹
۱۸۹۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، ص ۱۹۰۔۱۹۱
۱۹۰۔ بانو قدسیہ، پُروا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۲۶
۱۹۱۔ صدیق سالک، پریشر ککر، ص ۵۲
۱۹۲۔ فرخندہ لودھی، حسرتِ عرضِ تمنا، ص ۱۲۷۔

ب ۔تانیثیت اور پاکستانی اُردو افسانہ

افسانے سے مُراد وہ مختصر تحریر ہے، جو کم سے کم وقت میں پڑھی جائے، جب کہ ایڈگر ایلن پونے آدھ گھنٹے سے لے کر ایک گھنٹے تک پڑھی جانے والی تحریر کو افسانے کا نام دیا ہے۔ افسانہ زمان و مکاں کی قیود کے ساتھ کسی ایک کردار یا افرادِ معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید اُردو افسانے پر چیخوف، موپاساں کے علاوہ کارل مارکس اور میکسم گورکی کے اثرات نمایاں ہیں، ترقی پسندوں سے قبل رومانوی تحریک، جو کہ سرسید کی تحریکِ علی گڑھ کا ردِ عمل تھی، اِس کے زیرِ اثر رومانوی طرزِ فکر کی حامل تحریریں وجود میں آئیں۔ رومانویوں کے لیے حقائق کی تلخی، ناآسودگی وکرب کے احساس سے بچنے کے لیے تصورات وتخیلات کی دُنیا اور فطرت پرستی جائے امان ثابت ہوئی، جب کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر حقیقت نگاری کے فروغ کے علاوہ تلخ سماجی حقائق، جنسی ونفسیاتی اُلجھنیں اور مسائل منظرِ عام پر لایا گیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اُردو افسانے کو موضوع اور تکنیک، رُجحانات وتجربات کے اعتبار سے چار ادوار میں منقسم کیا ہے، اُن کے خیال میں پہلا دَور اصلاحی و رومانی رُجحان کا حامل ہے، دوسرا دَور ترقی پسند تحریک، تیسرا دَور ۱۹۴۷ سے ۱۹۶۰ تک اور چوتھا دَور ۱۹۶۰ سے ۱۹۸۰ تک کا ہے، اِس کے تحت لکھے جانے والے افسانوں میں عصری شعور نمایاں ہے۔ [۱]

۱۹۳۰ جسے اُردو ترجمہ نگاری کی دہائی بھی کہا جاتا ہے، سجاد حیدر یلدرم اور امتیاز علی تاج نے لفظی وطبع زاد تراجم کیے۔ پھر مخزن کی اشاعت نے ادب کی یکسانیت میں رومانویت کا رنگ بھر کر نئی تبدیلی کا آغاز کیا۔ عورت جو مثالیت اور یبوست کا شکار تھی۔ اَب تخیلاتی ہونے کے علاوہ متحرک اور جذبات واحساسات سے مزین دکھائی دینے لگی۔ ''خارستان وگلستان'' کی نسرین نوش ہو یا ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کی چڑیا یا ''نکاحِ ثانی'' کی بیوی یلدرم کے تانیثی شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ پریم چند نے دیہی زندگی کی عکاسی کے علاوہ اپنی کہانیوں میں انسان کی لاشعوری اور نفسیاتی کیفیات پیش کیں، اِن کے افسانے مرد کی حاکمیت، دھونس، میاں بیوی کے تعلقات میں ناآسودگی اور مرد کی خود غرضانہ طبیعت کی عکاسی کرتے ہیں مثلاً ''خاکِ پروانہ''، ''ملاپ''، ''علیحدگی''، ''مزارِ آتشیں''، ''وفا کی دیوی''، ''مس پدما''، ''نئی بیوی''، ''ستی''، ''کفن'' اور ''بوڑھی کاکی'' اِس حوالے سے اہم ہیں۔ حجاب امتیاز علی تاج نے ''پاداش'' اور ''بیمارِ غم'' میں گھریلو عورت کے استحصال اور ہر میدان میں پسِ پُشت ڈالے جانے کے خلاف آواز بلند کی۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سیاسی وسماجی شعور، جبریت، نفسیاتی پیچیدگی، جنسی اُلجھنوں، معاشرتی ناہمواریوں کو بے نقاب کیا۔ اِس تحریک کے زیرِ اثر ادب میں ترقی پسندی، فحش نگار اور لا دینیت کے رُجحانات بھی نمایاں ہوئے۔ ''انگارے'' کی اشاعت ایک رُجحان ساز بغاوت کی صورت میں سامنے آئی۔ انگارے میں لکھے جانے والے ادب میں دیگر رُجحانات کے علاوہ حقیقت پسندی اور تانیثیت کا اثر نمایاں ہے۔ اِن میں سجاد ظہیر کے افسانے 'نیند نہیں آتی'

''جنت کی بشارت''، ''گرمیوں کی ایک رات''، ''ڈلاری'' اور ''پھر یہ ہنگامہ'' شامل ہیں، اِن افسانوں میں سجاد ظہیر نے نام نہاد اعلیٰ طبقے کی روزمرہ زندگی کے معاملات کے علاوہ متوسط اور نچلے طبقے کی عورتوں کی زندگی کے مسائل ومصائب کو بیان کیا ہے، اِن میں حقیقت پسندی اور تانیثیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

ناقدین نے ڈاکٹر رشید جہاں کو پہلی نسائی آواز قرار دیا ہے، جنھوں نے زندگی کے مسائل اور حقیقتوں کو بڑی بے رحمی سے بے نقاب کیا ہے، اُن کا افسانہ ''نئی مصیبتیں'' میں سُسرال کے مظالم کی داستان ہے، ''چھدا کی ماں'' میں عورت کے استحصال اور بے وقعتی کو موضوع بنایا ہے، ''سودا''، ''اندھے کی لاٹھی'' اور ''وہ جل گئی'' وغیرہ سماجی مسائل پر لکھے گئے افسانے ہیں۔علی عباس حسینی کے ہاں بھی۔ پریم چند اور راشد الخیری کی طرح عورت قربانی، خدمت اور اخلاص کا پیکر دکھائی دیتی ہے۔''باسی پھول''، ''میلہ گھومنی''، ''رفیقِ تنہائی''، ''خالی گود'' اُن کے اہم افسانے ہیں، جن میں عورت کے استحصال کی مختلف شکلیں واضح کی گئی ہیں۔حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''بھرے بازار میں'' سماجی چیرہ دستیوں کی داستان ہے۔''آخری کوشش'' میں زمینداروں کے مظالم بیان کیے گئے ہیں۔''نیا بھیس'' اور ''اخلاص'' میں نئی نسل کے جنسی جذبات اور بے راہ روی کی عکاسی کی گئی ہے۔دیوندر ستیارتھی کا افسانہ ''ٹھنڈی چائے کا دھواں'' میں جنسی ہوس پرستی کی شکار ہونے والی لڑکیوں کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔خواجہ احمد عباس نے ''پاؤں میں پھول'' میں فسطائی رویوں کے خلاف ردِعمل ظاہر کیا ہے۔''زعفران کے پھول''، ''نیلی ساڑھی''، ''ٹیرالین کی پتلون''، ''کایا کلپ''، ''اجنتا'' اور ''تین عورتیں'' میں مرد وعورت کے احساسات اور نفسیات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کی سرزمین کے تلخ حقائق بیان کیے ہیں، اِن کے افسانوں میں محض میلوں ٹھیلوں کا ذکر ہی نہیں، بلکہ نوجوانوں کے جنسی مسائل، تشدد، استحصال کے خلاف لاٹھیاں چلانے والے سادہ لوح اُجڈ جنگلی اور محنتی سکھ قوم کا ذکر کیا ہے۔''پہلا پتھر'' میں ایسے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے، جس میں جوشِ انتقام میں سچ، جھوٹ اور ظلم وانصاف کے سارے امتیاز مٹا دیے ہیں۔''کالی تیتری''، ''گرنتھی''، ''دیمک''، ''بابو مانک لعل''، ''سمجھوتہ''، ''اعتراض'' اور ''گھر کا راستہ'' میں شہری معاشرت اور ازدواجی زندگی کی ریاکاری کو موضوع بنایا ہے۔اختر حسین رائے پوری عورتوں کی حالتِ زار پر کڑھتے دکھائی دیتے ہیں، اُن کے خیال میں اِس دُنیا میں صرف مردوں کا خدا ہے عورتوں کا نہیں۔''کاغذ کی ناؤ''، ''گونگی''، ''اندھا بھکاری''، ''میرا گھر''، ''مجھے جانے دو'' میں عورت جسم کی پامالی کرتی دکھائی دیتی ہے۔معاشرے کی گھائل یہ روح، محبت کے فریب کا بیج بدن میں پالتی ہے۔عورت کہیں سرپرست کی متلاشی ہے، کہیں خود وارث بنتی ہے، نام نہاد دین دار اُس کے بدن کی جھولی میں اپنی نفسانی آلائیش ڈال دیتا ہے اور کہیں ''مجھے جانے دو'' کی طوائف وجود میں آتی ہے، جو آتشک، سوزاک اور تپ دق میں مبتلا ہو کر آتشِ انتقام دہکانے سے قاصر رہتی ہے۔ اختر انصاری کا افسانہ 'وہ عورت' میں متوسط طبقے کی بے حسی اور ناانصافی و ناہمواری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا افسانہ ''لیلیٰ کے خطوط'' میں عورت کے استحصال کے مختلف انداز بتائے گئے ہیں اور ''تین پیسے کی چھوکری'' میں ایک ایسی عورت، جو دِن بھر کھیتوں میں مویشی چراتی ہے، گھرداری بھی سنبھالتی ہے، انتھک محنت کے باوجود دھتکاری جاتی ہے۔غریب گھر کی بیوہ یا سہاگن، جو برتن مانجھتی ہے، روٹی پکاتی ہے، اِیسی مفلس بوڑھی عورت، جو اُجرت پر کپڑے سی کر اور آٹا پیس کر اپنی اولاد پالتی ہے۔ہاجرہ مسرور کا شمار ایسی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جو سماجی ریاکاری، مرد وعورت کی جنسی ونفسی اُلجھنوں کو بے نقاب کرنے پر دسترس رکھتے ہیں۔ہاجرہ مسرور کے افسانوی مجموعے ''چوری چھپے'' میں عورت کے

نئے روپ اُبھرتے ہیں، اِن کے ہاں لڑکپن سے بڑھاپے تک عورت کی نفسیات اور اُس کی مختلف اُلجھنیں اور مسائل کی گرہ کشائی ملتی ہے، مثلاً ''ایک بچی'' میں عورت کی مامتا کے جذبے اور شادی کی خواہش کو بیک وقت اُبھارا گیا ہے۔ ''سرگوشیاں'' میں تقدیر کے ہاتھوں مجبور گیتا کی زندگی کے مختلف پہلو اُجاگر کیے گئے ہیں۔ افسانہ ''چوری چھپے'' میں معصوم اور بھولی بھالی بچی اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے دینو کی طرف مائل ہو جاتی ہے، اسی طرح ''بھالو'' جسے گھر شوہر اور ایک سچے پیار کرنے والے ساتھی کی ضرورت ہے، پہلے قدیر کے ہاتھوں لٹتی ہے پھر حفیظ دُکاندار سے التجا کرتی نظر آتی ہے کہ صرف ایک بار اُسے اپنی بیوی بنالے، تو وہ تمام عمر اُس کی خدمت کرتی رہے گی۔ ہاجرہ مسرور نے افسانہ ''کتے'' لکھ کر جنسی بھوک کے ہاتھوں بے بس ہونے والے شخص کی بدفطرتی کو بے نقاب کیا ہے۔ افسانہ ''ہائے اللہ'' میں دادی کے کوسنوں سے معصوم بچی کے جنسی احساس میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اِسی طرح ''کوٹھی اور کوٹھری'' کا 'نقو' صاحب کی دیکھا دیکھی بیوی کو چوری چھپے اُس کی گاڑی میں سیر کروانا چاہتا ہے، لیکن اُس کی عدم موجودگی میں اُس کی بیوی روٹی اور روپے کے عوض خانساماں سے اپنا سودا کر بیٹھتی ہے، اِسی طرح ''اندھیرے اُجالے''، ''بندر کے گھاؤ''، ''سپاہی''، ''عاقبت'' وغیرہ میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم اور استحصال کی مختلف صورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کرشن چندر کے ہاں انسانی حرمت کی پاس داری کے علاوہ عورت کے ساتھ روا رکھے جانے سماجی بے حسی اور غیر انسانی رویوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ کرشن چندر عورت کو بھی زندہ انسان متصور کرتے ہیں، جو جذبات بھی رکھتی ہے اور احساسات بھی۔ بعض اوقات یہی عورت اِستحصالی رویوں سے تنگ آ کر بہت سے منفی رویے اختیار کرتی ہے۔ کرشن چندر کے ہاں عورت مزدور، طوائف اور کال گرل کے روپ میں نظر آتی ہے، مثلاً ''تائی ایسری'' اور ''کچرا بابا'' کی عورت شوہر کی محبت اور وفا کو بھولتے ہوئے نئی بانہوں کی پناہ ڈھونڈتی دکھائی دیتی ہے۔ ''مہالکشمی کا پل''، ''کالو بھنگی''، ''موبی''، ''اندھا چھتر پتی'' اور ''قہر'' میں عورت کی نفسیاتی تہہ داریاں، جاگیرداروں، ٹھاکروں اور سرمایہ داروں کی جنسی بھوک کی شکار عورتوں کا ذکر ملتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے عورتوں پر ڈھانے جانے والے مظالم کو موضوع بنایا ہے، اِن کے افسانے کی عورت زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ غربت و افلاس کے ہاتھوں عصمتوں کے سودے، مزارعوں کی عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، خواندہ و نیم خواندہ طبقے کے افراد کی جنسی بے راہ روی اور اُلجھنوں کو بھی بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔ ''چھوکری کی لوٹ''، ''گرھن'' کی ہولی سُسرال کے طعنوں اور مار پیٹ سے تنگ آ کر گھر سے نکلتی ہے، تو ہوس پرستوں کے جنسی تشدد کا شکار ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے بیدی کے افسانے ''تلادان''، ''اغوا''، ''گھر میں بازار میں''، ''ایک عورت''، ''لاجونتی'' اور ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' وغیرہ میں خانگی تشدد اور استحصال کی مختلف صورتوں کی عکاسی کی ہے۔ عصمت چغتائی نے مسلم معاشرے کی اُس عورت کو اپنا موضوع بنایا ہے، جو فرسودہ رسموں سے ٹکرا کر اپنا راستہ تلاش کرتی ہے۔ اُنھوں نے عورت کو بہ حیثیتِ انسان سوچنے اور عمل کرنے پر اُکسایا ہے، اِس کے علاوہ عورت کے جنسی جذبے، نفسیاتی مسائل اور ہم جنس پرستی کو بھی بعض افسانوں میں بڑی جُرأت مندی سے پیش کیا ہے، مثلاً ''گیندا''، ''نفرت''، ''نیند'' اور 'لحاف' وغیرہ میں تانیثی احساس کی جھلکیاں بہت نمایاں ہیں، اِسی طرح ''پتھر دِل عورت'' میں طوائف کے بجائے عزت کی زندگی گزارنے کی ترغیب ملتی ہے ''بے کار'' ''تھوڑی سی پاگل'' اور ''بہو بیٹیاں'' میں ایسی عورتوں کو پیش کیا گیا ہے، جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن کی آزادی اور بے راہ روی معاشرے کے لیے ایک بہت بڑا داغ بن جاتی ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے ''یا خدا''، ''ماں جی''

اور ''اور عائشہ آ گئی'' لکھ کر فسادات کے دلخراش حقائق کو پیش کیا ہے۔ زبیدہ اور دلشاد نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں کی ہوسنا کی کا شکار ہوئیں، بلکہ مہاجر کیمپ میں سرکاری افسران، ٹھیکیداران اور رضا کاروں کے ہاتھوں برباد ہوئیں۔ ''یا خدا'' کے افسانوں میں قدرت اللہ شہاب نے عورت کے جسمانی استحصال پر بڑے جذباتی انداز میں قلم اُٹھایا ہے۔ منٹو کے افسانے ''بو''، ''نیا قانون''، ''کھول دو''، ''ھتک'' میں بیمار معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے، جس میں عورتوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ افسانہ ''کالی شلوار'' کی سلطانہ محرم پر کالی شلوار بنانے کی خاطر اپنی عزت کا سودا کرتی ہے۔ ''سڑک کے کنارے'' میں عورت کی مجبور ماممتا کو موضوع بنایا گیا ہے، ''بو'' گھٹن زدہ ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی کے جذبوں کی شدت اور اُن کے منفی اظہار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''خوشیا'' کی طوائف اپنا آپ بیچ کر بھی مفلسی کا شکار رہتی ہے۔ حسن عسکری نے عورت و مرد کی جنسی گراوٹوں اور سماجی بے حسیوں کو اینگلو انڈین عورت کے ذریعے موضوع بنایا ہے۔ ''حرام جادی''، ''چائے کی پیالی''، ''اندھیرے میں'' اور ''وہ تین'' میں عورت کے احساسِ تنہائی اور اعصابی تھکن کا شکار عورت کی داستان لکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے تانیثی طرزِ فکر کے تحت اعلیٰ طبقے کی عورتوں کے بارے میں لکھا ہے، جو بظاہر خوش نظر آتی ہیں، لیکن مسلسل ذہنی اذیتوں اور نظر انداز کیے جانے کے دُکھ سے نا آسودگی کا زہر ان کی روحوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ ''پت جھڑ کی آواز'' کی عورت بے دھڑک ہر کسی کو اپنا جسم سونپ دیتی ہے۔ نچلے طبقے کی عورت کے مسائل اور ذہنی اُلجھنوں کو بھی قرۃ العین حیدر نے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ معاشرے کو گہنا دینے والے کردار، جو بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح دَر دَر منڈلاتے ہیں، اِن میں ''سیکریڑی'' کی ریتی، ''حسب نسب'' کی چھمی بیگم ''سنگھار دان'' کی مہارانی ''جگ مگ پور'' کی داشتہ اور ''روشنی کے مینار'' کی ڈاکٹر پدما قابلِ ذکر ہیں۔ ''فصلِ گل آئی، اجل آئی'' ہجرت کے حوالے سے لکھی گئی داستانیں ہیں، اِسی طرح ''اگلے برس موہے بٹیانہ کیجیو'' میں عورت کی دُکھ بھری داستان تہذیبی المیہ بن گئی ہے۔ ''نظارہ درمیاں میں ہے'' کی عورت کا جسم، تو بے روح ہے، مگر آنکھیں دوسروں کے چہروں پر مرکوز ہیں۔ ''چائے کا باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائیٹی''، ''کارمن'' اور ''یاد کی اک دھنک جلے'' بے بس نسوانی کردار، جو ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے پروردہ ہیں، زندگی کی محرومیوں کا شکار ہیں۔

غلام عباس کے بیشتر افسانے عورت کے حوالے سے سماجی رویوں، نفسیاتی کیفیتوں اور زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش ہے، یہ ماممتا کا قتل یا محبت کا فریب بیان کرتے ہوئے طوائف کے کردار کے ذریعے شر کی تجسیم کر دیتے ہیں۔ اِسے نہ، تو ''بھنور'' کا حاجی شفاعت احمد سُلجھانے پر قادر ہے اور نہ مصلحین قوم کی سطحیت اور ریا کاری ''آنندی'' کی صورت میں کی جا سکتی ہے، بلکہ یہاں بکنے والوں کی ناک کاٹنے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مزید برآں، جنسی ہوس اور ضعیف الاعتقادی کا اظہار ''سُرخ گلاب'' میں بیان کیا گیا ہے۔ غلام عباس کے ہاں عورت کے مختلف روپ اور سماجی مسائل کو بڑے غیر محسوس انداز میں پیش کیا گیا ہے، یہاں عورت بیک وقت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی، مثلاً ''سمجھوتہ''، ''تنکے کا سہارا''، ''حمام میں'' ''سیاہ و سفید''، ''چنکی بائی''، ''بردہ فروش''، ''سایہ''، ''بندر والا''، ''غازی مرد'' اور ''کن رس'' وغیرہ میں مرد کا استبدادی رویہ نمایاں ہیں۔ عزیز احمد نے اپنے افسانوں میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں کا ذکر کیا ہے، جو فلرٹیشن، جسمانی معاشقوں گھناؤنے کاروبار، مفادات، کج روی کی شکار ہیں، مثلاً ''خطرناک پگڈنڈی''، ''جادو کا پہاڑ''، ''رقصِ ناتمام'' جیسے افسانوں میں میں عورت کا استحصال جنسی سطح پر ہوتا ہے، جب معاشقے کی آڑ میں عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں اور ایسے بھی ماں

باپ ملتے ہیں، جو اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں ہی بکاؤ مال بنادیتے ہیں۔خدیجہ مستور نے معاشرتی تضادات اور عورت کی مظلومیت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔''بوچھاڑ''،''چندروز اور''،''تھکے ہارے''اور''ٹھنڈا میٹھا پانی''میں نچلے متوسط طبقے کے کرداروں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔روز مرہ زندگی میں عورت، جن آزمائشوں، معاشرتی مسائل اور دقیانوسی سماجی نظام کا شکار ہوتی ہے، اِس کا اظہار افسانے''ٹھنڈا میٹھا پانی''،''بھُورے''،''تین عورتیں''،''محافسے سے دُور'' میں ہوتا ہے۔تعلیم کی کمی اور وسائل کی عدم دستیابی نے خدیجہ مستور کی عورت کو جلنے کُڑھنے پر مجبور کر دیا۔ممتاز شیریں کے افسانوی مجموعے''اپنی نگریا''اور''میگھ ملہار''جدید افسانہ نگاری کا نقطۂ آغاز سمجھے جاتے ہیں، اِن کے افسانے کی عورت ذہانت وشعور کی بنیاد پر زندگی کی کشمکش سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہے، مثلاً''کفارہ''،''اپنی نگریا''اور''آئینہ''میں وہ مرد وعورت کی تخصیص کی قائل نہیں۔احمد ندیم قاسمی نے نچلے طبقے کی خواتین خصوصاً گاؤں کی عورتوں کے مسائل اور انسانی رشتوں کے بدلتے ہوئے رویوں کی عکاسی کی ہے، اِس کے علاوہ جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاتھوں مزارعوں کی بیٹیوں کی عصمت دری کی داستانیں ملتی ہیں، اِس حوالے سے اہم افسانے''کریا کرم''،''ماں''،''کھیل''،''پاؤں کا کانٹا'' ''پرچھائیاں''،''نشیب وفراز''،''میرا دیس''،''نامرد''،''سائے''،''اکیلی''،''رئیس خانہ''،''سانولا''،''چڑیل''،''کنجری'' ''گھر سے گھر تک''،''دُوربین''،''امانت''،''گل روح''،''بدنام''،''ماسی گل بانو''،''کپاس کا پھول''اور''نیلا پتھر'' ہیں۔بانو قدسیہ نے عورت ومرد کی تخصیص سے قطع نظر دونوں کو بہ حیثیتِ انسان متصور کیا ہے اور اُن کی اچھی عادات واطوار کے علاوہ بُری جبلت کو بھی بے نقاب کیا ہے، اِن کے افسانوں میں برقعہ پوش اور محبت کی تکمیل کرنے والی عورتیں شامل ہیں، اُن کے خیال میں، جو مرد جذبے کی صداقت کی بجائے اپنی ذہانت سے عورت کے ذہن کو تسخیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ عورت کو محض کھلونا سمجھتے ہیں اور وقتی طور پر کھیل کر آگے نکل جاتے ہیں۔جیسے افسانوں میں''امر بیل''،''بازگشت'' ''کاغذی پیرہن''،''بیوگی کا داغ''اور''نیلوفر''میں ایسی عورت کی کہانی ہے، جو اپنے اردگرد بنے جانے والے بُرائیوں کے جال کو سمجھ نہ سکی اور بالآخر اِس کی نیم برہنہ لاش معاشرے کی بربریت کا زندہ ثبوت بن گئی، اِسی طرح''شریفاں''،''کتنے سوسال'' ''سامانِ شیون''،''سمجھوتہ''،''توجہ کی طالب''،''کال کلیجی''،''کلو''،''کرکل''،''موج محیطِ آب میں''،''انتر ہوت'' ''اُداسی''،''واماندگیِ شوق''،''توبہ شکن''،''دوسرا دروازہ''،''تنکے کا سہارا''وغیرہ اہم ہیں۔ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں فرائڈ کے نظریات کے حامل کردار پیش کیے ہیں، جو جنسی دباؤ اور گھٹن کا شکار ہیں۔اِس حوالے سے اُن کے افسانوی مجموعے ''ان کہی''،''گہما گہمی''،''چپ''،''اسمارائیں''،''گڑیا گھر''،''روغنی پتلے''،''سمے کا بندھن''،''کہی نہ جائے''اہم ہیں۔

جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں عدم تحفظ، بے یقینی وبے اعتمادی، بدلتے ہوئے عقائد، قومی تشخص اور سماجی حالات کی وجہ سے پیدا ہونے والا جذباتی اشتعال اور تموج پیدا ہوا۔اِس دَور میں لکھے جانے والے ادب میں اپنوں کی بے حسی وبے غیرتی، بدنظمی وبدعنوانی، لوٹ کھسوٹ، ظلم وجبر، ناانصافی، ناعاقبت اندیشی، مہاجرت وفسادات سے پیدا ہونے والے مسائل یعنی سماجی حقیقت نگاری، جنسی مسائل واشتراکی پروپیگنڈا اور کرداروں کی ذہنی کیفیات ونفسیاتی عوامل کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے، اِس دَور کے لکھنے والوں میں الطاف فاطمہ، اختر جمال، جمیلہ ہاشمی، مسعود مفتی، غلام الثقلین نقوی، رشید امجد اے حمید، آغا بابر، منیر احمد شیخ، حمید کاشمیری، انور سجاد، مسعود اشعر، عرش صدیقی، رضیہ فصیح احمد اور محمد منشایاد وغیرہ شامل ہیں۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں، طاقت ور ملکوں کا غلبہ پانا، تیسری دُنیا خصوصاً جنوبی ایشیا میں ردِّعمل کی

تحریکیں، سیاسی و اقتصادی عدم استحکام اور بے حسی و بے دِلی کے علاوہ ۱۹۶۵ کی جنگ خصوصاً سقوطِ ڈھاکہ سے پیدا ہونے والی افراتفری، معاشی بدحالی، اقتصادی ناہمواری، عدم مساوات، لاقانونیت، آمریت کی سختی، بدنظمی، رشوت ستانی اور چور بازاری کا دَور دورہ ہوا۔ نئے لکھنے والوں میں سلیم اختر، مستنصر حسین تارڑ، فردوس حیدر، مظہرالاسلام، رحمٰن مذنب مرزا ریاض، احمد شریف، اُمِ عمارہ، اعجاز راہی، احمد داوٗد، میرزا حامد بیگ، زاہدہ انجم، فرخندہ لودھی وغیرہ نے عصری مسائل اور اُن کا شعور اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت ہجرت اور فسادات سے بہت بڑے انسانی المیے نے جنم لیا، جس میں لوٹ مار، جان و مال، عزت و ناموس کی پامالی کی ارزانی نے بے حسی اور بے مروتی کے در وا کیے۔ بہت سے مصنفین اِس سانحے سے بہت متاثر ہوئے اور اُن کی تحریروں میں ہجرت و فسادات باقاعدہ موضوع کے طور پر آیا۔ عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستانیں بہت سے ادیبوں کے ہاں شعوری و لاشعوری طور پر موجود ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُردو افسانے پر تانیثیت کے اثرات کا اجمالی جائزہ لیا جائے، تو بہت سے تانیثی موضوعات منظرِ عام پر آئے، جن میں سرِ فہرست فسادات، جنسی تشدد، گھریلو تشدد، ہراساں کیا جانا، جسم فروشی، وڈیروں، زمینداروں اور افسروں کی عیاشیاں، ناجائز تعلقات اور معاشقے، شادی، عورت کو ترقی کا زینہ سمجھنا، سُسرال، خانگی زندگی کی مشکلات، ملازمت پیشہ عورتوں کے مسائل، جعلی پیروں کے ہاتھوں عورت کا استحصال، بانجھ پن، غیر شادی شدہ لڑکیوں کے مسائل، جائیداد اور بنیادی انسانی حقوق کی عدم دستیابی وغیرہ اہم ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''اور عائشہ آ گئی'' کا عبدالکریم تمام تر آلائیشوں سے لتھڑا ہوا ہے، اُس کی ذات کے چور دروازے بُرائی کی ہر گلی میں کھلتے ہیں، لیکن اِس کے برعکس وہ ایمانداری، نیکی اور پارسائی کا خواہاں ہے۔ عبدالکریم کی شخصیت تضاد کا شکار ہے۔ اُس کی بیٹی عائشہ کے رُخصتی کے بعد اس کی ذات کا اصل سیاہ پن ظاہر ہوتا ہے، لیکن عائشہ کی آمد پر وہ پھر پارسائی کا خول چڑھا لیتا ہے، اگرچہ ہجرت کے دَوران کسٹم چوکی والوں کے ہاتھوں عزت و مال کے لٹ جانے کے شدید کرب سے گزر چکا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''یا خدا'' کی دلشاد جو کہ مولوی علی بخش کی جواں سال بیٹی تھی، علاقے کے سکھوں نے بڑی بیدردی سے قتل کر کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا اور اُسی مسجد میں جہاں وہ پانچ وقت اذان دیا کرتا تھا، اُس کی آواز سے سکھوں کی عورتیں خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ اُس کے سامنے اِس کی لاڈلی بیٹی کو بے آبرو کیا گیا ہے اور اُسی مسجد کے حجرے میں مقید کر دیا گیا اور علاقے کا ہر سکھ اُس کو بے آبرو کرنا اپنا دھرم کا حصہ سمجھتا تھا۔ دلشاد کے حاملہ ہونے پر مشترکہ فیصلے سے دِلشاد کو عورتوں کی برآمدگی کے سلسلے کی کاروائی کے طور پر تھانیدار کے حوالے کر دیا گیا، یہاں تھانیدار لجھورام بھی، جس حد تک اُس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، فائدہ اُٹھاتا رہا اور پھر ہیڈ کانسٹیبل دریودھن سنگھ نے بھی اُسے کولہوں اور گھٹنوں کے درد کا مداوا سمجھتے ہوئے استعمال کیا:

> ''مسجد کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی، سہمی ہوئی، حیران، لیکن اس کے دم سے مسجد پھر سے آباد ہو گئی تھی۔ لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور وہ بہادر خالصے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چوڑ چوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے۔''[۲۲]

''یا خدا'' میں بربریت کی شکار ایک لڑکی جس نے خط کے ذریعے اپنی بپتا سنائی اور جسم فروشی پر مجبور اُس عورت کے الفاظ بعینہٖ قدرت اللہ شہاب نے پیش کر دیے ہیں:

''یہ دھرتی میرے لیے فردوس کی سرزمین اور یہاں مسلمان مجھے شفیق بھائی دکھائی دیتا تھا، لیکن یہ بھائی ہوس ناک شکاری نکلے، اُنھوں نے میری، جو خاطر مدارت کی ہے، اُس کے طفیل میں تپ دق کی مریض ہوں۔۔۔ میں اُن مجبوروں میں سے ہوں، جو ہنسی خوشی پکوڑے نہیں تل سکتیں، بیسن نہیں لاسکتیں اور اِس پاک سرزمین میں سیکڑوں شاید ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔'' [۳]

احمد ندیم قاسمی نے ''پرمیشر سنگھ'' کا کردار پرمیشر سنگھ اپنی بیٹی امر کور کو ذرا ذرا سی بات پر دُھنک کر رکھ دیتا ہے، اُس کی بیوی، جوان بیٹی کو پٹتے دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے۔ پرمیشر سنگھ اپنی بیوی کے بھی خلاف ہو جاتا ہے، وہ بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے بہت بڑی سماجی حقیقت بے نقاب کرتی ہے:

''بیٹی کو بُرا مت کہو، بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے، یہ تو ایک مسافر ہے بیچاری، ہمارے گھر ونڈے میں ستانے بیٹھ گئی ہے۔ وقت آئے گا تو چلی جائے گی، اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے، تو آپے میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں، بیویاں اغوا ہوتی تھیں یارو، یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اُٹھ جاتے ہیں۔'' [۴]

کشور ناہید کا قیامِ پاکستان پر ہجرت کرنے کے دوران اغوا ہونے والی عورتوں کے بارے میں کہنا ہے:

''قیامِ پاکستان، تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت تھی، چالیس ہزار عورتیں اغوا ہوئیں، ہزاروں قتل کر دی گئیں، ہزاروں ہندو لڑکیاں مسلمان بنا کر بیویاں بنا لی گئیں، ہزاروں گمنام رہیں، کسی کے گھر خادمہ کی شکل میں، کسی دارالامان میں، کسی گائیڈ ہاؤس میں، کسی سڑک پر بھکارن کے روپ میں اور کسی ہسپتال میں ظہورن کے روپ میں ستم ظریفی یہ رہی کہ، جو بچھڑ گئی تھیں وہ، تو اِسی دُکھ دھل جاتے، مگر وہ کہ جنھیں اپنے مل بھی گئے، مگر اُنھوں نے اِس داغ کو اپنا کہنے سے گریز کیا، اپنا ماننے سے اجتناب کیا، پہچان لینے سے انکار کیا، اپنے باوقار لباس اور باکردار خاندانی روایات کو قُربان نہ کرنے کی قسم کھائی۔'' [۵]

''شریفن'' میں منٹو نے اِس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ فسادات کا عذاب، قہر بن کر ٹوٹا، خصوصاً لڑکیوں، عورتوں اور بچوں کو اِس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ قاسم کا کردار اپنی بیٹی شریفن اور بیوی کی برہنہ لاش کا سامنا کرتا ہے، اِسی طرح ''دیکھ کبیرا رویا'' میں فسادات کے حوالے سے تباہ حال خواتین کے مستقبل کو محفوظ اور باحیا زندگی گزارنے پر مائل کرنے پر ایک تحریک کے بارے میں لکھا ہے۔ ''انجام بخیر'' کی نسیم اختر، جو فسادات کے بعد ہجرت کر کے محض اِس وجہ سے پاکستان آئی کہ یہاں شادی کر کے شریفانہ زندگی بسر کر سکے، لیکن یہاں بھی اسے جسم فروشوں ہی سے واسطہ پڑا:

''نسیم اختر کو یہ معلوم نہیں تھا، یہ عورت شریفوں کے محلے کی بہت بڑی پھاپھا کٹنی ہے۔ شریفوں کے محلے میں کئی گھر تباہ و برباد کر چکی ہے۔ کئی لڑکیوں کی عصمت اونے پونے داموں بکوا چکی ہے۔ کئی نوجوانوں کو غلط راستے پر لگا کر اپنا اُلو سیدھا کرتی رہی ہے۔'' [۶]

خدیجہ مستور کے افسانے ''بھورے'' میں بھورے کی منگیتر ظہورن جو پاکستان بننے کے بعد سرحد پار کر کے آتی ہے۔

ماں بیٹے اور باپ حادثے میں ہلاک ہونے سے لاوارث ہو جاتی ہے۔ بھورا بھی شہر کے ہنگاموں میں گم زچہ بچہ ہسپتال میں ملازم ہو جاتا ہے، یہاں بہت سوں کے ساتھ دل بہلاوے کے لیے محبتوں کا ڈھونگ رچاتا ہے، اتفاقاً اسی ہسپتال میں اس کی ملاقات ظہورن سے ہو جاتی ہے، استفسار کرنے پر ظہورن بتاتی ہے:

''یہ سب تو جبر دستی ہوتا ہے۔ باپو کے بعد کون دیتا روٹی۔ کوٹھیوں میں کام کر کے پیٹ بھرتی تھی، پر بھورے یہ شہری بابو بڑے کھراب ہوتے ہیں۔ ہر سال اِس اسپتال میں آ کر کچے بچے جنتی ہوں۔ مر مر کر جیتی ہوں۔ بابو صاحب اپنے کسی بیرے، کھانسامے کو میرا سوہر لکھا جاتے ہیں، اس باری وہ کھانساماں کہتا تھا کہ ظہورن ایسے کب تک چلے گا، میرے ساتھ دو بول پڑھا لے، تجھے لے کر دور بھاگ جاؤں گا۔'' ۷

مرزا ریاض کے افسانے ''بوجھ'' میں فسادات کے دَوران عورتوں کی عصمت دری، وحشیانہ تشدد اور قتل کے واقعات اور ہندوؤں، سکھوں اور پھر اپنوں کے مظالم کی شکار خواتین کی داستانِ غم کو بیان کیا ہے۔ سلیم و آسیہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے اور اِن کی آپس میں شادی بھی ہونے والی تھی، لیکن اسے گھر والوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اِسی طرح گھر کی آصفہ سکھوں اور ہندوؤں کے نرغے سے، تو بچ نکلی، لیکن کیمپ میں ایک باریش بزرگ نے باپ بن کر اُس کی عصمت تار تار کر دی۔ جنسی تشدد کی شکار عورتوں کی نفسیاتی کیفیات کا نقشہ اِس طرح کھینچا گیا ہے:

''اِسی کے تصور میں عورتیں چیخ رہی تھیں، مردہ اور بے جان عورتیں، عورتیں جن کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں، جن کے چہروں پر ظلم اور استبداد کی خونیں داستانیں کندہ تھیں، زخمی اور اپاہج عورتیں، گونگی اور بہری عورتیں، جن کی آنکھوں کے آنسو ہمیشہ کے لیے خشک ہو گئے تھے، جن کے لیے اِس ماتم کدے میں کوئی جگہ نہ رہی تھی، زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں، انسانیت کے دروازے بند ہو چکے تھے اور جو سوسائٹی کے لیے ایک مستقل بوجھ بن چکی تھیں، ایک مسلسل اور ابدی بوجھ۔'' ۸

انتظار حسین کے افسانے ''شہرِ افسوس'' میں انسانی بے حسی، ظلم اور بربریت کا نوحہ پیش کیا ہے اور اِس کے لیے علامتی انداز اختیار کیا ہے، یہاں عزتوں کے رکھوالے ہی عفتوں کے سوداگر بن گئے تھے۔ اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی ہی عزت کو داؤ پر لگانے والے مردہ لاشوں کی مانند ہیں، کیوں کہ ضمیر ان کے لیے محض ایک افسانہ ہے۔ ماں، بہن، بیوی، بیٹی جیسے قابلِ صد احترام رشتوں کو اپنے ہی ہاتھوں، موت کے خوف سے برہنہ کرنے والے خود بھی جی نہیں پاتے، اِن کے ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں، وہ محض چلتے پھرتے پُرزے ہوتے ہیں، جن میں نہ روح ہوتی ہے اور نہ ہی زندگی:

''میں نے نوجوان سے پوچھا یہ تیری کون ہے؟ بولا کہ میری بہن ہے، میں نے کہا کہ، تو اِسے برہنہ کر، یہ سنا تو لڑکی پر دہشت طاری ہو گئی، یہ میری بہن ہے، میں نے کہا، تو نوجوان نے فریاد کی کہ ایسا مت کر کہ یہ میری بہن ہے۔ مجھ پر وحشت سوار تھی، میں نے نیام سے تلوار نکال لی اور چلایا کہ تو اِسے برہنہ کر، برہنہ تلوار کو دیکھ کر نوجوان خوف سے تھر ایا پھر لرزتے ہاتھ بہن کی ساڑی کی طرف بڑھے اور اُس سانولی لڑکی نے ایک خوف بھری

چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔۔۔اور اِن لرزتے ہاتھوں نے میرے
سامنے۔۔۔دوسرے آدمی نے تیسرے آدمی کی حیرت کو یکسر فراموش کیا اور اپنے اسی
جذبے سے معرا لہجے میں پوچھا، پھر تو مر گیا؟ ''نہیں میں زندہ رہا'' ۔۔۔اچھا؟ ''۹

عورت پر جنسی تشدد، اغوا، زنا، ہراساں کیا جانا بہت بڑی عفریت کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ مجرمانہ ذہنیتوں کے حامل افراد کے تشدد کا شکار ہر عمر کی لڑکی یا عورت بنتی ہے۔ ایسے گھناؤنے جرائم میں محرم رشتے بھی عزت و عصمت کو تار تار کرتے نظر آتے ہیں، بعض اوقات میں ہسپتالوں میں مریضوں کے علاوہ اُن کی عیادت کرنے والی خواتین بھی جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہیں تعلیمی اداروں، دفاتر اور بعض قبیح صورتوں قبرستانوں میں دفنائی جانے والی لاشوں کو بھی شیطان صفت لوگ اپنی ہوس کا نشانہ بنا ڈالتے ہیں۔ معاشرے کے اِن ناسوروں کی نشاندہی کچھ افسانہ نگاروں نے بڑی جرأت مندی سے کی ہے۔ مزید برآں بہت سے افسانہ نگاروں نے قحط و غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر عزت کا سودا کرنے والوں کے علاوہ زمینداروں، وڈیروں بھٹہ مالکان، مالک مکان اور اوباش افسروں کی عیاشیوں کے علاوہ محنت کش اور مزدور خواتین کا جنسی استحصال کرنے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ہاجرہ مسرور نے ''بھاگ بھری'' میں ملک کے ہاتھوں ملازمہ کی بیٹی کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے ماں جب اِس ظلم کے خلاف آواز اُٹھانا چاہتی ہے، تو ملکنی اُسے معمول کا واقعہ سمجھتے ہوئے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی ہے:

> ''بڑی ملکنی بھاگ بھری کی ماں کو روک رہی تھی کہ بچے والے گھر میں رونا مت ڈالو، لیکن جب وہ اپنی بچی کی حالت کے بین ہی کرتی گئی، تو بڑی ملکنی آپے سے باہر ہو گئیں کہ تیری لڑکی خود مستانی ہوئی ہے۔ تو لیہ رکھ کر وہاں رکی کیوں۔؟ مرد ہے کیا کرے، اور یہ بھی کہا کہ بڑی بیٹی کی عزت کی دہائی دینے والی آئی۔ وہ دن بھول گئی، جب تیرا خاوند کھیتوں پر ہوتا تھا اور تو ملک جی کی بیٹھک میں ہوتی، بھاگ بھری کی ماں نے رو رو کر اپنی ہم چشموں سے فریاد کی تو بڑی ملکنی اور بھی جل گئیں کہ دیکھیں کون ہیں مریم بیبیاں، جنھیں تو پکار رہی ہے، اِس پر وہ دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی، بھاگ بھری کی ماں، جب رونے سے باز نہ آئی، تو ملکنی نے اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ جاتے ہوئے وہ بھاگ بھری کے لے جانا چاہتی تھی، مگر جواب ملا نہیں جائے گی، آج کام بہت ہے حویلی میں، سب رشتے ناطے والے جمع ہیں، ایسی کونسی موت آ رہی ہے بھاگ بھری کو'' ۱۰

ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانے ''اور ہستی'' میں مُردوں کی بے حُرمتی کرنے والوں کو بے نقاب کیا ہے، کفن چوری، تو معمول بن گیا ہے، لیکن لاشوں کے ساتھ بد فعلی جیسے گھناؤنے جُرم کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ ''سانتا کلاز کا زوال'' میں جنسی تشدد اور اوباش لوگوں کی ہوسنائی کی شکار ہونے والی عورتوں کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جنھیں معاشرہ نا کردہ جُرم کی پاداش میں نفرت کا عذاب دیتا ہے، اِس اخلاقی جُرم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حرام اولاد عورت کو مزید مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ''سانتا کلاز کا زوال'' میں بچی کرسمس کے موقع پر ماں سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے، لیکن مجبور ماں کے پاس سوائے بے بسی کے آنسوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنے دِل کا دُکھ ہلکا کرنے کے لیے بتاتی ہے:

> ''مجھے کئی مردوں نے مل کر خراب کیا اور وہ بھی کرسمس والے دن! یہ بدقسمت کرسمس کے

اِس حادثے کا تحفہ ہے، کسی نے میری بات پر یقین نہ کیا، میں شریفوں کی بستی سے نکلنے پر مجبور ہوگئی، تنہا، اَب میں اکیلی رہتی ہوں اور اِسی طرح روزی کماتی ہوں، جس طرح روزی کمانے کا ایک دروازہ میرے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا، خود میں بھی نہیں جانتی کہ یہ کس مرد سے ہے، وہ کئی تھے، شکاری کتوں کی مانند کرمس کی شراب کے نشے میں اندھے، اپنی ہوس کی بو کے اسیر، میں روئی، چلائی، دُھائی دی مگر کوئی مدد کو آیا نہ شنوائی ہوئی، اور یہ احمق لڑکی باپ مانگتی ہے اور وہ بھی کرمس پر!''[11]

افسانہ ''پگلی'' میں سی ایم نذیر نے چوہدری تاج دین جیسے درندوں کی زندگی کا پردہ چاک کیا ہے، جو بظاہر انسانی ہمدردی، خدا خوفی اور نیکیوں کی آڑ میں سیما جیسی پڑھی لکھی استحصال شدہ عورتوں کو انصاف دلوانے کی اُمید میں اپنی ہوسنا کی کا نشانہ بناتے ہیں اور بعد میں پگلی قرار دے کر پاگل خانے کی دیواروں میں مقید کر دیتے ہیں۔ سیمو مسلسل جسمانی اذیتوں سے مر جاتی ہے، اِس کی موت پر چوہدری بڑا خوش ہوتا ہے: ''جہاں لوگ پگلی کے سوگ میں پریشان تھے، چوہدری تاج دین اُتنا ہی اندر سے خوش تھا، اِس کا وقار قائم رہا، اِس کی حویلی کی عزت محفوظ رہی، پگلی کا زیرِ زمین ان حالات میں جانا ضروری تھا، جو اچھا ہو گیا۔''[12] معاشرے میں مرد کی حاکمیت اور برتری کے بے جا احساس کے خلاف ردِعمل یقینی ہے۔ باشعور لڑکیاں اور عورتیں شادی سے متنفر ہونے لگتی ہیں، کیوں کہ سماج کی جو تصویر اُبھرتی ہے، اُس میں شادی شدہ عورت محض ایک غلام دکھائی دیتی ہے، سُسرال کا تشدد، دھونس اور ذہنی اذیتیں عورت کا مقدر قرار دے دیے جاتے ہیں، ایسی نام نہاد سماجی روایتوں اور جبر کے خلاف ردِعمل، نفرت کی صورت میں ملتا ہے۔ ''نیو ورلڈ آرڈر'' میں بانو قدسیہ نے جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبِ روزگار لڑکیوں کی مرد کی حاکمیت کے خلاف بے جا جور و ستم کے خلاف باغیانہ روش اختیار کی ہے، اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بانو اپنے نظریات کا اظہار کرتی ہیں:

''اِس کو تو کوئی پسند ہی نہیں آتا، اوپر سے نوکری کرتی ہے، ہنسنے بولنے کو وہاں ہم عمل جاتے ہیں جواب پر، اگر بن گائے پالے دودھ ملے تو یہ بتاؤ گائے کیوں پالے مریم، کس لیے؟ کسی قسم کی Dependency تو رہی نہیں مرد پر، پھر شادی کیوں کرے؟ مرد عورت کا رابطہ ہو، ماں بچے کا رشتہ ہو، دوستی ہو، بھائی جہاں کسی کی محتاج ہی نہ ہو، وہاں جھنجھٹ ہی کیوں مول لے کوئی؟''[13]

غزالہ خاکوانی نے ''نامعتبر رفاقتیں'' میں عورت کے بارے میں مرد کے خیالات کو موضوع بنایا ہے:

''میں نے سمجھا تھا کہ تم دُنیا کے سب سے مضبوط اور طاقتور مرد ہو، تم سے ہی مجھے اخلاقی پناہ مل سکے گی۔ عورت، تو اِس معاشرے میں بہت کمزور ہے، وہ کتنی بڑی سالی بن جائے، انٹلیکچوئیل کہلائے، کتنے بڑے عہدے پر پہنچ جائے اُسے ہر دور میں کسی نہ کسی مرد کی بانہوں کی پناہ چاہیے ہوتی ہے۔ چاہے وہ بھائی ہو، باپ ہو، دوست ہو، خاوند ہو یا سرپرست ہو۔''[14]

''زہرباد'' میں محمد یحییٰ خان نے سرکس میں کرتب دکھانے والی لڑکیوں کے مسائل بیان کیے ہیں، اُنھیں بیاہ کے نام پر خریدا جاتا ہے اور روزی روٹی کا وسیلہ بنا دیا جاتا ہے، اِس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اِن لڑکیوں کا پاؤں بھاری نہ ہو، تاکہ اُن کی آمدنی کا ذریعہ برقرار رہے، اِس کے علاوہ بوڑھی فقیرنی کا ذکر کیا ہے، جو تمام دِن بھیک مانگنے پر مجبور ہے اور

جب گھر لوٹتی ہے، تو اُس کا بڈھا شوہر، جس کی تمام عمر نشے کی لت میں گزری تھی، اِس سے تمام دن کی اُجرت وصول کر کے بدلے میں مارتا پیٹتا ہے:

''آ گئی، حرامزادی! اپنے بڈھے عاشق کی ٹہل سیوا کر کے، دو چار گیلی گیلی گالیوں سے اُس کا سواگت کر کے اندر گھسیٹ لیتا، چادر کا پلو، شلوار کا نیفہ، نیچے اوپر بڑی بیدردی سے ٹٹولتا، ہمیشہ خالی ہاتھ ہی آوَ، دوادارو، نوٹ روپیہ پیسہ تجھے تیرا عاشق نہ دیوے ہے؟ اری بھیڑو، نخچرو! اِس کی کوئی مندری، گھڑی ہی لے آتی مرتی، اگر اِس کی بہو، پوتیاں موقع پر موجود ہوتیں، تو قدرے بچت ہو جاتی ورنہ وہ دو تھپڑ دھرنے سے بھی باز نہ آتا، ماں، بہن برا بر کر کے وہ برابر کے کسی جھونپڑے میں ٹیلی ویژن دیکھنے گھس جاتا اور اِس جنم جلی کے بس میں صدا وقت یا فریاد کرنا تو کجا، رونا یا کراہنا بھی نہیں تھا۔'' ۱۵

عورت کی کمتر حیثیت اور مرد کی حاکمیت کے حوالے سے افسانہ ''زمیں آگ کی، آسماں آگ کا'' اہم ہے:

''سنو شہنشاہ بانو، یہ شہنشاہی کا خناس دماغ سے نکال دو۔ عورت کا درجہ اتنا کم تر، اتنا حقیر ہے کہ اِس کے وضو اور غسل کے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو اور غسل کرنا منع آیا ہے۔ ہمیں عورتوں پر شیر کیا گیا ہے، کیا سمجھیں تم؟ وہ پہلی رات تھی جب اُنھیں یقین ہو گیا کہ عورتوں کی نجات کا کوئی نسخہ آسمان سے زمین پر نہیں اُتارا گیا ہے۔ تمام کتابیں، تمام تحریریں، تمام اقوال اِس لیے ہیں کہ مردوں کو اِس سے آگاہ کیا جائے کہ وہ دُنیا میں ہی عورتوں کو کس طرح جہنم کے ساتوں طبقے میں رکھ سکتے ہیں۔'' ۱۶

احمد ندیم قاسمی نے سماجی مسائل کے علاوہ نوجوان لڑکیوں کی جنسی و ذہنی گھٹن کو موضوع بناتے ہوئے ہسٹریائی کیفیات بڑی مہارت سے پیش کی ہیں، جسے ضعیف الاعتقاد لوگ جن بھوت کا سایہ سمجھتے ہوئے جعلی پیروں فقیروں سے علاج کرواتے ہیں، جو اُن پر بہیمانہ تشدد اور بعض گھناؤنی صورتوں میں عزتوں سے کھلتے ہیں، اِس کی نشاندہی احمد ندیم قاسمی نے ''ماسی گل بانو'' میں کی ہے۔ ماسی گل بانو چوں کہ ہسٹریا کی کیفیات سے گزر چکی تھی اور تمام زندگی دیوانگی کے عالم میں بسر کر چکی تھی۔ لڑکی شادی کا مجرب مشورہ دیتی ہے:

''کچھ بھی کرے تاجو کی فوراً شادی کر دو۔ جوانی کی انگیٹھی پر چپ چاپ اپنا مگر پھونکتے رہنا کسی کام کا نہیں ہے اور تمھاری تاجو، تو بالکل چھلکتی ہوئی لڑکی ہے، اِس کی شادی کر دو، دولہا آیا، تو جن چلا جائے گا، جن نے دولہا کی آمد کا بھی انتظار نہ کیا وہ مہندی کی خوشبو سے بھاگ نکلا۔'' ۱۷

انوار صدیقی کے افسانے ''گوریلا'' میں نیکروفیلزم یعنی مردہ جسموں سے جنسی فعل کرنے کی خواہش کو موضوع بنایا ہے اِس کا مرکزی کردار نیلسن گھروں میں موجود اکیلی لڑکیوں اور عورتوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ بظاہر یہ شخص بڑا خوش پوشاک، خوش گفتار اور مہذب دکھائی دیتا ہے، لیکن اندر سے درندوں سے بھی زیادہ بے رحم اور سفاک ہوتا ہے۔ شخصی تضادات کا شکار یہ شخص اپنی جنسی تسکین بہیمانہ قتلوں کے بعد مردوں سے کرتا ہے۔ انوار صدیقی نے نیلسن کی صورت میں ہمارے معاشرہ کے درندہ صفتوں کو بھی بے نقاب کیا ہے، جو اپنی لمحاتی تسکین کی خاطر عورتوں، کم سن بچوں کو جنسی

ہوس پرستی کا نشانہ بنا کر بیدردی اور بے رحمی سے قتل کر دیتے ہیں، تا کہ پہچانے نہ جائیں۔ دوسری طرف دوہری شخصیت کے شکار ایسے مردوں کو بھی بے نقاب کیا ہے، جو قبرستانوں میں لاشوں کی بے حُرمتی کر کے اپنی ہوس پرستی کے لیے سامانِ راحت پیدا کرتے ہیں، ایسے ناسوروں کے لیے عبرت ناک سزائیں ہی ہونی چاہیں: ''تحقیق کرنے والے افسران نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ کلارا نیومن کو پہلے بیدردی سے قتل کیا گیا بعد ازاں، قاتل نے وحشیوں جیسے انداز میں اس کے ساتھ بُرا فعل کیا۔'' ۱۸؎

نیلم احمد بشیر کے افسانے ''پردہ اُٹھتا ہے'' میں بچوں کے ساتھ جنسی تشدد کے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے، اس میں غلام فاطمہ گھر کی نوکرانی اپنی چھوٹی بچی شریفاں عرف شیری کو مالکن کی اکلوتی بیٹی مونا کے پاس چھوڑ دیتی ہے، ماں بیٹیاں اُسے بہت محبت سے اپنے پاس رکھتی ہیں، لیکن ایک روز پانچ چھ سالہ شیری درندگی کا شکار ہو جاتی ہے اور درندہ بھی کون ہوتا ہے گھر کا مالک۔ مونا، شیری کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر احتجاج کرتی ہے، تو اِس کا باپ بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے، اپنی لاڈلی بیٹی کو سیر اور آئس کریم کھلانے کا پروگرام بناتا ہے تا کہ وہ اس سانحے کو بھول جائے۔ اِسی طرح ''ایک اور دریا'' کی سکینہ شوہر کی طرف سے بانجھ پن کے طعنوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنا چاہتی ہے، لیکن دریا کی موجیں اِسے دوسرے کنارے پر لے جاتی ہیں، جہاں پولیس والا غلام محمد نامی شخص اِسے بہن بنا کر گھر لے جاتا ہے اور اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ ''غمِ ہستی'' میں ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ بدسلوکی، عصمت دری کے حقائق منکشف کیے ہیں، اس گھناؤنے جُرم میں ہسپتال کا عملہ بھی شامل ہوتا ہے:

> ''اچانک میری نظر آئی سی یو ہال میں چلتے سفید کوٹ میں ملبوس ایک ہیولے پر جا پڑی، یہ وہی صبح والا لیب ٹیکنیشن تھا، جس نے میرا بلڈ ٹیسٹ کیا تھا، ہیولے کو کومے میں پڑی بے خبر پروفیسر کے سرہانے کھڑا پا کر پل بھر کو میرے دِل کو تسلی ہوگئی، چلو میں تو بلڈ ٹیسٹ سے بچ گئی، وہ اِس کے قریب کھڑا ہو گیا، پھر کھڑے کھڑے اِس کے بے انتہا قریب ہو گیا، اتنا قریب کہ اَب وہ مجھے علیحدہ سے نظر ہی نہیں آ رہا تھا، ٹاور آف سائیلنس پر رکھی ہوئی لاش کو ایک بڑا بُھوکا گدھ ٹھونگے مار مار کر نوچنے لگا، میرے سارے جسم میں باریک باریک سی سوئیاں چھبنے لگیں اور سانس پھر سے اُکھڑ گیا۔ اوہ، خدایا! ایک مجبور بے بس عورت کے ساتھ اتنا ظلم، غضب خدا کا دِل کی مریض، پھر خطرے کی حالت میں، اتنا اندھیر! اتنی حیوانیت! میں بے بسی سے کروٹیں بدلتی رہی، نیند کے سمندر میں ڈوبتے اُبھرتے رات بیت ہی گئی!۔'' ۱۹؎

محمد یحییٰ خان کے افسانے ''بدماش'' میں محنت کش غبارے بیچنے والے باپ بیٹا اور بیٹی کیرم کلب کے پاس ساحل پر غبارے بیچتے تھے، لیکن ایک روز غنڈے بچی کو زبردستی اُٹھا کر لے جاتے ہیں: ''وہ معصوم روتی، چلاتی، تڑپی، مچلی مگر وہاں کون تھا، جو اُس کی مدد کرتا، کمزور سا لڑکا، دم سادھے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ سب کچھ دیکھ رہا تھا، بے بس، لاچار، نہ آہ نکلی نہ فریاد اور لڑکی اِن وحشیوں کے آگے زندگی ہار گئی۔'' ۲۰؎

''گناہ'' اور ''ابابیل'' میں بشریٰ اعجاز نے گدی نشینوں اور عورتوں کی سنگساری کو موضوع بنایا ہے، ''ابابیل'' کی رقیہ بی بی شاہ صاحب کے بیٹے چھوٹے صاحب کی ہوس پرستی کا شکار ہوتی ہے، شاہ صاحب، جن کے ہاں غریبوں کے لیے لنگروں کا سلسلہ جاری تھا اور مریدوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ تھی، رقیہ کے بڑھتے ہوئے پیٹ نے اُس پر گزرنے والی قیامت کو بے نقاب کر دیا اور پھر ایک روز اُن کے بارے میں ہونے والی سرگوشیاں پورے علاقے میں شور کا طوفان بن

گئیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے شاہ صاحب رقیہ کو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ابابیل تو کنکریوں کے ساتھ ہی ڈھیر بن گئی اور سنگسار کر دی گئی، جس سے ظلم ڈھانے والے کا وقار اور بلند ہو گیا، شاہ جی کو خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا اور گدی نشین بھی ہوئے:

''وہ سارے، جو بے بہرہ تھے، نجانے کہاں سے خالی کندھوں پر شکلیں دھرے چڑھ دوڑے۔ کنکر پکڑے، شعلے اُگلتے، اُن کی قیادت کھوہ والے پیر صاحب کر رہے تھے، جو بے اولاد عورتوں کو صاحبِ اولاد کرنے کے سلسلے میں بہت شہرت رکھتے تھے' دروازے کے سامنے شور بڑھنے لگا، جس میں نمایاں آواز کھوہ والے پیر صاحب کی تھی۔ نکالو باہر اُس فاحشہ کو جو پیٹ میں نجانے کس کا گناہ چھپائی بیٹھی ہے۔ غضب خدا کا اللہ والوں کا بھی شرم نہیں، اُن کے پہلو میں چکلہ کھلا ہے۔'' ۲۱

''آیا'' کے ذریعے قدرت اللہ شہاب نے گھروں میں کام کرنے والی مائیوں، خادماؤں، آیاؤں اور گھر کے مالکان کی زندگی کے سربستہ رازوں کی گرہ کشائی کی ہے کہ کس طرح یہ دونوں طبقات ایک دوسرے کی کمزوریوں اور اخلاقی پستیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ روز محمد دھوبی بھی آیا کو اونچ نیچ سمجھانا چاہتا تھا، در پردہ اُس کی خواہش اپنی ہوس کی آگ بجھانے کی تھی، لیکن ایک روز آیا اپنے حاملہ ہونے کے بارے میں بتاتی ہے، تو سمجھانے لگتا ہے:

''اری چُپ رہ تو نہیں جانتی سالے کوٹھیوں والوں کو، تجھے کان سے پکڑ کر نکال دیں گے، سُور کے جنے، گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، چل تجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا، جو سو پچاس خرچ آئیں گے میں دوں گا، تیری نوکری تو رہے گی میری لاڈو۔'' ۲۲

نیر اقبال علوی کے افسانے ''کمرہ نمبر ۳۲۳'' کی نسرین اپنی یورپین نیشنیلٹی کی بیٹی کو اپنے شوہر کی وفات کے بعد بیاہنے کے لیے پاکستان آتی ہے، لیکن اِسی کا بگڑا ہوا بھانجا رشتے میں ناکامی پر اِس کی بیٹی کو اغوا کر کے دوستوں کے ساتھ درندگی کا نشانہ بناتا ہے۔ گینگ ریپ کی شکار اِس لڑکی کی رپورٹ درج کرانے ماں، جب تھانے جاتی ہے، تو اِسے تمسخر اور طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

''مسز خان! آپ کی بیٹی یورپین مزاج کی آزاد لڑکی لگتی ہے، شاید اپنی مرضی سے اپنے کسی عاشق کے ساتھ چلی گئی ہو؟ پولیس نے، جب نسرین کے زخموں پر نمک چھڑکا، تو وہ تڑپ گئی، بے چاری بے بس تھی، آخر اپنے ایک عزیز کی وساطت سے کچھ رقم دے کر اغوا کی رپٹ درج کروائی اور ماتم کرتی ہوئی اپنی بہن کے گھر آ گئی۔'' ۲۳

مسعود مفتی نے افسانے ''توبہ'' میں زمینداروں کی عیاشیوں کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح عیاشیوں کو اپنا اسٹیٹس سمبل بناتے ہیں اور شراب اور رنڈی بازی کو مردانگی کا جوہر قرار دیتے ہیں:

''رنڈی بازی، تو کھاتے پیتے، زمینداروں کا کلچر ہے، اِسے کوئی بُرا نہیں کہتا۔۔۔ اِن عورتوں کی زندگی کو روزی مل جاتی ہے اور ہماری زندگی کو رنگ مل جاتا ہے، اِن کی بنیادی ضرورت ہمارا ثانوی شغل، بس اِس سے زیادہ، تو کچھ نہیں نا اِس میں!۔'' ۲۴

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''جلسہ'' میں جب بوڑھا مزارع اپنی اکلوتی جوان بیٹی کو بستر پر نہ پا کر ذیلدار کے پاس پہنچتا ہے، تو اُس کے نوکر اُس پر کتے چھوڑ دیتے ہیں، زخمی ہونے کے باوجود بوڑھے نے ذیلدار سے پوچھا کہ میری لڑکی کہاں

ہے،تو اُس نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے:

''میری لڑکی کہاں ہے اور ذیلدار نے بتایا کہ وہ اندر مولوی جی کے پاس ہے اور تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ تیری لڑکی اپنا کنوار پن لٹا کر تیرا چندہ ادا کر رہی ہے۔ بوڑھے نے چیخنا چاہا،مگر ذیلدار کی لٹھ سیدھی اُس کے دماغ پر پڑی۔ چوکیدار اُسے اُٹھا کر باہر گلی میں لے آئے۔۔۔ کہتے ہیں کہ وہ صبح تک مولوی کے چنگل سے نکل کر برساتی نالے کی ایک اندھی کھائی میں بیٹھی رہی۔لوگ اُسے سمجھانے بجھانے آئے،لیکن وہ وہیں پڑی رہی،اُس کے بال کھلے،چولا پھٹا ہوا تھا،اُسے کوئی احساس تک نہ تھا کہ اُس کا سینہ نظر آرہا ہے اور اُس کی پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔دو چار دن کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ کر کہیں چلی گئی۔ کہتے ہیں آج کل وہ لاہور کے چکلے میں بیٹھی ہے!۔'' ۲۵

عورت کو کھلونا سمجھنے والوں کی قدرت اللہ شہاب نے نشاندہی کی ہے کہ کس طرح شادی کا چکمہ دے کر سوشیلا نام کی ہندو لڑکی کو انگریز افسر نے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر گلا گھونٹ کر مار ڈالا،عورت ذات کو اپنے نفس کی بھینٹ چڑھانے والے افسر تبادلہ ہو کر چلا گیا،لیکن اُس کے ظلم کا شکار لڑکی اور اُس کے بچے کی روح اِسی کمرے میں بھٹکتی رہی۔ظلم وقتی طور پر چھپ،تو جاتا ہے،لیکن قدرت کسی نہ کسی طرح اُسے بے نقاب ضرور کرتی ہے،مثلاً ۱۸ سول لائن کی کوشیلا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک روز جب اُس نے شرمیلی دلہنوں کی طرح یہ راز افشا کیا کہ وہ عنقریب ہی ماں بننے والی ہے،تو صاحب بہادر کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے،اُس نے راتوں رات سوشیلا کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالا،جب سوشیلا کا گلا گھونٹا جا رہا تھا،تو عین اُسی وقت اُس کے بطن سے ایک مردہ بچی پیدا ہوئی۔ انگریز افسر نے اُن دونوں لاشوں کو اُسی کوٹھڑی کے کسی کونے میں دبا دیا۔ کہتے ہیں کہ اُس روز سے بچاری سوشیلا کی روح اپنی بچی کی لاش اُٹھائے اِس کوٹھی میں بھٹک رہی ہے۔'' ۲۶

راجندر سنگھ بیدی نے''اغوا''میں ٹھیکیداروں کے مظالم،شوہروں کی خود غرضی اور بھٹہ مزدور خواتین کی بے بسی کا ذکر ہے:

''بلا کی عورتیں تھیں،اُن کی لگائیں،کڑاکے کی سردی میں صرف ایک انگیا یا ایک معمولی سی صدری پہن لیتی تھیں اور چالیس چالیس مکعب فٹ روڑی کوٹ ڈالتیں،اُن کا دودھ بچے پیتے تھے،لہو ٹھیکیدار پیتا تھا اور ہڈیاں خاوند چوڑتے تھے۔'' ۲۷

افسانے''پھندنے''میں مالکوں کے ہاتھوں نوکرانی کو جنسی ہوس پرستی کا شکار بنا کر قتل کر دینے کا ذکر ہے،جب کہ سعادت حسن منٹو کے افسانے''اُس کا پتی'' کی روپا زمیندار کی ہوس پرستی کا شکار ہو جاتی ہے،مادھو جو کہ تانیثی شعور رکھتا ہے، اُس کے فکر و احساس عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے۔روپا بھٹے مالک لالہ گنیش داس کے بیٹے کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی،اگرچہ تمام گاؤں اِس سے نفرت کرتا تھا،لیکن نتھو ہمدردی رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اِس شخص کا نام بتائے،جو اصل گناہگار ہے۔روپا کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اُسے کہتا ہے:

''وہ عورت ہی تو تھی،مندر میں گڑی ہوئی دیوی،تو تھی نہیں اور پھر لوگ خواہ مخواہ کیوں اپنی

جان ہلکان کر رہے تھے، مادھوکا کے لڑکے سے اِس کی شادی ہوئی، تو بھی کبھی نہ کبھی بچہ ضرور پیدا ہوتا، اَب کون سی آفت آ گئی تھی، یہ بچہ جو اسی کے پیٹ میں تھا، کہیں سے اُڑ کر تو نہیں آ گیا تھا۔ شادی بیاہ ضرور ہوا ہوگا، یہ لوگ باہر بیٹھے آپ ہی فیصلہ کر رہے ہیں اور جس کی بابت فیصلہ ہو رہا ہے، اُس سے کچھ پوچھتے ہی نہیں، گویا بچہ وہ نہیں، بلکہ یہ خود جن رہے ہیں۔ عجیب بات تھی اور پھر اُن کو بچے کی کیا فکر پڑ گئی تھی، بچے کی فکر یا تو ماں کرتی ہے یا اُس کا باپ، باپ؟، اور مزہ دیکھیے کہ کوئی بچے کے باپ کی بات ہی نہیں کرتا تھا۔'' ۲۸؎

عصمت چغتائی نے تانیثی احساس کی پیشِ نظر ملازماؤں، نوکرانیوں، خادماؤں اور اُن کی بیٹیوں کو محبتوں کی آڑ میں اپنی ہوس پرستی کا نشانہ بنانے والوں کو موضوع بنایا ہے، مثلاً'' گیندا''، ''اپنا خون''، ''بدن کی خوش بو''، ''چڑیا کی دُکی'' ''دو ہاتھ''، ''زرخرید''، ''سوری ممی''، ''شادی'' اور ''کنواری'' وغیرہ میں عورت کی حیثیت شے سے زیادہ نہیں، جو وقتی تسکین کا سامان بنتی ہے۔ گیندا ایسا ہی ایک کردار ہے، جو چھوٹی بہن کی سہیلی بھی تھی اور خدمتگار بھی، لیکن بھیا نے اُسے ہوس پرستی کا نشانہ بنا کر گود میں بچہ ڈال دیا، بچی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھی، جو بھیا کی گیندا سے دِل بستگی کو ظاہر کرتی تھی۔ گیندا، جب حاملہ ہوئی، تو ماں نے اُلٹا دھتکار دیا، اِس کا بچہ ضائع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن بے سود: ''اے ہے وہ ،تو مارے ڈالتا تھا، بڑی آفتیں اُٹھیں، بیوی نے کہا، میں نے فوراً اُسے دہلی چلتا کیا، پڑھنے والا بچہ! یہ نیچ ذات کمینیاں شریفوں کو یونہی۔۔۔ اور پھر باوجود سانس روک کے سننے کے میں آگے نہ سمجھ سکی۔'' ۲۹؎ ''غیر مشروط محبت'' کا حامد بھی اپنی گھریلو ملازمہ کو محبتوں کے جال میں پھنسا کر، جب لوٹنا چاہتا ہے، تو دِل کی آواز پر کان دھرتا ہے:

''اُس کا خوابیدہ ضمیر جاگ اُٹھا اپنے اندر سے آنے والی آواز نے مخاطب کرتے ہوئے اُس سے کہا: بدبخت ایک مجبور و بے کس عورت، جو کسی کی عزت ہے، اِس کے غریب وفاقہ زدہ بدن کو ہوس کا نشانہ بنانے والے بے شرم! محبتوں کو بے توقیر کرنے والے ظالم، پھر یکا یک وہ کسی گلیشیئر کی ٹنوں وزنی برفوں تلے دبتا چلا گیا، پل بھر میں تپتے ہوئے بدن کی نس نس میں سے اُٹھنے والے شرارے یخ بستہ اور ٹھنڈی راکھ میں تبدیل ہو گئے۔'' ۳۰؎

محمد سعید شیخ کے افسانے ''اسباب'' میں سلطان احمد کا کردار ایک ایسے شخص کا ہے، جو گھریلو ملازمہ کو داشتہ بنا ڈالتا ہے اور بعد میں اُس کی جواں سال بیٹی کو بھی، جو درحقیقت اِس کی اپنی بیٹی ہوتی ہے، اِس کے ساتھ شکوہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

''میں ایسی ماں کی بیٹی ہوں جسے لوگوں کے گھروں میں محنت مزدوری کر کے اپنے ناکارہ خاوند اور بیٹی کو زندہ رکھنا پڑا، وہ اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی، اِس میں، تو اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اپنے نشئی خاوند سے اپنی کوکھ ہی بچا لیتی یا خودکشی ہی کر لیتی۔ تم نے اُسے اتنی ہمت اِس لیے نہیں دی تھی کہ تم نے مجھے اِس کے گھر پیدا کرنا تھا، وہ موت سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی۔۔۔ اور وہ بچی اپنے باپ کو زندہ رکھنے اور ماں کی بیماری کا علاج کرانے کے لیے صرف گھریلو ملازمہ بن کر گزارا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔، تو مجھے اپنے صاحب کی لونڈی بننا پڑا، کیوں کہ اُسے ہی میری کمزوری اور ضرورت کا علم تھا اور مجھے اِس

کی ضرورت کا پتا لگ گیا تھا۔'' ۳۱؎

ناجائز تعلقات اور جسم فروشی کی مختلف صورتیں وہ ناسور ہے، جو معاشرے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جائے تو سماجی روح کو کھوکھلا کر دیتا ہے تو کبھی غربت و افلاس کے ہاتھوں جسموں کے سودے ہوتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی نے ''پان شاپ'' میں غربت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر شرافتوں اور جسموں کے سودے بھی ہو جاتے ہیں:

> ''یہاں سے کبھی کبھی کوئی حسین لڑکی اپنی رومانوی حیات معاشقہ کی عزیز ترین اور آخری نشانی دے کر حسرت کے عالم میں اپنے رونڈے ہاتھ کو مسلتی ہوئی چلی جاتی ہے، اگر ہمارے ہاں سنہری زلفوں کی کوئی قیمت ہوتو یہ حریص آدمی اُن کو بھی گروی رکھ لیا کریں۔'' ۳۲؎

محمد حمید شاہد کے افسانے ''نئی الیکٹرا'' میں ریاستی جبر کی شکار لڑکی کی داستان علامتی انداز میں رقم کی گئی ہے:

> ''پُرانی والی الیکٹرا نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ اُس کے ہاں بچہ ہو چکا ہے، جب کہ اُس نے یعنی نئی الیکٹرا نے ڈھونگ رچایا تھا کہ اُس کے پیٹ میں بچہ ہے اور بچہ اِس قدر نیچے کھسک آیا ہے کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے، لوگ کہتے ہیں: وہ الیکٹرا نہیں، کلائمنسٹرا ہے، دغاباز، فریبی، مکار، یوں بھی حمل کسی قسم کا ڈھونگ رچانے سے بھلا کب باز رکھ سکتا ہے۔'' ۳۳؎

سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''اللہ دتا'' سماجی ناسوروں کی نقاب کشائی ہے، جو محرمات کے ساتھ جنسی تعلقات اُستوار کر لیتے ہیں یا جبراً اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ ''اللہ دتا'' اپنے بھائی اللہ رکھا کی وفات کے بعد اُس کی بیٹی صغریٰ کو اپنی بہو بنا لاتا ہے، اللہ دتا کی بیوہ بیٹی زینب سلائی کا کام کر کے باپ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ دونوں بھائیوں کی اکلوتی بیٹیوں کا تقابل اِس طرح پیش کیا ہے۔ اللہ دتا اپنی بیٹی زینب سے ناجائز تعلقات اُستوار کیے ہوتا ہے اور جب اُس کی بھتیجی اُس کی بہو بنتی ہے، تو اُسے بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی، لیکن صغریٰ اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہوگئی:

> ''زینب نے اپنے شہید شوہر کو کبھی یاد نہیں کیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں، وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی، بعض اوقات وہ اُس سے لپٹ جاتی تھی، طفیل کے سامنے بھی اور اُس کو خوب چومتی تھی، صغریٰ اپنے باپ سے ایسے پہل نہیں کرتی تھی، اگر ممکن ہوتا، تو وہ اُس سے پردہ کرتی، اِس لیے نہیں کہ وہ کوئی نامحرم تھا، نہیں، صرف احترام کے لیے، اِس کے دِل سے کئی دفعہ یہ دعا اُٹھتی تھی، یاپروردگار، میرا باپ میرا جنازہ اُٹھائے۔'' ۳۴؎

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''فیشن'' کی نجمہ اپنے گھر کے سامنے رہنے والے لڑکے سے خط و کتابت حلیمہ کے ذریعے کراتی ہے اور لڑکے کے بارے میں بھی نجمہ کو بتاتی ہے۔ نجمہ کے فیشن کے کپڑے حلیمہ کو بھی عنایت ہوتے اور وہ پہن کر اُچھلتی کودتی اُس کے نامے لے کر پہنچاتی۔۔۔ اور خود بھی نجمہ کے محبوب کی ہوس پرستی کا شکار ہوگئی، لیکن جلد ہی حلیمہ کی ماں پر اِس کا راز افشا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے لے کر چلی جاتی ہے۔ کافی مہینوں کے بعد حلیمہ کی واپسی ہوتی ہے، تو اُس کی گود میں دو ماہ کا بچہ ہوتا ہے، جو نجمہ کے محبوب شیخ منصور کی ہوس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حلیمہ کے ذریعے قاسمی نے غریبوں کی عزتوں سے

کھیلنے والے نام نہاد شرفا کو بے نقاب کیا ہے، جن کے کردار معاشرے کی نظر میں، تو اچھے ہوتے ہیں، لیکن قدرت کی سزا، اُنھیں اُن کے ضمیر کی عدالت میں گھسیٹتی ہے۔ شیخ منصور کا جُرم اُس کے بچے کی صورت میں تا دمِ حیات اُسے بے نقاب کیے رکھتا ہے۔ ''رئیس خانہ'' کا فضلو اور اُس کی بیوی مریاں، جو بے انتہا خوبصورت ہے۔ غیرت منداور خود دار ہے۔ رئیس خانہ کے صاحب جن کی بیوی شادی کے ایک برس بعد مرجاتی ہے۔ فضلو کو عورت لانے کا کہہ ڈالتا ہے۔ فضلو جتنی عورتوں کو صاحب کے پاس لے گیا تھا وہ صبح ایک سو روپے ہاتھ میں تھامے صحیح سلامت باہر آئیں، تو فضلو صاحب کا معتقد ہو گیا اور اُس کی پارسائی کے گُن گانے لگا۔ ایک روز صاحب، جب مریاں کی جھلک دیکھتا ہے، تو بیوی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور فضلو سے اُسے بنگلے میں آنے کی دعوت دیتا ہے، لیکن مریاں کے انکار پر فضلو کو محسوس ہوتا ہے، جیسے اُس کے تین سو روپے چولہے میں چلے گئے۔ فضلو کے اصرار پر کہ تمھاری قسم کھا کر کہہ چکا ہوں کہ وہ تو چھوتا تک نہیں، بس دیکھتا ہے اور سو روپے دے کر سو رہتا ہے، اِس پر مریاں شرط لگاتی ہے کہ اگر صاحب نے اُسے چھوا، تو پھر جہاں وہ چاہے گی جائے گی اور وہ اُسے نہیں روکے گا۔ مریاں کے ساتھ وہی ہوا، جس کا اُسے ڈر تھا:

> ''تم شرط ہار گئے ہو حرامزادے، اُس کی آواز بھرا آگئی، پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کمینے، ذلیل، وہ مجھے لوٹ لے گیا، اُس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا، رات بھر وہ مجھ سے چمٹا رہا، اُس نے مجھے نوچا، کھسوٹا، اُس نے میرے گال چاٹ ڈالے اُس نے، وہ بولتی گئی تم شرط ہار گئے، لیکن وہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو، کہیں سے عزت، آبرو بکاؤ ملے، تو چٹکی بھر خرید کر رکھ لینا، کیوں کہ آج سے تم پرلے درجے کے بدذات، کمینے اور کنجر ہو گئے ہو؟ سمجھے؟ اور اب میں جارہی ہوں میں جہاں کہیں بھی جارہی ہوں تمھیں اِس سے واسطہ نہیں میں اَب کسی کی نہیں رہی، تم نے میرا غرور توڑا، تم نے میرا سب کچھ لٹوا دیا ہے حرامزادے۔'' ۳۵

قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''پکے پکے آم'' میں گلابو مہتر اپنی بیٹی نھیا، جس کی عمر بارہ برس ہے اُسے کمائی کا ذریعہ بنانے کے لیے خانساماں کی منت سماجت کرتا ہے۔ خانساماں انکار کر دیتا ہے: ''تخمِ خنزیر، ابھی اِس کا عمر بارہ برس ہے، تم اِس کو کیسے تیار بولتا ہے؟ دو برس اور صبر کرو۔ قانون میں لڑکی ۱۴ برس سے پہلے بالغ نہیں ہوتا۔'' ۳۶

منشی پریم چند کے افسانے 'کفن' میں سماجی بے حسی اور مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں استبداد و استحصال کی شکار بے بس حاملہ عورت کے دردِ زہ میں مبتلا ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کا نوحہ پیش کیا ہے۔ غریبوں کی اِس بستی میں مادھو اور گیسو کے گھر کی عورت کا ایک ایک لمحہ اِن دونوں باپ بیٹوں کے پیٹ کا دوزخ بھرنے میں صرف ہوتا ہے، جہاں کہیں بیٹے کا احساس بیدار ہونے لگتا ہے، تو باپ اُسے تسلیاں دے کر سُلا دیتا ہے، جب گاؤں والے روپیہ پیسہ اکٹھا کر کے دیتے ہیں، تو دونوں فیصلہ کرتے ہیں کہ لکڑیاں، تو اکٹھی ہو ہی جائیں گی، کفن ضروری چاہیے، جب بازار میں پہنچتے ہیں بھوک ستاتی ہے، تو کفن کے پیسوں سے پوڑیاں، حلوے، شراب اور دیگر کھانے کی چیزیں لے کر اُڑاتے ہیں اور غل غپاڑے کرتے ہیں۔ یہاں مادھو اور گیسو معاشرے کے وہ مکروہ کردار ہیں، جو چل چلاؤ پر یقین رکھتے ہیں، وہ آخری سانس تک سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، جب تک اُس کے سانس کی ڈور ساتھ دیتی ہے، یہ بھی جان کا روگ بنے رہتے ہیں، لیکن اِن کے اغراض کے اندھے کنویں بھرنے کا نام نہیں لیتے، روز مرہ زندگی میں ہر سطح پر مادھو اور گیسو جیسے ناسور دکھائی دے جاتے ہیں:

"لے جا، کھوب کھا اور اسیر باد دے، جس کی کمائی ہے، وہ تو مرگئی، مگر تیرا اسیر باد اُسے ضرور پہنچ جائے گا، روئیں روئیں سے اسیر باد دے، بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔۔۔ بیکنٹھ میں جائے گی دادا، بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔۔۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر گئی، وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی، تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں، جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ دھونے کے لیے گنگا میں نہاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔" ۳۷

سعادت حسن منٹو کے افسانے "ایک زاہدہ، ایک فاحشہ" کی برقعہ پوش مسافر عورت ظاہر و باطن کے شدید تضاد کا شکار ہے۔ گاہکوں کی گھیرنے والی یہ عورت اپنی نیکی ظاہر کر کے شکار پھانستی ہے:

"بیٹھ جاؤ اور بی بھابی سے باتیں کرو۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں، میں بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا، اِس لیے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی، جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔" ۳۸

خدیجہ مستور کے افسانے "لاشیں" انتہائی غریب طبقے کے کچے گھر کا گیارہ لاشوں میں ایک بڈھا بڑھیا، آٹھ لڑکیاں اور پچیس چھبیس سال کا مدقوق لڑکا، نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو لباس۔ انتہائی خستہ حالت میں زندگی کے دن بتا رہے تھے۔ سارا سارا دن اُن کے ہاں چولہا نہ جلتا تھا۔ شام کو لڑکا، جو کچھ لاتا، پکتا اور مل بانٹ کر کھاتے۔ کسمپرسی کے عالم میں پلنے والی یہ روحیں اپنی زندگیوں کا شعور، جسم کی قیمت سے لگا کر کرتی ہیں اور دوسروں کی بربادی کے ساتھ ساتھ اُن کے گھروں کو بھی لوٹ لیتی ہیں۔ "خرمن" کا دین محمد اپنی بیوی سکینہ کا عاشق ہے، جس نے اِس کی خاطر پورے زمانے سے ٹکر لی ہوتی ہے، حتیٰ کہ اِس کا عاشق بھی زہر کھا کر مر جاتا ہے، لیکن سکینہ دل و جان سے دین محمد کی ہی رہتی ہے، اَب جب کہ سکینہ لا علاج مرض کا شکار ہو کر بستر کی ہو رہتی ہے، تو یہی مرد گھریلو اُمور کی انجام دہی کے لیے چھ ماہ کے لیے کنیز نامی عورت سے نکاح کرتا ہے اور بیوی کی موت پر اُسے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیتا ہے۔ خدیجہ مستور کے افسانے "چیلیں" کی سندریا اور اُس کا نوعمر بھائی ماں باپ کی موت کے بعد بالکل بے سہارا ہو گئے تو گاؤں کے کرتا دھرتاؤں کے لیے سندریا جیسی بے سہارا لڑکی ہمدردی کا سبب تھی۔ ہر کوئی اپنی حریصانہ نظروں سے اُسے تولتا ہے اور اخلاقیات کے نام پر اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے، گویا لاوارث لڑکی پر گاؤں کے لوگ چیلوں کی طرح منڈلاتے ہیں:

"اگر آپ یہاں سال دو سال بعد پھر آئیں گے، تو اسی سندریا کو تمام دن دو ایک پیسے پر کسی کھیت میں یا کسی گھر میں مزدوری کرتے دیکھیں گے اور ایسی ہی تپتی ہوئی دوپہروں اور خاموش راتوں میں سلو اور لالاجی جیسے نہ معلوم کتنوں کو اُس کی جھونپڑی کے گرد گھومتے دیکھیں گے، اوہ! آپ چونک کیوں پڑے۔۔۔ اچھا جوتوں کی چُرمر کچھ عجیب لگ رہی ہے آپ کو؟ وہ جو سر پر سرخ چار خانے دار انگوچھا ڈالے آرہے ہیں وہ مولوی جی ہیں، اِس گاؤں کے۔" ۳۹

یونس جاوید کے افسانے "کانچ کا پُل" کی تجلی جوان ہو کر اپنی جوانی آٹے اور چاول کے عوض بیچ دیتی ہے:

''چاچا نے اِسے روشن کے گھر سے دھان اور مچھلی کا تھیلا اُٹھا کے نکلتا دیکھا اور تیسری دفعہ اُس وقت دیکھا، جب وہ ٹھیک طور پر چل بھی نہ سکتی تھی، اِس کے پاس اَب کئی بڑی بڑی ساڑھیاں تھیں، مگر اتنی بڑی ساڑھی کوئی نہ تھی، جس سے وہ اپنا پیٹ چھپا سکتی، اُس کی ماں نے معراج چاچا کے پاس آ کر دونوں ہاتھوں کو دو بالشت بھر پھیلا کر کہا تھا' روشن نے اتنا دھان دیا ہے' چاچا نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ کر وہیں روک لیا اور حیرت سے بولا، اتنا دھان، ہاں اتنے بڑے پیٹ کے لیے اتنا ہی دھان چاہیے۔'' [۴۰]

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''لاجونتی'' میں بٹوارہ کے دوران زخمی ہونے والی عورتیں عصمت دری سے، جن کی روحیں پژمردہ ہوگئی تھیں، اُن کو درپیش مسائل کا نمائندہ افسانہ ہے، ''سارا گام کے بھوکے'' اور ''کلیانی'' بھی میں ہجرت کے دوران لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں بچ جانے والی عورتیں پیشہ کے لیے جسم فروشی پر مجبور کر دی گئیں:

''اندر کے صحن میں آنے والے مرد کی صرف چھایا ہی نظر آتی، جس سے معاملہ پٹاتی لڑکی اُسے اندر لے جاتی، پٹھانی اور اک بار ضرور باہر آتی، نل پر سے پانی کی بالٹی لینے، جو صحن کے عین بیچوں بیچ لگا ہوا تھا اور دونوں طرف کھولیوں کی طرح طرح کی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ پانی کی بالٹی اُٹھانے سے پہلے لڑکی ہمیشہ ہمیشہ اپنی دھوتی، ساری کو کمر میں کستی اور گاہک لگ جانے کی اکڑ میں کوئی نہ کوئی بات اپنی ہم پیشہ بہن سے ضرور کہتی۔اے گرجا، جرا چاول دیکھ لینا میرے گاہک لگا ہے، پھر وہ اندر جا کر دروازہ بن کر لیتی۔'' [۴۱]

محمد یحییٰ خان کے افسانے ''شہزادہ مندراں والا'' میں طوائفوں کے چنگل میں پھنسنے والوں کا المناک انجام دکھایا ہے، گلیمر کی چکا چوند وقتی طور پر لذت کا سامان پیدا کر دیتی ہے، لیکن اِس کے بُرے اثرات رہتی دُنیا تک چھوڑ جاتی ہے، انھی شرفا کی بیٹیاں بازار کی زینت اور بیٹے دلالوں کا روپ دھار لیتے ہیں:

''وہی شیخ صاحب جنھیں تم میرے ساتھ دیکھ چکے ہو، جن کی بیوی بقیدِ حیات ہے، دو جوان بیٹیاں اور ایک بیٹا موجود ہے۔۔۔ میرے باپ سے بڑی عمر کا شخص میری ماں کا گرویدہ بھی رہ چکا ہے، اب میں اپنی ماں کو کیا کہوں کہ ماں، تو ماں ہی ہوتی ہے، چاہے وہ میری ماں جیسی ماں ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ میں اپنے آپ کو جانتی ہوں، جواب زندہ رہ کر بھی زندہ نہیں، خوش قسمت تھے، جو ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے ورنہ شاید اُنھیں زندہ رہ کر بھی کئی بار مرنا پڑتا، مگر میرے دادا بھی زندہ ہیں، بڑے نام، عزت وقار والے۔۔۔ مگر میرے وجود اور ناتے سے بے خبر ہیں میرے پاس اپنے مرحوم والد کی تصویریں، خط اور چند کپڑے بھی موجود ہیں۔ چند ثبوت بھی کہ میں اُن کی بیٹی ہوں، مگر اپنی زبان سے مجھے بیٹی کہنے والا باپ موجود نہیں، وہ مجھے میری ماں کی کوکھ میں رکھ کر خود قبر کی کوکھ میں اُتر گیا۔ میں اگر اِس کی منکوحہ بیوی کے ہاں پیدا ہوئی ہوتی، تو سیدانی کہلاتی، مگر ایک غیر منکوحہ طوائف کے ہاں پیدا ہوئی، تو حرام زادی کہلائی۔۔۔ اس میں میرا کیا قصور؟ میری رگوں

میں دوڑتا ہوا خون میرے لیے، بہت بڑا عذاب ہے۔'' ۴۲؎

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''رئیس خانہ'' میں ایسی عورتوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو چند سکوں کی خاطر اپنا آپ بیچ دیتی ہیں:

''مریاں جیسی عورتیں ذرا کم ہی ملتی ہیں، یہاں، تو پردہ نہیں کرتیں، مگر پھر بھی ایسا پردہ کرتی ہیں کہ کوئی دیکھ لے، تو خود بے پانی پانی ہو جائے اور وہ سرائے کے بھٹیارے کی رانی خوبصورت ایسی کہ لٹھے کے تھان کی مورت اور ندیدی ایسی کہ اٹھنی دکھاؤ تو بھوکی کتیا کی طرح بھاگی آئے اور پھر یہ مسافر عورتیں، جو سروں پر پوٹلیاں رکھے سڑک پر سے گزرتی ہیں اور کنواریاں جن کی مدت تک شادیاں نہیں ہو سکتیں، مارے غریبی کے اور یہ بیاہی عورتیں، جن کے شوہر ہانگ کانگ پولیس میں ہیں اور پانچ سال کے بعد ہی تین مہینے کے لیے گاؤں کا چکر لگا پاتے ہیں، جب کہ اُن کی بیویاں گاؤں کی بوڑھی دایہ کو چار بار انعام دے چکی ہوتی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ آدمی ایسا بھی بزدل نہ ہو کہ عورت کا نام سنا اور گھڑوں پڑ گیا۔'' ۴۳؎

خدیجہ مستور کے افسانے ''راستہ'' میں غربت کے ہاتھوں جسم فروشی کرنے والی عورت کا قصہ ہے، جو رات کی تاریکی میں ایک غیر مرد کا ہاتھ اپنی دم کا کہہ کر تھام لیتی ہے اور سارا راستہ فرضی بچوں کی باتوں میں گزار دیتی ہے، اِس اُمید پر کہ مرد کا دِل اس کی طرف مکمل طور پر مائل ہو جائے اور دوسری طرف مرد جو عشق میں ناکامی کے باعث غیر عورتوں کا رسیا ہوتا ہے۔ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ بھلا ایک عورت کو اپنا شوہر پہچاننے میں کیسے غلطی ہو سکتی ہے۔ عورت ذو معنی انداز میں اپنا حالِ دل بیان کرتی ہے:

''تم بتاؤ اگر میرا بھائی اپنی ماں، بہنوں کا بار نہیں اُٹھاتا، تو اِس میں میرا کیا قصور ہے، سب بھوکے مرتے ہیں، تو مر جائیں، میں تمھاری کمائی کا ایک دھیلا بھی اُن کو نہ دوں گی، اگر تمھارے پاس بہت دولت ہوئی، تو شاید میری وجہ سے اُن کو سنبھال لیتے، مگر اتنا ہے ہی نہیں، پھر یہ بھی، تو سوچو کہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اتنے بہت سے لوگوں کا بار اُٹھاتا پھرے، اتنے بہت سے بیمار اور بھوکے لوگ بھر گئے ہیں اِس گھر میں پتہ نہیں میں اِن سب کے ساتھ کیسے رہتی ہوں، جی نہیں چاہتا کہ یہ سب مر جائیں، اپنوں کی محبت اندھی ہوتی ہے نا؟۔'' ۴۴؎

منٹو جہاں عورت کو طوائف کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ وہاں اُس کا ایک روپ اور بھی، جس کے تحت عورت جسم فروشی کے پیشِ نظر ایسا کرتی ہے، یعنی اُس کا جبلی جذبہ حاوی آ جاتا ہے، مثلاً ''جانکی''، ''رومی لڑکی''، ''شانتی''، ''فوجابائی''، ''موذیل''، ''بابو گوپی ناتھ''، ''پری''، ''سونورل''، ''شاداں''، ''قادرا قصائی''، ''میرٹھ کی قینچی'' اور ''سرکنڈوں کے پیچھے'' وغیرہ اِس ضمن میں اہم ہیں، اِن افسانوں میں عورت کی نفسیات کی مختلف گرہوں کو کھولا ہے، جب کہ افسانہ ''جھمکے'' میں چرنجی کی بیوی جھمکے لینے کی خاطر اپنے تن کا سودا کر لیتی ہے:

''میں تمھارے پاس اس لیے آتی ہوں کہ وہ چلا گیا ہے، اَب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، جس طرح میری لُٹی ہوئی آبرو واپس نہیں آئے گی، بولو مجھے پناہ دیتے ہو، تمھیں اُس پاپ کا واسطہ دے کر التجا کرتی ہوں کہ جو تم نے اور میں نے دونوں نے مل کر کیا ہے کہ مجھے پناہ دو، بچوں کا باپ چرنجی کی بیوی کی سب التجائیں سنتا ہے، مگر وہ کیسے اِس عورت کو پناہ دے

سکتا ہے، جس نے اپنے آپ کو جھمکوں کے بدلے بیچا، ایک سودا تھا، جو ختم ہو گیا، چرنجی کی بیوی کو یہ سُن کر بہت صدمہ ہوتا ہے، ناکام و مایوس ہو کر وہ چلی جاتی ہے۔'' ۴۵

مسعود مفتی کے افسانے ''نابینا'' میں تازی اپنے شوہر اسلم کے نابینا ہونے پر اُس سے متنفر ہو جاتی ہے اور سراہے جانے کا احساس اِس میں شدید تر ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک شادی شدہ مرد کی لچھے دار باتوں کی اسیر ہو کر اِس سے خفیہ میل ملاقاتیں کرتی ہے، بالآخر اپنے شوہر سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیتی ہے، لیکن اُس کا شوہر نابینا ہونے کے باوجود اُس کی کیفیات بھانپ کر اُس کے کہنے سے پہلے ہی اِس مطالبے کا ذکر کرتا ہے، بیوی کے استفسار پر بتاتا ہے:

> ''اور جب تم اُس سے ملنے جاتی تھی۔۔۔ تو مجھے پہلے سے ہی پتہ چل جاتا تھا، کیوں کہ اُس دن تم ہر مرتبہ وہی خوشبو لگا کر جاتی تھیں، جو شاید اُسے بہت پسند ہے۔۔۔ اور ہر دفعہ واپسی دیر سے ہوتی تھی، جس کا نیا بہانہ ہوتا تھا، کبھی دوکان بند ہونے کے قصے۔۔۔ کبھی ٹریفک بند ہونے کا قصہ۔۔۔ کبھی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہونے کا قصہ۔۔۔ میں خاموشی سے یہ سب سُنتا اور تمھارے جانے سے پہلے، جو کپڑے سرسراتے تھے، واپسی پر اُن کے کچلے جانے کی وجہ سے اُن کی سرسراہٹ غائب ہو جاتی تھی۔'' ۴۶

شادی بیاہ کے دھوکے میں آ کر یا کسی کے دامِ اُلفت کے فریب میں اُلجھ کر، جو لڑکیاں گھروں کی دہلیزیں پار کرتی ہیں۔ زندگی اِن کے لیے تلخ تر ثابت ہوتی ہے، اِس حوالے سے بانو قدسیہ کے اہم افسانے ''شاہراہ''، ''حجاب''، ''دانت کا دستہ'' اور ''توبہ شکن'' وغیرہ ہیں، اِسی طرح ''کاغذی ہے پیرہن'' کی سعدیہ کی آزاد فکری اور بے حجابی کی غماز ہے، لیکن اس کی ٹھٹھول بازی کسی قانون و قاعدے اور ضابطۂ اخلاق کو نہیں مانتی۔ سعدیہ کہ ہر درجہ التفات سے اِس کے دیور کے ذہن میں پراگندہ خیالات مجتمع ہونے لگے، یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر وہ ذہنی طور پر اپنے بھائی کی موت اور بھابی کے اغوا کے منصوبے بناتا رہتا، جب دیور کی شادی ہوتی ہے، تو بھابی بھی خاصی پریشان ہوتی ہے اور اقرار کرتی ہے: ''میں سمجھتی تھی کہ مجھے تمھارے جسم سے پیار نہیں۔۔۔ تھا، لیکن یہ جھوٹ نکلا، لیکن یہ جھوٹ نکلا۔۔۔ تم آہستہ سے بولیں، اگر یہ سچ ہوتا، تو آج مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی، بھلا آج تک مجھے کیا حاصل تھا، جو چھن رہا ہے اور پھر بھی۔'' ۴۷ بانو قدسیہ کے افسانے ''پریم بولی''، ''نقل مکانی'' کرپٹ عورتوں سے متعلق ہیں، اِسی طرح ''بیوگی کا داغ'' کی عائشہ، جب روزمرہ اُمور کی انجام دہی کے لیے ماسٹر صاحب کی ہمدردیاں وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور ماسٹر صاحب بھی بڑی تندہی و شرافت سے اِس کے کام کر دیتے ہیں، بدلے میں اِس کے ہاں سے چائے پینا اور کھانا کھانا اِن کا معمول بن جاتا ہے، یہ بیوہ ماسٹر جی سے اپنے کام کو نکلواتی رہتی ہے اور بہانے سے اخراجات بھی پورے کرتی رہتی، حتیٰ کہ اِس کے بچے جوان ہوتے ہیں، لیکن جب اِس کی بیٹی نیلوفر کالج سے دیر سے گھر آنے لگی، کیونکہ بچپن ہی سے اُس نے دیکھا تھا کہ اِس کے گھر میں غیر مرد کا آنا جانا تھا، لڑکوں کے ساتھ گھومنا اور سینما جانا اِس کا معمول بن گیا تھا۔ ایک روز رات گئے کوئی لڑکا اُسے چھوڑنے آیا، تو ماں نے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ کر پوچھا، تو اِس نے نہایت ڈھٹائی سے جواب دیا:

> ''میری سہیلی کا بھائی ہے ماں اور تیرے ساتھ کیوں آیا تھا، میری زندگی بھر کی قربانیوں کا صلہ تو نے یہ دیا بے حیا'، 'کیسا صِلہ ماں؟'' نیلوفر کندھے چھڑاتی ہوئی بولی 'میں نے تیرے

لیے سارے سکھ قربان کیے، اپنا آرام کبھی نہ دیکھا، ساری مسرتوں سے منہ پھیرا، تاکہ
۔۔۔تو اندھیرے میں ماں کا نام روشن کرتی پھرے۔ نیلوفر کے چہرے پر گہری زہر خند
ابھر آئی، وہ پلنگ پر بیٹھ گئی اور چبا چبا کر بولی' ماں میں، تو اندھیرے میں منہ روشن کرتی
ہوں تجھے تو اتنی بھی شرم نہیں، وہ جو تو پارسا بنتی ہے ماں مجھے اچھی طرح علم ہے، مجھے تو تیرا
لحاظ تھا ورنہ وہ بھی ماسٹر جی کی طرح کبھی ہمارے گھر کا فرد بن جاتا، میرا تو ارادہ شادی کا
ہے ماں اور تو مجھ پر الزام دھرتی ہے کبھی، اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا ہے،؟ ماسٹر
جی کے علاوہ کبھی میرا باپ بھی وہاں نظر آیا ہے تجھے۔'' ۴۸؎

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانے'' روشنی کی لکیر'' میں ایسی عورتوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جو نشہ باز شوہروں اور بگڑی اولادوں کے ہاتھوں تنگ آ کر جسم فروشی کا دھندا کرنے لگتی ہیں۔ شرافتوں کے لبادوں میں چھپے ہوئے ایسے گھرانے اپنے روزمرہ ضروریات اور اکثر صورتوں میں سامانِ تعیش کی خاطر یہ مکروہ دھندا کرتے ہیں:

'' معاً میری سوچ زقند بھر کے دوسرے پڑوس میں پھلانگ جاتی ہے، جہاں ایک طوائف
خفیہ طور پر روزانہ دو تین گاہکوں کو نمٹاتی ہے اور اپنے ناتواں اور کمزور شوہر کے نشے پانی کا
بندوبست کرتی ہے اور جب ایک بار پورے ایک ہفتے تک کوئی گاہک میسر نہ آ سکا تھا، تو وہ
رات کے اندھیرے میں میرے پاس آئی تھی کہ کچھ روپے اُسے، اِس کے جسم کے عوض
دے دوں اور جب میں نے جسم کے بجائے ویسے ہی اُسے دینے چاہے، تو وہ مجھے ایک
غلیظ سی گالی دے کر روپے میرے منہ پر مار کر چلی گئی تھی، اس کے بعد سے آج تک اُس
نے میرے گھر کا رُخ نہ کیا۔'' ۴۹؎

محمد حمید شاہد کے افسانے 'بر شور' کا بوڑھا بیوی کی وفات کے بعد بچی کا نام ماں کے نام پر رکھتا ہے اور پھر ایک مسجد بچی کے نام سے تعمیر کرواتا ہے۔ مسجد کی تعمیر کے لیے قرض اُٹھانا پڑتا ہے، لیکن رقم کے تقاضے پر اس کی بیٹی اس سے چھین لی جاتی ہے:

''ترین، کیوں تماشا بناتے ہو، تم نے پچھلے سات سالوں میں جتنی پے منٹ مانگی میں نے
دی۔۔۔ میں نے دی نا؟۔۔۔ دیکھو میں نے تمھاری بیٹی سے اتنے شریف لوگوں کے
سامنے نکاح کیا۔۔۔ اَب باقی قرض میں خدا اور رسولؐ کے نام پر تمھیں معاف کرتا
ہوں۔۔۔ خدا اور اُس کے رسولؐ کے نام پر، پھر وہ 'ہائے نور' کہتا مسجد کی سمت بڑھا اور
ایک ستون کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر جھنجھوڑنے لگا، جیسے پوری مسجد کو کھسکا کر کہیں لے
جانا چاہتا ہو، حتیٰ کہ وہ نڈھال ہو گیا بے بسی سے ستون سے سر ٹکرایا اور کہا' کاش میں تمھیں
بیچ کر نور، اپنی نور کو بکنے سے بچا لیتا۔'' ۵۰؎

محمد سعید شیخ کے افسانے'' فالتو آدمی'' میں غربت ختم کرنے کی خاطر جسم فروشی کرنے والی لڑکی کی زندگی کو موضوع بنایا ہے:

'' میرے گھر کی ضرورتیں ہیں کہ بیمار اماں کے لیے دوائیاں چاہییں، جو سرکاری ہسپتالوں
سے بھی نہیں ملتیں، میرے باپ کو ہر روز نشے کے لیے دو سو روپے چاہیں، کیوں کہ میں

جانتی ہوں کہ وہ نشے کے بغیر مر جائے گا، میں ماں کو کہتی ہوں، اِسے مرنے دو، وہ کہتی ہے نہیں میں بیوہ نہیں ہونا چاہتی، میری ایک جوان بیٹی ہے اور میرے چھوٹے سے گھر میں بجلی کا بل، میں ادا کرنا ہے، کل آخری تاریخ ہے، میری ماں دمہ کی مریض ہے اُسے ہوا چاہیے، پنکھا چاہیے، بجلی تھوڑی دیر کے لیے بند ہو جائے، تو اُس کی جان اُس کی سانسوں میں اٹک جاتی ۔۔۔ آپ آج نہ ملتے، تو کسی بھی دوسرے شخص کو اپنا جسم کا لمس بیچنے پر تیار ہو جاتی، چاہے وہ مجھے کتنا بھی غلیظ نظر آتا۔'' ۵۱؎

اِسی طرح ''دورنگا'' کے کردار کے ذریعے شہاب نے ایسی مکروہ شخصیات کو بے نقاب کیا ہے، جو بظاہر شرافتوں کے خول چڑھائے ہوئے ہیں، لیکن اُن کے باطن غلیظ اور لتھڑے ہوتے ہیں، اُن کی ذات کے چور دروازے اکثر جنسی تسکین کا سامان کیے رکھتے ہیں۔ ایسے مکروہ انسان، جو عورت کو محض برتنے کی چیز سمجھتے ہیں، ایک طرف اپنے بیوی بچوں کو دھوکے میں مبتلا رکھتے ہیں اور بظاہر مخلص اور محبت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور درپردہ عورتوں سے تعلقات اور دوستانے گانٹھتے ہیں، ایسے لوگوں کے کرتوت بہت جلد منظرِ عام پر آجاتے ہیں، چھپتے نہیں ہیں اپنی دانست میں وہ خود کو بڑا کامیاب، چالاک ہوشیار اور باذوق انسان متصور کرتے ہیں۔ ایسے ناکام لوگ اپنی عورت کے لیے کسی عذابِ الٰہی سے کم نہیں ہوتے۔ دوسری طرف وہ بھی وحشی مرد ہیں، جو دولت کی خاطر اپنی بہنوں بیٹیوں اور بیویوں کو دوسرں کے تعیش کا سامان بناتے ہیں:

''ایک روز جب امام بخش چپڑاسی کے سامنے زندگی، موت اور روزی کا مسئلہ درپیش تھا، تو اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنی نو برس کی محمودہ کو انجینئر صاحب کے کمرے میں دھکیل دیا۔ محمودہ دیر تک انجینئر کے منہ پر کالے اور سفید داغوں پر انگلی پھیر کے ہنستی رہی اور پھر تالیاں بجا بجا کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگنے لگی۔ آہا جی، تم ننگے ہو گئے، میں ابا کو بتاؤں گی، آہا جی تم ننگے ہو گئے۔'' ۵۲؎

مسعود مفتی کے افسانے ''بڑے باپ کی چھوٹی بیٹی'' میں معاشرے کے اُن بے غیرت اور بے حس افراد کا ذکر کیا ہے، جو عہدوں، ترقیوں اور زمین و جائیداد کے حصول کے لیے اپنی بہنوں، بیٹیوں، بیویوں کو رات گزاری کے لیے افسران کے پاس بھیج دیتے ہیں، مذکورہ افسانے کا چوہدری بھی ایسا ہی کرتا ہے؛

''مگر لڑکی، میرا مطلب ہے بعد میں کوئی بدمزگی نہ ہو، لڑکی تو، راضی ہے نا۔' چوہدری صاحب مسکرائے کرسی کی پشت پر پھیل کر بولے' بڑی سگھڑ بیٹی ہے جی، خدمت کرنا جانتی ہے، وہ رُکے، پھر لیڈر کے چہرے پر بے یقینی کی پرچھائیں دیکھ کر دوبارہ آگے جھک کر سرگوشی میں بولے ایک آدھ خاص دوست کا پہلے بھی اسی طرح علاج کر چکی ہے۔'' ۵۳؎

''موم کی مریم'' میں جیلانی بانو نے سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کو موضوع بنایا ہے اپنے جذبات اور احساسات کی توہین کے بدلے عورت، جو انتقامی رویہ اختیار کرتی ہے، خواہ یہ استحصال فردِ واحد کا ہو یا افرادِ معاشرہ کا ردِ عمل یا تو اپنی ذات کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے یا سماجی رواج کی شکست و ریخت کی صورت میں افراد و معاشرہ بنتے ہیں:

''مگر یہ کتنا بڑا خزینہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو ٹکوں کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ

پر کالک مل لی تھی، تا کہ اُن کے سفید دامن سیاہی سے ملوث نہ ہوں۔۔۔تم میری بہت عزت کرتی تھیں۔۔۔ایک نوجوان مرد کی۔۔۔جو تمھارے ذرا سے سہارے سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔۔۔جس نے تمھاری اٹھارہ سال کی زندگی میں مسلسل فریب دیے تھے، جس نے تمھیں منزل کے قریب لا کر بھٹکا دیا تھا۔۔۔بدنامی کی کوٹھڑی میں دھکیل کر ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر تم نے اپنی رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں اور بیچ چوراہے اپنے ظاہری لباس اُتار ڈالے، وہ تو خیر ہوئی کہ تم میری عزت کرتی رہیں اور میں تمھیں سمجھنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ جذبات کے انجکشن قطعی بے اثر ہو گئے ورنہ ممکن تھا کہ ایک دن میری خودداری اور عزت تمھارے قدموں میں پڑی بخشش کی طلبگار رہوتی۔'' ۵۴ؔ

داؤد رہبر کے افسانے ''میزبان اور مہمان'' میں ٹومی کے چھوٹے بھائی ایلن کی منگیتر شیری نے شادی میں التوا کا انتقام لیا، لیکن انجام طلاق ہی نکلا: ''تین سال انتظار کر کے اِس نے ایک چال چلی، اختلاط میں سدِ حمل کا نسخہ استعمال نہ کیا اور حاملہ ہوئی، یوں اِس نے دباؤ ڈال کر ایلن کو شادی کی تاریخ مقرر کرنے پر مجبور کیا۔'' ۵۵ؔ واجدہ تبسم کے افسانے ''اُترن'' کی سہیلی نمانو کرانی اپنی مالکن سے در پردہ حسد کرتی ہے۔ اِس کی شادی سے ایک روز پہلے اِس کے ہونے والے دولہے کو لبھا کر اپنی تسکین کا سامان کرتی ہے اور بی پاشا کی شادی کے دوسرے دِن قہقہے لگاتی پھرتی ہے: ''کیوں کہ اِس کی سوچ یہی تھی کہ میں بی پاشا سے بھی زیادہ خوب صورت ہوں نا؟ پھر، تو اُنوں میری اُترن پہناتا؟'' ۵۶ؔ واجدہ تبسم کے افسانے ''ذرا ہور اُوپر'' کا نواب جنسی بے راہ روی کا شکار ہے، ہر روز نئی نئی عورتوں سے شراب و شباب کی محفلیں بسانا اِس کی زندگی کا معمول بن جاتا ہے۔ بسیار کوشش سے راہِ راست پر نہیں آتا، بلکہ بیوی کو طلاق کی دھمکیاں دیتا ہے، اِس کی بیوی دلہن پاشا جواباً کہہ دیتی ہے، انتقاماً نواب کی بیوی اپنے پاؤں اور ٹانگیں دابنے کے لیے جوان لونڈے رکھ لیتی ہے: ''ہور طلاخ لیے بعد سارے حیدر آباد کو سناتی پھروں گی کہ تمے عورت کے لائج مرد نہیں تھے، یہ بچے تمھارے نہیں اَب چھوڑ و میرے کو، ہور دیو میرے کو طلاخ!'' ۵۷ؔ

''بارہ آنے کی عورت'' میں عورت نے جب خود کو اپنے معیار سے گرا دیا، تو ابن الوقتوں نے بھی اُس کی اُتنی ہی قیمت لگائی، کیوں کہ شمو نے ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچا کہ، جو شخص بچوں والا ہو کر اپنی بیوی سے وفا نہیں کر رہا، اُس کے اعتماد کو دھوکہ دے رہا ہے، وہ اِس کے ساتھ کیوں کر اچھا ہو سکتا ہے۔ بیوی کے اعتماد کی دھجیاں بکھیرنے والا غیر عورتوں کی ہمدردیاں وصول کر کے دوستانے گانٹھنے والا، کیوں کر وفادار ہوتا ہے۔ دھوکہ، جھوٹ اور لالچ کی بنیاد پر قائم ہونے والے تعلقات پانی پر بلبلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اخلاقی اقدار کی پامالی سے نہ صرف انسان اپنے آپ کا مجرم ہوتا ہے، بلکہ معاشرے اور خدا کا بھی، ایسے جرائم چھپتے نہیں، بہر حال منظرِ عام پر آ کر رہتے ہیں، یہ وقتی سرشاریاں بہت جلد عذابوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ شمو کی یہ سوچ، جو اُسے گمراہی کی طرف مائل کرنے کا سبب بنی، اگر وہ ضمیر کی دستک پر کان دھرتی، تو کبھی بھی بارہ آنے کی عورت نہ بنتی، یہی تھوڑا سا فرق اُسے بارہ آنے کی عورت بنا گیا، خود، تو اُس کی قیمت گر گئی، لیکن اُس نے اپنی بچیوں کو جیتے جی بے قیمت کر دیا۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بشریٰ اعجاز نے مرد و عورت کی نفسیات کی عقدہ کشائی کی ہے اور عورت کی زندگی کے اِن پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جنھیں معاشرہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا ہے:

''پھر آہستہ سے خود کو یہ کہہ کر سمجھالیا، میں بھی شادی شدہ ہوں اور دو بچوں کی ماں ہوں اور تا حال

ریاض کی منکوحہ ہوں، مجھے ریاض نے چھوڑ دیا اور شہباز کی بیوی اُس کی پسند کی نہیں، بات تو تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی ہوئی اور پھر، جو بھی ہوا، واپس پلٹنا ممکن کہاں۔''۵۸

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے ''کنول کنڈ'' نام کی بستی میں کسی ناجائز بچے کو پھینک دیا گیا، علاقے کے بزرگوں سے اُسے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا، تاکہ یہ پلید روح ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، اِس بچے کی جان ایک طوائف بچاتی ہے، جسے سارے ڈائن، فاحشہ اور پچھل پیری کا نام دیتے ہیں: ''سب مل کر پتھر مارو'' تجربہ کار دانا بزرگ نے کہا، یہ معاملہ کیوں کہ مردوں کا تھا، اِس لیے کوئی بھی عورت شریک نہ تھی۔''۵۹ ''بیگو'' پہاڑی علاقوں میں بسنے والی ان لڑکیوں کی نمائندہ ہے، جنھیں مصوری کی آڑ میں اپنی تفریح کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور جھوٹے عشق یا چند روپوں کی خاطر ان کے جسموں تک رسائی حاصل کی جاتی ہے، ایسی لڑکیاں دِق زدہ وجود، زندگی بھر کی بیگار روپوں کے عوض فروخت کرتی ہیں، اِن کی جوانی کا رس چوسنے والے اُنھیں بیکار شے میں بدل دیتے ہیں، جو محض ظلم و بختی ہی جھیلتی ہیں۔ منٹو نے بیگو کی زبانی اسے لوگوں کی نقاب کشائی کی ہے، جو ایسی لڑکیوں کے نذرانِ حُسن کے عوض اپنی بے وفائی اُن کی جھولی میں ڈال جاتے ہیں، جب کہ افسانہ ''بدتمیز'' کی عزت جہاں کی زبانی منٹو نے جنسی تلذذ حاصل کرنے والوں اور ہوس پرستوں پر کڑی تنقید کی ہے، جو اپنے 'کارنامے' بڑے فخریہ انداز میں پیش کرتے ہوئے خود کو سچائی کا علمبردار سمجھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، اپنی پردہ پوشی نہیں کرتے:

''پردہ پوشی نہیں کی، تو اُن کے یہ معنی ہوئے کہ وہ راستی پر ہیں۔ ویشیائیں کھلے بندوں اپنا جسم بیچتی ہیں، تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کا وجود فطری ہے، چوں کہ ہمارا نظام بالکل غلط اور غیر فطری ہے، اسی لیے ہمیں یہ چکلے نظر آتے ہیں، چوں کہ آپ کے دوست کا نظامِ عصبی تندرست نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ عورت اور روٹی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ روٹی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن اِس جسمانی تعلق کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔''۶۰

''موری کی اینٹ'' میں گھروں کا کوڑا کرکٹ اُٹھانے والی بھنگنوں کو محبتوں کے جال میں پھنسا کر، عزتیں لوٹنے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔ کنواری حاملہ جنتے کی ماں، جب مجرم کا نام پوچھنے کے لیے اپنی بیٹی کو خوب مارتی پیٹتی اور گالی گلوچ کرتی ہے:

''میری بھولی بچی! تو کس جال میں پھنس گئی ہے۔ تیری پشتیں اِن بابوؤں کا گند اُٹھاتی آرہی ہیں، تو جس بابو کی رانی بننے کی آس لگائے بیٹھی ہے، اُس کا گند تیرے ناخنوں میں ہے، اس کے گند کی بو تیرے جسم میں بھی ہے۔ ہماری دال روٹی اِن بابوؤں کے گند سے چلتی ہے، وہ گند جس کا دُنیا میں کوئی فائدہ نہیں، وہ ہمیں روٹی دیتا ہے۔۔۔ اور تو اُس کی بیوی بنے گی۔۔۔ جب تک مطلب نکل نہیں جاتا کبھی بابو میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں، لیکن بعد میں وہ تم جیسیوں کو اِسی طرح بھول جاتے ہیں جیسے ہم کمیٹی کی لاری میں ٹوکری اُلٹ کر بھول جاتی ہیں۔''۶۱

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے افسانے ''بھاگ گئی'' میں لکھا ہے کہ مرد کے ناجائز تعلقات عورت کی زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں۔ جائیداد کے حصول کے لیے یتیم بچی کو چچا اپنے بدکردار بیٹے سے بیاہنا چاہتے ہیں، جب کہ وہ اذیت پسند ہونے کی وجہ سے اپنی بیوی پر بدترین تشدد کرتا رہتا ہے:

"چچا کا لڑکا، جو جوان تھا تحصیل میں چپڑاسی تھا، مگر حال یہ تھا کہ عرصے سے بیکار تھا، کیوں کہ وہاں سے برخاست ہو چکا تھا، بیوی کا مار مار کر اُن نے وہ بُرا حال کیا کہ غریب اپنے باپ کے گھر چلی گئی، جب کبھی آتی خوامخواہ ماری جاتی، شراب کی بھی عادت اور عموماً رات کے گیارہ بجے سے کبھی پیشتر گھر میں نہ آتا تھا۔ باپ بچارہ خود پریشان تھا کہ کیا کروں، اکلاتا لڑکا تھا، جو کچھ بھی کما کر لاتا، بیوی کو دیتا اور لڑکے کا یہ حال کہ ماں سے سب کچھ لے لیتا، غرض عائشہ نے گھر کی وہ حالت دیکھی، جو کبھی سننے میں بھی نہ آئی تھی، مگر پھر بھی چچی ناراض ہی رہتی، جب سے وہ آتی تھی اِس کو پیسہ کوڑی کبھی کچھ نہ ملا باپ کے زمانے کے کپڑے پھٹنے کو آئے، مگر چچا چچی نے کچھ پروا نہ کی۔" ۶۲

نیر اقبال علوی کے افسانے "گلوبل ولیج" میں بتایا گیا ہے کہ یورپ جیسے مادر پدر آزاد ماحول میں بھی جہاں مرد وعورت کے اختلاط پر کوئی پابندی نہیں ہے، وہاں بھی مرد وعورت کا بہ حیثیتِ میاں بیوی کسی دوسرے مرد یا عورت سے فلرٹ، معاشقہ یا جسمانی تعلق کو قابلِ گرفت سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ شادی شدہ جوڑے کے بندھن کو مضبوط بنانے میں سب سے اہم چیز وفا اور اعتبار ہے، جس کے مفقود ہونے سے خانگی زندگی تباہی کا شکار ہو جاتی ہے، ایک یورپی مرد نے کتے کو انسانوں پر فوقیت دے رکھی تھی کہ اس میں وفا پائی جاتی ہے، اپنی طلاق کی وجہ بتاتا ہے:

"میں کام کی زیادتی سے اکثر شام پی کر گھر آتا، جو میری بیوی کو سخت ناگوار گزرتا، پہلے پہل تو وہ برداشت کرتی رہی پھر اُس نے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا، جب میں پھر بھی باز نہ آیا، تو اُس نے غیر مردوں کے ساتھ تعلقات اُستوار کرنے شروع کر دیے اور پھر ایک روز نئے دوست کو گھر لا کر میرے کپڑے اور دیگر ذاتی اشیا گھر کے باہر رکھ دیں، یہ کہتے کہتے مرد کی آواز بھر آگئی اور آنکھیں بھی بھر آئیں، مگر جدائی کے غم سے نہیں، بلکہ شراب کی حرارت سے۔" ۶۳

نیلم احمد بشیر کے افسانے "بھوک" میں افشی اور اُس کے شوہر محمود کی داستان بیان کی گئی، جس نے دوسروں کی باتوں میں آ کر اپنی ہنستی بستی خوشگوار زندگی میں زہر گھول لیا تھا، محمود ہر وقت ہیرا پھیری، جھوٹ اور بے جا مصروفیات کا بہانہ بنائے رکھتا اور گھر اور گھر کے اُمور میں اِس کی دلچسپی تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، جہاں اُسے پل پل کی خبر ہوتی تھی کہ اُس کے بچوں کو کیا چیز درکار ہے، اُن کی ضرورت کیا ہے اور پھر بڑی تندہی سے اُسے پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا، اَب بات بے بات پر جھگڑنے لگتا، کیوں کہ اَب اُس کی توجہ کی مرکز کوئی اور بن رہی تھی، گھر اور بیوی بچوں سے ذہنی دوری اور لاتعلقی بڑھنے لگی:

"یہ وہ شخص تھا، جس کے پہلو میں وہ رات بھر جاگتی اور اُسے سکون سے خراٹے لیتے دیکھتی تھی، اِس شخص کے ساتھ، تو اِس کا جسم، روح، جان، دِل، ہر قسم کا رشتہ تھا، مگر نہ جانے اُسے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی اجنبی کے بستر پر لیٹی ہوئی ہے، پھر وہ اجنبی سانپ کی مانند رینگ کر اپنی کینچلی میں سے باہر نکل گیا ہے اور بستر پہ کھنچی ایک لکیر اُسے گھورتی ہے۔" ۶۴

ممتاز مفتی کے افسانے "ذاتی معاملہ" کا صمد اپنی بیوی سے والہانہ پیار کرتا ہے۔ بیوی بھی دل و جان سے فریفتہ ہوتی ہے اچانک اُس کے ذہن میں سوچ اُبھرتی ہے۔ اپنے دل و ذہن میں اُبھرنے والی اِس بات کا قلع قمع کرنے کی اِس میں

ہمت نہیں تھی۔ لہٰذا، وہ فراریت کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کسی اور کے خیالوں میں کھونے لگتا ہے، بیوی جب پوچھتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہے پس میں کسی کو بھی دخل دینے کی ضرورت نہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اِس کی بیوی بھی محفلوں میں جانا شروع کر دیتی ہے، جہاں وہ صرف اپنے شوہر کے ساتھ جاتی تھی۔ اب اِس کی توجہ کا مرکز احمد ہو جاتا ہے۔ صمد یہ بات جاننے میں ناکام رہتا ہے۔ رشتوں کی پائیداری، شدت اور خوبصورت اِن کی پاسداری میں ہے وفا اور اعتماد میں ہے، اگر یہی صمد اپنے احساسات کا دھارا جنس سے ہٹا کر سیر وتفریح کی طرف ہو جاتا، تو رشتے میں پہلے سے زیادہ پائیداری پیدا ہو جانا قدرے بہتر ہوتا، اِس سے دونوں کا کتھارسیس ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کو مزید سمجھنے میں مدد ملتی تھی، لیکن اپنی حقیقی خوشیوں کی تلاش تنہا کرنے والے خود بھی اکیلے وہ جاتے ہیں:

> ''وہ غصے میں چلایا، آج سے تم احمد سے نہیں ملو گی۔' کیا مطلب' پہلی مرتبہ وہ تنک کر بولی، مطلب وطلب نہیں، میں کہتا ہوں تم احمد سے نہیں مل سکتی، لیکن کیوں، وہ چلائی کسی سے ملوں یا نہ ملوں، اِس میں کسی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، 'ذاتی معاملہ' صمد نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا، چارپائی پر پڑی لاش اُٹھ بیٹھی 'ذاتی معاملہ'؟ اِس نے حیرانی سے انوری کی طرف دیکھا۔'' ۶۵

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے ''کاناچور'' کا خاور فوٹوگرافر دن بھر عورتوں کی تصویریں اُتارنا، اُنھیں ڈیولیپ کرنا، اُن کے پرنٹ نکالنا اور اِنھیں انلارج کر کے تکتے رہنا اِس کا محبوب مشغلہ تھا، لیکن جب اُس کی اپنی بیوی ماڈلنگ کرنے لگی اور لوگ اُس کے نیم برہنہ پوسٹروں پر تبصرے کرنے لگے، تو حسد ورقابت اور بے عزتی کے احساسات اِس کے دِل ودماغ میں موجزن ہونے لگے، اِس کی بیوی نرگسیت کا شکار تھی، ستائیشی کلمات اِس میں زندگی بھر دیتے تھے:

> ''میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ وہ میری بیوی کی چھاتیوں اور کولہوں کا قصیدہ پڑھتا اور میں سُن کر بیٹھا مکرر ارشاد فرمائیے کہتا رہتا۔۔۔ اتنی سی بات سمجھتے؟ ایسے کیا پتہ کہ یہ تصویر کس عورت کی ہے، تمھاری بیوی کی ہے کہ کانے چور کی بیوی کی۔۔۔ اِس نے، تو تصویر کو پروفیشنل آنکھ سے دیکھا اور تعریف کر دی۔۔۔ میں تمھاری بیوی ہوں اُسے اِس کا کیا پتہ اُس کے لیے، تو محض ماڈل تھی، ایک غیر عورت، بلکہ پروفیشنل عورت۔ لہٰذا، بے عزتی اِس وقت ہوتی، جب تم نے اُسے بتایا کہ میں تمھاری بیوی ہوں، اِس سے پہلے میں اُس کے لیے ایک بے نام جسم تھی، مس ایکس سمجھ لو، لیکن تم اپنے جوش میں پھوٹ پڑے اور اب یہ مس ایک مسز خاور بن گئی۔۔۔ یوں بے عزتی ہوئی۔'' ۶۶

خدیجہ مستور کے افسانے ''دیوانی'' میں پھوپھی اور بھتیجی راشدہ کا قصہ ہے۔ پھوپھی نت نئے شوہروں کو پھانستی رہتی ہے، احسن کا چھوڑ کر چلے جانا اور فیشن زدہ پھوپھی کی نئے عاشق کی تلاش میں نوجوان بھتیجی بہت بڑی رُکاوٹ بنتی ہے۔ قدم قدم پر اُن کی مڈبھیڑ رقابت کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کیوں کہ راشدہ اُسے اپنی اور خاندان کی توہین تصور کرتی ہے، جب کہ اُس کی پھوپھی ایسی عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے، جن کے لیے ایک کا ہو رہنا اور نفیِ ذات ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں اُس کی انانیت پر ضرب لگنے کا خدشہ ہوتا ہے، وہ دوسروں کو اپنی زندگی سے نکال باہر کرتی ہیں، تو نہیں تو اور سہی کے

قاعدے کے تحت زندگی بسر کرتی ہیں۔ خدیجہ مستور کے افسانے ''عسق'' کی بہوایک ایسی عورت کا کردار ہے، جو محض وفا کی متلاشی ہے اس لیے جگہ جگہ ذلیل ورُسوا ہوتی ہے۔ مردوں کی غیرعورتوں میں دلچسپی، تعلقات ومعاشقے، خانگی زندگی کے لیے بڑے زہرناک ثابت ہوتے ہیں۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ امیرزادوں کی ہوس کا شکار ہونے والی ملازمائیں اور نچلے طبقے کی عورتیں، جن مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ خدیجہ مستور نے اپنے افسانے ''بھورے'' میں بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ بھورے کی ظہورن بھورے کو پانے کی خاطر عزت وآبرو گنواتی ہے۔ بھورا جس نے غیرعورتوں سے تعلقات استوار کیے ہوتے ہیں اپنی منگیتر ظہورن کو اپنانے سے انکار کردیتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ ''تو پھر تو اُسی خانساماں سے شادی کرلے ظہورن'' اور یہ کہ ''میں نے تجھ سے شادی کی تو لوگ کیا کہیں گے''۔ ظہورن کے دِل کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتے ہیں، حالاں کہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ بھورے دل لگی کے لیے سامانِ لذت کرتا تھا اور ظہورن کو اِس کی مجبوری کی آڑ میں لوگ استعمال کرتے رہے، لیکن ظہورن اِس کے باوجود اِس کی محبت کا دم بھرتی رہتی ہے۔ ظہورن تو چلی جاتی ہے، لیکن بھورے کے دل میں محبت کی آگ جلا جاتی ہے، اسے اِس کا انتظار لگ جاتا ہے، لیکن یہ ظہورن ایک روز بغیر نام بدل کر اِسی ہسپتال میں لائی جاتی ہے اور خون کی کمی کے باعث جان دے دیتی ہے، اِس کی لاوارث لاش طالبِ علموں کی تجربہ گاہ بن جاتی ہے، دوسری طرف بھورے کو اِس کا انتظار لگا رہتا ہے، لیکن بے سود خدیجہ مستور نے امیرزادوں کے چونچلوں اور غریب لڑکیوں کو سامانِ عیش بنانے والوں کو بے نقاب کیا ہے:

> ''جارے، میرا نام جھورن ہے، میری سادی جو ہونی تھی، سو ہوگئی، میں تیری جیسی نہیں ہوں، بادہ لے لے جو دوسری سادی کروں' جھورن جندگی بھر تیرے نام پر بیٹھی رہے گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرے گی، یہ سب کسمت کے کھیل میں ہے۔'' ۶۷

خدیجہ مستور کے افسانے ''ہُنھ'' میں میاں کا غیرعورتوں میں دلچسپی لینا، اُن کے ساتھ وقت گزارنا بیوی کے لیے سوہانِ روح ہوتا ہے،، بسم اللہ کے پڑوس میں رہنے والی چھبیلی جیسی طوائفیں اِس پر اپنی برتری جتاتے ہوئے، اُسے احساس دِلاتی ہیں کہ وہ تو پھر اپنے جسم اور ناز وادا کی قیمت وصول کرلیتی ہیں، جب کہ تم جیسی شریف عورتیں، جو محض شوہرپرست ہوتی ہیں ہم سے بھی گھٹیاترین طوائفیں ہوتی ہیں، جنھیں نہ تو معاوضہ ملتا ہے اور نہ دِلداری، بلکہ شوہر کی بے راہ روی ہی ملتی ہے،، بسم اللہ کے شوہر کا دیر تلک گھر سے باہر رہنا، گھر، بیوی، بچوں کی طرف کسی قسم کی توجہ نہ دینا اُس کا معمول تھا۔ بیوی جب اُن کی عدم توجہی اور بے جا لڑائی جھگڑا اور مار کٹائی سے عاجز آجاتی ہے، تو ذہنی تناؤ کا شکار ہوکر بے دم بستر کی ہو رہتی ہے، کیوں کہ اُس کا شوہر اُس کی ذات وحیثیت کی نفی کرتے ہوئے دھونس کا رویہ اختیار کرتا ہے: ''اسے تو بس اپنے کھانے، کپڑے، بچے کی پرورش اور شوہر کی مرضی سے مرضی رکھنا چاہیے، نہ کہ اُن کی باہر کی بے جا باتوں میں ہاتھ ڈالتی پھرے۔'' ۶۸ اِسی طرح پڑوس میں رہنے والی طوائفیں رونق میاں کی بیوی کو کوسنے دے کر جتاتی ہیں:

> ''ہوں، کمائی کی کھانے والی، بسم اللہ نے ہاتھ مٹکا کر اُس کی نقل اُتاری، بی بی جس کمائی کے پیسے سے ہم پیٹ بھرتے ہیں، اسی سے تم بھی اپنا پیٹ بھرتی ہو اور تم، تم کیا دُنیا کی سب عورتیں اُسی کا کھاتی ہیں، جس کا ہم، پر تم ہمیشہ جوتیاں سیدھی کرتی رہتی ہو اور ہم سر چڑھ کر کھاتے ہیں، کسی کے دبیل نہیں، سمجھیں، کیا کہتی ہو ہم کو کمائی کے پیسے سے پیٹ بھرتی ہے،

کمائی کے پیسے سے، جب جانئیں تم لے لوا پنے میاں سے یوں ہی روٹی کپڑا بڑی بے چاری
ہم کو کہنے چلی ہیں۔ مچھلی کے سفلے اکھیڑ کر رکھ دوں جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔''۶۹ے

انوار صدیقی کے افسانے ''نہلے پہ دہلا'' کی روزی اور اُس کا شوہر جوزف پر سکون اور خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن جب مرد کھویا کھویا رہنے لگا، بیوی نے اصل معاملہ جاننا چاہا، کیوں کہ شوہر کی عدم دلچسپی اور کھویا کھویا پریشان رہنے کا انداز ناچاقی کا سبب بن رہا تھا، دونوں میاں بیوی مل کر اُس عورت کی سرکوبی کرتے ہیں۔ انوار صدیقی نے خانگی زندگی میں باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کے مسائل کو مشترکہ انداز میں حل کرنے کی خوبصورت مثال دی ہے، یہ اُسی وقت ہوتا ہے، جب دونوں فریق ایک دوسرے کی اہمیت کو سمجھیں اور اِس کی پاس داری بھی کریں، کیوں کہ عام طور پر تمام وفاؤں اور قربانیوں کی ذمہ داری عورت کے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے، اُنھیں سب کچھ سُنایا بھی جاتا ہے، لیکن اُنھیں سنا نہیں جاتا، بلکہ استبدادی اور جبری انداز میں بُرے رویے کی آڑ میں دبانے کی کوشش کی جاتی ہے:

> ''مونیکا کے سلسلے میں تم کو صاف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ ایک بدکردار عورت ہے، لیکن میں مقدس مریم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اِس سے کبھی کوئی ناجائز تعلقات نہ پہلے تھے نہ اَب ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ حالات نے مجھے اِس کے ذریعہ ایک ایسی مصیبت میں پھانس دیا ہے کہ میں بے بس ہو گیا ہوں، میں تمھیں اپنی محبت کا یقین دلاتا ہوں، اگر تم میرا ساتھ دو، تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔''۷۰ے

مرد کی غیر عورتوں سے دوستیاں، معاشقے اور اسکل صورت میں اِن سے تعلقات ازدواجی زندگی میں تباہی کا مؤجب بنتے ہیں، ایسے لوگ نہ صرف اپنی زندگی کو ناآسودگیوں کی نذر کرتے ہیں، بلکہ فریقِ ثانی کو زندہ درگور کر دیتے ہیں، اِن کے معاشقے و دوستانے وقتی طور پر راحت کا سامان، تو پیدا کر لیتے ہیں، لیکن اِس کے مضر اثرات روح کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کے افسانے ''جہالت مکسچر'' میں حامد کے معاشقوں نے اِس کی بیوی عارفہ کو اِس حد تک متنفر کر دیا کہ وہ اِسے چھوڑ کر میکے سدھار گئی، جب عشق کا بھوت اُترا، تو حامد کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا، جس عورت کے دام میں گرفتار تھا وہی سب کچھ لوٹ کر روانہ ہوئی، جب کہ وہ خود بے یارومددگار بیمار تنہائی میں پڑا تھا:

> ''عارفہ کو پورے تین سال ہو گئے کہ وہ میاں سے الگ ہوئی تھی، اِس دوران میں، جب کبھی بھی مصالحت کی کوشش کی گئی ناکام رہی، بلکہ نتیجہ یہ کہ حامد کی طرف سے وہ وہ باتیں پیش آئیں کہ عارفہ، جو دِل سے مصالحت بھی چاہتی ہوئی، تو اور بگڑ جاتی، کوئی بھی عورت میاں کی وہ باتیں نہیں سُن سکتی۔''۷۱ے

ہاجرہ مسرور کا افسانہ ''عورت'' مرد و عورت کے مابین پیدا ہونے والی شک و شبہ کی خلیج کے بھیانک انجام کی عکاسی کرتا ہے، کاظم اپنی بیوی قدسیہ کو چاہنے والے تصدق کے حوالے سے شکوک و شبہات کا شکار ہوتا ہے، کیوں کہ قدسیہ اور کاظم کی محبت کے چرچے خاندان بھر میں مشہور تھے۔ تصدق کا شادی کی بجائے آوارگی اختیار کرنا کاظم کے نزدیک غم مٹانے کا بہانہ تھا۔ قدسیہ کے دل میں بھی تصدق کی محبت تازہ تھی، جس کی وجہ سے کاظم گاہے بگاہے طعن و تشنیع، بیہودہ الزامات اور بدمزاجی کا مظاہرہ کرتا، ایک اُس کی عدم موجودگی میں تصدق کی آمد، اظہارِ عشق اور قدسیہ کے انکار کے باوجود اُس سے بدظن ہو جاتا ہے:

''وہ اب میرا بھائی ہے۔ آپ ناحق شک کرتے ہیں۔ وہ بات کو زیادہ طول نہ دینا چاہتی تھی۔ 'بکواس مت کرو، میں پوچھتا ہوں اتنی دیر تک کیا ہوتا رہا؟' کاظم نے جھپٹ کر اس کی سوکھی ہوئی کلائی مروڑ دی۔ 'جلدی بول ورنہ اچھا نہ ہوگا' شادی کے بعد تو اکثر ملا ہی کرتی تھیں، لیکن یہ مار بالکل نئی تھی۔ ماں باپ کی لاڈلی جسے کبھی کسی نے انگلی نہ چھوائی تھی، آج بلا وجہ اتنا ظلم سہہ رہی تھی، وہ تکلیف سے زرد پڑ گئی، لیکن اس کی خودداری زندہ ہوگئی۔ 'جب آپ اپنی راتیں آوارہ عورتوں میں بسر کرتے ہیں، تو میں نہیں پوچھتی کہ ان سے کیا باتیں ہوئیں!'، آدم کے پہلو سے نکلی ہوئی حوا کی بیٹی اپنے ازلی مساویانہ حق کی دعویدار تھی، لیکن ابنِ آدم، جو عورت کی پیدائش کے مقصد کو پہلو سے گرا کر پاؤں سے کچلنے کا عادی تھا۔ بھلا یہ جائز نکتہ چینی، کیوں کر برداشت کرسکتا تھا۔ وہ سراپا شعلہ بن گیا۔ بیوی کی اتنی ہمت کہ وہ اس سے باز پرس کرے؟ یہ مرد کی آمرانہ ذہنیت پر ایک زوردار طمانچہ تھا۔ کاظم صداقت کی تلخی برداشت نہ کرسکا اور کونے میں رکھا ہوا بید اس کے ہاتھ میں تھا، پھر قدسیہ پر مار پڑنے لگی وہ چیخی چلائی، لیکن اُس کی آواز پر کوئی کیوں دوڑتا، بھلا کسی کو کیا غرض تھی کہ کسی کی بیوی یا بالفاظ، دیگر ملکیت کے متعلق باز پرس کرتا۔''[۲]

مظہر الاسلام نے علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے پے در پے معاشقوں کی نفسیاتی توجیہ پیش کی ہے کہ افسانے کے مرکزی کردار کا نئی گڑیائیں تراشنا دراصل نئے معاشقے کا آغاز ہوتا ہے، جو درحقیقت اِس کی عدم اعتمادی اور احساسِ کمتری کی دلیل اور ایک ناکام شخص کی علامت ہے، ایسا شخص جو ایک ناؤ کو کامیابی سے کھے کر کنارے کی طرف رواں دواں ہوتا ہے منزل اسی کو ملتی ہے۔ منتشر ذہن بہت سی منزلوں اور کناروں کا متلاشی ہوتا ہے، بالآخر اپنا دامن ناآسودگی سے بھر لیتا ہے:

''اُس کے گھر والے اُسے ڈھونڈتے رہے ہوں گے مگر اُس نے کبھی اپنے آپ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی، مگر ہر گڑیا مکمل کرنے کے بعد وہ یہی کہا کرتا تھا کہ گڑیا ایسی نہیں بن سکی جیسی وہ بنانا چاہتا ہے، میں اکثر اُس کے ساتھ بحث کیا کرتا تھا، مگر اُس کا جواب یہ ہوتا کہ اُس کے اندر ایک گڑیا ہے، جب تک وہ گڑیا باہر نہیں آجاتی وہ گڑیاں بناتا رہے گا۔''[۳]

نیلم احمد بشیر کے افسانہ ''جسے پیا چاہے'' میں بدصورت شوہر کے کردار کی داخلی خوبصورتی کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے، اِس کے علاوہ ایسے مردوں کے ذہنیتوں کی عکاسی کی ہے، جو جذبے کے نام پر نہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، بلکہ دوسروں کے جذبات کو بھی اپنی نام نہاد سچائی کے نام پر ٹھیس پہنچاتے ہیں، ایسے لوگوں کا مؤقف عموماً یہ ہوتا ہے کہ میرا سب کچھ تمھارا ہے صرف محبت کے سوا:

''دیکھو سعدیہ میں ایک بڑا سچا اور بااصول آدمی نہیں ہوں، جھوٹ بولنا اور جھوٹی زندگی گزارنا مجھے قطعاً گوارا نہیں، میں ہر بات صاف صاف کر دینا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان ایمانداری، بھروسہ اور انڈرسٹینڈنگ کا رشتہ قائم ہو اور کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہ ہو۔۔۔ سعدیہ میں آپ کو ہر چیز دوں گا، آپ کو یہاں اِس گھر میں کسی قسم کی کوئی

تکلیف نہ ہوگی، بس ذرا حوصلے اور انڈر سٹینڈنگ سے کام لیجیے گا۔۔۔شاید آپ کو وہ
سب کچھ نہ ملے جس کی آپ کو تمنا ہو یا جو واقعی آپ کا حق ہے، مگر میں مجبور ہوں، دراصل
یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی، میں آپ کو محبت کے سوا سب کچھ دوں گا، آپ کو کوئی
شکایت نہ ہوگی۔ پلیز مجھ سے مجھ کو نہ مانگنا اور جو کچھ چاہے مانگ لو۔۔۔اُسے ایسے لگا
جیسے اُس لمحے اُس کی زندگی کی سب سے قیمتی چیز اُس سے چھن گئی ہے اور وہ ایک ایسے
کمرے میں کھڑی ہو، جس کی چھت ابھی ابھی بھک سے اُڑ گئی ہو۔''[۴۷]

''حوا زادی'' میں ہاری کا کا کے قتل کے خلاف احتجاجاً اُس کی دونوں بہنیں سندھ ہائی کوٹ کی بلڈنگ کے سامنے خود کو جلا ڈالتی ہیں، اُن کی مظلوم ماں بے بسی کی تصویر بنی اُنھیں دیکھتی رہی۔ شوہر کی لا پروائی، عدم توجہی، آوارگی اور نشے کی عادت، غیر عورتوں سے اِس کے تعلقات عورت کے لیے نا قابلِ برداشت ہوتے ہیں، اُنھی باتوں سے مضبوط سے مضبوط عورت کے کرب کو بیان کیا ہے، اس میں کسی طبقے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی، گھروں میں کام کاج کرنے والی بشیرے کی بیوی بڑے ناز و تمکنت سے اپنے شوہر کی وفا اور پیار کا ذکر کرتی ہے:

''وہ میرا میاں تھوڑی ہے، ہم دونوں دوستوں کی طرح ہیں، آپس میں باتیں کر لیتے ہیں، جو
چاہوں لا کر دیتا ہے۔ مارتا بھی نہیں، مجھے رانی بنا کر رکھا ہے، اُس نے ایک چاہی جانے والی
عورت انتہائی تمکنت سے میرے سامنے کھڑی میرے جھوٹے برتن دھو رہی تھی، میرے فرش
پرنا کی لگا رہی تھی اور مجھے اپنے راج پاٹ کے بارے میں بتا رہی تھی، اسی لمحے میں نے خود کو
بہت غریب اور تہی دامن محسوس کیا، وہ میری طرف دیکھ کر شاید جان گئی تھی۔''[۴۸]

نیر اقبال علوی کے افسانے ''سوسائیٹی مین'' کا امجد علی پاکستان شادی کر کے یورپ جاتا ہے، لیکن رنگینیوں میں کھو کر بیوی بچوں کو بھلا ڈالتا ہے۔ امجد علی اپنی انا کا سودا ایک یہودی کے ہاتھ کرتا ہے اور اُس کی مالدار بیٹی کا غلام بن جاتا ہے۔ زندگی کا سنہرا دَور اِس کا، تو عیاشیوں کی نذر ہو جاتا ہے، لیکن اپنے وطن میں اِس کی بیوی بیواؤں کی طرح زندگی کے ماہ و سال گزارتی ہے اور بچوں کو پال پوس کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے قابل بناتی ہے، اِس عورت کے سسکتے ماہ و سال میں اِس کی اپنی ذات بے حیثیت ہو کر مٹ سی جاتی ہے، جس پر شوہر کی بے وفائی کے غم کی پرچھائیاں اُسے کھوکھلا کر دیتی ہیں، یہی امجد علی عمر ڈھلنے پر موت سے خائف بے نشان ہونے کے ڈر سے، جب اپنے گھر آ جاتا ہے، تو بیٹے رسمی برتاؤ کے ساتھ ہی رخصت ہو جانے کا کہہ دیتے ہیں، اِسی طرح ''اُدھورا سفر'' میں شادی کا جھانسہ دے کر لڑکیوں کو محبتوں کے دام میں پھنسا کر جنسی استحصال کا نشانہ بنانے والوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور لڑکیوں کو بھی ایسے مردوں کی نفسیات سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو جگہ جگہ غیر عورتوں، لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھتے ہیں اور معاشقے لڑاتے ہیں، اُن کے اپنی شریکِ حیات کے لیے اُصول بڑے پکے ہوتے ہیں چاہتے ہیں کہ اُن کی بیوی باوفا خاندانی عزت و وقار کی ضامن با اعتماد ہو، چوں کہ اُنھوں نے خود عزتوں کی دھجیاں تار تار کی ہوتی ہیں، دھوکے اور فریب سے شرافتوں کے لبادے اندھے ہوتے ہیں، وہ محبت اور چاہت کا خول چڑھایا ہوتا ہے، اِس لیے شریکِ حیات میں اِن باتوں کے ہونے سے بُری طرح خائف ہوتے ہیں۔ ''اُدھورا سفر'' کی لڑکی بار بار اپنے محبوب فیروز کو شادی کے قائل کرتی ہے اور حقیقت بھی منکشف کرتی ہے کہ وہ اِس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ لہٰذا، حسبِ وعدہ اُس

سے نکاح کر لے۔لیکن بہانے تراشنے والا فیروزا پنے اصل مؤقف پر آ جاتا ہے کہ جولڑکی اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کا پاس نہیں رکھ رہی، اُن کی عدم موجودگی میں، جھوٹ اور فریب کاری سے اُس سے ملنے اور باتیں کرنے کی راہیں ہموار کر رہی ہے،کل کو وہ کسی اور کے ساتھ بھی کر سکتی ہے:

''تم بھی اُن مردوں میں سے ہو، ہرجائی، سنگ دِل ،فریبی ، بزدل ، مکار، اچانک لڑکے کے اندر چھپا ہوا جانور بیدار ہو گیا، اُس نے تڑاخ سے لڑکی کے منہ پر تمانچہ رسید کیا، پھر بھیڑیے کی طرح غُراتے ہوئے بولا :حرام زادی ۔۔۔ بکواس بند کرو۔۔۔ اپنا پاپ میرے سر جُڑنے کی کوشش مت کرو، کیا ثبوت ہے تمھارے پاس کہ یہ میرا بچہ ہے؟ مجھے تم سے شادی کرنی ہے نہ یہ بچہ مجھے درکار ہے جاؤ۔۔۔ جا کر اِسے ضائع کروادو یا جَن کر کسی اناتھ آشرم کے حوالے کر دو۔''۲ے

''رونگ نمبر'' میں غزالہ خاکوانی نے معاشقے لڑانے والوں کی حقیقتوں کی منکشف کیا ہے کہ زیادہ تر روگ دھوکہ دیتے بھی اور کھاتے بھی ہیں، محبتوں کے بے سلسلے باتوں سے جسم تک کا فاصلہ جلد طے کرنے میں ناکامی پر جلد ہی اصل حقیقتیں منکشف کر دیتے ہیں۔ شادی ہونے کی صورت میں پہلے سے کیے گئے دعوؤں کی قلعی بہت جلد کھل جاتی ہے، ایسی محبتوں کی شادیوں میں سے تقریباً پچانویں فصدی کا انجام ناکامی ہی کی صورت میں نکلتا ہے، کیوں کہ فریقین لاشعوری طور پر عدم تحفظ اور عدم اعتمادی کا شکار ہوتے ہیں، دونوں کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ اگر تمام رشتوں کی سچائیوں اور عزتوں کو بالائے طاق رکھ کر چھپ چھپ کر مجھ سے دوستی گانٹھی گئی ہے، تو یقیناً کسی وقت بھی توجہ بٹ سکتی ہے۔ محبت کی شادی کرنے والا اعلیٰ تعلیم یافتہ یہ جوڑا گھر میں آنے والے'' رانگ نمبر'' نے اِن دونوں کے لاشعور میں پوشیدہ خدشات کو بے نقاب کر دیا:

''یہ تمھاری سازش لگتی ہے، تمھارا کوئی فرینڈ ہو گا، اِس لیے تمھارا آج موڈ نہیں تھا۔۔۔ میری سازش ہے؟ تمھاری کوئی گرل فرینڈ ہو گئی۔ شادی کے بعد بھی تم نے اپنی حرکتیں نہیں چھوڑیں اور تمھاری گرل فرینڈ کے فون آتے ہیں اور الزام مجھ پہ لگا رہے ہو، شادی سے پہلے ،تو تم مجھے کہتی تھی کہ مجھے تمھاری اِن حرکتوں پر کوئی اعتراض نہ ہو گا، میں خود تمھیں ڈیٹس پر بھیجا کروں گی ، بس میرے سے شادی کر لو' سارہ غصے سے تلملا گئی: 'میں نے تمھیں پھنسایا ہے یا تم نے مجھے پھنسایا ہے، تم ہی میرے پیچھے پیچھے آتے تھے، مجھے فون کیا کرتے تھے، میرے باپ کی خوشامدیں الگ کرتے تھے، تم جیسے جاہل زمینداروں کے لیے کمشنر تو چھوڑ تحصیلدار سے رشتہ داری ہونا بھی بڑی بات ہے۔ میرے باپ نے ترس کھا کے تمھیں رشتہ دے دیا ورنہ ایک کمشنر کی بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی ہے' اَب جنید کو بھی غصہ آ گیا طنزاً بولا: اِس بھول میں نہ رہو کہ میں تمھارے عشق میں مبتلا تھا، میں نے تو کمشنر کی بیٹی سے افیئر چلایا تھا، کمشنر سے بدلہ لینے کے لیے کہ وہ مجھے میرے دوستوں کے مقابلے میں نظرانداز کرتا تھا۔ میرے کام نہیں کرتا تھا، میرے اندر کمپلیکس پیدا کرنے کے لیے مجھے گھنٹوں دروازے پہ کھڑا رکھتا تھا، بیٹی کا باپ بنا کے میں اُس کا سر اپنے قدموں

میں جھکا دیکھنا چاہتا تھا۔'' ۷۷ے

خانگی زندگی کے استحکام میں میاں بیوی کی ہم آہنگی، اخلاص اور وفا و اعتماد بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں سے کسی ایک کی کمی سے پوری عمارت ریت کی طرح ڈھ جاتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے علامتی انداز میں ''چڑیا چڑے کی کہانی'' کی صورت میں پیش کیا ہے۔ دونوں کی ہم آہنگی اور مشترکہ کاوشیں انھیں زندگی کے سرد و گرم کو جھیلنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ زندگی کے اِس اہم ترین پہلو کو دیگر مصنفین نے بھی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اِس افسانے میں مرد و عورت دونوں کو فکرِ معاش کے لیے یکساں کاوش کرنے کا درس دیا ہے، تاکہ اپنے بچوں کو بہتر ماحول اور سہولتیں بہم پہنچا سکیں، اِس سلسلے میں چڑیا کا یہ کہنا ہے: ''میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں، یہاں تک کہ تدارکِ معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں، میں چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی۔'' ۷۸ے ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانے ''روشن دن کا تاریک رات میں سفر'' میں نیا شادی شدہ جوڑا، جن مسائل سے دو چار ہوتا ہے، اِس کی عکاسی بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔ بیوی کے حاملہ ہونے اور اُسے توجہ نہ دے سکنے کی وجہ سے پڑنے اعصابی بوجھ نے اُسے بے حد چڑ چڑا بنا دیا تھا، حالاں کہ اِس وقت اُس سے زیادہ اُس کی توجہ کی مستحق اُس کی بیوی تھی۔ بچے کی پیدائش لاشعوری طور پر اُس کے لیے خوف کا باعث تھی، کیوں کہ اُس کی دانست میں بچہ اُس کا رقیب تھا۔'' سارے فساد کی جڑ اِس کا حل تھا، اِس لیے بات بے بات اِس سے اُلجھ پڑتا اور پھر، جب وہ روتی، تو پشیمان ہر کر اُس کے آگے پیچھے پھرتا، جب وہ دیکھتا کہ وہ چھوٹے چھوٹے کپڑے سی رہی ہے، تو اُس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑ جاتا جواب میں وہ اِس پر برس پڑتی، تو پھر ڈر جاتا، کبھی کبھی اکڑ بھی پڑتا، لیکن نتیجہ ہمیشہ بدمزگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، غرض یہ کہ اِن دنوں گھر کی صفا سخت پر تناؤ تھی۔۔۔ اور اب، تو جمیلہ سے زیادہ بے چینی سے وہ خود بچہ کی پیدائش کا منتظر تھا، تا کہ حمل کی اِس بک بک سے چھٹکارا ملے اور زندگی پہلے کی طرح نارمل بن جائے۔'' ۷۹ے ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانے ''بے چہرہ لوگ'' میں عائلی زندگی کے بہت بڑے مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ شوہر اپنی گوناں گوں مصروفیات کی آڑ میں گھر، بیوی اور بچوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، وہ اپنی عائلی زندگی میں دلچسپی لینے کی بجائے تشویش کا شکار ہوتا ہے، اپنی مصروفیات کی آڑ میں بیوی کو توجہ سے اور محبت سے محروم کر دیتا ہے:

> ''میری بیوی کا یہ بازو تو واقعی خوبصورت ہے، آج تک کبھی اِس کے بازو غور سے دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔۔۔ کمال ہے! اپنی بیوی ہے، بلکہ کئی سالوں سے ہی بطور بیوی چلی آ رہی ہے، مگر آج تک وہ کبھی پوری دیکھی ہی نہ جا سکی۔ ایک ہی نگاہ میں وہ کیسے بیک وقت نظر آ سکے گی؟ کیا پتہ وہ واقعی خوبصورت ہی ہو اور کیا پتہ پڑوسی واقعی اِس پر رشک کرتے ہوں، لیکن اَب، تو رحم نکلوا کہ وہ آخری سٹیشن بن چکی ہے اور کیا آخری اسٹیشن سے آگے ریل نہیں جا سکتی؟۔'' ۸۰ے

عصمت چغتائی کے افسانے ''عورت'' میں مردوں کے غیر عورتوں سے معاشقے، دوستانے، یارانے گانٹھنے والے توقع رکھتے ہیں کہ اِن کی بیویاں نسوانیت کا پٹارا لیے، بچوں کی فوج کے ہمراہ اِس کے گھر کی چار دیواری میں مقید رہیں، نہ کھانے کو مانگیں نہ پہنے اوڑھنے کو، اِن کو اتنا ہی کھانے پہنے کو دیا جائے، جو زندگی گزارنے کے لیے بمشکل پورا ہو اور زندگی کی ڈور بندھی رہے۔ عصمت نے مرد کی چالاکیوں اور عیاریوں کو بے نقاب کیا ہے کہ کس طرح اپنے معاشقوں کی راہ ہموار رکھتا ہے:

> ''عورت کی خصلت ہی آپ کے مطلب کے مطابق ڈھال لی گئی، تا کہ آپ اطمینان سے خصلت کے سر الزام تھوپ کر رنڈی بازی کریں اور بیوی کے پیروں میں اُسی کی بیڑیاں ڈال دیں کہ وہ خلافِ قدرت بات کر کے پڑوسی سے دیدے نہ لڑانے لگے اور اِس طرح لطافتِ نسوانی نہ کھو بیٹھے اور تو اور قدرت کو بھی مرد اِس سازش میں گھسیٹ لائے۔''۸۱

افسانہ ''چُپ'' کی جیناں شوہر کی عدم موجودگی میں قاسی، جس کی مَسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی ہوتیں اُسے کو اپنی جنسی تشفی وتسکین کا ذریعہ بناتی ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے، بہانے بہانے سے اُسے ورغلاتی ہے، اُس سے دلگی اور لگاوٹ کر کے لبھاتی ہے اور اپنا گرویدہ کر لیتی ہے۔ایسی صورت میں مفتی کے خیال میں مرد اِس ناجائز تعلق سے جائز تعلق کی لذت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جینا کے ورغلانے پر برملا کہتا ہے ''مجھے تم سے محبت۔۔۔ مگر جیناں نے اُس کا سر دبا کر اُس کا منہ بند کر دیا، ''چُپ'' وہ بولی کوئی سُن لے تو۔۔۔ بیاہتا سے پیار نہیں کرتے۔''۸۲ اِسی طرح ''سے کا بندھن'' میں اُن مردوں کی نفسیاتی، اُلجھنوں کو پیش کیا ہے، جو جا بجا دل لگیاں اور دوستیاں کرتے پھرتے ہیں، وہ بچی ازدواجی خوشی سے محروم ہو جاتے ہیں، ناآسودگی اِن کا مقدر بن جاتی ہے، اِن اُلجھاوے میں اُلجھنے والے اگر ایسی قباحتوں کو جڑ سے ختم کریں اور جذباتی واحساساتی خیانت کے مرتکب نہ ہوں، تو زندگی خوشیوں اور آسودگیوں کی آماجگاہ بن جائے گی، کشمکش کے نتیجے میں ناآسودگی کا شکار شخص اپنے کرب کو بیان کرتا ہے:

> ''جب میں مونا کے پاس ہوتا ہوں، تو میرے دِل میں امنا کی آرزو اُبھرتی ہے، اُبھرے جاتی ہے، اِس قدر مسلط ہو جاتی ہے کہ مونا پورے طور پر فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے اور اِس کی جگہ امنا آموجود ہوتی ہے، اسی طرح، جب میں امنا کے ساتھ ہوتا ہوں، تو امنا فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں اور مونا آموجود ہوتی ہے۔'' ۸۳

کرشن چندر نے ''ربڑ کی عورت'' میں حسن ایسا کردار پیش کیا ہے، جس کے کئی عورتوں سے تعلقات اور یارانے تھے، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھا اور ایک آئیڈیل بیوی کا خواہاں تھا، اِسی چکر میں تین بیاہ رچا چکا تھا اور کئی ایک داشتائیں رکھ چکا تھا۔ ہر کسی میں کوئی نہ کوئی عیب دکھائی دیتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ وہ سیاہ کرے یا سفید اِس پر اس کی بیوی اُسے کسی قسم کی روک ٹوک نہ کرے، بلکہ اِس کے معاشقوں اور یارانوں میں دلچسپی لے۔ ظاہر ہے یہ فطرت کے خلاف چلنے والی بات تھی بالآخر وہ ایک منصوبہ تیار کرتا ہے کہ ایک ایسی ربڑ کی عورت بنوائی جائے، جس کی شکل، خدوخال اور جسامت اِس کے تصور کے عین مطابق تھی، وہ اِس کے لیے نت نئے کپڑے لاتا ہے، بناتا سنوارتا اور خوب باتیں کرتا ہے، جواب میں عورت کی خاموشی اُسے تسکین پہنچاتی ہے۔ پھر ایک روز وہ اسپین جا کر ایک ہفتے کے لیے غیر عورتوں کے ساتھ خوب عیاشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور جب روانہ ہونے لگتا ہے، تو ربڑ کی عورت میں اچانک جان پیدا ہو جاتی ہے اور اُس کا گریبان پکڑ لیتی ہے:

> ''کیوں جی کیا مجھے اسی لیے گھر لائے تھے؟ کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر پیرس جاؤ اور وہاں سے کسی مردار مائی جلی فرنچ میم کو لے آؤ، نا ایسے نہ جانے دیا، میں ربڑ کی ہوں، تو کیا ہوا، آخر ہوں، تو عورت ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ صاف صاف کہہ دیتی ہوں، جہاں تم جاؤ گے وہاں میں بھی جاؤں گی تمھارے سنگ تمھارے ساتھ ساتھ جاؤں گی ورنہ تم کو بھی نہیں

جانے دوں گی، کان کھول کر سُن لو ابھی سے ہاں۔'' ۸۴؎

مرد کے بارے میں یہ کہنا کہ ''بے وفائی اُن کی گھٹی میں ہے'' درحقیقت اِن نظریات کا پرچار کرنا ہے، جو منفی ہے۔ مرد بے وفا ہوتے ضرور ہیں، وفاؤں کی مثالیں قائم کرنے والے بھی مرد ہوتے ہیں، ایسے مرد زندگی میں کامیاب نظر آتے ہیں اور ایک اچھے مثبت طرزِ فکر کے حامل صحت مند گھرانوں کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں، اسی طرح مرد و عورت پوری توجہ ایک دوسرے کی وفا کی تکمیل میں صرف کریں، تو زندگی اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ مرد و عورت کی ذات سے وابستہ سماجی اوہام یا ٹیبوز توڑے بغیر بڑی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ ''زہرہ سے ملاقات'' میں روحی اور زلیخا کی زبان سے حجاب امتیاز علی نے مرد و عورت کی وفا کے حوالے سے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے: ''روحی یقین کرو بے وفائی مردوں کی گھٹی میں ہے عورتوں کا خمیر وفاداری سے گوندھا گیا ہے۔۔۔ اور یہ کہ عورت ہمیشہ گھاٹے میں رہی ہے۔ محبت میں عورت اپنا سب کچھ مرد کو دے ڈالتی ہے، مگر تم ہی انصافاً کہو صلہ میں اُسے کیا ملتا ہے۔'' ۸۵؎

محمد سعید شیخ کے افسانے ''فرصتِ گناہ'' کا مرکزی کردار اپنی بیوی رضوانہ سے مصروفیت کا بہانہ کر کے بینش، جو صرف اُس کو اِس لیے چیلنج بناتی ہے کہ مسز خان اُس کی کرایہ دار خاتون، جو جدید انداز میں قحبہ خانہ چلاتی ہے، اُس کے ہاں ریٹائرڈ سرکاری افسر اور عہدے داروں کا بہت آنا جانا تھا، کے ساتھ ثاقب کے دفتر جاتی ہے اور وہ اِس کے حُسن کو اپنی نظروں میں نہیں تولتا، اپنے تئیں بینش کو اپنے حُسن کے ٹھکرانے کا احساس ہوتا ہے۔ اُسے اپنی طرف مائل کرنا اُس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ بینش نے اپنے شوہر غضنفر سے علیحدگی اختیار کر لی ہوتی ہے، بالآخر ثاقب کو گھر بُلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے یہاں ثاقب کے کردار کی کمزوری کھل کر سامنے آتی ہے، وہ عورتوں کی طرف جلد مائل ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو اُس وقت ہیرو متصور کرتا ہے۔ بینش اپنے بیٹے کو سُلا کر رات دس بجے کا وقت طے کرتی ہے اور اپنی لچھے دار باتوں میں اُسے شیشے میں اُتارنے کی ہر ممکن کاوش کرتی ہے۔ دوسری طرف ثاقب نفسیاتی طور پر خود کو توجہ کا مرکز پا کر بڑا قابلِ قدر متصور کرنے لگتا ہے۔ وہ بینش کی داستانِ غم سے متاثر ہو کر اُس کے تمام دُکھوں اور مشکلات کو حل کرنے کی ہامی بھرتا ہے، جب وہ چائے بنا رہی ہوتی ہے، تو ثاقب کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے، وہ اِس عورت کے مقابلے میں اپنی بیوی کے بارے میں سوچتا ہے، تو اُسے احساس ہوتا ہے کہ آخر کس قسم کی آزادی اُسے چاہیے؟ پھر خیال آتا ہے تمام مرد و عورت خواہ میاں بیوی ہوں یا محب و محبوب سبھی کسی نہ کسی قسم کی سماجی مجبوری کا شکار، تو ہوتے ہیں، یہاں اِس کی بیوی فوقیت لے جاتی ہے، جو ہر قدم پر اُس کی وفا شعار، غیر مشروط ہے، رضوانہ کا اِس پر اعتماد اور بھروسہ، اُسے تقویت دیتا ہے: ''جب وہ کافی کا دوسرا کپ پینے اور بینش کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اُس کے گھر سے نکلا، تو واپسی پر اُس کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ اپنا امیج سلامت لے کر واپس آ گیا۔'' ۸۶؎ بانو قدسیہ کے افسانے ''ٹھنڈا عذاب'' کا حارث معاشقے لڑانا اپنا حق سمجھتا ہے اپنی بیوی جمیلہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ حارث، تو عشق کی پینگیں چڑھاتا، ڈال ڈال گھومتا رہتا ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے، کہ اِس کی یہ بے وفائی اِس کی بیوی کو کھوکھلا کر رہی ہے، جمیلہ کی کشمکش کو اِس انداز میں پیش کیا گیا ہے: ''شوہر اور بیوی کا رشتہ کیا ہے؟ صرف ایک گھر میں رہ کر ایک دوسرے کے جسم استعمال کرنے کا نشہ، سارا دن اجنبی بنے رہو اور رات کو ایک تکیے پر سر رکھ کر غڑغوں کرنے لگو۔۔۔ خدا جانے دِن کی روشنی کا رشتہ درست ہے کہ رات کے اندھیرے کا۔'' ۸۷؎

قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''اسٹینو گرافر'' کی گریسی، جو کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی، اُس کا باپ سُرخ بالوں والی

بدصورت لڑکی کا اسیر ہو کر تمام گھر کا سامان بیچ کر اُس کے ساتھ ایسا گیا کہ پھر دوبارہ نہ لوٹا اور اُس کی ماں کی زندگی محض آنسو بن کر رہ گئی اور غم سے مرگئی۔ ماں کی موت کے بعد گریسی اپنے بھائی جارج کی شراب اور جوئے کے پیسوں کا انتظام کرتی کہ کہیں یہ بھی اُسے تنہا چھوڑ نہ جائے، یہی وجہ ہے، جب جارج کے مطالبات بڑھے، تو یہی گریسی جو اِس بُرائی سے بچنا چاہتی تھی، بالآخر اسی میں لتھڑ گئی، کیوں کہ وہ محض تحفظ چاہتی تھی اور کھلونا بن گئی، وہ اکثر اپنے بچپن میں جھانکتی، تو اُسے سب کچھ یاد آجاتا:

''گریسی کے ذہن میں اپنے بچپن کے دھندلے سے عکس تیرتے رہتے تھی۔۔۔ایک بدمست اور مخمور باپ شراب کے نشے میں چور گھر میں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ گریسی کی ماں کو بغل میں لے کر یوں جھنجھوڑنے لگتا، جیسے بُھوکا کتا ہڈیاں بچوڑ رہا ہو، اُس کا باپ کئی بار عجیب سی لڑکیوں کو گھر میں لے آتا تھا۔ پیلی پیلی، دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد گالوں پر سُرخی اور پوڈر کے بدنما دھبے، بکھرے ہوئے بال، بانہوں پر اُبھری ہوئی نیلی نیلی رگیں۔''۸۸

رضیہ فصیح احمد کے افسانے ''سُرخ پلنگ پوش کی رات'' میں سیما اپنے شوہر پر بھروسہ اور اعتماد رکھتی ہے، لیکن اِس کے اعتماد کو اُس وقت ٹھیس پہنچتی ہے، جب وہ شادی سے پہلے کے معاشقے کو نئے سرے سے تازہ کرتا ہے اور ناہید جو کہ اِس کی سابقہ معشوقہ بھی تھی اور کزن بھی، اِس کے کمرے میں رات گزارتی ہے، اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اِسے جذبات میں تبدیلی آچکی ہوتی ہے، لیکن اِس کے میاں کا اِس کی طرف متوجہ ہونا ہی دل کی شکستگی کا باعث بنتا ہے اور وہ گومگو کا شکار ہو جاتی ہے کہ کس بات پر یقین کرے اور کس پر نہ کرے۔ خود ناہید، تو باہر سدھار گئی، لیکن اِس کے دِل و دماغ میں انگارے بھر جاتی ہے۔ سیما کا کردار عورت کا سچا ترجمان ہے، کیوں کہ عورت کی سرشت میں یہ بات ودلعیت کر دی گئی ہے، وہ سب تلخیاں اور زندگی کی مُشکلات برداشت کر لیتی ہے، لیکن مرد کی طرح وہ بھی، اپنے شریکِ حیات کے لیے دِلی وجذباتی، ذہنی و قلبی ہر لحاظ سے بلاشرکتِ غیر اپنانا چاہتی ہے عموماً فردِ خود تو وفاؤں کی طلبگار ہوتے ہیں، لیکن اپنی بیوفائیوں سے بیوی کی جھولی میں انگارے بھرتے ہیں، اِس بات کا اعتراف سیما کا شوہر اِن الفاظ میں کرتا ہے:

''سیما کی عادتیں ویسی ہی ہیں، چست ہنسانے والے فقرے اِسی ادا سے کیے جاتی ہے، مگر آنکھیں آج بھی سُلگتی ہیں، کبھی کبھی وہ ایک بستر پر بیٹھے ہوئے دوسرے بستر کے پلنگ پوش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے، حالاں کہ اَب اِن دونوں پلنگوں کے پلنگ پوش ایک سے ہوتے ہیں، میں جانتا ہوں وہ کیا سوچتی ہے، وہ سُرخ پلنگ پوش کی رات اُس کے دِل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، جسے وہ ناہید کی رات سمجھی ہے، حالاں کہ وہ سراسر اُس کی اور میری ملن کی رات تھی۔''۸۹

''کنول کنڈ'' میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اِس کھلنڈرے نوجوان کی نفسیات کو واضح کیا ہے کہ جو شخص گلیمر اور طرح طرح کی عورتوں سے میل جول رکھتا ہے، وہ ہمیشہ ایسی عورت کا متمنی ہوتا ہے، جو اِس کی عزت کی پاس دار ہو۔ عفت وحیا، جس کا جوہر ہے، ایسا مرد بیوی کو بہت رُتبہ دیتا ہے، کیوں کہ وہ غلاظتوں اور بُرائیوں کی اتھاہ گہرائیوں کو چُھو چکا ہوتا ہے، پاکیزہ بیوی کا احساس اِس کے شکستہ وجود کے لیے زندگی کا پیغام بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اخلاقی بگاڑ کے شکار بیشتر مرد نیکوکار بیوی کے ساتھ سُلجھ جاتے ہیں اور بُرائیوں سے تائب ہو جاتے ہیں۔ مرد ہمیشہ عورت کو اُس وقت مقام و درجہ دیتے ہیں،

جب وہ اُن کے تصور و خیال کے تابع ہو، ایسی عورتیں قابلِ تحسین قرار دی جاتی ہیں، خواہ وہ مردہ روحیں کیوں نہ ہوں، یہی وجہ ہے کنول کُنڈ کی بستی کی آسودگی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔ اِس شرافتوں کی بستی میں اتنا بڑا اخلاقی جُرم اس بات کا غماز ہے کہ کسی کنواری یا عورت کا قدم بہک گیا یا بہکایا گیا، عورت مجرم قرار دی گئی۔ کیا عورت کا یہ جُرم تنہا اُس کی ذات تک محدود تھا یا کوئی شریکِ جُرم بھی تھا؟ یہ اَن دیکھا مُجرم ہی حقیقی مُجرم ہے، جسے عموماً نظرانداز کیا جاتا ہے، یہاں سلیم اختر نے مردوں کے معاشرے پر گہری چوٹ کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے ''نیک پروین'' میں گلیمر کی دُنیا میں راجا اندر بنے رہنے والے مرد کا قصہ ہے، جو کہ خوبصورت عورتوں سے معاشقے لڑا چکا ہے۔ عورتوں کی محفلوں میں مرکزِ نگاہ بنے رہنا اُس کا مشغلہ ہے۔ لڑکیاں اِس پر دل و جان سے فریفتہ تھیں۔ شراب و شباب کا رسیہ یہ نوجوان، جب شادی کرتا ہے، تو نہایت سادہ، ہلکے سانولے رنگِ عام، شکل وصورت کی سوکھی و کمزور عورت سے، لیکن یہی عورت اس کی دل کی دُنیا بدل دیتی ہے۔ خاور کے ہمراہ دوست کو جب اِس کی شادی کا علم ہوتا ہے، تو برملا کہہ اُٹھتا ہے:

> ''اگر چہ یہ خاور کا ذاتی معاملہ تھا، مگر مجھے اچھا نہ لگا، ایک، تو اِس لیے کہ مجھ جیسے قریبی دوست اور راز دار سے بھی اُسے راز رکھا گیا، اِس خلجان سے قطع نظر اِس لیے بھی کہ خاور جیسے خوبصورت مرد کے لیے وہ چھپکلی نما عورت قطعاً موزوں نہ تھی۔ خاور کی، تو نسل ہی خراب ہو جائے گی۔ بچے کالے پیدا ہوں گے، چھپکلی اور کالے کلوٹے بچوں کے تصور سے میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔''[۹۰]

شوہر کی حاکمیت کا زہر ہنستی بستی زندگی کو نگل جاتا ہے۔ ایسے مرد عورت کی زندگی کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں ''صحبتِ ناجنس''، ''نکاحِ ثانی''، ''چڑیا چڑے کی کہانی''، ''اگر میں صحرا نشین ہوتا'' اور ''ازدواجِ محبت'' میں تانیثیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ افسانہ ''صحبتِ ناجنس'' جس میں دو تعلیم یافتہ سہیلیاں اِسے مردوں سے بیاہی جاتی ہیں، جن کی طبیعتیں اور میلانِ طبع اُن کے مخالف ہوتے ہیں۔ دونوں خطوط کے ذریعے اپنا مسئلہ ایک دوسرے کو بیان کرتی ہیں اور اپنا کتھارسیس کرتی ہیں۔ عذرا رومانوی خیالات کی مالک، جو پیانو بجانا، شاعری کرنا اور نہایت نفیس طبع ہے، جب کہ اُس کا شوہر غیاث الدین اَن پڑھ گنوار اور کھانے کی میز پر لمبی لمبی ڈکاریں لینے والا ہے اور عذرا پر فریفتہ بھی ہے:

> ''میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی غیر ملک کے باشندے کے ساتھ میری شادی ہوئی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اُنھیں ہندوستانی بی بی نہیں ملی۔ ابا جان کی بے پروائی سے تم واقف نہیں، عجب بے پروا آدمی ہیں، اماں جانی نمائش پرست، دولت پرست ہیں۔۔۔ میں کنویں میں دھکیل دی گئی اور ماں نے مجھے کنویں میں دھکیلا۔''[۹۱]

بانو قدسیہ نے ایسی عورتوں کو بھی موضوع بنایا ہے، جو اپنے شوہر کی عدم توجہی، بے اعتنائی و بے رُخی سے تنگ آ کر انتقاماً جسم فروشی کی طرف مائل ہوتی ہے، تا کہ توجہ جس کی وہ بھوکی ہوتی ہے، اِسی کے حصول میں ہر طرح کی ارذل سطح پر اُتر آتی ہے، اِس ضمن میں اِن کے افسانے ''ایک روایت''، ''کچھ اور نہیں''، ''دو رنگی''، ''پریم بولی اور نقل مقانی'' اہم ہیں، مثلاً ''بازگشت'' کی جمیلہ، فاروق کے ساتھ اپنی شادی کو وقعت نہیں دیتی اور جب فاروق اس سے استفسار کرتا ہے، تو مردوں کے خلاف اِس کا انتقامی رویہ اختیار کرتی ہے: ''مجھے اِس کی معصومیت سے بڑی چڑ تھی، تم نے سنا ہے نا کہ لڑکے لڑکیوں کی

زندگیاں تباہ کرتے ہیں، میں نے اس کی زندگی خراب کی، اِس لیے کہ یوں زندگی خراب ہونے کے بعد وہ بہت پیارا لگتا تھا، بے حد گھبرایا ہوا۔۔۔ بے حد کھویا ہوا۔'' ۹۲ واجدہ تبسم کے افسانے ''ہل'' اور ''نتھ کا غرور'' میں بانجھ مردوں کے بارے میں ہیں، جو اپنے عیب کو چھپانے کی خاطر بے اولادی کا سارا الزام عورت پر دھر کر شادیاں رچاتے رہتے ہیں، مذکورہ افسانوں میں عورت مرد کی اِس عیاری کا جواب باغیانہ روش اختیار کرتے ہوئے دیتی ہے۔ جیسے اولاد کی خاطر بانجھ نواب صاحب کی لائی گئی چوتھی بیوی بغاوت کا راستہ اختیار کرتی ہے، اِسی طرح ''نتھ کا غرور'' میں نامرد میاں نے اپنی مظلوم بیوی کو شرافت دلہن کا خطاب دیا، جب کچھ عرصہ تک اولاد نہ ہوئی، تو بڑی پاشا نے بیٹے کی دوسری شادی کی ٹھانی، شرافت محل نے شوہر کی کئی ماہ کی عدم موجودگی میں اپنے نوکر محمود سے تعلقات اُستوار کر لیے، جب نواب کو زمینوں پر اطلاع ملی کہ وہ باپ بن گئے ہیں۔ بھاگم بھاگ واپس آئے۔ استفسار پر بیوی نے جواب دیا:

> ''ذرا صبر سے کام لیو آپ ___ میں ہوب سمجھاتیوں آپ کو ___ میرا نام شکو ___ شاکرہ تھا، صابرہ بھی ہو سکتا تھا، زاہدہ بھی، شکر کر لیتی، زہد کر لیتی، آپ کے واسطے سوب کر لیتی کیوں کہ آپ بولے تھے نا کی نتھ ایک طرحوں سے عزت ہور غرور کی رکھوالی کرتی ___ ہور یہ بھی بولے تھے کہ اس عزت کو سنبھال کر رکھنا اَب میرا اَچ کام ہے کیوں کی، مَیں ''شرافت محل'' کا خطاب آپ کی حویلی سے پائی۔'' ۹۳

انوار صدیقی کے افسانے ''پھانس'' کا شیرا کو اُس کا دوست رحمتے اُس کی منگنی ہونے پر، اُس کی منگیتر کلثوم کے خلاف اُکساتا رہتا ہے، جو مولوی عبدالمتین مسجد کے پیش امام، کے پاس قرآن پڑھنے جاتی ہے، وہ دوسرے لفظوں میں کلثوم اور مولوی عبدالمتین کا سکینڈل بنانے کی کوشش کرتا ہے، شیرا اپنی طبعیت کی سادگی کی وجہ سے اُس کی باتوں میں آجاتا ہے۔ کلثوم اِس پر شدید ردِعمل کا اظہار کرتی ہے: ''میں سب سمجھتی ہوں، تیرے دماغ میں یہ بات رحمتے نے بٹھائی ہوگی، اِس کی گندی کھوپڑی میں ہر وقت باؤلی ہنڈیا پکتی رہتی ہے۔ باپ دن بھر دوسروں کے جوتے گانٹھتا ہے اور وہ لڑکیوں سے پیچ لڑانے کے چکر میں سارا دن کٹی ہوئی پتنگ کی طرح آگے پیچھے ڈولتا پھرتا ہے۔'' ۹۴

عورتوں کو جہاں نصیحت کی جاتی ہے کہ دوسروں کی باتوں میں آکر اپنا گھر نہ برباد کر لیں وہیں شیرا جیسے مرد، جب رحمتے جیسے کمینے لوگوں کے ہتھے چڑھ جائیں، تو اچھی بھلی اپنی خوش گوار زندگی میں زہر گھول لیتے ہیں۔ ایسے لوگ خود کو سب سے زیادہ سچا مخلص اور اچھے بھلے شخص کی خانگی زندگی تباہ کر دیتے ہیں، اس کے نفسیاتی محرکات میں سب سے بڑا محرک حسد اور رقابت کا ہوتا ہے، چوں کہ خود نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں، اِس لیے اِن کی دانست میں اِن کی برتری میں کمی آتی ہے۔ لہٰذا، اپنے سے برتر یا بہتری کی طرف کسی کو بھی دیکھتے ہوئے، اُنھیں اپنی اہمیت کم ہوتی دِکھائی دیتی ہے، نتیجہ اپنا بن کر سب کچھ چھین لینے کی کوشش کرتے ہیں اور جب کوئی شخص اِن کی باتوں میں آکر اپنی نجی زندگی بربادیوں، تلخیوں اور اپنی بیوی بچوں کو ناخوشی اور ناآسودگی کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے، تو یہی لوگ اپنی زندگی میں شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے افسانے ''آدھی عورت، آدھا خواب'' میں عورت اور مرد کے مابین روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کی نمایاں وجوہات کی نشاندہی کی گئی ہے، جو جنسی تفاوت کا باعث بنتی ہیں، اِن جوڑوں کی بھی نشاندہی کی ہے، جو بہترین زندگی بسر کرتے ہیں:

> ''مرد کی شہرت سے مرد کی عزت نہیں گھٹتی، تو عورت کی شہرت سے کیوں، اس کی بڑائی کو

گھن لگ جاتا ہے۔۔۔ دُنیا میں کروڑوں عورتیں اپنے شوہر کی بیوی بن کر مزے سے
رہتی ہیں، اُنھیں احساسِ کمتری نہیں ہوتا، مرد کے کان میں پیدا ہوتے ہی پھونک دیا جاتا
ہے کہ وہ برتر ہے اور اُس کی معصومیت دیکھیے کہ وہ واقعی یقین کر لیتا ہے کہ وہ دُنیا کی لائق
ترین عورت سے بلند ہے، صرف اس لیے کہ وہ مرد ہے پھر، جب اُسے اپنے سے زیادہ
تعلیم یافتہ اور عقل مند عورت ملتی ہے، تو وہ اس سے نفرت کرتا ہے، کیوں کہ اُس وقت وہ
خود کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔'' ۹۵

انوار صدیقی کے افسانے ''مایا جال'' کی بیوی اپنے شوہر کے عتاب اور نفرت کا اِس لیے نشانہ بنی رہتی ہے کہ اِس کا شوہر ریشہ نامی عورت کے دام میں اسیر ہوتا ہے۔ ''مایا جال'' شادی شدہ خائن مردوں کی کہانی ہے، جو اپنے معاشقوں اور دوستانوں کو اپنا حق سمجھتے ہوئے نہ صرف خود اپنی ذات کو دھوکہ دیتے ہیں، بلکہ اپنی بیوی کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظر میں اُن کے معاشقوں میں سب سے بڑی رُکاوٹ بیوی ہی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بات بات پر لڑائی جھگڑا، ہر بات میں نقص نظر آنا، اچھائی بھی بُرائی محسوس ہونا، چڑ چڑا پن، بدمزاجی، غیر حاضر دماغی اِن کا معمول بن جاتی ہے، ایسی حالت میں جب بیوی شوہر کو پریشان اور اُداس پر کر استفسار کرتی ہے:

''کیا بات ہے آج کچھ پریشان پریشان سے نظر آرہے ہیں' 'ہاں۔۔۔ میری طبعیت
اِس وقت ٹھیک نہیں' کیا محسوس کر رہے ہیں، کسی ڈاکٹر کو دکھایا؟ میری بیوی نے پیار سے
پوچھا، تو میں چیخ اُٹھا: 'دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے میری بربادی کا سبب
تمھاری ہی منحوس ذات ہے۔'' ۹۶

''احمق کٹھ پتلی'' میں علامتی انداز اختیار کیا گیا ہے، ایسی عورت کی جیسے مرد اپنی سوچ اور تصور کے مطابق تراشتا ہے اور اُسے شادی کے خواب دکھاتا ہے کہ میں تمھیں اچھے اچھے کپڑے بنوا کر دوں گا۔ تمھیں میری خدمت کرنا ہوگی، دن میں بھی اور راتوں کو بھی میں تمھیں کپڑے، زیور بنا کر دوں گا، تم میرے بچے پیدا کرو گی، ان کی پرورش کرو گی، پتلی استفسار کرتی ہے کہ کب تک تو اُسے جواب ملتا ہے عمر بھر۔۔۔ ساری زندگی کی بیگار کی فہرست سُن کر جن میں فرائض کی بھرمار اور حقوق کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ لکڑی کی بے جان مورتی بھی بے اختیار چیخ اُٹھتی ہے کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اپنی خلافِ طبع پتلی کی بات سُن کر مرد ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ پتلی کی یہ باغیانہ روش اُسے سیخ پا کر دیتی ہے، اُس کی تمام محبت کی بجائے نفرت کی زہرناکی میں ڈھل جاتا ہے۔ ''کاٹھ کی عورتیں'' کا مرد دراصل ایسی عورتوں کا انتخاب کرتا ہے، جو مجبور و بے کس تھیں، جن کے پاس واپسی کی راہیں مسدود تھیں، یہی وجہ ہے کہ اُس کے تمام ظلم برداشت کرنے کے باوجود ساتھ رہنے پر مجبور تھیں۔ ایک روز بستر پر مُردہ پایا گیا، اِن استحصال شدہ عورتوں نے مل کر اِس ظالم کا خاتمہ کر دیا۔ دوسرا کردار اِس افسانے کا جلالی ماموں ہے، جو انتہائی جھگڑالو اور ضد کا پکا ہے، اپنی ذرا سی بات کی نفی برداشت نہیں کرتا اور پے در پے مار پیٹ اور گالی گلوچ سے کام لیتا ہے۔ ماموں جب بیمار پڑتا ہے، تو ہر طرح ظلم سہنے والی یہ کاٹھ کی عورت ماموں کے مفلوج ہونے پر سارے زندگی سہے گئے ظلم و ستم اور لاشعور میں چھپے ہوئے غصے کا اظہار بڑے غیض و غضب سے کرتی ہے: ''حرام زادے، کمینے، ذلیل، کتے، تو نے ساری عمر مجھے جلایا! ذلیل کیا، ظلم توڑے، ہاں! اب کیا مردہ مثال پڑا ہے۔ کتے! کہاں گئی تیری اکڑ فوں

اور تیرا اطلطنہ!۔'' ۹۷ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے ''مٹھائی پلیٹ اور دودھ کا گلاس'' میں Marital rape کی نشاندہی کی گئی ہے۔مرد اپنی خواہش میں اندھا ہو کر، عورت کی رضامندی کو مدِنظر رکھے بغیر تسکین کا سامان کرتا ہے۔شوہر کے جبر کا شکار زرینہ کی نفسیاتی اُلجھنوں اور جنس کے حوالے سے اُس کے دِل میں پیدا ہونے والے خوف کی وضاحت بھی کی گئی ہے:

''اپنی بہن اور بعدازاں ماں کے سمجھانے کے باوجود بھی اُس کا ذہن ازدواجی جنس کو تسلیم نہ کر سکا۔پہلی رات کو واحد اِس کے ساتھ، جس وحشیانہ انداز سے پیش آیا، اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کے ذہن میں خوف اور ڈر کی مُہر ثبت کر دی، ڈوبتے سورج کے ساتھ ہی زرینہ کا دِل ڈوبنے لگتا۔صبح، جب نماز کے وقت وہ اُٹھ کر نہاتی، تو دِل ہی دِل میں شرمندہ اور خود کو مجرم سا سمجھتی، بعض اوقات وہ کام کی تھکن، سردرد، کمر درد کا بہانہ کر کے اپنی جان بچا لیتی، ایسے میں اُسے انجانی خوشی ملی، جو وصل انجان مرد اور عورت کے لیے دائمی پیار کا بندھن ثابت ہوتا ہے، وہی یہاں نفرت کی خلیج کی صورت اختیار کر گیا۔'' ۹۸

افسانے ''رُکاب'' میں شوہر پے در پے بیٹیوں کی پیدائش کا الزام اپنی بیوی کے سر تھوپتا ہے اور اُسے نفرت کا نشانہ بناتا رہتا ہے:

''تیرا وجود ہی بے برکت ہے، ورنہ اللہ کے لیے یہ اتنا مشکل، تو نہیں تھا، مر جائیں گے ہم، تو پیچھے ہمارا نام لینے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔۔۔میرے باپ نے جیسے میری ماں کو طعنہ دے کر، اُس کے وجود کی استطاعت کی نفی کرنے کی کوشش کی تھی، اس لیے میری ماں نے چپکے سے خفیہ طور پر آپریشن کروالیا، تا کہ میرا باپ سال دو سال بعد میری پیدائش کا مقدمہ بھول کر، پھر ایک بیٹے کی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری ماں کو حاملہ نہ کر سکے کیوں کہ میری ماں بھی ایک کمزور عورت تھی اور عورت ہونے کے ناتے وہ بھی دھوکہ کھانے پر مائل ہو سکتی تھی۔'' ۹۹

شادی شدہ عورت سماجی رسوم، شوہر اور سُسرال کے تشدد اور ناروا سلوک کی بھینٹ چڑھتی ہے، رشتوں کی بدصورتی اُس سے جینے کی تمام اُمنگ لیتی ہے، اسی طرح معاشرہ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی زندگی بھی عذاب بنا ڈالتا ہے۔غیر شادی شدہ عورتوں کی زندگی کے مسائل اور اِن کو درپیش مشکلات کا احاطہ بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنے منفرد انداز میں کیا ہے۔پریم چند کے افسانے ''وفا کی دیوی'' کی تلیا ایسا کردار ہے، جس کی بچپن میں شادی کر دی جاتی ہے، جب صرف پانچ برس کی تھی، لیکن جوان ہونے پر حقوق آشنا ہوتی ہے اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف باغیانہ روش اختیار کرتی ہے:

''اِس زمانے میں کون کس کا ساتھ دیتا ہے، تلیا جب اپنے گھر والوں نے ساتھ نہ دیا اور تیرے بھیا کے مرتے ہی میرے خون کے پیاسے ہو گئے، تو پھر میں کس سے اُمید رکھوں کیا تو میرے گھر کا حال نہیں جانتی، تجھ سے کیا چھپا ہے، وہاں نائن، کہاون کے لیے روٹیاں ہیں میرے لیے نہیں ہیں اور راتوں کی ساری روٹیاں کون کھائے، میں کسی سے خیرات نہیں مانگتی، اپنا حق مانگتی ہوں، میں رکھیل نہیں ہوں، ادھری نہیں ہوں، بیاہتا ہوں، دس آدمیوں کے بیچ میں بیاہ کے آئی ہوں، اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی اور اپنا حصہ

لے کر رہوں گی۔''۱۰۰

خدیجہ مستور کے افسانے ''ہوس''، ''جوانی'' اور'' کیا پایا'' میں پڑھی لکھی اور ملازمت پیشہ لڑکیوں، خواتین کی داستان ہے، عموماً پڑھی لکھی باشعور لڑکیاں اپنے گرد لوگوں کے منافقت اور خود غرضانہ دوغلے پن، بے جا پابندیوں، سختیوں، گالی گلوچ اور دھونس کے رویوں سے شادی سے متنفر ہو جاتی ہیں، کیوں کہ شادی کے بعد لڑکیوں کے ساتھ مالِ مسروقہ کا سا سلوک کیا جاتا ہے، اِن سے اپنوں کا حق بھی چھین کر محض غلام ولونڈی کا درجہ ہی دیا جاتا ہے، وہ شوہر اور اُس کے گھر والوں کے ہر حکم کی پابند اور ہر قسم کی توہین کو سہنے کا سر چشمہ سمجھی جاتی ہے۔ حقوق آشنا خواتین کو عموماً ناپسندیدہ کلمات سے نوازنے کے علاوہ اُن کی عزتِ نفس کو زیادہ کچلا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں شادی سے متنفر ہو جاتی ہیں، لیکن دورانِ ملازمت بھی اُنھیں اِس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اِن کے گرد تانا بانا، تو اُٹھی افرادِ معاشرہ کا ہے، جو ہر کنواری لڑکی کو ہراساں کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں، یہاں بھی ہر طرح کا استحصال عروج پر نظر آتا ہے۔ ''ہوس'' کی طاہرہ جو دس بہن بھائیوں اور بیوہ ماں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے نہ چاہتے ہوئے بھی شادی کرنے سے انکاری ہو جاتی ہے، طاہرہ سے شادی کا متمنی شادی سے انکار پر بہت رنجیدہ ہوتا ہے، وہ اِس سماجی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اگر اُس کی شادی طاہرہ سے ہو جاتی، تو اِس کی اپنی ماں بہنیں اُس کی زندگی کا دائرۂ حیات کم کر دیتیں، کیوں کہ'' کمائی کرنے والی بہو اگر اپنے گھر والوں کو بھی کچھ دینا چاہے، تو روز روز کی خانہ جنگی سے سامنا رہتا ہے۔''۱۰۱ اِسی طرح افسانہ ''جوانی'' کی بٹن کا سارا وقت ماں کی خدمت دیکھ بھال میں گزر گیا پر ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کا شوق غالب رہا، جب اپنی کماؤ بیٹی کا گھر بسانا اُنھیں گوارا نہ تھا، کیوں کہ ایسی صورتحال میں اُن کا اپنا گھر لٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا چڑایا اور پھر پوتے پوتیوں کا، سب کی خدمت کر کے بھی گالیاں ہی اُس کی قسمت میں لکھی تھیں، وہ کب سے سنتی آئی تھی کہ بھیا اِس کی شادی کا انتظام کر رہے ہیں، لیکن ہر سال آتا اور گزر جاتا، اکثر اکیلے میں گھر والوں کو کوسنے دینا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ ہر وقت سوچوں میں ڈوبی ہوئی بٹن کو کھانا جل جانے پر ماں اور بھابی کے کوسنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے: ''میں کہتی ہوں اماں کہ تم نے بٹن کو اب تک بٹھا کیوں رکھا ہے، اِس کے لچھن، تو یہی کہتے ہیں کہ اب ہم سے نہ بیٹھا جائے گا۔ نوج بیوی کنواری بالی لڑکیوں کے لیے ڈھنگ ہو۔ قیامت قریب ہے کنواری اپنے منہ سے بر مانگے، بھائی کی انگلی ناک پر لٹک گئی۔'' ۱۰۲

محمد سعید شیخ کے افسانے ''میں جاناں جوگی دے نال'' کی ریٹائرڈ پرنسپل، جس کی آنکھوں کی بینائی بہت کم ہو چکی ہے۔ پھر بڑھاپا، بلڈ پریشر اور دیگر امراض کا شکار ہوتی ہے، اکثر نیند میں اپنی مرحومہ ماں کو دیکھتی ہے اور اجازت چاہتی ہے کہ جو شخص اُسے چاہتا ہے اُس کے ساتھ زندگی کے بقیہ دن بتائے، کیوں کہ جوانی کا سارا وقت اُس نے ماں کے مرنے کے بعد بہن بھائیوں کو پالنے اور اُنھیں تعلیم دِلوانے، شادیاں کرنے میں بسر کیا۔ اَب چوں کہ ہر کوئی اپنی زندگی میں مگن ہو گیا، تو اِس ہمہ ہمی میں کسی کے پاس اُس کے لیے کوئی وقت نہیں، اگر کوئی اُس پر توجہ دے بھی رہا ہے، تو اُس کی پینشن اور دیگر واجبات، وجہِ دلچسپی ہیں۔ پرنسپل کا بھائی اپنی بیوی سے بڑی بہن کا دھیان رکھنے کا کہتا ہے، کیوں کہ اِن بھائی بہنوں پر اُن کے بڑے احسانات ہیں، جواباً اپنی سوچ کا اظہار اِس انداز میں کرتی ہے:

> ''میں سمجھتی ہوں، مجھے پتہ ہے، اِسی لیے میں چاہتی ہوں وہ جیسی بھی ہیں زندہ رہیں، اگر خدانخواستہ اِنھیں آج کچھ ہو جائے، تو اِن کی پینشن سے اِس گھر کو جو سپورٹ ملتی ہے، وہ

ختم ہو جائے گی۔۔۔ اب انھوں نے ایک نوکرانی بھی رکھ لی تھی، تاکہ آپا کی دیکھ بھال
کا زیادہ بوجھ وہ اُٹھا سکے۔'' ۱۰۳؎

خالدہ حسین کے افسانے ''الاؤ'' میں کم عمری کی شادی کے حمایت داروں کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کرداروں کی زبان سے مؤقف اختیار کیا ہے، اسی طرح اساتذہ کی باہمی گفتگو سے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ عورتوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے:

''بھئی تم لوگ کیسے مزے سے بیٹھی باتیں بنا رہی ہو، اِس لیے کہ تمھارا گھر ہے شوہر ہے
بچے ہیں تمھارے پاس زندگی کا اتنا ٹھوس۔۔۔ اتنا بڑا مقصد ہے۔۔۔ مگر مجھے دیکھو
مجھے اپنی تمام خوبصورتی کے باوجود ایک تنہا اُجاڑ کمرے میں تصویروں کے درمیان وقت
گزارنا ہے، بلکہ وقت کو مارنا ہے، قتل کرنا ہے، سلیمہ نے یکدم غصے میں آ کر ہینڈ بیگ بند
کیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔'' ۱۰۴؎

ممتاز مفتی کے افسانے ''سے کا بندھن'' میں آپی کی زبان سے لڑکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ''جو گر گئی وہ سمجھ لو نظروں سے گر گئی، پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔'' ۱۰۵؎ ''سے کا بندھن'' میں لڑکیوں کے رشتوں کے مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے کہ ماؤں کو مجبوری بن جاتی ہے کہ وہ بر دکھاوے کے لیے اپنی بچیوں کو سجا سنوار کر پیش کریں، اس میں لڑکی اپنی توہین محسوس کرتی ہے کہ اگر اُسے ٹھکرا دیا گیا، تو اِس کی عزتِ نفس مزید مجروح ہوگی:

''امی ہر وقت مجھے بناتی سجاتی رہتی۔ پلیٹ برستے بادام لگاتی رہتی چاندی کے ورق سے
سجاتی رہتی۔ میری ہر بات پر کڑی نظر رکھتی۔ یہ پہنو وہ نہ پہنو، یوں پہنو، یوں نہیں۔ یوں
اُٹھو، یوں بیٹھو، یوں مسکراؤ یوں بات کرو، یوں ڈرنکس سرو کرو، یوں چائے بناؤ، یوں پان
پیش کرو، یوں دیکھو، یوں مسکاؤ۔'' ۱۰۶؎

افسانہ ''ڈوبتے جسم کا ہاتھ'' میں ڈاکٹر رشید امجد نے بیٹی کے والدین اور گھر والوں کی بے بسی اور مجبوریوں کا ذکر کیا ہے، جو تمام خوداری تربیتوں کے باوجود بیٹی کو جھکے رہنے اور خاموش رہنے کی تلقین کرتی ہی نظر آتے ہیں، کیوں کہ سماجی رویے اور روایات ایسی ہیں کہ جو مردوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتی ہیں، اِس لیے سُسرال کے مظالم، جن میں سرِ فہرست ناانصافی و ناہمواری، کوسنے، طعنے، گالی گلوچ ہوتے ہیں۔ لڑکی کے والدین اور گھر والوں کو کمتر درجے کا سمجھ کر طعنہ زنی کی جاتی ہے۔ شادی سے قبل بھی یہی رسومات کی زنجیر زندگی کو زخم خوردہ کر دیتی ہیں، جن میں نالائق بیٹوں کے لیے بھی چاند سی دلہن تلاش کی جاتی ہیں، حالیہ دَور میں کماؤ دلہن کی تلاش عروج پر نظر آتی ہے، مذکورہ افسانے میں باپ بے بسی سے اپنی بیٹی کے جہیز کی تیاریاں نہ ہونے کا کرب سہتا ہے، چوں کہ کسی دَور میں اِس نے اپنا بیمہ کرا رکھا تھا، اِس لیے موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے تاکہ بیمے کی رقم سے بیٹی کو رخصت کیا جاسکے: ''گھر میں جوان لڑکیاں ہوں، تو اُنھیں رخصت کرنے کے لیے کئی ٹکرے دینا پڑتے ہیں اور تم صرف ایک ہی بات کر رہے ہو؟ صرف ایک۔'' ۱۰۷؎ ''تلچھٹ'' میں جیلانی بانو نے عورت کے متعلق سماجی رویے کی عکاسی بھی کی ہے:

''اونھ مت رو کو نگوڑی ماریوں کو۔۔۔ کنوای لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں، کون جانے
کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہو۔۔۔، جب تم کسی ناصر یا شاید کلرک سے بیاہی جاؤ گی

اور آنسو پونچھتے ڈولے میں سوار کرائی جاؤ گی، پھر ہر سال ایک ننھے منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ساتویں یا آٹھویں ننھے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مرجاؤ گی۔۔۔ ہر لڑکی اِنھی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے، مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈنا چاہا، جس کی سزا میں موت و زندگی تم پر حرام ہوگئی۔'' ۱۰۸

''الحمد للہ'' میں مسجد کے مُلا کی زندگی کی جھلکیاں دکھائی ہیں کہ کس طرح اُس کے گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، اُس کی بڑی بیٹی مہر النسا کی شادی کی جب بات چلائی گئی، تو لوگوں کے اُس کے گھر کے بارے میں تاثرات بھی اُس کے گھر کی طرح کے ہی تھے۔ ''گھر سے گھر تک'' میں قاسمی نے سفید پوش متوسط طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا ہے جن کے بچے بچیوں کے رشتوں کے سلسلے میں اُنھیں نمود و نمائش کے تقاضوں کو دکھاوے کی حد تک پورا کرنا پڑتا ہے، تا کہ معاشرے میں معزز کہلائے جائیں، اِسی طرح افسانہ ''احسان'' میں ایسے گھرانوں کو موضوع بنایا ہے، جن کے سربراہ نہ ہوں اور مرد دوسرے ملکوں میں چلے جائیں، اکیلی لڑکیاں ظالم سماج کی نگاہوں اور فریب پرستی کا شکار ہونے کو رہ جائیں۔ ''احسان'' کی صبیحہ، جو دو بھائیوں کی بہن، بھائی دوبئی سدھار گئے، ماں مرگئی اور باپ چارپائی سے جالگا، اُس کی زبانی قاسمی نے معاشرے میں تنہا اور بے سہارا خصوصاً کنواری لڑکیوں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح ہر کوئی اُنھیں اپنی دولت و متاع سمجھتا ہے۔ بہتان طرازی اور لُٹ جانے کا خوف ہر وقت اِن بچیوں پر منڈلاتا رہتا ہے، اسی طرح ''عالاں'' میں بھی لڑکیوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے کہ بچیاں، جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں، تو ہر کوئی اُنھیں حریص نظروں سے تولتا ہے: ''گاؤں میں جوان لڑکی کا ایک ایک قدم گنا جاتا ہے۔ ایک ایک نظر کا حساب رکھا جاتا ہے۔'' ۱۰۹

بشریٰ اعجاز کے افسانے ''حل'' میں رشتے کے لیے لڑکیوں کو نظروں میں تولنے والوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کہ کس طرح لڑکیوں کو قربانی کے جانور کی طرح تولا جاتا ہے اور پھر پسند آئے، تو ٹھیک ورنہ دھتکار دیا جاتا ہے۔ ''حل'' کی مرکزی کردار روز روز کی ذلت سے بچنے کی خاطر اپنے ملازم شیدے کے پُھسلاوے میں آکر گھر سے بھاگ جاتی ہے:

> ''آج پھر چند خریدار آئے تھے میرا سودا کرنے، حسبِ معمول مجھے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں جانچتے، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے وہ قصائی ہی، تو لگ رہے تھے، سودا کرنے سے پہلے خوب ٹھوک بجا کر مال دیکھتے ہیں، پھر قیمت لگاتے ہیں پھر وہی ہوا، جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، اُنھیں مال پسند نہیں آیا اور وہ مسترد کر کے چلے گے اُن آنکھوں کی چمک، چہرے کی سختی اور چال کی مضبوطی اِس بات کی امین تھی کہ وہ ماہر کھلاڑی ہیں اور اِس سے پہلے وہ اِس طرح کے کھیل کھیلتے رہے ہیں۔'' ۱۱۰

اُس کے نزدیک اُس کے خاندان اور گھر والوں کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اُس کی شادی ہے، جو ہوتے دکھائی نہیں دیتی، اپنے اور اپنے خاندان کو ناکامی کی ذلت سے بچانے کی خاطر وہ راہِ فرار حاصل کرتی ہے، نظروں میں تولنے والے اور پھر انکار کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ جیسے ناپا تولا جارہا ہے، اُس کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔ غزالہ خاکوانی کے افسانے ''نامعتبر رفاقتیں'' میں شادی کے معاملات میں عام طور پر لڑکیوں کو بے خبر رکھے جانے کو موضوع بنایا ہے:

> ''اُس نے شادی کی خبر ایسے سنی جیسے وہ کسی اور کی شادی کی اُڑتی خبر ہو مگر۔۔۔ وہ خبر اسی

کی اپنی شادی کے بارے تھی، اس کی انا کو شدید ٹھیس پہنچی، اُسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بکنے والا بے زبان مویشی ہو، جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ خریدنے والے ہاتھ کتنے کھر درے اور کرخت ہیں، وہ سارا دن پڑی سوچتی رہتی، کیا اس کی کوئی شخصیت نہیں؟ کیا وہ اپنی رائے کے اظہار سے عاری ہے، وہ اتنی نا سمجھ بھی نہ تھی کہ اُسے نظر انداز کر دیا جاتا، وہ گریجویٹ تھی، اپنا بُرا بھلا سوچ سکتی تھی، پھر کیوں اُسے نظر انداز کیا گیا، کیوں آخر؟"[۱۱۱]

فرخندہ لودھی کے افسانے "اپنا دامن اپنا ہاتھ" کی صبیحہ معمولی شکل وصورت کی مالک تھی، جس پر فریفتہ ہوکر، جو شخص اِس سے شادی کا ڈھونگ رچاتا ہے، وہ اپنا چہرہ بے نقاب کر دیتا ہے اور وٹہ سٹہ کا خواہاں ہے: "شادی کے واقعے کو مشکل سے دس دن ہوئے تھے کہ خبر ملی، رابعہ کی بیٹی کو طلاق ہوگئی، بھی کیوں؟ نازش کہتا ہے کہ زاہدہ میرے رنڈوے باپ سے شادی کرے، تو میں صبیحہ کو رکھتا ہوں ورنہ صبیحہ اِس قابل نہیں کہ اسے گھر میں رکھا جا سکے۔"[۱۱۲] اشفاق احمد اپنے افسانے "پناہیں" میں بے جوڑ اور جبراً کی گئی شادی کے انجام بد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اپنی بیوی سے بوڑھے کے تعلقات کچھ اتنے خوشگوار نہیں تھے، اِن کی ازدواجی زندگی نارضامندی کی شادی کا ایک تلخ رِدِعمل تھی، بوڑھا ایک کامیاب سلوتری تھا، لیکن ایک ناکام خاوند! شادی سے لے کر آج تک اُس کی بیوی کبھی ایک سال سے زیادہ اس کے پاس نہ رہ سکی۔ بیٹھے بیٹھائے کوئی نہ کوئی بات ایسی چل نکلتی کہ فوراً تانگہ منگوایا جاتا اور بیگم صاحبہ کھڑے پاؤں میکے پہنچ جاتیں، بچوں کو بھی اپنے باپ سے وہ الفت نہ رہی تھی، پھر اُٹھتے بیٹھتے ماں کے منہ سے ابا کے خلاف ایسی باتیں سنتے، اُنھیں اور بھی یقین ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اِن کے کچھ نہیں لگتے۔"[۱۱۳]

رشید امجد کے افسانے "بیزار آدم کے بیٹے" میں شادی کا جھانسہ دے کر لڑکیوں کو پھانسنا، گھر سے، تعلیمی اداروں، دفاتر، خرید وفروخت سودا سلف خریدنے کے لیے جانے والی خواتین، گھروں میں کام کاج اور اِس کے علاوہ راہ جاتی لڑکیوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنا، اغوا کرنا اور ہوس کا نشانہ بنانے والوں کو موضوع بنایا ہے، اِس کے لیے رشید امجد نے تمثیلی انداز اختیار کیا ہے:

"میں تمھیں قتل کرنے کے لیے یہاں لایا ہوں۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں میں قصائی ہوں، ب بھی قصائی ہے، ج اور د بھی۔۔۔ ی تک ہم سب قصائی ہیں۔۔۔ وہ قتل ہونے سے بچنا چاہتی ہے، لیکن کوئی نہ کوئی اُسے ضرور قتل کر دے گا۔ باہر ب چھرا لیے کھڑا ہوگا، اُس سے بچ گئی، تو ج چوک پر ہوگا، اُس سے بھی بچ گئی تو د ہوگا، ایسے ی تک آخر وہ کس کس سے بچے گی، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب قاتل ہیں۔۔۔ میرے قریب سے ایک لڑکی گزرتی ہے۔ میرے اندر کا ڈریکولا پھڑ پھڑا کر باہر نکلتا ہے اور لڑکی پر جھپٹتا ہے، وہ چیخیں مارتی بھاگ جاتی ہے، میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں کہ کسی نے مجھے دیکھا، تو نہیں، لیکن میرے چاروں طرف ہر شخص اپنے ڈریکولا کو چھپانے کی فکر میں ہے۔"[۱۱۴]

بشریٰ اعجاز کے افسانے "بارہ آنے کی عورت" میں پسند کی شادی کرنے والے ریاض اور شمو کا قصہ ہے۔ دو بچیوں کی

ولادت کے بعد ریاض امریکہ شہریت حاصل کرنے کے لیے شادی رچالیتا ہے اور بیوی بچوں کو بے یارومددگار چھوڑ جاتا ہے۔ ریاض کی اِس بے وفائی کا شمو پر اتنا گہرا اثر ہرتا ہے کہ وہ خود سے اور بچوں سے بیگانہ ہوجاتی ہے، اس کی زندگی کا ہر لمحہ کربنا کی کی نظر ہوجاتا ہے، اِن کمزور لمحوں میں شہباز نامی شخص، جو خود بھی شادی شدہ بال بچے دار ہے، زبردستی کی شادی اور بیوی سے ناپسندیدگی ظاہر کر کے شمو کی ہمدردی مول لیتا ہے۔ انسان خواہ مرد ہو یا عورت ہو، جب اپنی ذات کو گرادیتے ہیں تو ہر کوئی اِسے نوچنا کھسوٹنا اپنا حق سمجھتا ہے، جس طرح کھلے برتن میں ہر کوئی منہ مارنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ شمو بھی شہباز کی دلفریب اور لچھے دار باتوں اور ''داستانِ غم'' سے متاثر ہوجاتی ہے اور جب کبھی وہ اِس شہر میں آتا ہے، اُس کے ایک فون کال پر نہ دن دیکھتی ہے اور نہ رات اُس کے فلیٹ پر پہنچ جاتی ہے۔ بچیوں کو نوکرانی کے سپرد کر کے وہ بھی اُنھیں دودھ میں افیون ڈال کر سوتا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ شمو شہباز کے ساتھ سپردگی کی تمام حدیں پار کر جاتی ے۔ شہباز بھی خوب موقع پرست ہوتا ہے۔ بظاہر اِس تعریف وتوصیف اور لچھے دار باتوں سے اپنا اسیر بنائے رکھتا ہے، اس کی اصلیت اُس وقت کھلتی ہے، جب ایک روز اِس کے دوست اُسے بڑی داد دے رہے ہوتے ہیں، کہ کس مہارت سے وہ عورتوں کو چکمہ دے کر اپنا اسیر کر لیتا ہے۔ شہباز کی جواباً گفتگو اُس کی نفسیات کی بھرپور غمازی کرتی ہے:

> ''ویسے حامد یار یہ 'کیپ' والی بات کچھ جچی نہیں۔ ارے بھلے آدمی 'کیپ' کے تو سو نخرے اُٹھانے پڑتے ہیں۔ مطالبے ماننے پڑتے ہیں۔ جیب ہلکی کرنی پڑتی ہے۔ کیا مطلب؟ کہنے والا اَب کے قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ارے میرے یار سمجھا کر یہاں، تو معاملہ ہی کچھ اور ہے، وہ عجب سے لہجے میں بولا، نہ جیب پر بوجھ، نہ ذہن پر بھار، بس ایک بارہ آنے کی ٹیلی فون کال اور کچھ بھی نہیں، وہ سر کے بل دوڑتی چلی آتی ہے۔ ارے بھئی مجھے، تو وہ صرف بارہ آنے میں پڑتی ہے، بارہ آنے میں، اِس نے چہکتے ہوئے حامد کی طرف دیکھا، جو خاصے گاؤدی پن سے اُسے دیکھ رہا تھا۔'' ۱۵؎

''کاٹھ کی عورتیں'' عورتوں کو دھوکے دے کر شادیاں کرنے والے مردوں کی نفسیات بیان کی گئی ہے، جو دوسروں کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہیں: ''وہ بڑا زہریلا مرد تھا، گالیاں دیتا، گندی اور بڑی بڑی، تھپڑ مارتا اتنے کہ منہ سُجا دیتا، جوتے مارتا، گھر سے نکال دیتا، مگر وہ پاؤں پر گر کر معافی مانگتیں۔'' ۱۶؎ ''اشتہار'' میں نیر اقبال علوی نے دورِ حاضر کی عورت کے مسائل میں سرِ فہرست مسئلۂ شادی کو موضوع بنایا ہے۔ مردوں کی نااہلی اور بے عملی اَب شریکِ زندگی کی بجائے کار اور کاروبار اور مادیت پرستی کو جنسِ مخالف پر ترجیح دے رہا ہے۔ عورتیں مردوں کو راغب کرنے کے لیے اخباروں کے پُر کشش اشتہارات کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف یورپ کی عورت ہجر ووصال کی نفی کرتے ہوئے مرد کی دسترس سے نکلنے کے راستے اختیار کر رہی ہے۔ اس خودمختاری سے مُراد اب اولاد کے لیے عورت مرد سے شادی کی محتاج نہیں ہوتی ہے وہ کسی بھی مرد کے عطیے میں دیے گئے نطفے سے حاملہ ہوسکتی ہے، لیکن یہاں یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ جہاں شادی جائز طریقوں سے پیدا ہونے والی اولاد حقوق سے محروم کردی جاتی ہے، اس قسم کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا: ''جس طرح مرد کو عورت کی ضرورت نہ رہی، اُسی طرح عورت بھی مرد سے اپنا دامن چھڑوا کر اپنی مرضی کی مالک بن بیٹھی ہے۔'' ۱۷؎

نیلم احمد بشیر کے افسانے ''لے سانس بھی آہستہ'' میں سندھ کی قدیم جان لیوا رسم کی نشاندہی کی ہے، جس میں نوجوان لڑکیوں کو

قرآن سے بیاہ کیا جاتا ہے۔ لڑکی کو دُلہن کی طرح سجا کر حجلۂ عروسی تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ علاقے کی عورتیں مرید نیاں بن کر اُس سے تعویذ لینے کے لیے آتی ہیں۔ لڑکی کی قرآن سے شادی باپ بھائیوں کے لیے قابلِ فخر سمجھی جاتی ہے:

''آخر اُسے بھی خوش ہونا چاہیے، اُس نے کلامِ پاک پر حق بخشی کی ہے، یہ تو ہم سب کے لیے عزت کا مقام ہے، تا کہ اُس نے خاندان کی خاطر یہ سب کچھ کیا ہے، اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ ۔۔۔ دیکھ بابا! اَب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ساری زمینیں، ساری جائیداد تیرے دونوں بیٹوں، پوتوں کے ہی نام رہے گی اور بیٹی تیری آنکھوں کے سامنے، اِس کی جدائی، تو تجھ سے سہی نہ جاتی، تیرے لیے کیا یہ خوشی کی بات نہیں؟ وڈے سائیں نے ملائمت سے اپنی نا سمجھ بیوی کو سمجھایا۔'' ۱۸؎

لیکن جنسی جبر کے نتیجے میں اس کی بغاوت ایک اجنبی کے ساتھ رات گزارنے کی صورت میں نکلتی ہے اور جب سب کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اُمید سے ہے، اُس کے بڑھتے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر باپ اور دونوں بھائی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ استفسار پر سراپا احتجاج کرتے ہوئے کہتی ہے:

''کیا کہا؟ میرا کوئی خصم نہیں ہے؟ نور بانو تیر کی مانند آگے بڑھی اور کلامِ پاک کو اپنے سینے سے لگا لیا، یہ میرا خصم ہے، میں اس کی بیوی ہوں، تم ہی سب لوگوں نے میری اِس سے شادی کی تھی ۔۔۔ خبردار، جو کوئی میرے قریب آیا، یا کسی نے میرے بچے کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی، جو آگے بڑھے گا اُس پر قرآن کی مار پڑے گی، سنا؟ یہ اس کا بچہ ہے، اِس نے مقدس کتاب کو اپنے پیٹ کی ڈھال بنا لیا۔'' ۱۹؎

رضیہ فصیح احمد کے افسانے ''لعنت'' میں عورتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے:

''اگر تمھیں یہاں کے پاگل بوڑھے ہانٹ کرتے ہیں، تو مجھے وہاں کی وہ ہوش مند بوڑھیاں پریشان کرتی ہیں، جو پارکوں اور بازاروں میں ایک دوسرے کے سہارے گرتی پڑتی رہتیں اور جنھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اِن کے بچے اِس وقت کہاں اور کیا کر رہے ہیں، اگر تمھارے حواسوں پر کوئلہ چنتی وہ عورت چھائی رہتی ہے، جس کے حسین چہرے کے نقوش راکھ سے چتکبرے ہو رہے ہیں، تو میرے حواسوں پر نیوڈ کلب کی وہ عورتیں سوار رہتی ہیں، جو اپنے جیسے مردوں کے ساتھ دِل جمعی سے اُٹھتی بیٹھتیں ہیں اور جن کو تانکنے جھانکنے کے لیے جہاز اور ہیلی کاپٹر نیچی اُڑانیں کرتے ہیں۔'' ۲۰؎

''سائیں بی بی'' میں غزالہ خاکوانی نے سکون و محبت کی تلاش میں یا سہانے سپنے دکھانے والوں کے جھانسے میں آ کر گھروں سے فرار ہونے والی لڑکیوں کو درپیش مسائل اور اُن کی زندگی کی تلخیوں کو موضوع بنایا ہے، جن کے نصیب میں پشیمانی ہی رہتی ہے:

''میں محبت کی تلاش میں گھر چھوڑ آئی تھی ۔۔۔ جانتی ہو ۔۔۔ جب بچوں کو گھروں میں مکمل محبت نہ ملے، تو وہ باہر تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں، مگر گلیوں اور سڑکوں میں

مارے مارے پھرنے سے بھی کبھی محبت ملی ہے، آخر مجھے پسپائی اختیار کرنی پڑی اور اَب
میں اِس ویرانے میں سمٹ آئی ہوں، ویرانے کی دہشت نے مجھے اس قدر ہراساں بنادیا
ہے کہ لوگ میری عزت، میری اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔'' ۱۲۱؎

محمد سعید شیخ کے افسانے ''بساط'' کی ہیڈ مسٹرس کے حوالے سے بہت بڑے سماجی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لڑکیوں کو جائیداد کے وراثتی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے:

''میں اپنے گھر سے، اپنے بھائیوں سے دور علیحدہ رہتی ہوں، اپنی مرضی سے، ان کی خوشی
سے اور میں مر بھی جاؤں، تو اِنھیں دُکھ نہیں ہوگا، بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ہمارے باپ کی
جائیداد سے ایک دعوے دار کم ہو گیا، میرے خاوند نے مجھے کھڑا کیا تھا، اِن کے مقابلے
میں، ناانصافی کے خلاف، اُنھوں نے اُسے ہی راستہ سے ہٹا دیا، کسی کرائے کے قاتل
کے ذریعے اُسے قتل کرا دیا آج تک اِس قتل کا سُراغ نہ ملا۔'' ۱۲۲؎

طاہرہ اقبال کے افسانے ''شب خون'' میں شہباز خان کی حویلی کا منظر دکھایا گیا ہے، جس میں گھر کی عورتوں، حتیٰ کہ بیٹیوں کو بھی جائیداد کے حصول کے لیے قید کیا جاتا ہے، جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ شہباز خان کی بیوی دیگر عورتیں، جو اِس کی بیویاں رہ چکی تھیں، اِن کا کام صرف اِس کے عیش و آرام کا خیال رکھنا تھا۔ خان نے اپنی بہنوں اور پھر بیٹی کو بھی جائیداد کے نام پر بٹھائے رکھا اور نادرہ کی بغاوت پر اُسے زہر دے کر مار ڈالا لیکن کسی کی جرأت نہ تھی خان کے خلاف کوئی لفظ بھی بول سکے۔ رابعہ خان کی بیٹی بشارت ہر اُتر آتی ہے اور نادرہ کی طرح زہریلے دودھ کا گلاس پینے کی بجائے اُسے پٹخ دیتی ہے اور حویلی سے فرار ہو جاتی ہے: 'میرا جوڑا پیدا ہو چکا ہے اور میں اِس جاگیر پر تھوک کر جا رہی ہوں۔'' ۱۲۳؎ خان کی بیٹی رابعہ کے علاج کے لیے آنے والا ڈاکٹر اِن میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے:

''میں نے شہباز خان کی اِس پُراسرار حویلی کے جناتی قسم کے قوانین اور مافوق الفطرت
اصولوں کی سنا ہے اور حیرت زدہ ہوں، محض اِس جاگیر کو بٹوارے سے بچانے کے لیے یہ
مفروضہ گھڑ لیا گیا کہ اِس خاندان کی کسی لڑکی کا جوڑا خدا بنانا بھول جاتا ہے، خدا کبھی کچھ
نہیں بھولتا، بھول ہمیشہ انسان کے حصے میں آتی ہے، میں اِس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں
۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس ناانصافی کو ضرور محسوس کرتی ہوں گی، آپ جیسی لڑکی کو اِس نسل
در نسل ہونے والی بربریت کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے۔ کیا اِس حویلی کی پابندِ سلاسل
لڑکیوں کے دِلوں میں یہ ارمان کبھی نہیں جاگتا کہ سہ پہر ڈھلے اپنی دہلیز پر بھاری بوٹوں کی
آہٹ سنیں اور اِن کے آنگن معصوم بچوں کی کلکاریوں سے بھر جائیں۔'' ۱۲۴؎

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے ''گندہ خون'' میں زمین دار گھرانوں کے روایتی اُصولوں خصوصاً شادی کے مسئلے میں زبردستی، بے جوڑ، جائیداد کے حصول کے لیے وٹہ سٹہ وغیرہ طرز کی شادی کو موضوع بنایا ہے، اِن کے ہاں لڑکے اور لڑکی کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ ناظم داد ایسا زمیندار ہے، جسے اپنی اعلیٰ نسبی پر بڑا فخر تھا:

''اُنھوں نے بھی اپنے آبا کی مانند ہزار جتن سے خون کو ہر طرف کی آمیزش سے محفوظ رکھا

تھا۔ نہ ذات سے باہر بیٹی اور نہ ہی ذات سے باہر کی بہولائے اور اِس معاملے میں اولا
دیں بھی اتنا تابعدار تھیں کہ آج تک کسی نے بھی شادی بیاہ کے معاملے میں چوں بھی نہ کی
تھی، سنا ہے قدیم دَور میں کسی لڑکی نے دم مارنے کی جرأت کی تھی، مگر اُس ناشدنی کا
انجام انارکلی سے ملتا جلتا ہوا تھا، اِن کے معنی میں کہ انارکلی، تو زندہ دیوار میں چنوائی گئی تھی،
جب کہ اِس مردود کو زندہ حویلی کی دیوار کے نیچے پھینک دیا گیا تھا۔‘‘ ۱۲۵

’’جسے پیا چاہیے‘‘ میں راجہ سہیل جیسے مکروہ لوگ بظاہر لوگوں کی خوشنودی کی خاطر شادی کا ڈراما رچا لیتے ہیں اور اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ وہ ایسا مجبوراً کر رہے ہیں یا خاندانی وقار اور عزت کے پیشِ نظر کر رہے ہیں، لیکن وہ یہ بات یکسر بھول جاتے ہیں کہ جس انسان کی زندگی کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا جا رہا ہے، اِس سارے کھیل میں اُس کا کیا قصور، اُس کی زندگی اور جذبات کی اتنی ارزاں قیمت کیوں لگائی گئی نہ صرف اُسے، بلکہ اُس کے تمام خاندان کو کیوں بیوقوف بنایا گیا اور دھوکہ دیا گیا۔ ایسے مکروہ انسان سخت ترین سزا کے مستحق ہوتے ہیں، اِن کا جُرم ناقابلِ معافی اور قتل سے سنگین تر ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کو زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑتے نہ وہ زندوں میں شمار ہوتی ہے اور نہ مُردوں میں۔ پل پل روح اُس کی ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کی اذیت سے گزرتی ہے، یہی کیفیت سعدیہ کی بھی تھی، اسی طرح اسلام کے نام پر شادی جیسے مقدس فریضے کو عیاشی کا ذریعہ بنانے والے عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے، جو اسلام کے نام پر عورت کے استحصال کے مرتکب ہوتے ہیں، اِن میں اہم ترین نام واجدہ تبسم کا ہے۔ ’’شادی‘‘، ’’بھوک‘‘، ’’نولکھاہار‘‘، ’’توبہ توبہ‘‘، ’’طلاخ! طلاخ! طلاخ!‘‘، ’’زمین زکواۃ، جنتی جوڑا‘‘، ’’جنتی جوڑا‘‘، ’’کوئلہ بھی نہ راکھ‘‘، ’’پہلا گناہ‘‘، ’’روزی کا سوال‘‘ واجدہ تبسم کے ایسے افسانے ہیں، جن میں خانگی اور ازدواجی زندگی میں ظلم و تشدد اور استحصال کی مختلف صورتوں کو موضوع بنایا گیا ہے، نوابوں کا اپنی کنیزوں اور لونڈیوں پر شب خون مارنا اور جنسی استحصال کا نشانہ بنانے کے لیے افسانہ ’’لڑکی بازار کا نواب‘‘ ہے۔ جس میں نواب صاحب کی طرف سے پورے علاقے میں منادی کراتا ہے، ہر سال رمضان کے مہینے میں اُس کے کارندے ہر گھر میں کام والے والی شادی کے جوڑے بھیجتے ہیں، جن گھروں میں کنواری بچیاں ہوتی ہیں۔ کارندوں کی اطلاع کے مطابق کوئی بھی اُس کی نظروں سے بچ نہیں سکتا۔ پھر ایک میلے کا انعقاد کیا جاتا تھا، جس میں تمام دوشیزائیں کم عمر بچیاں وہ جوڑے پہن کر گزرتیں اور نواب جس کی طرف اشارہ کرتا، اُسے محل سرا میں بھیجا جاتا اور اُن کی تزئینِ و آرائش اور خوراک کا خصوصی بندوبست کیا جاتا۔ گزشتہ برس منتخب کی جانے والی لڑکیاں، جن کی کوئی تعداد اور عمر کی کوئی حد مقرر نہیں ہوئی تھی، اُن کی فہرست کھلوائی جاتی اور پھر اُن کو طلاق دے دیتا، عید کے چاند پر نئے نکاح کرتا چلا جاتا، یوں نہ صرف مذہب کا تمسخر اور تضحیک کا سبب بنتا، بلکہ سماجی سطح پر بھی بہت سی خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔ پورے علاقے کی لڑکیوں کی اُس کی صحبت کے بغیر شادی کی اجازت نہ ہوتی تھی، اِس کے حرم میں موجود ’’نام نہاد بیویوں‘‘ میں اکثر کے نام بھی اُسے یاد نہ ہوتے تھے۔ پورے علاقے کو اکٹھے کر کے معاشرے کا یہ ناسور اِس طرح مخاطب ہوتا۔ نواب قرآنی آیات کو اپنی مرضی کے مطابق تفسیر کرنے والا اور اُن کو بگاڑنے والا مکروہ شرابی انسان، دھن دولت سے لوگوں کا منہ بند کر دیتا اور اُس کے بدمعاش عزت داروں کی عزتوں کا جنازہ پل بھر میں اُٹھانے کے لیے تیار رہتے۔ لوگ مجبوراً اپنی معصوم بچیوں کو نواب کی بھینٹ چڑھاتے ہیں:

’’میں بولا تھا کہ پچھلے سال میں جتنی بھی شادیاں کیا تھا، اِن سبھی کو آج رات میں طلاخ

> دینا ہے؟، تو اِسی لیے تو طلاخ دینا ہے کہ ہمیں شبہ ہے یہ بچے ہمارے نہیں، بدچلن عورتوں سے کوئی کیسے نباہ کر سکتا ہے؟ قرآن شریف میں آیا ہے کہ مصالحت اور معالمت کی کوئی شکل باقی نہ رہ جائے، تو طلاخ جائز ہے۔''۱۲۶

منٹو کے افسانے ''صاحبِ کرامات'' میں مولوی حلالہ کا کہہ کر موجو کی بیوی سے بغیر نکاح کے رات گزارتا ہے اور نیکی کا درس دیتا ہے اور نشہ پلا کر اُس کی جوان بیٹی کو وضو کا طریقہ سمجھاتے سمجھاتے، دوشیزگی سے محروم کر دیتا ہے۔ مذہب کے نام پر اتنا بڑا دھوکہ کرنے والے شرابی اور عورت کے رسیا، بدکار، سادہ لوح لوگوں کی عقیدتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اُن کا سب کچھ لوٹ لیتے ہیں: ''مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اُس کی پیشانی چوم لی، اُس نے اُٹھنا چاہا مگر اُن کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اُس کو اپنے گلے سے لگا لیا اور موجو نے کہا: ''چوہدری میری بیٹی کا نصیب جاگ اُٹھا ہے۔''۱۲۷ خانگی تشدد میں شادی شدہ عورتوں کو شوہر اور سُسرال کے علاوہ دیگر عزیز و اقارب کے مظالم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ گھریلو تشدد کی شکار عورتیں کبھی جہیز کم لانے پر، کبھی بدصورتی کا طعنہ سہتی ہیں، کبھی اِن کے والدین اور بہن بھائیوں کو گالی گلوچ سے نوازا جاتا ہے۔ جسمانی و ذہنی تشدد، مار پیٹ، ناک، چوٹی کاٹ دینا، جلا دینا، تیزاب پھینکنا، چولہا پھٹنے کے واقعات، عموماً روا رکھے جاتے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے ''نکاحِ ثانی'' میں بیوی اپنے شوہر پر حد درجہ اعتبار کرتی ہے، مگر اُس کا شوہر کبھی دوستوں سے ملنے کے بہانے، کبھی کام کے بہانے بنا کر بیشتر وقت گھر سے باہر گزارتا ہے اور واپسی پر محض بے حسی کے چند بوسوں کے عوض سمجھتا ہے کہ بیوی کے اعتماد کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے، لیکن یہ بے اثر بوسے اور چغلی کھاتی نگاہیں اصل بھید کھول دیتی ہیں اور عورت کے لیے یہ صدمہ کافی ہوتا ہے کہ اُس سے جھوٹ بولا جا رہا ہے: ''پہلا جھوٹ، اُس جھوٹ پر یقین کرنے کے لیے اُس نے تمام رات کوشش کی تھی، تمام رات اپنی طبیعت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ یہ عذر جھوٹ نہ تھا۔''۱۲۸

عورت خواہ برصغیر کی ہو یا دُنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتی ہو، کسی نہ کسی سطح پر استحصال کی شکار ہوتی ہے۔ عورت کا استحصال عورت کے ذریعے مختلف صورتوں میں کیا جاتا ہے۔ محمد سعید شیخ کے افسانے ''دامِ تمنا'' میں یورپی عورتوں کے مسائل بیان کیے ہیں۔ بظاہر آزاد و خود مختار اِن عورتوں کو پسپا کیا جاتا ہے:

> ''ویسے بھی یہاں مرد کم ہیں اور عورتیں زیادہ اور مرد بچوں کو پسند نہیں کرتے، اُنھیں آزاد، کماؤ عورتیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ میں جس سکول میں بطور ٹیچر کام کرتی ہوں وہاں بیس عورتوں میں صرف ایک عورت ایسی ہے، جو گھریلو مکمل زندگی گزارتی ہے اور ایک بچے کی ماں بھی ہے، یہ عورتیں بڑی مظلوم ہیں اور ترسی ہوئی ہیں۔ مجبوراً آزادی پسند ہیں، بہت ہیں جنھیں اگر وفادار مرد مل جائے، تو ساری زندگی غلامی میں گزار دیں۔''۱۲۹

''بھروسا'' کی رضیہ کے ذریعے خدیجہ مستور نے عورت کی مختلف ذہنی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔ عورت کی رقابت اور دشمنی اُس وقت بڑھ جاتی ہے، جب کوئی عورت شوہر کی توجہ اور محبت کا مرکز بنتی ہے، تو حاسد عورتیں اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتیں، جب تک میاں بیوی میں پھوٹ ڈال دیں، ان کے مخاصمانہ ہتھکنڈے عروج پر ہوتے ہیں۔ رضیہ کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا، جب تک وہ اپنے شوہر کی محبت اور توجہ کا مرکز رہی۔ ہر عورت خواہ اِس کی ساس اور نندیں ہی کیوں نہ ہوں اُس وقت تک

چین سے نہیں بیٹھتیں، جب تک میاں بیوی میں لڑائی نہ ڈلوادیں۔ بدستور اُن کا پروپیگنڈا میاں کو بیوی کے خلاف بھڑکانے میں سرگرمِ عمل رہتا ہے، کبھی دوسروں کی مثالوں کے ذریعے، کبھی ہنسی مذاق میں اور کبھی براہِ راست تنقید کر کے میاں کو بھڑکانے کا کام جاری وساری رہتا ہے۔ حسد ورقابت کی یہی کیفیات رضیہ پر گذرتی ہے، جب وہ دس برس کی تھی، تو اُس کی شادی شدہ بڑی بہنیں اپنے شوہروں کے گُن گاتیں، تو یہ رضیہ اُنھیں گالی گلوچ اور کوسنوں سے نوازتی اور جواباً خوب پٹتی۔ جلد ہی جب اُس کی شادی کر دی گئی، تو اس کا میاں اُس کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ رضیہ خوشی سے پھولے نہ سمائی تھی۔ خوشی خوشی اپنی ساس اور نندوں کو اُس کی محبت کا ذکر کرتی۔ شوہر کے بدلتے ہوئے اِس رویے سے دل برداشتہ ہو کر رضیہ صفدر کی طرف مائل ہوگئی اور شوہر کے طلاق دینے پر صفدر سے شادی کر کے خوشحال زندگی گزارنے لگی، جس کا دُکھ بستی کی تقریباً ہر عورت کو تھا، جو بھی اپنے شوہر کی عدم توجہی اور عدم محبت کا شکار تھی اور لگائی بجھائی کر کے محلے کی عورتیں ایک دوسرے کے میاں بیوی کے معاملات کو زیرِ بحث لا کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں اُلجھنے لگیں۔ رضیہ، جو صفدر کی محبت میں سرشار پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی، محلے کی ایک لڑکی پیلو نے صفدر کو توجہ کا مرکز بنانے میں کامیاب ہوگئی اور اُس نے رضیہ کو بڑے پیار سے لا کر دیا ہوا ٹرانسسٹر بیچنے کا کہہ کر پیلو کو دے دیا اور پیلو پورے محلے میں بڑے فخر سے دکھانے لگی۔ محلے کی عورتوں نے رضیہ کا ریڈیو پہچان لیا اور رضیہ کو بتا دیا، جس پر رضیہ شوہر کی بے وفائی کے غم میں ڈھے گئی اور تمام عورتیں، جو اس سے دشمنی اور رقابت رکھتی تھیں اِس کے ٹوٹ کر بکھرنے پر اِس کی ہمدرد بن گئیں:

> ''رضیہ سارا دن میاں کا کلمہ پڑھتی، پیروں کا غلام دُنیا سے بے خبر تھا اور ساس نندوں کے کلیجے دُکھ سے پھٹے جا رہے تھے ماں، بیٹے کو چھیننے اور بہن بھائی کو پانے کے لیے ہر وقت چوکس رہنے لگیں، اُن کی زبانیں دو دو ہاتھ لمبی ہو گئیں۔۔۔ آخر بہنوں کی بن آئی۔ روز روز کی کٹ کٹ سے شوہرا کتا گیا۔۔۔ ایک دن جو رضیہ نے ساس کی شکایت کی، تو اُس نے اسے خوب پیٹا، پہلے تو رضیہ کو اپنے پٹنے کا یقین ہی نہ آیا۔۔۔ اُنھی دنوں رضیہ دنوں رضیہ کے پیٹ میں صفیہ کلبلانے لگی اور اُس کا شوہر راتوں کو غائب رہنے لگا، اُس کی ساس نندوں نے اُنے نہتے دیکھ کر بڑی محبت سے غمخواری شروع کی۔'' ۱۳۰

ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے ''گرود کشنا'' میں ہندو سماج بیوہ کی بہ گفتہ بہ حالت کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح اُس سے زندگی کا تمام حق چھین لیا جاتا ہے۔ عورت تمام خود سختیاں سہتی ہے، لیکن جب ساس بنتی ہے، تو لاشعوری طور پر اپنی نفرت اور رقابت کا اظہار بہو پر مظالم کر کے کرتی ہے۔ سب سے اہم بات بیٹے پر بہو کی محبت کا غلبہ کسی طور اُسے گوارہ نہیں ہوتا، اُسے اپنی اہمیت کے کم ہونے کا احساس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہو کی خوشی اور بیٹے کے دِل میں بیوی کی چاہت اُسے قطعاً گوارہ نہیں ہوتی؛ بیٹے کی بربادی اور صحت کی خرابی و ذہنی سکون کے لٹ جانے کا غم جیسے بہتان تراشتی رہتی ہے، اگر خدانخواستہ بیٹا بیمار ہو جائے یا مر جائے، تو اُس کا سبب بھی بہو ہی کو قرار دیتی ہے۔ اپنے خاوند کے رونے، تو روتی رہتی ہے، لیکن یہ بھول جاتی ہے کہ اِس کا بیٹا بھی، تو بہو کا خاوند ہے۔ افسانے ''درد کا بندھن'' میں بیٹے کی ناگہانی موت کا سبب بہو ہی کو قرار دے کر ساس طعنے دیتی ہے:

> ''ڈس گئی! ڈس گئی میرے بچے کو ڈس گئی، نہ یہ منحوس گھر میں آتی نہ میرا بچہ پریشان ہوتا، اِس

کی کڑیل جوانی کو کھا گئی۔ بچپن میں بھی اُسے بہت جلد نظر لگ جاتی تھی، ایسے تعویذ گھول کر پلائے کہ بس اُس کی مالا جپتا تھا، اُس کا نام لے کر جیتا تھا اور میں، جس نے اُسے پالا پوسا، دودھ پلایا، پڑھایا، لکھایا اور آدمی بنایا مجھے کیسے بھلا دیا۔ کھا گئی مُردار اُسے کھا گئی۔ میرے چاند کا گہن بن گئی کیسے اُس کی حمایت کرتا تھا وہ، اچھا ہوا مُردار اَب رانڈ ہو گئی۔ اُف! اُف خدایا! شاید میں پاگل ہو رہی ہوں، شاید میں پاگل ہو چکی ہوں۔"[۱۳۱]

نیلم احمد بشیر کے افسانے "آرزو کا صحرا" کی نجمہ خوشحال زندگی گزار رہی تھی، لیکن اس کی عائلی زندگی میں اس کی ماں کی مداخلت زیادہ ہونے کی وجہ سے میں بیوی میں اَن بن رہنے لگی تھی، نجمہ کا شوہر بالآخر کہہ اُٹھتا ہے: "تمھاری ممی فرسٹیٹڈ عورت ہیں، وہ ہمیں اکٹھا نہیں دیکھ سکتیں، اِس لیے جیلس ہو جاتی ہیں۔"[۱۳۲] نیلم احمد بشیر نے افسانے "لالی کی بیٹی" میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ماں باپ پوری زندگی کی جمع پونجی لگا کر لڑکی کو پڑھاتے لکھاتے ہیں، لیکن شوہر اور سُسرال والے اپنے رُعب جمانے کی خاطر اُنھیں محض گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیتے ہیں خصوصاً احساسِ کمتری کے شکار مرد اپنے سے قابل پڑھی لکھی، خوش شکل اور باصلاحیت بیوی کو بالکل گوارہ نہیں کرتے۔ بیٹی، جب اِس کی سختی اور مظالم سے تنگ آ کر اپنے باپ سے شکایت کرتی ہے، تو اکرم آپے سے باہر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اُس کے میکے میں ماں باپ کے سامنے بُرے طریقے سے بولتا ہے۔ ماں باپ اپنے ہیرے جیسی بیٹی کی ناقدری بے بسی سے دیکھتے ہیں اور خون کے آنسو روتے ہیں: "میں کہتا ہوں چلتی ہو یا پھر کسی اور طرح سے ساری اکڑفوں نکال دوں! یہ آج کل کی عورتیں نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں! یہ سب ماڈرن لبریٹڈ عورتوں کے چونچلے ہیں!! اپنے عورت پن سے فرار حاصل کرنے کے طریقے ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔"[۱۳۳]

سیماں کے افسانے "بھنور" میں سُسرال کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ شوہر اگر خود بیوی عزت و احترام نہ کرے، تو سُسرال میں کوئی درجہ نہیں ملتا، بلکہ ہر کوئی اِس کا استحصال کرنا اپنے فرائضِ منصبی میں شامل سمجھتا ہے:

> "جب سے وہ عابد کے گھر آئی تھی اُس نے کوئی سکھ نہیں دیکھا تھا، نہ کھانے پینے کا، نہ پہننے اوڑھنے کا اِس پر ساس نندوں کے طعنے، جیٹھانی کے طنز اور شوہر کی مار پیٹ بھی تھی، جو دِن بھر کے کولہو کے بھوکے بیل کی طرح جتے رہنے کے باوجود کرتی، اگر عابد ایک چاہنے والا شوہر ثابت ہوتا، تو شاید سرمد کی جدائی اتنی اذیت ناک نہ ہوتی اگر سرمد خود اپنے ہاتھوں سے اپنا آپ چھین کر عابد کو اِس کے حوالے نہ کرتا، تو وہ سب کچھ ہنس کر جھیل جاتی، سرمد نے، جن دکھوں کے خوف سے اُسے عابد کو بخشا تھا، یہی دُکھ اَب اِس کے نصیب تھے۔"[۱۳۴]

جیلانی بانو کے افسانے "دیوداسی" میں عورت کے عمومی رویے کی عکاسی کی ہے، جب عورت ساس کے روپ میں ہوتی ہے، تو اکثریت اپنی زندگی میں سہے گئے مظالم اپنی نارسائیوں کا بدلہ بہوؤں سے لیتی ہیں، بعض صورتوں میں بیٹے کے چھن جانے اور اِس کی توجہ کا مرکز بہو کے بن جانے کا خوف اِس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اُس کا ذہن ہمہ وقت ایسے تانے بانے بننے میں لگا رہتا ہے، جن سے میاں بیوی کے مابین کشیدگی پیدا کی جائے۔ ایسی عورت ہمہ وقت ہنستے ہنستے بھی سنجیدگی کے ساتھ بھی اُٹھتے بیٹھتے اپنی مظلومیت اور اچھائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی زہر بجھا جملہ بہو کے خلاف اُچھال

دیتی ہے، ایسا ہی ایک کردار دادی کا ہے، جو تمام لوگوں کو اپنے گرد جمع کیے ہوئے ہوتی ہے: ''دادی کو دیکھ کر ملکہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ خود لڑکی نہیں خاندانی قبرستان ہے، اِس قبرستان میں دادی نے اپنے قہقہے بکھیرتے پوتوں کو شاعر مزاج بیٹے کو اور نک چڑھی بہو کو ایک ساتھ دفن کر دیا تھا اور اَب درگاہ کی مجاور بنی بیٹھی تھی۔'' ۱۳۵

ممتاز مفتی کے افسانے ''پردۂ سیمیں'' میں بھی اسی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کا المیہ پیش کرتے ہیں، جس کی مشرقیت اِس کے آڑے آتی رہی: ''جسے وہ وصف سمجھتی تھی، اُس کی تباہی کا باعث ہوا ہے، یہ محسوس کر کے وہ دفعتاً چھلکنے لگی اور اُس نے وہ دبا شعلہ عریاں کر دیا۔'' ۱۳۶ احمد ندیم قاسمی کے افسانے 'سناٹا' کی نجمہ ارشاد احمد بہو نے اپنی ساس اور نندوں کا دائرۂ زندگی تنگ کر رکھا تھا، یہ ایسی عورتوں کی نمائندگی کرتی ہیں، جو اپنے میاں اور سُسر ال والوں کو انگلیوں پر نچائے رکھتی ہیں:

''نجمہ ارشاد احمد نے ایک کمرے کو چھوڑ کر باقی سارے مکان پر قبضہ کر لیا ہے اور اُس کا کہنا ہے کہ رانڈوں اور کنواریوں کے پاس ایک سے زیادہ کمرہ ہو، تو سمجھ لو دوسرا کمرہ گلچھرے اُڑانے کا اڈا ہے، کھلے مکان، تو بیاہتا عورتوں ہی کو زیب دیتے ہیں۔'' ۱۳۷

سجاد حیدر یلدرم کے افسانے ''نکاحِ ثانی'' میں طوائف کا اسیر شوہر، جب اپنی نیک اور پارسا بیوی کا تقابل فاحشہ سے کرتا ہے، تو فاحشہ کے مقابل اپنی باوفا اور باسیرت خوبرو بیوی کے مقابل سرخی پوڈر میں لپا ہوا عارضی حُسن، جو غیر کے بوسوں سے ژولیدہ تھا یک لخت دونوں کا فرق اُس کی آنکھوں میں گُھب گیا:

''ایک پاک و لطیف دوسری کثیف و ملوّث، ہم جسماً، ہم اخلاقاً ملوّث!، وہ تمام بے وفائیوں، جو اُس نے اپنی بیاہتا کے ساتھ کی تھیں، اُس کے ضمیر پر برچھی کی طرح آ کر لگیں۔ اَب قلباً اپنے تئیں اس قعرِ مذلت سے نکال کر اپنی زندگی اپنے بیوی بچوں پر وقف کر دیگا، اِس بیاہے جوڑے نے جن کے درمیان اَب تک ایک سرد مہری کی دیوار حائل تھی جسے وہ ہٹا نہ سکے تھے، پاک صاف محبت بھرا بوسہ لے کر گویا دوسری مرتبہ نکاح کیا اور وہ پیمانِ وفا باندھا، جو اب عمر بھی تک نہ ٹوٹے گا، یہ بوسہ اُس پیمانِ وفا کی مُہر تھی۔'' ۱۳۸

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''گرہن'' میں عورتوں کی زندگی کہانی، تو ہمات مختلف معاشرے کے اوہام اور سُسر ال کی زندگی کے مصائب و آلام کی داستان ''ہولی'' کی صورت میں بیان کی ہے، جس میں عورت ہی عورت کے استحصال کا باعث بنتی ہے: ''شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے، تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی۔'' ۱۳۹ ''گھر میں بازار میں'' میں مرکزی کردار درشی کی شادی کے بعد اپنے شوہر کے کوٹ میں سے ضرورت کی پیشِ نظر پیسے نکالنا چاہتی ہے، لیکن ضمیر کی کسک اُسے جینے نہیں دیتی۔ 'ٹرمینس سے پرے' کے کردار موہن کے ذریعے ایسے لوگوں کی نشاندہی کی ہے، جو اپنی بیوی کی بیماری سے پریشان ہو کر اُسے چھوڑ دینا چاہتے ہیں، جب کہ افسانہ 'بلی کا بچہ' میں نجی زندگی کے حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے:

''میں مر جاؤں گا، تو کیا ہوگا؟ میں بتاتا ہوں کیا ہوگا، میری بیوی، جو میری وجہ سے کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتی، پناہ کے لیے میرے بھائی کے پاس چلی جائے گی، اِس کے گلے میں رسی ہوگئی اور منہ میں گھاس اور میرے چھوٹی بہن اِس سے وہ سلوک کرے گی، جو کوئی کھاج ماری کتیا سے کرتا ہے۔ میں خود اپنی بیوی سے بدسلوکی کرتا ہوں، بہت غصہ آئے، تو

کچھ کھینچ مارتا ہوں، میں جانور ہوں، لیکن میں اُس خود ماروں گا، کاٹ ڈالوں گا، مگر کسی
دوسرے کو اُس کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھانے دوں گا۔'' ۱۴۰؎

حاملہ عورت کے استحصال، شوہر کے نظرانداز کیے جانے کے رویے، تو بھی عصمت نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے مثلاً ''کیسی بیوی''، ''کیسا شوہر''، ''گنہگار ہستی''، ''چھوئی موئی''، ''باندی''، ''بدن کی خوشبو''، ''بہو بیٹیاں''، اسی طرح محرمات سے عشق لڑا کر مقدس رشتوں کی پامالی عصمت کے افسانوں کا موضوع ہے مثلاً ''بیڑیاں'' اِس سلسلے میں اہم مثال ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے ''نوالہ'' میں شادی کے نام پر عورت کے استحصال، ناجائز تعلقات، خفیہ شادیاں اور نکاح معاشرے کی وہ غلاظتیں ہیں، جو مرد کی پیدا کردہ ہیں، اِن کو چھپانے کی خاطر وہ مختلف نام دیتا ہے، ''نوالہ'' میں شوہر شراب کے نشے میں دھت بیوی کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ رام دئی اپنا گھر بسانا چاہتی ہے، لیکن ہر بار دھوکہ کھا جاتی ہے:

''کچھ دن بعد دولہا اِس کی ٹھکائی کر کے، کبھی کبھی کپڑے لتے چرائے بھاگ جاتا، ابھی
پچھلی شادی تو اُس نے باقاعدہ کی تھی، پھر دولہا نے اِس کی پٹائی شروع کر دی روز دارو پی کر
ہڈیاں توڑتا، مہینے بھر کے اندر اندر وہ اِس کے چاندی کے کڑے اور ناک کی لونگ لے کر
بھاگ گیا۔ رام دئی تھوبڑا سجائے کئی دن تک لنگڑاتی رہی اور اِس کی جان کو کوستی رہی۔'' ۱۴۱؎

فرخندہ لودھی کے افسانے ''برسات کی گرم ہوا'' میں نکاحی ہوئی بیوہ ہونے پر ساس کی طعنہ زنی اور نفرت کا اظہار کیا گیا ہے:

''دیکھیں مائی نے میری چوڑیاں توڑ دیں، میرا دوپٹہ کھینچ لیا اور کہتی ہیں، تو منحوس ہے ڈائن
ہے، تو نے مرا بیٹا کھا لیا، خدا کی قسم میں! کوئی اپنے پیارے کو کیسے کھا سکتا ہے، اماں کہتی
ہیں، مت رو لوگ کیا کہیں گے، تو کنواری ہے اور تیرا رونا ٹھیک نہیں، آپ گئی ہیں میں
یہاں کیوں بیٹھی ہوں؟ بتایئے میں منحوس ہوں اور یہ کہ کالی دیوی نے میرے بچے کی
بھینٹ لے لی، لیکن کالی دیوی، تو کلکتہ سے اُٹھ کر ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں منہ پھاڑے
خون پیتی رہی تھی اور عفت کا کلیجہ اِس کے دانتوں کی تیزی کو یہاں محسوس کر رہا تھا۔'' ۱۴۲؎

بشریٰ اعجاز کے افسانے 'رحمو رام ریان والی' میں رحمو نامی غریب لاوارث بچی کم عمری میں بیاہی جاتی ہے اور شادی کے ایک سال بعد ہی بیوہ ہو جاتی ہے۔ سوکھے ٹکڑوں پر پلنے والی رحمو کی اپنی بیٹی بھوک وافلاس کا شکار ہو کر چیچک جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئی اور موت کی وادیوں میں کھو گئی: ''وہ جب بھی روتی رحمو جھٹ قمیض کا دامن اُٹھا کر اُسے اپنی چھاتی میں گھسیڑ لیتی وہ چند لمحے اِدھر اُدھر سر مارنے کے بعد چُسر چُسر دودھ پینے لگتی، ایسے میں رحمو بڑی حسرت سے اُسے دیکھتی، بے اختیار اُسے اپنی مری ماں کی یاد آجاتی، جس کی چھاتی سے اُسے قریب پا کر آپ ہی آپ دودھ رسنے لگتا۔ کاش اُس بچی کی جگہ میں ہوتی۔'' ۱۴۳؎ لیکن جب یہی بچی سسکتی ہوئی بغیر علاج و دارو کے مرجاتی ہے، تو گاؤں کے دھتکارنے والے سارے لوگ اِس سے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے بچی کے کفن دفن کا اہتمام بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ خالی گود سے تڑپتی ہوئی ماں کے دِل و ذہن سے لحہ لحہ موت کی وادیوں میں سانسیں گم کرتی ہوئی لاعلاج بچی کا خیال مٹنے نہیں پاتا۔ اُسے اب دُنیا کے تمام اُمور اور لوگ محض چلتے پھرتے مردہ انسان دکھائی دیتے ہیں، جو زندہ انسانوں کی قدر نہیں کرتے اور نہ ہی مدد، مردوں کو کفن پہنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ کئی دنوں کی فاقہ زدہ خالی گود ماں کو، جب روٹی کھانے کو ملتی ہے، تو عجلت میں نگلے

ہوئے نوالے پھانس بن جاتے ہیں اور ایک اکائی سارے کھانے پینے کو اُگل دیتی ہے: ''اُس وقت اگر کوئی پوچھتا رحموتن کی بھوک بڑی یا من کی، تو شاید اُس وقت بھی اُس کے پاس اِس بات کا کوئی جواب نہ ہوتا۔'' ۱۴۴

واجدہ تبسم کے افسانے ''آسمان'' میں بیوہ عورت کا وجود خوشی کے موقع پر بدشگونی قرار دیا ہے کہ جب بی پاشا بیگم کی گود بھرائی کا موقعہ تھا، تو بیوہ بھابھی کا سامنے آنا بد فعال سمجھا گیا: ''یہ کون ایسے مبارک موقع پر اتنے منحوس ماری رانڈ کے ہاتھ سے تھالی بھجائے جی، کچھ تحمل بھی ہے کہ نہیں، اُجاڑ یہ تو سوچنا کی کہ کتا مبارک کام ہونے جا رہا۔۔۔ ایسی منحوس کی چھاؤں پڑی تو۔'' ۱۴۵

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''ہیرا'' کا وریام فوج میں بھرتی ہوا، انسانی زندگی اور خون کی ارزانی نے نفسیاتی طور پر اُسے مار ڈالا۔ معذوری اور ذہنی کرب نے اِس پر زندگی کے ماہ وسال تنگ کر دیے تھے، اُس کی بیوی زینو محنت مزدوری کر کے گھر والوں کا پیٹ پالتی:

> ''اُس کا سارا اثاثہ ختم ہو چکا تھا اور وہ جاگیردسار اور دوسرے بڑے گھروں کی چکی پیس کر پانی بھر کر اور کپڑے دھو کر گھر بھر کا پیٹ پال رہی تھی، اُس کے ہاتھوں پر گٹے پڑ گئے تھے، اُس کے بال ہر وقت اُجڑے رہتے تھے اور وہ سوتے وقت کراہتی تھی، وہ بہرام کو ساتھ لے کر باہر چلی جاتی اور محنت مزدوری کر کے واپس آ جاتی، اُسے یقین تھا کہ وریام گھر سے نہیں نکلے گا، کیوں کہ جب وہ بیمار ہوتا تھا، تو چارپائی سے گر کر زمین سے چمٹ جاتا تھا اور ہوش میں تو وہ بچوں تک سے نظریں ملانے سے گریز کرتا تھا۔'' ۱۴۶

بانو قدسیہ نے ذات پات اور رنگ و نسل کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے لوگوں کو اپنا موضوع بنایا ہے، اِسی طرح مذہبی بعد بھی افسانوں کی قربت میں رُکاوٹ بنتا ہے، مثلاً کتنے سو سال میں عورت کو معاشرتی حوالوں سے دریافت کیا ہے۔ سکھ گھرانے کی کرنیل کور، مسلمان عورت کی آغوش میں پرورش پا کر باحیا و باکردار لڑکی بن جاتی ہے، مذہبی تعصب اِس کی راہ میں رُکاوٹ نہیں بنتا ہے، اِسی طرح ''سمجھوتہ'' کی ماچھن کا کردار بھی عورت کی نفسیاتی گرہیں کھولتا ہے، یعنی جیسے پھول کی قید سے سمجھوتہ کرتی ہے، تو خوشبو بنتی ہے، اِسی طرح، جب دو جسم سمجھوتہ کرتے ہیں، تو زندگی وجود میں آتی ہے، رشیدہ جو ذات کی ماچھن ہے، عیسائی لڑکے گلزار سے شادی، تو کر لیتی ہے، لیکن لوگوں کے طعنوں کے ڈر سے اُس کی اولاد پیدا کرنے سے خائف ہوتی ہے۔ ''نیو ورلڈ آرڈر'' میں بانو قدسیہ نے میاں بیوی کے لیے زندگی گزارنے کا اُصول متعین کیا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک قربانی کا بکرا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے کی وفاؤں کے پابند ہونے چاہیے، اِن میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی خاطر اپنے آپ کو بدل سکیں، ایک دوسرے کی پسند و ناپسند کا احترام کریں: ''وہ سمجھنے لگی ساتھی کو کھلا کپڑا ہونا چاہیے۔۔۔ اِس کی کتر بیونت۔۔۔ سجاوٹ، ناپ سب کچھ اپنے دوسرے ساتھی پر چھوڑنا چاہیے۔'' ۱۴۷ اِسی طرح ''موسمِ سرما میں نیلی چڑیا کی موت'' میں چادر اور چاردیواری کے حوالے سے بانو قدسیہ نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے: ''چادر اور چاردیواری ایک سلوگن سہی، لیکن عورت سے ایک قدر وابستہ ہے کہ وہ گھر کی اخلاقی فضا دُرست رکھے اور بچے کی تربیت کی ضامن ہو۔'' ۱۴۸ بانو قدسیہ نے ازدواجی زندگی کے سب سے اہم ترین پہلو میاں بیوی کے لیے ایک دوسرے کی توجہ اور محبت کو شادی شدہ زندگی کی کامیابی قرار دیا ہے: ''زنجیر سے بندھے ہوئے کتے کو بھی سیر پر لے جانا پڑتا ہے۔۔۔ وہ، تو پھر پوری کی پوری عورت ہوگئی، توجہ کے بغیر کیسے جیئے گی۔'' ۱۴۹ گھر کی بنیاد میں مرد و عورت کی توجہ، خلوص، وفا پائیداری کا سبب بنتے ہیں، مرد کی توجہ بھی اُتنی ہی اہم ہے، جتنا کہ عورت کی عموماً یہ بوجھ عورت ہی کے

کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ڈاکٹر فرید سے جہاں زیب اپنی زندگی کی دُکھ بیان کرتا ہے کہ جس طرح ہر رشتہ وقت کے ساتھ بوڑھا نہیں ہوتا، بلکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے:

''تمھاری بیوی بچے؟'' تھے۔۔۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔۔۔ پودے کو پانی نہ دو، تو سُوکھ جاتا ہے۔۔۔ بیوی بچوں کو وقت نہ دے سکو، تو وہ بھی سسک سسک کر مرجھا جاتے ہیں۔ دونوں بیٹے اپنی ماں کے ساتھ کینیڈا چلے گئے، کبھی کبھی خط آجاتا ہے، کبھی تو فون پر خیریت معلوم ہوجاتی ہے اور بس۔'' ۱۵۰

''ابجی ڈوڈر'' بظاہر میاں بیوی کے درمیان ہونے والی عام گفتگو ہے، لیکن اس کے ذریعے منٹو نے اپنے مخصوص انداز میں باتوں ہی باتوں میں میاں بیوی کے نجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح سارا دن کی پے در پے مصروفیات اور گھریلو ذمہ داریوں سے تھکاوٹ سے شرابور عورت پُرسکون نیند کی خواہاں ہوتی ہے، تو اُسی وقت میاں اپنے لیے وقت مانگتا ہے عموماً عورت ازدواجی تعلقات کے معاملے میں کمپرومائز کی جاتی ہے۔شوہر کے مزاج اور تھکاوٹ کا احساس کرتے ہوئے اس کی کیفیات کو سمجھ لیتی ہے، جب کہ مرد ہر صورت میں اپنے حق کا دعویدار ہوتا ہے؛ ''ٹوٹی ہے میری نیند مگر، تم کو اس سے کیا'' کے مصداق غرض حاوی آجاتی ہے:

''مجھے مت ستایئے۔۔۔ خدا کی قسم، میں آپ سے کہتی ہوں مجھے مت ستایئے۔' آہستہ بولو، بچیاں جاگ پڑیں گی' 'آپ تو بچیوں کے ڈھیر لگانا چاہتے ہیں'۔۔۔ وہ کیا دن تھے، جب ہماری شادی ہوئی تھی، تمھیں میری ہر بات کا کتنا خیال رہتا تھا، ہم باہم کس قدر شیر و شکر تھے۔۔۔ مگر اَب تم کبھی سونے کا بہانا کر دیتی ہو، کبھی تھکاوٹ کا عذر پیش کر دیتی ہو اور کبھی دونوں کان بند کر لیتی ہو، کبھی سنتی ہی نہیں' 'بھئی میں سارا دن گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں۔۔۔ جب فرصت ملتی ہے آجاتا ہوں اور تمھارا ہاتھ بٹا دیتا ہوں' 'میں سونا چاہتی ہوں' 'سو جاؤ، میں پڑا بکواس کرتا رہوں گا' 'یہ بکواس کیا اشد ضروری ہے۔ ہے تو سہی۔۔۔ ذرا اِدھر دیکھو۔۔۔' 'میں کہتی ہوں مجھے تنگ نہ کیجیے، میں روؤں گی' 'تمھارے دِل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہوگئی ہے؟ میری ساری زندگی تمھارے لیے ہے، سمجھ میں نہیں آتا تمھیں کیا ہوگیا ہے، مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو، تو بتادو۔'' ۱۵۱

ایم اسلم کا افسانہ ''کیا کرے'' میں مرد و عورت کی غیر ہم آہنگی اور ازدواجی زندگی کی تلخیوں کا سبب بیان کیا ہے۔عورت نام نہاد جدیدیت کی آڑ میں کلبوں میں جانا مخلوط محفلوں کی رونق بننا، رقص و سرور کی محافل میں حصہ لینا، اپنا حق سمجھتی ہے جب کہ اِسے اپنی غیرت کے لیے ناقابلِ برداشت متصور کرتی ہے، یہ ایسی عورت ہے، جو مادر پدر آزادی کی قائل ہے:

''ہاں ہے درست ہے کہ تمھیں ایک بیٹے کا باپ ہونے کی بڑی آرزو ہے، لیکن یہ تمھاری ایک کمزوری ہے اور ویسے ابھی بہت قبل از وقت ہے۔ اولاد ہوئی، تو نہ جوانی رہی نہ رنگ روپ رہا، نہ آزادی رہی، اس لیے اس جھگڑے میں پڑنے کے لیے ابھی تیار نہیں اور یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔'' ۱۵۲

مسعود مفتی کے افسانے ''نابینا'' کی تازی کو بہت جلد احساس ہو جاتا ہے کہ ظاہری پن کی بجائے احساس کا رشتہ سب سے مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کی کیفیات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ چاہے نظروں کے سامنے ہوں یا اوجھل اِس کا ثبوت نابینا شخص کے حوالے سے دیا ہے، بغیر بینائی کے انسان اِس قدر جان سکتا ہے، جتنا کہ بینا، تازی کو شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے عاشق کو برملا انکار کر دیتی ہے: ''اگر پہلی بیوی تمھاری آنکھوں کی آوارگی نہیں روک سکی، تو میں کیسے روک سکوں گی۔''۱۵۳؎

ممتاز مفتی کے افسانے ''انطخام'' کا مرکزی کردار اسلم اپنی فائلوں میں اُلجھا ہوا، اپنی بیوی کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ بیوی بارہا اُسے احساس دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ فکرِ روزگار ہر کوئی کرتا ہے، لیکن بیوی بھی جیتا جاگتا انسان ہوتی ہے، اسے بھی توجہ اور محبت کی غذا چاہیے، وہ بھی زندہ لوگوں کی طرح اپنے شوہر کے ساتھ گھومنا پھرنا اور زندگی کی لطافتوں کا لطف اُٹھانا چاہتی ہے اِس کا شکوہ کرتی ہے۔ پھر انجام وہی ہوتا ہے، جو نظر انداز کیے جانے کا نتیجہ مرد بھگتتا ہے کوئی اور اِس کی بیوی کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسانے لگتا ہے۔ ''بیگانگی'' کی عذرا کو اِس کا باپ ہر وقت ٹوک جھونک کرتا ہے، کیوں کہ اِس کے جسم کے پیچ و خم سے خائف ہوتا ہے، اپنی زندگی کا سفر اور ذہنی عیاشی اِس کے ذہن پر طاری خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہ اپنی بیٹی کی جوانی سے ڈر جاتا ہے کہ کہیں کوئی اِس کا اسیر نہ ہو جائے یا یہ کسی کے دِل نہ دے بیٹھے، یہی وجہ ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے کہتا پھرتا ہے:

> ''عذرا دوپٹہ سنبھالو، بیٹیوں کو یوں ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا، حشمت وہ کھڑکی کیوں کھلی ہے، بند کرو اسے دیکھو تو عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں، عذرا تم یہ نہ ملک ولک کے ہاں نہ جایا کرو، لڑکیاں اپنے گھر بیٹھی ہی اچھی لگتی ہیں، اِن نصیحتوں کے باوجود اُنھوں نے کبھی آنکھ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ بیٹی جوان ہو جائے، تو جانے کیوں اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے، اُنھیں عذرا کی شادی کا خیال بھی نہ آتا تھا۔''۱۵۴؎

غزالہ خاکوانی کے افسانے ''مینیوڈل کوریئر سروس'' میں مرد کے حاکمانہ رویے کو اُجاگر کیا ہے، جو عورت کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور اُسے انسان سمجھنے کی بجائے پاؤں کی جوتی تصور کرتا ہے:

> ''جو آدمی اپنے کسی بھی رویے سے اپنے مرد ہونے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے، وہ سب سے بڑا اخسرہ لگتا ہے، اس کی شخصیت میں کوئی نقص ضرور ہوتا ہے، جس کو ہو چھپا رہا ہوتا ہے وگرنہ، جو حقیقی مرد ہوتے یا لگتے ہیں اُن کی شخصیت کا اظہار نہایت گریس فلی بہت آہستہ آہستہ سے مختلف انداز میں ہوتا رہتا ہے، اُنھیں اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''۱۵۵؎

نیلم احمد بشیر کے افسانے ''اپنی اپنی مجبوری'' میں نذیر صاحب معمولی شکل وصورت کی مالک اپنی خوبرو بیوی پر ظلم کا پہاڑ توڑے رکھتا تھا۔ خدمتیں بھی خوب کراتا اور بہانے بہانے سے اُسے ڈانٹتا ڈپٹتا اور بے عزت کرتا تھا، رات گئے گھر لوٹنے پر سلمیٰ نے دروازہ کھولنے میں دیر کر دی۔ نذیر جیسے لوگ اپنی بیویوں پر تشدد کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بچوں اور دیگر گھر کے افراد کے سامنے اپنا غصہ اور رقابت کو نکالتے ہیں کہ وہ خود، تو عورت کی توہین کر رہے ہوتے ہیں، لیکن بچوں کی نظروں میں اُن کی کیا تصویر بنتی ہے اور پٹنے والی عورت کس طرح مجبوراً دوسروں سے نظریں چُراتی پھرتی ہے، ایسے لوگ اولاد کے

ہاتھوں ذلیل ورُسوا ہوتے ہیں:

''میاں جی نے اندر آتے ہی اُسے بالوں سے پکڑ کر ایک ذوردار جھٹکا دیا اور زمین پر گرادیا ساتھ ہی تھپڑوں، ٹھڈوں، گھونسوں کے تحفوں سے بھی نوازنا شروع کر دیا، مردار، کمینی! کمبخت، بہری ہوگئی تھی کیا، سنائی نہیں دیتا؟ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی حرام خور! اری تجھے شرم نہیں آتی، اتنے دنوں بعد خاوند گھر آیا اور تو پڑی سوتی رہتی ہے، دروازہ ہی نہیں کھولتی، اتنی نیندیں تجھے کیسے آجاتی ہیں۔''۱۵۶؎

انتظار حسین کے افسانے ''ٹھنڈی آگ'' میں مختار کا کردار بیان کیا ہے، جس نے تمام عمر اپنے بیوی بچوں سے بے اعتنائی برتی، حتیٰ کہ جس وقت اُس کی شادی ہوئی تھی، تب بھی اِس کی یہی کیفیت تھی کہ نہ کسی کے آنے کی خوشی نہ جانے کا غم۔ ایسے ناسور مرضی نہ ہونے پر شادیاں، تو رچا لیتے ہیں، لیکن بعد میں احتجاجی رویے اختیار کر لیتے ہیں، اگر اِن کا ہی ردِعمل شادی سے پہلے ہو، تو بہت سی زندگی تباہ و برباد ہونے سے بچ جائیں۔ عورت کا استحصال کیا، پھر اس سے اولاد پیدا کی، اُنھیں بھی تمام عمر اپنی شفقت کے سائے سے محروم رکھا اور خود شہر والے گھر میں زندگی گزاری، حتیٰ کہ بیٹی کی شادی تک پر بھی مہمانوں کی طرح آئے اور یہ تک معلوم نہ تھا کہ کتنا مہر مقرر رہا۔ ''فجا کی آپ بیتی'' میں عورت کے بارے میں مردوں کے نظریات کی نمائندگی فجا کی زبان سے کی گئی ہے:

''میاں عورت کو تو بس نکیل دے کے ہی رکھنا اچھا ذری ڈھیل دے دو، تو بس سر پہ ناچنے لگے ہے میں نے کہا دیکھ ری منہ زوری کے گی، تو مار مار کے الو بنا دوں گا۔ پر جی اُس کی عورت دھکا دے رہی تھی، سالی ہلہ کیے جاوے، میں نے پکڑا جوت، اتنے میں سینوں چچا چیختا آیا کہ بے چاری عورتوں کو حویلی میں پہنچا دو اور پھر، تو ساری گلی میں ہلڑ مچ گیا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کوٹھے میں سے لٹھیا نکالی اور دن سے باہر، مجھے تو اُس پہ آوے ہے کہ لو جی ہم گھر میں رہیں اور واں کام شروع ہو جائے کلمے محمد کی قسم مجھے، تو پتہ تھا کہ ہو کے رہے گی۔''۱۵۷؎

مرزا ریاض کے افسانے ''تاریک رستوں کے مسافر'' کی رشیدہ، جب شادی کرتی ہے، تو اُس کا شوہر عدم اعتمادی کی وجہ سے بیوی کو مکمل نظر انداز کرتا ہے، اس کی بیوی مصائب و آلام کی شکار رہتی ہے:

''یہ سارا قصور ہمارے ماحول کا ہے، یہ قصور ہماری معاشرت کی اُن قدروں کا ہے، جن کے دباؤ سے عورت کو گونگا اور بہرا کر کے اس کی راہوں کو تاریک بنا دیا گیا ہے، یہ رہی شادی، تو یہ شُدنی کی بات تھی۔ دولت نے ایک غریب بیوہ کی لڑکی کو کریدا، افلاس دولت کے ہاتھ ہمیشہ بکتا آرہا ہے، جب تک اس بنیادی قدر کو تبدیل نہ کیا جائے گا کہ دولت سب سے بڑی طاقت ہے، اس وقت یہی ہوتا رہے گا اور بے عقل اُسے تقدیر کا کرشمہ قرار دیتے رہیں گے اور اگر ہم مصیبت زدہ عورت کے دُکھ سے تکلیف محسوس کرتے ہیں، تو ہمیں اُس کی زندگی کی تاریک راہوں میں اُجالا پھیلانا چاہیے۔''۱۵۸؎

نیلم احمد بشیر کے افسانے ''لالی کی بیٹی'' میں پڑھی لکھی ڈاکٹر لڑکی کا شوہر اُسے گھر داری اور بچوں کی خاطر گھر بٹھا لیتا

ہے، کیوں کہ اُس کا احساس کمتری اُسے اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اُس کی بیوی با اعتماد و خود مختار ہو: ''اُس کے نزدیک بیوی میں ذہانت، لیاقت، قابلیت اور احساسِ خود اعتمادی شخصیت کو کھوکھلا کر دینے والے سرسراتے کیڑے ہوتے ہیں، جو بالآخر گھروں کو اُجاڑ دیتے ہیں۔''۵۹؎ اُس کی بیوی رو رو کر اپنی کم مائیگی کا شکوہ اپنے باپ سے کرتی ہے، جو سماجی منظر نامے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ازدواجی زندگی میں ناآسودگی کا ایک بڑا سبب جذباتی عدم توازن ہے، جس میں کسی قسم کی کمی فریقین کے ذہنی تناؤ کا سبب بنتی ہے۔ ''نئی دستک'' میں نیلم احمد بشیر نے نو بیاہتا جوڑے شہلا اور سعید کے ذریعے مرد و عورت کی نفسیات اور جنسی اُلجھنوں کی گرہ کشائی کی ہے، اِن کے خیال میں مرد و عورت کو ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا چاہیے، اپنے اپنے تصورات کی وادیوں سے نکل کر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سعید کی حد سے زیادہ جذباتیت، شہلا کو اکثر تنہا کر دیتی ہے:

> ''نئی نویلی دلہن اپنی پوری ہستی، اپنی کائنات جتنی وسیع محبت، اپنی مکمل سپردگی کے تحفے کا گفٹ باکس ہاتھ میں تھامے منتظر کھڑی رہ گئی، نہ اس کا سُنہری فیتہ کھلا، نہ رنگین کاغذ احتیاط سے اُتارا گیا، کیوں کہ فیتے اور کاغذ کے چکروں میں پڑ کر تحفے تک پہنچنے کا کٹھن انتظار کون کرتا؟ اُسے پتہ چل گیا کہ اُس سُنسان سڑک پر وہ اَب اکیلی، تن تنہا ہی چلتی جائے گی، اُسے اِس کا ساتھی ساتھ لے کر نہیں چلے گا۔''۶۰؎

منعم مجید نے ''صحیح فیصلہ'' میں محبوب کی خاطر گھر بار چھوڑ چھاڑ کر گھر سے فرار ہوتی ہے، لیکن قسمت میں وہی نارسائی آتی ہے:

> ''اِس عورت نے اپنے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے اپنا گھر بار، بہن، بھائی اپنے بنک اکاؤنٹس سب کچھ چھوڑ دیا اور اپنے محبوب کے ساتھ ایک دو کمروں کے گھر میں چلی آئی۔ محبت کا ابتدائی وقت، تو پھر بھی کچھ بہتر گزر گیا، مگر پہلے بچے کی پیدائش کے بعد اُس کے شوہر نے اپنا دوسرا روپ ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ اُسے اپنی بیوی سے زیادہ باہر کے لوگ عزیز ہو گئے، وہ ساری رات باہر اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا اور اُس کی بیوی اپنے خالی بستر کی شکنیں ٹھیک کرتے رات بتا دیتی، اِس کی ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی، اُس کے گھر کو سنوارا، اُس کے بچوں کی ماں بنی، لیکن اُس کے نصیب میں شاید سُکھ تھا ہی نہیں۔''۶۱؎

عطیہ سید کے افسانے ''آنسو کا نمک'' میں ازدواجی زندگی کی تلخی کی ایک بہت بڑی وجہ بیان کی ہے، افسانے کا مرکزی کردار فہیم نارسائی، محرومی اور ناکامی کے خوف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے نہ، تو اپنی بیوی پر بھرپور توجہ دے پاتا ہے اور نہ ہی اپنے گھر پر، اِس کی بے اعتنائی اور لاپروائی اِس کی بیوی کو بہت کھلتی ہے، اُسے ایسے ہی محسوس ہوتا ہے کہ فہیم کسی فراق کا مارا ہوا ہے، یہی وجہ ہے قُربت کے لمحات میں بھی اُس کی کیفیت موجود ہوتے ہوئے بھی غیر موجود ہوتے ہیں۔ فہیم کی شخصیت کے اِس پہلو کی نشاندہی، جب اِس کی بیوی کرتی ہے، تو آہستہ آہستہ فہیم بھی اپنی اِس خامی کی جڑ تلاش کرتے ہوئے نتیجے پر پہنچتا ہے، چوں کہ اِس کے اندر چیزوں کے اور پسندیدہ لوگوں کے بچھڑنے کا خوف شدید تر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے، بیوی جس سے گریزاں ہوتا ہے درحقیقت اُسے بڑی شدت سے چاہتا ہے، لیکن چاہت کے بھرپور اظہار سے محروم ہوتا ہے، کیوں کہ درپردہ بچھڑ جانے یا چھن جانے کا خوف بہت زیادہ ہوتا ہے:

''فہیم کا تجربہ شاید یہی ہے، شاید وہ چیزوں کو کھوتا رہا ہے اور اب اُس نے ہمیشہ کے لیے
اِن کے فراق سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے کہ اِس فراق، اِس ہجر کو ایک دائمی کیفیت اور
اپنا مقدر سمجھ کر اُس نے موجود کو نظر انداز کرنا اور محض غیر موجود سے دِل لگانا سیکھ لیا ہے، جو
یاد کی صورت ہمیشہ ساتھ رہتا ہے، یہ دغا نہیں دیتا، کوئی بے وفائی نہیں کرتا۔'' [۱۶۲]

لڑکیوں کو جب بیاہا جاتا ہے عام طور پر لڑکے کو دیکھا جاتا ہے، ماں باپ صرف یہ سوچ کر ہاں کر دیتے ہیں کہ لڑکا اچھا ہے، تو سب ٹھیک ہے، مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں شادی صرف ایک فرد سے نہیں، بلکہ شوہر کے پورے گھرانے اور اکثر صورتوں میں اِس کے پورے خاندان سے متصور کی جاتی ہے۔ عورت شوہر کی خادم اور اس کی پابند ہوتی ہے، جب کہ ہندووانہ رسوم و رواج کے زیرِ اثر پورا کنبہ عورت کا حکمران بن جاتا ہے۔ پھر صاف ستھری رہائش، صحت مند ماحول اور نان ونفقہ عورت کا بنیادی حق ہوتا ہے، جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، پراگندگی خواہ تن و من کی ہو یا گرد و پیش کی، لڑکی کو اِسی میں رہنے پر مجبور کر دیا جاتا، کیوں کہ شوہر اور اِس کے گھر والوں کو اپنا گند اور غلاظت بھی عزیز تر ہوتی ہے، دوسروں کی اچھائیاں بھی عیب بن جاتے ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانے ''یارمن بیا'' کی امتل اِسی قسم کے ماحول کی گندگیوں میں گھری ہوئی بے بس عورت ہے، جس کی صدائے احتجاج بننے والا کوئی نہیں، وہ بھی جیتی جاگتی انسان ہے۔ اپنی زندگی گزارنے کا تصور رکھتی ہے۔ ماحول کو صاف رکھنا چاہتی ہے، لیکن ماں باپ بھی اِسے مفاہمت ہی پر اُکساتے ہیں جیسے تیسے اُسے گوارہ کرے کوئی بھی اِس کی مشکلات کو نہیں سمجھتا:

''مگر امتل تو یہاں کیوں آتی ہے، جا جلدی گھر چلی جا، اب وہی تیرا گھر ہے، مگر امتل نے
جھرنوں آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اس گھر سے بدبو آتی ہے۔ وہاں گھر کے اندر
نالی بہتی ہے، جس میں گھر بھر کی غلاظت جمی رہتی ہے، اِس میں ڈکا لگ جاتا ہے اور اُسے
ہر دوسرے تیسرے دن یہ ڈکا کھولنا پڑتا ہے، پھر اِس نے یہ بھی بتایا کہ گھر بھر کے لیے
صرف ایک تولیہ ہے اور باری باری سب وہی استعمال کرتے ہیں اور اس کے شوہر کے
منہ سے خوفناک بدبو آتی ہے اور مسوڑوں سے خون بہتا رہتا ہے، مگر اماں نے اِس کو برقعہ
اُٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: کچھ بھی ہو، اَب وہی تمھارا گھر ہے، آہستہ آہستہ سب
ٹھیک ہو جائے گا اور یہ کہ وہ اسٹور کی الماری میں سے اپنے لیے تولیہ لے جائے۔'' [۱۶۳]

''مٹی کی گڑیا'' میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کو موضوع بنایا ہے، استحصال شدہ عورت کی کہیں کوئی شنوائی نہیں:

''غارت ہو جائیں، آگ لگے ایسے شوہر کو، دھیڑ واڑے کے مرد اپنی سوکھی ماری بچے لٹکائے
ہوئے بیویوں کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگے۔ اکٹھے سو روپے میں، تو آج تک کوئی دھیڑنی نہ بکی
تھی۔ کوئی بڑا نصیبوں والا ہوا ہوا، تو دس بیس روپے لے مرا، ورنہ بنگلے کے صاحب لوگ تو
دھیڑنیوں پر اپنا آبائی حق رکھتے ہیں۔ یوں بھی عورتوں کو روکنے کے لیے کوئی بند نہیں باندھا
جا سکتا۔ نہ جانے کتنے صاحب لوگ شکار کھیلنے گاؤں آتے ہیں، تو جاتے وقت کھیتوں میں
تتلیوں کی طرح اُڑنے والی لڑکیوں کو بھی اُٹھا کے موٹر میں ڈال لیتے ہیں، اِن کے بھائی اور

> شوہر ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے روتے چلاتے بھاگتے ہیں، پھر اپنی حماقت پر کھسیا کر موٹر کا پیچھا کرنا فضول سمجھتے ہیں، ان تیز رفتار موٹروں کو کون پکڑ سکتا ہے! چند دنوں بعد وہ لڑکیاں شہر کے چکلے میں جا بیٹھیں! کسی دوسرے گاؤں میں بھیک مانگتی پھرتیں۔" ۱۶۴

جنسی نا آسودگی اور ٹھکرائے جانے کا احساس حد سے بڑھ جائے، تو احساسِ ذات کے لیے مختلف راستے تلاش کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا، ہم جنس پرستی وقتی آسودگی اور راحت و تلذذ کا سامان تو فراہم کرتی ہے، لیکن در پردہ فریقِ ثانی سے نفرت اور انتقام کو بھی ظاہر کرتی ہے، جو مرد غیر عورتوں میں اُلجھے رہتے ہیں اور اپنی بیوی کی جذباتی اور احساساتی ضرورت پورا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی بیویاں انتقاماً یہ روش اختیار کرتی ہیں، عصمت چغتائی کا افسانہ "لحاف" اِسی حوالے سے نمائندہ ہے، جس میں مالکن اپنی کمسن ملازمہ کو آسودگی کا ذریعہ بناتی ہے: "بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا، اللہ! آں، میں مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھلکا اور بیٹھ گیا۔ میں پھر چپ ہوگئی، ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی میرا رواں رواں کانپا۔" ۱۶۵

نیلم احمد بشیر کے افسانے "رام گلی" کا یاسر شادی کے کئی سال بعد بیوی سے متنفر ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ اِس میں پہلی سی رعنائی نہیں رہی، جسم بھی متناسب رہا اور نہ ہی چہرے پر چمک۔ لہٰذا، وہ فیصلہ کرتا ہے کہ بیوی کو پاکستان بھیج کر شادی سے قبل گانٹھی ہوئی دوستیوں اور محبتوں سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ بہانے سے زبردستی بیوی بھیج کر اُن تمام پانچ لڑکیوں عورتوں سے رابطہ کرتا ہے، لیکن ہر کوئی وقت گزاری کے لیے راضی ہو جاتی ہے، لیکن ذہنی سکون کے لیے نہیں، کیوں کہ یورپین روح کی بجائے جسم کی وقتی آسودگی کو محبت کا نام دیتے ہیں۔ دِل شکستہ ہو کر گھر آتا ہے، تو اپنے شادی کی تصویر دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اَب وہ کتنا بدل گیا ہے، اونچا لمبا، سمارٹ، چمکتی آنکھوں کی بجائے فربہ اور بے ڈھب وجود، سفید بال اور آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، جن میں پہلے سی چمک نہ تھی، پھر ساتھ اپنی بیوی کی تصویر دیکھنا ہے، جو اِس سے کئی گناہ زیادہ بہتر اور حسین محسوس ہوتی ہے، وقت اِس پر بھی اثر انداز ہوا، لیکن نسبتاً کم، اپنی پارسا و باوفا بیوی کے خیال سے رونے لگتا ہے اور سوچتا ہے: "ذرا سوچو تو تم New Trousetic trend کے تحت اپنی فرخندہ کو کسی غیر مرد سے شیئر کر سکتے ہو۔ پسینے کی بوندیں یاسر کے ماتھے پر اُبھر آئیں۔" ۱۶۶ "آرزو کا صحرا" گھر سے حصولِ تعلیم و روزگار کے علاوہ دیگر اُمور کی خاطر ویگنوں، بسوں، رکشوں میں سفر کرنے والی اور پیدل چلنے والی خواتین کے مسائل اور مشکلات پیش کی ہیں کہ کس طرح اُنھیں بیہودہ مذاق، گندے جملے اور اشاروں اور نازیبا حرکات کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

> "ہر روز وہ صبح سویرے کالج جانے کے لیے بس سٹاپ پر ویگن کا انتظار کرتی، تو اُسے نت نئے تجربات ہوتے۔ عامیانہ، گھٹیا ذہنیت رکھنے والے اوباش نوجوان اور بڑی عمر کے بھوکی نظروں والے شوقین مرد اُس کے کپڑوں کے آر پار دیکھنے کی کوشش کرتے، تو اُسے وحشت ہونے لگتی، اِن کی للچائی ہوئی، طلبگار نگاہیں اسے اپنی نظروں میں ذلیل کر کے رکھ دیتیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ چرغہ روسٹ کی دُکان پر لٹکی ہوئی ایک ننھی، ننگی مرغی ہو، جسے دُکاندار نے اپنے گاہکوں کو مائل کرنے اور اُن کی اشتہا بڑھانے کے لیے کنڈے سے لٹکا رکھا ہو۔" ۱۶۷

نیر اقبال علوی کے افسانے "بدلا ہوا اِرادہ" میں شوہر آئینے کے سامنے کھڑا خود کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچتا

ہے کہ اُسے اپنی بیوی کی تضحیک نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اِس کے اعتماد و بھروسے کو ٹھیس پہنچانی چاہیے، جس طرح وہ اِس کی وفاؤں کی امین ہے اُسے بھی ویسا ہی ہونا چاہیے:

''خوب صورت جسم انسان کو فرحت و سکون عطا نہیں کرتے ، بلکہ یہ پیار اور جذبہ وفا ہے، جو آدمی کو روحانی اور قلبی اطمینان بخشتا ہے اور تم نے دیکھ لیا کہ اہلِ یورپ کے پاس جسمانی لذت و سکون کے تو کافی نسخے موجود ہیں، جب کہ قلبی روحانی اطمینان حاصل کرنے کے گُر سے قطعاً نابلد و ناآشنا ہیں۔''۱۶۸

ممتاز مفتی کے افسانے ''کھِل بندھنا'' میں عورت کی سماجی حیثیت اور اِس کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ پڑھی لکھی لڑکیاں بھی اِن استحصالی رویوں کی کھلم کھلا مذمت نہیں کر سکتی اور نہ ہی اِن کو ختم کرنے کی تگ ودَو میں آزادی سے شامل ہو سکتی ہیں، کنول کی زبانی کہلوایا ہے، جو مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر شکوہ کرتی ہے: ''ہم سب بکاؤ ہیں، کوئی خود کو اک ہی مرد کے ہاتھ روز بیچتی ہے، کوئی رنگ رنگ کے پُرش کے ہاتھ بکتی ہے۔۔۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہوگی۔''۱۶۹ ممتاز مفتی کے افسانے ''روغنی پتلے'' میں جدیدیت کے نام پر عریانیت کے نقصانات کے حوالے سے مفتی کا کہنا ہے: ''دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا، تو گال دیکھ مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی، لیکن اَب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حِس کو کُند کر دیا ہے۔ تمھارے دَور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔۱۷۰

عورت اور مرد میں صنفی امتیاز برتنے پر سماجی رویوں کی بدصورتی کو بہت سے ادیبوں نے نمایاں کیا ہے، مثلاً راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''معاون اور میں'' سکھیا کی کہانی ہے، جس میں چیچک زدہ کالے شوہر سے نباہ کی صورت دکھائی گئی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مرد کی بڑی سے بڑی خامیاں بھی نظر انداز کر دی جاتی ہیں، جب کہ عورت کا چھوٹا سا عیب بھی قابلِ گرفت ہوتا ہے: ''مرد کماؤ ہو، شریف ہو، صحت مند ہو، تعلیم یافتہ ہو، تو پھر چیچک کے داغ اُس کی سندرتا ہو جاتے ہیں۔''۱۷۱ ''ماسوا'' میں ایسی عورتوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جن پر اکثر مرد پوری طرح غلبہ پالینے کے لیے منفی طور طریقے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، کیوں کہ اُن کے لاشعور میں یہی بات راسخ ہوتی ہے کہ عورت کمتر اور پاؤں کی جوتی ہے:

''وہ کتنی بھولی دکھائی دیتی تھی، اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں، وہ ہنستی رہتی تھی، میں نے اُس کی ہنسی کو کچلنے کی بہت کوشش کی، اُس کی مسکراہٹ کا جواب میں نے تیور سے دیا اور ہنسی کا جواب خفگی سے، لیکن وہ ہنستی رہی۔ کیا موت اِس ہنسی کی کچل دے گی؟''۱۷۲

''آدھی عورت آدھا خواب'' میں عورت اور مرد کے حوالے سے سماجی رویوں کے فرد پر اثرات کی نشاندہی ملتی ہے:

''صدیوں سے عورت کے سر ایسے اوٹ پٹانگ الزام تھوپ کر مفکرین اِسے بوکھلانے کی کوشش کرتے آئے ہیں یا تو وہ اِسے آسمان پر چڑھا دیتے ہیں یا کیچڑ میں پٹخ دیتے ہیں، مگر برابر کھڑا کرتے ہوئے اِن کا دم نکلا جاتا ہے، اِسے دیوی اور آسمانی مخلوق بنا دیں گے، مگر دوست اور ساتھی کہتے شرماتے ہیں، آخر انھیں عورت کی برابری سے کیوں ڈر لگتا ہے، وہ

بھی تو انسان ہوتی ہے، سب کو معلوم ہے کہ عورت ماں بیٹی، بیوی اور بہن ہی بن سکتی ہے
باپ، بیٹا، میاں اور بھائی نہیں بن سکتی پھر کیوں بار بار کہتے ہیں کہ وہ اسی لیے پیدا ہوئی
ہے، کیا عورت کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ وہ عورت ہے، جو مسلسل اِسے بتایا جا رہا ہے۔''۳۔۱۷

بانو قدسیہ نے شوہر کی عدم توجہی، بے اعتنائی و بے حسی، مظالم اور تشدد کے ہاتھوں بے بس گھریلو عورتوں کی زندگی کے تلخ پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے، ایسی عورتیں، جو شوہر کے تمام مظالم اور پابندیاں سہتی ہیں، یہی پسپائیت کی شکار مخلوق باغیانہ روش اختیار کر لیتی ہے، اس کی بغاوت کبھی اپنی ذات کے متعلق ہوتی ہے، جس میں اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہوئے مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے اور بعض انتہائی صورتوں میں سماجی اقدار اور شوہر سے براہِ راست بغاوت پر اُتر آتی ہیں اور اُن تمام اخلاقی سانچوں کو توڑ ڈالتی ہیں، جس میں اُنھیں پابند کیا جاتا ہے۔ ''بازگشت''، ''سمجھوتہ''، ''رشتہ و پیوند''، ''خانہ جنگی''، ''سوغات''، ''سامانِ شیون''، ''ایک اور ایک''، ''افسوں چلے''، ''سیپنچ سینچ''، ''امر بیل''، ''موجِ محیطِ آب میں'' اور ''الزام سے الزام تک'' وغیرہ اہم افسانے ہیں۔ ''ذات کی چیستاں'' میں لڑکیوں پر بے جا پابندیوں کے بعض اوقات اُبھرنے والے منفی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ بانو قدسیہ نے رنگ و نسل کی بنا پر عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کو اپنے افسانے ''کلو''، ''کال کلچھی''، ''کرکل''، ''دورنگی''، ''کتنے سو سال''، ''ہاتھی کا دستہ'' اور ''پابند'' میں بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا۔ مزید برآں، اُنھوں نے محرمات پر جنسی تشدد، ''انتر ہوت اُداسی'' میں ہم جنس پرستی اور ''توجہ کی طالب'' میں جاگیرداروں کے مظالم، 'پچھمو' میں پڑھی لکھی اور کوخوبرو بیویوں کا استحصال، ''بھوا'' میں بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ افسانہ ''ایک اور ایک' میں اختر نامی لڑکے کی داستانِ حیات ہے کہ کس طرح ماں اور گھر سے دُوری کی بنا پر لاشعوری طور پر توجہ کے حصول کے لیے کبھی بیوہ کے گھر کی بھاگ دوڑ سنبھالتا ہے اور کبھی انسانی ہمدردی کے نام پر لوگوں کی ضروریات پوری کرتا ہے کہ اس کی نیکی کے در پردہ انانیت کی تسکین ہوتی ہے کہ لوگ، جب اِس پر انحصار کرتے ہیں، تو اُسے اپنی فتح کا احساس ہوتا ہے، فیاض کی بہن فہمیدہ اُسے اپنا سمجھ کر اپنے ادھ جلے چہرے کا دُکھ بیان کرتی ہے کہ سکول جاتے ہوئے محلے کے لڑکے اِس کا پیچھا کرتے تھے اور ضد میں آ کر ایک لڑکا اُس پر تیزاب پھینک دیتا ہے، تاکہ اُسے کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے: ''پھر افتخار نے ایک روز، جب میں اسکول سے آ رہی تھی اور میں نے نقاب اُٹھا رکھا تھا، تو افتخار نے میرے منہ پر تیزاب پھینک دیا۔''۴۔۱۷

''ایک اور ایک'' میں بانو قدسیہ نے فہمیدہ کی زبان سے اختر جیسے نام نہاد ہیرو کاروں کی نفسیات بیان کی ہے:

''آپ بڑے محبوب طبیعت ہیں۔ اپنی انا کو موٹا کرتے ہیں دوسروں کا سہارا بن کر، آپ
دوسروں سے نہیں صرف اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ آپ گھاس میں پھدکنے
والے اِس ننھے سبز ٹڈے کی مانند ہیں، جو کبھی اِدھر، کبھی اُدھر پھدکتا ہے اور سمجھتا ہے کہ
گھاس کی ہریاول اُس کے سبز پن کی وجہ سے ہے۔''۵۔۱۷

اشفاق احمد نے افسانہ ''بابا'' میں عورت کو کمتر اور کمزور سمجھ کر ظلم ڈھانے کے رُجحان کی مذمت کی ہے۔ بوڑھے ڈاکٹر کی بیوی کو عدم توجہی اور ڈاکٹر بیوی بچوں سے بے اعتنائی برتنے پر شدید اعتراض تھا۔ ساری زندگی بیوی بچوں کو اپنی آزادی اور دوستیوں کی راہ میں رُکاوٹ سمجھنے والا بالآخر تنہائی کی موت کا شکار ہوتا ہے:

''کس کی بکری اور کون ڈالے گھاس! باپ کا دل اور ایسا کٹھور پھر کوئی تجھ سے پوچھے

جب وہ میری نہیں سُنتا ،تو تیری کیسے مانے گا ایک تولے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی کیا
اُسے اپنے کھیل کھیلنے سے فرصت ہو تو تیری خبر گیری کرے۔ وہاں کی چپڑی سے یہاں کی
روکھی اچھی میرے تھپڑوں سے وہاں کی سڑی بساندھی باتیں اچھی نہیں؟ جہاں آفت کی
ماری ٹھڈا ٹوٹی پڑی ہوں، تو بھی نچلا ہو کر بیٹھا رہ۔ محلوں کا خواب دیکھے گا، تو جھونپڑے کی
زندگی اجیرن ہو جائے گی۔'' ۷۶؎

''دفینہ'' کا رحمان اور اُس کی بیوی پارو کے ذریعے رضیہ فصیح احمد نے خانگی زندگی کے بہت بڑے مسئلے کو اُجاگر کیا ہے جب رحمان بات بات پر بیوی کو مارتا پیٹتا اور جھگڑے کرتا تھا، اُس کی کمزوری جمع کی ہوئی دولت کا بیوی پتہ چلتا ہے، تو وہ اپنی بیوی کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے، تا کہ کسی کو بتا نہ دے۔ رفتہ رفتہ اُس نے گھر میں رہنا اور بیوی کو وقت دینا شروع کر دیا، جس کی کی وجہ سے پارو نے بھی گھر سے باہر جانا چھوڑ دیا اور گھر شیشے کی طرح چمک اُٹھا، لیکن ایک روز دیر سے آنے پر بیوی نے استفسار کیا، تو رحمان نے بھنا کر اُس کا جواب دیا۔ پارو نے جب اُس کا صندوق دیکھا، تو وہ بالکل خالی تھا وہ پیسے بھی سارے لے گیا تھا۔ رحمان جیسے فرد، جب غیر عورتوں کا اسیر ہوتے ہیں، تو اپنی بیوی اور گھر کو اجنبی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں، ان سے وابستہ ہر بات میں اُنھیں کجی اور بُرائی نظر آتی ہے اور جب باہر کے سلسلے ختم ہوتے ہیں، تو بھر پور توجہ کا مرکز گھر والی اور گھر بن جاتے ہیں، لیکن جیسے ہی عیاشی کا کوئی نیا ذریعہ ہاتھ لگتا ہے، اُن کی فرعونیت لوٹ آتی ہے، پھر وہی بے اعتنائی و مار کٹائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، ایسے مرد عورت خصوصاً اپنی بیوی کو محض ایک شے سمجھتے ہیں، انسان نہیں:

''نہ تم لاٹ صاحب کی بیوی ہو کہ کھانے کا وقت ایک منٹ اِدھر سے اُدھر نہ ہو، ایسا ہی تھا
تو نگل لیتی میرے بغیر، میں تمھارا نوکر نہیں ہوں، بہت دِنوں سے یہ اکڑ دیکھ رہا ہوں
بڑی جیسے یہ میری کوتوال، میں پاگل ہوں، جنونی ہوں، خوامخواہ مجھے غصہ آتا ہے، اتنے دِن
سے مجھے عاجز کر رکھا ہے، زندگی حرام ہوگئی ہے، رحمان نے پیر سے جوتی نکال کر کھٹا کھٹ
اِس کے سر پر بجادی اور پھر جوتی پہن کر بھناتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔'' ۷۷؎

ماں باپ کا کردار اولاد کے لیے آدرش کی حیثیت رکھتا ہے، بدکردار روحوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ باپ کا کردار اُتنا ہی اہم ہے جتنا ماں کا، کیوں کہ اگر باپ بدکردار ہوگا یا معاشقوں اور غیر عورتوں سے دوستانے اور یارانے لگانے والا ہوگا، تو اولاد یقیناً اِس سے شدید نفرت کرے گی اور مستقل میں بہت سے جنسی اور نفسیاتی مسائل سے دوچار ہوگی، انسانی زندگی کے اِس اہم ترین مسئلے کی نشاندہی میں جا بجا ملتی ہے، میاں بیوی کی محبت اور اُن کے بے لوث اور باوفا تعلق انسانیت کی اساس ہے، گھر کی پائیداری و استحکام کے لیے میاں بیوی ہی بنیاد فراہم کرتے ہیں، ان دونوں کی ہم آہنگی ہی زندگی کی معراج ہے گھر بچانے اور خانگی زندگی کے استحکام، خوشیوں کی بقا کے لیے محض عورت کو ہی نہیں مردوں کو بھی اُتنی ہی کاوش کرنی چاہیے کیوں کہ یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ جس طرح شوہر، بچوں اور گھر کے بغیر نامکمل ہے، تو مرد بھی بیوی بچوں کے بغیر ادھورا ہے اِس کی خوشیاں بھی مصنوعی اور عارضی ہی ہوں گی، بہت سے افسانہ نگاروں نے مختلف تہذیبوں، مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ ہر قسم کی لوگوں کی زندگیوں کی جھلکیاں بیان کرتے ہوئے، اُس کی اہمیت اُجاگر کی ہے، تا کہ قارئین اُن کے مؤقف کو محض جذباتی نہیں، بلکہ حقائق کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے تسلیم کریں، مثلاً ہاجرہ مسرور کا

افسانہ ''محبت اور ___ '' میں ماں باپ کی بے جوڑ شادی، باپ کی سخت گیری، گالی گلوچ اور مار پیٹ کا رویہ بیٹی کے دل میں مردوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے، ماں بیٹی کو اپنی داستانِ غم سناتی ہے:

''اُس کی ماں اُسے جنم دیتے مرگئی اور اُس نے باپ کی سختیوں اور سوتیلی ماں کی نفرتوں کے سائے میں بارہ تیرہ سال پورے کیے، ابھی اُسے مرد کے متعلق سوچنا بھی نہ آیا کہ وہ اٹھائیس سال کے مرد سے بیاہ دی گئی، وہ اٹھائیس سال کا مرد، جس نے اتنی عمر عورت کو صرف کنکھیوں سے دیکھا تھا، اُس کا شوہر تنہائیوں میں ایک خود غرض وحشی کے روپ میں نظر آتا۔ ساس نند اُسے کم جہیز لانے کے طعنے اُٹھتے بیٹھتے دیتیں اور یہ جلوتیں یہ خلوتیں آہستہ آہستہ، اُس کے دماغ پر ایک کنکھجورے کی طرح اپنے بے شمار پاؤں ڈبوتی ہی چلی گئی اور بچوں پر بچے ہوتے چلے گئے۔ ماں نے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے درمیان یہ ساری باتیں بڑی دردناک تفصیل سے بتائیں اور پھر مجرموں کی طرح آنکھیں جھکا کر بیٹی سے ایک اعتراف کیا!'' مجھے یہ نفرتوں اور حقارتوں کی پیداوار گندے کیڑوں کی طرح نالیوں میں بہا دینا چاہیے تھی، مگر میں ایسا نہ کر سکی، میں نے ہر طرف سے محروم ہو کر اپنے بچوں سے محبت کی اور صرف اِن کی خاطر سب کچھ سہا، لیکن اتنی عاجزی، اتنے صبر و شکر کے باوجود تمھارا باپ مجھ سے دامن چھڑا کر بھاگ گیا'' خاموش بیٹھے بیٹھے لڑکی کا جی چاہا کہ وہ اپنے باپ کی گردن مروڑ ڈالے، اُسے اپنا محبوب بھی اپنے باپ کی صورت میں نظر آنے لگا تھا۔''۱۷۸

ڈاکٹر سلیم اختر کا امتیاز ''اُستانی بی اے بی ٹی'' میں باپ کی بدکرداری، بے راہ روی اور ماں پر ہاتھ اُٹھانے کی عادت، اولاد کے نازک ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں یا باپ کے مظالم سہنے والی لڑکیاں مردوں سے نفرت کرتی ہیں۔ انجم کا مؤقف بھی یہی ہوتا ہے: ''میں نے شادی کے نام پر اپنی ماں کو جوتے کھاتے دیکھا ہے۔''۱۷۹ زمانہ طالبعلمی میں ماں باپ کی عدم توجہی، خصوصاً باپ کی بے راہ روی کی وجہ سے جنسِ مخالف کی طرف کشش محسوس ہونے کی بجائے اُس میں نفرت اُمنڈنے لگی اور وہ رفعت کے عشق میں گرفتار ہوگئی اور ہم جنس پرستی میں مبتلا ہوگئی۔ لڑکی دراصل لاشعوری طور پر جنسِ مخالف سے خائف تھی، اِس لیے وہ یہ سمجھتی تھی کہ مرد کی محبت گندی محبت ہے اِس میں عورت کے لیے تباہی ہی تباہی ہے، باپ کے ہاتھوں ماں پر ظلم و ستم اور مار پیٹ سے ہراساں یہ بچی تمام عمر مردوں سے خائف رہی، باپ کی گھر سے عدم توجہی، شراب نوشی، آوارگی اور رات گئے دروازے کے دھڑ دھڑانے کی آواز اِس معصوم بچی کے ذہن میں لاشعوری طور پر بہت زیادہ متاثر کیا کہ یہ شادی سے خائف ہوگئی اور زندگی میں دوسروں پر اعتماد، بھروسہ اس کا ختم ہونے لگا، بچی اپنے باپ کے بارے میں کہتی ہے:

''ماں کی سب سے بڑی بیماری باپ ہے، وہ شرابی کبابی، شوہر کبھی شریف آدمیوں کی طرح گھر نہ آیا، رات کو وقت بے وقت دروازے بے ہنگم طریقہ سے دھڑا دھڑ پیٹے جاتے اور اُسے ایسے کئی مواقع یاد تھے، جب دروازے ہی کی طرح ماں بھی دھڑا دھڑ پٹی، اُسے تو اِس پر تعجب تھا کہ اتنی آوارگی کے بعد وہ کیسے ایک کامیاب ٹھیکیدار ثابت ہو رہا

تھااور بے عزتی اور مار کٹائی کے بعد بھی اُس کی ماں بچے کیسے پیدا کر لیتی تھی۔''۱۸۰؎

افسانے'' ٹوٹا ہوا کھلونا'' میں نیر اقبال علوی نے اس حقیقت کی تائید کی ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ بے غرض اور مبنی بر اخلاص ہوتا ہے، اگر اِس میں بے وفائی، دھوکہ، جھوٹ اور اغراض، جیسے قبیح عناصر کی آمیزش نہ ہو، تو کائنات کا خوبصورت ترین ناتا ہے۔ صائمہ ایسی عورت ہے، جو شوہر پرست ہے، اُس سے بے انتہا محبت کرتی ہے، اس کی محبت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ، بعض اوقات وہ بچوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے، جس پر اُس کا شوہر اس پر نالاں بھی ہوتا ہے۔ روایتی مردوں کی طرح وہ بھی سمجھتا ہے کہ صائمہ کی محبت سے ہٹ کر ہی اُسے سکون مل سکتا ہے۔ بیوی کو بہانے سے اُس کی بہن کے ہاں دو ماہ کے لیے بھیجتا ہے، لیکن جلد ہی اُس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ محض گھر کا ایک فرد نہیں تھی، بلکہ اُس کا سب کچھ تھی، بچوں کے پاس ہوتے ہوئے بھی اِکی روح بیقرار رہتی ہیں:

''ہفتے، بھر میں ہی شریکِ حیات کے بغیر زندگی دوبھر، اُداس، کٹھن، تنہا اور بے رنگ و بے مزہ ہوگئی، اُن کو کیسے سمجھاتا کہ اُس کو بھیج کر میرے ذہنی و جسمانی تناؤ میں کمی واقع ہونے کے بجائے، اِس میں مزید کھنچاؤ پیدا ہوگیا ہے، میری ہنسی، میری خوشی، مزاح، تمھاری ماں اپنے ساتھ لے گئی، میرے خوب صورت رویے، میرا اخلاق اُسی کے دم سے تھا۔''۱۸۱؎

ممتاز مفتی کے افسانے'' جوار بھاٹا'' کا منصب مرجانہ کے دامِ فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرجانہ کا شمار ایسی عورتوں میں ہوتا ہے، جو مرد کو پھانسنے کے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں، مردوں سے دوستیاں گانٹھنا، سیر سپاٹے کرنا، اپنے کام نکلوانا، خریداری کرنا اور ناز نخرے اُٹھوانا اِن کا وطیرہ ہوتا ہے۔ باپ کو جب پتہ چلتا ہے، تو وہ بیٹے کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے: ''یہ آزاد عورتیں کسی کی نہیں ہوتیں، وہ ہر کسی کی ہوتی ہیں۔''۱۸۲؎ افسانے'' ریت کی لکیریں'' کا باقر جس کی جوان بیٹی بھی تھی، خوبصورت اور ساتھ نبھانے والی بیوی کے باوجود محلے کی عورتوں کو تانک جھانک اشارے کنایے معاشقے لڑانے کا ماہر تھا۔ ایک روز، جب اِس کی بیٹی مہمان آنے پر چائے کی ٹرے لے کر جاتی ہے، تو بیٹی سراپا دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے بہت جلد اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا، شدید طور پر پشیمان ہوتا ہے، بیٹی پر اُٹھنے بیٹھنے کی بہت سختی روا رکھتا ہے، لیکن اِس کے معاشقے بدستور جاری رہتے ہیں ایک روز، جب بیٹی کے لیے شادی کا پیغام آتا ہے، تو سکتے میں آجاتا ہے اور کردار کی خرابی کا عکس لڑکی میں محسوس کرتے ہوئے نفسیاتی خوف کے تحت رشتے سے انکار کر دیتا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانے'' نفرت'' میں باپ کی شخصیت و کردار کے بچوں خصوصاً لڑکوں کی زندگی پر اثرات کا جائزہ لیا ہے، مرکزی کردار زرد رنگ سے خائف رہتا ہے، کیوں کہ اِس کا باپ بچپن میں مہمان عورت سے خوب گپ شپ کرتا ہے، جو زرد دوپٹہ اوڑھے تھی۔ بیٹے کے اچانک آنے پر اُسے آکر سلام کرنے کو کہتا ہے۔ تب سے لڑکا تمام عمر زرد رنگ اور پردے کے بغیر عورت و لڑکی سے خائف ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کی لڑائی جھگڑے اور ایک دوسرے سے ہٹ دھرمی اور دھونس کے رویے بچوں کے دلوں میں نفرتیں اور کدورتیں پیدا کرنے کے علاوہ احساسِ محرومی اور عدم تحفظ کے احساس پیدا کرتے ہیں۔ ماں کی اپنے حقوق کے لیے جنگ شوہر دُوری کا سبب بنی، تو اولاد بھی اِس سے متنفر ہونے لگی:

''عارف کا خیال تھا کہ اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ عورت کی بنیاد پسلی کی ٹیڑھی ہڈی پر پڑتی ہے اور اُسے اگر زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے، تو اِس میں لچک نہیں آسکتی،

ٹوٹ سکتی ہے۔ سو اُنھوں نے ابا سے سارے رشتے منقطع کر دیے اور اُن کے گھر سے
روٹھ گئیں۔ نہ ہی ابا نے پلٹ کر بات پوچھی اور نہ ہی اماں نے سر جھکایا۔ ملازمت کے
لیے سکول اور کالجوں کی خاک چھانتی پھریں۔ میرے تیرے گھر ٹیوشن پڑھانے لگیں۔
کرائے کے مکان کی وجہ سے بہت سارا سامان الگ کر دینا پڑا اور بچوں نے اس مثالی
غربت کا مزہ چکھا، جس کا ذکر کبھی کبھی ابا کیا کرتے تھے کہ کیسے اُن کی اماں ایک بڑے گھر
کی بیٹی ہونے کے باوجود دونوں وقت صرف چٹنی، روٹی کھا کر گزر کرتی تھیں۔'' ۱۸۳

مثلاً افسانہ ''ہوتے ہواتے'' کی آمنہ، ملک آصف کی بے وفائیوں اور ظلم و تشدد کی شکار ہے، شراب، عورت اور آوارگی ملک آصف کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ باپ کی دیکھا دیکھی، جب بیٹا بھی اُسی راہ پر چل نکلتا ہے، تو باپ، بجائے افسوس کرنے کے اپنی جیت متصور کرتا ہے، اِس بے بس عورت کے مقابل اپنے ضمیر کی خلش اُسے جینے نہیں دیتی: ''گہری رات کے سناٹے میں ملک آصف نے ایک ہی کھونچا مار کر ملکانی کا گریبان گھیرے تک پھاڑ دیا ''تمھیں اپنے پرائے کی کیا تمیز ملک آصف تم، تو بیٹے کی گاڑی پر بھی فائر کر سکتے ہو، اکٹھے چار فائر۔'' ۱۸۴

مرزا ریاض کے افسانے ''تاریک رستوں کے مسافر'' میں والدین، خصوصاً والد کی گھر اور اولاد و بیوی کے بارے میں عدم دلچسپی، اولاد کے لیے ترقی اور سہولتوں کے فقدان کا باعث بننا، اپنوں کو نظر انداز کر کے غیروں کے مسائل حل کرنا، مالی معاونت اور وقت گزاری کرنا معمول ہو، اِس کی اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی عدم تحفظ اور اعتماد کی کمی کا شکار ہو جاتی ہے، کیوں کہ اعتماد و بھروسہ اولاد باپ کی شخصیت اور کردار سے سیکھتی ہے۔ رشید بھی باپ کی عدم توجہی کا شکار: ''اُسے اپنے سگے باپ سے بھی ڈر لگتا تھا، وہ سمجھتا تھا کہ باپ اِس کا دشمن ہے اور ماں اِس کی رفیق، ماں ہر معاملے میں اِس کی حمایت کرتی تھی۔'' ۱۸۵

شادی شدہ زندگی میں بانجھ پن المنا کی کی صورتحال پیدا کر دیتا ہے۔ عام طور پر بے اولادی کی سزاوار عورت ٹھہرائی جاتی ہے۔ قدرتی طور پر بعض اوقات یہ کمی مرد و عورت میں رہ جاتی ہے کچھ قابلِ علاج ہوتی ہے اور کچھ نا قابلِ علاج۔ مرد اپنی اس خامی کو تسلیم نہیں کرتے، حتیٰ کہ اپنا معائنہ کروانا بھی اپنی مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں اور اپنی توہین قرار دیتے ہیں۔ عورت کو بانجھ قرار دیتے ہیں۔ عورت کو بانجھ قرار دے کر جانتے بوجھتے شادیوں پر شادیاں رچاتے چلے جاتے ہیں، اس اخلاقی جرم میں اُنھیں اپنے گھر والوں کی بھرپور معاونت حاصل ہوتی ہے۔ عورت کے اِس استحصال کی تصویر کشی کی جھلکیاں درج ذیل ہیں۔ خدیجہ مستور کے افسانے ''چپکے چپکے'' کے بابو جی، جو چودہ برس کے عمر تک پہنچتے پہنچتے تمام بُرائیوں کی آخری حدوں کو چُھو چکے تھے، اُن کی مار دھاڑ گالی گلوچ سے تمام اہلِ علاقہ حائف تھے، لیکن ماں کی اچانک وفات کے بعد بابو جی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی کہ اُنھوں نے ہمیشہ کے لیے نیک راستہ اپنا لیتا ہے۔ شادی کے بعد بیوی کی پرستش کرنے لگے اور پورے علاقے میں زن مرید کے نام سے مشہور ہو گئے، اُن کے برعکس اُن کی نویلی بیوی ناز نخرے میں رہتی اور ہر وقت اُس کا مزاج برہم ہی رہتا، جب کہ بابو میاں اُن کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تگ و دو میں لگے رہتے، حتیٰ کہ محلے دار عورتیں اُس کی بانجھ بیوی کو طلاق دِلوا کر اپنی بیٹیوں کو بیاہنے کا سوچنے لگیں، اُس کی بیوی اچانک بیمار ہوئی اور چارپائی سے جا لگی۔ بیوی کے علاج کے لیے مہنگے ترین پارسلوں میں دوائیں منگواتے، محلے دار اِن کی قیمتیں پوچھ کر حیران رہ جاتے۔ بابو میاں نے اُس کی خدمت کے لیے ایک لڑکا رکھ لیا بیوی دن بہ دن بہتر ہونے لگی اور اُس پر نکھار آنا شروع ہوا، تو

بابومیاں پر اُس کا راز فاش ہو گیا:

"اُفوہ، یہ بابو جی ہی کا دم ہے، جو اِس بانجھ عورت کی محبت میں روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں، مگر وہاں کون جانے بابو جی کی خود غرضی، ایک قطرہ دوا بیوی کو چکھنے کے لیے نہ دیتے، خود ہی ساری شیشیاں شربت کی طرح ڈکارتے چلے جاتے، خدا تم کو غارت کردے بابو جی نے بے بس عورت کی طرح کوسا، یوں تو مرنا مشکل ہے، تم کو ایک ننھے کا ابا بنا دوں، پھر دیکھا جائے گا۔ ارے ہاں کہیں لوگ مجھے کہتے کہتے سچ مچ تمھاری ہی حقیقت کو نہ سمجھ جائیں، وہ طنز سے ہنسی۔ بابو کا سرخ چہرہ زرد پڑ گیا اور اُن کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔" ۱۸۶

اولاد کی پیدائش شادی شدہ زندگی کے استحکام کا سبب سمجھی جاتی ہے۔ بانجھ پن بہت سے مسائل کا پیش خیمہ قرار دیا جاتا ہے۔ عورت بانجھ ہو تو طلاق، نفرت، حقارت اور مرد کی دوسری شادی اُس کا نصیب بنتی ہے، جب کہ مرد بانجھ ہو تو اِسے صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے اِس کی تمام تر ذمہ داری عورت کے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے، ایسے مرد اولاد کا بہانہ بنا کر اپنی بیوی کو بانجھ ثابت کر کے نیا بیاہ رچا بھی لیتے ہیں، لیکن بے ثمر ہی رہتے ہیں اور جو عورتیں اِن بانجھ مردوں کی شکار ہوتی ہیں اِن کی جنسی نا آسودگی انھیں بے راہ روی کی طرف لے جاتی ہے اور زیادہ تر عورتیں ہم جنس پرستی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جمیلہ اور اُس کی اُستانی کے مابین اسی قسم کے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانے "بنجر مرد، زرخیز عورتیں" میں ازدواجی زندگی کے ایسے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے، جو شادی کے نااہل مردوں کی بیویوں کو درپیش ہوتے ہیں، جب مرد بانجھ ہو جاتے ہیں، تو معاشرہ انھیں نہ صرف تحفظ فراہم کرتا ہے، بلکہ اُن کے عیب کی پردہ داری کرتے ہوئے، شادیوں پہ شادیاں کر دی جاتی ہیں، جب کہ عورت میں اگر نقص ہو، تو نہ صرف تمام عالم میں اُسے نشر کر دیا جاتا ہے، بلکہ زندگی کی خوشیوں، جینے کی تمام راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں اور طلاق اِس کا نصیب بنتی ہے۔ اپنے پرائے سبھی نفرت کا اظہار کرتے ہیں اور اُسے ایک بیکار شے تصور کرتے ہیں، علاج کا دائرۂ عمل عورت کی طرف مرکوز کر دیا جاتا ہے:

"جب اُس کی ماں ہر طرح کے علاج، دائیوں کے ٹوٹکوں، پیروں کے تعویذوں، مزاروں اور بزرگوں کی دعاؤں کے باوجود بھی بہو کے پاؤں بھاری کرانے میں ناکام رہی، تو اِس محاذ پر شکست کھانے کے بعد نیا محاذ کھول لیا اور یہ تھا اُس کی دوسری شادی کا محاذ! وہ تمام توانائی جو اَب تک دواؤں اور تعویذوں کے چکر میں صرف ہو رہی تھی، اَب بیٹے کی دوسری شادی کے نقطہ پر یوں مرکوز ہوئی، گویا یہ اُس کی اپنی شادی کا فیصلہ ہو۔" ۱۸۷

سعادت حسن منٹو کے افسانے "اولاد" میں بے اولاد عورت کا قصہ ہے۔ اولاد کی محرومی بسیار علاج کے باوجود دُور نہیں ہوتی، اِس کا شوہر علم الدین اُسے بے حد چاہتا ہے پر اُس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ اپنی بیوی کو خوش رکھے۔ مرد بانجھ ہو، تو معاشرہ اور افرادِ معاشرہ اُسے ہر طرح سے چھپاتے ہیں اور پناہ دیتے ہیں، حتیٰ کہ عورت کو بھی تمام عمر اُس کے اندر عیب ظاہر نہ کر کے اپنے ماتحت اور دستِ نگر، احسان تلے دبی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ عورت پر ڈالے گئے نفسیاتی دباؤ کے نتیجے میں زُبیدہ Hallucination ہیلوسی نیشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اپنی چھاتیوں میں دودھ نہ اُترنے پر اُنھیں کاٹ

ڈالتی ہے:

''دوسرے روز جب علم الدین اپنی بیوی کو دیکھنے گیا، تو اُس نے دیکھا کہ وہ لہولہان ہے، اِس کے ہاتھ میں اُس کا کٹ تھروٹ اُسترا ہے اور وہ اپنی چھاتیاں کاٹ رہی ہے۔ علم الدین نے اُس کے ہاتھ سے اُسترا چھین لیا 'یہ کیا کر رہی ہو تم؟'، زبیدہ نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور کہا 'ساری رات بلکتا رہا ہے، لیکن میری چھاتیوں میں دودھ نہ اترا لعنت ہے ایسی۔۔۔ اِس سے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکی، خون سے لتھڑی ہوئی ایک انگلی اس نے بچے کے منہ کے ساتھ لگادی اور ہمیشہ کی نیند سوگئی۔''۱۸۸

محمد سعید شیخ کے افسانے ''رکاب'' کا ریاست علی بانجھ تھا، اِس کی بیوی خورشید کے بارے وہ بہت تشکیک کا شکار تھا، اگر یہی نقص عورت میں ہوتا، تو یہ شخص ڈنکے کی چوٹ پر اُسے طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کرتا اور دوسری شادی رچالیتا، اَب اپنی خامی پر مظلومیت کی تصویر بن جاتا ہے:

''خورشید ایسی عورت نہیں تھی، جو اپنے مرد کی اس کمی پر صبر شکر کر کے بیٹھ جائے بس یہی احساس اُسے اندر ہی اندر کاٹتا جارہا تھا، اِس کے جسم کو جیسے اِس خیال نے ڈھاہ لگا رکھی تھی کہ خورشید اِس کی پردہ پوشی نہیں کرنے والی اور اِس کی جان کٹ کٹ کر اِس دریا میں گرتی جارہی تھی۔''۱۸۹

ملازمت پیشہ سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو گھر سے باہر، راستے میں دورانِ سفر اور جائے ملازمت پر مختلف حریص نظروں اور فحش جملوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ جائے ملازمت پر افرانِ بالا اُنھیں اپنی ملکیت متصور کرتے ہیں۔ مردوں سے زیادہ نہ گھلنے ملنے والیوں کے اسکینڈلز مشہور کر کے اپنی مردانگی اور احساسِ برتری کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ ملازمت پیشہ کے مسائل افسانوں کے بہت اہم موضوع کے طور پر سامنے آئے جیسے راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''دیوالہ'' میں غربت زدہ ماحول کی لڑکیاں اور عورتیں، جو محنت مزدوری کی خاطر گھر سے نکلتی تھیں، اُنھیں حریص نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا:

''اپنی جات برادری کے سیٹھ، جات باہر کے بیوپاری، جن کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ رانوں کے تھیلیاں، جن کی طنابیں تک کمر میں بندھی دکھ رہی ہیں۔ تس پہ بھی چھوکریوں کو گھور رہے ہیں۔ گھورتے مشٹنڈے بھی ہیں، لیکن ایک کی نگاہ میں پل پڑنے والا پیار اور آشا، دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشا۔ چھوکریاں بھی، تو اُن سے نہیں شرماتیں، شرمائیں کن سے؟۔''۱۹۰

حسن عسکری کے افسانے ''حرامجادی'' میں ملازمت پیشہ اس عورتوں کے مسائل، ایشیائی مڈوائف ایملی کے ذریعے پیش کیے ہیں۔ لوگوں کی حریصانہ نگاہیں اُسے اپنے آر پار اُترتی محسوس ہوتی تھیں:

''وہ چلی جارہی تھی کہ یکا یک اُس کی نظر ایک دُکان دار پر پڑی، وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ کے اشارے کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔۔۔ کیا یہ اُسے دیکھ کر تھا؟۔۔۔ ممکن ہے، وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں اور اُسے دیر بھی ہوگئی تھی۔۔۔ وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ

آواز آئی 'آج، تو آسمان نیلا ہے بھئی۔۔۔ بڑے دن میں ہوا ہے ایسا آج۔۔۔اُس نے
پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بدتمیز کے۔۔۔ چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور
صاف صاف کہہ دے کہ وہ اِن لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے اور اب وہ زیادہ
برداشت نہیں کر سکتی'، آخر کہا تک؟۔۔۔ پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھرتھرا
رہی تھیں، جس سے وہ کئی مرتبہ چلتے چلتے ڈگمگائی۔۔۔مگر ان آنکھوں نے جواب ہر طرف
سے اُس کی طرف اُسے دیکھ رہی تھیں، اُسے رُکنے نہ دیا، وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی
اِس نے پلے اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی
جب وہ دروازے پر پہنچی، تو اُس نے دیکھا کہ قصبے کی پُرانی دائی بائیں ہاتھ میں لوٹا ہلاتی
صحن سے گزر رہی ہے، یہ کہتی ہوئی "ابھی تک نا نکلی گھر سے حرام جادی!۔"۱۹۱

نیر اقبال علوی کے افسانے "خارش زدہ کتا" میں گھر سے باہر مسافر خواتین اور نوکری کی غرض سے جانے والی عورتوں کو درپیش مسائل کو موضوع بنایا ہے، اُنھوں نے ریگل چوک کی مسافر ویگن کا نقشہ کھینچا، ویگن کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی مہذب پڑھی لکھی عورت آفس فائل پکڑے، اُترنے لگی، اُسے چادر سمیٹنے میں تاخیر ہوئی، تو ویگن کے کنڈیکٹر نے زور سے آواز لگائی:

"جلدی کر جلدی، پڑھی لکھی عورت نے فقط اتنا کہا: بھائی! ذرا آرام سے اُتر تو جانے دو کلینر
کی پستول نما تھوتھی میں فوراً گولیاں بھریں: 'دبنے جیسی چکی کو جلدی جلدی ہلالیا کرو'۔ ڈز
سے فائر ہوا، گولی ریت کی بوری کی طرح عورت کے فربہ چوتڑوں میں جا دھنسی۔شریف
خاتون زیرِ لب بڑبڑائی، اپنے بھاری کولہوں کو سہلاتی ہوئی سڑک پار کرنے لگی۔ دُھوپ کی
عینک پہننے کی وجہ سے میں بے چاری کی آنکھوں میں اُمڈنے والے احساسات نہ دیکھ پایا
ویگن، زور زور سے پوں پوں کرتی عورت کے زخمی ہونے والے جذبات، اُس کی خاک
میں ملنے والی عزت پر تالیاں بجاتی، وہاں سے بھاگ گئی۔"۱۹۲

اِسی طرح افسانہ "آرزو کا صحرا" میں نیلم احمد بشیر نے مسافر لڑکی نجمہ کے ذریعے ہراساں کیے جانے کی مذمت کی ہے:

"نجمہ اپنی سوچوں میں گم ویگن سٹاپ پر کھڑی، ویگن کے جلدی آنے کی دُعائیں مانگ
رہی تھی کہ ایک آوارہ سا لڑکا، اِس کے پاس جان بوجھ کر، اِس کے جسم سے مَس کرتا ہوا
گزر گیا۔ نجمہ کو اُس کی اِس حرکت سے بڑی کراہت محسوس ہوئی اور اس نے فوراً ہی اپنے
جسم کو اپنی چادر میں لپیٹنا شروع کر دیا۔۔۔لڑکے کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ناچنے
لگی۔ 'منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا' وہ دھیمے سُروں میں گنگنانے لگا اور اُس کی شہوت بھری
نگاہیں زہریلے تیروں کی طرح نجمہ کے جسم پر آ آ کر لگنے لگیں۔"۱۹۳

محمد سعید شیخ کے افسانے "بساط" کی بتول غریب والدین کی اولاد تھی، باپ نے نہایت محنت سے اُسے پڑھایا، اُس کی منگنی، جس لڑکے سے کی گئی، تو پتہ چلا کہ وہ آوارہ ہے۔ لہٰذا، اُس کی شادی کہیں اور طے پا گئی، اُس لڑکے نے انتقامی رویہ اختیار کرتے ہیں اور سکول جاتے ہوئے راستے میں ہر لڑکی کو ہراساں کیا:

''تم ہو،تو واقعی بڑی شے میں چاہتا،تو تمھارے اِس چاند چہرے پر تیزاب پھینک کر تمھارا سارا غرور توڑ سکتا تھا،لیکن میں تمھیں اتنی سخت سزا نہیں دوں گا۔ تمھارے باپ نے میرے باپ سے تمھیں بیاہنے کا وعدہ کیا تھا، رشتہ تمھارا کسی اور کو دے دیا ہے یہ وعدہ خلافی ہے، جا، اور اپنے باپ کو کہہ دے ہماری مرضی کے خلاف تمھاری شادی کی،تو انجام اچھا نہ ہوگا۔'' ۱۹۴

رضیہ فصیح احمد کے افسانے'' آگ کا دریا'' میں آج کی عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے۔ مزدور عورتیں مردوں کے مساوی کام کرتی ہیں،لیکن اُن کی اُجرت مردوں سے خاصی کم ہوتی ہے:

''اجمل نے ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں، جو مردوں کے دوش بدوش بوجھ اُٹھاتی تھیں، ان کے گھر کے آس پاس کتنے ہی نئے مکان بن رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے اَب،تو کام رک گیا تھا اور نیو پڑے ہوئے مکان کا ہر کمرہ چھلکے جام کی طرح لب ریز تھا،مگر خشک دنوں میں اِس نے کتنی ہی گھاگرا چولی پہنے ہوئے عورتوں کو مٹی ڈھوتے اور سیمنٹ کی تگاریاں لاتے لے جاتے دیکھا تھا، ایسا اطمینان اور خود اعتمادی جیسے وہ عورتیں نہیں مرد ہوں، خالی وقت میں ساتھ کام کرنے والے مردوں کے پاس بیٹھ کر وہ اِسی اطمینان اور خود اعتمادی سے باتیں بھی کرتی تھیں،اِن عورتوں کے کام کرنے کی بات نئی نہیں پُرانی تھی۔'' ۱۹۵

غزالہ خاکوانی کے افسانے'' چھوٹے میاں سبحان اللہ'' میں خصوصاً دفتروں میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والی سلوک اور جنسی طور پر ہراساں کیا جانا، اُنھیں دیکھنا، تمسخر اُڑانا، معاشقے لڑانا، فقرے کسنا وغیرہ ملازم سے لے کر افسر تک اسے اپنا حق سمجھنا کی نشاندہی کی ہے۔ دفتروں کے دروازے خوبصورت لڑکیوں کے لیے گرمجوشی سے کھلے ہوتے ہیں، جب کہ باقی بے چاریوں کو محض بھگتایا جاتا ہے:'' افسر دفتر میں شکاری کتے کی طرح جال پھیلائے بیٹھے ہوتے ہیں کہ کب کوئی شکار آئے اور اُن کے جال میں پھنس جائے۔ افسر دفتروں کی اکثریت دفتروں میں کام سے کم دلچسپی رکھتی ہے، اپنے تعلقات بنانے کے لیے حکومت کے تمام وسائل کو استعمال میں لانے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔'' ۱۹۶ جائے ملازمت پر خواتین کو ہراساں کیا جانا، اِن پر ڈورے ڈالنا کولیگ اور افسران اپنا حق سمجھتے ہیں'' فیوڈل کوریئر سروس'' میں غزالہ خاکوانی نے ایسے ہی مکروہ چہروں کو بے نقاب کیا ہے، جو نئے آنے والی لڑکیوں اور عورتوں کو اپنی لچھے دار باتوں میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں:

''اپنے واد کو نا کام جاتے دیکھ کر وہ نرمی سے اُسے سمجھانے لگا: دیکھو، میں تمھارا دوست ہوں، اِس لیے تمھیں سمجھا رہا ہوں، زندگی ایک بار ملتی ہے اُسے بھرپور انجوائے کرو۔ Sex سے مزیدار چیز دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ 20s (ٹونٹیز) میں اِس کا اپنا مزہ ہے 30s (تھرٹیز) میں اِس کا الگ مزہ ہے، 40s (فوٹیز) میں اِس کا اپنا مزہ ہے۔ تم کر کے تو دیکھو، میں اپنے لیے نہیں کہہ رہا جہاں تمھارا دِل چاہتا ہے تو وہاں کرو، اگر میرے ساتھ تم تیار ہو،تو میں وعدہ کرتا ہوں کسی نہیں کہوں گا،تم انجوائے کرتی رہنا اور دُنیا کو خبر بھی نہ ہوگی۔'' ۱۹۷

ممتاز مفتی نے افسانے'' باجوؤں کی ڈھونڈ'' میں مؤقف اختیار کیا ہے کہ عورت، جو مرد کا بازو کہلاتی ہے، اِس کے اپنے

باز وتمام دِن صبح تا رات محبت وشفقت کرتی ہے، اِس کا کام مرد کے گھر کے تمام اُمور انجام دینے کے علاوہ اِس کی خدمت کرنا ہے، فرض کرلیا جاتا ہے، سگو'ایسا کردار ہے، جس کے بارے میں اِس کا شوہر کہتا ہے: ''تیج ورے میرا گھر ان باجوؤں سے بھرا رہا اور پھر گھر ہی نہیں میرے کھیت ماں بھی وہ بوٹوں کی طرحیوں لہلہاتے رہے۔''۱۹۸ ممتاز مفتی کے افسانے ''بُش اور بشرہ'' میں مصروف ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ نہیں دیتے، بلکہ اُسے بوجھ تصور کرتے ہوئے، بچوں کو ہر قسم کی اجازت دے دیتے ہیں، جیسے ہی بچے جوان ہوتے ہیں، فلرٹ کرنا اُن کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ جدیدیت کی آڑ میں بچوں کی مادر پدر آزادی اُن کی جنسی بے راہ روی، معاشقوں اور تفریحوں میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ایسا ہی کردار ذولف کا ہے جو کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے باپ اعلیٰ افسر اور ماں سوشل سرکلز کی جان ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے لاتعلق اور اپنی عیاشیوں میں مگن ہے۔ اسٹیٹس کے مارے یہی لوگ، جب شادیاں طے کرتے ہیں، تو بھی اغراض ہی پیشِ نظر رکھتے ہیں:

> ''پھر بھی کبھی کبھار ماں باپ کی بچوں سے ملاقات ہو ہی جاتی اور اُنھیں احساس ہوتا کہ وہ اُن کے اپنے بچے ہیں۔ سوشل ماں کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ ہوتا ہے خصوصاً جب بچے جوان ہو جائیں، تو وہ ماں کی عمر کی گواہی، جو دینے لگتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ سوشل ماں کے لیے عمر کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے، بہرصورت ذولف کی ماں اِس بات پر بہت خوش تھی کہ بیٹے نے موٹر سائیکل، رائیڈنگ کی ہابی کو اپنا رکھا ہے اور شامیں گھر میں نہیں، بلکہ سڑک پر گزارتا ہے، باپ بھی خوش تھا کہ بیٹے میں ڈیش ہے اور جب کیرئیر کے سائیکل پر چڑھے گا کچھ کر دکھائے گا۔ دراصل ماں باپ دونوں ہی آزاد خیال تھی اور اپنے لبرٹیڈ ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے، اِن کے دِلوں میں صرف دو بندھن باقی رہ گئے تھے۔ سٹیٹس و کیرئیر، شاید یہ بندھن لبرٹیڈ ہونے کے لیے ازبس ضروری ہوتے ہیں۔''۱۹۹

افسانے ''حرامی'' میں ماں باپ اور جوان بہنوں کا اکلوتا بھائی، بسیار کاوش کے بعد بھی نوکری تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ مایوسی، جب حد درجہ بڑھ جاتی ہے، تو اکثر سوچتا ہے: ''کاش وہ ہجرت کر کے آئے ہوتے، کم از کم لوگوں کے دِلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات تو ہوتے یا پھر سارا خاندان قتل ہو جاتا یا کم از کم اِس کی بہنوں کو ٹھکانے لگا دیتا، وہ تو پتھر کی مورتیاں بنی، اِس کا منہ تکتی بوڑھی ہو چکی ہیں۔''۲۰۰ فرخندہ لودھی کے افسانے ''خاتونِ آخر'' میں جنسی طور پر ہراساں کیے جانے، عورتوں پر فقرے کسنا، فحش گانے گانا، حریص نگاہوں سے طواف کرنا وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ عورت کو انسان کی بجائے شے تصور کرنے والوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے:

> ''عورت ذات خواہ کوئی ہو، کہیں ہو، کسی بھی حال میں ہو، ہم مرد لوگ اِس کے بارے میں متوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، جہاں صنفِ نازک سامنے آتی نظریں طواف کرنے لگیں، سینے کا اُبھار کتنا ہے؟ کولھوں پر کتنی چربی ہوگی؟ چہرے پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم لوگ جسم کے نشیب وفراز میں ڈوبنے اُبھرنے لگے ہیں، چہرے کو بس ہم Exit,Admit کے بورڈ کے طور پر پڑھتے ہیں۔ اِس پر ہمیں Admit لکھا ہوا نہ بھی نظر آئے، تو بھی Admit کے کئی راستے ہیں۔ نظروں کو کون روک سکتا ہے، یہ رینگتی رینگتی راستہ

ڈھونڈ لیتی ہیں۔''۲۰۱

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''مہنگائی الاؤنس'' کی کسم ملازمت پیشہ خواتین کے مسائل کی نمائندہ ہے۔ رسوم ورواج سے ٹکرا کر دفتر کی نوکری کرنے والی کسم پر جب مسائل اور اُلجھنوں کی نئی دُنیا وا ہوتی ہے، تو بے انتہا پریشان ہوتی ہے:

''اگر مراری لال جی کسم کو دفتر کی اس گھنٹی کی حیثیت ہی دے دیتے، جس کی گردن کو دبا کر اردلی کو بلایا جاتا ہے، تو بھی غنیمت تھا، لیکن کسم بے چاری، تو یہاں آتے ہی ردی کی ٹوکری بن گئی ہر وقت قدموں میں پڑی رہتی۔ گاہے بگاہے چند مٹی مٹی مسکراہٹیں چند پھٹے پھٹے قہقہے، چند مڑی تڑی باتیں۔ لے اِس جمائیوں کی دھجیاں اور بس۔''۲۰۲

افسانہ ''تلاش'' اور ''اسٹینو گرافر'' میں شہاب نے دفتروں کے افسروں، چپڑاسیوں، اسٹینو گرافروں، لیڈی سیکریٹریوں ٹیلی فون آپریٹروں کی زندگی کے مسائل کی نقاب کشائی کی ہے کہ کس طرح جائے ملازمت پر اُنھیں اپنی عیاشی اور ہوس کا شکار بنانے والے ہی اِن کے خلاف گالی گلوچ سے کام لے رہے ہوتے ہیں، اپنی پُر فریب میٹھی اور لچھے دار باتوں سے اُن کو اپنے گرداب میں پھانسنے کے بعد دِل بھر جانے کی صورت میں حقارت سے پھینک دیتے ہیں اور جو اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے اُسے تسخیر کرنا اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں: ''یہ اینگلو انڈین چھوکریاں آگا پیچھا، تو دیکھتی نہیں اور پھر دو مہینے کی چھٹی مانگتی ہیں۔ دفتر نہ ہوا، باوا کا گھر ہوا، کس نے کہا تھا کہ سالے ٹامیوں کے ساتھ دِن رات رکشا میں گھوما کرو۔''۲۰۳

خدیجہ مستور کے افسانے ''یہ ہم ہیں'' میں بازار خرید وفروخت کی غرض سے جانے والی خواتین کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح ہر کوئی راہ گیر و دوکاندار بھی اُنھیں ترنوالہ سمجھتے ہیں۔ دیکھنا، آوازے کسنا اور طرح طرح کے قصے منسوب کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں ہر گزرنے والی عورت اُن کی ملکیت ہے:

''وہ تو اُن یکے والوں، پان والوں بسکٹ والوں اور بھی تمام لوگوں کو حق ہے کہ چاہے کسی قسم کی بھی عورت راستہ چلتی ہو، جو رشتہ چاہیں جوڑ لیں، اُن کے برعکس بیچاری عورت یہ حرکت نہیں کر پاتیں، اگر کوئی راستے چلتے میں اُسے پسند آجائے، تو چیخ پڑے، فرض کیجیے کہ خوبصورت سا مرد راستہ چل رہا ہے، خوبصورت ننھی منی مونچھیں، سرخ سفید رنگ مضبوط جسم اور بہترین سوٹ پہنے ہوئے، تو کوئی عورت یوں نہ چیخ۔'' پڑے۲۰۴

گھروں کی چار دیواری میں بھی لڑکیوں، عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے، اِن میں محرم رشتوں کی پاس داری بھی نہیں کی جاتی۔ عظیم بیگ چغتائی کے افسانے ''بھاگ گئی'' کی یتیم لڑکی عائشہ کو اُس کا چچازاد گھر میں اکیلا پا کر جنسی طور پر ہراساں کرتا ہے:

''اپنی کوٹھڑی کی طرف دوڑی، مگر فاروق اس کو بھلا کب چھوڑنے والا تھا، یہ کیا بدتمیزی ہے۔ غضب ناک ہو کر فاروق نے کہا، تڑپ کر وہ اُٹھا مگر چار پائی کی رسی میں پاؤں اُلجھ کر منہ کے بل گرا، اتنے میں عائشہ اپنی کوٹھڑی میں تھی اور چاہتی تھی کہ دروازہ کو بند کرے کہ فاروق آپہنچا اور دروازہ کو زور سے دھکا دیا، مگر عائشہ میں اُس وقت بلا کی طاقت آگئی تھی اُس نے بھی خوب زور لگایا اور دروازہ کھلا جاتا تھا کہ اِس نے ایک اینٹ کا ٹکڑا اُٹھا کر اِس

بیدردی سے فاروق کی اُنگلیوں پر مارا کہ وہ تڑپ گیا۔ عائشہ نے دروازہ بند کر دیا۔۔۔
اَب اِس نے عائشہ کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور کہا کہ اِس کا مزہ شادی کے بعد تجھ کو
چکھاؤں گا، عائشہ اِس کی گالیاں اور بدزبانی سن کر سہم گئی، کیوں کہ وہ عائشہ کو ایسی گالیاں
دے رہا تھا، جیسی وہ اپنی بیوی کو دیا کرتا تھا۔''۳۰۵

خدیجہ مستور کے افسانے ''یہ بڈھے'' میں ہوس پرست ادھیڑ عمر لوگوں کا قصہ ہے، جو اپنے نفس کو قابو میں نہیں رکھتے اِس ارذل عمر میں عموماً نا سمجھ بچیاں اِن کا کھلونا بنتی ہیں، ایسے لوگ اپنے نفس کے کانٹوں کی قطع بُرید کرنے کی بجائے اِن کی پرداخت کرتے ہیں، کیوں کہ دیگر ارتقائی مدارج کی طرح اس کی بھی سطحیں ہوتی ہیں، اگر اپنی ذات کے تاریک گوشوں کو گہری نیند ہی سُلائے رکھا جائے، تو پھر یہ ایک بھیانک اندھیرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جو دِل و دماغ پر چھا کر محض نفسانی خواہشات کی تکمیل، خواہ وہ کسی شکل ہی میں کیوں نہ ہو، چاہتا ہے، ایسے بڈھے خاندان، ملنے جُلنے والی لڑکیاں، بچیاں جو اُنھیں باپ دادا کا درجہ دیتی ہیں اُن کی معصومیت سے اپنا حظ پورا کرنے کا سامان کرتے ہیں، یہ پراگندہ لوگ مقدس رشتوں کی آڑ میں اپنے شیطانیت کو چھپائے رکھتے ہیں۔ عطیہ ارشد چچا کے انتہائی قریبی دوست کی بیٹی ہے، اِس کے مکالمات، اِس کی معصومیت کے آئینہ دار ہیں اور یہ کہ ماں باپ دونوں کو بچیوں کے مسائل اور اُن کی شکایات پر خصوصی توجہ دینی چاہیے، کیوں کہ جب عطیہ محسوس کرتی ہے کہ چچا عجب نظروں سے اُسے گھورتے ہیں، کبھی بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہیں، کبھی گردن اور کمر پر ہاتھ پھیرنا، سینما لیجانا، بچہ بچہ کہہ کر اپنے ساتھ لپٹانا، کبھی گداز بازوؤں پر رکھ کر زور سے دبانا، کبھی گوری گردن پر چٹکی بھرنا وغیرہ۔ یہ بچی، جب اپنے والدین سے ذکر کرتی ہے، تو دونوں اُلٹا ہی اُسے بُری طرح سے ڈانٹ دیتے ہیں اور کہ چچا کو کس قدر دُکھ ہوگا اِس کی بات سُن کر چلو معافی مانگو وغیرہ، اِن بڈھوں کے ہاتھوں جنسی طور پر ہراساں ہونے والی بچیوں کی ذہنی کیفیات کی عکاسی عطیہ کے اِن الفاظ سے کی گئی ہے:

''وہ سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی ارشد چچا اُسے بچوں کی طرح چاہتے ہیں، اُن کی وہ
تیز سانسیں، جلتے ہوئے ہونٹ، وہ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ، کیا یہ بڈھے بچوں کو اسی طرح
چاہتے ہیں، لیکن اُن کے ہونٹ نہیں جلتے، وہ اپنے دل کی دھڑکن اُس کے سینے میں نہیں
جذب کرتے اور نہ ہی اُسے چھوتے وقت اُن کے ہاتھ کانپتے ہیں، مگر سب کچھ وہ کس
سے کہے، کسے جا کر سمجھائے کہ اُس کے ارشد چچا پر ایک بہت ہی خوفناک بھوت سوار ہو
گیا ہے اور بھلا کوئی یقین ہی کیوں کرنے لگا، اُسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔''۳۰۶

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانے ''روشنی کی لکیر'' میں خوب صورت اور خوش شکل عورت کو ہمیشہ نظروں میں تولا جانا لوگوں کا معمول بن گیا ہے۔ مثال ہمیں خوبرو عورت کے حوالے سے ملتی ہے:

''میری سوچ سب سے پہلے پڑوس میں رہنے والی خوبصورت عورت کے کمرے میں نقب
لگا کر پہنچی ہے۔ پھر میری خواہشوں کا تانا بانا اِس کے وجود کے اردگرد جال بُنتا ہے اور اپنے
حسبِ مرضی اِسے جس طرح اور جس ڈھب پر چاہتا ہوں اُٹھاتا بٹھاتا اور اُس کی پرستش
کرتا ہوں اور اُس کے ایک ایک عضوِ بدن پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہوں اور ایک ایک

موئے بدن پر فدا ہوتا ہوں۔'' ۲۰۷؎

جعلی پیروں کے کالے کرتوت کی عکاسی بھی بہت سے افسانوں میں کی گئی ہے جیسے محمد سعید شیخ کے افسانے ''تاریک راہیں'' میں جعلی اور بدنام پیروں کی سیاہ کاریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'جیناں' ایسا کردار ہے، جو نہایت خوش شکل تھی اِس کی پیدائش پر جیناں کے باپ کو اِس کی ماں پر شک تھا، جس کا اظہار وہ اکثر کرتا تھا: ''سچ سچ بتا یہ جیناں تم کہاں سے لائی ہو میری دوسری اولاد، تو میری طرح کوجھی ہے، مگر یہ شہزادیوں جیسی اولاد میری کیسے ہوسکتی ہے۔'' ۲۰۸؎ جیناں کی جب دلاور سے شادی ہوئی ہے، تو شاہ جی کے حواری اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، زمیندار اور افسروں کی نظروں، تو بچ جاتی ہے، لیکن شاہ جی کی حریص نگاہوں سے نہیں، یہی وجہ ہے اپنے شوہر دلاور سے اپنے خدشات کا اظہار کرتی ہے:

> ''میں آخری دم تک تمھاری نگاہ میں خوبصورت رہنا چاہتی ہوں وگرنہ تیزاب سے چہرہ جلا کر تو میں شاہ جی سے جان چُھڑا سکتی ہوں۔۔۔ اگر میں اِن کے ہاتھ آ گئی، تو میرے ماں باپ کو مجبور کر کے وہ مجھے تم سے طلاق دلوا کے غلام بنالیں اور تم تم بھی کچھ نہ کر سکو گے۔ مجھے پتہ ہے سارا جھگڑا میرا ہی ہے۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ تمھارے یا میرے ماں باپ، تو مجبور کمی لوگ ہیں۔ شاہ جی کے بند آنکھوں والے مرید، بس میں چاہتی ہوں کہ تم میری خوشی سے میرا گلا دبا دو، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، میں بڑے آرام سے سو جاؤں گی، تم دیکھنا میں چیخوں گی نہ چلاؤں گی پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ۲۰۹؎

بشریٰ اعجاز نے افسانے ''ابابیل'' میں جعلی پیروں کے کالے کرتوتوں کا پردہ بڑی مہارت سے چاک کیا ہے کہ کس طرح یہ لوگ لوگوں کی ضیف الاعتقادی کا فائدہ اُٹھاتے ہیں اور نوجوان لڑکیوں عورتوں کو بھوت اور جن نکالنے کے سلسلے میں ظالمانہ انداز میں مار پیٹ اور جنسی تشدد کا شکار کرنے کے علاوہ بے اولاد عورتوں کو ''اولاد'' جیسی نعمت نوازنے کا سبب بنتے ہیں، اِن عورتوں کو نشہ آور چیزیں کھلا کر یا ہپناٹزم کے ذریعے اپنی نفسانی خواہشات کا نشانہ بناتے ہیں۔ ''ابابیل'' کی رقیہ بی بی جسے ماں باپ مرنے پر اپنے عزیز رشتہ دار لاوارث پیر کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کا دستِ شفقت بڑھتے اور پھیلتے ہوئے اُس کی پوری زندگی پر حاوی ہو گیا اور تمام عمر کے لیے اُس کے وجود میں تنہائی بھر گیا۔ ایک طرف اللہ ہو، حق ہو کی صدائیں اور دوسری طرف جعلی پیروں کی ذات کے چور دروازوں نے اِس کی ذہنی اُلجھنوں کو بہت بڑھا دیا تھا، بے اُولاد صفیہ کو بے اولاد دیکھ کر کھوہ والے پیر کے کالے کرتوت منظرِ عام پر آ گئے:

> ''گہرے سانولے رنگ والی صفیہ پر وہ بچہ کچھ جچ نہیں رہا تھا۔۔۔ یوں جیسے کالے کپڑے پر سفید داغ۔ 'کب ہوا یہ؟' رضیہ بی بی نے بانجھ صفیہ کی گود میں نیا نکور کھلونا دیکھ حیرت سے پوچھا۔ 'جی اب تو چھ ماہ کا ہو گیا ہے' صفیہ کا لہجہ بجھا سا تھا۔ پندرہ برس کے بعد ماں بن کر بھی اُس کے لہجے سے وہ خوشی مفقود تھی جو ایک عورت کو ماں بن کر ہوتی ہے۔ 'ہاں سے علاج کروایا تھا؟' رضیہ بی بی نے بچے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ 'بس جی علاج کیسا' یہ تو کھوہ والے پیر کی دعا سے ہوا ہے' صفیہ جواب دیتے دیتے رُک سی گئی۔ 'کھوہ والے پیر صاحب؟ وہ جن کے بارے میں اُس دن شاہ صاحب۔' رقیہ

نے بات ادھوری چھوڑ کر بچے کی طرف دیکھا، رضیہ کی گود میں واقعی وہ اِک داغ کی طرح
نمایاں تھا۔ پیر صاحب کی دعا، رضیہ، چمکدار نیا نکور کھلونا۔۔۔ حیرت، سوال! آندھی، ہاں
آندھی، رقیہ بی بی نے چکراتے ہوئے سر کو تکیے پر گرا دیا۔'' ۲۱۰

سعادت حسن منٹو کے افسانے ''صاحبِ کرامات'' میں گاؤں والوں کی ضعیف الاعتقادی کو موضوع بنایا ہے۔ مولوی صاحب کے بہروپ میں شرابی وزانی شخص نہ صرف اِس کی جواں سال بیٹی کی عزت سے کھیل جاتا ہے، بلکہ شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اُس کی بیوی کو بھی لوٹ لیتا ہے اور اُس کی داڑھی مونچھ اور پٹے تکیے کے نیچے ہی دھرے رہ جاتے ہیں، اسی طرح افسانے ''اصلی جن'' کی فرخندہ باپ کے سائے سے محروم تھی، اُس کی ماں نے اپنی نوعمر بیٹی کا گھر سے باہر آنا جانا بند کر دیا اور پردے کی کڑی نگرانی کر کے اُسے گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا، چوں کہ تنہا ہوتی ہے اس لیے اکثر و بیشتر روتے ہوئے خدا سے اپنے باپ اور بھائی کے نہ ہونے کا گلہ کرتی ہے، یہی فرخندہ پڑوس میں رہنے والی مردنما لڑکی سے دوستی گانٹھتی ہے۔ اِس ہسٹریائی کیفیت کو جن بھوتوں اور آسیب کا چکر سمجھتے ہوئے، جھاڑ پھنکار اور تعویذ گنڈے کیے جانے لگے، مگر بے سود ایک روز فرخندہ نسیمہ کے بھائی سے تنہائی میں ملتی ہے اور اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرخندہ بالکل ٹھیک ہو جاتی ہیں اور اُس کا جن غائب ہو جاتا ہے:

''دیر تک دونوں سہیلیاں کمرہ بند کر کے بیٹھی پیار محبت کی باتیں کرتی رہیں، اُس دِن کے
بعد اُن کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔۔۔ مگر فرخندہ کی ماں نے محسوس کیا کہ اُس کی بیٹی
کی صحت دِن بدن خراب ہو رہی ہے، چنانچہ اِس نے اُس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا۔۔۔
اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرخندہ کو ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔'' ۲۱۱

احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''ماسی گل بانو'' کا باپ مزدور تھا، بیوی کی موجودگی میں تو کئی کئی ماہ تک گھر سے دُور کھیتی باڑی کرتا تھا، لیکن اُس کے مرنے کے بعد جوان بیٹی کی خاطر گھر سے زیادہ دُور نہ رہتا تھا۔ گل بانو بیمار ہوئی تو اُس کی ٹانگ مفلوج ہو گئی، اِس کا باپ بھی حکیم کی غلط دوائی کی نذر ہو گیا۔ ماسی گل بانو اَب ایک بھٹکی ہوئی روح کی مانند تھی، جو اکثر گھر سے غائب رہتی اُس کی ہسٹریائی کیفیات کو گاؤں والوں نے جنوں کے سائے سے تعبیر کیا کہ وہ جنوں کے بادشاہ سے ملنے جاتی ہے، پھر جہانے مراثی کی جوان شوخ بیٹی تاجو پر بھی جن آنے لگے:

''جب تاجو پر جن آئے، تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ تاجو اِن جنوں کو وہیں ماسی گل بانو کے ہاں
سے لگا لائی ہے، پھر جن اچھی آواز، اچھی صورت اور بھرپور جوانی پر تو عاشق ہوتے ہی ہیں اور
تاجو میں یہ سب کچھ تھا اور جنات کے گڑھ میں بیٹھی اِن تینوں صفات کا مظاہرہ بھی کرتی رہی
تھی، اِس پر ستم یہ کہ تاجو بلا کی طرار تھی اور جنات طرار لڑکیوں کو تو تاک میں رکھتے ہیں۔'' ۲۱۲

محمد سعید شیخ کے افسانے ''فریبِ ہستی'' میں لڑکیوں کی پیدائش کو بڑا سمجھنے والے اور لڑکوں کی خاطر اولاد پر اولاد پیدا کرنے والوں کی مذمت کی ہے، لڑکی لڑکے کی پیدائش کی تمام تر ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی ہے، حالاں کہ طبی نقطۂ نظر سے مرد اِس کا ذمہ دار ہے، عورتوں کو طلاق کی سولی پر کھڑا کر کے نا چاہتے ہوئے بھی بچوں کی پیدائش کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے، مذکورہ افسانے میں بیٹے کی آس میں پانچویں بچی کی پیدائش ماں کے لیے انتہائی کرب ناک بن گئی:

''واقعات مجھے چیخ چیخ کر بتاتے تھے کہ میری ماں مجھے پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی اور اگر وہ جانتی کہ میں نے پیدا ہونا ہے،تو وہ مجھے اپنی کوکھ میں ٹھہرنے بھی نہ دیتی، اباٹرشن کروالیتی یا شروع ہی سے میرے باپ کے اُمید دلانے پر پُر اُمید ہی نہ ہوتی، میں اپنے باپ کی پانچوں بیٹی تھی اور اِس مرتبہ،تو وہ بیٹی قبول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے، میری ماں شاید میرے باپ کی اُمید دلانے پر تیار ہوگئی تھی۔۔۔میرے باپ نے کئی روز میری ماں سے بات نہیں کی اور میری ماں جیسے اُتنے ہی روز مجھے اُس کی گود میں ڈالنے سے جھجکتی رہی، مبارکباد کی جگہ کہیں وہ مجھے دھتکار دے، میری ماں میرے باپ سے چھپ کر مجھے دودھ پلاتی تھی، جیسے میں اپنے باپ کے نطفے سے ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ماں حتی المقدور مجھے اِن چھاتیوں سے دور ہی رکھتی تھی، خاص طور پر جب میرا باپ گھر ہوتا تھا۔''۲۱۳

سی ایم نذیر کے افسانے''آس کا پنچھی'' کی نوری اپنے باپ کی زندگی بچانے کی خاطر اپنا آپ بیچ دیتی ہے، لیکن بے سود:

''دوسرے دن ابا کی حالت زیادہ بگڑ گئی، آپا نوری نے، جب ابا کی حالت غیر دیکھی، وہ کرموخان کے گھر گئی، پانچ سو روپیہ کے عوض اُس نے اپنی الھڑ نوخیز جوانی کو بڑھے کرمو کی ہوس کی قربان گاہ پر قربان کرنا منظور کرلیا، یہ وہ بڈھا کرموخان تھا، جس کی بیوی پانچ بچے چھوڑ کر دس سال پہلے فوت ہو چکی تھی۔''۲۱۴

رضیہ فصیح احمد کے افسانے''آشیاں گم کردہ'' میں احمد تعلیم یافتہ پٹھان لڑکی کی اپنے خاندانی رُسوم و روایات اور دقیانوسی مردانہ سماجی ڈھانچے کے خلاف مزاحمت کرتی ہے:

''اُس نے صاف کہا کہ میں اپنی ماؤں کی سی محبت میں یقین نہیں رکھتی، جہاں مرد کی ہر اچھی بُری عادت سے پیار کیا جائے، ایسا پیار جیسا پالتو جانور اپنے مالک سے کرتے ہیں کہ جس وقت بھی آیا اُس کے جوتے چاٹنے شروع کر دیے، اُن نے جب چاہا گود میں لے لیا، اپنے بستر میں سُلا لیا اور جب چاہا ٹھوکر سے پرے دھتکار کر شکار پر چلا گیا۔ پڑھی لکھی لڑکی کو جیون ساتھی چاہیے نہ پوجا کے لیے لمبا چوڑا خوب صورت اپالو کا مجسمہ، نہ رات کے لیے کوئی گلگو۔''۲۱۵

عصمت چغتائی کے افسانے'سونے کا انڈا' میں بیٹے کی پیدائش میں ناکامی پر خاندان اور گرد و نواح میں صفِ ماتم کا بچھ جاتا، دقیانوسی معاشرے میں انوکھی بات نہیں ساس اپنی بہو کو زچگی کے وقت کوسنے دیتی ہے اور پوتیوں کو دھتکارتی ہے کہ نگوڑیوں نے اُس کا گھر دیکھ لیا ہے:''بندو میاں کی میاں کی ماں پھسکڑا مارے بیٹھی نکمی بہو کی سات پشت کو گالیاں دے رہی تھیں، موئی ہیجڑوں کے خاندان کی۔۔۔ لونڈیا نہ جنے گی تو اور کیا کرے گی۔''۲۱۶ عصمت چغتائی کے افسانے 'چھوئی موئی' میں بیٹے کی پیدائش کے لیے عورت کو موردِ الزام ٹھہرا کر عورت کا استحصال کرنے والے مردوں کو بے نقاب کیا گیا ہے، حالاں کہ عورت کا اعتراض مرد کے لیے بنتا ہے۔'اللہ کا فضل'، 'بیڑیاں'، 'تھوڑی سی پاگل'، 'زہر'، 'سونے کا انڈا' وغیرہ اِس ضمن میں اہم افسانے ہیں، اِسی طرح بچوں کی پیدائش کے بعد عورت میں آنے والی جسمانی تبدیلی پر ناگواری کا اظہار،

''پہلی لڑکی''، ''چھوئی موئی''، ''سارٹیفکیٹ''، ''شادی''، ''کچے دھاگے''، ''کیسی بیوی کیسا شوہر'' وغیرہ میں ملتا ہے:

> ''اَب تو وہ نام چلانے والے کی آڑ لے کر سب کچھ کر سکتے تھے۔ خبر نہیں بیچارے کو اتنا اپنا نام زندہ رکھنے اور اُسے چلانے کی کیوں فکر پڑی تھی، حالاں کہ خود اِن کا کوئی اونچا نام تھا ہی نہیں۔ دُنیا میں مسہری کی زینت کا جو ایک اہم فرض ہے، اگر وہ بھی نہ پورا کر سکیں، تو یقیناً اُنھیں سُکھ کی سیج چھوڑنا پڑے گی۔ یہ چند سال نوجوانی اور جمن کے بل بوتے پر وہ ڈٹی رہیں پر اَب، تو ذرا تخت کے پائے ڈگمگاتے جا رہے تھے اور وہ اُنھیں الٹ دینے کو تیار تھا اور پھر اس تخت سے اُتر کر بے چاری کے پاس دوسری جگہ کہاں تھی۔''۲۱۷

بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں بلا تخصیص عورت و مرد کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے، اُنھوں نے اُن کی عادات واطوار، جبلت، کمینگی و کم نظری اور نیکی وخیر، جیسی بنیادی خصوصیات کے تناظر میں مرد و عورت کی سوچ وفکر کی عکاسی کی ہے، اُنھوں نے مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رُجحانات کے انسانی رشتوں پر بُرے اثرات وتبدیلیوں کو بھی اُجاگر کیا ہے، اِن کے افسانوں میں ہر طبقہ اور مکتبِ فکر کے لوگ موجود ہیں، اِن افسانوں میں برقعہ پوش عورتیں، بدصورت عورتیں اور محبت کی تکمیل کرنے والی عورتیں اپنے مخصوص انداز اور طرزِ فکر کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں، وہ آج کی عورت کے بدلتے ہوئے روپ کو نہ صرف تسلیم کرتی ہیں، بلکہ کسی حد تک اِس کی حمایت بھی کرتی ہیں، اِس حوالے سے اِن کے افسانے ''مادہ پرستی''، ''بازگشت''، ''کچھ اور نہیں''، ''امربیل''، ''ہو نقش اگر باطل''، ''کاغذی پیرہن'' وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، ''مجازی خدا'' کی تابی جسم فروش ہے اپنے لیے اور بیٹی کے لیے سہارا چاہتی ہے، کیوں کہ اُسے معلوم ہے کہ دُنیا کو وہ زیادہ عرصہ تک دھوکے میں نہیں رکھ سکتی:

> ''محلے والیوں نے اُسے اصل کی نہ پا کر ویسے ہی ترک کر رکھا تھا، نادر سے معاملہ یوں چوپٹ ہو چکا تھا۔ زندگی گرمیوں کی دوپہر ہو گئی، اُٹھتے بیٹھتے خیال آتا ہے کہ پارسائی کی چادر کب تک گرمی دے گی۔۔۔ اگر کسی کا ساتھ نہ ملا، تو ٹھٹھر ٹھٹھر کر جوانی کی سرد رات کب تک کٹے گی؟ پھر بچی پر ہر نگاہ پڑتی، تو دِل دھک سے رہ جاتا۔ اللہ میں، تو پارسا بن گئی یہ بن باپ کی بچی کس کی کہلائے گی، جوان ہو کر کہاں جائے گی، کہاں سے کھائے گی؟ خود میری زندگی کا کیا بنے گا؟ جس رفتار سے وہ بینک کے چیک کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی، اِس رفتار سے، تو سارا اثاثہ دنوں کی کھیل تھا۔''۲۱۸

''جلسہ گاہ'' میں یونی ورسٹی طلبہ وطالبات کے جلسہ میں شریک ہونے والی طالبات کی گرفتاری پر پولیس والوں کی اُن سے حقارت آمیز سلوک اور گفتگو مرد کی حاکمیت کے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویے کی عکاسی کرتے ہیں:

> ''بی بی سیاست کرنا عورتوں کا کام نہیں، مونچھوں والے کانسٹیبل نے کہا، تو پھر کس کا کام ہے؟، عورتوں کا کام تو صرف، کانسٹیبل نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے ننگی نظروں سے اُس کے جوان جسم کو دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور فقرہ ادھورا چھوڑ دیا، اُسے

ایسے محسوس ہوا جیسے اُس کے تمام جسم پر بڑے بڑے چیونٹے رینگ رہے ہوں۔ اُسے لگا جیسے اُسے سرِ بازار ننگا کر دیا گیا ہو کمینے، اُس نے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھ کر میز سے پیپر ویٹ اُٹھالیا۔ میں نے تیرا سر پھوڑ دینا ہے، تجھے عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں وہ چیختے ہوئے بولی، ارے جاؤ، یہ رُعب کسی اور کو دینا، وہ عورتیں، جن کی عزت کی جاتی ہے وہ جلوسوں اور جلسوں میں نہیں چار دیواری میں رہا کرتی ہیں، اُن کا مقام سڑکیں نہیں گھر ہے، اَب اگر سڑک پر آئی ہو، تو بھگتو، تھانے دار نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے پیپر ویٹ چھین لیا۔ منظور حسین جاؤ اِن محترمہ کو اِن کے 'بیڈ روم' تک چھوڑ آؤ۔ حوالات کا تالہ کھول کر منظور حسین نامی مونچھوں والے کانسٹیبل نے اُس اندر دھکیل دیا۔'' ۲۱۹

نیر اقبال علوی کے افسانے ''طالبانِ خلد'' میں مردوں کے اِس رویے کی مذمت کی ہے، جو فیشن کی آڑ میں اپنے گارمنٹس، فیکٹریوں کو چار چاند لگاتے ہیں۔ ماڈلنگ کرنے والی یہ عورتیں کیا اپنے وقار میں اضافہ کر رہی ہوتی ہیں؟:

''دُنیا کے مشہور و معروف اور بڑے بڑے ڈیزائنیز سال کے ہر موسم کے لیے اپنی اپنی کولیکشن یہاں بطور نمائش پیش کرتے۔ دُنیا بھر کی حسین و جمیل کی شہرت یافتہ اور مہنگی ترین ماڈل گرلز اِن کے تیار کردہ ملبوسات کو اپنے متناسب دلکش، سیکسی اور نیم برہنہ جسموں پر پہن کر ان کی نمائش کرتیں اور کھچا کھچ بھرے ہوئے ہالوں میں لوگ اِن ماڈلز کو مخصوص پلیٹ فارموں پر چلتے پھرتے اس طرح دیکھتے، جیسے کسی اور کُرے کی مخلوق زمین پر اُتر آئی ہو۔'' ۲۲۰

اُردو افسانے کے مختصر مطالعہ سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر دَور کے افسانہ نگاروں کے ہاں، مرد و عورت کی تخصیص کے قطعِ نظر تانیثی احساس کسی نہ کسی سطح پر موجود رہا ہے۔ افسانہ نگاروں نے روز مرہ زندگی میں عورتوں کو درپیش مسائل و مشکلات کو موضوع بناتے ہوئے سماجی واخلاقی اور نفسیاتی حقیقتوں کی گرہ کشائی کی ہے۔ ابتداً لکھے جانے والے اصلاحی و تربیتی ادب سے خواتین کے مسائل کی تصویر کشی کی، جو عمارت ایستادہ کی گئی تھی، اُس کی پختگی و پائیداری میں نئے آنے والے تخلیق کاروں نے بھرپور حصہ لیا، یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ عورت کی سماجی و مذہبی سطح پر مقام و شعور کی آگہی تحفظِ حقوقِ نسواں کے رُجحان کی آبیاری کا باعث بنی۔ تانیثیت در حقیقت عورت کے حوالے سے سماج کے مروجہ توہمات ظالمانہ رسومات اور غلط خیالات و نظریات کی مذمت کا نام ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اہم ترین موضوع ہجرت و فسادات کے صورت میں سامنے آیا، جس میں قتل و غارت گری انسانی اقدار کی ارزانی، بے حسی و بے مروتی نے یاسیت و قنوطیت کو فروغ دیا، یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے لکھے جانے والے ادب میں افسانہ نگاروں نے انھی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کی، اس ضمن میں لکھے جانے والی تحریروں میں ہندوؤں سکھوں کے مظالم، عصمت دری کے واقعات، بہیمانہ قتل و غارت گری، لوٹ مار، جسم فروشی پر مجبور کیا جانا، کیمپوں میں رہبروں کا رہزن بننا، خونی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، نفسا نفسی، سقوطِ ڈھاکہ میں اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں مظالم و تشدد کی شکار عورتوں کی داستانِ غم تاریخ کا المناک پہلو ہے۔ مذکورہ بالا پہلوؤں کے علاوہ افسانہ نگاروں کے پیشِ نظر وہ تمام سماجی روایات اور ٹیبوز و اوہام بھی ہیں، جو عورت کو انسان تصور کرنے سے گریزاں ہیں، کیوں کہ عورت کو محض شے یا زینتِ پلنگ

متصور کرنے والے اِسے ذہنی و جسمانی اذیتیں دینے سے گُریز نہیں کرتے۔ علاقائی و قبائلی ظالمانہ روایات نے بھی صنفی امتیازات کو فروغ دیتے ہوئے اخلاقی اقدار کو پسِ پُشت ڈال دیا ہے۔ کاروکاری، وَنی، ولور، قرآن سے شادی، بچپن کی بے جوڑ شادیاں، وٹہ سٹہ، قصاص کے طور پر عورت کو پیش کیا جانا، مذہب کی آڑ میں غیر اسلامی و سفاکانہ جبر، شادی بیاہ اور جہیز کے مسائل، سُسرال کے مظالم، مار پیٹ، ظلم و تشدد، جائیداد و حقِ وراثت سے محروم کیا جانا، نان و نفقہ کے مسائل، تیزاب پھینکنا، جلایا جانا، غیرت کے نام پر قتل، زنا، زنا بالجبر، جائے ملازمت پر ہراساں کیا جانا وغیرہ مرد کی حاکمیت والے معاشرے کا حصہ ہیں۔ مرد و عورت کے مابین امتیازی تفاوت روا رکھے جانے والے سماجی مظالم کے خلاف خواتین کا شدید ردِ عمل یقینی ہے، جو بغاوت کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ سابقہ ادوار کی بہ نسبت آج کی عورت زیادہ باشعور اور حقوق آشنا ہے۔ فکرِ معاش جو مرد کا طرۂ امتیاز تھا کم مائیگی کا شکار ہو رہا ہے، آج کی عورت خواہ پڑھی لکھی ہو یا اَن پڑھ ہر سطح پر خود کفیل ہو رہی ہے۔ تانیثی رُجحان کے حامل افسانہ نگاروں نے تانیثی رویوں کی عکاسی بڑے بھرپور انداز میں کی ہے اور دَورِ حاضر کے مسائل اور آزمائشوں کے نتیجے کو قبول کرتے ہوئے افرادِ معاشرہ کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔فرمان فتح پوری، افسانہ اور افسانہ نگار، م ن، ۱۹۸۶، ص ۱۷۔۲۴
۲۔قدرت اللہ شہاب، یا خدا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۲۳
۳۔ایضاً، ص ۱۰
۴۔احمد ندیم قاسمی، پرمیشر سنگھ مشمولہ ''افسانے'' (خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۲۱۴
۵۔کشور ناہید، خواتین افسانہ نگار (۱۹۳۰ سے ۱۹۹۰ تک) مرتبہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶، ص ۸
۶۔سعادت حسن منٹو، انجام بخیر مشمولہ کلیاتِ منٹو افسانہ، حصہ اول و دوم، دہلی: ایجوکیشنل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۱۷۴
۷۔خدیجہ مستور، بھورے مشمولہ ٹھنڈا میٹھا پانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵، ص ۶۰۔۶۱
۸۔مرزا ریاض، بوجھ مشمولہ نامکمل کہانی، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۹۶، ص ۲۵
۹۔انتظار حسین، شہرِ افسوس مشمولہ شہرِ افسوس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵، ص ۲۰۱
۱۰۔ہاجرہ مسرور، بھاگ بھری مشمولہ سب افسانے میرے، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱، ص ۳۵۲
۱۱۔سلیم اختر، ڈاکٹر، سانتا کلاز کا زوال مشمولہ نرگس اور کیکٹس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۲۴۔۱۲۵
۱۲۔سی ایم نذیر، پگلی مشمولہ پتھر کی عورت، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۸، ص ۹۷
۱۳۔بانو قدسیہ، نیو ولڈ آڈر مشمولہ سامانِ وجود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۴۹
۱۴۔غزالہ خاکوانی، نامعتبر رفاقتیں مشمولہ ذرا در تو کھولیے، ملتان: جاذب پبلی شرز، ۲۰۰۵، ص ۱۴۸
۱۵۔محمد یحییٰ خان، زہر باد مشمولہ شب دیدہ، لاہور: پیارنگ پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۱۲
۱۶۔زاہدہ حنا، زمیں آگ کی، آسماں آگ کا مشمولہ تتلیاں ڈھونڈنے والی، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۱۷۵
۱۷۔احمد ندیم قاسمی، ماسی گل بانو مشمولہ ''افسانے''، ص ۹۲۔۹۳
۱۸۔انوار صدیقی، گوریلا مشمولہ دستک، لاہور: نیر اسد پریس، ۱۹۹۸، ص ۱۸۷
۱۹۔نیلم احمد بشیر، غمِ ہستی مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۱۰۔۱۲
۲۰۔محمد یحییٰ خان، بدماش مشمولہ شب دیدہ، ص ۱۳۹
۲۱۔بشریٰ اعجاز، ابابیل مشمولہ بارہ آنے کی عورت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص ۳۹
۲۲۔قدرت اللہ شہاب، آیا مشمولہ ماں جی، لاہور: سنگِ میلی پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۷۵
۲۳۔نیر اقبال علوی، کمرہ نمبر ۳۲۳ مشمولہ عالمِ سوز و ساز، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۵، ص ۵۷
۲۴۔مسعود مفتی، توبہ مشمولہ توبہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۸
۲۵۔احمد ندیم قاسمی، جلسہ مشمولہ ''افسانے''، ص ۵۷۵
۲۶۔قدرت اللہ شہاب، ۱۸ سول لائن مشمولہ ماں جی، ص ۳۱
۲۷۔صلاح الدین محمود، اغوا مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص ۱۹۵

۲۸۔ سعادت حسن منٹو، اُس کا پتی مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۱۲۵
۲۹۔ عصمت چغتائی، گیندا مشمولہ عصمت چغتائی کے سو افسانے، لاہور: چودھری اکیڈمی، س ن، ص ۳۶
۳۰۔ نیر اقبال علوی، غیر مشروط محبت مشمولہ سلسلۂ روز و شب، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر ز، ۲۰۰۵، ص ۱۲۳
۳۱۔ محمد سعید شیخ، اسباب مشمولہ رکاب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۹۶۔۹۷
۳۲۔ صلاح الدین محمود، پان شاپ مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، ص ۷۷
۳۳۔ توصیف قیصر، ڈاکٹر، نئی الیکٹرا مشمولہ محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۹، ص ۹۴
۳۴۔ سعادت حسن منٹو، اللہ دتا مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۱۵۲
۳۵۔ احمد ندیم قاسمی، رئیس خانہ مشمولہ افسانے، ص ۳۲۶
۳۶۔ قدرت اللہ شہاب، پکے پکے آم مشمولہ ماں جی، ص ۱۳۱
۳۷۔ منشی پریم چند، کفن مشمولہ بیسویں صدی کے منتخب افسانے مرتبہ سید معراج نیر، لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۳۴
۳۸۔ سعادت حسن منٹو، ایک زاہدہ، ایک فاحشہ مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۲۲۳
۳۹۔ خدیجہ مستور، چیلیں مشمولہ بوچھاڑ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵، ص ۷۱
۴۰۔ یونس جاوید، کانچ کا پُل مشمولہ آوازیں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، س ن، ص ۴۸
۴۱۔ صلاح الدین محمود، کلیانی مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ، ص ۲۷۵
۴۲۔ محمد یحییٰ خان، شہزادہ مندراں والا مشمولہ شب دیدہ، ص ۲۴۵
۴۳۔ احمد ندیم قاسمی، رئیس خانہ مشمولہ افسانے، ص ۳۰۵
۴۴۔ خدیجہ مستور، راستہ مشمولہ ٹھنڈا میٹھا پانی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵، ص ۴۳
۴۵۔ سعادت حسن منٹو، جھمکے مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۶۱
۴۶۔ مسعود مفتی، نابینا مشمولہ توبہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۵۱
۴۷۔ بانو قدسیہ، کاغذی ہے پیرہن مشمولہ توجہ کی طالب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۳۸۳
۴۸۔ بانو قدسیہ، بیوگی کا داغ مشمولہ توجہ کی طالب، ص ۴۰۲۔۴۰۳
۴۹۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، روشنی کی لکیر مشمولہ اگن کنڈلی، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱، ص ۳۶
۵۰۔ توصیف قیصر، ڈاکٹر، بَرشَور مشمولہ محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے، ص ۸۷
۵۱۔ محمد سعید شیخ، فالتو آدمی مشمولہ رکاب، ۲۰۰۶، ص ۳۲
۵۲۔ قدرت اللہ شہاب، دورنگا مشمولہ ماں جی، ص ۱۸۸۔۱۸۹
۵۳۔ مسعود مفتی، بڑے باپ کی چھوٹی بیٹی مشمولہ توبہ، ص ۲۸۱۔۲۸۲
۵۴۔ جیلانی بانو، موم کی مریم مشمولہ نئی عورت، لاہور: فکشن ہاوس، ۱۹۹۳، ص ۶۳۔۶۴
۵۵۔ داؤد رہبر، میزبان اور مہمان مشمولہ پراگندہ لوگ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷، ص ۱۲۷
۵۶۔ آصف نواز چودھری، اُترن مشمولہ واجدہ تبسم کے بہترین افسانے مرتبہ، لاہور: چودھری اکیڈمی، س ن، ص ۱۷۳

۵۷۔ آصف نواز چودھری، ذرا ہوا اُوپر مشمولہ واجدہ تبسم کے بہترین افسانے، ص ۱۶۷
۵۸۔ بشریٰ اعجاز، بارہ آنے کی عورت مشمولہ بارہ آنے کی عورت، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص ۱۹۶
۵۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کنول کنڈ مشمولہ نرگس اور کیکٹس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۸۸
۶۰۔ سعادت حسن منٹو، بدتمیز مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۸۴
۶۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، موری کی اینٹ مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۵۴۳
۶۲۔ صلاح الدین محمود، بھاگ گئی مشمولہ مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرتبہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۵۳۰
۶۳۔ نیر اقبال علوی، گلوبل ویلج مشمولہ جہان رنگ وبو، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر ز، ۲۰۰۵، ص ۳۸
۶۴۔ نیلم احمد بشیر، بھوک مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، ۱۹۹۹، ص ۲۷
۶۵۔ ممتاز مفتی، ذاتی معاملہ مشمولہ گڑیا گھر، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۰۸، ص ۷۰
۶۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کانا چور مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۵۲۸۔۵۲۹
۶۷۔ خدیجہ مستور، بھورے مشمولہ ٹھنڈا میٹھا پانی، ص ۶۱۔۶۲
۶۸۔ خدیجہ مستور، ہُنہ مشمولہ بوچھاڑ، ص ۳۲
۶۹۔ ایضاً، ص ۳۷
۷۰۔ انوار صدیقی، نہلے پہ دہلا مشمولہ دستک، لاہور: نیر اسد پریس، ۱۹۹۸، ص ۸۔۹
۷۱۔ صلاح الدین محمود، جہالت مکسچر مشمولہ مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرتبہ، ص ۴۶۱
۷۲۔ ہاجرہ مسرور، عورت مشمولہ سب افسانے میرے، لاہور: مقبول اکیڈیمی، ۱۹۹۱، ص ۸۰۳
۷۳۔ مظہر الاسلام، ایک گڑیا کا زائچہ مشمولہ گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۶۵
۷۴۔ نیلم احمد بشیر، جسے پیا چاہے مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، ص ۱۴۹۔۱۵۱
۷۵۔ نیلم احمد بشیر، حوا زادی مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، ۱۹۹۹، ص ۳۶
۷۶۔ نیر اقبال علوی، اُدھورا سفر مشمولہ سلسلۂ روز و شب، ص ۶۸
۷۷۔ غزالہ خاکوانی، رانگ نمبر مشمولہ ذرا در تو کھولیے، ص ۵۳۔۵۴
۷۸۔ سجاد حیدر یلدرم، چڑیا چڑے کی کہانی مشمولہ خیالستان، دہلی: ایجوکیشن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۱۳۰
۷۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، روشن دن کا تاریک رات میں سفر مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۲۷۷
۸۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، بے چہرہ لوگ مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۴۸۳
۸۱۔ عصمت چغتائی، عورت مشمولہ عصمت چغتائی کے سو افسانے، لاہور: چودھری اکیڈیمی، س ن، ص ۹۸۶
۸۲۔ ممتاز مفتی، چُپ مشمولہ چُپ، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۰۸، ص ۵۳
۸۳۔ ممتاز مفتی، سمے کا بندھن مشمولہ سمے کا بندھن، لاہور، الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۰۸، ص ۶۷
۸۴۔ کرشن چندر، موم کی عورت مشمولہ کرشن چندر کے سو افسانے، لاہور: چوہدری اکیڈیمی، ۲۰۰۲، ص ۶۵۱
۸۵۔ حجاب امتیاز علی، زہرہ سے ملاقات مشمولہ وہ بہاریں، یہ خزائیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲،

ص۱۷۵۔۱۷۷

۸۶۔محمد سعید شیخ،فرصتِ گناہ مشمولہ زمین کا دُکھ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص ۳۶۴

۸۷۔بانو قدسیہ،ٹھنڈا عذاب مشمولہ دست بستہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶،ص ۶۸

۸۸۔قدرت اللہ شہاب،اسٹینو گرافر مشمولہ ماں جی،ص۱۵۳۔۱۵۴

۸۹۔رضیہ فصیح احمد،سُرخ پلنگ پوش کی رات مشمولہ بارش کا آخری قطرہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹،ص۴۲

۹۰۔سلیم اختر،ڈاکٹر،نیک پروین مشمولہ نرگس اور کیکٹس،ص۱۵۳

۹۱۔سجاد حیدر یلدرم،صحبتِ ناجنس مشمولہ خیالستان،ص۱۰

۹۲۔بانو قدسیہ،بازگشت مشمولہ توجہ کی طالب،ص۴۴۴

۹۳۔آصف نواز چودھری،نتھ کا غرور مشمولہ واجدہ تبسم کے بہترین افسانے مرتبہ،لاہور:چودھری اکیڈیمی،س ن،ص ۲۲۸

۹۴۔انوار صدیقی،پھانس مشمولہ دستک،لاہور:مکتبہٗ القریش،۱۹۹۸،ص۲۶

۹۵۔آصف نواز چودھری،محمد طارق چودھری،آدھی عورت،آدھا خواب مشمولہ عصمت چغتائی کے سو افسانے مرتبہ،لاہور:
چودھری اکیڈیمی،س ن،ص۴۲۔۴۳

۹۶۔انوار صدیقی،مایاجال مشمولہ دستک،لاہور:نیر اسد پریس،۱۹۹۸،ص۱۶۵

۹۷۔سلیم اختر،ڈاکٹر،کاٹھ کی عورتیں مشمولہ نرگس اور کیکٹس،ص۵۵۹

۹۸۔سلیم اختر،ڈاکٹر،مٹھائی پلیٹ اور دودھ کا گلاس مشمولہ نرگس اور کیکٹس،ص۶۰۶۔۶۰۷

۹۹۔محمد سعید شیخ،فریبِ ہستی مشمولہ رُکاب،ص۸۸۔۸۹

۱۰۰۔پریم چند،وفا کی دیوی مشمولہ بیسویں صدی کے منتخب افسانے مرتبہ سید معراج نیر،ڈاکٹر،لاہور:الاعجاز پبلی کیشنز،
۲۰۰۳،ص۴۰

۱۰۱۔خدیجہ مستور،ہوس مشمولہ بوچھاڑ،ص۱۲۲

۱۰۲۔خدیجہ مستور،جوانی مشمولہ بوچھاڑ،ص۹۰۔۹۱

۱۰۳۔محمد سعید شیخ،میں جاناں جوگی دے نال مشمولہ زمین کا دُکھ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص ۲۴۸

۱۰۴۔خالدہ حسین،الاؤ مشمولہ دروازہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹،ص۱۰۷

۱۰۵۔ممتاز مفتی،سے کا بندھن مشمولہ سے کا بندھن،لاہور:الفیصل ناشران وتاجرانِ کُتب،۲۰۰۸،ص۹

۱۰۶۔ایضاً،ص۲۱

۱۰۷۔رشید امجد،ڈوبتے جسم کا ہاتھ مشمولہ عام آدمی کے خواب،اسلام آباد:پورب اکیڈیمی،۲۰۰۷،ص۶۳

۱۰۸۔جیلانی بانو،تلچھٹ مشمولہ نئی عورت،لاہور:فکشن ہاؤس،۱۹۹۳،ص۶۲۔۶۳

۱۰۹۔احمد ندیم قاسمی،عالاں مشمولہ احمد ندیم قاسمی افسانے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص۴۷

۱۱۰۔بشریٰ اعجاز،حل مشمولہ بارہ آنے کی عورت،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۴،ص۱۱۵

۱۱۱۔غزالہ خاکوانی،نامعتبر رفاقتیں مشمولہ در تو کھولیے،ملتان:جاذب پبلی شرز،۲۰۰۵،ص۱۴۲

۱۱۲۔ فرخندہ لودھی، اپنا دامن اپنا ہاتھ مشمولہ خوابوں کے کھیت، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۵

۱۱۳۔ اشفاق احمد، پناہیں مشمولہ ایک محبت سو افسانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۹

۱۱۴۔ رشید امجد، بیزار آدم کے بیٹے مشمولہ عام آدمی کے خواب، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۱۱۵۔ بشریٰ اعجاز، بارہ آنے کی عورت مشمولہ بارہ آنے کی عورت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۷

۱۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کاٹھ کی عورتیں مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۵۵۷

۱۱۷۔ نیر اقبال علوی، اشتہار مشمولہ جہانِ رنگ و بو، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۵ء، ص ۵۰

۱۱۸۔ نیلم احمد بشیر، لے سانس بھی آہستہ مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، ص ۱۶۶

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸۳۔۱۸۴

۱۲۰۔ رضیہ فصیح احمد، لعنت مشمولہ بارش کا آخری قطرہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۶

۱۲۱۔ غزالہ کاکوانی، سائیں بی بی مشمولہ در تو کھولیے، ص ۳۷

۱۲۲۔ محمد سعید شیخ، بساط مشمولہ رکاب، ص ۱۵۵

۱۲۳۔ طاہرہ اقبال، شب خون مشمولہ سنگ بستہ، فیصل آباد: قرطاس، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۹۔۲۰

۱۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، گندہ خون مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۵۶۱

۱۲۶۔ آصف نواز چودھری، لڑکی بازار کا نواب مشمولہ واجدہ تبسم کے بہترین افسانے مرتبہ، ص ۱۳۳

۱۲۷۔ سعادت حسن منٹو، مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۱۳۳

۱۲۸۔ سجاد حیدر یلدرم، نکاحِ ثانی مشمولہ خیالستان، دہلی: ایجوکیشن پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۵۹

۱۲۹۔ محمد سعید شیخ، دامِ تمنا مشمولہ رکاب، ص ۱۹۱

۱۳۰۔ خدیجہ مستور، بھروسا مشمولہ ٹھنڈا میٹھا پانی، ص ۱۳۶۔۱۳۷

۱۳۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، درد کا بندھن مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۳۷۹

۱۳۲۔ نیلم احمد بشیر، آرزو کا صحرا مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، ص ۱۷۔۱۸

۱۳۳۔ نیلم احمد بشیر، لالی کی بیٹی مشمولہ جگنوؤں کے قافلے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۲

۱۳۴۔ سیماں بھنور مشمولہ گیلی ریت کے گھر، کراچی: بیشال پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۰

۱۳۵۔ جیلانی بانو، دیوداسی مشمولہ نئی عورت، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۷

۱۳۶۔ ممتاز مفتی، پردۂ سیمیں مشمولہ گڑیا گھر، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۶

۱۳۷۔ احمد ندیم قاسمی، سناٹا مشمولہ احمد ندیم قاسمی ''افسانے''، ص ۳۸۴

۱۳۸۔ سجاد حیدر یلدرم، نکاحِ ثانی مشمولہ خیالستان، ص ۷۵۔۷۶

۱۳۹۔ صلاح الدین محمود، گرہن مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ، ص ۱۶۶

۱۴۰۔ صلاح الدین محمود، بلی کا بچہ مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ، ص ۴۹۱

۱۴۱۔عصمت چغتائی،نوالہ مشمولہ عصمت چغتائی کے سوافسانے،ص۱۳۱۵

۱۴۲۔فرخندہ لودھی،برسات کی گرم ہوا مشمولہ خوابوں کے کھیت،لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۰،ص۱۷۴

۱۴۳۔بشریٰ اعجاز،رحمو رام ریان والی مشمولہ بارہ آنے کی عورت،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۴،ص۵۹

۱۴۴۔ایضاً،ص۶۰

۱۴۵۔آصف نواز چودھری،آسماں مشمولہ واجدہ تبسم کے بہترین افسانے مرتبہ،ص۱۴

۱۴۶۔احمد ندیم قاسمی،ہیرا مشمولہ احمد ندیم قاسمی ''افسانے''،ص۲۷۵

۱۴۷۔بانو قدسیہ،نیو ولڈ آرڈر مشمولہ سامانِ وجود،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵،ص۵۰

۱۴۸۔بانو قدسیہ،موسمِ سرما میں نیلی چڑیا کی موت مشمولہ سامانِ وجود،ص۱۱۱

۱۴۹۔بانو قدسیہ،کج کلاہ مشمولہ سامانِ وجود،ص۱۹۲

۱۵۰۔ایضاً،ص۱۹۱

۱۵۱۔سعادت حسن منٹو،اجی ڈڈر مشمولہ کلیاتِ منٹو،ص۱۰۷۔۱۰۹

۱۵۲۔ایم اسلم،کیا کرے مشمولہ حقیقتیں اور حکائتیں،لاہور:مکتبۂ نظامی،۱۹۷۲،ص۲۷

۱۵۳۔مسعود مفتی،نابینا مشمولہ توبہ،ص۱۵۷

۱۵۴۔ممتاز مفتی،بیگانگی مشمولہ اَن کہی،لاہور:الفیصل ناشران وتاجرانِ کُتب،۲۰۰۸،ص۳۷

۱۵۵۔غزالہ خاکوانی،منیوڈل کوریئر سروس مشمولہ در تو کھولیے،ص۱۳۶

۱۵۶۔نیلم احمد بشیر،اپنی اپنی مجبوری مشمولہ جگنوؤں کے قافلے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸،ص۴۱۔۴۲

۱۵۷۔انتظار حسین،فجا کی آپ بیتی مشمولہ جنم کہانیاں،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص۶۰

۱۵۸۔مرزا ریاض، تاریک رستوں کے مسافر مشمولہ نامکمل کہانی،لاہور:مکتبۂ عالیہ،۱۹۹۴،ص۴۸

۱۵۹۔نیلم احمد بشیر،لالی کی بیٹی مشمولہ جگنوؤں کے قافلے،ص۱۵۹

۱۶۰۔نیلم احمد بشیر،نئی دستک مشمولہ جگنوؤں کے قافلے،ص۱۲۴

۱۶۱۔منعم مجید،صحیح فیصلہ مشمولہ قابلِ رحم،لاہور،روش پبلی کیشنز،۲۰۰۵،ص۲۲

۱۶۲۔عطیہ سید،آنسو کا نمک مشمولہ خزاں میں کونپل (شہرِ ببول)،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴،ص۲۱۸

۱۶۳۔خالدہ حسین،یارِ من بیا مشمولہ میں یہاں ہوں،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵،ص۱۵

۱۶۴۔جیلانی بانو،مٹی کی گڑیا مشمولہ نئی عورت،لاہور:فکشن ہاؤس،۱۹۹۳،ص۹۹۔۱۰۰

۱۶۵۔عصمت چغتائی،لحاف مشمولہ عصمت چغتائی کے سوافسانے،ص۱۱۹۴

۱۶۶۔نیلم احمد بشیر،رام گلی مشمولہ جگنوؤں کے قافلے،ص۳۰۔۳۱

۱۶۷۔نیلم احمد بشیر،آرزو کا صحرا مشمولہ لے سانس بھی آہستہ،ص:۱۵

۱۶۸۔نیر اقبال علوی،بدلا ہوا ارادہ مشمولہ عالمِ سوز و ساز،لاہور:ملٹی میڈیا افیئرز،۲۰۰۵،ص۳۱

۱۶۹۔ممتاز مفتی،کھل بندھنا مشمولہ روغنی پتلے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۹،ص۸۲

۱۷۰۔ممتاز مفتی، روغنی پتلے مشمولہ روغنی پتلے، ص ۹۸۔۹۹
۱۷۱۔صلاح الدین محمود، چیچک کے داغ مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ، ص ۲۹۵
۱۷۲۔صلاح الدین محمود، ماسوا مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ، ص ۴۲۳۔۴۲۴
۱۷۳۔عصمت چغتائی، آدھی عورت آدھا خواب مشمولہ عصمت چغتائی کے سو افسانے، ص ۴۱
۱۷۴۔بانو قدسیہ، ایک اور ایک مشمولہ توجہ کی طالب، ص ۷۸۸
۱۷۵۔ایضاً، ص ۷۹۱
۱۷۶۔اشفاق احمد، پناہیں مشمولہ ایک محبت سو افسانے، ص ۱۸۵
۱۷۷۔رضیہ فصیح احمد، دفینہ مشمولہ بارش کا آخری قطرہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص ۸۲
۱۷۸۔ہاجرہ مسرور، محبت اور___ مشمولہ سب افسانے میرے، ص ۳۷۴۔۳۷۵
۱۷۹۔سلیم اختر، ڈاکٹر، اُستانی بی اے بی ٹی مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۶۶۳
۱۸۰۔ایضاً، ص ۶۵۷
۱۸۱۔نیر اقبال علوی، ٹوٹا ہوا کھلونا مشمولہ سلسلۂ روز و شب، ص ۲۵
۱۸۲۔ممتاز مفتی، جوار بھاٹا مشمولہ اسمارا ہیں، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران، ۲۰۰۸، ص ۷۸
۱۸۳۔اُمِ عمارہ، کوئلہ بھئی نہ راکھ مشمولہ آگہی کے ویرانے، لاہور: مقبول اکیڈیمی، اشاعت اول، ۱۹۸۹، ص ۸۲
۱۸۴۔بانو قدسیہ، ہوتے ہواتے مشمولہ آتش زیر پا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۳۶
۱۸۵۔مرزا ریاض، تاریک رستوں کے مسافر مشمولہ نامکمل کہانی، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۹۴، ص ۳۸
۱۸۶۔خدیجہ مستور، چپکے چپکے مشمولہ بوچھاڑ، ص ۴۶۔۴۷
۱۸۷۔سلیم اختر، ڈاکٹر، بنجر مرد، زرخیز عورتیں مشمولہ نرگس اور کیکٹس، ص ۶۷۷۔۶۷۸
۱۸۸۔سعادت حسن منٹو، اولاد مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۲۱۰
۱۸۹۔محمد سعید شیخ، بساط مشمولہ رکاب، ص ۱۶۳
۱۹۰۔صلاح الدین محمود، دیوالہ مشمولہ مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، ص ۶۳۶
۱۹۱۔حسن عسکری، حرامجادی مشمولہ عسکری نامہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص ۵۷
۱۹۲۔نیر اقبال علوی، خارش زدہ کتا مشمولہ جہانِ رنگ و بو، لاہور: ملٹی میڈیا افیئر ز، ۲۰۰۵، ص ۱۵
۱۹۳۔نیلم احمد بشیر، آرزو کا صحرا مشمولہ لے سانس بھی آہستہ، ص ۱۶۔۱۷
۱۹۴۔محمد سعید شیخ، اسباب مشمولہ رکاب، ص ۱۵۲۔۱۵۳
۱۹۵۔رضیہ فصیح احمد، آگ کا دریا مشمولہ مجموعہ رضیہ فصیح احمد، لاہور: اکادمی بازیات، ۲۰۰۵، ص ۹۱
۱۹۶۔غزالہ خاکوانی، چھوٹے میاں سبحان اللہ مشمولہ در تو کھولیے، ص ۱۱۴
۱۹۷۔غزالہ خاکوانی، فیوڈل کوریئر سروس مشمولہ در تو کھولیے، ص ۱۳۵
۱۹۸۔ممتاز مفتی، باجوؤں کی ڈھونڈ مشمولہ روغنی پتلے، ص ۴۳۔۴۷

۱۹۹۔ممتاز مفتی، بُش اور بشرہ مشمولہ روغنی پتلے، ص ۳۱
۲۰۰۔فرخندہ لودھی، صراحی مشمولہ جب بجا کٹورا، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۹، ص ۶۳
۲۰۱۔فرخندہ لودھی، خاتونِ آخر مشمولہ جب بجا کٹورا، ص ۵۰
۲۰۲۔احمد ندیم قاسمی، مہنگائی الاؤنس مشمولہ احمد ندیم قاسمی ''افسانے''، ص ۵۳۵
۲۰۳۔قدرت اللہ شہاب، اسٹینوگرافر مشمولہ ماں جی، ص ۱۵۰
۲۰۴۔خدیجہ مستور، یہ ہم ہیں مشمولہ بوچھاڑ، ص ۹۷
۲۰۵۔صلاح الدین محمود، بھاگ گئی مشمولہ مجموعۂ عظیم بیگ چغتائی، ص ۵۳۳
۲۰۶۔خدیجہ مستور، یہ بڑھے مشمولہ بوچھاڑ، ص ۶۱۔۶۲
۲۰۷۔آغا سہیل، ڈاکٹر، روشنی کی لکیر مشمولہ اگن کنڈلی، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱، ص ۳۶
۲۰۸۔محمد سعید شیخ، تاریک راہیں مشمولہ رکاب، ص ۲۲۸
۲۰۹۔ایضاً، ص ۲۲۹۔۲۳۰
۲۱۰۔بشریٰ اعجاز، ابابیل مشمولہ بارہ آنے کی عورت، ص ۳۵۔۳۶
۲۱۱۔سعادت حسن منٹو، اصلی جن مشمولہ کلیاتِ منٹو، ص ۱۴۲۔۱۴۳
۲۱۲۔احمد ندیم قاسمی، ماسی گل بانو مشمولہ احمد ندیم قاسمی ''افسانے''، ص ۹۱
۲۱۳۔محمد سعید شیخ، فریب ہستی مشمولہ رُکاب، ص ۸۳۔۸۷
۲۱۴۔سی ایم نذیر، آس کا پنچھی مشمولہ پتھر کی عورت، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۸، ص ۱۷۲
۲۱۵۔رضیہ فصیح احمد، آشیاں گم کردہ، مشمولہ مجموعہ رُضیہ فصیح احمد، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۵، ص ۱۲۵
۲۱۶۔عصمت چغتائی، سونے کا انڈا مشمولہ عصمت چغتائی کے سو افسانے، ص ۹۲۸۔۹۲۹
۲۱۷۔عصمت چغتائی، چھوئی موئی مشمولہ عصمت چغتائی کے سو افسانے، ص ۴۹۷
۲۱۸۔بانو قدسیہ، مجازی خدا مشمولہ توجہ کی طالب، ص ۲۶۳
۲۱۹۔بشریٰ اعجاز، جلسہ گاہ مشمولہ بارہ آنے کی عورت، ص ۸۹
۲۲۰۔نیر اقبال علوی، طالبانِ خلد مشمولہ جہانِ رنگ و بو، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۰۵، ص ۱۲۴۔۱۲۵۔

ج۔تانیثیت اور پاکستانی اُردو ڈراما

ڈراما یونانی لفظ ڈراؤ سے ہے، جس کا مطلب عمل کرنا یا کر کے دیکھانا ہے، یعنی کرداروں کی حرکات وسکنات، چہرے کے تاثرات اور مکالمات کی ادائیگی سے قصہ یا کہانی بیان کرنا ہے۔ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار، مکالمے اور مناظر، بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُردو ڈرامے پر فرانسیسی ڈراما نگار لورکا کے اثرات نمایاں ہیں، جس طرح لورکا کے ڈراموں کا اصل موضوع عورت کی زندگی پر سماجی روایات کے اثرات کی عکاسی تھا، اِسی طرح ان میں ہمیں اپنی تہذیبی وثقافتی آوازیں سنائی دیتی ہیں، کیوں کہ سپین میں عورت کی کم وبیش وہی حیثیت ہے، جو ہمارے ہاں ہے، ان کے ڈرامے Shoen Kens Prodigal،Billy Blood Wedding میں عورت کی شادی شدہ زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح جہیز کم لانے اور اولاد نہ ہونے پر اُسے بُرا بھلا کہا جاتا ہے، اُن کے ہاں بھی اولاد کی خاطر عورتیں پیر وفقیروں کی درگاہوں کا رُخ کرتی ہیں۔ چلے کھینچتی ہیں۔ نذر و نیاز دیتی ہیں، لڑکیوں کی شادی کے مسائل، بے جوڑ شادیاں ماں باپ کے عدم توجہی اور جہیز کے علاوہ خاندان کی جھوٹی عزت اور وقار کے ہاتھوں لڑکی کو بھینٹ چڑھانا، ساس بہو اور نندوں کے جھگڑوں کی عکاسی کے علاوہ لورکا نے عورتوں کو راہبائیں بنانے کی شدید مذمت کرتا ہے۔ رضی عابدی نے عورت کے خلاف مروجہ استحصالی رویوں کو سماجی گھٹن کا نام دیا ہے، اُن کے خیال میں اِس گھٹن کا اظہار تشدد اور جذباتی عدم توازن میں ہوتا ہے۔ یہ قتل و غارت، فساد اور خون خرابے کی دُنیا ہے، جس میں ایک بیاہی ہوئی عورت کے لیے چاقو چل جاتے ہیں۔ پورے کے پورے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ رقابتیں ہوتی ہیں۔ نفرتیں ہوتی ہیں۔ کہیں ماں کے روپ میں اپنے بیٹے کو مرنے پر اکساتی ہے۔ اِعورت کی زندگی کے یہ تمام پہلو لورکا کی تانیثی فکر کی غمازی کرتے ہیں۔

اُردو ادب میں فنِ ڈراما نگاری کا جائزہ لیں، تو امانت لکھنوی کا ڈراما ''اندر سبھا'' کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اندر سبھا میں راجا اندر کے دربار میں مختلف خوبصورت پریاں آتی ہیں اور رقص کرتی گانے گاتی ہوئی اپنا حالِ دل بیان کرتی ہیں۔ راجا اندر کے دربار میں گائے گئے اِن گیتوں میں ہندی شاعری کی روایات کے گہرے اثرات تھے، جن کے تحت اظہارِ عشق عورت کی زبان سے کرائے جانے کی وجہ جذبات واحساسات میں نرمی اور نزاکت کا احساس ہوتا ہے، جن میں عورت کی کم تری اور مرد کی برتری کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ اندر سبھا کی پریاں بادشاہ کی ایک نظرِ کرم اور نگاہِ التفات کو ترستی ہیں اس کے بغیر اُن کی حیثیت ذرے سے بھی کم تر محسوس ہوتی ہے۔ اندر سبھا کی طرز پر ہی شیخ پیر بخش کانپوری نے ایک ناٹک ''ناگر سبھا'' لکھا، بعد میں قائم ہونے والی شیخ فیض بخش کی فرحت افزا تھیٹریکل کمپنی نے کافی کھیل پیش کیے۔ حکیم حسن مرزا برق کا ''گلشنِ جانفزا'' اور ماسٹر احمد حسین کا ''بلبلِ بیمار'' جیسے اُردو کا پہلا نثری ڈراما کہا جاتا ہے، پیش کیا گیا۔ اُردو تھیٹر کے باوا آدم دادا بھائی رتن جی کے ڈرامے ''نیرنگِ عشق'' اور ''لیل ونہار'' کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی سے

وابستہ ڈراما نگاروں میں مہندی حسن، احسن لکھنوی اور بیتاب بنارسی کے علاوہ آغا حشر نے بھی ڈرامے لکھے۔ آغا حشر کی ڈراما نگاری میں ''بلند آہنگی''، ''جُرات مندی'' اور ''انفرادیت'' نمایاں ہے۔ ''سلور کنگ''، ''خوابِ ہستی''، ''یہودی کی لڑکی''، ''ترکی حُور''، ''خونِ ناحق''، ''اسیرِ حرص'' اور ''رستم وسہراب'' نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ''رستم وسہراب'' میں تہمینہ کا کردار تانیثی شعور کا حامل ہے۔ وہ سماجی رسوم ورواج سے بغاوت کرتے ہوئے، مخالف ملک کے جری انسان رستم سے شادی کرتی ہے، پھر رستم کی عدم موجودگی میں اُس کے بیٹے سہراب کی پرورش کرتی ہے اور سہراب کے گلے میں وہی ہار پہناتی ہے، جو رستم کی نشانی تھی۔ تقدیر کے ہاتھوں باپ بیٹا میدانِ جنگ میں دست وگریباں ہوتے ہیں، تو سہراب اپنے باپ پر ہاتھ اُٹھانے سے کتراتا ہے اور اُس سے التجائیں کرتا ہے کہ وہ اُس کی بات سُن لے، لیکن رستم اُسے سہراب کی بزدلی تصور کرتے ہوئے مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے، جب سہراب اُس کے ہاتھوں قتل ہوجاتا ہے، تو تہمینہ کا دیا ہوا ہار دیکھ کر دیوانوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے، لیکن بے سود۔ سید امتیاز علی تاج کا ڈراما ''انارکلی'' اُردو ڈراما نگاری میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ انارکلی حاکم اور کنیز کی روایتی کشمکش کی داستان ہے، اِس کے نسوانی کردار، جہاں حسد ورقابت کا شکار ہیں، وہیں اِن میں خیر وشر کی داخلی کشمکش بھی پائی جاتی ہے۔ انارکلی، چوں کہ کنیز ہے اور شہزادہ اُس پہ فریفتہ ہے، بادشاہ اسے اپنی سلطنت کے شایانِ شان نہیں سمجھتا اور اُسے زندہ دیوار میں چنوا دیتا ہے، اِس کے برعکس شہزادہ، جو ولی عہد بھی ہے، اپنی تمام تر قباحتوں کے باوجود معاف کر دیا جاتا ہے، اِسی طرح ''قرطبہ کا قاضی'' میں ماں کی بے بسی اور قاضی کا انصاف کشمکش کی علامت ہیں۔ امتیاز علی تاج کے بعد رفیع پیر کے ڈرامے، ڈراما نگاری کے فن میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوئے قیامِ پاکستان کے بعد اگر چہ اِس صنف پر بہت کم لکھا گیا، ڈراما نگاری میں یہ نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی کہ اِس میں عشقیہ قصوں سے ہٹ کر روزمرہ زندگی کے مختلف مسائل، سیاسی وسماجی حالات کی عکاسی کے علاوہ فرد کے نفسیاتی مسائل اور اُلجھنوں کو موضوع بنایا گیا ہے، ڈاکٹر محمد سلیم ملک کے کہنا ہے:

> ''یہ اُنیسویں صدی کے آخری نصف حصے کی بات ہے کہ اُردو میں پہلے منظوم انداز میں اور پھر نثر میں ڈرامے لکھے گئے، بلکہ داستانوی، عشقیہ یا قدیم کہانیوں کو مبتذل اور عامیانہ انداز میں اسٹیج پر پیش کیا جاتا۔۔۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں آغا حشر کی ذات چھائی رہی، اُنھوں نے آہستہ آہستہ ڈرامے کو داستان اور لوک کہانیوں سے معاشرتی زندگی کے مسائل تک لانا چاہا۔ طویل کورس اور گانوں کی کثرت ختم کی۔ منظوم مکالموں اور مقفٰی ومسجع انداز کو ڈرامے سے الگ کیا اور اِس طرح آغا حشر نے ڈرامے کے فن میں کئی اصلاحات کیں۔''[۲۲]

ہجرت کے دوران ہونے والے خون ریز فسادات کی تباہ کاریوں سے کوئی بھی قلم کار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، یہی وجہ ہے کہ فسادات اور قتل وغارت گری اور لوٹ مار کو ڈراما نگاروں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے، اِن کی تعداد بہت کم ہے۔ عصمت چغتائی کا ڈراما ''دھانی بانکیں'' میں ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی عکاسی کی ہے۔ منہارن کی زبان سے فسادات کے دوران ہونے والی تباہی کا نقشہ بھی کھینچا ہے، جو لڑکیوں کو چوڑیاں چڑھانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان سناتی ہے:

''منہارن: (دبی ہوئی آواز سے) ہاں، ذرا باہر جا کر دیکھو تو سارا شہر جانو مرگھٹ بنا پڑا ہے، گلیاں پڑی بھائیں بھائیں کر رہی ہیں۔ پڑوسن: ہا، کیا شوبھا تھی شہر کی سب لٹ گئی، منہارن: (پڑوسن سے) ارے جب بھرے پورے گھر لٹ گئے، سہاگنوں کی مانگیں اُجڑ گئیں، ماؤں کی گودیں خالی ہو گئیں تو پھر کیا رہ گیا۔ لکشمی: (پھر لرزنے لگتی ہے) منہارن جانو شہر میں ہیضہ کی طاعون پھیلی ہے، جس گھر سے سنو بین کی پکار آرہی ہے۔۔۔ منہارن: اری رہنے بھی دے بہنیا۔ یہ لڑائی ہے؟ مردوں کی لڑائی اسی کو کہتے ہیں، ارے لڑنا ہے تو مردانگی سے خم ٹھوک کر میدان میں جا کے لڑو، اپنی بہادری کے جوہر دکھاؤ، یہ کیا کہ پاگل بھیڑیوں کی طرح نہتے، بے کس عورتوں بچوں پر ٹوٹ پڑے ناری بوا، یہ لڑائی مردوں کی تو نہیں۔'' [۳۳]

مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں مرد اپنی غلطی اور خطا کو کبھی تسلیم نہیں کرتا، بلکہ عورت ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ حاکمیت کا نشہ اِس پر اِس حد تک طاری ہو جاتا ہے کہ وہ عورت کو انسان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے، جو بات خلافِ طبع محسوس ہوتی ہے، اُسے حکم عدولی، مزاج ناآشنائی اور رویے کی بدصورتی پر محمول کر کے انتقامی رویہ اختیار کرتے ہوئے عورت کو غم و غصے کا نشانہ بناتا ہے۔ خانگی زندگی میں منفی پروپیگنڈا سُسرال کے مظالم، جن کا عام طور پر ایک عورت کو سامنا کرتی ہے، میاں بیوی کے مابین اختلافات اور ناچاقی کا باعث بنتے ہیں، بیشتر مرد اپنی سوچ مثبت انداز میں استعمال نہیں کرتے، بلکہ گھر والوں کی اندھی تقلید کے پیروکار ہوتے ہیں۔ سُسرال والوں کے ظلم و تشدد کا لازمی نتیجہ شوہر کے نارو اسلوب کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی صورتحال میں عورت اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی بیگانگی اور بے حسی کا سامنا کرتی ہے، اس بدترین کیفیت سے چھٹکارہ پانے کا یہی طریقہ ہے کہ شوہر کو چاہیے کہ وہ یہ سوچے کہ اُس کی بیوی اُسی کے اعتماد اور بھروسے پر اپنی زندگی کو فراموش کرتے ہوئے، اِس کے اور اِس کے گھر والوں کی ہر سختی اور ہر کجی اِسی کی خاطر برداشت کرتی ہے۔ مرد کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ عورت بھی ایک انسان ہے اِسے ستانا اور ظلم ڈھانا چہ معنی دارد؟ طرہ یہ کر اِس کے والدین اور بہن بھائیوں کو بھی اِس کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے اِس کی ذہنی اذیت میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے، مثلاً راجندر سنگھ بیدی نے ڈراما ''بے جان چیزیں'' میں حاکمیت کے نشے میں چور مرد کی کیفیات بیان کی ہیں، جو بات بہ بات پر عورت کی عزتِ نفس کی دھجیاں بکھیرنے سے گریز نہیں کرتے، جس کا حتمی نتیجہ عورت کی بغاوت کی صورت میں نکلتا ہے، اگرچہ سلیمہ آڑے وقتوں میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے، لیکن قدوائی معمولی باتوں پر اُس کی سرزنش کرنا اپنا حق تصور کرتا ہے، اُس کا یہ عمل بالآخر سلیمہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے:

''قدوائی: (آناً فاناً آواز وحشت ناک ہو جاتی ہے) بس ختم کرو اِس فلسفیانہ بکواس کو میں نے سمجھ لیا ہے کہ تم بھی ایک، اَن پڑھ گنوار عورت کی طرح حاسد ہو، کمینی ہو۔ سلیمہ: (بلند آواز میں) خاموش! زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں تمھاری منکوحہ عورت ہوں، بھگائی ہوئی نہیں۔ مجھے یہ بھی روز کی دانتا کلکل نہیں بھاتی۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ تمھاری زبان سے گالی سنی ہے۔ بس میں ایک بار بھی گالی برداشت نہیں کر سکتی، خوب ڈھنگ

ہیں۔ باہر کہیں سے ڈانٹ ڈپٹ کھا کر آئے اور گھر آ گئے اور گھر آ کر لگے ایک کمزور اور ناتواں عورت سے اُلجھنے، بڑے جواں مرد ہو نا۔۔۔ (شدید غصے میں کانپتی ہوئی) بس بہادری یہی ہے نا۔ عورت پر ہاتھ اُٹھانے لگے، اپنے گنوار پن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ آج کل تم جو کچھ بھی دکھائی دے رہے ہو یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہے۔ بیس روپے مہینے کی پریکٹس نہیں تھی، سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے اور کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ لو، اِس سے پہلے میں تمھاری دھول مٹی سے پٹی ہوئی سڑک پر چل رہی تھی، آج میں اپنا پختہ اور راہِ راست اختیار کرتی ہوں اور تمھاری منحوس شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں گی۔۔۔ (آواز میں رقت پیدا ہو جاتی ہے) زندگی میں سب سے بڑی ذہنی کوفت رہے گی کہ تم ایک معصوم عورت کو گمراہ کرنے میں کامیاب رہے۔ قدوائی: ۔۔۔ تم نے مرد کے وقار کو ٹھکرایا ہے، سمجھ لو کہ تم آج سے پھر سلیمہ سلطانہ ہو سلیمہ قدوائی نہیں۔''[۴]

عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کی عورت کی نفسیات اور جنسی اُلجھنوں اور مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہوئے بے باقی کے ساتھ انسانی تحت الشعور اور لاشعور کے تاریک پہلوؤں کو منظر عام پر لے آتی ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کا شادی کے بعد شوہر اور سُسرال کے رویوں کے حوالے سے گفتگو، اِن کی تصوراتی دُنیا میں طلاطلم و ہلچل مچا دیتی ہے۔ ڈراما ''ڈھیٹ'' میں اِسی کشمکش کا اظہار ملتا ہے:

''میں: میں نے سب کچھ مانا، لیکن ایک دیوتا کے لیے پاگل وانگل کا سوال ہی نہیں، کہا نا میں نے کہ وہ جیسا بھی ہو پھر مجازی خدا ہے، اگر سجدہ سوائے خدا کے جائز ہوتا تو وہ اسی دیوتا کے حضور میں پیش کیا جاتا۔ عورتیں وہی پارسا اور نیک ہیں، جو بُرے شوہروں کو نباہ رہی ہیں۔ ہماری بخشش شوہر کی فرماں برداری میں ہے۔ وہ: بس۔ بس میں تمہاری باتیں نہیں سُن سکتا، کہتے ہیں، جو اگر شادی بیاہ کی باتیں لڑکیاں کرتی ہیں، تو مُنہ پکا پکا ہو جاتا ہے۔''[۵]

اشفاق احمد حقوقِ نسواں کی بات کرتے ہیں، لیکن وہ مرد کی حاکمیت کے بھی قائل ہیں، یہی وجہ ہے وہ مرد کی ہر کجی کے لیے کوئی نہ کوئی توجیہہ تراش لیتے ہیں، مثلاً ڈراما ''ماما یسی'' میں شوہر کے متشددانہ رویے کی نفسیاتی توجیہہ دے کر اُس کے غم و غصے کے اظہار کو ظلم سہنے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، چوں کہ عورت اُسے کمزور محسوس ہوتی ہے، اِس لیے اِس پر غصے کا اظہار کرتا ہے، یہ جانے بغیر کہ بیوی کی ذہنی صحت پر اُس کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، جب کہ عورت کو اپنی تمام اُلجھنوں اور نفسیاتی دباؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تناؤ کے اظہار کی آزادی نہیں دیتا:

''عدنان: مرد عورت کی سچوایشن تو زیادہ DRAMATIZE نہ کیا کرو بھابی۔ ایگریکلچرل سوسائٹی میں تو عورت مربعوں میں کھلی پھرتی ہے آج بھی، روز پکنک ہوتی ہے۔ کھانا دینے جاتی ہے شوہر کو، بھائیوں کو، بیٹوں کو کھلی ہوا میں کئی پیلیاں چل کر۔ یسی: لیکن شہر

میں کیا ہوتا ہے، دیکھتے نہیں کیا محبوس کر کے چار دیواری میں بند کر کے عورت کو رکھا جاتا ہے۔ آج کی عورت کو ذرا آزادی ملی ہے تو اب تم جیسے دیور پیدا ہو گئے ہیں۔ عدنان: دراصل تم بھی جانتی ہو کہ میں بنیادی طور پر تمہارا غلام ہوں۔ سیمی: پھر؟ عدنان: لیکن بھابی ایک بات مان لو، ہمیشہ ہمیشہ سے جو مرد عورت پر ظلم کرتا ہے، غور سے دیکھو تو معاشرے میں وہ مظلوم ہوتا ہے۔ بہت ظلم سہتا ہے۔ پھر کچھ حصہ کچھ پرسنٹیج PERCENTAGE بیوی کے ساتھ بانٹ لیتا ہے ورنہ سچ مانو، وہ پاگل ہو جائے۔''۶

بانو قدسیہ کے ڈرامے ''سورج مکھی'' کی آمنہ نے آنکھ کھولتے ہی اپنی ماں کو سسرال اور شوہر کے جور و ستم کا نشانہ بنتے دیکھا، اِس عورت کو اِس حد تک بے بس کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے اولاد کے حق کے لیے بھی زبان کھولنے سے قاصر رہی، اِس کا المیہ یہ ہے کہ تمام زندگی ستم سہنے کے باوجود، جس اولاد کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی رہی تھی، وہی اِسے اِس کے بے بسی پر طعنہ زنی کرتی ہے:

''آمنہ: پھر تیرا فائدہ؟ نہ تو اپنے حق کے لیے لڑ سکے، نہ بچو کے حق کے لیے کھڑی ہو سکے۔ تجھ سے تو بلی اچھی ہے۔۔۔ دیکھا ہے کبھی ذرا بلونگڑے کو ہاتھ لگاؤ تو کیسا پنجہ مارتی ہے۔۔۔ پر تو نے ہمیں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔۔۔ کیسی ماں ہے تو۔''۷

میرزا ادیب کے ڈرامے ''ساحل'' میں بھی مرد کی حاکمیت کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ عورت کسی بھی مکتبِ فکر کی ہو شوہر اُسے اپنا دستِ نگر اور ہر حکم کا پابند کرنا حق تصور کرتا ہے۔ ایسا مرد عورت کو برابری اور ہمسری کا درجہ دینے میں ناکام رہنے اور اپنی کمتری کے خوف سے یہ دفاعی میکانیت اختیار کرتے ہیں کہ جس سے کسی نہ کسی طرح اپنی برتری ثابت کر سکیں:

''لیلیٰ: میں نے محسوس کیا کہ ایک آزاد پیشہ عورت کسی مرد کی حمایت اور سرپرستی کے بغیر عزت و آبرو کی زندگی نہیں بسر کر سکتی، لیکن جو قیمت مرد اپنی حمایت اور سرپرستی کے لیے، ہم عورتوں سے طلب کرتے ہیں، وہ اتنی خوف ناک ہے کہ موت اُس کے مقابلے میں مجھے دلکش دکھائی دیتی ہے۔''۸

امجد اسلام امجد کے ڈرامے ''بازدید'' کا ناصر اپنی بیوی روبینہ کے ساتھ ناروا سلوک رکھتا ہے، اِس کی روبینہ سے شادی بھی اپنے باپ کا انتقام لینے کی خاطر کرتا ہے۔ معمولی معمولی بات پر اِس کی تذلیل کرتے ہوئے اِسے کمتر و کمزور ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ایک روز جب وہ چائے لے کر آتی ہے، تو بُری طرح اُسے دھتکارتا ہے: ''ناصر۔ میرے سر پر کیا کھڑی ہو گئی ہو۔ رکھو اِسے کہیں اور دفع ہو جاؤ یہاں سے، کتنی دفعہ کہا ہے چینی مجھے ایک چمچ چاہیے نہ ایک دانہ کم نہ زیادہ، دیکھو کون ہے، جو بھی ہو کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔''۹ اسی طرح ''وادیِ پُر خار'' میں نجمہ اپنے شوہر کی لگائی گئی پابندیوں اور حاکمانہ رویے سے تنگ آ کر سراپا احتجاج بن جاتی ہے:

''نصیر: کام سے منع کر رہی ہوں گی۔ ہے نا؟ نجمہ: خون جم گیا ہے شریانوں میں۔ کیا میرا وجود کسی دوسرے وجود میں فٹ ہے؟ اس لیے لائے تھے مجھے جیت کر۔ یہ محبت ہے یا انتقام؟ (رُک کر) مرضی سے آ سکتی ہوں، جا سکتی ہوں، نہ مل سکتی ہوں، حتیٰ کہ رو بھی نہیں

سکتی۔(رُک کر)تم مرد ہویارا کھ کا ڈھیر؟(نصیرالدین چپ چاپ سیدھا کھڑا ہے)۔''[۱۰]

اصغر ندیم سید نے ''دریا'' میں مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں بھی چند ایسی مثالوں کو بیان کیا ہے، جن کی وجہ سے عورتوں کو اپنی شادی کے مسئلے میں پسند اور ناپسند کی پوری چھوٹ ہے۔''دریا'' میں چولستان کی روایات میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ شادی کے لیے اگر لڑکی رضامند ہوتی ہے، تو شادی ہو پاتی ہے ورنہ عورت کو پورا اختیار ہے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرے:

''سانول: بھاگی کے مقدر کا فیصلہ کرنے کا کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔وہ خود فیصلہ کر سکتی ہے۔جندوڈا: مگر سانول سُنا ہے۔وہ شاہ مرید کا بازو ہے۔سانول: وہ بازو نہیں انسان ہے جیندا جاگدا۔شاہ مرید: تم سب سُن لو کہ میری وجہ سے اگر تم ایک معصوم عورت کا حق مارنے لگے ہو تو میں ابھی اور اسی وقت جا رہا ہوں۔بخشو: شاہ مرید تم نہیں جاؤ گے۔تیڈا کوئی قصور نہیں۔شاہ مرید: کسی کو نہیں معلوم کہ میں کون ہوں اور مرا بھاگی سے کیا رشتہ ہے۔سیفل: کوئی رشتہ ہے تو بات نکلی ہے۔شاہ مرید: بھاگی کبھی میری بیوی تھی۔اب وہ سانول کی بیوی ہے۔میرا اُس پر کوئی حق نہیں ہے، اُسے اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا اختیار ہے۔''[۱۱]

مُستنصر حسین تارڑ کے ڈرامے ''کالاش'' کی زرگل جنگل میں رہنے کے باوجود بہ حیثیتِ عورت مسلسل دباؤ اور ذہنی اذیتوں سے تنگ آکر اپنے شوہر کی حاکمیت کے طلسم کو توڑ ڈالتی ہے:

''زرگل: میں چاہتی ہوں کہ مجھے انسان سمجھو۔۔۔جانور نہیں۔۔۔سنو۔۔۔غور سے۔۔۔سن لو۔۔۔میں کالاش کی لڑکی ہوں، میں نے تمھیں پسند کیا تھا، تمھیں چُنا تھا۔۔۔چُنا تھا اور تمھیں چھوڑ بھی سکتی ہوں۔شان: (سناٹے میں آجاتا ہے) زرگل۔۔۔زرگل: ہاں۔۔۔میں جنگلی جنگلی سُن کر تنگ آگئی ہوں۔۔۔اور اکیلی نہیں جاؤں گی، اپنے بچے کو۔۔۔اپنے بیٹے کو لے کر جاؤں گی۔۔۔ایسی جگہ کہ۔۔۔تم کبھی۔۔۔کبھی وہاں نہ پہنچ سکو۔۔۔ساری زندگی۔۔۔ہاں شان ڈارلنگ۔۔۔مجھ سے میرا بچہ چھین لیا ہے، یہ تہذیب ہے تمھاری۔۔۔ایسی جگہ۔۔۔کہ تم کبھی اپنے بیٹے کو نہ دیکھ سکو۔۔۔وعدہ زرگل کا ہاں شان ڈارلنگ (روتی ہوئی چلی جاتی ہے، کیمرہ شان کے حیران چہرے پر)۔''[۱۲]

خانگی تشدد عورت کو درپیش مسائل میں سرِ فہرست ہے۔کبھی یہ تشدد بہن بھائیوں یا والدین کے ہاتھوں ہوتا ہے، جس کی بڑی وجہ عام طور پر روپیہ پیسہ اور جائیداد کا حصول یا وٹہ سٹہ، بے جوڑ اور بدلے کی شادی اور وَنی کے نتیجے میں ہوتا ہے، اِس کی بہ نسبت گھریلو تشدد کی بدترین مثال شوہر اور سُسرال کے مظالم ہیں، جن کی انتہائی صورت لڑکی کو جلا کر مار ڈالنا، قتل کر دینا یا ناک، کان، چوٹی وغیرہ کاٹ دینا ہے، اِس کی مثالیں ڈرامہ نگاروں کے ہاں ملتی ہیں، جن میں امجد اسلام امجد کے ڈرامے ''لیکن!'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے، جس میں لبنٰی کے شوہر انور کے اُس پر مظالم، شک اور مار پیٹ کو موضوع بنایا گیا ہے، جس طرح کا ظلم برداشت کرنے کے باوجود والدین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو ماں باپ سے ملاقات کی اجازت نہیں دی

جاتی اور جب ماں باپ اُسے ملنے آتے ہیں، تو اُنھیں بے عزت کر کے نکال دیا جاتا ہے۔ آیا یہ باتیں اخلاقی وسماجی اور انسانی سطح پر درست ہیں؟:

ناصر___ (نذیر کی طرف دیکھے بغیر روبینہ سے مخاطب ہوتا ہے) میں نے کہا تھا، جو بھی ہو کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔ (چیخ کر) سنا نہیں تھا تم نے، روبینہ___ (بے چینی سے اپنے حیرت زدہ والدین کی طرف دیکھتی ہے) مگر امی اور پاپا تو۔۔۔، ناصر___ کون سے لعل لگے ہوئے ہیں تمہارے امی اور پاپا کو (مڑ کو پھلوں کے لفافے والی میز کو ٹھوکر مارتا ہے) اور یہ سب کیا ہے۔ کیا میرے گھر میں کھانے کو نہیں ہے، (شدید حیرت اور صدمے سے) نذیر___ مگر بیٹے، یہ تو، شگن ہوتا ہے۔ رسم ہے۔ بیٹی کے گھر جائیں تو کچھ نہ کچھ لے کر جاتے ہیں، ناصر___ یہ تمہاری بیٹی کا نہیں میرا گھر ہے، سمجھے۔''[۱۳]

''چٹان پر گھونسلہ'' میں بانو قدسیہ نے ایسی عورت کی زندگی کا المیہ بیان کیا ہے، جس شادی کی پہلی رات ہی دو کم سن نندوں کی تربیت کا تحفہ ملتا ہے، نہایت دیانتداری سے اُس نے اُنھیں پال پوس کر بڑا کیا، لیکن اِس کے حصے میں صرف برائیاں ہی آئیں، اِسی طرح ڈراما ''خانہ بدوش'' کی مہرو شوہر کے اچانک غائب ہو جانے پر اِس کی عدم موجودگی میں اِس کی عزت کی پاس داری کرتی ہے، اِس کی ساس بھی یہی سمجھاتی ہے، زندگی کی بھاگ دوڑ کے لیے کام کے لیے نکلتی ہے، تاکہ دو وقت کی روٹی میسر آ سکے، جب اِس کی ساس دوسری شادی کرنے کا کہتی ہے، تو مہرو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے:

''مہرو: (اب مہرو بیٹھ کر زانو پر سر رکھتی ہے اور رونے لگتی ہے) تو نے جب جب مجھے کوئی حکم دیا اماں، میں نے ضرور مانا۔۔۔ پر تو نے کبھی میرا امتحان لینا نہ چھوڑا۔۔۔ تو نے کہا دیکھ مہرو کام پر جانا تو آنکھیں جھگی میں چھوڑ جانا، باہر غیر مرد پھرتے ہیں۔۔۔ بول، بتا۔۔۔ اتنے سال گزر گئے کیا میں نے کبھی کسی کو دیکھا باہر۔۔۔ کبھی آنکھیں ساتھ ہی لے کر نہیں گئی اماں، یہ تو کیا کہہ رہی ہے آج، جب میں آنکھیں ہی گھر چھوڑ گئی سدا۔''[۱۴]

اِسی طرح اصغر ندیم سید نے ڈراما ''دریا'' میں عورت کو اپنے خاندان کی رسم ورواج کے ہاتھوں عورت کی بے بسی کو بیان کیا گیا ہے۔ اولاد کے معاملات میں بھی اُسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا:

''بڈھن: دستور ہے بخشو یہاں کا۔ چاہے نکاح کیوں نہ ہو۔ طلاق دینی پڑتی ہے۔ سیفل: اُٹھ اُٹھ سال کے قبضے والے بازو وارثوں کو واپس چلے گئے یہ تو حالی کل کی بات ہے۔۔۔ بڈھن: دیکھ بخشو بھاگی بے وفائی کر کے بھاگی ہے، اُسے یہاں سے جانا ہوگا۔ جنداں: او منے یا نہ منے بات تو مرد کی مانی ہوگی جو لینے آیا ہے۔ بڈھن: ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی پیچھے سے آیا۔ بازو کو اُسی وقت اُس کے حوالے کر دیا، چاہے پانچ بچوں کی ماں کیوں نہ بن چکی ہو۔''[۱۵]

عمیرہ احمد نے ''دوراہا'' میں ساس ثمینہ کا بہو سارہ کے مس کرج ہونے پر اُسے نام نہاد تسلی دینے کو موضوع بنایا ہے:

''سارہ: آپ مجھے بلیک میل کر رہی ہیں۔۔۔؟، ثمینہ: (فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر) بیٹا میں

کیوں کروں گی۔۔۔تم بہو ہو میری۔۔۔میں بڑا پیار کرتی ہوں،تم سے۔۔۔اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اظفر کو ایک موقع اور دو اِس بار مس کیرج ہو گیا۔اللہ تعالیٰ اور اولاد دے دے گا،بعض دفعہ تو ویسے ہی مس کیرج ہو جاتا ہے(سارہ بے بسی سے اُنھیں دیکھتی رہتی ہے)۔۔۔ثمینہ:بس پتہ بھی نہیں چلا کیسے باتھ روم میں گھر گئی۔میں اور اظفر تو فوراً ہاسپٹل لے کر گئے اسے۔ثمرہ:لیکن ہمیں کیوں نہیں انفارم کیا۔ثمینہ:وہ بس رات کا وقت تھا۔سارہ نے ہی منع کیا تھا کہ آپ لوگوں کو ڈسٹرب نہ کریں۔حسین:سارہ بے وقوف ہے۔Parents ڈسٹرب ہوتے ہیں کبھی؟،اظفر:بس انکل یہ سب کچھ ایسے ہی ہونا تھا۔

حسین: I was so excited about the baby and it all ended up in smoke.

پریشان مت ہو۔ابھی Young ہو تم لوگ اللہ تعالیٰ پھر سے اولاد سے نوازے گا۔''[۱۶]

سُسرال کے مظالم کے علاوہ جہیز کے مسائل بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں،حتیٰ کہ چولہا پھٹنے کے نام پر کئی لڑکیاں زندہ جلا دی جاتی ہیں،اسی طرح لڑکی کی شادی،وٹہ سٹہ بدلے کی شادی،بے جوڑ بچپن کی منگنیاں وغیرہ،جیسے خودساختہ مسائل بہت سے لوگوں کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں،اِسی طرح اشفاق احمد کے ڈرامے''ڈزے کول'' کی ساجدہ سُسرال والوں کی توقعات سے کم جہیز لے کر جاتی ہے،تو سُسرال والے اِس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتے ہیں اور وہ بمشکل جان بچا کر ماں باپ کے پاس آجاتی ہے۔اپنی داستانِ الم بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

''ساجدہ ــــ بس پھر میں ــــ کوئی گیارہ روز ــــ اپنے سُسرال رہی ــــ اتنی ہی تھی میری ازدواجی زندگی۔سلمان ــــ پھر۔ساجدہ ــــ پھر میں وہاں سے بھاگ آئی ــــ اپنی چھوٹی نند کی مہربانی سے ــــ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے بڑی ہمدرد بڑی نرم گفتار۔بہت زیادہ محبت کرنے والی بہت کچھ تمہاری طرح ــــ اس نے مجھے وہاں سے بھاگنے میں مدد دی اور میں راتوں رات ــــ اکیلی تن تنہا ــــ میانوالی سے سرگودھا پہنچ گئی۔واپس اپنے ابا جان کے پاس۔سلمان ــــ پھر۔ساجدہ ــــ پھر انھوں نے بڑا زور لگایا سلمان ــــ بڑے واسطے ڈالے پگڑیوں والے معززین کو ہمارے گھر بھیجا،لیکن ابا جان ایک نہ مانے۔ اُنھوں نے چھ مہینے کے اندر اندر مجھے طلاق لے دی۔''[۱۷]

اشفاق احمد نے ڈراما''غریب شہر'' میں ماں کی انتھک محنت اور قربانی،باپ کی عدم توجہی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ساس بہو کے ذریعے اپنی بیٹی زرینہ کے لیے اس کے سُسرالی رشتے داروں کی تواضع کا تقاضہ کرتی ہے،وہ بیٹے اور بہو کی محبت وقربت کو ذرا بھی برداشت نہیں کرتی:

''ماں ــــ میرا زمانہ گیا بتول۔اب تو تیرا زمانہ ہے۔بتول ــــ میری کہاں مانتے ہیں اماں جی۔ماں ــــ تو چاہے تو اس سے دس قتل کروالے تیرا تو وہ ایسا مرید ہے کچھ ترقی کی سوچ کچھ آگے بڑھنے کی دُنیا کہاں کی کہاں نکل گئی۔زرینہ ــــ بھابھی کے پیچھے آپ ایسے پڑی رہتی ہیں اماں۔بتول ــــ تو نہ بول زرینہ ان کا حق ہے۔ماں ــــ منگنی پر

موچیوں نے چھ دیگیں پکائیں۔ تین پلاکی اور تین زردے کی۔ ایک جوڑا ساس کو دیا ایک مندری لڑکے کو۔ ہم اِس کو زہر دیں گے شادی کے دن زرینہ کو۔ بتول ـــ ہائے اللہ نہ کرے کیسی باتیں سوچتی ہیں آپ۔ ماں ـــ جواں لڑکی کی ماں اور کیسی باتیں سوچے بتول؟ زرینہ ـــ جواں لڑکی نہ ہوئی اماں سر کھلی موت ہوگئی۔ گھر میں جب دیکھو جوان لڑکی جب دیکھو، جوان لڑکی، جی چاہتا ہے موہرا کھا کر مرجاؤں۔''[۱۸]

''فہمیدہ کی کہانی، اُستانی کی راحت کی زبانی'' میں غریب گھرانے کی خوبصورت لڑکی شادی کی امنگوں کے خواب آنکھوں میں سجائے جہیز اور وسائل کی عدم دستیابی کی وجہ سے مسلسل ٹینشن اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے اگلی دُنیا سدھار جاتی ہے، اِس کی ماں تمام عمر کی کمائی جہیز کی تیاری اور اچھے رشتے کی آس میں بتا دیتی ہے، لیکن اپنی زندگی کا واحد سہارا اپنی بیٹی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ ڈراما ''میل ملاپ'' کا موضوع شوہر اور سُسرال والوں کے خانگی تشدد کی بدترین صورت، عورت کو جلا کر مار ڈالنا ہے۔ کلثوم والدین کی لاڈلی بیٹی ماں باپ بڑے ارمانوں سے، جس کا گھر بساتے ہیں، لیکن اپنی بیٹی سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں:

''آخری خط کے بعد مجھے ظفر کا خط ملا کہ تیل کا چولہا پھٹ جانے سے کلثوم کی موت واقع ہوگئی ہے اور اَب اُس کا پاسپورٹ کبھی بھی نہ بن سکے گا۔ خالہ: کلثوم مرگئی سجاد۔ سجاد: پتہ نہیں یہ تیل کا چولہا تھا یا کلثوم کی پشیمانی کے آنسو تھے یا نائیلون کا لباس تھا یا کسی کی بددعا تھی یا ترس کی محبت کا کوندا تھا، جو چار مہینے تک آہوں کی ہواؤں پر ہلتا رہا اور پھر سب کچھ راکھ میں تبدیل ہوگیا۔''[۱۹]

''جنگل کی آگ'' میں ماں بہن کی طلاق کا بدلہ لینے کی خاطر اپنے بیٹے کی شادی فاطمہ سے کرتی ہے، تاکہ اسے طلاق دِلوا سکے:

''ماں: خورشید کی لاش پر میں نے ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی قادر۔۔۔ کہ میں اِسی گھر کی لڑکی اپنے گھر بیاہ کر لاؤں گی اور جب اسے میرے بیٹے سے محبت ہو جائے گی تو اِسی طرح طلاق دلواؤں گی جس طرح میری بہن کو طلاق ہوئی، جب میرا نصیر دس سال کا ہوا تھا۔۔۔ تب سے میں نے اُن کے گھر چکر لگانے شروع کیے۔۔۔ پورے بیس سال بعد مجھے فاطمہ ملی ہے۔۔۔ اَب میں اُسے بخش دوں۔۔۔ اب۔۔۔ بیس سال راہ دیکھ کر! ۔ قادر: میں تو سمجھتا تھا ماں کو بڑی محبت ہوتی ہے اپنے بیٹے سے ـــ تیرا نصیر یہ چوٹ برداشت کرلے گا۔؟''[۲۰]

اپنے گھر کی خواہش ہر لڑکی کے دِل میں ہوتی ہے، لیکن سُسرال میں جب اُس کی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا، تو یہ احساس شدید تر ہو جاتا ہے، میرزا ادیب کے ڈرامے ''اپنا گھر'' کے صفیہ اور شائستہ ایسے ہی دو کردار ہیں، جو گھر کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔ صفیہ کی خاموشی، جب اِس کے میاں کو کھٹکتی ہے، تو وہ اُسے اپنا حالِ دِل بیان کرنے کے لیے کہتا ہے، جب وہ اپنا مدعا بیان کرتی ہے، تو میاں بیوی کی گفتگو ہر شادی شدہ جوڑے کے مابین پیدا ہونے والی تلخی کی نشاندہی کرتی ہے۔ شوہر اور سُسرال والے عورت کو اِس کا جائز مقام دیں، تو ایسے مسائل کم ہوتے ہیں، جب کہ ہمارے معاشرے میں

عورت کو اِس کی مرضی و خواہش کے مطابق ماحول دینے کی بجائے اُسے بے جا دھونس اور حاکمیت کے زیرِ اثر کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کا ایک نتیجہ گھر سے نکال دینا یا طلاق کی صورت میں نکالا جاتا ہے، گویا عورت کو اپنے جائز حق کے لیے بھی ذلت و رسوائی کے علاوہ ہمیشہ کے لیے اپنے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا ہے:

''صفیہ: اور یہ اس وجہ سے کہ اس گھر سے کسی معاملے پر مجھ اختیار نہیں۔ گھر کے فرنیچر سے لے کر روز مرہ کی چیزیں لانے تک ــــ ہر ایک بات کا فیصلہ آپ کے امی یا ابا کرتے ہیں۔ اشرف: اور یہ اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں تم فضول خرچی کرتی ہو۔ صفیہ: میں نے آج تک کون سی فضول خرچی کی ہے ــــ زمانے کا فیشن بدل چکا ہے۔ آپ کے ابا امی پرانے دستور، پرنے رسم ورواج کے قایل ہیں۔ میں اِن کے ذہن میں نئے خیال نہیں ڈال سکتی اور وہ مجھ سے پوچھتے ہی کب ہیں۔ پورے گھر پر اِن کا حکم چلتا ہے، جو چیز منگوائیں، جب چاہیں منگوائیں، میرا فرض یہ ہے کہ گھر کے کسی معاملے میں بھی دخل دینے کی جرأت نہ کروں۔ خاموش تماشائی بن کر بیٹھی رہوں ــــ میں پوچھتی ہوں یہ گھر میرا گھر کیسے بن سکتا ہے، جب اس کے کسی معاملے میں بھی مرا دخل نہیں ہے۔ اشرف: وہی ہوا نا، جس کا مجھے خدشہ تھا۔ صفیہ: کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟، اشرف: تم اِن لوگوں کو یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ صفیہ: یہ غلط ہے ــــ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے اِس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی آزادی حاصل ہو، اشرف: یہ آزادی تمھیں حاصل نہیں؟ صفیہ: نہیں، اشرف: اگر تم اِس بات کو پسند نہیں کرتیں کہ میری امی ابا اور خالہ یہاں آگئے ہیں، تو تم بھی اپنی بہن بھائی کو یہاں بلا لو ــــ یہی چاہتی ہونا!، صفیہ: (غصے سے) آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ یہ میں کیوں چاہوں گی ــــ اُن کا اپنا گھر ہے ــــ وہ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ اشرف: گویا میرے گھر والے میرے محتاج ہیں!، صفیہ: محتاج نہیں ہیں تاہم ــــ اشرف: تم میرے والدین کی توہین کر رہی ہو، صفیہ: آپ نے خود ہی فرمایا ہے اپنے دل کی بات کہو۔''[۱۲]

عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، اِسی طرح شائستہ کی باجی دخل اندازیوں پر سراپا احتجاج بننے والی شائستہ کے الفاظ میں عورت کی خواہش دیرنہ کے کچلے جانے کا دُکھ بیان کیا ہے:

''مسعود: تم یہ سوال کرنے والی کون ہوتی ہو؟ شائستہ: مجھے یہ سوال کرنے کا حق ہے، کیوں کہ اِس کے جواب کے ساتھ میری ذات کا گہرا تعلق ہے۔ میں جواب دیتی ہوں۔ آپ کی باجی وہاں اِس بنا پر نہ رہ سکیں کہ ساس سُسر نے گھر کے ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑائی ــــ بہو کو نظر انداز کر دیا ــــ اور آج آپ کی باجی بھی یہی رول ادا کر رہی ہیں۔ وہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ لڑکی، جو بہو بن کر یہاں آئی ہے، اس کے بھی کچھ ارمان ہیں، کچھ خواہشیں ہیں ــــ کچھ خواب ہیں، وہ کیوں نہیں سوچتیں کہ میں اِس گھر کو ــــ جو میرا گھر

ہے اور ہمیشہ میرا رہے گا ___ ایسا بنانا چاہتی ہوں جیسا میں سوچتی رہی ہوں۔ ہر لڑکی شادی سے پہلے اپنے نئے گھر کے خواب دیکھتی رہتی ہے ___ اور جب وہ اس گھر میں آتی ہے، تو یہ زندہ خواب اس کے ساتھ ہوتے ہیں ___ وہ ان خوابوں کے مطابق گھر کا نقشہ بناتی ہے، لیکن آپ کی باجی مجھے یہ حق نہیں دیتیں ___ وہ مجھے یہ حق دینا نہیں چاہتیں!۔'' ۴۲

صالحہ عابد حسین نے حالی کے حوالے سے لکھا ہے کہ نان ونفقہ کی ذمہ داری مرد ہی کو نبھانی چاہیے، تاکہ اس کے بیوی بچے اعتماد کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں اور کسی کے محتاج نہ ہوں:

''حالی۔ (مُسکرا کر) معلوم ہوتا ہے آج سب نے صلاح کر کے مجھ پر دھاوا بولا ہے کہ نوکری کرو۔ (بچہ رونے لگتا ہے حالی کھڑے ہو کر اسے بہلاتے ہیں، جب نہیں بہلتا، تو بیوی کو دے دیتے ہیں)، اسلام النسا: دھاوا بولنے کی کونسی بات ہے۔ آخر سوچو۔ بیوی بچوں کا بار اُٹھانا ہر مرد کا فرض ہے کہ نہیں۔ بیاہ ہوئے چار برس ہوگئے۔ کہاں تک میکے والوں کا احسان لوں! کہاں تک جیٹھ جیٹھانی کی دستِ نگر ہوں۔ حالی۔ اچھا بی اچھا۔ تمہارا مطلب سمجھ گیا کہ اَب پھر تم سب لوگ میری تعلیم میں رکاوٹ ڈالو گے۔'' ۴۳

پیدائش سے قبل بچپن کی منگنیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پریشانیوں کو عصمت چغتائی نے ''فسادی'' میں پیش کیا ہے:

''نشاط: میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں، جو آپ نے سُنا اور سمجھے، مگر میں معیوب اور غیر معیوب ہونے کے سوال کو ہی بیہودہ سمجھتا ہوں۔ یہ سراسر غلطی تھی کہ عزت کے پیدا ہوتے ہی اُسے آپ کے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ کیا یہ معیوب نہ تھا؟ عزت کچھ بھی نہ جانتی تھی بچاری، جب سے وہ بڑی ہوئی آپ ہی کو شوہریت کے لیے مقرر کیا ہوا پایا، لیکن وہ بھی تو انسان ہے، اِس کی خود کی بھی تو کوئی آزاد رائے ہے، وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ خواہ ہفتہ بھر بعد وہ تمہاری قانوناً بیوی ہو جائے۔'' ۴۴

لڑکیوں کی شادی کے مسائل، بر دکھاوا، جہیز وغیرہ بہت سے ایسے مسائل ہیں، جو لڑکیوں کی عزتِ نفس کچلنے کا سبب بنتے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد نے ''کار برائے فروخت'' میں اِس سماجی برائی کو کار کی خرید وفروخت کے ساتھ موازنہ کیا ہے:

''پرویز: (قہقہہ لگا کر) واہ واہ ___ خوب! آپ کے ہاں کاریں دکھانے کا رواج نہیں، خوب کہا۔ (پھر ہنستا ہے) بھئی بڑی ہی مزے دار بات ہے (چچا اور ڈاکٹر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہیں) مگر نعیم صاحب بغیر دیکھے کوئی کار کیسے خرید سکتا ہے؟ نعیم: بغیر دیکھے لڑکیاں بیاہی جاسکتی ہیں تو کار کیوں نہیں خریدی جاسکتی، کار تو پھر بے جان چیز ہے، اِس کی عادتیں خصلتیں اتنی پکی نہیں ہوتیں، دوسرے اسے اوور ہال بھی کرایا جا سکتا ہے۔ پرویز: آپ کار کا مقابلہ لڑکی سے کیوں کرتے ہیں، اگر کار کے ساتھ بھی کوئی اتنی دَھن دولت دے جتنی لڑکی کے ساتھ دی جاتی ہے تو یقیناً اسے بھی لوگ بغیر دیکھے اُٹھا لے جائیں۔ نعیم: کار کے ساتھ دَھن دولت نہیں دی جاتی تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اُس

کو دِل بھر کے ذلیل کریں؟ پرویز: ذلیل کرنے سے آپ کا کیا مطلب؟ نعیم: یہی کار کے بارے میں بے حد ذاتی سوال، کتنے میل چلی ہے، کون کون مالک رہ چکے ہیں، انجن کھولا گیا ہے یا نہیں، ایک گیلن میں کتنے میل چلتی ہے اور صرف مالکوں نے چلائی ہے یا اور لوگ بھی ہینڈل کرتے رہے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شریف کار اس قسم کے سوال کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کرسکتی۔'' ۲۵

عمیرہ احمد کے ڈرامے ''دوراہا'' میں سُسرال کے مظالم پر روشنی ڈالی ہے:

''عمر: وہ لوگ آپ سے کتنی عزت اور چاہت سے پیش آ رہے تھے۔۔۔ اور آپ لوگ اُنھیں دھتکار رہے تھے، سعیدہ: (تلخی سے) ان کی بیٹی نے ہمارے بیٹے کو پھانسا۔۔۔ عزت اور چاہت سے تو پیش آئیں گے وہ، اِن کی مجبوری ہے یہ۔ عمر: (لفظوں پر زور دے کر) وہ بہت اچھے لوگ ہیں آپ کم از کم دکھاوے کے طور پر ہی وہاں اچھا برتاؤ کرتے۔ سعیدہ: (تیز آواز) اب تم ہمیں یہ بتاؤ بے کہ ہمیں تمہارے سُسرال والوں کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ آپ لوگ نہ جاتے وہاں۔۔۔ اگر وہاں جا کے بے عزتی ہی کرنی تھی ان کی۔'' ۲۶

ظالم اور اذیت پسند شوہروں سے، جب عورتیں خلع لینا چاہتی ہیں یا طلاق کا تقاضا کرتی ہیں، تو اُنھیں بڑی مشکلات میں اُلجھا دیا جاتا ہے، جیسے امجد اسلام امجد ڈرامے ''باز دید'' میں نذیر اپنی بیٹی کی جان خلاصی کے لیے جب ناصر سے اُسے طلاق دلوانے کا تقاضہ کرتا ہے، تو ناصر اُسے کھلم کھلا دھمکی دیتا ہے کہ قانون کا دروازہ، اگر کھٹکائے گا بھی، تو صرف ذلت و رُسوائی ہی اُس کے حصے میں آئے گی اور خبروں کی سرخیاں، اگر بننا چاہتے ہو اور وکیلوں کے ہر طرح کے سوالات کا جواب دے سکتے ہو، تو ضرور عدالت سے رجوع کرو، اِسی طرح ڈراما ''لیکن!'' میں پروفیسر چیمہ ادھیڑ عمری میں ایک طالبہ سے اپنے بے جوڑ رشتے کا جوڑنے کی کوشش میں نظر آتا ہے، جب کہ امجد اسلام امجد کے ڈرامے ''دُکھوں کی چادر'' میں جائیداد کی خاطر کی جانے والی بے جوڑ شادی کی نشاندہی کی ہے:

''نواز ___ اتنی بڑی حویلی میں تم تنہا کیسے رہتی ہو بیٹی۔ میری مانو تو اب بھی وقت ہے برخودار ہمایوں۔۔۔، نائلہ ___ (تڑپ کر) خدا کا خوف کریں چاچا جی، ہمایوں مجھ سے دس سال چھوٹا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بیٹوں جیسا ہے، نواز ___ اوہو بھئی۔ (نائلہ کے چہرے کے تیور دیکھ کر رُک جاتا ہے) خیر تمہاری مرضی۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کی تھی۔'' ۲۷

بانو قدسیہ نے ''پیا نام کا دیا'' اور اشفاق احمد نے ''صنم گزیدہ'' میں بے جا آزادی اور فلمی دُنیا کے گلیمر اور جلد شہرت حاصل کرنے کی خاطر ہونے والے عزتوں اور خاندانی وقار کے سودے کو موضوع بنایا گیا، اگر چہ یہ سودا بازی معمول کا حصہ متصور کی جاتی ہے، لیکن اِن سے متاثر ہونے والے افراد اور بچے معاشرے میں جینے کے قابل نہیں رہتے، بلکہ جگہ ہنسائی اور رُسوائیاں اِن کا مقدر بن جاتی ہیں۔ بے جا آزادی کی متمنی عورتیں اپنا گھر بار اور شوہر بچے سب کچھ کھو دیتی ہیں اور طلاق

ہی اِن کا مقدر بنتی ہے:

''ستارہ: سکینڈل نہ ہوں تو رسالے نہیں چلتے، آرٹسٹ پاپولر نہیں ہوتے، تمھیں دنوں میں build کر دے گا یہ سکینڈل۔ میں نے تو دس سال فیروز کے ساتھ اپنی شادی کو چھپایا۔ سکینڈل بننے دیئے۔ اپنے طلاق نامے کو اباجی تک کو نہ دکھایا، باتیں مشہور ہوئیں میں نے اُنھیں اپنی شہرت کے لیے ضروری سمجھا۔'' ۲۸

دوسری طرف اِسی موضوع کو اشفاق احمد نے اپنے ڈرامے ''صنم گزیدہ'' میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر جیسے مرد بھی ہیں، جو بیوی کو طلاق دینے کے علاوہ جائیداد اور نان نفقہ کی ادائیگی بطریق احسن کر دیتے ہیں:

''ڈاکٹر ___ (آواز) میرے پاس تمھیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سوائے ایک طلاق کے کاغذ کے اور جو کچھ ہے وہ تمھیں نہیں چاہئے۔ پھر بھی میں نے اپنی سب جائیداد تمہارے نام منتقل کر دی ہے۔ تم کالج نہ جا سکیں ___ تم اپنا بچہ نہ پال سکیں۔ تمھیں خوشی کا ایک اور موقعہ ضرور ملنا چاہیے۔ میں نے یہ جائیداد تمہارے نام اس لیے منتقل نہیں کی کہ میں ایک پچھتاوا بن کر تمہارے دِل میں رہوں، بلکہ صرف اس لیے ___ صرف اس لیے منتقل کی ہے کہ اگر کسی وقت کامران کی خواہشیں اسے تم سے دور لے گئیں ___ دلوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اگر کامران کا دل بدل گیا تو ___ '' ۲۹

شوہر اور سُسرال کی عدم مفاہمت اور عدم مطابقت کے رویوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لڑکی کو اِس کے والدین اور گھر والوں سے نہیں ملنے دیا جاتا، اِن کے خیال میں لڑکی کا تمام تر تعلق میکے سے ہٹ کر سُسرال سے جڑنا چاہیے، حتیٰ کہ ماں باپ ،بہن بھائیوں سے ذہنی ربط بھی گوارا نہیں ہوتا۔ اولاد ہونے کی صورت میں ننھیال کا وجود مزید ناقابلِ برداشت سمجھا جاتا ہے۔ سارا ایسی ہی لڑکی ہے، جسے سُسرال اور شوہر کی بے جا پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ سگی بہن کی شادی میں بھی شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی، اِس غیر انسانی رویے کی مذمت عمیرہ احمد نے ڈرامے ''دوراہا'' میں کی ہے:

''سارہ: (کپڑے رکھنا جاری رہتا ہے) گھر جا رہی ہوں میں صوفی کی شادی کے لیے، اظفر: (سنجیدہ) لیکن صوفی کی شادی تو ایک ہفتے کے بعد ہے۔ سارہ: ہاں لیکن مجھے مدد کروانا ہے۔ ممی اور بابا اور خود صوفی روز فون کر رہے ہیں۔ اظفر: لیکن میں اِس حالت میں تمھیں وہاں جانے نہیں دے سکتا۔ وہاں کون خیال رکھے گا تمہارا۔ سارہ: سب رکھیں گے۔ I am alright ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ اظفر: (دوٹوک) سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سارہ: (جھنجھلا کر) You want go اظفر میں نے گھر والوں کو بتا دیا ہے، وعدہ کیا ہے میں نے آج آنے کا۔ اظفر: (بے ساختہ) مجھ سے پوچھ کر وعدہ کرنا چاہیے تھا تمھیں۔ سارہ: (الجھ کر) مجھے نہیں پتا تھا کہ میری بہن کی شادی پر جانا بھی میرے لیے ایک ایشو ہو جائے گا۔ (سیل اُٹھا کر کال کرنے لگتا ہے) کیا کر رہے ہو؟، اظفر: تمہارے پیرنٹس سے خود بات کر لیتا ہوں میں۔ سارہ: (ایک دم محتاط ہو کر) ضرورت نہیں ہے اِس کی۔۔۔ اظفر:

(کال جاری رکھتا ہے) ہے ضرورت۔۔۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں ان سے کہ ایسا کون سا کام ہے وہاں، جو میری بیوی کے بغیر نہیں کر سکتے۔ سارہ: (آ کر فون پکڑ لیتی ہے) اظفر پلیز۔۔۔ ان سے کچھ مت کہو۔ میں نہیں جاتی، میں ان کو سمجھا لوں گی۔''۳۰

چودھریوں، وڈیروں، زمینداروں، ٹھیکیداروں وغیرہ کے مظالم بہت سے ڈرامہ نگاروں نے موضوع بنایا ہے، مثلاً ''دُکھوں کی چادر'' امجد اسلام امجد نے چودھری نواز نام نہاد دستاد او نچے شملے کی بدصورتی کو بیان کیا ہے۔ چوہدری نوازش کو اپنی عزت تو عزیز تر ہوتی ہے، لیکن غریب گاؤں والوں کی عزت سرِ عام تار تار کر کے اپنی چودھراہٹ کے نشے کی تسکین کا سامان کرتا ہے:

''(بازار میں مہر دین، کمال دین اور جمال دین کی لاشیں پڑی ہیں، اُن کے قریب بختو، جمیلہ اور زینت سکتے کے عالم میں کھڑی ہیں۔ نواز گاؤں والوں کے سامنے تقریر کرتا ہے)، نواز___ اِن کو اچھی طرح دیکھ لو گاؤں والو، اِن کی ذلیل شکلیں اور جان لو کہ چودھری کی حویلی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے (عورتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) اُتار دو، اِن کے سروں سے چادریں اور گھماؤ اِن کو سارے گاؤں میں۔ گھسیٹو اِن کو بالوں سے پکڑ کر، بختو___ نہیں نہیں نہیں، چودھری جی، یہ ظلم نہ کرو۔ (بختو اور اُس کی بیٹیاں چیختی اور فریاد کرتی ہیں، مگر اُن کے سروں سے کپڑے اُتار کر اُنھیں دھکے دے کر چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ گاؤں والے خوف سے سہمے کھڑے ہیں۔ ایک آدمی ذرا سا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، کئی بندوقیں اُس کی طرف اُٹھتی ہیں)۔''۳۱

اِسی طرح ڈراما ''وارث'' میں چوہدری انور نتھو کی بیٹی جیراں کو اُٹھوا لیتا ہے، جس کے بعد جیراں بے حرمتی کے بعد مار ڈالتا ہے، گاؤں والوں کو کنویں میں اُس کی لاش ملتی ہے، انصاف کا طالب بختو انصاف کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، لیکن دھمکیوں سے اِس کا منہ بند کر دیا جاتا ہے:

''حشمت: ہوں۔ تو تُو کیس کرے گا چوہدری انور پر، اِس کا مطلب پتہ ہے تجھے (نتھو کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ الفاظ نہیں ملتے) مجھے پتہ چلا ہے کہ تو نے جیراں کو کھوہ میں دھکا دیا ہے، نتھو: (آنسو روکتے ہوئے) جیراں میری بیٹی تھی چوہدری جی، حشمت: لیکن وہ اپنی مرضی سے غوث محمد کے ساتھ چلی گئی تھی اور تجھے اِس کا رنج تھا، نتھو: یہ جھوٹ ہے۔ اُسے چوہدری انور نے اُٹھوایا تھا اور اُس نے اپنا منہ کالا کرنے کے بعد۔۔۔ حشمت: ہاں غلام حسین۔۔۔ میں نے سُنا ہے اِس کی دو بیٹیاں جوان ہیں اور وہ تیری ایک بہن بھی تو تھی۔۔۔ بڑی خوب صورت ہوتی تھی جوانی میں (نتھو غصے اور بے بسی سے کانپتا ہے) اچھا سا نام تھا اُس کا، بشیراں۔۔۔ اُس کی بھی سُنا ہے ایک لڑکی جوان ہے، کیوں اوئے بخشو، بخشو: جی چوہدری جی، ثریا نام ہے جی اُس کا، حشمت: تو ایسا کر نتھو، جیراں اکیلی کے مقدمے کا مزہ نہیں آئے گا، تو چاروں لڑکیوں کا مقدمہ ایک ساتھ ہی کر دے۔''۳۲

یونس جاوید نے ڈرامے ''وادیِ پرخار'' میں زمینداروں کی فطرت بیان کی ہے کہ اُن کے نزدیک زمین جائیداد کے

اہمیت سب رشتوں سے اہم ہے، جائیداد کی خاطر وہ اپنی سگی اولاد کو بھی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں:

''زینب: سمجھ گئی ہو ___ (رُک کر) لینا چاہتی ہو کچھ؟ (رُک کر) مقدمہ کر لے۔ نجمہ: اصل بات منہ سے نکل گئی۔ (رُک کر) زمین، جائیداد، حویلی، رشتوں سے افضل ہے؟ اور رشتہ بھی۔ (رُک کر) پوتے کا (جھولے کی طرف اشارہ کر کے) آپ کی نسل کا امین، نام آپ کا، پہچان آپ کی۔ زینب: اسی کے لیے تو بچانا چاہتی ہوں سب۔ (رُک کر) اور سب کے لیے۔ (آگے بڑھ کر) اُسے چھین رہی ہوں۔ بلا لے جسے بلانا چاہتی ہے۔'' ۳۳

اسی طرح ''شاہلاکوٹ'' میں بھی وڈیروں زمین داروں کی زندگی کے تضادات اور منافقانہ رویوں کی عکاسی کی ہے:

''سرفراز: میں نے بھی وہی کیا ابا جو ہر طاقت ور شخص کرتا ہے، پہلے طاقت اور انصاف اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے، دیکھتا نہیں ابا ساری دُنیا کا یہی چلن ہے۔ تمام چودھری، سردار، نمبردار، پہلے مزارع کی بیٹی کو بے آبرو کرتے ہیں، پھر اُسی مزارع کو جہیز بنا کر دیتے ہیں کہ بیٹی کا ڈولا گھر سے نکالے۔'' ۳۴

اسی طرح امجد اسلام امجد نے ''دُھند کے اُس پار'' میں خواتین کو گھر سے باہر ہراساں کیے جانے پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اُنھیں کس طرح نازیبا جملوں، حریص نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے: '' حنا ___ یوں بھی ہمارے معاشرے میں جب کوئی لڑکی گھر سے باہر نکلتی ہے، تو اُسے پتہ ہوتا ہے کہ بے شمار آنکھیں اُس کا ایکسرے لینے کو تیار ہوں گی۔ سو عادت سی پڑ جاتی ہے۔ کتوں کے بھونکنے سے قافلے رُک تو نہیں جاتے نا۔'' ۳۵

جنسی ہوس پرستی کے حوالے سے ''یاتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی'' اہم ڈراما ہے، اِس میں کم سن اور نوعمر لڑکے لڑکیوں کو جنسی ہوس پرستی کا نشانہ بنانے والوں پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ نوعمر لڑکوں، لڑکیوں کے ساتھ بدکاری کرنے والوں پر قانون کی گرفت ڈھیلی رہتی ہے۔ ایک کاغذ چننے والی لڑکی کے بے آبرو کرنے والا جھوٹے گواہوں اور جھوٹی رپورٹوں کے سہارے معزز ہی رہتا ہے، اگرچہ پورا بازار اِس واقعے کا گواہ ہوتا ہے، لیکن سچ بولنے سے ہر کوئی گریزاں ہے۔ جنسی ہوس پرستی کی شکار ہونے والی اِس لڑکی کو ہر اوباش لوٹنا چاہتا ہے کوئی ہمدردی اور کوئی مدد کے بہانے، اس کے حق میں گواہی دینے کو تیار ہوتا، لیکن جسم کے بدلے مشروط گواہی بھی اُسے انصاف نہ دے سکی:

''بولی۔ کیا شرط ہے، 'شرط یہ ہے کہ تم۔۔۔ بس سمجھ جاؤ'، 'دیکھو۔۔۔ مان جاؤ اِس طرح تمھیں ایک گواہ بھی مل جائے گا ورنہ۔۔۔ ورنہ تمھیں میرے خلاف بھی گواہی کی ضرورت پڑے گی اور کوئی بھی تمہارے حق میں گواہی نہیں دے گا۔۔۔ تم چاہو تو بغیر پیسے کے بھی گواہ خرید سکتی ہو'، پھر اندھیرا اور گھنا ہو گیا۔۔۔ یکدم جھونپڑی کے باہر کتے آپس میں لڑ پڑے اور لڑتے لڑتے اندر آ گئے اُنھوں نے جھونپڑی کا ستیاناس کر دیا، کچھ بھی سلامت نہ رہا۔۔۔ ساری جھونپڑی تنکا تنکا ہو گئی۔ وہ جو اُس کا گواہ بن کر آیا تھا اُسے وقت کی عدالت کے احاطے میں پچھلی رات کے سناٹے میں بے بس چھوڑ کر چلا گیا اور پھر وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب اِس کی گواہی کون دے گا۔'' ۳۶

بانو قدسیہ نے ڈراما ''دیمک'' میں لڑکیوں کو گھر سے باہر ہراساں کرنے کے حوالے سے لکھا ہے کہ بہنوں، بیٹیوں کو سرِ بازار چھیڑنے پر اکثر مرد سیخ پا ہو جاتے ہیں اور مرنے مارنے پر تُل آتے ہیں، اسی خون خرابے کے ڈر سے تمام اہلِ علاقہ مشترکہ طور پر لڑکیوں ہی کی سرزنش کرتے ہیں:

''ماں: لے اب جب دو لاشیں گھر آئیں ناں بھائیوں کی تو ساڑھی پہن کر بھنگڑا ڈالنا اُن کی لاشوں پر۔۔۔ پہن لی ساڑھی، ہو گیا شوق پورا ___ منتیں کیں منی چادر پہن لے۔۔۔ ناں جی میری تو شو خراب ہوتی ہے ___ اب جو ملوک جیسے بھائیوں کی عاقبت خراب ہو گی اُسے سنبھال۔۔۔ ساجدہ: (روتے ہوئے) پڑ جائیں ساڑھی کے پیچھے۔ سارا زمانہ ساڑھی پہنتا ہے۔ ایک میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا تو ساڑھی کے ہی خلاف ہو گئیں۔۔۔ یہ تو آپ کا انصاف ہے۔ ماں: ابھی تو ابا جی کو پتہ چلنا ہے ___ میری قسمت! یہ دونوں کم عقلے پتہ نہیں کہاں گئے ہیں۔'' ۳۷

لڑکیوں کا اغوا بہت بڑی سماجی بُرائی ہے، جس لڑکی کے ساتھ اغوا کا دھبہ لگ جائے وہ زندہ درگور ہو جاتی ہے۔ معاشرہ اُسے جینے نہیں دیتا، بے قصور ہونے کے باوجود اپنے پرائے ہر طرح کے لوگوں کی نظروں اور زہر بجھے جملے اِس کی رُوح کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ امجد اسلام امجد کے ڈرامے ''وارث'' میں فتح شیر سکندر کی منگ زہرہ کو اُٹھا لے جاتا ہے، لیکن کوئی اِس کو نہیں پوچھتا، اِسی طرح ڈراما ''دُھند کے اُس پار'' میں اوباش لڑکے حِنا کو اغوا کر لیتے ہیں، اِس بات کا صدمہ تو حِنا کو ہوتا ہی ہے، مگر درد اُس وقت بڑھتا ہے، جب اپنوں کے جملے سُنتی ہے:

''زینب ___ کس کس کی زبان پکڑو گی، بیٹا ___ لوگ تو باتیں کریں گے اور سچ پوچھو تو وہ بھی کوئی اتنے غلط نہیں، جوان لڑکی اغوا ہو جائے۔ دس گھنٹے گھر سے باہر غیر مردوں میں رہے اور اس کے باوجود ___ پتہ نہیں قدرت کو کیا منظور۔ اللہ معافی۔'' ۳۸

اِسی طرح بانو قدسیہ نے ''پیا نام کا دیا'' میں اغوا شدہ عورتوں اور گھر سے بھاگنے والی عورتوں کے موضوع پر لکھا ہے۔ مزید براں، اُن کے خیال میں عورت کی ہجرت اُس کے اپنے گھر سے سُسرال کی طرف ہوتی ہے، واپسی کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں، ایسی عورتوں کی حالت بھی اغوا شدہ عورتوں کی سی ہوتی ہے، جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا:

''آپا: اپنے سیاہ بختوں کے ساتھ، اپنی بد نصیبی کے ساتھ۔ ہم جیسوں کو کوئی بھگا کر نہیں لے جاتا۔ ہم خود بھاگتی ہیں۔ کبھی ماں باپ کے گھر سے، کبھی سُسرال سے، کبھی کوٹھے سے، کبھی بندی خانے سے۔۔۔ ہمارے ساتھ بانہہ پکڑ کر کھال ٹپانے والا، ٹرین کا ٹکٹ خریدنے والا، کسی حق والے گھر میں لے جا کر بٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا، ستارہ ہم جب بھی بھاگتی ہیں۔۔۔ اکیلی۔۔۔ اپنے سیاہ نصیب کا ہاتھ تھام کر۔۔۔ ہمیں بھگانے والا کوئی نہیں ہوتا ستارہ۔'' ۳۹

معاشقے، گھر سے فرار، نتیجہ جسم فروشی، ناجائز تعلقات، معاشقے، شادی کے جھانسوں میں لڑکیوں کو پھانسنا، جھوٹی محبتوں کے وعدے وغیرہ عورت کے جذباتی استحصال کی بدنما شکل ہے، یہی موضوع منٹو کے ڈرامے ''اکیلی'' میں نمایاں ہیں:

''وہ مرد عورت کو کیا جانے جسے پلیٹ فارم پر کھوئے ٹکٹ کی طرح ایک عورت مل گئی ہو ــــ میں جو کچھ چاہتی ہوں مجھے معلوم ہے۔آج سے دو برس پہلے جب میں گھر سے بھاگ کر سونے اور چاندی کے چور موہن کے کے ساتھ ایک ریل گاڑی میں سوار ہوئی تھی اُس وقت میرے دل میں جس بات کی چاہ تھی مجھے اب بھی یاد ہے ــــ اور سچ پوچھئے تو وہی نامکمل چاہ۔وہی پیاسی خواہش میرے اندر تڑپ رہی ہے ــــ وہ الفاظ، جو میری زبان کی نوک پر آ کر جم گئے تھے، پگھل کر باہر نکلنے کے لیے بیتاب ہیں ــــ میں اکیلی ہوں۔''[۴۰]

اِسی طرح اشفاق احمد کے ڈرامے ''آوارہ اور آواری'' کی نوری کو بھی علاقے کا حکیم بہلا پھسلا کر ناجائز بچے کی ماں بنا دیتا ہے،لیکن اُس کی اِس حرام کاری پر احتجاج بیوہ ماں کے بس کی بات نہیں۔چارو ناچار نوری کے ناجائز بیٹے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے،اِسی طرح ڈراما ''استباہِ نظر'' کا ماسٹر گاؤں کی تخیلاتی ذہن رکھنے والی فیروزہ کو اپنے عشق کے جال میں پھانس کر شہر جا کر شادی رچالیتا ہے اور فیروزہ تمام عمر باغوں اور کھیتوں میں اُس کی یاد کے سہارے پرندے اُڑتی پھرتی ہے۔ ماسٹر اُسے پاگل لڑکی کا نام دے کر بیوی کے سامنے سرخرو ہو جاتا ہے۔ماسٹر ایک طرف اپنی بیوی کا اعتماد حاصل کر کے اُسے دھوکے میں رکھتا ہے اور بیوی کو اُس کے سامنے محض بے جان روح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔دھوکہ دے کر خود کو بڑا ہشیار سمجھنے والا دوسروں کو نہیں، بلکہ اصل میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے:

''ماسٹر:بس یہاں پانچ دن راکھی کی تھی۔ مالٹوں کی پتہ نہیں۔۔۔ پاگل لڑکی رہتی تھی یہاں؟،ماسٹر: عام معنوں کی پاگل نہیں وہ ــــ وہ کچھ عجیب سی تھی کبھی شہزادی نظر آتی تھی کبھی کسی خانہ بدوش کی بیٹی لگتی ــــ کبھی کبھی اُس سے ڈر لگنے لگتا جیسے وہ کوئی خوبصورت چڑیل ہو بس میری تو قصبے میں کسی سے واقفیت نہیں ہے۔تمہارا اگر دل نہ لگے تو اُس سے مل لیا کرنا ــــ اب یہ پتہ نہیں کہ وہ یہاں ہے بھی کہ نہیں ــــ اُن کا اپنا باغ نہیں ہے یہ۔۔۔ماسٹر ــــ ہاں میں بھی آؤں گا ــــ ہم دونوں آئیں گے۔اکٹھے ــــ پھر کبھی سہی۔ (یکدم ماسٹر کا چہرہ سٹل ہوتا ہے۔جیسے فیروزہ تم ڈر نہ جانا یہ کچھ نہیں ہے۔یہ کوئی نہیں ہے۔ میری سب کچھ تم ہو۔سب کچھ ــــ فیروزہ یہ عورت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی سچ)۔''[۴۱]

ناجائز تعلقات اور معاشقے کے موضوع پر عصمت چغتائی کے ڈرامے ''شیطان'' میں بھی شوہر کے بے حسی کو بیان کیا کہ کس طرح بیوی کی تمام تر محبت اور خلوص کو اپنے معاشقے کی بھینٹ چڑھانے والا دوسرے کی بیوی کو لے اُڑتا ہے اور جب اُس کی اپنی بیوی پر ڈورے ڈالے جاتے ہیں،تو اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے:

''احمد: پھر بتائیے اُس نے میری محبت کو کیوں ٹھکرا دیا۔اُس نے میری پرستش کا یہ اجر کیوں دیا۔۔۔ جتنا میں نے اُسے چاہا وہ اور کھنچتی ہی گئی۔۔۔روشن: پھر بھی آپ مرد ہیں، خود مختار۔۔۔مگر میں، احمد: اوہ۔کاش میں مرد نہ ہوتا اور خود مختار نہ ہوتا میں محبت کا بھوکا ہوں حکومت کا نہیں۔۔۔ (جذباتی انداز میں) میں محبت کے سہارے ہی جی سکتا ہوں۔۔۔صوفیہ۔۔۔اوہ۔۔۔تم نے میری دُنیا میں کتنا اندھیرا بھر دیا۔۔۔ مجھے ٹھوکریں

کھانے کے لیے۔۔۔روشن: (اِس کی حالتِ ذار دیکھ کر) اوہ۔۔۔جب آپ کا یہ حال ہے۔۔۔تو۔۔۔میں آہ میں کسی قدر بدنصیب ہوں۔‘‘[۳۲]

مسعود مفتی کے ڈرامے ’’گنجلک‘‘ میں بھی اسی موضوع کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے:

’’لڑکی: یہ دراصل اِس عورت کا نہیں، بلکہ آپ بزرگوں کے ذہن کا فتور ہے ___ مجھے کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی؟ میں اپنی غلطی پر خود ہی سزا بھگتنے کو بالکل تیار تھی، مگر اپنے انداز میں عورت تو یادوں کے سہارے کانٹوں پر میٹھی نیند سوسکتی ہے اور میرے پاس نثار کی یادیں ہی نہیں ایک گوشت پوست کی نشانی بھی تھی، میں اسے سینے سے لگا کر تو دوزخ کو بھی گلزار سمجھتی ___ مجھے نثار مل گیا تھا، اُس کے بعد زندگی میں کسی اور چیز کی تمنا نہ تھی ___ آپ لوگوں کے لیے وہ مرگیا ہے، مگر میرے لیے وہ اب بھی زندہ ہے ___ جب تک میری سانس چلتی ہے اِس میں نثار کی دھڑکن شامل رہے گی ___ میرے بزرگ میرے دل میں جھانک کر تو دیکھتے، کوئی گنجائش ہوتی تو وہاں خاوند گھسیڑتے، مگر اُنھوں نے توڑھلے ڈھلائے فارمولوں سے فرض کرلیا کہ میں اب طوائف ہی بنوں گی۔‘‘[۳۳]

امجد اسلام امجد کے ڈرامے ’’دن‘‘ میں خانگی زندگی کے بہت سے مسائل اُجاگر کیے گئے ہیں، مثلاً جب غیر عورت کا بھوت سر پر سوار ہو جاتا ہے، تو ایسے مرد کو اپنا گھر بیوی اور بچے برے لگنے لگتے ہیں، اُسے ہر طرف عیب اور بُرائیاں ہی نظر آتی ہیں، دلاور جیسے مرد عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں اور اِسے تضحیک وتشدد کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے، دلاور اور ماہ پارہ کے کرداروں کے ذریعے سماج کے ایسے ہی ناسور عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے:

’’ماہ پارہ: میں ہر ذلت سہ سکتی ہوں مگر یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ آپ ___ میری جگہ کسی اور کو دیں، دلاور: (ایک دم چونک کر) کون، کس کی بات کر رہی ہو کس نے بتایا ہے تمھیں؟، ماہ پارہ: میں عورت ہوں سردار صاحب اور جب کوئی اور عورت اس کے مرد کے دل پر قبضہ کرنے لگے تو اسے خود بخود خبر ہو جاتی ہے۔ بغیر کسی کے بتائے۔ دلاور: خوب تو اب تم میری جاسوسی بھی کرنے لگی ہو۔ حق جتا رہی ہو مجھ پہ اپنا۔ ماہ پارہ: کچھ غلط تو نہیں کر رہی۔ دلاور: (بالوں سے پکڑ کر اُس کا منہ بلند کرتا ہے۔ ماہ پارہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرتے ہیں) عورت کو ہمیشہ میں نے اپنے پاؤں کی جوتی سمجھا ہے اور جس دن پاؤں میں چبھنے لگے اُتار کر پھینک دیا کرتا ہوں۔ ماہ پارہ: (حوصلہ کرتے ہوئے) مجھے پتہ ہے۔ میری ماں نے بھی بتائی تھی مجھے یہ بات، مگر آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میں آپ کی زندگی میں آنے والی آخری عورت ہوں۔ اپنے گھر کی مالکن بنایا تھا مجھے آپ نے۔۔۔دلاور: سوچ لو اِس صورت میں زندگی بھر تمھیں زندگی بھر میرا پابند رہنا پڑے گا اور کسی بھی خلاف ورزی کی سزا طلاق نہیں موت ہوگی۔ ماہ پارہ: کون ہے وہ جس کے لیے آپ مجھے اس طرح دھتکار رہے ہیں۔ دلاور: وہ ___ (مسکرا کر جیسے اپنی سوچ کا مزا لے

رہا ہو) یہ جو دماغ ہے نا (کنپٹی پر انگلی رکھ کر) اِس میں ایک چیز ہوتی ہے، جسے کہتے ہیں grey matter جو عورتوں کے سروں میں عام طور پر کم پایا جاتا ہے___ مگر اس کے سر میں ہے اور بہت ہے، اِس سے بات کر کے مزا آ جاتا ہے۔ ماہ پارہ: نہیں ماہ پارہ بیگم نہیں___ میں اسے یہاں دیکھنا چاہتا ہوں، اِس گھر میں، اِس کمرے میں ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے۔ ماہ پارہ: یہ باتیں تو آپ نے مجھ سے بھی کہی تھیں۔ دلاور: کہی ہوں گی، مگر تم نے وہ نہیں سنا___ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں! ، ماہ پارہ: خدا کے لیے سردار صاحب ایسا نہ کریں میں مر جاؤں گی۔ دلاور: (اُسے آگے سے ہٹا کر جاتے ہوئے) تو مر جاؤ۔'' ۴۴ؔ

باپ کی بے راہ روی، عیاشی اور معاشقوں کا ردِّ عمل اولاد کے ہاں بڑا شدید ہوتا ہے۔ لڑکیاں عدم اعتمادی کی شکار ہو کر مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہیں، کیوں کہ وہ لاشعوری طور پر باپ سے خائف و متنفر ہوتی ہیں۔ اشفاق احمد کے ڈرامے ''زود پشیماں'' میں لیلیٰ اسی قسم کی صورتحال سے دوچار ہے۔ ماں باپ کی عدم توجہی، معاشقے اور دوستانے اولاد کا جذباتی سطح پر استحصال کا سبب بننے کے علاوہ اِن سے نارمل زندگی گزارنے کے تمام مواقعے چھین لیتے ہیں:

''لیلیٰ___ آپ لوگوں نے ہمیں محبت کے قابل رہی کب چھوڑا ہے ممی۔ آپ نے ہماری تربیت ایسے کی ہے کہ، جو کوئی جوان نئی نئی زندگی شروع کرنے والا پوری نہیں کر سکتا۔ کمفرٹ جوان آدمی ہمیں سُوٹ نہیں کرتے۔ آپ نے، آپ جیسے ماں باپ نے ہمیں فطری محبت کے قابل نہیں چھوڑا۔ ہم جونکیں بن گئیں۔ لمبی لمبی فیشن ایبل جونکیں، آپ نے ہمیں دولت کی COMFORT کی EXPLOIT کرنے کی افیون لگا دی ہے۔'' ۴۵ؔ

مرد اپنی برائیوں کو برائی نہیں سمجھتا، بلکہ اِس نے ہمیشہ انھیں کسی نہ کسی من گھڑت اُصول کی آڑ میں کیموفلاج کیا ہوتا ہے۔ زندہ رہنے اور خوشیوں کے تمام مواقع اپنے لیے جائز متصور کرتا ہے اور عورت کو محض کولھو کے بیل کی طرح گھرداری اور بچوں تک محدود کر دینا ہی سب کچھ قرار دیتا ہے۔ شوہر کے تشدد سہنے والی عورت کو اولاد کی ناراضگی مول لینا پڑتی ہے۔ اولاد کسی طور پر نہیں چاہتی کہ ماں خاموشی سے تشدد سہے، بلکہ وہ بغاوت کی خواہاں ہوتی ہے، عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ سمجھوتہ کرنے والی عورت زیادہ استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ شوہر اُس کے خلاف اولاد کے ذہن میں بھی زہر بھر دیتا ہے:

''لیلیٰ___ کونسی قربانیاں ممی کونسی؟ بچپن میں جب کبھی ابو آپ کو مارتے تھے تو میں کئی کئی رات نہیں سوتی تھی۔ پھر میں نے دیکھا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر کھلا، آپ میرے لیے قربانیاں نہیں دے رہی تھیں۔ دولت اور آسائش آپ کو بھی CORRUPT کر رہی تھی۔ آپ میں مقابلے کی قوت نہیں رہی تھی۔ ماں کی گود میں بڑا تحفظ ہوتا ہے۔ بڑی مہربانی ہوتی ہے، لیکن آپ اور ڈیڈی تو ہاتھ اور دستانے تھے۔'' ۴۶ؔ

یونس جاوید کے ڈرامے ''گھنی چھاؤں'' میں باپ کی بے راہ روی کو موضوع بنایا گیا ہے، جرائم پیشہ افراد کی اولاد، جس سماجی نفرتوں کا شکار ہوتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے، احساسِ جرم اُن کی گھٹی میں ہوتا ہے، لوگوں کی طنزیہ نظریں تمام عمر اُن کا

پیچھا کرتی ہیں اور اُن کا تعارف اپنی شخصیت کی پہچان کی بجائے ماں باپ یا بڑوں کے جرائم بنتے ہیں۔ ''گھنی چھاؤں'' کی زینب اپنے بیٹے موتی کو جرائم کی دُنیا سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے، لیکن ناکام رہتی ہے۔ ڈاکو ہونے کی وجہ سے وہ جنگلوں میں مارامارا پھرتا ہے، ایک روز، جب گھر آتا ہے، تو اپنی جواں سال بیٹی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے:

''موتی: (حیرت سے گھورتے ہوئے سکتے میں آجاتا ہے) شاہ بیگم (پیار دے کر) تو اتنی بڑی ہوگئی ہے؟ زینب: کیسے یقین آئے گا تجھے (رک کر) آٹھ برس کی تھی، جب چھوڑ کے بھاگا تھا (سسک کر) اکیلی کیا کیا کروں میں اِس کے لیے؟، موتی: کون کہتا ہے کہ تو اکیلی ہے، زینب: پہلے تیرے پیشے نے اکیلا کر دیا مجھے، پھر تیرے غم میں رو رو کر مر گئی، زینت (رُک کر) اِسے میرے حوالے کر گئی (رُک کر) اِس بوجھ سے میں زیادہ کلی ہوگئی (رُک کر چلاتی ہے) یہ دوزخ کا بالن چھوڑے گا یا نہیں بتا مجھے؟ موتی (تحمل سے) چھوڑنا بھی چاہوں، تو چھوڑ نہیں سکتا، زینب (چلا کر) کیوں نہیں چھوڑ سکتا (رُک کر) زندگی بھر ڈاکو کی بیٹی کہلائے گی (اشارہ شاہ بیگم کی طرف) طعنے سنے گی، روز مرے گی روز جیئے گی، میں کہتی ہوں اَب بھی سمجھ جا، چھوڑ دے (موتی جیسے لاجواب ہوگیا ہو، چل کر شاہ بیگم کے سامنے آتا ہے)، موتی: تو کیوں آگئی یہاں (نرم لہجے میں) تیرے آنے سے میرے پاؤں اُکھڑ رہے ہیں، قدموں میں لرزش آنے لگتی ہے، میں ریت ہو رہا ہوں۔ شاہ بیگم: بابا تم گاؤں چلو میرے ساتھ۔ موتی: کاش کہ جا سکتا۔'' ۴۷

اِسی طرح شادیوں کے نام پر دھوکے اور شوہر کے معاشقے عورت کی زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں۔ اشفاق احمد کے ڈرامے ''کھیل تماشا''، ''میل ملاپ'' اور ''بندر جاتی اور ماممتا'' اِس حوالے سے اہم ہیں:

''سجاد: ماورا میری بیوی ہے اور میں اُس کا اصل وارث ہوں۔ خالہ: ہونہہ بیوی۔ اُس وقت یہ بیوی کہاں تھی، جب تم شادی کی پہلی رات اُسے چھوڑ کر کینیڈا روانہ ہو گئے تھے۔ اُس وقت یہ بیوی کہاں تھی، جب تم نے اپنی سہاگ رات کے ٹھیک بارہ بجے اپنے چھوٹے بھائی کی استانی سے نکاح کر لیا تھا۔ اُس وقت یہ بیوی کہاں تھی جب تم استانی کلثوم کو ظفر کے حوالے کر کے یہ کہہ گئے تھے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر پاسپورٹ بنوا کر میرے پاس کینیڈا بھجوا دینا۔۔۔ اُس وقت یہ بیوی کہاں تھی، جب۔۔۔ (دھیمی ہو کر) جاؤ سجاد ہم دونوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ جاؤ تمہارے پاس تمہارا درخشاں مستقبل اور محبت کرنے والی بیوی موجود ہے۔'' ۴۸

لڑکیوں کی تعلیم کے حصول میں حائل مشکلات کی نشاندہی بہت سے ڈراما نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ بچیوں کی تعلیم کے حوالے سے صالحہ عابد حسین نے اپنے ڈرامے ''حالی کی ایک جھلک'' میں بیان کیا ہے:

''حالی: ہاں خدا کی مہربانی اور تمہاری کوشش کی بدولت اسکول خاص ترقی کر رہا ہے۔ اِس وقت بیس بائیس لڑکیاں پڑھنے آتی ہیں، مگر اسکول کا وقت کچھ ٹھیک نہیں، ممکن ہو تو چھ

سات بجے سے بارہ بجے تک کا وقت مناسب ہے، کیوں کہ بڑی لڑکیاں، جو گھر کا کام
کرتی ہیں اُن کا بڑا ہرج ہوتا ہے۔''۴۹؎

گھر کی دال روٹی کی خاطر گھروں میں کام کرنے والی محنت کش عورتوں اور ملازماؤں کے مسائل کی عکاسی بہت سے ڈراما نگاروں نے کی ہے۔ غربت وافلاس میں پلنے والے بچے، جب ماں کی محبت وشفقت سے محروم رہ جاتے ہیں، تو اُن کی شخصیت کا خلا زندگی کی محرومیوں میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ ماں سے دُوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محرومی اشفاق احمد کے ڈرامے ''بندر جاتی اور مامتا'' نظر آتی ہے۔ شمو کا کرب اسی کمی کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح ''مہمانسرائے'' میں جائے ملازمت پر خواتین کو ہراساں کیے جانے کے تمام مواقع مرد بروے کار لاتے ہیں، خواہ کو لیگ واقف کار ہو یا انجان اِس کے ساتھ خوش گپی اور خوش وقتی مذکورہ افراد اپنا حق تصور کرتے ہوئے مردوں کے اِس رویے سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے، جب کہ ڈراما ''ہمتِ باطل'' میں ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے، ''ہمتِ باطل'' کے امیر زادے سکندر کے معاشقے کی وجہ سے اِس کا باپ تمام پڑھی لکھی لڑکیوں کے بارے میں تاثر قائم کر لیا جاتا ہے۔ ڈراما ''سنگل اور سنگل بینڈ'' میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی زندگی کی مشکلات کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو معاشرہ خوش دلی سے قبول نہیں کرتا۔ لڑکے، چوں کہ لڑکیوں کی بہ نسبت کم پڑھے لکھے ہیں، اِس لیے برابر کا رشتہ ملنا خاصا دشوار ہو گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکوں کی تعداد دِن بدن کم ہوتی جا رہی ہے، اِس لیے کم پڑھے لکھے عام طور پر اپنی کمتری کا ازالہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ذہنی اذیت اور نفسیاتی دباؤ کی صورت میں دے کر کرتے ہیں، کیوں کہ لاشعوری طور پر اُنھیں بیوی کے اپنے اوپر حاوی ہونے کا خوف محسوس ہوتا ہے، اِسی لیے اپنے احساسِ کمتری کو نام نہاد برتری کا نام دے کر مختلف حیلے بہانے سے اِسے پریشان کرتے ہیں:

''لبنیٰ: اِن ملازم پیشہ خواتین کی شادی نہیں ہوتی ناں ابا جی ___ اس لیے سر درد ہوتے ہیں ان کے کیوں اماں جی۔ ماں: وقت پر رشتے بھی تو نہیں ملتے لبنیٰ ___ وہ بھی کیا کریں (اب ڈاکٹر صاحب اپنے خول میں چلے جاتے ہیں۔) مریم: میں تو خود پروفیسر لگوں گی ایم اے کر کے۔ لبنیٰ: پھر شادی نہ ہوئی تیری مریم۔ مریم: میری تو تمام پروفیسروں کی شادی ہوئی وی ہے ___ اطہر: لیکن تیری نہیں ہوگی ناں۔ ماں: کیا بکواس کرتے ہو۔ اشعر: اس کے بھی سر درد ہوا کرے گی۔ اطہر: اور بائیں آنکھ سے آنسو نکلا کریں گے۔ شمس: کافی سر؟ ڈاکٹر: نو تھینک یو شمس۔''۵۰؎

مخلوط تعلیم، جہاں وقت کی ضرورت بھی ہے اور طلبہ وطالبات میں خود اعتمادی کی مظہر بھی۔ یہ پیٹ کے مسائل کی آماجگاہ بھی بن جاتی ہے، خصوصاً لڑکیوں کے لیے اُنھیں اپنے ہم مکتبوں کے علاوہ اساتذہ اور درجہ چہارم کے ملازمین کی جانب سے ہراساں کیے جانے کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً ڈراما ''پھول والوں کی سیر'' میں ڈین آف فیکلٹی طالبہ نیلوفر کو ہراساں کیے جانے کی درخواست کے حوالے سے میٹنگ میں باہمی مشاورت سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے:

''ڈین۔ا: بات یہ ہے وی سی صاحب کو پہلی کمپلینٹ نہیں ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے

اور میرا تجربہ ہے کہ مخلوط تعلیم میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ لڑکے لڑکیوں کو HARASS کرتے ہیں، لیکن اب اُن کے رویے میں شدت پیدا ہوگئی ہے جو قابلِ گرفت ہے۔ ڈین۔۲: سر! اگر یہ بات آپ نے نظر انداز کر دی تو پھر تو کل کسی لڑکی کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ ہمیں عمران کے لیے سخت سے سخت سزا تجویز کرنی ہو گی۔۔۔ وائس چانسلر: پروفیسر مدنی! ایز فاروق میں آپ کا ہم خیال ہوں کہ سزا اگر شخصیت کی توڑ پھوڑ کرے تو اُس کا دینے والا گناہ گار رہتا ہے، لیکن میں مجبور ہوں۔ دیکھئے مجھے نیلوفر فیاض کی درخواست ملی ہے کہ عمران نے اُسے جگہ جگہ HARASS کیا ہے۔ مجھے رپورٹ ملی ہے کہ عمران نے اُسے بس سٹاپ پر، ایک پبلک پلیس میں آگے بڑھ کر پکڑنے کی کوشش کی ہے، کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ایسے واقعات کے بعد بھی میں عمران کو یونیورسٹی میں رہنے دوں تو پبلک میرے خلاف ہو جائے گی۔''۵۱

وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ تعلیم کی اہمیت وافادیت بڑھتی جارہی ہے۔ تعلیم، صحت مند معاشرے کی بنیاد ہے۔ ''دوسرا قدم'' کی ماں فرحت محض اس لیے اپنی بچیوں کو پڑھانا چاہتی ہے کہ اُس کی دانست میں رشتے مجھے اچھے پڑھے لکھے گھرانوں کے آئیں گے اور لڑکیوں کا مستقبل سنور جائے گا:

''فرحت: اچھے رشتے بھی پڑھی لکھی لڑکیوں کو ملتے ہیں۔ اشرف اگر یہ اَن پڑھ رہ گئیں تو میرے خاندان میں کون بیاہے گا اِنھیں دیہاتی ماحول میں تو نہیں دوں گی اشرف۔ اشرف: میں ایک بات بتاؤں تمھیں۔ فرحت: ہاں۔ اشرف: تمھیں پڑھائی کا پاگل پن ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں سُوجھتا تمھیں پڑھائی کے بغیر۔ فرحت: آج کل یہ مرض سبھی عورتوں کو ہو گیا ہے اشرف۔ پڑھائی کے علاوہ اور کیا ضروری ہے بھلا؟ اشرف: کوئی نماز، روزہ، تلاوت وغیرہ۔ فرحت: وہ سب آجاتے ہیں آپی آپ۔ یہ پڑھائی نہیں آتی اللہ ماری۔''۵۲

حمید کاشمری کا ڈراما ''کافی ہاؤس'' کماؤ لڑکیوں کی شادی کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے، گھر کی کفیل ہونے کی وجہ سے بعض والدین مجبوراً اُنھیں بیاہنا نہیں چاہتے، بعض خود مختاری کے نشے میں اپنی آزادی کی سلبی متصور کرتے ہوئے شادی سے اجتناب کرتی ہیں، تو کچھ لالچی لوگوں سے متنفر ہو کر تنخواہ کی خاطر رشتے طے کرتے ہیں، شادی سے انکار کر دیتی ہیں:

''خالہ حشمت: دیکھو آپا، جو ہو گیا سو ہو گیا، اب آگے کی بات کرو، خدا کے فضل سے رحیم کی تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے، نوکری بھی پکی ہے، فرمابردار ہے کہ ابھی میرے کہنے میں ہے، ورنہ کماؤ لڑکے کا کیا، کسی وقت اِدھر اُدھر ہو سکتا ہے، امی: تمھاری بات ٹھیک ہے حشمت، لیکن مجھے کچھ مہلت دو میں نے صفیہ سے کُھل کر بات نہیں کی ابھی، حشمت: بچیوں سے زیادہ کُھل کر بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں، اشارے ہی کافی ہوتے ہیں۔ فیصلہ وہی سہی ہوگا، جو تم کرو گی۔ امی: تم اچھی طرح جانتی ہو حشمت صفیہ کے سوا میرا کون

ہے دُنیا میں، وہ میرا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی۔حشمت:وہ میں مانتی ہوں جب بیٹی کما کر لائے،تو بیٹا کہلاتی ہے،لیکن بیٹی بیٹی ہوتی ہے، بیٹا نہیں بن سکتی، چاہے کچھ بھی کرلے اور کتنا ہی کمالے۔بہن ایک نہ ایک دن بیاہنا ہ ہی پڑتا ہے،صفیہ: لوگ کون ہوتے ہیں امی، وہ میری ذات میں سوطرح کے کیڑے نکالتے ہیں، میرے کریکٹر پر شبہ کرتے ہیں اور مجھے بیاہنا بھی چاہتے ہیں، آخر کیوں اُنھوں نے کبھی آپ سے یہ نہیں کہا کہ وہ شادی کے بعد مجھے نوکری سے منع کریں گے،امی: نہ کریں سُسرال والوں کی مرضی پر ہوتا ہے۔صفیہ: واہ کیا بات ہوئی آخر میری مرضی بھی،تو کوئی چیز ہے۔امی: تو مرو پھر اپنی مرضی ہی کرو، مجھے کیوں ستاتی ہو،لوگ یہ تو نہ کہیں کہ میں نے کمائی کے لیے تمھیں بٹھا رکھا ہے۔''۵۳

احمد فراز کے منظوم ڈرامے''میرے خواب ریزہ ریزہ''میں بھی نوکری پیشہ لڑکیوں کی شادی کے مسائل کی تصویر کشی ملتی ہے۔خالدہ گھر کی واحد کفیل ہے، بوڑھے والدین کا واحد سہارا ہے، جب حالات سے تھک جاتی ہے،تو خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے، اُسے گم سم دیکھ کر بوڑھا باپ شدید کرب سے گزرتا ہے اور بعض اوقات تنگ آ کر اُسے بُرا بھلا کہتا ہے:

''بوڑھا: خالدہ! بند کردے یہ دریچے کے کواڑ،\
کتنی بے رحم ہے بیٹی تو بھی،\
میں چراغِ سحر اور تجھے\
طلبِ بادِ شمال\
کیا اسی دن کے لے تجھ کو جواں ہونا تھا؟\
(اپنے آپ سے) کاش اِس دخترِ بے فیض کے بدلے قدرت\
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات\
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات!۔''۵۴

خالدہ،مصور کی دلفریب باتوں میں آکر دل دے بیٹھتی ہے،اُس میں جاگنے والے ارمانوں کی گنگناہٹ، بوڑھا باپ سن لیتا ہے اور آنے والے وقت کے خوف سے لرزاں ہے،مصور خالدہ کو محبتوں کی پینگیں بڑھا کے چھوڑ جاتا ہے، خالدہ کے دیر سے گھر آنے پر بوڑھا اُسے نوکری پر جانے سے روکتا ہے، جب اُس کی بیوی آمنہ اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتی ہے کہ نوکری چھوڑ دی،تو کیسے جئیں گے، بوڑھا سنی اَن سنی کر دیتا ہے:

''بوڑھا:وائے محرومیٔ تقدیر کہ جس کے باعث\
آج میں اپنی جواں بیٹی پر\
بار ہوں ـــــــ بارِ گراں\
پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا\
خالدہ، باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مری\
اتنی تذلیل کرے

اِس سے بہتر کہ یہ افلاس مرا
مری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے
میں بجھا دوں گا ہر اک شمعِ حیات
زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں۔۔۔
کچھ بھی ہو
مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب
مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب۔'' ۵۵ے

میاں بیوی کا ایک دوسرے کو تسلیم کرنا، ایک دوسرے کی توقعات اور خواہشات کا احترام کرنا ازدواجی زندگی کے اصولوں میں سے ایک ہے، عام طور پر عورت شوہر کی ناقدری کا شکار ہوتی ہے۔شوہر کی ناقدری کی وجہ سے عورت بہ حیثیتِ ماں اور بیوی بے بسی کی علامت بن جاتی ہے۔اشفاق احمد کے ڈرامہ 'دادا اور دلدادہ' کا جمال اپنی ماں سے اس لیے متنفر ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مظالم کے آگے بے بس ہوتی ہے۔ مرد کا استحصالی رویہ خانگی زندگی کی بربادی کا سبب بنتا ہے، جو مرد جبر و دھونس کے ذریعے اپنے بیوی بچوں کو ہر طرح دبانا چاہتا ہے اور اپنی حاکمیت کا رُعب جماتا ہے اور بہت سے خانگی مسائل کا سبب بنتا ہے، مثلاً اشفاق احمد کا ڈرامے 'آسان سی بات'، 'بیانام کا دیا' اور 'یہ تیرے پُر اسرار بندے' میں گھریلو انتشار اور اُلجھنوں کے اسباب کی نمائندگی کرتے ہیں: ''اصل میں اُس کی دو شخصیتیں ہیں، ہتی: اور دونوں ہی مجھے زہر لگتی ہیں۔گھر کے اندر وہ مجھے دیکھتا نہیں اور گھر کے باہر وہ ہر ایک کو دیکھتا ہے، بڑی دیر تک دیکھتا ہے اور بڑی دُور تک دیکھتا ہے۔'' ۵۶ے دھونس کے رویے سے پیدا ہونے والی عدم مطابقت کی نشاندہی بانو قدسیہ کے ڈرامے 'زرد گلاب' میں کی گئی ہے:

''لالہ: اور جو تو مجھ سے اصلی بات پوچھے۔۔۔تو یہ شوہر کا رشتہ بھی سوتیلا ہی ہوتا ہے۔۔۔
اُس کی ساری عمر سیوا کرو، پر جب جی چاہے کھاٹ سے علیحدہ کر دے، طلاق دے
دے۔۔۔اُس پر بھی کون بھروسہ کرے اندھا؟۔'' ۵۷ے

''کالاش'' میں مرد کے بے حسی اور عدم توجہی سے خانگی زندگی میں درپیش آنے والے اکرب اور اذیت کو موضوع بنایا ہے:

''ثریا: داؤد۔۔۔(وہ مڑ کر دیکھتا ہے) کبھی میری طرف بھی دیکھ لیا کرو۔۔۔(وہ پھر
جانے لگتا ہے) داؤد۔۔۔داؤد: (ناگواری سے) کیا ہے؟ ثریا: تم اِن کرسیوں کی طرف
دیکھتے ہو۔۔۔ پردوں کو، صوفوں کو، گل دانوں کو۔۔۔آرائش کی چیزوں کو دیکھتے ہو۔۔۔
کیا میں اِن جیسی بھی نہیں کہ تم مجھ پر نگاہ بھی نہیں ڈالتے؟۔'' ۵۸ے

اِسی طرح رضیہ فصیح احمد نے ڈرامے ''بولتے گونگے'' میں لڑکیوں کو بردکھاوے کے نام پر نگاہوں میں ٹٹولنے اور اُس کے گھر بار کو پرکھنے کے بہانے لڑکی کے ماں باپ کی مالی حیثیت پرکھی جاتی ہے، اِس لیے لڑکیوں کی مائیں اکثر، گھربار برتنوں وغیرہ کا خاص دھیان رکھتی ہیں کہ کوئی بچی کے رشتے کے لیے آئے، تو اُنھیں غریب جان کر رشتہ نہ ٹھکرا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بردکھاوے کے موقع پر مرد سب سے زیادہ اِنھی دکھاوؤں کی نفی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن لڑکی کی شادی کے بعد استحصال کرنے والوں میں سرِ فہرست ہوتے ہیں:

''انور: (بُرا مان کر) اگر آپ ایسا نہیں کریں گی تو شفو کی شادی قیامت تک نہیں ہوگی۔ یاد ہے پچھلی مرتبہ جو عورتیں آئی تھیں اُنھوں نے گھر کی چیزوں اور بیچ رنگی پیالیوں کو دیکھتے ہی جانے کی ٹھان لی تھی۔ شفو کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اماں: (ڈرتے ڈرتے صوفے پر بیٹھتی ہیں) وہ دونوں لنگوڑ ماریاں تو یوں منہ بنائے، ناک سکیڑے بیٹھی رہیں، جیسے کسی اصطبل میں بیٹھی ہوں۔ نہ کوئی چیز چکھی نہ چائے پی۔ انور: (جوش سے) اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اِس اصطبل نما گھر کو اور ساز و سامان کو دیکھ کر کوئی شادی نہیں کرے گا اُس سے۔ آپ ایک مرتبہ اُن کو اس گھر میں آنے تو دیجیے۔ باقی میں سب ٹھیک کرلوں گا۔'' ۵۹

مسعود مفتی کے ڈرامہ ''رویے'' میں عورت کو گھر کی اساس قرار دیا ہے، اِن کے خیال میں جس طرح تخلیق کے بیشتر مراحل عورت طے کرتی ہے، اِسی طرح گھر کے ماحول کو درست رکھنا بھی محض عورت کے فرائض میں شامل نہیں۔ مرد کو اس میں عورت کی مدد و معانت کرنی چاہیے۔ مسعود مفتی نے مردوں کی اُس سوچ کی مذمت کی ہے، جس کے مطابق، شادی شدہ زندگی کی کامیابی کا بوجھ عورت کے سر پر قرار دیتے ہیں:

''عائشہ: مگر شکیل بھائی یہ سب کچھ تو آپ نے ہی مہیا کرنا ہے۔ صرف لڑکی کی ہی ذمہ داری نہیں ہے یہ۔ شکیل: بالکل درست کہا آپ نے عائشہ، مگر عورت کو خدا نے پیدا ہی تخلیق کے لیے کیا ہے، مرد تو تخلیقی عمل میں تھوڑا سا حصہ لیتا ہے۔۔۔ بالکل معمولی سا حصہ اور اگر تخلیق کرنے والی بانجھ ہو۔۔۔ تو مرد بے بس ہے، اِسی طرح گھر کا ماحول بھی بنیادی طور پر عورت تخلیق کرتی ہے۔ مرد تو اِس میں مدد کرتا ہے۔۔۔ اگر عورت میں وہ جو ہر نہیں ہوگا، تو مرد وہاں بھی بے بس ہو جائے گا۔۔۔ اَب دیکھ لو شبراتی گھر چھوڑ کے میلوں دُور یہاں پناہ لیتا ہے۔'' ۶۰

شادی لڑکی کی زندگی ہیں، اہم موڑ ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں شادی اور سُسرال کی زندگی لڑکی کا دوسرا جنم قرار دیا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے کی زندگی کو ختم کرنا ہی شوہر اور سُسرال والوں کی کامیابی تصور کیا جاتا ہے۔ تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ مرد اپنے والدین اور بہن بھائیوں میں رہنا اپنا حق سمجھتا ہے، جب کہ بیوی کے ماں باپ، بہن بھائی چھڑوانا۔ اپنی حاکمیت کی دلیل سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد کا ڈراما 'ترش، تلخ، شیریں'، اشفاق احمد کا 'صنم گزیدہ' اِسی قسم کے مسائل کی عکاسی کرتے ہیں:

''شیریں: نہیں سہیل، ہم مشرقی لڑکیاں شادی کے بعد اپنے نئے گھر جاتی ہیں، تو پرانی دُنیا کے دروازے اپنے پر بند کرلیا کرتی ہیں، مجھے پتا ہے۔ تم کہو گے اتنی تعلیم کے باوجود میرے خیالات کتنے دقیانوسی ہیں، لیکن جب ہمیں بچپن ہی سے تعلیم دی جاتی ہو، بار بار اِس بات کو ہتھوڑے سے دماغ پر نقش کیا جاتا رہا ہو کہ۔ سہیل: اور وہ بدنام زمانہ جملہ ___ بیٹی تم اپنے گھر جا رہی ہو ___ اب تمہارے لاش ہی وہاں سے آئے ___ نان سنس ___ اتنی ترقی یافتہ دُنیا میں بھی عورت اگر اسی طرح۔'' ۶۱

ہے اور بہت سے رشتوں کو ٹھکرا کر اپنے من پسند انسان کی متلاشی رہتی ہے۔ وہ اپنی آزادروی میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کرتی اور چاہتی ہے کہ کوئی بھی اُس کے طرزِ زندگی میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ رشتے کے لیے مطلوبہ سرجن سے فون پر بات کرتے ہوئے اپنے خیالات کا کھلم کھلا اظہار کرتی ہے:

''روزینہ: ہیلو، جی، میں روزی بول رہی ہوں__Pause تو آپ میرے بارے میں جاننا چاہتے ہیں (مسکراتی ہے)، مگر آپ کے پاس، تو وقت نہیں، ہاں، ہاں__ لگتا ہے ہم سب بے کار ہیں__ نہیں میں بُرا نہیں مان رہیPause میرے پاس بُرا ماننے کی فرصت نہیں__جی! دیکھئے ڈاکٹر I mean سرجن صاحب میں ایک آزادی خیال Established لڑکی ہوں__I am smart، yes I know ہاں کوشش، تو ماں باپ کی ہے، مگر پسند میری ہوگئی__جی!Date ہاں میں نے پہلے ڈیٹس کی ہیں۔ جی! گورے لڑکوں کے ساتھ، جی ہاں کالج کے ساتھی، کیوں نہیں__I love people پارٹیوں میں بھی جاتی ہوں، ضروری نہیں__ موڈ ہوا تو کبھی کبھی وائن بھی پی لیتی ہوں۔ جی میں I dont Somke میں جانتی ہوں__ ہاں شادی مجھے گورے سے نہیں کرنی، مگر میری پسند کا لڑکا نہیں ملا، تو میں شادی زبردستی بھی نہیں کروں گی، مجھے پتہ ہے میرے روایتی والدین یہ سب برداشت نہیں کریں گے__جی__ میں اِس کا بھی انتظام کر لیا ہےoh yes I am not depending on my parents__ آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں__ بھئی گھر بھی اپنا لے لیا ہے، جناب جی ابھی کرایے پر دیا ہوا ہے، جب ضرورت ہوگی، اِس میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی والدین کے ساتھ ہمیشہ، تو نہیں رہ سکتی__ anything else doc۔''۲۵

کوثر علی نے بھی ڈرامے ''آئینۂ حیات'' میں یہی موضوع اُجاگر کیا ہے، اگر والدین اپنی اولاد کی شادیاں پاکستان میں آ کر کرنا چاہتے ہیں، تو لڑکیاں اِسے اپنی آزادی کے سلب ہونے کے مترادف سمجھتے ہوئے، بغاوت پر اُتر آتی ہیں:

''زینب: یہ تو اچھا ہوا، پھر تم بچ کیسے گئیں، نورین: زینب تمھیں اندازہ نہیں کہ میں اس وقت کتنی بے بس محسوس کر رہی تھی، پاکستان میں رشتے دار اور والدین ایسے وقت میں مکمل طور پر بااختیار ہوتے ہیں۔ لڑکی کے پاس کوئی اختیار اور کوئی حقوق نہیں ہوتے، میرے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔۔۔ وہ ایمبسی کی خاتون میرے ساتھ گھر پر آ گئی اور اُس نے میرے والدین سے کہا کہ نورین ہماری حفاظت میں ہے، اِس کے ساتھ کوئی زیادتی برداشت نہیں کی جائے گی، ہم اسے آج ہی برطانیہ بھجوا سکتے ہیں، اگر اُس کے ساتھ کوئی جبر ہوا یا اُس کی زبردستی شادی کی گئی، تو برطانیہ میں آپ کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی۔''۲۶

عورت کے بارے میں سماجی رویے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں مروجہ رُسوم

ہے اور بہت سے رشتوں کو ٹھکرا کر اپنے من پسند انسان کی متلاشی رہتی ہے۔ وہ اپنی آزادروی میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کرتی اور چاہتی ہے کہ کوئی بھی اُس کے طرزِ زندگی میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ رشتے کے لیے مطلوبہ سرجن سے فون پر بات کرتے ہوئے اپنے خیالات کا کھلم کھلا اظہار کرتی ہے:

''روزینہ: ہیلو، جی، میں روزی بول رہی ہوں ــــ Pause تو آپ میرے بارے میں جاننا چاہتے ہیں (مسکراتی ہے)، مگر آپ کے پاس، تو وقت نہیں، ہاں، ہاں ــــ لگتا ہے ہم سب بے کار ہیں ــــ نہیں میں بُرا نہیں مان رہی Pause میرے پاس بُرا ماننے کی فرصت نہیں ــــ جی! دیکھیے ڈاکٹر I mean سرجن صاحب میں ایک آزادی خیال Established لڑکی ہوں ــــ I am smart، yes I know ہاں کوشش، تو ماں باپ کی ہے، مگر پسند میری ہوگئی ــــ جی! Date ہاں میں نے پہلے ڈیٹس کی ہیں۔ جی! گورے لڑکوں کے ساتھ، جی ہاں کالج کے ساتھی، کیوں نہیں ــــ I love people پارٹیوں میں بھی جاتی ہوں، ضروری نہیں ــــ موڈ ہوا تو کبھی کبھی وائن بھی پی لیتی ہوں۔ جی میں I dont Somke میں جانتی ہوں ــــ ہاں شادی مجھے گورے سے نہیں کرنی، مگر میری پسند کا لڑکا نہیں ملا، تو میں شادی زبردستی بھی نہیں کروں گی، مجھے پتہ ہے میرے روایتی والدین یہ سب برداشت نہیں کریں گے ــــ جی ــــ میں اس کا بھی انتظام کر لیا ہے oh yes I am not depending on my parents ــــ آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں ــــ بھئی گھر بھی اپنا لے لیا ہے، جناب جی ابھی کرایے پر دیا ہوا ہے، جب ضرورت ہوگی، اِس میں شفٹ ہو جاؤں گی۔ ویسے بھی والدین کے ساتھ ہمیشہ، تو نہیں رہ سکتی ــــ anything else doc۔'' [۶۵]

کوثر علی نے بھی ڈرامے ''آئینۂ حیات'' میں یہی موضوع اُجاگر کیا ہے، اگر والدین اپنی اولاد کی شادیاں پاکستان میں آکر کرنا چاہتے ہیں، تو لڑکیاں اِسے اپنی آزادی کے سلب ہونے کے مترادف سمجھتے ہوئے، بغاوت پر اُتر آتی ہیں:

''زینب: یہ تو اچھا ہوا، پھر تم بچ کیسے گئیں، نورین: زینب تمھیں اندازہ نہیں کہ میں اس وقت کتنی بے بس محسوس کر رہی تھی، پاکستان میں رشتے دار اور والدین ایسے وقت میں مکمل طور پر بااختیار ہوتے ہیں۔ لڑکی کے پاس کوئی اختیار اور کوئی حقوق نہیں ہوتے، میرے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔۔۔ وہ ایمبسی کی خاتون میرے ساتھ گھر پر آ گئی اور اُس نے میرے والدین سے کہا کہ نورین ہماری حفاظت میں ہے، اِس کے ساتھ کوئی زیادتی برداشت نہیں کی جائے گی، ہم اسے آج ہی برطانیہ بھجوا سکتے ہیں، اگر اُس کے ساتھ کوئی جبر ہوا یا اُس کی زبردستی شادی کی گئی، تو برطانیہ میں آپ کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی۔'' [۶۶]

عورت کے بارے میں سماجی رویے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں مروجہ رُسوم و

روایات اور تصورات کے تناظر میں عورت کا مقام و مرتبہ متعین کیا جاتا ہے۔ایک اچھا معاشرہ عورت و مرد کے حقوق و فرائض میں تخصیص کا قائل نہیں ہوتا، بلکہ یکساں انسانی سلوک کو اہمیت دیتا ہے۔ سماج میں مروجہ صنفی امتیازی سلوک والے معاشرے میں عورت پر مرد کی فوقیت تسلیم کی جاتی ہے۔عورت کی ضیف الاعتقادی اور جلد یقین و اعتبار کرنے والی عادت سے بہت سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ 'کھیل تماشا' میں اشفاق احمد نے اسی پہلو کو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح پیر الیاس منگل شاہ کی جھگی کے آگے پراندے کی ڈوری میں تین گرہیں لگا کر پیڑے میں لپیٹ کر اپنے خاوندوں کو دیتیں، جو ان کے پیروں کو جھگی کے سامنے پھینکتے، تو اِن کی عورتوں کی مرادیں پوری ہو جاتیں، جعلی پیر کا پول کھولتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> ''بیولوہاری اُس کی کٹیا میں داخل ہوئی اور اُس کے زنجیر پوش بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پھر اُس نے اُٹھ کر آہستہ آہستہ سائیں الیاس کے سارے سنگل کھولے اور نیچے سے اُس کا نخور پنڈا نکال کر اُس پر محبت کا ہاتھ پھیرا۔سنگلوں کی سختی کے بعد ایک نرم ہاتھ کے لمس نے جلد کے سارے روئیں ایک ساتھ کھڑے کر دیے۔آہنی انڈے کے خول سے ایک نرم و نازک چوزہ برآمد ہوا اور اِس نے اپنے آپ کو بیولوہاری کے پروں میں چھپا لیا۔'' ٦٧

''فہمیدہ کی کہانی، اُستانی راحت کی زبانی'' میں شادی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کس طرح غریب بچیاں جہیز کے نہ ہونے سے والدین کی چوکھٹ پر خواب بنتی رہ جاتی ہیں۔فہمیدہ ایسی لڑکی امیرزادی کے عالی شان جہیز اور اس کی شادی بیاہ کی شاہانہ طور طریقوں سے ذہنی تناؤ کا شکار ہوتی ہے، جو اِس میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور بالآخر لڑکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔جھوٹی شان اور دکھاوے کے حوالے سے اُستانی راحت کی زباں سے مروجہ رُسوم کی نفی کی گئی ہے۔بانو قدسیہ کا ''خانہ بدوش''، ''رات گئے''، عصمت چغتائی کا ''ڈھیٹ''، انور سجاد کا ''گونائی'' عورت کے ساتھ روا سماجی رویوں کی ناہمواری ظاہر کرتے ہیں:

> ''صدیقن: کچھ خبر رکھا کر اندر باہر کی۔۔۔ کچھ وارنے ہوں گے پوتے کے، کچھ لاگیوں کو ملے گا۔ کچھ نظر اتارے گی بہو کی چودھرائن ___ جب تجھے خبر ہی نہیں تو پیچھے رہ جائے گی سب سے۔سیوا کرتی تو مرے گی اور انعام سب دوجے لے جائیں گے ہاں۔مہرو: (دُکھ اور صبر سے) اچھا اماں! اپنے نصیب بھر ہی ملتا ہے ناں سب کو۔۔۔روزی بھی اور انعام بھی۔'' ٦٨

عصمت چغتائی نے ڈراما ''ڈھیٹ'' میں بھی عورت کو زندگی کے ہر محاذ پر کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

> ''وہ: عورت خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ پالے، بڑے سے بڑا کام انجام دے لیکن پھر وہ عورت ہے۔ایک کمزور ہستی۔ میں: تھوڑی دیر کے لیے مانو کہ میں یقین نہیں کرتی۔تب؟ وہ: تمہارے ماننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔دُنیا کہتی ہے، بڑے بڑے علمائے دین اور فلسفیوں کے قول دیکھ لو۔'' ٦٩

ڈراما ''گونائی'' میں بھی انور سجاد نے اِسی موضوع کو اُٹھایا ہے:

''ولو: ___ سن گونائی ___ میں چاہوں تو تجھے اٹھا کے بھی لے جا سکتا ہوں۔ تیرے بھائیوں کو ایک پل میں قید کرا سکتا ہوں اور تیرے طوطے میاں کی گردن مروڑ سکتا ہوں ___ لیکن نہیں ___ میں عورت کے معاملے میں زبردستی کا قائل نہیں ___ اور مجھے کوئی جلدی بھی نہیں ___ پہلے میں اس بپھری ہوئی روح کو کچلوں گا ___ پھر اس تن کو ___ کمپنی بہادر سے میں نے یہی سیکھا ہے۔''۷۰

مسعود مفتی کے ڈرامے ''نصیب'' میں عورت پر سماجی دباؤ کا یہ اثر ہے کہ ایک ماں سہارے کی خاطر اپنا گھر بناتی ہے، اُس کی بیٹی جب شوہر کے مظالم سے تنگ آ کر ماں کے پاس آ جاتی ہے، لیکن ماں یہ سوچ کر کہ اُس کا شوہر ناراض ہو کر بیٹی کو اِسی جہنم کدے میں واپس جانے کا کہتی ہے اور زمانے کے اُتار چڑھاؤ سمجھاتے ہوئے معاشرے کے بے بسی کا نقشہ کھینچتی ہے۔ لڑکی کی عام طور پر شوہر کا مرہونِ منت قرار دیا جاتا ہے:

''تیری ماں جب تجھے پا نہ سکی تو تجھے بھول کر اپنا گھر بنا لیا ___ اب تو بھی ماں کو بھول جا بیٹی ___ اور جا کر اپنا گھر بسا لے، خواہش سب کی اُونچی ہوتی ہیں، مگر قسمت ہر ایک کی اُونچی نہیں ہوتی ہے، تیرے نصیب میں ایسا ہی گھر لکھا تھا ___ اُسے ٹھوکر مارے گی تو ___ تیرا نصیب بھی لڑھک جائے گا۔''۷۱

اِسی طرح ''ماں بیٹی'' میں معاشرے کو فلک پیانے نے عورت کے مروجہ تصور کی تصویر کشی ادبی تناظر میں کی ہے:

''بیٹی: ملک اور قوم کی بدقسمتی سے آپ کے ذہنی نشوونما کی آب و ہوا وہ تھی، جس میں اصغری اکبری کے قصے کا چرچا تھا۔ تمام زور اِس بات پر تھا کہ جو ماں ہو وہ خانہ داری میں ماہر ہو، اُس زمانے میں ایک مفید ماں کا مسلک یہی تھا کہ گھر والی کُنجیاں یوں سنبھالے، دھوبی کے کپڑے یوں لکھے۔ نوکروں کی نگرانی دن رات کرے۔ اولاد پالے، شوہر کی مزاج شناس ہوں۔ اماں اِن سینکڑوں روزانہ کی نصیحتوں کے طومار میں تم پلیں۔ تمہارا کیا قصور کہ تمھیں مفید ہونا یاد رہا اور حسین ہونا بھول گئیں۔ ہم لوگوں کا بس چلے تو اِس ادب کو جس نے ہماری ماؤں کو یوں اعلیٰ پیانے کی بنا دیا ذبح کر ڈالیں۔''۷۲

عورت جس اولاد کی خاطر اتنی قربانی دیتی ہے، جب وہی اولاد نافرمان نکل آئے، تو اِس کی ساری محنت رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ حجاب امتیاز علی کے علاوہ آغا حشر کے ڈرامے ''افضل کا مکان'' میں عورت مزمت اور زندگی کے آرام و سکون کی متلاشی ہے۔ کہیں لڑکی، بیٹی اور ماں کی حیثیت سے بدستور استحصال کی شکار ہے:

''زیتون: ہائے بچاری ___ جانے کیسی ہے! احمد: پچھلے دنوں کسی نے کہا تھا کہ وہ ایک خیراتی ہسپتال میں پڑی ہے۔ زیتون: (گھبرا جاتی ہے) خیراتی ہسپتال!؟ احمد ہاں ___ کیوں کہ اِس کا کوئی گھر نہیں۔ زیتون: لیکن اِس کا بیٹا تھا۔ بیٹے کے ہوتے ہوئے خیراتی ہسپتال میں کیوں پڑی ہے! احمد: گھر پر سوتیلے بیٹے کی بدسلوکیوں سے تنگ آ گئی تھی۔

زیتون: اور بیٹے نے اُسے گھر سے اُٹھوا کر ہسپتال میں ڈلوا دیا! ___ نہ جانے قصور کس کا ہے۔ سوتیلی ماں کا؟ کہ سوتیلے بیٹے کا؟۔'' ۳ے

آغا حشر کے ڈرامے ''افضل کا مکان'' میں عورت زندگی کے آرام وسکون کی متلاشی ہے:

''اسد: تمہاری ضد سے میں اِس کارروائی پر مجبور ہوں، جب تم سیدھی طرح سے راہ پر نہ آئیں تو پھر مجھے بھی آڑے راستے پر چلنا پڑا۔ پروین: میری عاجزی اور میری حالت کی طرف دیکھو۔ تمھیں خدا نے دولت، راحت اور آرام دے رکھا ہے، اس میں سے کچھ نہیں مانگتی۔'' ۴ے

اشفاق احمد کے ڈرامے ''حجرِ اسود'' میں ماں بیٹی کے بہتر مستقبل کی خواہاں ہیں۔ ماں بیٹے کی گفتگو کے ذریعے میکے اور سُسرال میں لڑکی کی حیثیت کے حوالے سے مکالمات پیش کیے ہیں، جو سماجی حقیقت نگاری کی مثال ہیں:

''احمد ___ اور یہ جو اتنے زور زور سے میرے بال پُوٹ رہی ہے۔ وہ؟ ماں ___ بہنوں کو نہیں مارا کرتے بیٹا۔ احمد ___ اگلے گھر میں جو اس کی چھترول ہونی ہے اس کی کچھ پریکٹس نہ کرادوں اُسے پکی ہو جائے گی۔ ماں ___ اللہ نہ کرے۔ دیکھ لینا اُسے تو اس کی سُسرال تخت پر بٹھائے گی۔ نندیں پرُ دھلائیں گی۔ ساس واری جائے گی۔ شوہر غلام ہو گا۔ احمد ___ واہ نی رانی جنداں۔ بُوتھی دیکھی ہے اس کی۔ ماں ___ کیوں؟ کیا ہے اس کی بُوتھی کو۔ محلے کی ساری لڑکیوں سے اچھی ہے۔ احمد ___ سُسرال میں تو تیرے دانت بھی گنے جائیں گے۔ بچو جیسے بکروں کے بکر منڈی میں گنے جاتے ہیں کہ چوگا ہے یا کھیرا۔'' ۵ے

ڈراما ''دیمک'' میں بانو قدسیہ نے باپ بیٹے کو معاشرتی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے:

''ابا: دیکھو بیٹی! وقت چاہے کہیں کا کہیں چلا جائے، عورت تو ہر دَور میں قیمتی اور مقدس چیز رہے گی۔ قیمتی اور پاک چیزوں کی بے حرمتی تو دیکھی نہیں جا سکتی۔۔۔ اب لوگ اُن کی تصویریں لگا لگا کر اشتہار بنا رہے ہیں۔ حد ہے کمینگی کی، ہم عورت میں رابعہ بصری کا روپ دیکھ رہے ہیں اور یہ لوگ۔'' ۶ے

ڈراما ''فٹ پاتھ کی گھاس'' عورت اور سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے:

''بتول: (غصے کے ساتھ) کلثوم تم ایک دن بھی واجد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتیں۔ وہ غنڈہ ہے، ہماری جیسی۔۔۔ لڑکیوں کو نہ اچھی ملازمتیں ملتی ہیں نہ اچھے شوہر۔۔۔ ہمارے پاس صرف وہ خواب ہوتے ہیں جن میں ہمیں سب کچھ ملتا ہے۔ بتول: وہ بے روزگار بھی ہے کلثوم۔۔۔ میں اتنی مضبوط نہیں ہوں بتول کہ میں فٹ پاتھ پر گھاس بن کر زندہ رہ سکوں۔ ہر لمحہ مسلے جانے کے خوف سے زرد۔۔۔ مسل دینے والے بوٹوں کی چاپ سے پریشان۔۔۔ میں اتنی ڈھٹائی سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ بتول: میں تو اگر کسی کے آنگن

کی بیل بھی بن گئی اور وہ مجھے صبح شام سینچتا بھی رہا تو بھی زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ آپا کیا سوچ رہی ہیں آپ ۔۔۔ واجد آپ کے لائق نہیں ۔۔۔ وہ ممتاز بلڈنگ کی ہر لڑکی کو گھورتا ہے ۔۔۔ وہ میں کیا بتاؤں کیسا ہے واجد؟ ''[۷]

دیہی عورت، اگر چہ زندگی کے ہر میدان میں اپنے مرد کا ساتھ دیتی ہے۔ گھر داری سے لے کر کھیتوں میں کاشت کاری تک کے امور اور محنت و مشقت کو معمولاتِ زندگی اور فرائض میں شمار کیا جاتا ہے، مثلاً بانو قدسیہ ڈراما ''خانہ بدوش'' میں رقم طراز ہیں:

''چودھرائن: کیا بولے بیچاری، بڑے دُکھ جھیلے ہیں اُس نے چھوٹی سی عمر میں۔ ڈھاکے سے سارا خاندان لٹ پٹ کر آیا تو روڑی کوٹنے کو ملی ۔۔۔ پھر شادی ہوئی تو خصم روڑی کوٹنے والا انجن مل گیا ۔۔۔ آٹھ مہینے بھی نہ بسی تو لکھو کو ہو گیا عشق کنگن پور کے نمبر دار کی لڑکی ہے ۔۔۔ اب تو بتا کیا بولے خصماں نوں کھانی!۔''[۸]

موجودہ دَور میں عورت جہاں ترقی کی منازل طے کر رہی ہے وہاں اخلاقی سطح سے گر کر اِس نے اپنی عزتِ نفس اور اپنے وقار اور مرتبے کو بھی داؤ پر لگانا شروع کر دیا ہے۔ مردوں سے دوستانوں اور معاشقوں کے نتیجے میں بہت سے گھرانے تباہی کے دھانے پر آن کھڑے ہوئے ہیں، اگر عورت، عورت کا استحصال نہ کرے، تو خاص طور پر شادی شدہ مرد، جس کے ساتھ بہت سے لوگوں کی زندگیاں وابستہ ہوتی ہیں، بدحالی اور تنزل کا شکار نہ ہوں، کیونکہ ایسی عورت نہ تو مطلقہ ہوتی ہے، نہ بیوہ، نہ سہاگن، بلکہ ٹھکرائے جانے کے شدید احساس تلے کچلی ہوئی عورت ہوتی ہے، جسے اولاد بھی باپ کے ہوتے ہوئے یتیمی کا زہر چکھتی ہے۔ فلک پیا کے ڈرامے ''نقل اور اصل'' میں ہندوستانی لڑکیوں کی وفا کو سراہا گیا ہے، جو ایک بار گھر آباد کرتی ہیں، تو مرتے دم تک وفا نبھاتی ہیں، مذکورہ ڈرامے میں ہنسی مزاح میں کیا گیا نکاح سنجیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے، جب لڑکی اسے اپنی عزتِ نفس کا مسئلہ بنا لیتی ہے:

''مس ہاد: تم دونوں جانتی ہو کہ ہندوستانی عورت آزاد ہو کر بھی وفا کی پتلی ہی رہتی ہے، چنانچہ یہ مس صاحبہ بھی اِس خبط میں مبتلا ہیں کہ قبول کر لیا سو کر لیا اور اب کسی کو اسی زبان سے کیا کہیے، دوست اور سہیلیاں سب کہتے ہیں کہ پاگل پن کو چھوڑو بہت وہم ہے تو اِس لڑکے سے طلاق لے لو اور اپنا گھر آباد کرو، مگر وہ خبطن اِس دُھن میں ہے کہ جب تک وہ کاغذ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے چاک نہ کر لوں گی، کسی اور کا پیغام نہ سنوں گی۔ خدیجہ: ہاد تم اُسے چاہے خبطن کہو، مجھے تو وہ لڑکی ملے تو اُس کے پاؤں دھو کر پی لوں، کیا اُس لڑکی کا عزم ہو گا، میرا بھائی ہوتا، تو میں اُس کے لیے دُنیا بھر کی خاک چھان کر بھی ایسی دُلھن تلاش کرتی۔''[۹]

بانو قدسیہ کا ڈرامہ ''شکایتیں حکایتیں'' کی سہیلی جب اپنی سہیلی کا ہنستا بستا گھر اُجاڑ دیتی ہے۔ سہیلی اُس کے حق پر ڈاکہ ڈال دیتی ہے۔ قصوروار کون سہیلی یا جمشید؟ کیا مرد اتنا عقل کا اندھا ہوتا ہے، جان بوجھ کر مٹی کا مادھو بنتا ہے، ہر طرح اپنا مفاد عزیز رکھتا ہے: ''ساجدہ: میں نے اُس زریں پر کتنا اعتبار کیا اُسے گھر لائی اپنے بیڈروم میں رکھا، لیکن وہ بھی

نکلی بے ایمان فریبی ۔۔۔چار سو بیس۔ عابدہ: کسی کو ایسے چیپسٹر نہیں کہتے۔ سادہ: کہتے ہیں کہتے ہیں۔'' ۸۰؎

اکثر گھرانوں میں بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ لڑکیوں کو کمتر گردانا جاتا ہے، مائیں خود بیٹوں کی تربیت اس انداز میں کرتی ہیں، جس سے لڑکوں میں اپنی برتری کا سودا سما جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے عورتوں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگتے ہیں، اگر ماں صنفی امتیاز نہ برتے، بلکہ بیٹی بیٹے کے ساتھ یکساں سلوک کرے، تو اِس کے پروردہ بہت کم استحصال کا شکار بنیں گی، کیوں کہ غلط تربیت اور سماجی روایات کا نتیجہ ہے کہ مرد عورت پر اپنی ساری غریبی، ٹینشن، نارسائی اور محرومی کا غصہ کمتر سمجھتے ہوئے نکالتا ہے۔ اشفاق احمد کے ڈرامے ''بہن بھائی'' میں عدم تحفظ کی شکار حساس لڑکی کی سوچ کی عکاسی ملتی ہے:

> ''راشدہ: جی نہیں جس نے گند ڈالا ہے وہی اُٹھائے۔ میں جمعدارنی نہیں ہوں اِس گھر کی۔ یوسف: یہ میرے باپ کا گھر ہے میں جب چاہوں جس قدر چاہوں اِس میں گند ڈال سکتا ہوں۔ راشدہ: یہ میرے بھی باپ کا گھر ہے اور مجھے بھی اختیار ہے کہ میں جب۔۔۔ یوسف: نہیں جناب یہ آپ کے باپ کا گھر نہیں ہے۔ راشدہ: اگر میرے باپ کا گھر نہیں۔ تو پھر کسی کے باپ کا گھر نہیں۔'' ۸۱؎

''دِلگن اپنی اپنی'' میں بانو قدسیہ نے مرد و عورت کے باہمی تعلق اور رشتۂ ازدواج کے تقدس اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ دونوں کو یک جان دو قالب ہونا چاہیے، بعض مرد اپنے سے زیادہ خوش شکل اور تعلیم یافتہ با صلاحیت بیوی کو نفسیاتی طور پر خائف ہونے کی وجہ سے جور و ستم کا نشانہ بناتے ہیں، اُن کے خیال میں بیوی کی اُن پر فوقیت کی بھی صورت میں ناقابلِ برداشت اور اِن کی حیثیت کم کر دینے کے مترادف ہے، اِس لیے ایسے مرد ذہنی و جسمانی اذیتوں کے علاوہ معاشقوں یا طلاق کی دھمکیوں سے عورت کی عزتِ نفس کچلنے سے نفسیاتی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بات بے بات پر لڑنا جھگڑنا، شک و شبہ کرنا، ایسے مردوں کا معمول بن جاتا ہے۔ بانو قدسیہ کے ڈرامے ''فسادی'' کا خلیل اِسی قسم کے رویے کی عکاسی کرتا ہے:

> ''خلیل: تو کس سے پوچھ کر گئی تھی سوہے بازار؟ شہزادی: اماں ساتھ تھیں، اُن کو انگوٹھی صاف کروانی تھی۔ خلیل: خوب باتیں کی ہوں گی سنیارے کے ساتھ، جی کھول کر۔ بھاجی بھاجی کر کے دِل کی بھڑاس نکالی ہوگی۔ شہزادی: خلیل! کیا تجھے مجھ پر کبھی اعتبار نہیں آئے گا؟۔ خلیل: (شیشہ اُٹھا کر شہزادی کی گود میں رکھتا ہے) لے دیکھ اپنی شکل ــــــ ہے اعتباری شکل۔۔۔ شہزادی: میں تو برقعہ پہن کر نکلتی ہوں باہر۔۔۔ خلیل: برقعے میں بھی تیرا جلوہ ایسا ہوتا ہے کہ گلی والے بڈھے مسواک کرنا بھول جاتے ہیں۔۔۔ خلیل: تیری شکل صورت کی لڑکیاں اللہ لوگ نہیں ہوتیں شہزادی۔ تو ماں کو بھی دھوکا دیتی رہی ہے ــــــ مجھے بھی دھوکا دے رہی ہے۔۔۔ تو اگر تتے توے پر بھی قسم کھائے تو بھی میں یقین نہ کروں تیرا۔ ہرگز نہیں۔۔۔ توبہ کرو۔'' ۸۲؎

مرد بانجھ ہو تو پردہ داری کی آخری حدوں کو چھو جاتا ہے اور اگر عورت بانجھ ہو تو زندہ رہنے کے تمام حقوق سے محروم کر

دی جاتی ہے۔ ''کالاش'' کی ثریا، داؤد کے ہاتھوں مسلسل استحصال وتشدد پر بغاوت پر اُتر آتی ہے:

''داؤد: تم آگے مت آؤ ثریا مت آؤ (اُسے تھپڑ مارنے لگتا ہے، تو وہ ہاتھ پکڑ لیتی ہے) ثریا: نہ نہ داؤد صاحب، یہ پُرانے زمانے کی باتیں ہیں، جب آپ مجھے بانجھ قرار دے کر طلاق کی دھمکیاں دیا کرتے تھے، سنو اور کان کھول کر سنو، اگر میرے بھائی کو کچھ ہوا تو (ہاتھ اُس کی گردن تک لے جاتی ہے) مجھے قسم ہے پیدا کرنے والے کی، اِنھی ہاتھوں سے، ہاں مجھے قسم ہے۔''۸۳

یونس جاوید نے ''وادیِ پرخار'' کی نجمہ بھی روایات کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ ہوگئی:

''نصیر: روایات بھی تو ہوتی ہیں اپنی۔ نجمہ: تم بیاہ کر مجھے لائے ہو یا روایات کو۔ (رُک کر) کتابوں میں پھیلی اِس محلاتی حویلی میں قید کر کے تم مجھے روایات سمجھانے بیٹھ گئے ہو اور سمجھتے ہو کہ روایات صرف تمہاری ہوتی ہیں۔ تم ہی اِنھیں بنا سکتے ہو، سمجھ سکتے ہو مسلط کر سکتے ہو، تو سنو ___ (رُک کر) میں اِن روایات کو بگاڑ سکتی ہوں، توڑ سکتی ہوں، تباہ کر سکتی ہوں۔ (سسک پڑتی ہے)۔''۸۴

عزتِ نفس عورت کو بہت عزیز ہوتی ہے۔ عورت خواہ طوائف اور نوچی کیوں نہ ہو، اُس کے جسم اور عزتِ نفس کی دھتکار اِس کے اندر نفرت کے الاؤ روشن کر دیتی ہے، جس میں وہ سب کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتی ہے۔ منٹو کی سوگندھی، جب سیٹھ کی تحقیر آمیز باتیں سنتی ہے، تو شدید نفرت اور حقارت سے اُسے دھتکار کر اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتی ہے:

''سوگندھی: (اپنے خیال میں) اونہہ ___ یہ چھوکری لایا ہے تو ___ یہ چھچھوندر ___ اونہہ ___ رام لال: چل اب گھر چل۔ سوگندھی: اونہہ ___ دس روپے اور یہ چھوکری ___ خیر کیا بری ہے ___ رام لال: چل اب ہٹا اس قصے کو۔ سوگندھی: رام لال ایک بار تو اُس سیٹھ کو پکڑ کر میرے سامنے لے آ۔۔۔ ایک بار پھر وہ بیٹری کی روشنی میرے منہ پر مارے اور 'اونہہ' کرے۔۔۔ میں اُس کا منہ نوچ لوں۔۔۔ اُس کے سر کا ایک ایک بال اکھیڑ ڈالوں۔۔۔ ٹانگوں سے پکڑ کر موٹر کے باہر گھسیٹ لوں اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دوں اور جب تھک جاؤں۔۔۔ (ہانپنا شروع کر دیتی ہے) جب تھک جاؤں تو۔۔۔ تو رونے لگ جاؤں۔''۸۵

امجد اسلام امجد کے ڈرامے ''دن'' میں بھی اسی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح باشعور عورت غلط بات پر اپنے مؤقف پر ڈٹ جاتی ہے اور کسی قسم کے روب میں نہیں آتی:

''دلاور: (مسکراتے ہوئے) تمہارا خیال بالکل صحیح ہے۔ غصے میں مجھے کچھ نہیں سوجھتا ۔۔۔ میں خود اپنے آپ کو اجنبی لگنے لگتا ہوں۔ تابندہ: یہ تو بہت بری بات ہے، میں تو ایسے لہجے کی عادی نہیں ہوں۔ دلاور: اول تو میں خیال رکھوں گا، لیکن آئندہ کبھی ایسا ہو تو اس وقت مجھ سے بحث نہ کرنا، جو میں کہوں چپ چاپ مان لینا۔ تابندہ: آپ اچھی طرح

جانتے ہیں دلاور، غلط بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی، اگر کوئی میری ذات اور میرے فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا اور مجھ پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے تو میں اس کی اجازت نہیں دیتی اسی اصول کی خاطر میں نے اپنے باپ کی بات نہیں مانی۔ دلاور: دیکھو تابندہ، خوامخوہ بات کو طول مت دو، میں نے کہا نا میں اُس وقت غصے میں تھا۔ تابندہ: آئندہ اپنے غصے پر قابو کیجیے گا، ورنہ کسی اور کو بھی غصہ آ سکتا ہے، یہ آپ کا Divine Right نہیں ہے (ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے)۔ دلاور: یہ کیا تم لوگ ہر بات میں رائٹس کا رونا لے بیٹھتی ہو۔ یہ پاکستان ہے یورپ یا امریکہ نہیں کہ عورت ہر بات میں برابری کا دعویٰ کرے، تمھیں پتہ ہونا چاہیے کہ۔۔۔ تابندہ: (چند لمحے غصے سے اُس کی طرف دیکھتی ہے، پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑی ہوتی ہے، سرد سے گھمبیر لہجے میں بات کرتی ہے اور دلاور کا جواب سنے بغیر اندر کی طرف چلی جاتی ہے) ایک بات آپ بھی یاد رکھیے گا مسٹر دلاور۔۔۔ میرا نام تابندہ وہاب علی ہے۔۔۔ ماہ پارہ نہیں۔"۸۶

تانیثیت نے ناول اور افسانے کی طرح اُردو ڈرامے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، جس کی وجہ سے موضوعاتی تنوع میں اضافے کے علاوہ ڈرامے کا کینوس وسیع ہوا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔رضی عابدی،مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں،لاہور:ادارہ تالیف وترجمہ جامعہ پنجاب،۱۹۸۷،ص ۸۱۔۸۲
۲۔محمد سلیم ملک، ڈاکٹر، جدید اُردو ڈراما مشمولہ تلاش،لاہور: بک ہوم،۲۰۰۴،ص ۵۴
۳۔عصمت چغتائی، دھانی بانکیں مشمولہ شیطان، م ن، س ن، ص ۱۷۳۔۱۷۴
۴۔صلاح الدین محمود، بے جان چیزیں مشمولہ مجموعۂ راجندر سنگھ بیدی مرتبہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷،ص ۱۲۱۰۔۱۲۱۱
۵۔عصمت چغتائی، ڈھیٹ مشمولہ کلیاں،لاہور: اُردو مرکز،۱۹۶۰،ص ۱۹۸
۶۔اشفاق احمد، ماماسیمی مشمولہ بند گلی،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص ۱۵۰
۷۔بانو قدسیہ، سُورج مُکھی مشمولہ سُورج مُکھی،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱،ص ۳۱۔۳۲
۸۔میرزا ادیب، ساحل مشمولہ رفیع پیر کے ڈرامے،لاہور:مجلسِ ترقیِ ادب،۱۹۹۰،ص ۳۳۲
۹۔امجد اسلام امجد، بازدید مشمولہ اپنے لوگ (طویل ڈرامے)،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱،ص ۳۶
۱۰۔یونس جاوید، وادیِ پُر خار مشمولہ رگوں میں اندھیرا،اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز،۱۹۹۷،ص ۳۳
۱۱۔اصغر ندیم سید، دریا،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱،ص ۱۹۱
۱۲۔مُستنصر حسین تارڑ، کالاش،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص ۲۸۱
۱۳۔امجد اسلام امجد، بازدید مشمولہ اپنے لوگ،ص ۳۷
۱۴۔بانو قدسیہ، خانہ بدوش مشمولہ دہی تماثیل،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص ۲۱۴
۱۵۔اصغر ندیم سید، دریا،ص ۱۸۴
۱۶۔عمیرہ احمد، دوراہا،لاہور:علم وعرفان پبلی شرز،اشاعت اول،۲۰۰۹،ص ۳۵۸۔۳۵۹
۱۷۔اشفاق احمد، ڈزے کول مشمولہ ایک محبت سو ڈرامے،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص ۲۷۱۔۲۷۳
۱۸۔اشفاق احمد، غریب شہر مشمولہ ایک محبت سو ڈرامے،ص ۵۰۳
۱۹۔اشفاق احمد، میل ملاپ مشمولہ حیرت کدہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص ۴۴
۲۰۔بانو قدسیہ، جنگل کی آگ مشمولہ دہی تماثیل،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص ۲۶۷
۲۱۔میرزا ادیب، اپنا گھر مشمولہ آنسو اور ستارے،لاہور:مقبول اکیڈمی، س ن، ص ۲۵۴۔۲۵۵
۲۲۔ایضاً،ص ۲۶۴
۲۳۔صالحہ عابد حسین، حالی کی ایک جھلک،علی گڑھ:انجمنِ ترقی اُردو (ہند)،۱۹۵۹،ص ۲۵۔۲۶
۲۴۔عصمت چغتائی، فسادی مشمولہ کلیاں،ص ۱۸۵
۲۵۔رضیہ فصیح احمد، کار برائے فروخت مشمولہ کالا چور،کراچی: اکادمی بازیافت،۲۰۰۹،ص ۳۶۔۳۷
۲۶۔عمیرہ احمد، دوراہا،ص ۱۰۶
۲۷۔امجد اسلام امجد، دُکھوں کی چادر مشمولہ اپنے لوگ،ص ۱۰۳
۲۸۔بانو قدسیہ، پیا نام کا دیا،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴،ص ۱۱۲

۲۹۔ اشفاق احمد، صنم گزیدہ مشمولہ ایک محبت سوڈرامے، ص ۳۵۱

۳۰۔ عمیرہ احمد، دوراہا، ص ۳۵۶

۳۱۔ امجد اسلام امجد، دُکھوں کی چادر مشمولہ اپنے لوگ، ص ۱۲۴

۳۲۔ امجد اسلام امجد، وارث، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۱۴۔۱۱۵

۳۳۔ یونس جاوید، وادیٔ پُرخار مشمولہ رگوں میں اندھیرا، ص ۵۹

۳۴۔ اشفاق احمد، شاہلا کوٹ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۲۴۲

۳۵۔ امجد اسلام امجد، دُھند کے اُس پار مشمولہ اپنے لوگ، ص ۳۰۷

۳۶۔ مظہر الاسلام، گواہ مشمولہ باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۱۰۷

۳۷۔ بانو قُدسیہ، دیمک مشمولہ تماثیل، ص ۱۲۱

۳۸۔ امجد اسلام امجد، دُھند کے اُس پار مشمولہ اپنے لوگ، ص: ۳۲۳

۳۹۔ بانو قُدسیہ، پیا نام کا دیا، ص ۲۷۸

۴۰۔ سعادت حسن منٹو، اکیلی مشمولہ منٹو ڈرامے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۱۹

۴۱۔ اشفاق احمد، اشتباہِ نظر مشمولہ ایک محبت سوڈرامے، ص ۷۴۔۷۶

۴۲۔ عصمت چغتائی، شیطان مشمولہ شیطان، م ن، س ن، ص ۱۷

۴۳۔ مسُعود مفتی، گنجلک مشمولہ تکون، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۸۲، ص ۱۲۷۔۱۲۸

۴۴۔ امجد اسلام امجد، دن، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۴۵۔ اشفاق احمد، زودِ پشیماں مشمولہ ایک محبت سوڈرامے، ص ۶۷۷

۴۶۔ ایضاً، ص ۶۷۹

۴۷۔ یونس جاوید، گھنی چھاؤں مشمولہ اندھیرا اُجالا، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۶۶، ص ۶۱

۴۸۔ اشفاق احمد، میل ملاپ مشمولہ حیرت کدہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۴۳

۴۹۔ صالحہ عابد حسین، حالی کی ایک جھلک، ص ۹۶۔۷۰

۵۰۔ اشفاق احمد، سگنل اور سنگل بینڈ مشمولہ اور ڈرامے، ص ۱۶۸

۵۱۔ اشفاق احمد، پھول والوں کی سیر مشمولہ ننگے پاؤں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰، ص ۵۳۴

۵۲۔ بانو قُدسیہ، دُوسرا قدم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۱۰۴

۵۳۔ حمید کاشمیری، کافی ہاؤس، لاہور: مقبول اکیڈیمی، ۱۹۹۲، ص ۱۸۵۔۱۸۷

۵۴۔ احمد فراز، میرے خواب ریزہ ریزہ، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۸، ص ۱۰

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۶۔۲۷

۵۶۔ اشفاق احمد، آسان سی بات مشمولہ ننگے پاؤں، ص ۱۷۲۔۱۷۳

۵۷۔ بانو قُدسیہ، زرد گلاب مشمولہ فٹ پاتھ کی گھاس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰، ص ۱۱۷۔۱۱۸

۵۸۔ مُستنصر حسین تارڑ، کالاش، ص ۲۹۱
۵۹۔ رضیہ فصیح احمد، بولتے گونگے مشمولہ کالا چور، ص ۸۰
۶۰۔ مسعود مفتی، رویے مشمولہ تکون، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۸۲، ص ۴۹
۶۱۔ انور سجاد، ترش، تلخ، شیریں مشمولہ سورج کو ذرا دیکھ، لاہور: مکتبۂ عالیہ ۱۹۹۴، ص ۱۷۴
۶۲۔ اشفاق احمد، معکوس رابطے مشمولہ ایک محبت سو ڈرامے، ص ۱۳۳۔۱۳۴
۶۳۔ بانو قدسیہ، بھروسا مشمولہ دُوسرا قدم، ص ۱۷۹
۶۴۔ ابصار عبدالعلی، قفس مشمولہ شہ رگ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸، ص ۲۸۔۲۹
۶۵۔ جاوید دانش، ہجرت کے تماشے، لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۳، ص ۵۶
۶۶۔ کوثر علی، آئینۂ حیات، لاہور: عبداللہ پبلی شرز، طبع اول، س ن، ص ۱۰۰۔۱۰۱
۶۷۔ اشفاق احمد، کھیل تماشا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۹۴
۶۸۔ بانو قدسیہ، خانہ بدوش مشمولہ تماثیل، ص ۱۹۳
۶۹۔ عصمت چغتائی، ڈھیٹ مشمولہ کلیاں، ص ۱۹۰
۷۰۔ انور سجاد، گونائی مشمولہ سورج کو ذرا دیکھ، لاہور: مکتبۂ عالیہ ۱۹۹۴، ص ۵۶
۷۱۔ مسعود مفتی، نصیب مشمولہ تکون، ص ۱۰۷۔۱۰۸
۷۲۔ مہر نگار مسرور، ماں بیٹی مشمولہ فلک پیما کے ڈرامے مرتبہ، کراچی: بیت العزیز، ۱۹۸۴، ص ۶۴۔۶۵
۷۳۔ حجاب امتیاز علی، سوکھے پتے مشمولہ سوکھے پتے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹، ص ۷۸۔۷۹
۷۴۔ آغا حشر کاشمیری، افضل کا مکان مشمولہ نیک پروین، لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۸۳، ص ۱۰۱
۷۵۔ اشفاق احمد، حجرِ اسود مشمولہ ایک محبت سو ڈرامے، ص ۲۱۳
۷۶۔ بانو قدسیہ، دیمک مشمولہ تماثیل، ص ۱۲۳
۷۷۔ بانو قدسیہ، فٹ پاتھ کی گھاس مشمولہ فٹ پاتھ کی گھاس، ص ۴۳۶
۷۸۔ بانو قدسیہ، خانہ بدوش مشمولہ دہی تماثیل، ص ۲۱۲
۷۹۔ مہر نگار مسرور، فلک پیما کے ڈرامے مرتبہ، کراچی: ماس پرنٹرز، طبع اول، ۱۹۹۴، ص ۵۴
۸۰۔ بانو قدسیہ، شکائیتیں حکایتیں مشمولہ فٹ پاتھ کی گھاس، ص ۲۵۷
۸۱۔ اشفاق احمد، بہن بھائی مشمولہ حیرت کدہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۷۵
۸۲۔ بانو قدسیہ، فسادی مشمولہ تماثیل، ص ۱۳۵۔۱۳۶
۸۳۔ مُستنصر حسین تارڑ، کالاش، ص ۳۲۲
۸۴۔ یونس جاوید، وادیِ پُر خار مشمولہ رگوں میں اندھیرا، ص ۳۳
۸۵۔ سعادت حسن منٹو، ہتک مشمولہ منٹو ڈرامے، ص ۲۵۷
۸۶۔ امجد اسلام امجد، دن، ص ۳۷۶۔۳۷۵۔

د۔ تانیثیت اور پاکستانی اُردو سوانح اور آپ بیتی

کرۂ ارض پر بسنے والے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک منفرد شخصیت عطا کی ہے اور انسان خود بھی لاشعوری طور پر انفرادیت کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے، کیوں کہ فطری طور پر انسان چاہتا ہے کہ اُس کے نقوش کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ باقی رہیں، اِس تمنا کی عملی شکل اکثر و بیشتر شاعری، روزناموں، بیاضوں اور خصوصاً خودنوشت سوانح عمریوں کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خودنوشت سوانح حیات کسی بھی شخصیت کے داخلی و خارجی احوال و کوائف کو محفوظ کرنے کا ایک معتبر وسیلہ قرار پائی ہے، ڈاکٹر تحسین فراقی کے خیال میں: ''سچی آپ بیتی تو انکشافِ ذات کا عمل ہے۔''[۱] ایک اچھا خودنوشت سوانح نگار واقعات کو پوری ایمانداری سے بیان کرتا ہے اور ادھوری صداقتوں سے بچتے ہوئے نظریات و خیالات کے بجائے حقیقتوں کے بیان پر نظر رکھتا ہے، کیوں کہ: ''دُنیا میں وہ سچی بات بڑی مخدوش ہے، جو آدھی ظاہر کی جائے اور آدھی چھپا ڈالی جائے، دوسری بات یہ کہ مشہور انگریز مثل کہ خواہش تخیل کی ماں ہے، اپنے اوپر صادق نہ ہونے دے، خواہش نے تخیل پر غلبہ حاصل کر لیا اور لکھنے والے نے واقعات کی صورت مسخ کرنا شروع کر دی، تو آپ بیتی سچا نامۂ اعمال ہونے کی بجائے افسانہ یا ناول بن جائے گی، سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہیے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آ کر باآوازِ بلند پڑھ لیں، تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔''[۲] مارگریٹ ایٹ ووڈ اور مایا انجلو نے تو monologue کی شکل میں خودنوشت کو ناول کی نئی فارم قرار دیا، جس میں پلاٹ ضروری نہیں۔ موضوع کی بنت اسے ناول بنا سکتی ہے۔[۳]

خودنوشت سوانح حیات میں نئی نسل کے لیے راہِ عمل بھی متعین کرتی ہے، جس میں لکھنے والا واقعات کو سچائی اور صداقت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اُتارتا چلا جاتا ہے۔ خودنوشت سوانح عمری کے ابتدائی نقوش ابن خلدون کے ہاں ملتے ہیں، جن کی خودنوشت، تاریخ اور آپ بیتی دونوں کے امتزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ فارسی میں تزک تیموری، تزک بابری اِس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مغرب میں ہیروڈوٹس اور زنوفن کے کارناموں میں بھی تاریخ اور سوانح کا امتزاج ملتا ہے۔ رومن عہد میں ملنے والی آپ بیتیاں اعترافی اور نفسیاتی نوعیت کی ہیں۔ سینٹ آگسٹائن کے روحانی و نفسیاتی تجربات پر مبنی *Confessions* اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔[۴] سترہویں صدی میں انگریزی میں لکھی جانے والی زیادہ تر آپ بیتیاں پیورٹین مذہب کے محاسبے کے تحت مذہبی نوعیت کی حامل تھیں۔ انیسویں صدی میں ہربرٹ سپنسر، چارلس ڈارون، رسل اور کارلائل کے نام اہم ہیں۔ جارج بیرو نے آپ بیتی میں افسانے کی آمیزش کی۔ جارج اسٹیورٹ مل نے خالصتاً ذاتی نوعیت کی آپ بیتی لکھی، جو انیسویں صدی کے یورپی خیالات کی غماز ہے۔ جنگِ عظیم کے دَوران بہت سے سپاہیوں نے آپ بیتیاں لکھیں۔ اِن سوانحی کاوشوں کے علاوہ بہت سے خطوط، اعترافات، ڈائریاں اور روزنامچے بھی منظرِ عام پر آئے، اِس ضمن میں ژاں روسو کے اعترافات اہم ہیں، جہاں تک اُردو ادب میں خودنوشت سوانح حیات کا تعلق ہے۔ انیسویں صدی تک اِس صنف میں تحریری

سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا، البتہ بیسویں صدی میں، یہ صنف فروغ پائی۔

ملکوں کا بننا اور ٹوٹنا بہت بڑے تہذیبی نوحے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ قتل وغارت گری میں جہاں بہت سے افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، انسانی بربریت اور استحصال کا نشانہ سب سے زیادہ عورتیں اور بچے بنتے ہیں۔ مخالف ملک یا گروہ کی عورتوں کو جنسی انتقام کا نشانہ بنانا نفسیاتی طور پر برتری کے جذبے کی تسکین بن جاتا ہے۔ جنسی تشدد کے علاوہ بدترین جسمانی تشدد بھی عام ہو جاتا ہے۔ خواتین کے خلاف یہ جرائم و مظالم جنگ اور قحط و فسادات کا لازمہ سمجھے جاتے ہیں اور انسانیت اور تہذیب کی دھجیاں بکھیر دی جاتی ہیں۔ ملکوں کے قیام اور ہجرت کے نتیجے اور فسادات کے دوران تشدد کا نشانہ بننے والی عورتوں کی دادرسی کے لیے بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی لاچار نظر آتی ہیں۔ پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا، جہاں ایک بہت بڑا خدائی معجزہ تھا وہیں نسلِ انسانی کا تہذیبی نوحہ بھی بن گیا، ہندوؤں، سکھوں کے مسلمانوں پر مظالم اور تشدد اپنی آخری حدوں کو چھو گئے۔ نہتے قافلوں پر ظلم کی انتہا کر دی گئی، جن لوگوں نے اس اندوہنا کی کا سامنا کیا یہ کربنا کی اِن کے لاشعور کا حصہ بن گئی، بہت سے خودنوشت سوانح نگاروں نے اپنی داستانِ حیات رقم کرتے ہوئے ہجر کی اِن صعوبتوں کا ذکر شعوری ولاشعوری سطح پر کیا ہے۔ اے۔ حمید نے ''جب امرتسر جل رہا تھا'' میں اسی حقیقت کو منکشف کیا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ فسادات کے دَوران بچ کر آنے والی لڑکیوں کو کوٹھوں کی زینت بنا دیا گیا اور عصمت فروشی پر مجبور کر دیا گیا:

> ''یہ حقیقت ہے اور اِس کی گواہی بھارت کے پرانے ہندو سکھ بھی دیں گے کہ مسلمان بڑی رواداری سے کام لے رہے تھے۔ غیر مسلم عورتوں اور بچوں پر ان کا ہاتھ بالکل نہیں اُٹھا، بلکہ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے محلوں میں سے ہندو سکھ بچوں اور عورتوں کو بہ حفاظت نکال کر سکھوں کے محلوں میں پہنچایا، جب کہ ہندوؤں اور سکھوں کے پاس ایسا کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا، وہ مسلمان عورتوں اور بچوں کے بے دریغ قتل کر رہے تھے، اگر کہیں کسی جگہ مسلمان عورتوں کی عزت اور جانیں بچانے کا واقعہ ہوا ہے، تو اُس کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔''۵؎

ایسے ناگزیر حالات کے باوجود ہمیں اِسی مثالیں بھی ملتی ہیں، جن میں ہندوؤں سکھوں نے سردھڑ کی بازی لگا کر مسلمان عورتوں اور بچیوں کی عزت بچائی اور اُنھیں بہ حفاظت پاکستان کی سرزمین تک پہنچایا، اے۔ حمید نے ایسے ہی ایک نیک انسان کا واقعہ بیان کیا ہے، جس نے ''اُمرتسر کی ایک ہولناک رات'' میں ہندو غنڈوں کے نرغے میں پھنسی مسلمان لڑکی کی عزت کی حفاظت موہن اپنی زندگی داؤ پر لگا کر کرتا ہے:

> ''لوگ اُسے اُٹھا لائے تھے۔ موہن سنگھ نے دِل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس لڑکی کو اِن درندوں سے ضرور بچائے گا، مگر بلرام اور اُس کے غنڈے دوستوں کی آنکھیں شراب پی کر خونی ہو رہی تھیں، یہ بھوکے بھیڑیے کے جبڑوں سے اِس کا تر نوالہ جھپٹنے والی بات تھی۔''۶؎

شہاب نامہ میں قدرت اللہ شہاب نے خواتین کے خلاف استحصالی قوتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ عورتوں پر ہونے والے جنسی تشدد اور جدیدیت کی آڑ میں مادر پدر آزادی کی قائل عورتوں کے انجامِ بد کو بھی بیان کیا ہے، جن کی حیثیت شرفا اور

اکابرین کی اولاد ہونے کے باوجود داشتاؤں کی تھی۔ لاقانونیت اور حیوانیت نے شرفا کا جینا حرام کر دیا تھا، اس حوالے سے شہاب لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں کئی اور شہروں سے بھی جنسی بے راہ روی کی بہت سی خبریں آندھی کی طرح اُٹھیں اور بگولوں کی طرح پھیل گئیں۔ خبریں اس قسم کی تھیں، کہ چند بڑے بڑے مخصوص اور بااقتدار خاندانوں کے نوجوان دن دیہاڑے شریف اور باعزت گھرانوں میں گھس کران کی لڑکیاں زبردستی اُٹھالاتے تھے اور پولیس ڈر کے مارے ان کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھاتی تھی۔'' ۷

ممتاز مفتی نے ''الکھ نگری'' میں قیامِ پاکستان کے دوران ہونے والے فسادات کے نتیجے میں لوٹ مار اور عصمت دری کے واقعات کی نشاندہی کی ہے کہ جہاں عصمتوں کا لوٹنا معمول بن گیا تھا وہاں پاکستانی خواتین کے ایسے گروپ بنائے گئے، جو گھر گھر جا کر اغوا شدہ عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی تحویل میں لے لیتیں، تاکہ اُن کی حفاظت کی جا سکے:

''بن بیاہے لوگوں کے گھر میں ان کا رویہ مختلف ہوتا۔ بڑی بوڑھیاں گھر میں داخل ہو جاتیں، پھر لالٹین اُٹھا کر سارے گھر کی تلاشی لیتیں کہ گھر میں کسی ہندنی کو چھپا تو نہیں رکھا، اگر کوئی ہندنی مل جاتی، تو اُسے ساتھ لے آتیں اور کسی ذمہ دار شیخانی کے سپرد کر دیتیں، یہ لے ماسی اِسے تو اپنے گھر میں رکھ لے، اُنھیں صرف ایک خطرہ تھا کہ ایمن آباد میں کسی ہندنی کی آبرو نہ لٹ جائے، اُس رات شیخانیوں کا جلوس ایمن آباد کی گلی گلی میں گھومتا رہا، اُس رات ایمن آباد سے کل چھبیس ہندنیاں برآمد ہوئیں۔'' ۸

فسادات کے دوران ہونے والے بہیمانہ مظالم کی نشاندہی شہرت بخاری نے اِن الفاظ میں کی ہے:

''ایک عورت کو تین چار رضا کار نکال کر لائے، اِس کے دونوں بازو کٹے تھے، اِس کا جسم ننگا تھا۔ ناک اور سینہ کٹا ہوا تھا، مگر وہ زندہ تھی ___ کیوں؟ شاید اس لیے کہ عبرت کا کام دے سکے۔ اِسے دیکھ کر ایک شخص جو میرے پاس کھڑا تھا اور جو اِس کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا ___ 'اوے ظالموا ے کی کیتا اے ___ ' کہہ کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔'' ۹

سانحہ مشرقی پاکستان کے دوران بھی عورتوں پر جنسی تشدد کیا گیا۔ مسلمان بھائیوں نے اپنے ہی ملک کی بیٹیوں، ماؤں کی عزتوں کو داغدار کیا اور بدترین مظالم ڈھائے، اِس کی نشاندہی ''بُری عورت کی کتھا'' میں کشور ناہید نے کی ہے:

''مشکل سے تیرہ سے پندرہ سال کی تیلی تیلی لڑکیاں، جن کی ابھی چھاتیاں بھی سانس لینے نہیں پائی تھیں، مگر اِن کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی دے رہے تھے، اِن کے گھر والے کہاں تھے، اِن کی نسلیں خراب کرنے کے لیے اِن کے ساتھ حرام کاری کی گئی تھی، وہ بے امان، بے جگہ، بوڑھی گنگا کی گود میں، سوکھے ہونٹ اور سوکھی آنکھیں لیے سرنگوں بیٹھی تھیں۔'' ۱۰

آزادی کے متوالوں اور حریت پسندوں کو بہت سی جان لیوا صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس کا دائرہ اُن کی ذات

سے بڑھ کر اُن کے خاندان کے افراد، خصوصاً عورتوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے، اُنھیں جسمانی و جنسی تشدد کی بدترین صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔عورت کو بربریت اور درندگی کا نشانہ بنائے جانے کی تصویر کشی 'لیلیٰ خالد' میں کی گئی ہے:

ذاتی اور سماجی سطح پر میں عرب لڑکی کی طرح نارمل زندگی گزار رہی تھی۔ چھ سال تک مجھے اپنا ایک فلسطینی کلاس فیلو کہ جو کسی زمیندار گھر سے تھا، پسند رہا۔ پہلے تو اُس کے لڑکیوں سے خصوصی اجتناب برتنے کے روّیوں نے مجھے اِس کی جانب مائل کیا۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ اُس کی لڑکیوں سے نفرت کی نفسیاتی وجہ خود اُس کے سامنے، اُس کی ماں کی اسرائیلیوں کے ہاتھوں عصمت دری تھی جو اُسے بالکل نہیں بھول رہی تھی۔ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب یہ لوگ ۱۹۴۸ میں صدف کے علاقے سے ہجرت کر رہے تھے، جس لمحے وہ خود کمانے کے قابل ہوا، اُس نے اپنی ماں کا ساتھ چھوڑ دیا۔'' ۱۱

میاں بیوی کے نازک رشتے میں پائیداری اور مضبوطی باہمی اعتماد، محبت، اعتبار و عتماد کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ دونوں کے مابین غلط فہمی کو ہوا دی جاتی ہے، ایک کی عدم موجودگی میں اِس کے خلاف دوسرے کے کان بھرے جاتے ہیں، شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے ہیں، بیشتر معاملات میں عورت کا سُسرال خانگی زندگی میں انتشار کا باعث بنتا ہے، اِس کی بنیادی وجہ عورت بہ حیثیتِ ساس، بہو کو اپنا رقیب تصور کرتی ہے۔ لاشعوری طور پر اسے اپنے گھر بھر پر حکمرانی اور بیٹے کے چھن جانے کا خوف ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بہو بیٹے کی ذہنی ہم آہنگی اِس کے لیے اذیت کا باعث بنتی ہے، اِس لیے گاہ بگاہے بیٹے کو بہو کے خلاف اُکسانے سے نہیں چوکتی، اِس کے برعکس بعض بہویں بھی ایسی ہوتی ہیں، جو ساس کے وجود کو ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوئے اِس کا دائرۂ حیات تنگ کر دیتی ہے، ایسی صورتحال میں دونوں کو ایک دوسرے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کو گوارا کرنا چاہیے۔ رشیدہ عیاں ازدواجی زندگی کی ناآسودگی، شوہر کے معاشقے، دوستانے، بیوی بچوں اور گھر سے عدم دلچسپی کے موضوع پر لکھتی ہیں:

اندھیرے اور اُجالے میں کام ہوتے ہیں
یہ زوجیت میں بھی رخنے تمام ہوتے ہیں
وفا کے نام کے وادی میں پھول کم کم ہیں
کہ اعتبار و یقین کے چراغ مدھم ہیں
پڑے جو جبر کی، احساس کے بدن پر دھوپ
تو پھر کہاں کی کوملتا، کہاں کا روپ سروپ ۱۲

خانگی زندگی کی ناآسودگی کا ایک اور اہم ترین سبب شوہر کی بیوی بچوں سے اور گھر کے فرائض سے عدم دلچسپی ہے، جس کی بنیادی وجہ اِس کی دلچسپی کا محور و مرکز کسی اور کا ہونا ہے۔ مرد کے معاشقے غیر عورتوں سے دوستانے، سیر سپاٹے خانگی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں، رشیدہ عیاں زندگی کی نارسائی اور تنہائی کا کرب، شوہر کی عدم توجہی اور بیگانگی کی غمازی کرتے ہوئے کہتی ہیں:

میں سوچتی ہوں کہ یہ ساری زندگی کے کھیل

کئی ہیں سچ تو کچھ اصلِ حیات سے بے میل
میں سوچتی ہوں، جو تنہائیاں مقدر تھیں
تو جلوتوں کی عطائیں فضول مجھ پر تھیں ۱۳؎

باپ کی لاپروائی، عدم توجہی اور ماں کے ساتھ ناروا سلوک نے سارا شگفتہ کے دِل میں ہمیشہ کے لیے مردوں کے خلاف نفرت بھر دی، اس لاشعوری زہر نے، بالآخر اُس کی زندگی کو ڈس لیا: ''میں نے مرد سے ہمیشہ نفرت کی ہے، اُس کی وجہ میرا باپ ہے۔ یہ بات سارا برصغیر جانتا ہے اب تک تاریخی طور پر یہ بات ہی نوٹ ہے۔'' ۱۴؎

باپ جب اپنی اولاد میں فرق روا رکھتا ہے یا کسی ایک بچے کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے یا کسی کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے، تو نہ صرف بچے کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے، بلکہ وہ بہت سی نفسیاتی پیچیدگیوں سے بھی دوچار ہوتا ہے، اپنے باپ کے بارے میں انیس ناگی کا کہنا ہے کہ اُن کے غم و غصے سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔ ہر وقت اپنی ضروریات کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے کہ ماں اپنے بچوں پر توجہ نہ دے پاتی اور ہمیشہ گھبراہٹ کا شکار رہتی، اگر اُن کی روٹین میں ذرا سی چوک ہو جاتی، تو پورا گھر سر پر اُٹھا لیتے تھے:

''میں بچپن ہی سے طرح طرح کی محرومیوں کا شکار تھا۔ میرے والد میرے سوا اپنے ہر بیٹے کے لیے سفر کے دوران خریدا ہوا کوئی تحفہ لاتے، میں ان کی طرف دیکھتا تو وہ خاموش ہو جاتے، اگر میں دبے لفظوں میں احتجاج بھی کرتا، تو وہ بے حد دُرشت زبان استعمال کرتے۔ گھر میں کسی کو اونچا بولنے کی اجازت نہیں تھی، اگر اتفاق سے کوئی اونچا بولتا اور میرے والد کی نیند مخل ہوتی تو شامت آ جاتی، وہ اتنے غصیلے تھے کہ میں نے ابھی تک اس مزاج کا آدمی کہیں نہیں دیکھا۔'' ۱۵؎

مرد کی طرح عورتیں بھی، جب بے راہ روی کا شکار ہو جائیں، تو اُن کے معاشقے، اُن کی شادی شدہ زندگی کو برباد کر دیتے ہیں، کیوں کہ شوہر کو بیوی کی بے وفائی شدید نفسیاتی صدمے سے دوچار کرتی ہے، اُس کا تصورِ ذات، احساسِ کمتری کی شکل اختیار کر جاتا ہے، اِس کا اشارہ ہمیں ''یادوں کی برات'' میں ملتا ہے:

''اُس کی متواتر بے اعتنائی سے ابرار کا دل ڈوبنے لگا، مجھ سے اُن کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی، میں نے کہا ابرار اب میں کل ہی بڑی حویلی میں اُٹھ جاؤں گا۔ ابرار نے کہا اب آپ یہاں سے اُٹھ جانا بے کار ہے، اِس کا دل آپ پر آ گیا ہے۔ میں اُس کی نظروں سے گر چکا ہوں، قرآن مجید کی قسم ایسی بے وفا عورت پر میں لعنت بھیجتا ہوں، اب آپ یہاں رہیں، میں بڑی حویلی میں اُٹھ جاؤں گا، میں نے ابرار کو گلے لگا لیا اور کہا نہیں تم بڑی حویلی میں ہرگز منتقل نہیں ہو سکتے، تمھیں یہیں رہنا پڑے گا۔'' ۱۶؎

''مٹی کا دیا'' میں میرزا ادیب نے گندم چھان پھٹک کرنے والی بیوہ ماسی خیراں کی اکلوتی بیٹی پر سُسرال کے مظالم کا تذکرہ کیا ہے:

''وہ رو رو کر بتانے لگی کہ میری لڑکی بڑی دکھی ہے۔ سارے ٹبر کی جھڑکیاں سہتی ہے، آدھی

رات تک کام کرتی ہے، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ میں اُس کے سُسر کو خط لکھنا چاہتی ہوں۔ وہ میت کا مولبی ہے۔ دِل میں رحم آ جائے گا، تو میری لڑکی کو چھوڑ جائے گا____ پھر میں اُسے کدی نہیں جانے دوں گی، کدی وی نہیں۔''۱۷

رشید امجد ''تمنا بے تاب'' میں بیوی کی آوارگی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''خالدہ تو خود بادہ شبانہ کی سرمستیوں پر فریفتہ تھی۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں ہر شام، ہر رات جشن منایا جاتا۔ خالدہ کو کبھی کبھی تو ایک ساتھ کئی کئی جگہ سے بلاوے آتے۔ ہر دعوت نامے کی پیشانی پر پہلے میرا نام اور بعد میں خالدہ کا نام آیا، لیکن میں جانتا تھا کہ سوسائٹی میں مجھ سے کہیں زیادہ خالدہ کی مانگ ہے، ایسی سوسائٹی میں جہاں پانی کم پیا جاتا، شراب زیادہ پی جاتی وہاں میرا کیسے گزر ہوتا۔''۱۸

احمد بشیر نے بھی سماجی و خانگی سطح پر عورت کے استحصال کی تصویر کشی کے علاوہ لڑکی کے میکے والوں کا لڑکے والوں پر حد سے بڑھا ہوا اعتماد اور بیٹی کے بارے میں غیر ذمہ دارنہ رویے کی نشاندہی کی ہے:

''اَب تک نور پور کی لڑکیوں کے بارے میں جمال نے کبھی سوچا ہی نہ تھا، وہ تو محض خدمتگار ہوتی تھیں۔ گرمیوں میں وہ گھڑے بھر بھر کر تپتی ہوئی چھتوں پر پانی چھڑکتیں اور اُنھیں مردوں کے لیے ٹھنڈا کرتیں، جب وہ گھر آئیں۔ سردیوں کو وہ رضائیاں اور گدے سیتیں اور سوت کاتتیں، تاکہ مردوں کے لحاف نرم ہوں۔ وہ فرش دھوتیں، کھانے پکاتیں، برتن مانجتیں، حقے بھرتیں اور بھینسوں کے لیے گتاوے کرتیں، اِن خدمات کے عوض اُنھیں پھٹا پرانا پہننے کو اور جوٹھا موٹ کھانے کو مل جاتا پھر اُن سے پوچھے بغیر اُن کی شادیاں کر دی جاتیں اور وہ بچوں کی پرورش اور سُسرال اور خاوند کی تابع داری میں عمریں گزار دیتیں۔ باپ ان کے حق مہر بھی نہ لکھواتے۔ اپنی وراثت میں اُنھیں کوئی حصہ نہ دیتے اور خاوند بیویوں کو بے سہارا چھوڑ جاتے۔ نور پور کی لڑکیوں کو کھیل تماشے کی فرصت کہاں تھی، اِن کا تو اپنے خاوندوں سے تنہائی ملنا بھی دشوار ہوتا تھا۔''۱۹

خانگی و ازدواجی زندگی کے مسائل کے بنیادی عوامل کی نشاندہی کرتے ہوئے کشور ناہید نے ''بُری عورت کی کتھا'' میں لکھتی ہیں کہ عورت سے عام طور پر یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہی ایثار و قربانی اور مفاہمت سے کام لے:

''میاں بیوی کے رشتے میں عورت کی وفا اور مرد کی خواہش کے مطابق جنسیت کے لیے تیار ہو، اِس کو خوش کرے اور خوش رکھے اور اِس کو ناخوش کرنے پہ زندگی کے مایوس کن لمحات کے لیے تیار ہو جائے، گویا طاقت کا سرچشمہ مرد کر ثابت کرنے کے لیے سارا معاشرتی ڈھانچہ مرتب کیا جاتا ہے، اِسی لیے عورت کا معاشی طور پر آزاد ہونا یا مساوی انتظامی سطح پر آنا یا سماج میں عقلی سطح پر تسلیم کیا جانا، یہ سب منفی رویے قرار دیے جاتے ہیں اور قانونی سطح پر کسی قسم کی مساوات کے عمل کو روکنے کا ماحول بنایا جاتا ہے۔''۲۰

حمیدہ اختر نے شادی بیاہ کے گیتوں میں دلہن کے ماں باپ، بہن بھائیوں کو تضحیک کا نشانہ بنائے جانے کی سماجی برائی کی طرف اشارہ ہے، جس کے مطابق لڑکے والے لڑکی اور اُس کے ماں باپ بہن بھائیوں کو اپنے سے کمتر اور حقیر گردانتے ہیں:

بہن کھلونا، بھائی تماشہ
آگے تانگہ پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا (تالیوں کی گونج) ۲۱

اِسی طرح لوک داستانوں اور عشقیہ قصوں میں بھی عورت ہی کو ظالم، خود غرض اور مرد کو مظلوم دکھایا جاتا ہے:

''صحرا میں اونٹ کی نکیل تھامے مجنوں جا رہا تھا کہ محمل سے منہ نکال کر دلیلیٰ نے ڈرامائی انداز میں کہا، 'پیارے مجنوں مجھے بھوک لگی ہے'۔ مجنوں نے جواب دیا 'لیلیٰ یہاں کھانا نہیں مل سکتا'، لیکن لیلیٰ نے اصرار کیا۔ بھوک بدستور باقی ہے، مجنوں بولا 'دل و جگر حاضر ہیں'۔ اب ثابت ہوا کہ عورت دراصل مردُم خور ہوتی ہے، کیوں کہ لیلیٰ نے یہ پیش کش قبول کر لی اور پھر کہا 'پیارے مجنوں مجھے پیاس لگی ہے'، بے چارے مجنوں نے اپنا مغز کھول کر اپنا خون نکالا، جس کا پیالہ لیلیٰ پی گئی۔'' ۲۲

مرد کی حاکیت والے معاشرے میں عورت کی نفیِ ذات اور تحقیر معمولاتِ زندگی میں شمار کی جاتی ہیں۔ عورت ہی کو مرد کی ہر کجی اور خرابی کو برداشت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، لیکن جو خرابی کا اصل محرک ہے اُسے ہمیشہ ستائش و ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا درس دیا جاتا ہے، تاہم معاشرے میں ایسے انسانوں کی کمی نہیں، جو عورت کی عزت اور احترام کو عزیز رکھتے ہیں۔ شہرت بخاری نے 'کھوئے ہوؤں کی جستجو' میں ایسے شخص کی مثال دی ہے، جو مادیت پرستی سے قطع نظر، انسانیت کی معراج پر ہے:

''اُس کی زندگی کا سب سے نازک اور اہم مرحلہ اِس کی بیوی تھی ___ وہ نابینا تھی پیدائشی، جب مجھے اِس نے بتایا کہ 'میری لگائی تو اندھی ہے جی' ___ تو میں حیران رہ گیا کہ یہ کیسا نیک خُو انسان ہے کہ ایسی عورت کے ساتھ اُس نے ساری عمر گزار دی کہ جو نہ دیکھ سکتی ہے اور بچے جن سکتی ہے ___ حالاں کہ مختار کو بچے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے ایک بھتیجے کو لے کر بیٹا بنایا، مگر جب وہ بچہ پانچ چھ برس کا ہوا تو اُس کی ماں واپس لے گئی یہ مجھے بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ رات کو میرے گھر سے فارغ ہونے کے بعد مختار اپنے گھر جا کر کھانا پکاتا ہے، کبھی کبھار وقت ملے تو دوپہر کو جا کر پکا آتا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے ناخوش نہیں تھا، بلکہ ہر ممکن خدمت کرتا تھا۔'' ۲۳

گھریلو تشدد کی بدترین صورت عورت پر ذہنی اذیت کے علاوہ جسمانی و جذباتی سطح پر جبر و تشدد ہے۔ کہیں مٹی کا تیل چھڑک کر جلا دی جاتی ہے اور اسے چولہا پھٹنے کے واقع سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ کبھی گھریلو اختلاف کی تمام تر ذمہ دار ٹھہرا

کر شدید ذہنی و جسمانی تشدد کے علاوہ قتل کر دی جاتی ہے، کبھی اسے ناجائز تعلقات اور غیرت کے نام پر مار دینے کے بہانوں کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ ساس، نندوں، جیٹھوں دیوروں کا ہر وقت شوہر کو بیوی کے خلاف اُکسانا اور زہر اُگلنا ہی ان بھیانک نتائج کی صورت میں سامنے آتا ہے اور مرد بھی ایسے اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے ہر طرح کے ظلم ڈھانے اور اذیتیں دینا اپنا حق تصور کرتا ہے، اِس کی نشاندہی امرتا پریتم نے ''ایک تھی سارا'' میں کی ہے:

''اُس گھر میں تین برس رہی۔ ساس بوٹیاں گن کر رکھا کرتی تھی۔ مگر گھر سے قدم باہر نکالنا نہیں جانتی تھی۔ اول تو برقعہ پہنا کرتی، تنہا باہر نہیں نکلا کرتی تھی۔ اُسی گھر کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔ تقریباً رات کے آٹھ بجے میرے بھائی نے مجھے آکر اطلاع دی کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں جنازہ میں شرکت کے لیے تیاری کرنے لگی۔ میرے شوہر نے کہا۔ تم جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتیں۔ آج انسان نہیں ایک کتا مر گیا ہے۔۔۔، میں نے کہا۔۔۔ زیادہ خباثت کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ پھر اُس نے پائپ سے مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو رات کے دو بج رہے تھے۔۔۔، میں نے دیوار پھلانگی اور بھاگتی ہوئی اپنے والد کے جنازہ تک پہونچی اور میت سے لپٹ کر رونے لگی۔۔۔، گھر واپس آئی۔ شوہر صاحب نے مجھے پھر پائپ سے مارا۔ میں ہی کیا، پوری سوسائٹی عورت کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ بس کہیں کہیں دوپٹوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔۔۔، ہم تو بن آس کی آنکھیں ہیں۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ عورت تو کھیتیاں ہوتی ہیں۔۔۔ اُن سے پوچھو۔۔۔ کبھی کسی کسان نے اپنی کھیتی کو اجاڑا ہے۔۔۔ کسان کی تو پوری زندگی کا دارومدار کھیتی پر ہوتا ہے۔'' ۲۴

''ایک تھی سارا'' سُسر ال اور شوہر کے مظالم اور خانگی زندگی کے مسائل کی نشاندہی کی ہے:

''میں نے خاموشی سے ٹیکا نتھ اُتار کر رکھ دیا اور دوسرے کپڑے پہن لیے۔ شادی کے پہلے روز شاعر صاحب فرمانے لگے تم اکیلی باہر آجا نہیں سکتیں۔ یہ ہمارے گھروں کا دستور ہے۔ مجھے پڑوس تک جانے کی اجازت نہیں تھی، شادی کے ایک ہفتہ بعد ساس، نندوں کی نفرتوں کی وجہ سے شاعر صاحب نے مجھے اتنا مارا کہ مجھے زمین پر لٹا کر میرے سینے پر کودنے لگا، مجھے کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی میرے ہر آنے والوں پر شک کیا جاتا تھا۔ میں تمام گھر والوں کے کپڑے دھوتی، بوٹ پالش کرتی۔ چھ نندیں مجھے مل کر گالیاں نکالتیں اور شوہر صاحب تو ایسے بدلے کہ جیسے لونڈی خرید کر لائے ہوں۔'' ۲۵

میریٹل ریپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ناآسودگی سارا شگفتہ کے بے باک قلم نے نہ صرف نشاندہی کی ہے، بلکہ علامتی انداز میں اپنے دَور کی عورت کے خانگی و ازدواجی مسائل کی عکاسی بھی کی ہے، جسے معمولاتِ زندگی کا نام دے کر یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے نام ایک خط میں لکھتی ہیں:

''بیدی! میں ایک جاہل کنواری ہوں! سامنے دہلیز پر میرے بچے کا قدم لکھا ہے اور اُس

کے قدم کی لکیروں پر میں نے اُس کے باپ کا نام نہیں لکھا۔ سوچا، پہلے تمھیں خط لکھ دوں۔ پھر مٹی کو پڑھوں۔ تمہاری زندہ تحریریں اور وقت کے کشکول میں، جو تمہارے آج کے دن میں ایک 'لمبی لڑکی' ہوں، لیکن میں پھیرے لگاتے ہوئے دوہری نہیں ہوئی کہ میرے پیٹ میں کسی کی خواہش پل رہی تھی۔ میری دادی تو صدیوں سے دیکھ رہی ہے کہ میں اُمید سے ہوں، لیکن میرے یہاں کوئی جسم نہیں ہو پاتا۔ میری ماں نے ایک بوڑھا دیوتا جنم دے رکھا ہے جو روز مجھ سے ہم بستری کی کوشش میں رہتا ہے، لیکن میں کنواری ہی رہ جاتی ہوں۔''۳۶

سر رضا علی نے ساس بہو کے رشتے اور سُسرال کی زندگی کے مسائل، بیواؤں، مطلقاؤں کی زندگی کی مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے۔ سر رضا علی نے ساس بہو کی ازلی رقابت کی نفسیاتی توجیہ بیان کی ہے:

''ہمارے ملک میں عموماً بیٹا شمع ہوتا ہے اور ماں پروانہ۔ بیوی کے آجانے سے ایک ہی معشوق کے دو عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ماں کی محبت اور طرح کی ہوتی ہے اور بیوی کی محبت اور طرح کی، مگر قانونِ قدرت پر انسان فتح حاصل نہیں کر سکتا۔ رشک کا مادہ محبت کی جان ہے۔ ہمارے ملک میں ساس بہو دونوں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں، اگر کوئی ایک گھر کا انتظام کرنا اپنا استحقاق سمجھتا ہو۔ وہاں بدمزگی پیدا ہونا لازمی ہے:

بیٹے نے شادی کا تقاضہ نہ کیا تھا　　کیا لڑکی نے خود بیاہ کا پیغام دیا تھا

انسان ہے اس کے بھی زباں اور ذہن ہے　　لونڈی نہیں باندی نہیں بیٹے کی دلہن ہے

ہمارے ملک میں ساس بہوؤں کے جھگڑے کا انسداد کی میری سمجھ میں صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ کسی لڑکے کی ماں کے کہنے سے اُس وقت تک شادی نہ کرنا چاہیے، جب تک لڑکا خود اپنا اور اپنی بیوی کا خرچ اُٹھانے کا قابل نہ ہو جائے۔''۳۷

شادی محض جنسی خواہشات کی تکمیل کا نام نہیں، بلکہ یہ سماج کی مضبوط ترین بنیاد ہے۔ نکاح کے نتیجے میں عورت کی تمام تر ضروریات کا خیال رکھنا مرد کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ مرد کو گھر کے سربراہ کا درجہ بھی اُس کے اِس فرض کی ادائیگی کی بنا پر دیا جاتا ہے، جو مرد عورت کو محض اپنی خواہشات کی تکمیل، بچے پیدا کرنے اور اپنے اور گھر والوں کی خدمت گار، غلام اور لونڈی سمجھتے ہیں وہ اپنی حاکمیت کے زعم میں ہر طرح کا خانگی تشدد روا رکھتے ہیں۔ مینڈا سائیں میں جہاں عورت کے وقتی معاشقے کے ہاتھوں اپنی اولاد اور شوہر کو داؤ پر لگا کر محبت اور عشق کے نام پر گھربار کی دھجیاں بکھیرنے کا بیان ہے وہیں جاگیردارانہ نظام کے پروردہ مرد کی عیاش طبعی، حد سے بڑھی ہوئی حاکمیت اور اذیت پسندانہ و متشددانہ رویے کی عکاسی بھی کی گئی ہے، ایسے مرد عورت کو محض لمحاتی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہوئے، نت نئے شکار کے متلاشی ہوتے ہیں، اُن کے خیال میں عورت صرف اور صرف پاؤں کی جوتی ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے تہمینہ کو اُس کے شوہر کی پہلی بیوی شیری، جو اپنے شوہر کے ہر طرح کے مظالم برداشت کر چکی ہوتی ہے، سے آگاہ کرتی ہے: ''وہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا، وہ تمہاری زندگی کو اِسی طرح برباد کر دے گا، جس طرح اُس نے میری زندگی برباد کی، اُس نے مجھے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی کہ مصطفیٰ

نہایت غصیلہ اور خطرناک انسان ہے۔ وہ بہت سی معمولی باتوں پر شدید تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہے، مثلاً اگر تم نوکر سے گرم پانی کا کہنا بھول جاؤ یا اُس کے کپڑے استری ہونے میں دیر ہو جائے۔''۲۸؎ اسی طرح خود پر ہونے والے تشدد کی تصویر کشی کرتے ہوئے تہمینہ کا کہنا ہے کہ معمولی باتوں پر اُسے تشدد کا نشانہ بنانا، اُس کے شوہر کا معمول تھا۔ ایک روز ایسی ہی معمولی بات پر اُس نے نہایت بیدردی سے مارنا شروع کر دیا: ''اُس نے میری دائیں کلائی مڑوڑی اور مجھے گھٹنوں تک جھک جانے پر مجبور کر دیا، یہاں تک کہ تکلیف کی شدت سے میرے منہ سے کراہ نکلی، تو اُس نے مجھے تحکمانہ انداز میں خاموش رہنے کا حکم دیا، تا کہ گھر کے لوگ سن نہ سکیں، پھر اُس نے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو میں نے اپنے بازو کو سہلانا شروع کر دیا، جس میں شدید درد تھی، اُس نے پھر سے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ جب انیس (میرا پہلا شوہر) ہمبستر ہوتا تھا، تو تمھارا ردِ عمل کیا ہوتا تھا۔''۲۹؎ اپنی زندگی کے تلخ تجربات کی نشاندہی کے علاوہ مصطفیٰ کے الفاظ میں فیوڈل سسٹم کے پروردہ لوگوں کے عورت خصوصاً بیوی کے متعلق خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے اکثر قرآن کا حوالہ استعمال کرتا اور اُس کی خود ساختہ تشریح کرتا:

> ''ایک فیوڈل آقا، جس طرح اپنی زمینوں سے محبت کرتا ہے، اُنھیں کاشت کرتا ہے، اُن کی حفاظت کرتا ہے اور اگر زمین بنجر ہو جائے، تو اُنھیں چھوڑ دیتا ہے، اس لیے اُس کے نزدیک زمین قوت و طاقت، عزت و جائیداد کے مترادف ہوتی ہے۔ میں قرآن کی شرح مختلف انداز میں کرتا ہوں۔ میرے نزدیک زمین محض کھیتی ہے اور کاشت کی جائے تو پیداوار دیتی ہے۔''۳۰؎

ہمارے معاشرے میں عورت جبر و استبداد کی شکار ہے، اِس کی بنیادی وجہ سماجی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی سطح پر اُس کے جائز حقوق سے محرومی ہے، عورت خواہ پڑھی لکھی ہو یا اَن پڑھ، کسی نہ کسی سطح پر ذہنی و جسمانی اذیتوں کی شکار ہوتی ہے، اِس استحصال کی بنیادی وجہ عورت کو کمتر و حقیر جانتے ہوئے، اُس کے جائز حقوق سے محرومی ہے۔ رشیدہ عیاں اپنی خودنوشت سوانحِ عمری ''میری کہانی'' میں عورت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''سوچتی ہوں۔ ہم عورتیں تو زمانہ قدیم سے پتھریلی راہوں پر چلتی آئی ہیں اور آگ پر چل کر اگنی پر کھشا دیتی رہی ہیں۔ ہم جیسیوں کے لیے کیا پتھر، کیا انگارے۔ یہ زندگی جو سب سے بڑی معلمہ ہے۔۔۔ پتھروں پر چلنا، کڑوے گھونٹ پینا، حصارِ آتشِ ماحول سے گزرنا سکھا دیتی ہے، اِس کی تپش کی ساڑھ جسم پر نہیں۔۔۔ روح پر پڑتی ہے۔ جسم تو بظاہر، سجا، سنورا، خوب صورت تاج محل نظر آتا ہے، لیکن روح میں، تمناؤں اور جذبوں کے قبرستان کی ویرانی ہو ہو کرتی ہے۔''۳۱؎

''ایک تھی سارا'' میں معاشرے کے ناسوروں کے خلاف بھی شدید نفرت کا اظہار ملتا ہے، جو عورت کو محض کٹھ پتلی سمجھتے ہیں، اُن کے نزدیک عورت انسان نہیں، بلکہ شے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے مرد عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہوئے اُس کی عزتِ نفس کی دھجیاں بکھیرتے ہیں، انانیت کے نشے میں وہ ہر طرح کا ظلم روا رکھتے ہیں۔ سارا شگفتہ اِس جبر کے خلاف واشگاف لفظوں میں اپنے باغیانہ رویے کا اظہار کرتی ہیں: ''امرتا! جھوٹا تعلق مجھ سے نہیں رکھا جاتا لوگ ستر ستر سال گزار دیتے ہیں ایک ساتھ، لیکن دل میں اُن کے کینہ ہوتا ہے یہ کب اسلام نے کہا ہے کہ تم جبر کے تحت زندگی گزارو، اگر عورت کو

یہ لوگ ایک ہی جگہ پر مرکھپ جانے کو کہتے ہیں، تو اسلام میں طلاق کیوں رکھی گئی؟، میں انسان ہوں جائیداد نہیں اور اگر کوئی مجھ، یعنی عورت کو انسان نہیں سمجھتا تو وہ آدمی زیادہ دنوں تک عورت کے دن پر نہیں بھونک سکتا۔''۳۲ خانگی تشدد کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''عزت کی بہت سے قسمیں ہیں گھونگھٹ، تھپڑ، گندم، عزت کا سب سے چھوٹا اور سب سے بڑا حوالہ عورت ہے، گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک کچھ بھی ہمارا نہیں، عزت ہمارے گزارے کی بات ہے، عزت کے نیزے سے ہمیں داغا جاتا ہے عزت کی کئی ہماری زبان سے شروع ہوتی ہے کوئی رات ہمارے نمک چکھ لے تو ایک زندگی ہمیں بے ذائقہ روٹی کہا جاتا ہے، تم ڈر میں بچے جنتی ہو اسی لیے آج تمہاری کوئی نسل نہیں تم جس کے ایک بند سے پکاری جاتی، تمہاری حیثیت میں تو چال رکھ دی گئی ہے ایک خوبصورت چال، جھوٹی مسکراہٹ تمہارے لبوں پر تراش دی گئی ہے، تم صدیوں سے نہیں، ہنسیں تم صدیوں سے نہیں روئیں، کیا ماں ایسی ہوتی ہے کہ مقبرے کی سجاوٹ کہلوائے تمہارا نمک کیا ہوا!، عورت تو کبھی شہید نہیں ہوئی تم کون سی نماز پڑھ رہی ہو، تمہارے بچے آج تم سے ضد نہیں کرتے تم سے زنا کرتے ہیں تم کس کنبہ کی ماں ہو؟ زنا بالجبر کی؟۔''۳۳

حمیدہ اختر حُسین رائے پوری نے ہندوستانی عورت کی نفسیات کی بھی عکاسی کی ہے، جو مرد کے ساتھ ستی ہونے کو ترجیح دیتی ہے، کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ اُسے کن معاشرتی مسائل اور سماجی ناہمواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مرد اپنے احساسِ محرومی، عدم اعتمادی اور ضمیر کی ملامت کے ہاتھوں مجبور قیاس آرائی کے تحت اپنے بچوں کو قتل کر دیتا ہے اور خودکشی کرنے لگتا ہے، تو بیوی بھی زہر پی لیتی ہے، صرف بوڑھی ماں اپنے ناتواں کندھوں پر اولاد کا دُکھ سہنے کے لیے رہ جاتی ہے، یہی شخص ضمیر کی خلش کو کسی اور طریقے سے بھی مٹا سکتا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو عقلِ کل اور گھر کا سربراہ ہونے کے نشے میں سارے گھر کی جان لے لی:

''محمد عاقل خوش نویس نے اپنے تین عدد بچوں اور بیوی کو زہر پلا کر خود زہر پی لیا سب کے سب ختم ہو گئے۔ صرف ایک بوڑھی ماں زندہ گھر میں ملی۔ ایک پرچہ دیوار پر مضمون کا لگا ہوا پایا گیا، اِن سب کی موت کا ذمہ دار میں ہوں کہ میں نے اپنے ایک دیرینہ محسن ظفر عمر کے ساتھ اِس قدر بڑی بداخلاقی کی کہ اُن کی کتاب 'بہرام کی رہائی' کا مسودہ کوٹھی سے چُرا کر لایا اور چھپوا لیا میرا ضمیر مجھے ہر لحہ ملامت کرتا رہا ہے۔ یہ میرے بچے آخر کو محمد عاقل کے ہیں یہ بھی بڑے ہو کر ضرور اپنے کسی محسن کو دھوکا دیں گے۔ میں اپنی بیوی کو زہر پلانا ہرگز نہ چاہتا تھا مگر اُس نے زبردستی ہاتھ سے چھین کر پی لیا ہے۔ اب میں خود اپنا خاتمہ کر رہا ہوں۔ خدا کرے میرے محسن ظفر عمر صاحب مجھ کو دل سے معاف کر دیں۔ محمد عاقل یہ خبر پڑھ کر جب میں اُن کے گھر گیا اور اُس ضعیف ماں کی تڑپن دیکھی تو کئی دن نہ کھایا جاتا نہ رات کو سویا جاتا۔''۳۴

عورت کا استحصال ہر خطے، ہر معاشرے میں کسی نہ کسی انداز میں موجود ہے، احمد بشیر نے بنگالی لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی کے مسائل کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح جائے ملازمت پر اُن کے استحصال کے علاوہ گھر میں شوہر اور سُسرال کے مظالم ہونے کے باوجود اُس کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہوتی، اسٹوڈیو میں فلم، ڈرامے اور اسٹیج میں کام کرنے والی لڑکیوں کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے علاوہ جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے:

''کالی ناتھ بیز جی میوزک ڈائریکٹر تھا اور ہر وقت غصے میں بھرا رہتا، مگر وہ ارونا گھوش پر لٹو تھا اور بنگالی ہندوؤں کے رواج کے مطابق اُس کے ساتھ مالکانہ سلوک کرتا تھا۔ باقی لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کے مالکانہ سلوک کو نارمل سمجھتی تھیں اور بعض تو اپنی تنخواہیں بھی اُن کے حوالے کر کے سارا مہینہ اُن سے ٹکا ٹکا مانگ کر گزارہ کرتیں یا سب کچھ اُن کے کپڑوں اور اُن کی شراب پر خرچ کر دیتیں۔ نشے میں کبھی کبھی اُن کے عاشق اُن کی ٹھکائی بھی کر دیتے، پھر جب دال بھات کی تھالیاں لگ جاتیں تو ہو آنسو پونچھ کر کھانے اور کھلانے میں لگ جاتیں۔ یہ عورتیں شوہروں کے زاویے سے دُنیا کی بہترین عورتیں تھیں۔ یہ بھوکے اور یتیم بچوں کا ایک گروہ تھا، جس کے بارے میں جنسی زاویے سے کچھ سوچا ہی نہ جا سکتا تھا۔''[۳۵]

رشیدہ عیاں نے منظوم خود نوشت سوانح عمری ''میری کہانی'' میں اُن سماجی کجیوں کی نشاندہی بھی کی ہے، جب غربت و افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر عزتوں و عصمتوں کے سودے کیے جاتے ہیں:

ہے پیٹ ہے تو بڑا مسئلہ زمانے میں
ہیں سب اضافی جو قدریں ہیں اس فسانے میں
جو ان لڑکی، محل میں قبول ہو جائے
تو 'پال پوس' کی قیمت وصول ہو جائے
وہ پانچ دس رُپے، بیٹی جو پا رہی ہے 'بگار'
اسی کو لینے پہاڑوں سے آتے ہیں ہر بار
چڑھائی چڑھ کے پہاڑوں کی گھر کو جاتے ہیں
زمیں پہ چھوڑ کے شمس و قمر کو جاتے ہیں
رقم جو ملتی ہے، چلتی ہے آٹھ ماہ تلک
وہ خون بیچ کے لیتے ہیں تیل اور نمک[۳۶]

جنسی بے راہ روی یا عادتاً جنسی آلودگیوں میں ملوث ہونا یا پیسوں کے عوض عصمتوں کو داؤ پر لگانے کے علاوہ ہسپتالوں اسکولوں، دفتروں اور گھروں میں عورت کے جنسی استحصال کی مختلف صورتوں کی وضاحت ''بھٹکے کا دِل'' میں کی گئی ہے:

''اس زینت پال پر طنز کرنا گری ہوئی بات ہے، اسی طرح یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ پرائیویٹ ہسپتال کی تمام نرسیں اسی طرح راتیں گزارتی ہیں۔ یہ بات غلط ہے، کیوں کہ

بہتوں نے فدا محمد اور جمال کو دھتکارہ بھی بتایا، مگر کسی نے بھی اُن کے لیے مصیبت پیدا نہ کی، کسی ڈاکٹر سے کسی پولیس والے سے اُنھوں نے اُن کی شکایت نہیں کی، وہ خود بھی ہنگاموں سے ڈرتی تھیں۔ جھگڑے اِن کے چاروں طرف پھرتے تھے اور وہ ہر ایک کا مقابلہ نہ کرسکتی تھیں، بعض اِن میں سے تجربے کے بعد ہوشیار بھی ہوگئی تھیں، اُنھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو قبول کرلیا تھا اور وہ چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی شکریے کے ساتھ قبول کرلیتی تھیں، کیوں کہ پیٹ کا جہنم وقار اور عزت کو جلا دیتا ہے اور وہ پیٹ بھی، جس میں کسی کا ڈالا ہوا جہنم بھڑکنے لگ جاتا تھا، پھر اُن کی زندگیاں تباہ ہوجاتیں، اُن کے خطرات بہت زیادہ تھے، اِس لیے ہسپتالوں میں دو چار ہی اپنی مجبوریوں کے آگے ہتھیار ڈال سکتی تھیں اور ایسی بے کسی سکولوں دفتروں اور گھروں میں بھی ہوتی ہے، ان کی جلتی ہوئی ہڈیوں پر بھی کوئی تیل نہیں ڈالتا۔ عورتوں اور عورتوں میں مجبوریوں کے حوالے سے کوئی فرق نہیں ہوتا اور مرد بھی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، کیوں کہ ہم سب ایک کمینے سماج کے پھوڑے پھنسیاں ہیں، اِس سماج کے بدن میں زہر کے سوا کچھ نہیں۔'' ۳۷

قرۃ العین کے خیال میں عورتوں میں تعلیم کے حصول کا شعور اور بیداری ملکی ترقی کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہے، کیوں کہ علم شعور و آگہی پیدا کرتا ہے، جو حقوق کی باز آفرینی کے لیے نہایت اہم عنصر ہے۔ قرۃ العین نے ایران کے دور افتادہ گاؤں کی محنت کش عورت کا ذکر کیا ہے، جو غربت کے باوجود اپنی جمع پونجی سے بیٹی کی تعلیم کے لیے کوشاں ہے۔ دیہاتی عورت کی یہ کاوش دراصل علم کی روشنی پھیلانے کے علاوہ ملکی ترقی کے لیے اہم قدم ثابت ہوتی ہے:

''میں ایک سنسان پہاڑی سڑک پر ڈرائیو کرتی جارہی تھی۔ جب میں نے دیکھا ایک دیہاتی عورت سر پر سکارف باندھے، بھاری فل بوٹ پہنے، وزنی بنڈل اُٹھائے ہانپتی کانپتی چڑھائی طے کررہی ہے، اُس نے ہاتھ اُٹھا کر لفٹ مانگی میں نے گاڑی روک کر فوراً سے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ اِس دُور افتادہ پہاڑی علاقے میں نہ ٹیلی ویژن تھا نہ اخبار پہنچتا تھا۔ اُس نے شاید میری تصویر بھی کبھی نہیں دیکھی تھی، بہر حال وہ مجھے نہیں پہچان سکی، اُس نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں واپس جارہی ہے۔ اپنی لڑکی کے لیے کپڑا خریدنے قریب کے مارکیٹ ٹاؤن گئی تھی، کیا تمھاری لڑکی کی شادی ہورہی ہے؟ میں نے پوچھا۔ نہیں خانم! میری لڑکی سکول جاتی ہے۔ میں اُس کے لیے گرل گائیڈ یونیفارم کا کپڑا خریدنے گئی تھی۔''، اِس بات کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ یہ غریب پہاڑی عورت بھی اپنی لڑکی کو اسکول بھیج رہی تھی۔ وہ لڑکی گرل گائیڈ بن چکی تھی اور اِس غریب عورت نے پیسہ اِس لیے بچایا تھا کہ اُس کے لیے یونیفارم خرید سکے۔ ایران واقعی ترقی کررہا ہے۔'' ۳۸

پڑھی لکھی لڑکیاں، اگرچہ معاشرے کا فعال رُکن بنتی جارہی ہیں، اِس کے باوجود اُنھیں ہر طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شہروں کی طرح دور افتادہ گاؤں میں مدرسی کے فرائض انجام دینے والی لڑکیاں بہت سے عذابوں سے دوچار

ہوتی ہیں، اُنھیں نہ صرف حریصانہ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ روح کو زخمی کرنے والے جملوں اور سماجی ناپسندیدگی کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، قبول صورت ہونے کی پاداش میں ہمہ وقت ہوس پرستوں کے خوف میں مبتلا رہنا پڑتا ہے:

> ''جولڑکی گاؤں میں استاد بن کر آتی ہے، اُس پر زندگی کے امتحانات دوچند ہوجاتے ہیں، اگر لڑکی قبول صورت ہے تو نمبردار سے لے کر چودھری کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ تعلقات، صاحب سلام اور رشتہ استوار کرے، اگر وہ معمولی صورت کی لڑکی ہے، تو پھر اُس کا گاؤں میں کام کرنا، بُرائی پھیلانے کے مترادف ہے، جولڑکی قبول صورت اور نیک ہو اور نمبردر کے ہتھے نہ چڑھے۔ وہ نالائق اور بدکردار مشہور کردی جاتی ہے، جو مان جائیں، وہ بس اِن کے ڈیرے تک محدود رہتی ہیں۔''۳۹

مائیں بچیوں کے پیدا ہوتے ہی، اُن کے جہیز کے بارے میں فکرمند ہونا شروع ہوجاتی ہیں، کیوں کہ زیادہ جہیز دیے جانے کی سماجی بُرائی بہت سے ہنستے بستے گھروں کو اُجاڑ دیتی ہے، بہت سی بچیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر گزار دیتی ہیں:

> ''ادھر اَماں نے دو ٹرنک خالی کر کے ایک پر نور جہاں اور دوسرے پر باجی کی پرچی لگادی کہ لڑکیاں جوان ہیں، جانے کس وقت مناسب لڑکا مل جائے اور شادیاں کرنا ہوں۔ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بکسوں میں رکھا جانے لگا۔ باجی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد آگے پڑھنے سے صاف انکار کردیا۔''۴۰

خانگی زندگی کے دیگر مسائل میں نان و نفقہ کے معاملات تکلیف دہ صورت اختیار کرچکے ہیں، خصوصاً طلاق اور بیوگی کی صورت میں عورت وراثت اور نان و نفقہ سے مکمل طور پر محروم کردی جاتی ہے، بلکہ عام طور پر بچوں کو بھی چھین لیا جاتا ہے، اِن مسائل کی عکاسی مختلف سوانح نگاروں کے ہاں ملتی ہے، سر رضا علی نے بھی اِس سماجی مسئلے کی عکاسی کی ہے:

> ''مسلمانوں میں اب بھی بہت سے طریقے ہندوؤں کے رائج ہیں مغل بادشاہ ہندو راجاؤں کی بیٹیاں بیاہ کرلائے راجپوت شہزادیاں اپنے ساتھ میکے کی روایات لائیں، بیوہ دوسرا عقد نہ کرے رنگین کپڑے نہ پہنے، مہندی اور عطر نہ لگائے، میلی کچلی رہے، کھانا جو مل جائے کھالے، غور کیجئے اِس سے تو ستی کی رسم ہی اچھی تھی ایک مرتبہ ہی آگ کے دریا میں سے گزر کر بیڑا پار ہوجاتا تھا، ملکی رسم و رواج نے بیوہ کی زندگی کو تپ دق کی بیماری بنا رکھا ہے، جو عمر بھر جلا جلا کر اِس کا خون چوستی ہے۔''۴۱

بیوہ تحصیل دارنی، جنھیں شوہر کی وفات کے بعد تمام اثاثے سے محروم کر کے گھر سے نکال دیا گیا تھا، اُن کی عزتِ نفس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حمیدہ اختر حُسین رائے پوری کی والدہ گھر کے پرانے کپڑے اور بستر غیر محسوس طریقے سے دے دیا کرتی تھیں:

> ''ہمارے گھر میں ہر ماہ ایک خاتون تحصیل دارنی، اماں سے ملنے آتیں۔ بے چاری شادی کے بعد ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ سُسرال سے منحوسیت کا تمغہ ملا اور گھر سے نکال دی

گئیں۔ کسی پروفیسر کی کوٹھی کے کوارٹر میں رہتی تھیں۔ بچوں کو گھر گھر جا کر قرآن شریف کا
درس دیا کرتیں اور ہاتھ پیروں سے ضرورت مندوں کی دادرسی کیا کرتیں۔ اسی لیے اُن کو
پچاسوں لوگوں کی ضرورت کا علم رہتا۔ وہ آتیں تو خاموشی سے تخت کے نیچے سے کالا بکس
نکلا جاتا۔ بڑی سی گٹھری باندھتیں۔ تانگہ منگوا کر اُن سے ساتھ کر دیا جاتا۔ اسٹور میں لکڑی
کا ایک ایسا بکس بھی تھا جس میں پرانے کپڑے جو چھوٹے ہو گئے ہوں۔ پرانے کمبل اور
رضائیاں ڈال دیے جاتے۔ کسی پھیرے پر وہ بھی اُن کے ساتھ چلے جاتے۔'' ۴۲؎

جو مرد نان ونفقہ کی ذمہ داری نہیں نبھاتے، بلکہ اُن کی کمائی نام نہاد انسانیت کے درد کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ گھر میں فاقے اور ضروریاتِ زندگی کو ترستے بیوی بچے محرومی کا شکار ہوتے ہیں اور اُن کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے افراد کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں حصولِ معاش در در کی ٹھوکریں کھاتی ہیں:

''ایک کنواری پگلی نے کہا۔۔۔ محلے کے ایک غنڈے نے مجھے اغوا کیا اور رات بھر پانچ
مرد مجھے لوٹتے رہے اور پانچ عورتیں اس وجہ سے بیمار تھیں کہ اُن کے شوہر محبت کرتے
تھے، کماتے نہیں تھے وہ بچوں کو پالنے کے لیے جھاڑو برتن کرتی تھیں۔'' ۴۳؎

شک کی بنیاد پر یا معمولی جھگڑوں کی صورت میں اُبھرنے والے انتقام کے نتیجے میں ہونے والی طلاق سے گھر اُجڑ جاتے ہیں، سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ میاں، بیوی کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے اور زندگیوں میں زہر گھولنے والے ناسوروں کی وقتی ریشہ دوانیاں بہت بڑی تباہی کا سبب بنتی ہیں:

''وہ بولا۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں قرآن ہے۔ اُمید ہے تم سچ بولو گی۔ میں نے کہا۔۔۔
قرآن نہ ہوتا تو بھی سچ بولتی۔ خیر پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو، بولا۔۔۔ کیا تم نے اپنی
دوست سے کہا تھا کہ یہ دوسرا شاعر خوبصورت ہے اسمارٹ ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے۔؟
میں نے کہا۔۔۔ ہاں، میں نے کہا تھا۔ تو پھر بولا میں نے تمھیں طلاق دیا، طلاق دیا
طلاق دیا۔ جب طلاق دے چکا اور قرآن ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے کہا۔
تم مجھے طلاق دے چکے؟ اُس نے کہا۔۔۔ ہاں۔ تو پھر میں نے کہا۔۔۔ میری بھی اب
سن لو۔ میں اِس قرآن کو ہاتھوں میں رکھ کر کہتی ہوں کہ اُس شاعر کے ساتھ میرا کوئی
ناجائز تعلق نہیں ہے۔ لیکن تم گھٹیا اور کمینے انسان نکلے۔ اِس گھر کے دو دروازے ہیں اب
ایک سے تم باہر نکل جاؤ یا دوسرے سے میں نکل جاتی ہوں، وہ فوراً میرے قدموں میں گر
گیا اور کہا۔۔۔ مجھے معاف کر دو! تمہارے جیسی بیوی مجھے نہیں مل سکتی۔'' ۴۴؎

جوش ملیح آبادی طوائفوں کے اڈوں کا قلع قمع کرنے کے لیے نہایت محتاط اقدامات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، اِن کے خیال میں ذرا سی لغزش بہت سے سماجی مسائل کا سبب بن جائے گی، جس پر قابو پانا بہت مشکل ہو جائے گا:

''اور دوسری طرف، جب طوائفوں کے اڈے بند کر دیے جائیں گے، تو اُن کے پاؤں کی
زنجیر کُھل جائے گی اور وہ اڈے شہر کا رُخ کر کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے، شہر کا ہر

مکان بازارِ حُسن میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا اور شہر کی ہر شریف زادی، خانگی کا روپ
بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائے گی اور عصمت فروشی کا پانی اِس قدر
ٹوٹ کر برسے گا کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں میں گھٹنوں گھٹنوں
پانی کھڑا ہو جائے گا۔'' ۴۵؎

رشید امجد جسم فروشی کرنے والی عورتوں کے مسائل بیان کرتے ہوئے ''تمنا بے تاب'' میں لکھتے ہیں:

''گوہری کو سچ مچ گلی سے نفرت ہوگئی وہ سوچتی کہ کتنی سخت تھی اُس کی بیتی ہوئی زندگی جی
چاہے نہ چاہے طبیعت ٹھیک ہو نہ ہو چوبارے پر بیٹھنا پڑتا۔ بُرے بھلے سبھی آتے
بھونڈے، بدبودار، بدوضع، وحشی، دیوانے لوگوں سے بھی پالا پڑتا اور کسی دن تو اِسی قسم کے
لوگ آتے اور اُسے ادھ موا کر جاتے۔'' ۴۶؎

شہاب نامہ میں ''ایس ٹی آر'' کے زیرِ عنوان بیان کیا گیا ہے، کہ ضلع کے کلکٹر مسٹر رالز اور میم صاحبہ کی فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے بھاری رشوتیں وصول کرتے معمول ہے اور اس کا اِخیر میں ان کی دونوں بیٹیاں بھی شامل ہیں۔ ایس ٹی او کا اردلی شمبھو ناتھ پٹواری بھی ان کے اس جرم میں برابر کا شریک ہے، اِسی طرح قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لیے قائم کیے جانے والے غریب خانوں میں جہاں راشن اور ضروریاتِ زندگی کی پرچیاں بدعنوانیوں کا شکار تھے، وہیں یہاں قیام پذیر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں، کشش کا باعث تھیں۔ ایک روز میں نے پورد ہاؤس کا معائنہ کر رہا تھا، تو چودہ پندرہ برس کی ایک بے حد حسین وجمیل بچی کو دیکھا، اس کا نام نور جہاں تھا، پوور ہاوس کا سارا عملہ بڑی بے چینی سے اس کی ماں کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا، تا کہ اس بوڑھی بیمار عورت کے مرنے کے بعد اس کی جوان بچی کو لقمۂ ہوس بنایا جا سکے۔ مختلف شہروں میں تبادلوں کے دَوران شہاب کو بہت سے مافوق الفطرت واقعات سے بھی واسطہ پڑا خصوصاً بملا دیوی کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اٹھارہ بیس برس پہلے اس گھر میں ایک اوباش آئی سی ایس کے افسر نے شادی کا جھانسہ
دے کر الہ آباد میں کالج کی ایک طالبہ بملا کماری کو ورغلایا اور خفیہ طور پر اُسے اپنے ساتھ
کٹک لے آیا، شادی اس نے کرنی تھی نہ کی سات آٹھ ماہ بعد، جب بملا ماں بننے کے
قریب ہوئی، تو ظالم نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور لاش کو ڈرائنگ روم کے جنوب
مشرقی کونے میں دفن کر دیا۔ بملا کماری اس کوشش میں سرگرداں تھی کہ کسی طرح وہ اپنی
ماں کو صحیح صورتحال کی خبر پہنچا دے، جس روز بملا کی ماں کو اصل صورت حال کی
خبر ملی اور بملا کی بوسیدہ لاش کو چتا میں رکھ کر جلا دیا گیا۔ اسی روز ۱۸ سول لائنز کے
در و دیوار، سقف و فرش سے آسیب کا سایہ اس طرح اُٹھ گیا، جسے آسمانی پر چھائے ہوئے
بادل یکا یک چھٹ جاتے ہیں۔'' ۴۷؎

صدر ایوب کے دَورِ حکومت کے آخری ایام میں پولیس کے ہاتھوں عوام کی جان و مال اور عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیرے جانے کو واقعات میں اضافے کو شہاب نے ''بے برکتی کا سایہ'' قرار دیتے ہوئے خانم کا واقعہ بیان کیا ہے:

''خانم ایک سولہ برس کی جوان لڑکی تھی، جو اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ کسی

قتل کی تفتیش کے سلسلے میں کھاریاں پولیس اسٹیشن میں لائی گئی تھی، رات کو پولیس والے اسے ایک الگ کوٹھڑی میں لے گئے، جہاں ساری شب اس کے چیخنے اور چلانے کا شور سنائی دیتا رہ، صبح کے وقت وہ اپنی کوٹھڑی میں مُردہ پائی گئی۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ اس نے گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی کر لی ہے، لیکن میڈیکل رپورٹ نے ثابت کیا کہ کثیر التعداد میں لوگوں نے خانم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا گھونٹ کر مار دالا تھا۔'' ۴۸؎

جسم فروش اور کرپٹ عورتوں کو اکثر و بیشتر افسرانِ بالا اور قانون کے رکھوالوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے، اِس کے باوجود ہر قدم پر جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہیں:

''امیروں اور بدمعاشوں کے لیے جیل خانے تکیہ ہو گئے ہیں، پیسہ دے کر سب کام ہو سکتے ہیں۔ عورت اور روپیہ بڑی خطرناک چیز ہیں۔ ایک دن جیلر کے پاس ایک بنی ٹھنی عورت آ گئی اُس کے لیے بڑا دروازہ کھولا گیا وہ ٹھاٹھ سے آ کر جیلر کے بازہ کی کرسی پر بیٹھ گئی معلوم ہوا سوسائٹی گرل ہے، اِس کا آشنا سیٹھ سے ہاتھا پائی میں اندر ہو گیا ہے، جیلر نے سیٹھ صاحب کی سفارش پر اُس کو تنہائی قید میں ڈال رکھا ہے، اُس عورت نے چھٹتے ہی کھر درے پن میں کہا، حد ہو گئی اتنی راتیں گزارنے کے بعد بھی پرنالہ وہیں ہے، ابھی تک اُس کو قیدِ تنہائی سے نکالا کیوں نہیں؟۔'' ۴۹؎

جنسی استحصال کی مختلف صورتیں، جن کا عورت کو سامنا کرنا پڑتا ہے، شادی کے نام پر اغوا اور دھوکے کے علاوہ مختلف نفسیاتی مسائل کے نتیجے میں جنسی آلودگیوں اور پیچیدگیوں میں اُلجھنا شامل ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ''کارِ جہاں دراز'' میں ایسی لڑکیوں کی نفسیات کو موضوع بنایا ہے، جن پر جن عاشق ہو جاتے ہیں اور اُن کی ڈولی کو رخصت نہیں ہونے دیتے، جن کے نتیجے میں مالخیولیا، ہسٹریا۔ تپ دق وغیرہ ان عورتوں کے عام امراض تھے:

''اکبری بیگم نے اپنی ننہیال چوکنویں کی حویلی میں سب سے بڑی خالہ عمدہ بیگم کو دیکھا، اِس وقت اسی برس کا سن تھا، غدر سے قبل نکاح ہوا تھا، عین برات کے دن ایک جن عاشق ہو گیا۔ رخصت نا ہونے دی۔ آج تک مصلے پر بیٹھی اللہ اللہ کر رہی تھیں۔ مالخیولیا، ہسٹریا۔ تپ دق سل پردہ نشیں عورتوں کے عام امراض تھے۔ باہر دیوان خانوں میں چوسر اور گنجفے کی بازیاں جمتی تھیں۔ مراد آباد اُس وقت ہندوستان کا وی آنا کہلا رہا تھا۔ نامی گائیک، بین کار اور رباب جلسوں میں بلائے جاتے تھے۔ مقدمہ بازی محبوب مشغلہ تھا، اکثر جائدادیں بہ سلسلہ فضول خرچی مہاجن کے ہاں رہن تھیں۔'' ۵۰؎

''لیلیٰ خالد'' میں دورانِ سفر ہراساں کیے جانے کا ذکر ملتا ہے:

''مگر پھر روم میں بس میں سفر کرتے ہوئے پھر وہی سوال۔ پھر ایک اور ریشہ خطمی انسان، حتیٰ کہ ایک صاحب تو میرے قریب آ کر بغیر کچھ کہے مجھے اپنے بازوؤں میں لے

لینا چاہتے تھے کہ میں چیخی: 'اپنے ہاتھ پرے کرو، ورنہ میں تمھیں بس میں سے دھکا دے دوں گی۔' میری آواز اور غصہ دیکھ کر وہ سہم گیا اور راستے بھر میرے ساتھ کوئی اور حرکت نہیں کی۔'' ۵۱ے

''ایک تھی سارا'' میں زبردستی پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں داخل کی جانے والی عورتوں کی لرزہ خیز داستانِ حیات میں جنسی تشدد اور محرمات کی جنسی آلودگیوں کے علاوہ مریض عورتوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکیوں کو بے نقاب کیا ہے:

''ایک عورت نے بتایا۔۔۔ میرا شوہر دلا ہے اور مجھ سے پیشہ کرواتا ہے۔ میں شریف خاندان کی ہوں۔ ایک دوست پولیس والے نے مجھے پکڑا، تصویریں اخباروں میں آئیں اور جب پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی، حوالات میں دس پولیس والوں نے میرے ساتھ زنا کیا اور پھر مجھے مارا بھی، اُس پر میں ذہنی توازن کھو بیٹھی ہوں۔۔۔ ایک اور پگلی نے کہا میرا دیور اور میرا شوہر میرے ساتھ سوتے ہیں اور مجھے بلیک میل کرتے ہیں۔'' ۵۲ے

کشور ناہید نے بھی محرم رشتوں کی جنسی ہوس ناکی کو ''بُری عورت کی کتھا'' میں بے نقاب کیا ہے اور معاشرے کی اِس غلاظت کو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ قرار دیا ہے:

''جب بھائی بھی بہنوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں اور اگر بہن اعلان کرے تو وہی سزا کی مستحق ٹھہرے، بھائی پھر آزاد، بے لگام اور بے قصور گردانا جائے، جب خود باپوں کو بیٹی کی محبت میں بھی جنسیت کی بو آنے لگے اور اِن کے اندر باپوں کی شہوت پلنے لگے، تو ڈاکٹروں کے سامنے بھی اِن کی زبان یہ بتانے کو نہ کھل پائے کہ یہ جرم کس کا ہے، جب بے حیائی کا ہر داغ صرف عورت کے ماتھے پہ کلنک بنے اور ہر قسم کا زنا بالجبر، مردانگی ٹھہرے کہ مرد تو گھوڑے کی طرح ہوتا ہے۔ نہایا دھویا اُجلا صاف ستھرا، گھر گھر گھوم آئے، مگر جس کا ہاتھی اُسی کا نام، کہہ کر، دلاسے عورت کا مقدر ٹھہریں۔'' ۵۳ے

خاندانی طوائفوں کی زندگی کے اُصول بھی متعین کردہ ہیں۔ وہ لوگ اپنی بہوؤں سے دھندے نہیں کراتے، بلکہ بیٹی سے کراتے ہیں، تاکہ اُن کی نسل اُنھی کی کہلائے، شادی کے نام پر اغوا شدہ لڑکیوں کا استحصال، اولاد کا چھیننا، شخصی آزادی کا سلب کرنا اہم سماجی مسائل ہیں:

''بھوجی میرے بھائی کی بیوی۔ بھوجی کو کوئی غیر مرد نہیں دیکھ سکتا، ہماری بہویں طوائفیں نہیں ہوتیں۔ بہویں شریفوں کی بیٹیاں ہوتی ہیں، تمھیں اتنا بھی نہیں پتہ! مگر شریف لوگ طوائفوں کے خاندان کو رشتے کیسے دے دیتے ہیں۔ جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔ شریف لوگ رشتے نہیں دیتے۔ ہم خرید لیتے ہیں شریفوں کی کنواری بیٹیوں کو۔ بدمعاش اُڑا لاتے ہیں اور دلال اِن کے سودے کر دیتے ہیں، پھر ان میں سے جو واقعی بے داغ ہوتی ہیں، اُن کے ہم اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے نکاح کروا دیتے ہیں، تاکہ اُن کے گھر بس جائیں۔ شادی کے بعد بہویں گھر سے باہر نہیں جا سکتیں۔ بازار بھی اُنھوں نے کبھی

دیکھا نہیں ہوتا وہ ہمیشہ گھروں کے اندر پردے میں رہتی ہیں، تا کہ کوئی بُری نگاہ نہ پڑے اُن پر، اِس طرح اُن کے وارثوں کو بھی اُن کا پتہ نہیں چلتا ،مگر کیا وہ اپنے رشتہ داروں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو یاد نہیں کرتیں؟ طوائفوں کے خاندانوں کو قبول کیسے کر لیتی ہیں۔ شروع شروع میں نہیں کرتیں، روتی پیٹتی ہیں، چیختی چلاتی ہیں، مگر پھر وہ زندگی کو قبول کر لیتی ہیں، جب اُن کے بچے ہو جاتے ہیں۔ سال دو سال مشکل کے ہوتے ہیں، مگر اُن کے بچوں کا کیا ہوتا ہے، جمال نے پوچھا۔ بیٹیاں گانا بجانا سیکھتی ہیں۔ بیٹوں کوئی طوائف سنبھال لیتی ہے، جس میں توفیق ہو یا ہم اُن کی شادیاں کروا دیتی ہیں۔ خاندانی طوائفوں کے ہاں یہی طریقہ ہے۔'' ۵۴؎

گھروں سے فرار یا اغوا ہونے والی لڑکیوں کو اپنے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں:

''گاؤں کی گوری آپ بھاگے یا اُسے کوئی بھگائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ بھاگنے والی نے کبھی کسی کا نام روشن نہیں کیا اور اُس کے ناکردہ گناہ پر کبھی کسی نے اُسے نہیں بخشا۔ لطیف خاں اور سلطان کو کچھ معلوم نہ ہوا کہ ایشاں کہاں گئی اور کس حال میں رہی۔ قتل ہوئی کہ قدم قدم پر بکی۔'' ۵۵؎

اِسی طرح پاگل قرار دی جانے والی ایک اور لڑکی کی داستانِ الم ''ایک تھی سارا'' میں بیان کی گئی ہے:

''اُس نے بتایا۔۔۔ مجھے ایک سے محبت تھی۔ میں نے گھر چھوڑا، بچہ چھوڑا اور میرے عشق نے میری تصویریں اتاریں اور مجھ سے اسمگلنگ کروانے لگا اور میں بلیک میل ہو گئی اور پھر اُس نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا اور پھر رقص کرنے لگی۔'' ۵۶؎

عصمت چغتائی نے ناجائز تعلقات اور معاشقوں کے مہلک نتائج کی نشاندہی بے باک انداز میں ''ٹیڑھی لکیر'' میں کی ہے:

''کہتے ہیں ناجائز بچے بڑے سخت جان ہوتے ہیں تو رولف کیوں ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گم ہو گیا۔ کوئی دوسری ماں ہوتی تو تسلی دی جاتی کہ صبر کرو خدا اور دے گا مگر ناجائز بچے کی ماں کے لیے تو گالی ہوئی۔ ایلما شادی کر ڈالو۔ شمن نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ہونہہ، نئے رولف پیدا کرنے کے لیے۔۔۔ تم کیا جانو۔۔۔ اپنے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر یوں پھینک دینا مذاق نہیں۔ اوہ شمن وہ دُکھ جو اُسے جنم دینے میں میں نے سہا آج اُس کی موت سے دس گنا۔ اف وہ موت سے بڑھ کر دم گھوٹنے والا دُکھ۔ شاید تمھارا دُکھ اِس لیے بہت معلوم ہوا کہ تمھاری پوزیشن اور ماؤں سے مختلف تھی، اگر کسی کا بچہ محبت بھری نگرانی میں جنم لے تو شاید اتنا دشوار نہ ہو۔'' ۵۷؎

ہوسٹل کی لڑکیوں میں ہم جنس پرستی، ماں باپ کی ناچاقی، بدکرداری یا عدمِ توجہی کے رُجحان کی عکاس ہے:

''رات کو جب شمن پلنگ پر لیٹی تو بڑی دیر تک ہچکیوں کے مارے اِس کا بُرا حال رہا۔۔۔

خاموش وہ اپنی ہتھیلیوں میں دانت گڑو اپنی آواز کو گھوٹتی رہی۔ سعادت آج کمرے میں نہیں تھی۔ آج چوں کہ چھٹی تھی، اِس لیے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی۔ وہ نجمہ کے یہاں تھی۔ یہ اُسے کیا ہو گیا تھا خوف سے اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بالکل بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ کی طرح۔ اوہ! آج اسے رسول فاطمہ یاد آنے لگی اور ایسا معلوم ہوا کہ وہی اِس کی قاتل تھی، اِس نے ہی تو رات بھر اُسے سردی میں اکڑنے کو بند کر دیا تھا۔' ۵۸

مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں عورت اپنی ذہانت اور آگاہی کی بہت بڑی قیمت چکاتی ہے۔ مرد عورت خصوصاً اپنی بیوی کو اپنے سے کمتر درجے پر دیکھنا پسند کرتا ہے، ایسی ذہنیت کے حامل مرد اپنے سے زیادہ باصلاحیت بیوی کو طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کرتے ہیں:

''میرا شوہر بے جا مجھے اتنا مارتا کہ جسم پر نیل پڑ جاتے، بے قصوری کی سزا جرم سے بڑی ہوتی ہے۔ وجہ یہ تھی، وہ میری شاعری سے ڈرا ہوا تھا اور احساسِ کمتری کی وجہ سے مجھ پر ظلم کرتا، حالاں کہ میں اُس کے بوٹ پالش کرتی، تمام گھر والوں کے کپڑے دھوتی، فاقہ برداشت کرتی، ساس نندوں کی گالیاں سنتی، مجھے پڑوس جانے کی اجازت نہیں تھی، ہر بات پر مجھے آوارہ کہا جاتا، حالاں کہ میرے پاس چونی تک نہیں تھی، اُس نے شادی کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر کی تھی۔ شادی کے تیسرے روز وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل گیا۔'' ۵۹

لکھاری خواتین، جن مسائل کا شکار ہوتی ہیں ساقی فاروقی نے اُس کی نشاندہی مخصوص انداز سے آپ بیتی میں کی ہے:

''اچھا فقرہ چاہے کسی کا ہو اور چاہے کسی پر ہو، ضائع نہیں جانا چاہیے۔ میں راشد صاحب اور قاسمی صاحب کے تعلقات پر مزید کچھ نہیں لکھنا چاہتا مگر پشاور والے واقعے کے باب میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اُن دو مشہور لکھنے والیوں کے سلسلے سے چند کمینے مرد ادیبوں شاعروں نے بعض احمقانہ اور ذلیل افواہیں پھیلا رکھی تھیں (خیال اغلب ہے کہ ہاجرہ مسرور کی جودتِ طبع اور خدیجہ مستور کی فراست نے اُن لوگوں میں احساسِ کمتری پیدا کیا ہوگا)۔ ظاہر ہے قاسمی صاحب جو طبعاً ہیرا ہیں، وہ اِن افواہوں سے خاصے دُکھی اور زخمی ہوں گے۔ ایسے میں راشد صاحب کے فقرے سے اور ٹوٹ گئے ہوں گے ورنہ وہ ایسے سُخن ناشناس نہیں کہ مذاق اور کینے کا فرق نہ سمجھیں۔ دل دکھانا راشد صاحب کا شیوہ نہیں تھا۔ ہاں اگر کوئی اُن کا دِل دُکھاتا تو ہزار طرح کے آزار دینے کے درپے رہتے، مگر دِل دکھانے میں پہل نہیں کرتے تھے، میں اُس کا گواہ ہوں۔'' ۶۰

لکھاری مرد کی حوصلہ افزائی تمام معاشرہ کرتا ہے، اِس کی برتری اور فوقیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن لکھاری عورت کو ہمیشہ ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے، اِسے نہ تو گھر سے ستائش ملتی ہے اور نہ ہی سماج سے، بلکہ تضحیک و تحقیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

''اگر کوئی مرد لکھنا بند کر دے تو زمانہ افسوس کرتا ہے کہ کیا دماغ تھا، جانے کیا ہو گیا۔عورت لکھنا بند کر دے، تو سکون، اطمینان ___ کہ اب صحیح ماں، گھر والی اور زوجیت کے صحیح راستے پر گامزن ہے۔ایسے راستے تو ہمارے بڑے بڑے دماغوں مثال کے طور پر ڈی۔ ایچ لارنس نے بھی سکھائے ہیں۔Sex Literature and Censorship سارترے سے زندگی کے آخری حصے میں سوال کیا گیا تھا کہ سیمون کو آپ بطور ساتھی تو خوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔آپ اِن کی ادبی حیثیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔خود سارتر نے سیمون کی The Second Sex کی تحریر کے بہت سے حصوں سے اختلاف کیا تھا۔ہمارے یہاں لکھنے والیوں کے شوہر، اللہ معاف کرے ___ عجیب الخلقت ہوتے ہیں،لیکن وہ لکھنے والیوں کو ہاتھ کے چھالے کی طرح نہ رکھتے بنتے ہیں نہ چھوڑتے ہیں۔کبھی اس کی پبلسٹی ایجنٹ بن کر لوگوں کی اور اِن خاتون ___ دونوں کی زندگی اجیرن کرتے ہیں۔''[۶۱]

عورت کو قلم کی سچائی کی پاداش میں بعض انتہائی صورتوں میں طلاق یا عاق کر دینے جیسے مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے:

''خیر میں بھی ظاہراً امی کے کان میں دودھ بخشوا رہی تھی، لیکن میں نے امی کے کان میں یہ کہا، 'امی تم ٹھیک کہتی تھیں، کانٹے پر موسم آتا ہے۔' امی چپ ڈولی میں بدا ہوئیں ۔۔۔سارا خاندان میرے گرد، 'ہم تمھیں ان اینٹوں سے رہا کرتے ہیں، تم نے لکھ لکھ کر پورے خاندان کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔اخباروں کی سرخیاں ہمارا لگان لگاتی ہیں۔ہمارے دشمن ہمارے شریک اخبارات لیے پھرتے ہیں، تم نے امی عشق کا واقعہ کیوں لکھا۔؟، وہ تمہارے والد سے پنگھٹ پر ملا کرتی تھیں۔اب تو اُسے بخش دو۔' میں سوچنے لگی میری ماں تو ایک عظیم عورت تھی کہ اس نے خاندان کو خیر باد کہا اور میرے والد سے چھپ کر شادی کر لی۔اُس دَور میں تو یہ بات اور مشکل رہی ہوگی، خیر امرتا! مجھے اِس گھر سے نکال دیا گیا اور کہہ دیا گیا کوئی ادیب، شاعر اخباری نمائندہ ہمارے گھر نہ آئے اور ہم تمھیں عاق کرتے ہیں۔''[۶۲]

عورت کا استحصال بہ حیثیتِ ماں بھی سوانح عمریوں میں موجود ہے، ماں چوں کہ فطرتی طور پر اولاد کے لیے منبعٔ فیض ہوتی ہے، ماں تمام قربانیوں کا مظہر ہوتی ہے، اولاد کے زندگی کی توانائی و حرارت ماں کے وجود سے حاصل کرتی ہے، لیکن ماں کی کردار کشی اولاد کے لیے سوہانِ روح ہوتی ہے۔اولاد اپنے ماں باپ کو ہمیشہ بے عیب دیکھنا چاہتے ہیں، بہ حیثیتِ ماں عورت کا استحصال ہر قدم پر کیا جاتا ہے۔''مٹی کا دیا'' میں میرزا ادیب نے اپنے والد کی سخت طبعیت اور حاکمیت و رعب جمانے کی عادت کے اہلِ خانہ پر بُرے اثرات کا ذکر کیا ہے، اُن کی ماں تمام عمر شوہر کی خدمت گزاری کے باوجود لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ سہتی رہی، لیکن بے سود۔اپنی والدہ کی داستانِ غم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شوہر پیشے کے لحاظ سے ایک درزی ___ اپنے فن میں ماہر، مگر مہینے میں پندرہ بیس دن

دکان پر جاتا اور باقی دن دکان کے انچارج سے روٹھ کر گھر میں گزارتا۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ اور تیزی ___ ساس پُرانے زمانے کی عورت، لکیر کی فقیر، بہو سے یہ توقع رکھتی تھی کہ وہ صبح سے لے کر رات کے نو دس بجے تک سارا کام انجام دے اور اِس دوران میں شوہر سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ دو جیٹھ، بالکل اپنے حال میں مست، گھر کے کسی فرد سے بھی اُنھیں کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، ہاں اپنی ماں سے ضرور واسطہ تھا اور وہ اس وجہ سے کہ وہ اُن پر جان چھڑکتی تھیں۔ چھوٹے فاتر العقل، جو دِن چڑھے کچھ کھا پی کر گھر سے نکل جاتے اور رات کو واپس آتے۔ دِن بھر بازاروں میں گھومتے پھرتے یا لوہاری منڈی میں ایک خیمہ دوست کی دُکان پر بیٹھے رہتے۔ گھر میں باقاعدہ کمانے والا کوئی بھی نہ تھا۔'' ۶۳

''ایک تھی سارا'' میں اولاد کے کرب کی نشاندہی کی گئی ہے، جب ماں کی شخصیت و کردار کے بارے میں منفی باتیں سنتی ہے:

''میں خاموشی سے کہتی۔۔۔ ماں، وہ تو قیدی تھا، تیرا اصلی رانجھا تو تیرے پاس ابھی آیا ہی نہیں۔۔۔ لیکن ماں کی ماں نے صرف رُکنا سیکھا تھا، اس لیے بچوں کو اپنی بھوک میں شامل کر لیا تھا۔۔۔ اب اکثر چولہے میں آگ چاٹنے کے لیے کچھ نہ ملتا اور ہمارے گھر میں آگ پیاسی ہی ہوتی چلی گئی۔۔۔ آگ سے زیادہ ماں کے آنسو گنتی اور آنکھوں کی خاموشی دیکھتی رہتی۔ سو وہ برتن بھی بکنے لگے جن پر میرے باپ کا نام کھدا ہوا تھا۔۔۔ جو پکتا، ماں بڑے پیار سے ہمیں کھلاتی اور کبھی کبھار اُس عورت کو کوستی رہتی جس کو میرے باپ نے ہمارے برتنوں پر لاگو کر دیا تھا۔'' ۶۴

باپ کی عدم توجہی اور سخت گیری کا تذکرہ میرزا ادیب نے ''مٹی کا دیا'' میں جا بجا کیا ہے:

''اباجی کے کام خاصے مختصر تھے، اُن کا سب سے بڑا کام تھا امی سے لڑنا ___ امی کے ساتھ لڑنے کا موقعہ نہ ملے، تو اپنی اولاد کی پٹائی کرنا ___ گھر سے باہر نکلنا، تو دو تین دوکانوں پر باری باری بیٹھنا اور ایک جگہ بیٹھ کر دیر تک شطرنج کھیلنا۔ تین بہنیں تھیں، جنھوں نے کبھی کتاب ہاتھ میں نہ پکڑی تھی۔ گھر کے عام کاموں میں امی کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔'' ۶۵

انیس ناگی نے بھی ماں باپ کے آپس کے ناخوش گوار تعلقات کے بُرے اثرات اور نتائج پر روشنی ڈالی ہے:

''میری ماں کے مطابق میرے والد اور اُس کی عمر میں پندرہ سولہ برس کا فاصلہ تھا، جب میں اِس گھر میں آئی تو پہلے ہی وہاں میری ہم عمر لڑکیاں موجود تھیں۔ دو مرتبہ تمہارے باپ کا رشتہ آیا تھا اور دو مرتبہ میرے باپ نے انکار کر دیا تھا۔ پر میری قسمت ہی ایسی تھی، ایسے آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں ہے، ایک مرتبہ میری ماں باورچی خانے میں روتی ہوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے اُس عمر میں بھی احساس تھا کہ میرے والدین کے آپس میں تعلقات اتنے خوشگوار نہیں تھے۔ میری ماں کیا کوئی عورت بھی

میرے والد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی، کیوں کہ وہ عورت کو مساوی درجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ گرمیوں کے موسم میں ہر سال صحت افزا مقامات پر جاتے، لیکن میری ماں کو ساتھ لے کر نہ جاتے۔ گھر کی جمع تفریق میں اِس کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میری سوتیلی بہنیں، جب گھر میں رہنے آتیں، تو صرف اُن کی چلتی میں نے اپنے والد کو اپنی ماں سے کبھی تحمل سے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میری ماں زیادہ جواب دینے کی عادی نہیں تھی، دراصل وہ گھر میں ایک اجنبی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔" ۶۶

عورتوں کو سیاست کے میدان میں درپیش مشکلات کا ذکر بھی مختلف آپ بیتیوں میں کیا گیا ہے۔ سیاست میں مردوں کی اکثریت کی وجہ سے عورت کو سیاست کے میدان میں آگے نکلنے کے مواقع کم ملتے ہیں، مگر اِس کے ساتھ ساتھ سیاستدانوں کی عیاشیوں، غنڈا گردیوں اور بے جا حاکمیت کی وجہ سے بھی بھرپور کام کرنے کے مواقع نہیں مل پا رہے ہیں۔ طرفہ اس میدان میں بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی مے نوشیوں اور عیاشیوں کو قدرت اللہ شہاب نے بے نقاب کیا ہے اور شراب کے نشے میں چُور رشید مومن کے الفاظ میں کہلوایا ہے: "خدا کی قسم، پاکستانی بڑے اچھے لوگ ہیں۔ شراب نہیں پیتے، سؤر نہیں کھاتے، گرمیوں کے موسم میں حج پر جاتے ہیں اور نزہیہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں، ہاہاہا۔" ۶۷

اِسی طرح کشور ناہید نے "لیلیٰ خالد" میں عورتوں کے سماجی استحصال کے علاوہ سیاست کے میدان میں اُنھیں درپیش مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ سیاست میں مردوں کی اکثریت کی وجہ سے عورت کو سیاست کے میدان میں آگے نکلنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ معاشی عدم استحکام، سماجی اثر و رسوخ اور خاندان کے مردوں کے عدم تعاون کی بنا پر اِن پر عدم تعاون کے رویوں کی وجہ سے خواتین بہت سے مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔ "لیلیٰ خالد"، فلسطینی حریت پسند لڑکی کی جرأت مندانہ کاوش کی عمدہ مثال ہے۔ عورتوں کی سیاست میں شمولیت اس کے سیاسی شعور و آگہی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

"آخر کو ابا اور محمد کی وکالت ہمارے کام آئی اور یوں میری بہنوں کا سیاسی کام جاری رہا۔ فلسطینی مہاجرین میں بھی پچاس فیصد عورتیں تھیں۔ اسرائیلیوں نے اپنی تمام عورتوں کی جنگی بنیادوں پر تربیت کی تھی۔ اِس لیے ضروری تھا کہ فلسطینی خواتین بھی جنگی تربیت سے بہرہ ور ہوں۔ ماں کے مسلسل اشتعال کو دیکھ کر ابا نے آخر ایک دن پوچھا۔ 'آپ فلسطین کو آزاد دیکھنا چاہتی ہیں'، 'ہاں ہاں کیوں نہیں" اماں نے بے دھڑک جواب دیا۔ اب محمد کی باری تھی، بولا: پھر تو آپ سیاست میں اپنی بیٹیوں کے حصہ لینے پر اعتراض کر ہی نہیں سکتی ہیں۔' میں زرفیہ اور رہاب کے حصہ لینے پر معترض نہیں ہوں، مگر یہ فتنہ ذرا سی بچی (میری طرف اشارہ کر کے کہا) اس کو تو گھر رہنا چاہیے۔" ۶۸

شہاب نامہ میں نام نہاد گدی نشینوں اور قانون کے رکھوالوں کی سیاہ کاریوں کا ذکر بڑے مؤثر اور حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے۔ مذہب کی آڑ میں یہ گھناؤنا کاروبار کرنے والے قدرت اللہ شہاب کی دسترس میں سے محفوظ نہ رہ سکے، اُنھوں نے ایسے ہی ایک سجادہ نشیں کے ہاں محفلِ سماع کا ذکر کیا ہے، جس میں بقول قدرت اللہ شہاب بڑے بڑے افسر اور رئیس اکٹھے ہو کر جامیؔ، حافظؔ، خسروؔ، اقبالؔ، بلھے شاہؔ، خواجہ فریدؔ کا کلام سنتے ہیں اور مقربین کے لیے 'راہِ سلوک' میں ایک میں ایک

خیمہ اس مقام پر واقعہ تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جلتے ہیں جبریل کے پر جس مقام پر، کیوں کہ اس خیمے میں لاہور، ملتان اور فیصل آباد کی نامی گرامی گانے اور مُجرا کرنے والی فنکارائیں اُتری ہوئی تھیں۔۔۔ فن کاروں کا مجرا افسروں اور رئیسوں کی خوشنودی کے لیے منعقد ہوتا تھا:

''مجرے والے خیمے میں پہنچ کر سجادہ نشین صاحب اپنی زرکار قبا اُتار دیتے ہیں اور لہراتے ہوئے طرّے والی سبز پگڑی بھی خادمِ خاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خادم اس دستارِ فضیلت کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر باہر لے جاتا ہے، شاید یہ پگڑی روشن دین معمار کے گھر پہنچ جائے، جس کی جمیلہ پر شباب کے پھول تازہ تازہ کھلے ہیں شاید'' ۶۹

اسی طرح نام نہاد سجادہ نشیں جس کسی کے گھر جوان لڑکی ہوتی ہے اپنی پگڑی بھجواتا ہے، تاکہ لڑکی کو نکاح کے نام پر ہوس کا نشانہ بنا کر چھوڑ دیا جائے۔ سکینہ نے پگڑی سے بچنے کے لیے قدرت اللہ شہاب کو درخواست دی جو اُن کے بقول: ''سکینہ، تو بچ گئی، لیکن افسوس کہ وہ پگڑی ہمارے ہاتھ نہ آسکی، جس کی ایک ایک سِلوٹ میں ریاکاری اور سیاہ کاری کے سانپ لہرا رہے تھے۔'' ۷۰ یہ سجادہ نیشن کے حواری اہلِ خانہ کو اس انداز میں قائل کرتے ہیں:

''اے گھر والو، مبارک ہو، تمھاری بہو یا بیٹی پر حضرت قبلہ و کعبہ فخرِ سالکاں، رہنمائے عاشقاں، آفتابِ طریقت، ماہتابِ معرفت کی نظرِ انتخاب پڑ گئی ہے۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارے نصیبوں پر رحمتِ خداوندی کا سایہ قائم رہے، تمھاری کھیتیاں سرسبز لہلہاتی رہیں، تمھارے جھونپڑوں کو آگ نہ لگے، تمھارے مویشی گم نہ ہوں تمھارے دالان میں ہتھکڑیاں اور جیل خانوں کے دروازے تم پر اچانک وا نہ ہوں، تو برضا و رغبت۔۔۔ مالک، ہمارے گھر پگڑی آگئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ از طرف سکینہ دختر غلام محمد رجبانہ۔'' ۷۱

گویا تانیثیت کے نمائندہ نثر نگاروں نے خودنوشت سوانحِ عمریوں اور سوانح و آپ بیتیوں میں شعوری و لاشعوری طور پر اپنے مخصوص تانیثی تصورات کی نمائندگی کی ہے، اگر چہ اِن کی تعداد نسبتاً کم ہے، لیکن سوانحی ادب میں موضوعاتی سطح پر تنوع کے حامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبدالماجد دریابادی، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، طبع دوم، ۲۰۰۶، ص ۳۱۳
۲۔ ایضاً، ص ۳۱۱
۳۔ کشور ناہید، اپنے پڑھنے والوں کے نام! مشمولہ بُری عورت کی کتھا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸، ص ۱۰
۴۔ ریحانہ خانم، آپ بیتی کیا ہے؟ مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴، ص ۸۵
۵۔ اے حمید، اُمرتسر میں فساد کا پہلا شعلہ مشمولہ اُمرتسر کی یادیں، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۹۱، ص ۴۱
۶۔ اے حمید، اُمرتسر کی ایک ہولناک رات مشمولہ اُمرتسر کی یادیں، ص ۱۹۶۔۱۹۷
۷۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹، ص ۱۰۴۱
۸۔ ممتاز مفتی، الکھ نگری، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۸، ص ۳۸
۹۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۲۳۱
۱۰۔ کشور ناہید، پہلا قدم مشمولہ بُری عورت کی کتھا، ص ۲۵
۱۱۔ کشور ناہید: تعلیم اور انقلاب مشمولہ لیلیٰ خالد، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰، ص ۶۸
۱۲۔ رشیدہ عیاں، میری کہانی (منظوم آپ بیتی)، کراچی: اشارات پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۷۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵۸
۱۴۔ امرتا پریتم، ایک تھی سارا ایک تھا سعید مشمولہ ایک تھی سارا، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۶، ص ۱۶۳
۱۵۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۸، ص ۱۳
۱۶۔ جوش ملیح آبادی، م۔ بیگم مشمولہ یادوں کی برأت، لاہور: مکتبۂ شعروادب، ۱۹۷۵، ص ۶۷۶
۱۷۔ میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۹، ص ۱۴۷
۱۸۔ رشید امجد، پھول سائیں مشمولہ تمنا بے تاب، راول پنڈی: حرف اکادمی، ۲۰۰۳، ص ۲۴۵
۱۹۔ احمد بشیر، بھٹکے گا دل، لاہور: فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۳، ص ۱۰۸۔۱۰۹
۲۰۔ کشور ناہید، طوق درگلو تھا مشمولہ بُری عورت کی کتھا، ص ۱۳۶
۲۱۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری: ہمارے مولوی صاحب (تالیوں کی گونج) مشمولہ نایاب ہیں ہم، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۳، ص ۱۹
۲۲۔ اختر حسین رائے پوری، گردِ راہ، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۰، ص ۱۲۷
۲۳۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، ص ۲۶۵
۲۴۔ امرتا پریتم، انسانی صحیفہ کی آرزو مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۹
۲۵۔ امرتا پریتم، ایک اور اینٹ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۴۱
۲۶۔ امرتا پریتم، سارا کا ایک خط، راجندر سنگھ بیدی کے نام مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۵۶
۲۷۔ رضا علی، سر، ساس کی نظم اور میرا تصرف مشمولہ اعمال نامہ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۵، ص ۱۹۵۔۱۹۶

28- He's no good for you.He'll ruin your life as he's ruined mine.'She tried to convince me that Mustafa was a violent and dangerous man.She claimed that he beat her savagely for trivial reasons:if she forgot to tell the servants to switch on the hot water;if she misplaced something;if she delayed having his clothes pressed. My Feudal Lord, byTehmina Durrani with William and Marilyn Hoffer, Corgi Books,Great Britain,1995,P:76.

29- He grabbed my right wrist and twisted,forcing me to my kness.Even as a shriek servants,or his mother,hear.He released escaped from my lips,I told myself to be quiet,lest the his grip and I scrambled to my feet,gasping, bubbing my sore arm.He ordered me to sit down again on the bed,and the interrogation continued.He asked:'When you had sex with Anees,did you respond?'. My Feudal Lord, byTehmina Durrani with William and Marilyn Hoffer, Corgi Books,Great Britain,1995,P:102.

30- A feudal lord loves his land only in functional terms.He encloses it and protects it.If it is barren,he neglects it.Land is power,prestige and property.I interpreted the Koran differently.To me,land had to be tended and cultivated;only then could it produce in abundance.Otherwise,it would be barren.But,of course,I was expected to accept Mustafa's interpretation without question. My Feudal Lord, by Tehmina Durrani with William and Marilyn Hoffer,Corgi Books,Great Britain,1995,P:107.

۳۱۔رشیدہ عیاں، سچ بات تو یہ ہے مشمولہ میری کہانی، کراچی: اشارات پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء، ص ۱۴

۳۲۔امرتا پریتم، چوڑیوں کا قہقہہ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۸۳۔۸۴

۳۳۔امرتا پریتم، مینا بازار مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۶۔۷

۳۴۔حمیدہ اختر حُسین رائے پوری، نیلی چھتری مشمولہ نایاب ہیں ہم، ص ۸۷

۳۵۔احمد بشیر، بھٹکے گا دِل، ص ۱۸۲

۳۶۔رشیدہ عیاں، میری کہانی (منظوم آپ بیتی)، ص ۱۶۴

۳۷۔احمد بشیر، بھٹکے گا دِل، ص ۲۳۴۔۲۳۵

۳۸۔قرۃ العین حیدر، دفترِ مخصوص علیا حضرت مشمولہ کوہِ دماوند، لاہور: مکتبۂ اُردو اَدب، س ن، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۳۹۔کشور ناہید، پہلی لغزش مشمولہ بُری عورت کی کتھا، ص ۷۱

۴۰۔حمیدہ اختر حُسین رائے پوری، اماں (بیگم ظفر عمر) مشمولہ نایاب ہیں ہم، ص ۱۰۸

۴۱۔سر رضا علی، حسن و محبت کی جیتی جاگتی آٹھ تصویریں مشمولہ اعمال نامہ، ص ۳۶۹

۴۲۔حمیدہ اختر حُسین رائے پوری، اماں (بیگم ظفر عمر) مشمولہ نایاب ہیں ہم، ص ۱۴۴

۴۳۔امرتا پریتم، پاگل خانہ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۳۸
۴۴۔امرتا پریتم ایک اور اینٹ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۴۰
۴۵۔جوش ملیح آبادی، لکھنؤ کا پہلا سفر مشمولہ یادوں کی برأت، ص ۹۵
۴۶۔رشید امجد، ملنگ مشمولہ تمنا بے تاب، راولپنڈی: حرف اکادمی، ۲۰۰۳، ص ۹۷
۴۷۔قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، ص ۱۵۷۔۱۵۶
۴۸۔ایضاً، ص ۱۰۴۱
۴۹شورش کاشمیری، سنٹرل جیل کراچی مشمولہ موت سے واپسی، لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، ۱۹۹۴، ص ۱۶۱۔۱۶۲
۵۰۔قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۴۹
۵۱۔کشور ناہید، نئی انسانیت کا اعلامیہ، مزاحمت اور انقلاب مشمولہ لیلیٰ خالد، ص ۱۳۹
۵۲۔امرتا پریتم، پاگل خانہ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۳۸
۵۳۔کشور ناہید، پہلا جلوہ مشمولہ بُری عورت کی کتھا، ص ۵۴
۵۴۔احمد بشیر، بھٹکے گا دِل، ص ۲۴۱
۵۵۔رشید امجد، باسی گل مشمولہ تمنا بے تاب، ص ۱۲۵
۵۶۔امرتا پریتم، پاگل خانہ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۳۹
۵۷۔عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر، کراچی: بُک ٹائم، ۲۰۰۹، ص ۲۳۵
۵۸۔ایضاً، ص ۲۶
۵۹۔امرتا پریتم، پاگل خانہ مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۳۷
۶۰۔ساقی فاروقی، آپ بیتی/ پاپ بیتی، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۸، ص ۱۵۵
۶۱۔کشور ناہید، طوق درگلو تھا مشمولہ بُری عورت کی کتھا، ص ۱۳۳۔۱۳۴
۶۲۔امرتا پریتم، سرخ گرد۔ سیاہ گرد مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۱۳۰
۶۳۔میرزا ادیب، مٹی کا دیا، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۹، ص ۲۷۰
۶۴۔امرتا پریتم، مینا بازار مشمولہ ایک تھی سارا، ص ۹
۶۵۔میرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص ۱۵
۶۶۔انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۸، ص ۵۸۔۵۹
۶۷۔قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، ص ۵۷۷
۶۸۔کشور ناہید، تعلیم اور انقلاب مشمولہ لیلیٰ خالد، ص ۵۰
۶۹۔قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، ص ۵۰۰
۷۰۔ایضاً، ص ۵۰۱
۷۱۔ایضاً۔

۵۔ تانیثیت اور پاکستانی اُردو تحقیق و تنقید

تحقیق، حقائق کی تلاش کا مسلسل عمل ہے یہ موجودہ مواد کو مرتب کر کے اِس کا تجزیہ کرتی ہے اور پھر اس پر تنقید کرتے ہوئے نتائج اخذ کرتی ہے اور نئے امکانات دریافت کرتی ہے، اِس میں کوئی بھی نظریہ حتمی، قطعی یا آخری نہیں ہوتا۔ قاضی عبدالودود کے بقول: ''تحقیق کسی امر کو اِس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔''[۱] تحقیق میں کسی مسئلے یا سوال کو لیا جاتا ہے، اِس کے بعد اِس مسئلے کے بارے میں مواد فراہم کیا جاتا ہے، پھر تنقیدی جانچ پرکھ کے بعد مواد ترتیب دے کر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں، جس سے ایک مجموعی نقطۂ نظر یا نظریہ وجود میں آتا ہے۔ سچا محقق جذبات و خواہشات اور تعلقات و مراسم سے قطع نظر ایک خالص معروضی اندازِ نظر سے تحقیقی کام کرتا ہے اور اپنے معلوم حقائق و نتائج سے علمی دُنیا کو آگاہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحقیق و تنقید کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اِس طرح سے کیا ہے: ''ایک خاص حد تک تنقید و تحقیق کے دائرہ ہائے عمل الگ الگ ہیں، مگر ایسے دائرے بھی ہیں، جن میں یہ دونوں ہم قدم اور ہم رُکاب ہیں۔''[۲] ڈاکٹر جمیل جالبی کا تنقید کے حوالے سے یہ کہنا ہے کہ ہماری تنقید کا مستقبل تنقید و تحقیق کو ملا کر ایک اکائی بنانے سے ہی ممکن ہے: ''تحقیق دراصل تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق کو معلوم کرنے اور اُن کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔''[۳]

تنقید و تحقیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جب کہ عام طور پر اِن دونوں کو ایک دوسرے کے متضاد سمجھا جاتا ہے، جب تحقیق سے بے خبری اور بے تعلقی اختیار کی جائے، تو تنقید خود بخود غیر وقیع اور غیر مستند ہو جائے گی۔ اُردو تنقید میں اگر بنیاد تحقیق پر قائم کی جائے، تو اِس کا معیار اور وقار دونوں بلند ہوں گے اور تنقید کا منشا و مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ تانیثیت عورتوں کے حقوق کے حصول کے لیے چلائی جانے والی تحریک ہے، جس نے تمام دُنیا کے زبان و ادب پر کسی نہ کسی سطح پر اثرات مرتب کیے۔ تانیثی شعور و ادراک کے پرچار کے لیے ایسی زبان و اصطلاحات کا بیان، جو عورت کے احساسات، طرزِ فکر اور نفسیات کی بھرپور غمازی کرے، تانیثی تنقیدی زبان کہلاتی ہے۔ تانیثی افکار اور نظریات کی وضاحت عموماً بیل ہاکس کے خیالات سے کی جاتی ہے، بیل ہاکس کے مطابق تمام فیمینسٹ یہ طرزِ فکر اپنائے ہوئے ہیں کہ عورت ایک وجود ہے، شے نہیں اسے شے متصور کرنے والے اِس کی تمام تر صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے استحصالی قوتوں کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ ژولیا کرسٹیوا نے تحلیلِ نفسی کے حوالے سے نسائی ادبی تنقید کا آغاز کیا۔ شاہدہ حسن کا کہنا ہے کہ ژولیا کرسٹیوا نے فیمنزم کے پہلے دَور میں مرد اور عورت کی عالمی مساوات کی بات کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اِس میں اُن دونوں کے حیاتیاتی تقاضوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ دوسرے دَور میں منفرد تانیثی زبان تشکیل دی گئی۔ کرسٹیوا کا خیال ہے کہ معاشرے میں عورت کی زبان کی تشکیل کا حصہ خود بخود موجود ہوتا ہے، اِس لیے عورتوں کو اپنے اظہار کے لیے کسی جداگانہ زبان کی تشکیل کی ضرورت نہیں۔[۴]

دیگر تحریکوں کی طرح تانیثیت بھی برصغیر کے ادب پر اثرانداز ہوئی، اِسی لیے سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر ایسا

ادب تخلیق کیا گیا، جو خواتین کی ذہنی و جسمانی اور اخلاقی تربیت کے لیے سودمند ہونے کے علاوہ اُن پر ڈھائے جانے والے مظالم اور استبدادی رویوں کا عکاس تھا، مثلاً افتخار احمد شیروانی نے اپنے مضمون ''عورت کی محکومیت'' میں ہندو سماج کی پس ماندگی کا سب سے بڑا سبب عورت کا گِرا ہوا سماجی مرتبہ قرار دیا، اِن کے خیال میں جب تک مرد و عورت کے درمیان مساوی اور برابری کے تعلقات نہیں ہوں گے اُس وقت تک معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔[۵] تحریکِ علی گڑھ کے تحت لکھی جانے والی تحریروں میں بچپن کی شادی کی روک تھام، تعلیم کی اہمیت و افادیت اور ستی کے رسم کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہِ عمل بھی دکھائی گئی۔ سر سید احمد خاں عورت کی تربیت کو خالص مشرقی انداز میں کرنے کے خواہاں تھے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کو ''تحریکِ نسواں'' کا علمبردار کہا جاتا ہے، نظریاتی اختلافات کے باوجود حالی سر سید کے مکتبۂ فکر کے سرگرم رُکن تھے۔ سر سید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق میں اصلاحی مضامین ،تو لکھے ،لیکن طبقۂ نسواں کے مسائل و مصائب کو یکسر فراموش کر گئے، جب کہ حالی کے نزدیک طبقۂ اُناث ہمارے معاشرے کا اہم جز ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے عورتوں کے مسائل کو سمجھتے ہوئے سماجی ناانصافیوں اور استحصالی رویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے، اِن مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ تہہ دِل سے عورتوں کا احترام کرتے تھے، وہ سر سید تحریک کے پہلے رُکن تھے، جنھوں نے عورتوں کے حقوق کی بازیافت کے لیے باقاعدہ آواز اُٹھائی، اُن کے دو مضامین 'ہمارے معاشرے کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے' اور 'قرونِ اولیٰ میں عورتوں کی حق گوئی'، اِس حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب ''بہشتی زیور'' میں بھی خانگی و عائلی زندگی کے قواعد و ضوابط اور مسائل کو پیش کیا گیا، لیکن بیشتر مقامات پر مولانا کا قلم انتہا پسندی کی حدوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب عورت کے روایتی تصور کی عکاس بن گئی۔ بیسویں صدی کے آواخر میں جب خواتین کے حقوق کے حوالے سے بہت سی مباحث نے جنم لیا، تو اُن کے زیرِ اثر خواتین یہ احساس اُجاگر ہوا کہ مردوں کی طرح وہ بھی اپنے خیالات و افکار اور سماجی مسائل کا برملا اظہار کر سکتی ہیں۔ ابتدائی سطح پر دولت مند اور امیر گھرانوں کی اُن عورتوں نے اِس میدان میں قدم رکھا، جو اصلاحی سوچ اور فکر کی حامل تھیں۔ مثلاً ''بیگم آف بھوپال'' اِس حوالے سے اہم نام ہے، اُنھوں نے عورتوں کے مسائل کو رسائل کے ذریعے نہ صرف عام کیا، بلکہ سماجی عوامل کو بے نقاب کرتے ہوئے نامساعد حالات میں اُن سے نبرد آزما ہونے کی صورت دکھائی۔ ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۷ تک کا دَور خواتین کے رسائل و جرائد کا زمانہ ہے، جن میں خواتین کے حقوق کی بحالی کے لیے آواز بلند کی گئی ، خصوصاً مسلم معاشرے میں عورت کی حالتِ زار کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے اسلام میں عورت کے مقام اور حقوق و فرائض پر روشنی ڈالنے کے علاوہ تانیثیت کے نظریات کا پرچار بھی کیا گیا۔ مولوی ممتاز علی کا ہفت روزہ ''تہذیبِ نسواں'' اور علامہ راشد الخیری کے رسالے ''عصمت'' میں اخلاقی و سماجی مضامین ، افسانے ، ناول اور اصلاحی قصے لکھے گئے ، جن کا مقصد مختلف طبقوں اور سماجی حلقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کے علاوہ تعلیمی و سماجی اور سیاسی حقوق سے آگاہی کے علاوہ معاشرے میں عورتوں کو درپیش مشکلات ، سماجی ناہمواریوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ خواتین کی صلاحیتوں کو منتظم کرنے ، تعلیمی میدان میں دلچسپی ، قانونی حق جوئی اور پردے کی رُکاوٹوں کو دُور کرنے کی کوشش تھا۔ خواتین نے اپنے سیاسی و سماجی میلانِ طبع کو ذاتی تجربات کی روشنی میں پرکھا۔ ۱۹۴۴۔۱۹۴۵ میں ''عورت غلام نہیں'' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جس میں بہت سی خواتین قلمکاروں نے بھرپور حصہ لیا، اِن میں خاور درانی،

رفعت حسین، سلیمہ بیگم، سلطانہ قاضیہ اور جمیلہ بیگم شامل تھیں۔ ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' میں لکھنے والی خواتین نے نئی طرز کے گھریلو اور خانگی ادب کی تشکیل کی، جس کے تحت معمولی سے معمولی مسائل سے لے کر بڑے بڑے معاملات وموضوعات پر قلم اُٹھایا گیا، مثلاً سعیدہ قمرالدین کے مضمون ''ماں کی صحت'' میں مناسب خوراک، تازہ ہوا، آرام اور مثبت وصاف ستھرے ماحول کو حاملہ عورت کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ سیدہ کشور آرا نے ''عورت اور تربیتِ کردار'' میں اپنے فرائض سے غفلت نہ برتنے والی عورتوں کی مثالیں دیتے ہوئے حضرت فاطمۃ الزہرا کو مثالی عورت قرار دیا۔ مسز اے شہید نے ''تربیت کے چند اصول'' میں والدین کے لیے بچوں کی تربیتِ کردار کو لازم متصور کیا۔

عورتوں کے گھریلو مسائل پر لکھے جانے والے ادب کا اور اہم موضوع ملازمت پیشہ عورتوں کی زندگی کے مسائل اور مشکلات بنا، کیوں کہ ملازمت پیشہ خواتین کے لیے گھریلو زندگی ایک بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ گھریلو اور سماجی زندگی میں توازن قائم کرنا خاصا کٹھن اور دشوار کام ہوتا ہے۔ عزیز فاطمہ نے ''لڑکیوں کی تعلیم اور دستکاری'' میں شادی شدہ لڑکی کی زندگی کے مسائل کی اصل وجہ ماؤں کا بیٹیوں کو صحیح تربیت نہ دینا قرار دیا۔ جمیلہ بیگم نے ''ہماری شخصیت'' میں سماجی ونفسیاتی دباؤ کی شکار عورت کا المیہ بیان کرنے کے علاوہ کم عمری کی شادی اور متوازن غذا کی عدم دستیابی سے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا ہے۔ رافعہ خاتون نے ''ہندوستان میں نسوانی تحریک کا مفہوم'' میں اِس تحریک سے وابستہ عورتوں کے لباس اور تراش خراش اور جدیدیت کی آڑ میں کلبوں میں جانا، انگریزی بولنا، سینما دیکھنا، مغربی تعلیم اختیار کرنے اور پردے کی بے جا مخالفت یا مرد وعورت کی غیر مساوی صنفی امتیاز کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے اُن کے حقوق وفرائض میں بے اعتدالی دُور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ فاطمہ بیگم نے ''مشنری سکول کی تعلیم ضرور رنگ لائے گی'' میں مشنری سکولوں کی تعلیم کو شیرینی میں لپٹے ہوئے زہر کے مترادف قرار دیتے ہوئے صحیح اسلامی تعلیمات کے حصول پر زور دیا۔ جمیلہ بیگم نے بھی ''مذہبی تعلیم'' میں بے راہ روی کی اصل وجہ اسلام سے دُوری قرار دیتے ہوئے کہا ہے، چوں کہ مرد کی حاکمیت کے حامل معاشرے میں عورت کے حقوق کی بازیافت انتہائی کٹھن کام ہے، اِس لیے خواتین کے استحصال کی عمومی وجوہات میں سماجی ناہمواری، غیر مساوی سلوک، شعور وآگہی کی کمی ہے۔ ہندوستان کی عورت کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک روا رکھے جانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں میں اہم ترین نام علامہ راشد الخیری کا ہے۔ وہ تانیثیت کے علم بردار تھے، اُنھوں نے پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر تانیثیت کو ادب کا اہم ترین موضوع بنایا، عورت کے مسائل اور اُن کو درپیش مشکلات کی بھرپور عکاسی کرنے پر اُنھیں مصورِ غم کا خطاب دیا گیا، کیوں کہ عورت کے سچے جذبات اور احساسات کی جو نمائندگی اُن کی تحریروں میں نمایاں ہے، اُس دور میں کسی کے ہاں نہیں ملتی۔ علامہ راشد الخیری نے ستی کی رسم کی مذمت، بیوہ کے بال کٹوا دینا اور کم کھانے کو دینا، دیوروں، جیٹھوں اور نندوں کے جھگڑوں، لڑکی کی پیدائش کو بوجھ سمجھنا، جبکہ بیٹے کو طاقتور اور قوت کا مظہر قرار دینے کے خلاف آواز بلند کی، اُن کا مضمون ''شریعہ کا خون'' اور ''عالمِ ارواح سے عورتوں کی صدا'' میں صنفی امتیاز برتنے کی نفی کرتے ہوئے مسلمان بچیوں کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ ''سودائے نقد'' میں علامہ راشد الخیری نے لڑکی کے وجود سے وابستہ والدین کے اوہام اور اُن رشتوں کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح فرضی خوف میں مبتلا باپ اپنی کم عمر بیٹی کی شادی بوڑھے سے کر دیتا ہے۔ ''شادی شدہ سے کنواری ہی بھلی'' میں راشد الخیری نے شادی شدہ عورت کی زندگی کے مسائل، مرد کی حاکمانہ طبعیت کی وجہ سے عورت کو ذہنی دباؤ اور تناؤ کا شکار کر کے کٹھ پتلی بنائے رکھنے کی مذمت کرتے ہوئے اولاد میں تاخیر کی

صورت میں عورت کی زندگی اجیرن کرنا، بچے کی پیدائش اِس کی نشو ونما اور تربیت کے علاوہ گھریلو اُمور کی تمام تر ذمہ داری اُس کے کندھوں پر ڈالنے کے باوجود، زندگی کو محض طعنہ بنا دینے کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے خیال میں مہر عورت کا بنیادی حق ہے اور مرد عموماً اِس حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ بُرے شوہروں سے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا جاتا، غیرت کے نام پر اور جائیداد کے حصول کے لیے باپ، بھائیوں کے ہاتھوں عورت کا قتل کر دیا جانا معاشرے کا لازمہ بن گیا ہے۔ محمودہ رضویہ نے ''عورت کی زندگی پر اک نظر'' میں مرد و عورت کے ساتھ برتے جانے والے امتیازی سلوک کی مذمت کی ہے، اُن کے خیال میں مرد بڑے سے بڑا جرم کر دے، تو بھی معاشرہ اُسے معاف کر دیتا ہے، جب کہ عورت کی معمولی غلطیوں پر درگزر نہیں کیا جاتا۔ امت الوحی نے ''رسمِ پردہ'' میں نام نہاد شرفا کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے کہ جو مرد بنے ٹھنے اور خوش گپیاں کرتے نظر آتے ہیں، اُن کی اکثریت ایسی ہے، جن کی بیویاں اِن کی عدم توجہی اور ضروریاتِ زندگی کی عدم دستیابی کی وجہ سے انتہائی خستہ حال دکھائی دیتی ہیں۔ غلام رسول کا ''ہم بیچاری عورتیں'' میں ایسی عورتوں کو موضوع بنایا ہے، جو گھر کی اساس ہونے کے باوجود مصروفیات اور یکسانیت کے انبار تلے دبی باہر کی تازہ ہوا کو ترستی ہیں، بعض مردوں کے نزدیک عورت محض روپے اور جسم کا نام ہوتا ہے۔ سلطانہ غاضیہ کے مضمون ''سازِ دلبری'' میں ایسے مردوں کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے، جو عورت کو بیٹی، ماں، بہن، بیوی کی صورت میں کوئی بھی حیثیت دینے کو تیار نہیں ہوتے اور اُن کے تمام حقوق چھین لیتے ہیں۔ بیگم نصیر الدین نے اپنے مضمون ''مسلمان عورتوں میں قومی بیداری'' میں ہندو کلچر کے زیرِ اثر ہونے والے اسلامی بگاڑ کی مذمت کی ہے، کیوں کہ اسلامی اصولوں سے کم علمی کی وجہ سے فرائض کی ادائیگی، احسن طریقے سے نہیں ہو پاتی۔ بیگم عظیم النسا ''عورت اور اِس کی غلامی'' میں اُن گھروں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے، جن میں لڑکی بچپن ہی سے باپ کی بے اعتنائی اور جور و ستم کا شکار رہتی ہے۔ شادی کے نام پر شوہر کی طرف دھکیل دی جاتی ہے، جہاں اُس کی مرضی و رضا کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ایک جبرِ مسلسل ہوتا ہے، جسے اُسے ہر حال میں سہنا پڑتا ہے۔ بیگم عزیز الحسن نے ''خوشگوار شادی'' میں ساس، بہو کی ازلی رقابت کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح ماں اپنے بیٹے پر تسلط جمانے کے لیے ہمہ وقت دبے لفظوں یا واضح الفاظ میں بہو کے خلاف اُکساتی رہتی ہے، کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی کامیاب زندگی کی علامت ہے۔ رفعت حسن نے ''عورت کی غلامی'' میں عورت کے تقدس واحترام کو اُجاگر کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ تمام محترم ہستیوں کو جنم دینے والی عورت ہی ہے۔ مرد کی بے اعتنائی اِسے نفسیاتی دباؤ سے دو چار کر دیتی ہے، جو بہت سی بیماریوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتداً، تانیثی ادب کی تخلیق میں ادبی رسائل ''تہذیبِ نسواں'' اور ''عصمت'' کی اشاعت تانیثیت کے حوالے سے سنگِ میل ثابت ہوئی۔ لہٰذا، اِن کی اہمیت وافادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ پلیٹ فارم تھا، جہاں تقریباً تمام اصنافِ ادب میں بہت سے قلم کاروں نے خامہ فرسائی کی اور خواتین کے اُن مسائل و مشکلات کو بے نقاب کیا ہے، جنھیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد تانیثی طرزِ فکر میں وسعت پیدا ہوئی اور عورتوں کے حقوق کی پامالی کے خلاف کھلم کھلا اظہار کیا جانے لگا اِس حوالے سے تانیثی محققین اور ناقدین نے تانیثی تحقیق وتنقید کی راہ ہموار کی۔

جنسی گراوٹیں اور جسم فروشی بہت بڑے سماجی زوال کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ ناقدین نے معاشرے کی اِس کجی پہلو کے مختلف محرکات کی نشاندہی کی ہے۔ منیر احمد کی کتاب ''عورت اور بازار'' میں جسم فروشی کا دھندہ کرنے والوں کے مختلف

ہتھکنڈوں، اڈوں اور ٹھکانوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور مختلف کیس ہسٹریوں کے ذریعے حقائق اکٹھے کیے گئے ہیں کہ کس طرح عورت اور ع مرد اوچھے ہتھکنڈوں سے ایک دوسرے کو موہ لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وقتی جذباتیت کی بنا پر ہنستے بستے گھر اُجڑ جاتے ہیں، اُنھوں نے نیکیوں کے سفید لبادوں میں چھپی ہوئی کالی بھیڑوں کو بے نقاب کیا ہے، ان تمام کیس اسٹڈیز سے منیر احمد نے نتیجہ اخذ کیا ہے:

''آج کے دَور میں آدمی صرف ایک گھرانے کے ساتھ ہی انصاف کر لے، تو غنیمت ہے، ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورت کے بارے میں سوچنا گناہ ہی نہیں، بلکہ جُرم بھی ہے، جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی ہو سکتی ہے وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ عورت کی دوستی عورت اور مرد کی دوستی مرد کے ساتھ ہی زیب دیتی ہے۔ باقی سب فراڈ اور دھوکہ ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ کا ایک عورت کے ساتھ تعلق ہو اور کچھ عرصہ بعد وہ آپ کے اعصاب پر سوار نہ ہو جائے۔''[۶]

کوٹھوں، کوٹھیوں، گھروں میں، چوراہوں پر، ہوٹلوں وغیرہ پر ہر طرح جسم فروشی کا دھندہ کرنے والیوں کے طور طریقوں کو بے نقاب کرتے ہوئے۔ منیر احمد نے لفٹ لے کر دھندا کرنے والی ایک فاحشہ کا ذکر کیا ہے:

''چلیں! جو طے کرنا ہے فوراً کریں۔۔۔ گاڑی روکیں اور اُستاد جی کو Payment کر دیں۔۔۔ ہمارے پیچھے، جو موٹر سائیکل پر، جو صاحب آ رہے ہیں، اُن کو Payment پے منٹ کر دیں، یہ کہتے ہی اُس نے گاڑی سے باہر ہاتھ نکال کر کوئی مخصوص اشارہ کیا اور آناً فاناً ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ کے قریب آیا اور اُس نے کچھ اِس انداز میں گفتگو شروع کر دی، گویا مجھ سے کسی جگہ کا ایڈریس معلوم کر دیا ہو۔''[۷]

انیس ناگی نے ایک ایسے عورتوں کے طبقے کی نمائندگی کی ہے، جو عام ہوتے ہوتے بھی عام نہیں ہوتیں، بلکہ شریف گھرانوں کی ہوتی ہیں، لیکن رات کی تاریکی میں پیشہ کرتی ہیں۔ خاوند سے علیحدگی کے بعد دو بچوں کی ماں سلائی کڑھائی سے گزر کرتی تھی، اُس نے جدید فیشن کے تمام تقاضے پورے کر رکھے تھے، تاکہ اپنے اولین شکاروں، منہ بولے بھائیوں، دیوروں اور باپوں کے ذریعے نئے پنچھی پھانس سکیں۔ ایسی عورتیں اپنی مظلومیت، بے چارگی کے رونے رو کر اور اپنی پارسائی اور مجبوری کے قصے بیان کر کے اپنے کام نکلواتی ہیں، جن میں روز مرہ زندگی کی ضروریات، بل، ضروریاتِ زندگی کی دیگر اشیا وغیرہ۔ ایسی عورتوں کا عمومی ہتھکنڈہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ لگنے والے شخص کو یہی یقین دلائیں گی کہ دُنیا میں وہ واحد انسان ہے، جس پر اُنھیں اعتبار اور بھروسہ ہے، اپنے دُکھوں کو آنسوؤں میں ڈبو کر اپنی بے بسی کی داستان رقم کریں گی، جن میں اُن کی نام نہاد انانیت اور خودداری بھی عیاں ہوگی، مرد کو ہر ممکن یہی یقین دلائیں گی کہ وہی اُن کا نجات دہندہ ہے، وہی اِس کے مسائل کا حل نکال سکتا ہے، دُنیا میں آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا وغیرہ وغیرہ۔ مرد اسی زُعم میں نہ صرف اپنی خوداری، عزت وغیرت، بلکہ خاندانی وقار کو بھی داؤ پر لگا کر اُسے 'مظلوم گھرانوں' کی مدد کرنا اپنا فرض اولین سمجھ لیتا ہے اور ضمیر کو میٹھی نیند سُلانے کے لیے مختلف فلسفے تراش لیتا ہے، یعنی غریبوں مظلوموں کی مدد، کہیں بُرائی کی طرف راغب نہ ہو جائیں، میری بڑی عزت کرتے ہیں، اور یہ کہ اچھوں کو ہر کوئی پوچھتا ہے، بُروں کو کوئی نہیں، لیکن وہ یہ آفاقی سچائی بالکل بھول جاتے ہیں کہ

اِس قسم کی باتوں کی اجازت نہ تو کوئی معاشرہ دیتا ہے، نہ اخلاق اور نہ ہی مذہب، کیونکہ اِس کا نتیجہ محض ذلت ورسوائی اور تباہی ہوتا ہے، کیوں کہ مدد کرنے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں، مالی امداد، راشن پانی، مذکورہ خاندانوں کو وقت دینے، اپنے آپ کو اِن کے گھر کا فرد متصور کر لینے سے حقائق نہیں بدلتے، ایسے سادہ افراد، جو اِس چکنی چپڑی باتوں کے اسیر ہو جاتے ہیں نہ صرف اپنی عزت ووقار کھو دیتے ہیں، بلکہ اِن سے متعلقہ اِن کے حقیقی حق دار بھی یہ عذاب سہتے ہیں۔ انسانی امداد لینے اور دینے کے اِس بوگس طریقے کو انسانیت کا مذاق اُڑانے کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ اپنی بہن کی ایک سہیلی کا مشورہ، جو اُسے تنگدستی اور شوہر کی طبعیت کے پیشِ نظر دیتی ہے:

"چلو چھوڑو اُسے وہ حرامزادہ تھا، اُسے مزا چکھاؤ، ایک آدھ بوائے فرینڈ بنالو، بہت سی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، اکثر مرد عورت کے بارے میں بدھو ہوتے ہیں، جب بھی موقعہ ملے اُنھیں ایکسپلائیٹ کرنا چاہیے، ایک ناراض عورت کی طرح زندگی بسر نہیں جاسکتی۔" ۸

عورت، جب غیر مردوں سے تعلقات پیدا کرتی ہے، تو اُس کی نفسیاتی وجوہات کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ یہ وہ عورتیں ہوتی ہیں، جو اپنے شوہروں کی طرف سے ناآسودہ ہوتی ہیں، اِن کی مناسب توجہ اور پیار سے محروم ہوتی ہے، اِس کا انتقام وہ مردوں سے تعلقات، دوستیاں پیدا کر کے کرتی ہیں:

"ایک شریف اور باعصمت دوشیزہ شادی کے بعد بعض خاص حالات میں، مثلاً شوہر سے نفرت، اِس سے جنسی عدم آسودگی یا دیگر وجوہات کی بنا پر اپنے دِل سے عصمت کا 'تقدس' اور شوہر کی 'امانت' کا خیال نکال کر ایک لمحے کی سوچ کے بغیر اپنا جسم اپنے کسی منظورِ نظر کے حوالے کر دیتی ہے، تو اُس وقت اِس شریف زادی اور رنڈی میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟" ۹

ڈاکٹر سلطانہ بخش نے فرزانہ آغا کے افسانوں میں معاشرتی ناہمواریوں، اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور سماجی مسائل کی عکاسی کے لیے "جوگ اور دوسری عورت" کے اقتباسات پیش کیے ہیں، جن میں عورت کی مظلومیت نمایاں ہے، اِس میں پڑھی لکھی، اَن پڑھ، خوش شکل اور بدشکل عورت کی تخصیص نہیں، اُن کے خیال میں عام عورتوں کی بہ نسبت ذہین، خوش شکل اور باصلاحیت عورتیں زیادہ ناقدری اور استبداد کی شکار ہوتی ہیں، کے:

"یہاں اگر مرد کو باصلاحیت عورت مل جائے، تو ہو بلاواسطہ عمر بھر عورتیں زیادہ راج کرتی ہیں اور مشرق کا مرد چھپ چھپ کر اُسے تراشتا ہے، سنوارتا ہے، دُنیا سے اُس کی خامیاں چھپاتا ہے، تم دیکھ لو ساری دُنیا میں اپنی قابلیت اور لیاقت کی دھاک بٹھا کر اپنے اندر جھانک کر دیکھو! تم کھوکھلی ہو چکی ہو۔" ۱۰

چراغ حسن حسرت نے "سرگزشتِ اسلام" جو کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کی مکمل تاریخ ہے، میں عورتوں پر گزرنے والے حالات کو اِس طرح لکھا ہے:

"اسلام سے پہلے عورتوں کی حالت بہت خراب تھی، اُنھیں باپ کی جائیداد میں سے حصہ نہیں ملتا تھا۔ لوگ جتنی عورتوں سے چاہتے بیاہ کر لیتے اور جب چاہتے الگ ہو جاتے تھے، لیکن اسلام نے عورتوں کا رتبہ بڑھایا۔ بیاہ اور طلاق کے قاعدے اور شرطیں مقرر

کیں۔ وراثت کا نیا قانون مقرر ہوا اور عورتوں کو بھی جائیداد میں حصہ ملنے لگا۔'' [۱۱]

''کیا عورت آدھی ہے'' کے دیباچۂ ثانی میں فہمیدہ ریاض ''زندگی کے موڑ پر'' کے زیرِ عنوان لکھتی ہیں کہ پاکستان میں عورت کے استحصال کی بنیادی وجہ اِسے انسان کی بجائے ایک شے متصور کرنا ہے، یہ شعبہ ہائے زندگی میں عورت کی شمولیت کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے عہدوں پر عورتیں کم ہی نظر آتی ہیں زیادہ تر کلرک، ٹائپسٹ، اسسٹنٹ سیکریٹری وغیرہ کے طور پر کام کرتی ہے۔ فہمیدہ ریاض کے خیال میں سوشلسٹ نظامِ انسانیت میں عورت اور مرد کا مساوی درجہ ہے ''عورت کو بہ حیثیت ایک انسان سماج میں ایک بھرپور فعال کردار ادا کرنے کی تمام سہولتیں نصیب ہیں، اِن میں وہ سہولتیں بھی شامل ہیں، جن کی ضرورت عورتوں کو ہی ہو سکتی ہے، جیسے چھوٹے بچوں کو رکھنے کے لیے وافر مقدار میں نرسریاں، بچہ ہونے کی صورت میں تنخواہ سمیت طویل چھٹیاں وغیرہ، یہ ایسی سہولتیں ہیں، جو عورتوں کی آزادی اور مساوات کو حقیقی معنوں میں قابلِ عمل بناتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کا نقطۂ نظر یہ ہے:

> ''جس طرح کسی مظلوم کے ذہن میں یہ خیال نہیں آسکتا کہ اسلام کا مقصد اِسے مظلوم ہی بنانا چاہتا ہے، اِسی طرح کوئی سمجھدار مسلمان کا تو ن یہ سوچ تک نہیں سکتی کہ اسلام اُسے جہالت، غلامی اور مظلومیت کی حالت میں تاابد رہنے کی تلقین کر سکتا ہے۔ دُنیا بھر کی عورتیں جن ادوار سے گزری ہیں اور گزرتی ہیں وہ اِن کے لیے کسی خاص مذہب نے پیدا نہیں کیے یہ دُنیا کے خطوں میں مروج قبائل، جاگیردارانہ نیم قبائلی، جاگیری معاشی اور سماجی نظاموں کی رسوم و رواج ہیں، جو عورتوں کو کسی بھی مخصوص صورتِ حال سے دوچار کرتی ہیں۔'' [۱۲]

''عورت، پردہ اور جدید زندگی کے مسائل'' میں وارث میر نے ''بہشتی زیور'' میں عورت کے فرائض کا، جو ملغوبہ پیش کیا، جس میں عورت انسان نہیں، بلکہ محض حکم کی غلام دِکھائی دیتی ہے اور بعض مقامات پر تو عورت کے بارے میں مولانا کا قلم اعتدال سے تجاوز کرتا دکھائی دیتا ہے:

> ''عورت کو شوہر کے ہر قسم کے احکام بلا چون و چرا بجالانا چاہیں، یہاں تک کہ اگر وہ کہے کہ ایک پہاڑ سے پتھر اُٹھا کر دوسرے پہاڑ تک لے جاؤ اور پھر دوسرے سے تیسرے تک اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔۔۔ شوہر کو کبھی بھی بُرا بھلا نہ کہنا چاہیے، کیوں کہ اِس سے دُنیا اور آخرت دونوں خراب ہوتی ہیں۔ شوہر سے کبھی زائد خرچ نہیں مانگنا چاہیے اور نہ ہی اُس سے کوئی فرمائش کرنے چاہیے، اگر عورت کی خواہش پوری نہ ہو، تو خاموش رہنا چاہیے اور اِس بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہے، کبھی کسی بات پر ضد نہیں کرنی چاہیے۔۔۔ اگر وہ ناراض ہو جائے، تو عذر و معذرت کر کے ہاتھ جوڑ کر اُسے راضی کرو، شوہر کو کبھی اپنے برابر کا مت سمجھو اور اُس سے کسی قسم کی خدمت مت لو۔'' [۱۳]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی خطۂ ارضی پر مرد ہے اور عورت کی حیثیت اُس کے آگے بے داموں کی لونڈی کی سی ہے، جو محض مرد کی جنبشِ اَبرو پر ناچنے والی کٹھ پتلی ہے، جس کی نہ کوئی اپنی حیثیت ہے نہ وقار، نہ خواہش اور نہ ہی ارمان، بلکہ ہر لحاظ سے کہتر و کمتر ہے اور اِسی طرح مولانا اشرف علی تھانوی کا مزید کہنا ہے:

''عورت اپنے ماں باپ کو دیکھنے کے لیے ہفتے میں ایک بار جا سکتی ہے، دوسرے رشتہ داروں سے سال میں ایک دفعہ، اِس سے زیادہ اِس کا حق نہیں، اِسی طرح ماں باپ بھی ہفتے میں ایک دفعہ ملنے آ سکتے ہیں۔ شوہر کو اختیار ہے کہ بیوی کے والدین کو زیادہ نہ آنے دے اور نہ زیادہ ٹھہرنے دے، وہ شادی، بیاہ، ختنہ، عقیقہ اور منگنی وغیرہ جیسی تقریبات میں آنے جانے کو نقصان دہ سمجھتے ہیں۔''[۱۴]

عورت کی روزمرہ زندگی کے لیے جس قسم کا ٹائم ٹیبل متعین کیا گیا ہے، نہایت نادر اور اچھوتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کیا عورت کے والدین بھی مرد کے تابع و زرخرید غلام ہیں، جو اپنی مرضی سے نہ اپنی بیٹی سے مل سکتے ہیں اور نہ ہی آ جا سکتے ہیں۔۔۔ مگر کیوں؟۔ شاید وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ آپؐ جب کبھی سفر سے واپس آتے تھے سب سے پہلے اپنی بیٹی فاطمۃ الزہرہؓ کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔ وراث میر اِس حوالے سے اپنا مؤقف پیش کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مزئین شکنجوں یعنی بین الاقوامی سامراجی منصوبے، جاگیردارانہ مفادات کا دوسرے مفادات سے گٹھ جوڑ اور فرسودہ اور غیر اسلامی توہمات کا اقتدار میں جکڑے ہوئے ہیں:

''عورت بھی اِنھی تین شکنجوں میں جکڑی ہوئی۔۔۔ اِس کے لیے ایک چوتھا شکنجہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کا اقتدار ہے اور مرد اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے معاشرے کے دوسرے رجعت پسندانہ اور منفی مفادات کو تحفظ دیتا ہے، وہ عورت کو پیداواری سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روکے رکھنا چاہتا ہے اور اُسے صرف اپنی تسکین کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔۔۔ ہماری عورت ذہنی اور نفسیاتی طور پر یہ کردار اُس وقت تک ادا نہیں کر سکتی، جب تک اُسے یہ شعور نہیں کرنے دیا جاتا۔''[۱۵]

عورت کے بارے میں قائم کردہ تصورات کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے سوزن گریفن لکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کا وجود عیاشی کے لیے ہے۔ عورتوں کو کم تنخواہوں والی آسامیوں تک محدود رکھنا، مشترکہ خاندان اور برادری کے کنٹرول میں زندگیاں داؤ پر لگانا، اُسے قابو میں لانے کے لیے ضروری ہے۔ عورت کے بارے میں یہ بھی غلط فہمی عام ہے کہ عورت کا دماغ کمتر درجے کا ہوتا ہے، کیوں کہ ہر مہینے ماہواری کے بارے میں قائم مفروضات کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے سوزن گریفن لکھتی ہیں کہ ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے حبشی بچہ، عورت اور معزور گورا بوڑھا برابر ہیں۔ عورت کا دماغ چھوٹا ہوتا ہے اور اِس کی ساخت دودھ پینے والے بچے یا کمتر نسلوں کے دماغ جیسی ہوتی ہے اور یہ کہ عورت کو جب دیکھو وہ مرد کے مقابلے میں جانور سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے:

''عورت میں حسِ انصاف کم ہوتی ہے اور اِن کے خیالات مردوں کے مقابلے میں جذبات کے تابع ہوتے ہیں۔ (عورت بہت کم معروضی ہوتی ہیں) کہا گیا کہ تہذیب کے فروغ کے ذمہ دار مرد ہیں، عمل کرنا مرد کا ہی حصہ چھوٹے بچے عمودی شکلیں بناتے ہیں اور مرد کی حیثیت سے وہ باہر کی دُنیا میں حقیقت کو ایک شکل دیتے ہیں۔''[۱۶]

''عورت اور اسلام'' مشمولہ ''عورت۔ زبانِ خلق سے زبانِ حال تک'' میں شاہین سردار علی مختلف اسلامی ممالک میں

احیائے اسلام کے حامیوں کی بنیاد پرستی کا نام دے کر سیکولر نظام کے حامی تبدیلیاں لانے پر زور دیتا ہے۔ مسلمان خواتین میں عورت و مرد کے مقام کا یقین اسلام کی روشنی میں کرنے کی کاوش نظر آتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے:

''اسلام میں عورت کے مقام پر بات کرتے ہوئے خود بخود ہماری توجہ اِن تضادات کی طرح مبذول ہوتی ہے، جو بقول شاہین سردار علی ہماری زندگی اور ذاتی زندگی کے درمیان موجود ہیں اور جنھوں نے عورت کو عام معاشرتی زندگی میں الگ تھلگ کر دیا ہے، چناں چہ اِس کے ماں، بیٹی اور بیوی کے کردار کو، تو خوب اُچھالا جاتا ہے، لیکن ایک انسان کی حیثیت سے اِس کے حقوق کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔'' ۱۷

پردے کے حوالے سے اُٹھنے والے اعتراضات اور پردے کی کیا حدود و قیود ہیں۔ وارث میر کا مؤقف ہے کہ بے جا پردے کی پابندی گھٹن کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا کرنے کا مؤجب بنتی ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے بھی اِس کے منفی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے:

''مشرقی عورتوں کی بیشتر بیماریوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کو صرف چار دیواری میں بند کر دیا گیا ہے کہ جس سے اِس کے اعصاب ضعیف ہو جاتے ہیں اور پٹھوں کی کمزوری اخلاقی قوتوں میں خلل پڑنے کا مؤجب ہوتی ہے، چناں چہ اِسی لیے پردہ نشین عورت اپنی نفسانی خواہشوں کی قید میں گرفتار رہتی ہے، کیوں کہ اعصاب کی صحت اور درستگی انسان کو اپنے جذباتِ نفسانی پر قابو رکھنے میں مدد دیتی ہے اور اُن کی کمزوری ہی اِس بات کا بڑا سبب ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کو روک نہ سکے اور اسیر ہوا و حرص ہو جائے، غیر فطری جنسی جرائم کے افراط کی وجہ صرف یہی ہے۔'' ۱۸

کشور ناہید نے ''عورت: خواب اور خاک کے درمیان'' لکھنے کا سبب اپنے اردگرد پھیلے ہوئے عورت کے مسائل کا گسٹالسٹ کو قرار دیا، وہ جذباتی استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ صنفی امتیاز، اکیلے پن اور تنہائی کا مؤجب بن رہا ہے، اِس شدید ردِ عمل کے محرکات ہیں، سب سے زیادہ عمل دخل اُس کی ماں کا استحصال تھا، جس کی عملی شکل قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی۔ اردگرد کے حالات و واقعات ذاتی تجربات اور لوگوں کے مسائل ہیں۔ ایک نامعلوم خط کا حوالہ دیتے ہوئے کشور ناہید لکھتی ہیں:

''میرے پانچ بچے ہیں، پہلے تین بھائیوں کو پالتی تھی، اَب بچوں کو پالتی ہوں، میاں دوسرے کمرے میں آرام کرتے ہیں، اُن کی نیند میں فرق پڑتا ہے، اِس لیے بچوں کو اُن کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہے، میں بھی اُن کے کمرے میں نہیں آسکتی ہاں، جب اُنھیں ضرورت ہوتی ہے، مجھے بُلا کر ضرورت پوری کر لیتے ہیں، یہ میرے عورت ہونے کی معراج ہے۔'' ۱۹

انتساب بھی کشور ناہید نے گھر اور گھر کی چار دیواری، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر یعنی دُنیا کے ہر ممالک میں ہونے والے عورت کے استحصال کو موضوع بنایا ہے:

''گھر میں والان در دالان خاموشی کی بیلیں اور اُکتاہٹ کے پھول کہ گھر سے باہر۔۔۔نو

مولود کی سنگساری ننگی عورتوں کی پریڈ، آدھی گواہی، اندھی عورت کا زنا اور چولھا پھٹنے سے
جلنے والی، پکڑی جانے والی عورتیں، عورتیں، عورتیں کہ ملک سے باہر۔۔۔ستی کے نام پر
جہیز کے نام پر اور بیٹی پیدا کرنے کے نام پر جلائی جانے والی عورتیں، جہاد کے نام پر بیوہ
ہونے والی اور مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں گودیں اجڑنے والی عورتیں۔''۲۰

عائلی قوانین سے عدم واقفیت کی بنا پر بھی عورت اپنے بہت سے نا آشنا رہتی ہے، یہی وجہ ہے قریباً ۷.۶ ۸۴ فیصد خواتین نان ونفقہ کا حق لینے سے محروم کر دی جاتی ہے، جب کہ شوہروں کی اکثریت یہ حق دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، اِسی طرح مرد روز مرہ زندگی میں عورت کو طلاق کی دھمکیوں کی زد میں رکھتا ہے:

''کیا عورت کے حق تلفی کے اِس قسم کے واقعات پر معاشرے کی بے حسی کا ذکر کرنا مغرب
پرستی ہے، یہ مغرب پسندی کا طعنہ بھی نہایت لغو، بے بنیاد، مضحکہ خیز اور بے بصیرتی پر مبنی
ہے، کیا عورت کو جہالت کے اندھیروں اور نفس پرست مردوں کے خلاف آمادۂ پیکار کرنا
غیر اسلامی فعل ہے۔''۲۱

وارث میر کے خیال میں عورت کو بھی مرد کی طرح قائم بالزات ہونا چاہیے، سہارے ڈھونڈنے کی بجائے 'نسوانی حقوق' کی بجائے 'انسانی حقوق' طلب کرنے چاہیں۔ معاشرے کے پے در پے ظلم وستم نے عورت کو جور پرست اور مرد کو جور پسند بنا دیا ہے، موجودہ دَور میں تعلیم کے میدان میں تو عورت نے مرد کو پچھاڑ دیا ہے۔ کتاب کے آخر میں وارث میر نے قصاص ودیت کے مسائل، قوانین اور علما کے نظریات کے مطابق بیان کیے ہیں اور اجتہادی نقطۂ نظر اپنایا ہے:

''کورانہ تقلید اور غلامانہ تقلید کی وجہ سے ساری اُمت کے قوائے فکر پر جمود طاری ہو گیا مجھے
اِس خرابی کے اصلاح کی صورت یہی دکھائی دیتی ہے کہ اجتہاد پر سے پابندیاں اُٹھائی
جائیں۔ ہمارے بڑے بڑے مصلحین کے نزدیک اجتہاد مسلمان پر فرض ہے اور کورانہ
تقلید گمراہی کے مترادف ہے۔''۲۲

بقول نعیم صدیقی عورتوں کو قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں پر اعتماد کرنا چاہیے، تاکہ زندگی کے ہر میدان میں ترقی کر سکیں: ''اگر عورت اپنے عورت ہونے پر کہتری کا احساس کرنا اور مرد کے مرد ہونے پر رشک کرنا چھوڑ دیں، بلکہ فطرت کی تقسیم کردہ صلاحیتوں اور ذمہ داریوں میں مطمئین ہو جائے، تو پھر افضلیت و مفعولیت کا سارا سوال ختم ہو جائے۔''۲۳ نعیم صدیقی نے عورتوں کے معاشرتی وتمدنی زندگی کے مسائل، خانگی و ازدواجی اُلجھنوں کے علاوہ عورت و مرد کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اگر چہ اِس سلسلے میں اُن کا قلم بعض مقامات پر جذباتی ہو گیا ہے۔ عورت، کو اُم المسائل سمجھنے والوں پر بھی اُنھوں نے کڑی تنقید کی ہے۔ نعیم صدیقی حقوقِ نسواں کے قائل ہیں، لیکن اُن حقوق کے، جو اسلام کے وضع کردہ ہیں اگر چہ کئی مقامات پر اُن کا قلم جذباتی اور جانب دارنہ ہو گیا ہے، تاہم اُنھوں نے عورت کی زندگی سے متعلق تمام مسائل اور سماجی مشکلات اور نفسیاتی اُلجھنوں کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ منیر احمد اپنی تحقیق کے نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں، تو ایسے معاشرے کا حامی ہوں، جس میں عورت کی عزت گھر کے اندر اور باہر
دونوں جگہ محفوظ ہو اور وہ بلا خوف وخطر اپنی رائے کا اظہار کر سکے۔ میں، تو خواتین کے

مساوی حقوق کا حامی ہوں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جہاں بھی عورت پر ظلم ہوتا ہے، اُس کا ۹۰
فیصد باعث خود عورت ہی ہوتی ہے۔ عورت ہی عورت کے مسائل کا مؤجب ہے۔''۲۴

ایک جسم فروش عورت کی مثال دی ہے، جو اپنے تجربے اور مشاہدے سے مصنف کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتی ہے:

''عورتوں کے زیادہ تر مسائل خود عورتوں کے ہی پیدا کردہ ہیں، لیکن اگر مرد مضبوط کردار کا
مالک ہو، تو عورت کیسے بھٹک سکتی ہے، مرد ہی عورت کو بازار میں لے کر آتا ہے، اگر مرد
دلچسپی نہ لیں، تو عورت وہ سب کچھ کیسے کر سکتی ہے، جو اَب ہو رہا ہے۔''۲۵

منیر احمد کے بے باک قلم نے جہاں بہت سی حقیقتوں کو منکشف کیا ہے، وہاں ہسپتالوں میں ہونے والے مکروہ دھندے کو بھی منظر عام پر لائے ہیں، اُنھوں نے ہوسٹل کے نچلے طبقے کی معاونت سے فوٹو گرافرز اور رپورٹرز کی مدد سے مختلف وارڈوں اور ڈاکٹر رومز میں ہونے والی مختلف سرگرمیوں کو بھی سامنے لائے ہیں:

''لاہور کے مختلف ہسپتالوں میں دِن اور خصوصاً رات کے لمحات میں مختلف وارڈوں اور
ڈاکٹرز روم کے اندر ہونے والی حرکات کے بارے میں تحقیق کی، تو پتہ چلا کہ ہسپتالوں
کے بعض کمرے جسم فروشی کا مرکز بن چکے ہیں اور نہ صرف ڈاکٹر، بلکہ اُن کے دوست بھی
نرسوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہیں اور یہ وہ بات ہے، جو ڈھکی چھپی نہیں۔ نرس جس
کا پیشہ بہت Sacred ہے، لیکن چند بدکرداروں نے اُس کو ذلیل کر دیا ہے، اَب نرس کی
ہمارے معاشرے میں وہ عزت نہیں رہی، جو کسی وقت ہوا کرتی تھی، جہاں کہیں نرس کا نام
آئے فوراً ذہن میں ایک ایسی عورت کا تاثر ابھر آتا ہے، جو معمولی رقم کے عوض جسم فروشی
کے لیے تیار ہو جاتی ہے، ایسی نرسوں سے بہتر، تو وہ طوائف ہے، جو اڈے پر بیٹھی ہے اور
جس کے بارے میں سب کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا ہے۔''۲۶

اور جب ایک مقامی ہسپتال کے ایم ایس سے اِس حوالے سے بات کی گئی، تو اِس نے برملا کہا:

''توبہ توبہ! میں کیا بتاؤں کہ میں خود کس قدر بے بس ہوں، بعض نرسیں، ارکان کابینہ،
سیاستدانوں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز افسران کی نگہداشت کا فریضہ انجام دے چکی ہیں اور
اُن کو کچھ کہا جائے، تو ہڑتال کی دھمکیاں دینا شروع کر دیتی ہیں۔''۲۷

رابعہ الربأ نے عورت (مصائب، وجوہات، نفسیات) میں عورت کی پیدائش، نکاح، مہر، نفقہ، طلاق، خلع، جہیز، ثقافت، وراثت، تشدد، تعویز، گنڈے، زنا، شک، بہتان، سمگلنگ، تعلیم، چاردیواری، مجرم عورتیں، تھانہ، جیل، فنونِ لطیفہ، آزادیِ نسواں، طلاق یافتہ، بیوہ اور غیر شادی شدہ عورتوں، دارُالامان اور دارالاقائمہ، خودکشی، گھر سے بھاگنا، ساس، نند، بہو کے جھگڑوں، اسلامی تعلیمات کا غلط استعمال، دیہاتی وشہری طرزِ زندگی کی محاسن ومصائب کو موضوع بنایا ہے۔ خواتین میں شعور وآگہی کی شمع فیروزاں کرنا اور کہتر و کمزور گردانے جانے کی وجوہات کو موضوع بناتے ہوئے، اِس کے تاریخی، سماجی، نفسیاتی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ رابعہ الربأ نے اُن عوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس کے تحت مرد کا دین محض کثرتِ زوج اور عورت پر حاکمیت کے علاوہ عورت کو کمتر ثابت کرنے کے لیے مختلف دلائل کا سہارا لینے پر موضوع

بنایا ہے۔ رابعہ الربأ نے لڑکی اور لڑکے کی تربیت میں امتیازی حیثیت کو بگاڑ کی وجہ قرار دیا ہے۔ لڑکی کی تربیت میں انتہا پسندی کا رویہ مردستائی عورت پیدا کر رہی ہے:

"انتہا پسندی یہ ہے کہ بیٹیوں کو اس قدر فوقیت دی ہوتی ہے کہ وہ غلط، بلکہ حرام راہوں پر چل نکلتی ہیں اور اُس کو ماڈرنزم کا نام دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ ماڈرنزم ضروری ہو گیا ہے، اِس طرح لڑکیاں، تو غلط راہوں پہ نکل ہی پڑتیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکے بھی لاپروائی کی وجہ سے صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں۔" ۲۸

کشور ناہید نے سرمایہ دارانہ نظامِ حیات پر گہری چوٹ کی ہے، اِن کے خیال میں عورتوں کو اپاہج کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ عورت کے ہر روپ کو دیکھتی ہے۔ استحصال کی مختلف شکلیں، اُنھیں پریشان کرتی ہیں: "میں ہر طرح کی عورت سے ملی ہوں، وہ جو بطور سیکس ورکرز کام کرتی ہیں، وہ جو خاوند کے ذریعے روز زنا کا شکار ہوتی ہیں، وہ جن کا باپ اور بھائی بھی نہیں چھوڑتے۔" ۲۹ انیس ناگی نے ایک عمومی مسئلے بچیوں کی شادی کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے کہ باپ اپنی خوبصورت اور ذہن بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خواہاں تھا، جب کہ ماں اُن کی جلد از جلد شادی کرانا چاہتی تھی۔ باپ کی فوتگی کے بعد بیٹی مزید بوجھ بن گئی، بالآخر اُس کی شادی بادلِ نخواستہ ایک ادھیڑ عمر کے شخص سے کر دی گئی، بعد میں پتہ چلا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ بھی تھا اور لاولد بھی، لڑکی کے تاثرات اس کی ذہنی و دِلی کیفیات کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

"میں گائے بھینس، تو نہیں ہوں کہ بچھڑا پیدا کرنے کے لیے ادھیڑ عمر کے آدمی کی غلام بن جاؤں، یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ میں اِس شخص کے ساتھ مجبوراً زندگی بسر کروں جسے میں پسند نہیں کرتی، اِس پر میری ماں نے تنگ کر جواب دیا تھا، بے وقوف عورت کو صرف مرد چاہیے ہے، جو روٹی کپڑا دے، شکلوں کا کیا ہے، کچھ سالوں بعد ایک سی ہو جاتی ہے۔" ۳۰

من کے یہ دلائل پڑھی لکھی لڑکی کو قائل نہ کر سکے اور اُس نے اِن جبری رویوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کر دیا: "ایک مرد کے ساتھ رہنا نہ رہنا میرا ذاتی مسئلہ ہے، تم فکر مت کرو میں روٹی کمانا جانتی ہوں، یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ روٹی کپڑے کے لیے عورت اپنا سب کچھ قربان کر دے۔" ۳۱

حلالہ کے موضوع پر لکھی گئی یہ کتاب مختلف سماجی مسائل کے حوالے سے ہے۔ کتاب کا ایک حصہ عورت کے بارے میں انسانی تاریخ میں قائم نظریات اور مختلف نظاموں کی روشنی میں عورت کی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور کیس ہسٹری کا طریقۂ کار اپناتے ہوئے مختلف مثالوں میں حلالہ کے مسائل، انا کی پیچیدگیاں اور اس کے فریقین پر اثر انداز ہونے والے نفسیاتی عوامل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنفہ کے مطابق کسی ایک فقہ کے تحت عورت ہی کفارہ کیوں بھگتتی ہے؟:

"مجھے اِس سے بحث نہیں ہے کہ حلالہ کا فعل شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا نہیں، لیکن ایک سادہ سی بات پوچھنا چاہتی ہوں، وہ یہ کہ جب ایک فعل کا آغاز سینکڑوں کی موجودگی میں ہوتا ہے، تو اُس کے نکاح خواں اور گواہوں کا ہونا ضروری ہے، تو اِس فعل کا انجام یک طرفہ کیوں؟ دائمی مفارقت کا عمل جب ہر مذہب میں گناہ تصور کیا جاتا ہے، تو حلالہ کی صورت میں یہ عمل کا ثواب کیسے بن جاتا ہے؟ اور اِس فعل کے بعد عورت کی مجروح

عزتِ نفس کا ذمہ دار کون ہے؟ ۳۲ـ

کشور ناہید نے ''بُری عورت کے خطوط'' میں ازدواجی ناآسودگی کے حوالے سے بڑے واشگاف لفظوں میں جنسی اُلجھنوں اور مسائل پر روشنی ڈالی ہے، اِن کے خیال میں مرد کو چاہیے کہ عورت کی کیفیات اور آسودگی کا اتنا ہی خیال کرے، جتنا کہ اپنے لیے رکھتا ہے:

> ''اِس ملک کی اسّی فیصد عورتیں نہال ہوئے بنا اور جانے بنا بچے اپنی کوکھ میں پالتی رہتی ہیں۔ میرا دوسرا بیٹا بھی بالکل اسی طرح میرے اندر پلا، اس دَوران مجھ پہ اتنی بِتا پڑی اتنے خواب ٹوٹے، سوتن نہ ہوتے ہوئے بھی کئی کئی سوتنوں کا دُکھ سہا۔ یہ Humilaiation کہ دُنیا کہے تم کیا چیز ہو اور میرا مرد دوسری عورتوں کے عشق میں رات گئے واپس گھر آئے۔'' ۳۳ـ

حاملہ ہونے کی صورت میں اکثر مرد اپنی بیوی پر زیادہ توجہ دینے کی بجائے اِدرگرد منہ ماریاں کرنا شروع کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے میاں بیوی میں ذہنی دُوری پیدا ہونے لگتی ہے۔ شوہر بچوں اور بیوی جنھیں اِس کے بھرپور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، اپنے لیے نئے دوستانے تلاش کرنے لگتا ہے، اِس کی یہ عدم توجہی حاملہ عورت کی نفسیاتی و جسمانی صحت کو بری طرح متاثر کرتی ہے اور اِس کا براہِ راست اثر بچے پر پڑتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب و معاشرت میں عورت کا ستی ہونا نیک کام سمجھا جاتا تھا۔ بیوہ عورتوں کو سر منڈا کر ایک علیحدہ ادارے میں رکھی جانے کی رسم ابھی تک جاری ہے: ''یہ بھی آج تک ہوتا آرہا ہے کہ جنوبی ہندوستان میں جوان ہوتی بچی کا پہلا استعمال پنڈت کرتا ہے، جس کو ہمارے سرداروں، پیروں اور وڈیروں کے علاقے میں نتھ اتروانا کہتے ہیں۔'' ۳۴ـ

''گرہن'' کی حاملہ عورت اپنے شوہر کی عدم توجہی کا شکار ہے۔ ہمارے معاشرے میں بقول فاطمہ حسن عورت کے لیے پناہ گاہیں بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ خود سے اِسے مضبوط بنانے پر توجہ نہیں دی گئی، اِسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھنے اور پردے اور دیواروں میں قید کرنے کو اِس کے تحفظ کا نام دینے کے لیے کہتی ہیں کہ ہم وہ نہیں، جو آپ نے سمجھا ہے اور لکھا ہے ۳۵ـ فاطمہ حسن نے بیدی کے افسانے ''مہاجر'' اور ''سونفیا'' کی مثالیں دے کر تنقید کرتے ہوئے اپنا مؤقف پیش کیا ہے کہ اگر بیدی مذکورہ افسانوں میں عورت کے حوالے سے چند جملے نہ لکھتے ،تو کہانی پر کوئی اثر نہیں پڑنا تھا، لیکن اِس سے اِن کے ذہنی رویے کا پتہ چلتا ہے، جو ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ورنہ بیدی کو غیر ضروری طور پر بلا وجہ عورت کی تضحیک پر تبصرہ کوئی فنکارانہ خوبی نہیں۔ ۳۶ـ

انیس ناگی نے ''ناراض عورتیں'' میں اُن عورتوں کو موضوع بنایا ہے، جو کوٹھے کی زینت تو نہیں اور نہ ہی کوٹھیوں، ہوٹلوں کی، بلکہ وہ عام گلی محلوں میں رہنے والی گھریلو عورتیں ہیں، جو شادی شدہ زندگی بھی گزارتی ہیں، نماز قرآن بھی پڑھتی ہیں، لیکن اُن کی پارسائی کے جوہر کھل کر اُس وقت سامنے آتے ہیں، جب کوئی غیر مرد دوست، بھائی، دیور، باپ یا ماموں، چچا بن کر اُن کی دہلیز پھلانگتا ہے، ایسی عورتیں عموماً بال بچے دار ہوتی ہیں، کچھ مطلقہ ہوتی ہیں کچھ بیوہ اور کچھ کے شوہر پردیس سدھار گئے ہوتے ہیں، اِن کی ایک قبیح صورت یہ بھی ہے کہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی یہ خواتین خیانت کی مرتکب ہوتی ہیں، اِن گھریلو طوائفوں کا طریقہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ محرم رشتوں کے نام پر اپنے ''نجات دہندہ'' کو سارے خاندان سے متعارف کرائے رکھیں گی، بظاہر یہ ''نجات دہندہ'' اِن کے خاندان کا محسن، اُنھیں مشورے بھی دیتا دکھائی دے گا، اِن کے مسائل کو حل

کرتا اور مالی معاونت کرتا بھی نظر آتا ہے۔ جال میں پھنسنے والوں میں سے، جو تو کردار کی پختگی کا مالک ہوتا ہے وہ روپیہ پیسہ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی زندگی، تو برباد کر ہی لیتا ہے۔ بظاہر دل پشوریاں، تو چلتی ہیں، لیکن جنسی سطح پر گراوٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ ایسی عورتوں کے ڈسے ہوئے 'بھائی' اور 'دوست' اگرچہ اِن عورتوں کے بتائے ہوئے دِن اور وقت کے مطابق گھروں میں پہنچتے ہیں، لیکن ذلتوں کے مہیب اژدہے، اُن کے گرد پھن پھیلائے ہمہ وقت موجود رہتے ہیں، اُنھیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو کیا پتہ وہ اِن کے خاندان کا فرد ہے، لیکن زمانہ بلا کی نظر رکھتا ہے۔ یہ دو دھاری تلوار ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتی، اِس کا خمیازہ اُن کے متعلقہ لوگوں اور اولاد کو لازماً بھگتنا پڑتا ہے۔ انیس ناگی ایسی عورتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میں بہت سی شادی شدہ شریف عورتوں کو جانتا ہوں، جو جنسی طور پر اپنے خاوندوں سے غیر مطمئین ہیں، اِس لیے مجبوراً وہ اور طرف رُجوع کرتی ہیں، ہر مذہب نے اِس ٹیڑھی کمان کو سیدھا کرنے کے لیے احکام جاری کیے ہیں، عورت کو جنس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔'' ۳۷

امین احسن اصلاحی نے عورتوں کی آزادی و حقوق کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے، اُنھوں نے نظریۂ مساوات کا موازنہ کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے ہیں، اسی طرح پردہ سے متعلق مسائل، تو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کرنے کے ساتھ اِس کی ضرورت و اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ حکومت میں عورت کے مساوی حقوق پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اِن کے خیال میں عورتوں کے اجتماعی حقوق و فرائض کا مسئلہ اسلام میں اِس قدر واضح اور صاف ہے کہ اِس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے خاص تحقیق وکاوش کی ضرورت نہیں ہوتی، اِن کا کہنا ہے:

> ''عورت بھی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حقوق رکھتی ہے اور اُس کے حقوق بھی اِسی طرح قطعی اور واجب الادا ہیں، جس طرح مرد کے حقوق قطعی اور واجب الادا ہیں اور دوسری طرف معاشرتی نظام میں (قرآن) مرد و عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے اور اس ترجیح کو نظامِ معاشرت میں توازن قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتا ہے، کیوں کہ خاندان کی کفالت کا اصلی بوجھ مرد اُٹھاتا ہے۔'' ۳۸

زاہدہ حنا پاکستانی عورت سے روا غیر انسانی سلوک کی مذمت کرتی ہیں اور عائلی نظام میں تبدیلی کی خواہاں ہیں، وہ ۱۹۶۱ میں جاری ہونے والے عائلی قوانین کا حوالہ دیتی ہیں، جس کے مطابق لڑکیوں کی شادی کی کم سے کم عمر مقرر کی گئی، مردوں کی دوسری شادی پر بڑی حد تک روک لگادی گئی اور اِس کے لیے پہلی بیوی کی تحریری اجازت لازمی ٹھہری، اِن ہی قوانین کے تحت نکاح اور طلاق کا اندراج لازمی ٹھہرا اور نکاح نامے میں عورت کے طلاق کے حق کی شق بھی شامل کی گئی۔ طلاق کی صورت میں بچوں کی تحویل اور نان نفقہ کی ادائیگی کے معاملات بھی نسبتاً بہتر اور عورتوں کے حق میں ہوئے ۳۹ زاہدہ حنا، ضیا دَور میں ۵ جولائی ۱۹۷۷ میں اور ۱۹۷۹ میں قائم کردہ اسلامی تعزیراتی قوانین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اِن کے تحت عورتوں کے حقوق سلب کیے گئے۔ ۱۹۸۴ میں قانونی شہادت اور شریعت بل کا بھی یہی نتیجہ نکلا اور جب اِن مرد و عورت کے امتیازی قوانین کے خلاف خواتین تنظیمیں اُٹھ کھڑی ہوئیں، تو اِن پر وحشیانہ تشدد کیا گیا۔ صفیہ بی بی نامی اندھی لڑکی کا مقدمہ ''ضیاالحق برانڈ اسلامی عدل کا شاہ کار'' ہے، اِس کے باپ اور بیٹے نے عصمت دری کی، جس نتیجے میں وہ ایک بچے کی ماں بنی، اِس گھناؤنے جُرم کی چار گواہ نہ ملنے پر دونوں رہا کردیے گئے، جبکہ صفیہ بی بی، چوں کہ ماں بنی تھی، اِس لیے زنا'' ثابت''

تھا، چناں چہ حکم نامۂ زنا کے مطابق سنگسار کی سزا سنادی گئی۔ ۳۹ فکرِ معاش کے حوالے سے امین احسن اصلاحی کا کہنا ہے کہ خاندان کی کفایت کا بوجھ اُٹھانے کی قابلیت اللہ تعالیٰ نے مرد ہی میں رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ بیوی بچوں کی نان نفقہ کا ذمہ دار مرد ہوتا ہے۔ مرد کی طرح عورت کو بھی طلاق کا پورا حق حاصل ہے، اسی طرح تمام مدنی وسیاسی حقوق وفرائض میں عورت کو بھی مرد کے دوش بدوش حصہ لینے کا پورا حق ہے۔ عورت امام کیوں نہیں بن سکتی؟ اِس حوالے سے امین احسن اصلاحی کا کہنا ہے: ''عورت فطری وجنسی خصوصایت اور مرد کے جنسی میلانات کی وجہ سے عورت کی امامت میں یہ کھلا ہوا اندیشہ ہے کہ نماز کا واخلاقی اور رومانی مقصد ہی فوت ہوجائے، جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے، اس وجہ سے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی۔'' ۴۱ فکرِ معاش کے موضوع پر بات کرتے ہوئے امین احسن اصلاحی کا قلم خاصا جذباتی ہوگیا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق، چوں کہ فکرِ معاش کی ذمہ داری عورت کے کندھوں پر نہیں ڈالی گئی، تو پھر عورتیں خود کو دوہری ذمہ داریوں میں کیوں مبتلا کرتی ہیں، لکھتے ہیں: ''لیکن اَب اِسے بتایا جارہا ہے کہ لعنت ہے اس زندگی پر، جو باپ کے بخشے ہوئے ٹکڑوں اور شوہر کے دسترخواں کے ریزوں پر بسر ہوگی، تُو خود سے گھر سے نکل، جدوجہد کر، شکار مار، خود بھی کا کھا اور دوسروں کو بھی کھلا۔'' ۴۲

اِسی طرح عورت ترقی کے حوالے سے بھی امین اصلاحی کے بقول عورتوں کو بھڑکایا جارہا ہے:

> ''اس کو یہ سمجھایا جارہا ہے کہ اِس کی اصلی ترقی مردوں کی ریس کرتے اور ہر پہلو سے ان کی نقل اُڑانے اور زنانہ کام چھوڑ کر مردانہ کام کرنے میں ہے اور اِس کے بعد ایک ترقی یافتہ عورت کے لیے اگر کوئی زنانہ کام موزوں ہے، تو بس یہ کہ وہ ناچ گانا سیکھ کر اور جسم بنانے کے فن سے واقف ہو کر مخلوط سوسائٹی میں مردوں کی تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرے۔ ۴۳

عورتوں نے فکرِ معاش کے سلسلے میں، جس طرح عملی زندگی میں قدم رکھا ہے، اُسے معاشی طور پر خودمختاری اور معاشی آسودگی کس حد تک، تو حاصل ہو ہی گئی ہے، لیکن اِس کی گھر سے دوری اور مصروفیات کا سب سے بڑا شکار بچے ہوتے ہیں، کیوں کہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں مرد بالکل ساتھ نہیں دیتے:

> ''ورکنگ مدرز کا طریقہ مختلف ہوتا ہے، اِن کو فکر لگی ہوتی ہے کہ اِن کی غیر موجودگی میں بچے کیسے اور کتنے مصروف رہیں، کس طرح ٹیوشن پڑھیں، قرآن پڑھیں، کھیلیں اور محبت کریں۔ ورکنگ مدرز، چغلیاں نہ کرتی ہیں اور نہ سنتی ہیں، اِس لیے ورکنگ مدرز کے بچوں کو دلچسپی کا ماحول کم محسوس ہوتا ہے۔ اپنی ہی ماؤں کے ساتھ، پھر وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں کی دوسری مصروفیات، دخل اندازی کر رہی ہیں، اس حق پر، جو صرف اور صرف اِن کا حق، اِن کا وقت ہوتا ہے۔'' ۴۴

''معاشی عمل اور خواتین'' مرتبہ خاور ممتاز، فریدہ شہید مشمولہ ''عورت۔ زبانِ خلق سے زبانِ حال تک'' میں پاکستانی مزدورں، محنت کش عورتوں کے اعداد وشمار اکٹھے کر کے نتیجہ اخذ کیا گیا ہے:

> ''بڑی صنعتوں میں کارکنوں کی کم گنجائش کی بنا پر اِس شعبہ کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ زیادہ تر عورتیں گھروں میں بیٹھ کر فی نگ کے (پیس کریٹ) حساب سے جز وقتی کام کرتی ہیں۔ عالمی جنگ کا ہی تخمینہ ہے کہ اِس شعبہ کی پندرہ لاکھ عورتوں میں سے ستر فیصد وہ ہیں، جو

گھروں میں رہ کر جز وقتی کام کرتی ہیں۔ باقی کی عورتیں جو اکثر غیر ہنر مند ہوتی ہیں، گھروں سے باہر نکل کر مینوفیکچرنگ، کنسٹرکشن اور سروسز میں کام کرتی ہیں، ان خواتین کو چوں کہ کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے اس لیے ان کا بہت استحصال ہوتا ہے۔'' ۴۵

''عورت ۔ ۔ ۔ بطور جز وقتی کارکن'' میں گھر کی چار دیواری کے علاوہ عورت غربت اور مجبوریوں کی خاطر گھر کی چار دیواری سے باہر کام کرنے، محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔ ہماری دیہی عورت شروع ہی سے زرعی اور پرورشِ حیوانات کے شعبے سے منسلک ہیں۔ کشور ناہید کے بقول، اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والی عورتوں کے اعداد و شمار بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ تقریباً ۹۲.۸ فیصد عورتیں کچی اینٹیں بنانے، مٹی کھودنے، مٹی ملانے، تھیلوں میں بھر کر گدھوں پر لادنے، بھٹوں میں پکائی کے لیے بھرنے اور پکی اینٹیں ڈھونے کا کام کرتی ہیں۔ بھٹہ مزدور یہ عورتیں ہر روز ۱۰ گھنٹے اور ۴۵ منٹ کام کرتی ہیں، جو کے صرف کیے گئے کام کا ۲۰ فیصد کم ہوتا ہے۔ پھر یہی عورت گھریلو کام کاج، کپڑے، برتن، کھانا، بچوں کی دیکھ بال کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ چھٹی والے دِن اینٹوں کو گننا، ترتیب لگانا بھی اِس کے ذمہ ہوتا ہے، یہ عورتیں حمل کے دوران پورے وقت تک کام کرتی ہیں اور ڈلیوری کے دس دِن کے بعد پھر سے مزدوری پر آجاتی ہیں۔ ۴۶ مزدور اور محنت کش عورت، جو گھر اور جائے ملازمت پر اپنے فرائض بھرپور طریقے سے انجام دیتی ہیں، حتیٰ کہ گول گپے حلیم، دال چاول، چاٹ اور ایسی ہی بے شمار چیزیں گھر کی عورتوں کو محض نکھٹو کہا جاتا ہے، گھر بیٹھی بنا کر دیتی ہیں۔ مرد بازار میں بیچتا ہے۔ عورت سارا دِن جان مارتی ہے، بناتی ہے، ہر قسم کی طعنے گالی گلوچ سنتی ہے، ایسی عورت کی مزدوری کی قیمت کون دے گا، اُسے مزدور ہی شمار نہیں کیا جاتا۔ ۴۷ انعام الرحمٰن سحری نے اپنی کتاب ''عورت جرائم کی دلدل میں'' میں عورتوں کے مجرمانہ معاملات میں ناجائز تعلقات، رقابت سرِ فہرست ہیں، جو خواتین اپنے خاوندوں کے قتل میں ملوث ہوتی ہیں، اُس کی بنیادی یہ ہے کہ وجہ خاوند کا متشددانہ رویہ، مار پیٹ، گالی گلوچ عورت کی عزتِ نفس کو مسلسل کچلتے رہنا، دھوکا و فریب اور طنز و تعریض خوف پیدا کر دیتا ہے، جس سے غصہ پیدا ہونا بھی قدرتی امر ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی خواتین طیش میں آکر اپنے شوہروں، بچوں وغیرہ کو قتل کر دیتی ہیں:

> ''پاکستان کی ہی مثال لیجیے یہاں تعلیم یافتہ عورت اپنی گزر اوقات کے لیے یا معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے پہلے قابلِ عزت پیشے ہی چنتی ہے، پھر چند ایک ایسی عورتیں، جن کی تربیت یا ماحول میں گڑبڑ ہوتی ہے، وہ جلد روپیہ حاصل کرنے کے لیے اور زیادہ کے حصول کے لیے کال گرل بننا پسند کر لیتی ہے، جب وہ ایک بار اس راستے پر چل نکلتی ہے، تو پھر اُس کا کوئی اخیر نہیں، یہ اور بات کہ کچھ عرصہ بعد ہی وہ اس کاروبار سے نکل آنے کی کوشش کرتی ہے، مگر کامیاب نہیں ہو پاتیں۔'' ۴۸

ملازمت پیشہ خواتین کو ہراساں کیے جانے کے بڑھتے ہوئے رُجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زاہدہ حنا کا کہنا ہے کہ ہراساں کیے جانے کا عمل نہ صرف لڑکوں، بلکہ دفتروں میں بھی جاری ہے، ''ذرائع ابلاغ کا صنفی رویہ'' پر بحث کرتے ہوئے زاہدہ حنا کا کہنا ہے کہ اُردو رسائل و جرائد عورت کا، جو چہرہ ہمیں دکھاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کا خاندان اور گھر کو بنا کر رکھنے کی تمام ذمہ داری صرف عورت کی ہے۔ مرد ہر نوعیت کا ظلم کرنے، بے وفائی برتنے اور غیر ذمہ داری کرنے کا پیدائشی حق رکھتا ہے ۴۹ انیس ناگی نے غیر ملکی این جی او کی دعوت پر عورتوں کے بارے میں دستاویزی فلم بنانے کی حامی بھری، تا کہ

اُن کی زندگی کے مختلف اور پہلوؤں کو یکجا کیا جائے، اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے خواتین کے تعلیمی اداروں، دارالامان سے معلومات حاصل کیں۔ سب سے پہلے اُنھوں نے وکلا خواتین کو جائے ملازمت پر ہراساں کیا جانا، گرسنہ نگاہوں سے طوائف، گالی گلوچ، ذو معنی فقرے، رومینٹک گانے سب عورتوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ دو وکیل عورتوں کے اِس بارے میں وکلا، کلرکوں اور عام لوگوں کے تاثرات قلمبند کیے ہیں:

''پہلا وکیل: ہاں واقعی پیشے کی مجبوری ہے، یہ بڑے بڑے چیمبروں میں کام کرتی ہیں، وہ گاہک میرا مطلب ہے، یہ سب ناراض عورتیں ہیں، جو انتقام لینے باہر نکلی ہوتی ہیں، دوسرا وکیل: خواجہ تم ایک بے وقوف کشمیری ہو، اِسی لیے تم لوگوں کو کشمیر نہیں مل سکا، لوگوں کی عزت کرنا سیکھو، چل ہمارے کیس کو آواز پڑ گئی ہے۔'' ۵۰

''مسلمان عورت'' میں ابوالکلام آزاد نے عورت کے فرائض، پردہ، مسلمان عورتوں کا طریقۂ تعلیم، بغاوت اور عورت کی فطری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے میں تربیت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں:

''کتنے بڑے بڑے تمدن محض اس وجہ سے مٹے ہیں کہ وہاں زندگی کی اس دوئی میں ترتیب ملحوظ نہ رکھی گئی، یعنی رزم و بزم کی سرحدوں کو ملا دیا گیا۔ عورت، تو اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ ماں بنے اور امومت کے شرف سے بہرہ ور ہو، اس کو ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا گیا، اِس صورتِ حال کو موجودہ دَور کا پڑھا لکھا، مگر بے وقوف انسان، جس قدر جلد محسوس کر لے یہ اس کے لیے بہتر ہے، ورنہ فطرت اپنا فرض سرانجام دیتے ہوئے اسے تمدن کو تہہ و بالا کر دے گی، جس کی بنیاد ادنیٰ درجہ کی خواہشوں کی تکمیل پر قائم ہے۔'' ۵۱

مذکورہ بالا اقتباس میں مولانا محمد حنیف ندوی کا یہ کہنا: ''عورت، تو اِس لیے پیدا کی گئی تھی کہ ماں بنے'' یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کیا مرد اِسی لیے پیدا نہیں کیا گیا کہ باپ بنے؟۔ عورت کے بارے میں اِس قسم کے جملے عمومی تاثر یہ پیدا کرتے ہیں کہ محض عورت شادی اور اولاد کی ذمہ دار ہے، اُس کی زندگی کا واحد مقصد اُولاد پیدا کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ بانجھ عورت کو نہ صرف سماجی سطح پر ناپسندیدگی اور دھتکار کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ اپنی نظر میں تصورِ ذات بھی مجروح ہوتا ہے اور وہ خود کو مورِدِ الزام سمجھنے لگتی ہے۔ ایسے ہی جملوں کے ابلاغ کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ مرد نفسیاتی طور پر گھر کی ذمہ داری اور اولاد کی پرورش کے معاملے میں لاپروائی برتنے کی وجہ سے پورے کنبے کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔

سیمون دی بووا The second sex کا ترجمہ یاسر جواد نے ''عورت'' کے نام سے کیا ہے۔ ''عورت'' میں عورت کو درپیش مسائل، اُن کے درپردہ عوامل کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قانون دان، پادریوں، ادیبوں اور سائنس دانوں نے عورت کو مرد کا ماتحت بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ عورت کے حوالے سے قدیم روایات میں بھی عورت کو پست اور مرد کو برتر سطح پر پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فرانسیسی ادب میں بھی عورت کو ناقص العقل اور کمتر درجے کی مخلوق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ روم میں غیر شادی شدہ عورت کو اپنی جائیداد کا نظام سنبھالنے کی اجازت دی گئی۔ اٹھارہویں صدی میں عورت کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کیے جانے پر زور دیا گیا، جب کہ انیسویں صدی میں آزادیِ نسواں کے لیے آواز بلند کی گئی۔ معیشت میں عورتوں کی فعالیت نے مزدور طبقے کے اندر بھی مردوں نے عورتوں پر پابندیاں عائد کرنی شروع کیں۔

رجعت پسندوں نے عورتوں کی آزادی کی مخالفت کی ہے، وہ اس بات کی حمایت کرتے تھے کہ عورتیں کبھی بھی مرد کے برابر نہیں ہوسکتیں، جب کہ آزادیِ نسواں کے حامیوں کا کہنا ہے کہ عورت کمتر درجے کی مخلوق نہیں، بلکہ جیتی جاگتی انسان ہے۔ فرائڈ اور ایڈلر کے حوالے دیے گئے ہیں۔ عورت کی نفسیات کو بیان کرنے کے لیے ایڈیپس کمپلیکس اور الیکٹرا کمپلیکس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لڑکی کی پیدائش سے لے کر شادی بیاہ کے معاملات تک مختلف سماجی اوہام یا مفروضات وابستہ کیے جاتے ہیں، مثلاً عورت کی ماہواری، ایامِ حمل اور دودھ پلانے کے دَوران ایڈیپس اُلجھن کے تحت مرد عورت کے خلاف دفاعی انداز اختیار کرتا ہے، کیوں کہ وہ دُنیا کے بہم ماخذ اور غیر واضح کامیابی نشو ونما کر ظاہر کرتی ہے۔۵۲؎ عورت کے متعلق قائم کردہ نظریات کے حوالے سے سیمون دی بووا کا کہنا ہے:

> ''وہ اپنے بارے میں قائم کردہ نظریات کے مطابق سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاتی ہے، نہ کہ محبت اور خوشی کی عیاں اصلیت کی مطابقت میں، یہ جینے کی معقول وجوہات کے لیے ہر شوق، جستجو، لاعلمی، تعصبات، دھوکہ بازیوں کی تاریکی میں سے گزر کر جذبات کی پر ہیجان دُنیا میں جانے کی تلاش ہے، یہ حسرت تا موت، عظمت یا شرمندگی کا لامحدود خدشہ ہے، جس نے اِن عورتوں کی زندگیوں کو رفعت عطا کی۔''۵۳؎

لیلیٰ احمد نے اپنی کتاب ''عورت، جنسی تفریق اور اسلام'' میں اسلام سے قبل مشرقِ وسطیٰ کی تہذیبوں میں عورت کے بارے میں روا رکھے جانے والے ناروا سلوک اور اِس کے بارے میں خام نظریات کی وضاحت کی ہے۔ طلوعِ اسلام کے وقت عورتوں کی حالتِ زار کے بارے میں عبوری و بنیادی مباحث کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کے عورت کی زندگی پر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے نئے مباحث کے نئے دریچے وا کیے ہیں اور اِس کے لیے سماجی و فکری سطح پر عورت سے متعلقہ نظریات کی وضاحت بھی کی ہے۔ ہر دَور میں مرد و عورت کے باہمی تعلق، ان کے حقوق و فرائض کا تعین مختلف انداز میں کیا گیا ہے۔ مرد و عورت کے بارے میں غیر مساوی اندازِ فکر کی مذمت کرتے ہوئے قرآن اور قانون فطرت کی روشنی میں اِس کی وضاحت کی ہے، ساجد علی کے بقول: ''رسوم ورواج عورت کے دُشمن اور عقل اس کی حامی ہے۔ عورت عقلی دلائل کی بنا پر مساوی سلوک کا مطالبہ کر سکتی ہے، اِس خطرناک راستے کو بند کرنے کے لیے مردوں نے عورت کو ناقص العقل قرار دے دیا۔''۵۴؎ سماجی روایات عورت اور مرد کے مخصوص کردار، جو وہ معاشرے میں ادا کرتا ہے، احسن ترین متصور کرتی ہیں، اِن کے خیال میں عورت کی تخلیق کا واحد مقصد محض مرد کی جنسی خواہشات کی تسکین کا سامان سمجھتی ہے، مگر جب تانیثیت کے رُجحان نے غلبہ پایا، تو اِس کے اثرات تمام اقوامِ عالم میں کسی نہ کسی درجے پر مرتب ہوئے، کیوں کہ محض جنس پر عورت کے پورے وجود و زندگی کو موقوف کر دینا کسی طور پر درست نہ تھا، یہی وجہ ہے معاشرے میں عورت کی حیثیت، جائے ملازمت پر حقوق کا تحفظ، جنسی طور پر ہراساں نہ کیا جانا، شادی بیاہ میں لڑکی کی خواہشات کو فوقیت نہ دینا، بلکہ اُسے تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیے جانے کی بھی مذمت کی گئی ہے:

> ''ہمارے اپنے معاشرے میں عورت بے اندازہ زیادتیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہے، نہ اِن کے دینی حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں نہ دینوی جاگیردارانہ معاشرہ عورت سے بھیڑ بکری جیسا سلوک کرتا ہے۔ شادی میں بھی عورت کی رضا اور پسند و ناپسند کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اِسے جس کھونٹے سے جی چاہا باندھ دیا۔ وراثت میں بھی اِس کا حق تسلیم نہیں کیا

جاتا نہ اِس کا حصہ ادا کیا جاتا ہے۔ سندھ میں ایک انتہائی قبیح رسم جاری ہے۔ عورتوں کو وراثت سے محروم کرنے کے واسطے اِن کا قرآن سے نکاح کر دیا جاتا ہے۔ عورتوں کو تعلیم دلوانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔'' ۵۵

کشور ناہید کے خیال میں مرد نے اپنی حاکمیت کے زعم میں بے جا اختیارات کا خود کو حقدار متصور کر لیا ہے اور معاشی، ذہنی اور سماجی سطح پر عورت کو مکمل طور پر اپنا دستِ نگر اور پابند بنانے میں کسر نہیں چھوڑی، لیکن عورت نے اِن روایات کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے باغیانہ روش اختیار کر لی ہے، اس ضمن میں مارکسزم اور سوشلزم کی نظریات اور اُس کے اثرات کا جائزہ لیا ہے، اُن کے خیال میں روس کی طرح چینی عورت بھی وراثتی طور پر جکڑبندیوں کی شکار ہے۔ لوہے کے جوتے پہنا کر پیر چھوٹے رکھنے کی مثال بھی عورت کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ چین میں بھی بیٹا عورت کے لیے خوش بختی اور بیٹی مصیبت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مغرب میں آزادی نسواں کی تحریک ۱۸۴۰ میں قائم ہوئی۔ امریکہ میں ۱۹۲۳ میں مساوی تنخواہوں کے لیے بھی آزادیِ نسواں کی تاریخ میں بہت بامعنی اور نتیجہ خیز مطالبے کے طور پر مانا جاتا ہے۔ پاکستان میں بھی عورتوں کی فلاحی تنظیمیں اور انجمنیں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے سرگرداں نظر آتی ہیں۔ کشور ناہید کے خیال میں:

''برصغیر میں عورت کی آزادی کی تحریک مغرب کے تتبع میں نہیں، بلکہ جاگیرداروں اور آقائیت کی زنجیر سے رہائی کی وہ تحریک ہے کہ جس میں عورت کو بطور فرد تسلیم کیا جائے، اِس کو تربیت و تعلیم کے مساوی مواقع دینے کے بعد مساوی مقداریت کی توقع کی جانی چاہیے۔'' ۵۶

عورت کی سماج میں حیثیت کے حوالے سے اُبھرنے والے سوالات کے متعلق لکھتی ہیں:

''میں کون ہوں ۔۔۔ ماں، بیٹی اور بہن ۔۔۔ عورت کہاں ہے۔ مرد کے حوالے سے شناخت والے رشتے، اُس کی پہچان نہیں، تو پھر یہ پہچان بھی کیا کہ قبر پہ لکھے کتبے مختلف ناموں کی نشانیاں معلوم ہوتے ہیں، مگر وہ سب وہ سارے کے سارے ہوتے، تو مُردے ہی ہیں، بے روح، بے جان، بے کار مٹی کا ڈھیر۔'' ۵۷

سیمون دی بووا نے عورت کی نفسیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مردوں کی جانب سے نمائندہ کردہ ''ہستی'' سے نفرت کرتی ہے، چوں کہ مرد معاشرتی مستحکم اور اپنی کمتر حیثیت کے تقابل سے تناؤ کی شکار ہو جاتی ہے۔ عورت کی جنسی بے راہ روی میں بھی بعض اوقات یہی عوامل کارفرما ہوتے ہیں:

''شروع میں ہم جنس پرست عورت مرد ہونے کا دکھاوا کرتی ہے، لیکن پھر ہم جنس پرست ہونا بھی ایک دکھاوا بن جاتا ہے۔ بہروپ کے لیے پہنے ہوئے مردانہ کپڑے بعد میں یونی فارم بن جاتے ہیں اور مردانہ جبر سے بچنے کے عذر کے تحت اپنے اختیار کردہ کردار میں ہی مقید ہو جاتی ہے۔ عورت کی حیثیت میں پابند نہ ہونے کی خواہش کرتے ہوئے وہ ہم جنس پرست عورت کی حیثیت کے عقوبت خانے میں بند ہو جاتی ہے۔'' ۵۸

مشرقِ وسطیٰ کے عرب معاشرے میں صنفی تفریق کے بارے میں مختلف نظریات مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ تخلیقِ آدم وحوا، حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا، پردے کا اہتمام، صنفی تفریق کی حامل مختلف رسوم ورواج اور روایات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلام کی آمد نے عورت کے وقار اور مقام ومرتبہ میں اضافہ کیا۔ مروجہ رُسوم وروایات کی نفی کی گئی، خصوصاً مصر میں سیاسی، سماجی، فکری سطح پر عورت سے روا رکھے جانے والے سلوک کی وضاحت کی گئی ہے۔ مصر میں عرب دُنیا سب سے پہلے عورتوں کے حق میں سماجی تبدیلی کا تجربہ کیا گیا۔ پردے کے حوالے سے عورتوں سے متعلق ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ لیلیٰ احمد عورتوں کو ملکیت سمجھے جانے کی وجہ اِن کی جنسیت اور تولیدی صلاحیت کو قرار دیتی ہیں۔ مختلف معاشروں اور تہذیبوں میں مردانہ غلبے کے حوالے سے اُن کا کہنا ہے کہ طبقاتی معاشروں میں ملکیتی طبقے اور جنگی و مذہبی گروہ اور پدری خاندان یعنی ملکیتی احساس اور عورتوں کی جنسیت پر مردوں کی ملکیت مسلمہ حیثیت اختیار کر گئی۔ نسوانی صنفی پاکیزگی بالخصوص دوشیزگی قابلِ انتقال اور معاشی طور پر قابلِ قدر ملکیت بن گئی تھی، رفتہ رفتہ یہ حیثیت زوال پذیر ہوئی۔ عورت کا یہ زوال درحقیقت، دیوی دیویوں کا زوال تھا اور آشوری قوانین کے مصائب نے عورت کو مزید بے حیثیت کر دیا۔ عورت پر شوہر اور باپ کا حق قرض کی ادائیگی کی بجائے عورت کو امین دکھایا جانا، زنا، حرام اولاد کے مسائل، پردہ، پردہ نا کرنے کی صورت میں مظالم اور سزائیں، اِس کی جنسی صلاحیتوں کی بنا پر اِن کی حیثیت متعین کرنا، غلاموں اور لونڈیوں سے ناروا سلوک، طلاق، نان ونفقہ کے مسائل، شوہر کی جائیداد اور وراثت کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے:

> ''طلاق کے لیے عام طور پر دونوں فریقوں کی رضامندی ضروری تھی، لیکن اگر بیوی بداعمالی کی مجرم پائی جاتی تھی، تو اُس صورت میں اُس کی رضامندی ضروری نہیں تھی۔ طلاق اُس وقت ناگزیر ہو جاتی تھی، جب اپنے باپ، بھائی یا دوسرے مرد عزیز کے لیے وارث مہیا کرنے کی خاطر عورت کی ضرورت پڑ جاتی تھی اور اِس صورت میں اِسے اپنے عزیز کے جدی رشتہ دار سے شادی کرنی پڑتی تھی۔ عورتوں کو ایسی شادیوں پر مجبور کر دیا جاتا تھا، لیکن متضاد بیان بھی دیتے تھے کہ عورتوں کی مرضی کے خلاف اُن کی شادی نہیں کی جا سکتی تھی۔'' ۵۹

ماں باپ کی محبت اور خوش حال زندگی اولاد کے لیے زرخیز کھاد کی مانند ہوتی ہے، جس میں پودے پروان چڑھتے ہیں، اگر باپ شفیق ومہربان ہو، تو ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول: ''اکثر لڑکیوں کے خیال میں خدا نے اِن کے باپ کی پیدائش کے بعد اچھے لوگوں کی تخلیق کا سانچہ ہی توڑ ڈالا'' ۶۰ اگر مرد جھگڑالو، غیر ذمہ دار، خودغرض، غیر عورتوں میں دلچسپی لینے والا اور بچوں کی تربیت کے معاملے میں عدم دلچسپی لینے والا ہو، تو اولاد کی نظر میں اپنا مقام ومرتبہ کھو دیتا ہے:

> ''پدرانہ وابستگی سے قطع نظر بھی لڑکی پر باپ کی شخصیت اثر انداز ہوتی ہے، لیکن منفی انداز سے، اَب باپ کے تصوراتی ہیولی سے پیار نہیں کیا جاتا، بلکہ باپ کی خباثتوں کی بنا پر اِس سے نفرت کی جاتی ہے، اِس نفرت کے عمومی اسباب میں سے ماں کے ساتھ بُرا برتاؤ، بچوں سے خراب یا ترجیحی سلوک، جوئے یا شراب نوشی وغیرہ کی وجہ سے گھر کی تباہی، نمایاں ہیں، بعض اوقات اِسی نفرت کے باعث وہ ہم جنس پرستی کی طرف رجوع کرتے ہوئے جذباتی اور ہیجانی لحاظ سے مرد کو اپنے لیے ناقابلِ قبول بنا لیتی ہے۔'' ۶۱

کشور ناہید نے ایسے مردوں کی نشاندہی کی ہے، جو معاشرے میں اپنے تئیں اہم کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں، لیکن اس کی اخلاقی گراوٹوں سے لوگ متنفر اس حد تک ہوتے ہیں کہ مرد ذات کا اعتبار اور یقین اُٹھتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے:

''تم پھر کہو گی، ماں تم نے کس کس قسم کے مردوں پر ترس کھانے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے، وہ جو ہر عمر کی عورت کے بدن پر ہاتھ پھیرنے کا موقع حاصل کرنے کی کوشش میں بچی کھچی عزت بھی گنوا بیٹھتے ہیں، وہ جو شراب کے دو پیگ کے بعد رشتوں کے تقدس کی دھجیاں اُڑا دیتے ہیں، وہ جو بظاہر داڑھی رکھ کر رشوت کا مال سنبھالتے ہیں، وہ جو دفتروں میں کچھ بھی نہ کر کے فرض شناسی کی قسمیں کھا کر ترقیاں مانگتے ہیں اور بے نام خط لکھ کر دُنیا کے سارے دفتروں میں بھیج کر اپنی خباثت، کو استعمال کرتے ہیں۔ کس طرح اپنی سیکریڑیوں اور دفتر میں چھوٹی ملازمت پر کام کرنے والیوں پہ ڈورے ڈالتے ورنہ حرف گیری کرتے ہیں، کس طرح گھروں میں کام کرنے والی بچیوں کی عصمت لوٹتے ہیں، کس طرح جیل کی کوٹھڑی یا حوالات میں بند عورت پر ایک کے منہ کا نوالہ بنتی ہے، کیسے کھیت سے گزرتی بچی، کسی بھی ہوس ناکی کا شکار ہو جاتی ہے۔'' ۶۲

کشور ناہید نے آوارہ مرد و عورت کے رویوں کی نشاندہی بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں کی ہے:

''میں تمھیں ایسی عورتیں بھی دکھاتی، جو اپنے شوہروں کے روروں پہ جاتے، دوسرے شہر جانے اور گھر سے نکلنے کی منتظر رہتی ہیں۔ دوسرے مرد اِن کے گھر کے مردوں سے زیادہ لطف فراہم کرتے ہیں۔ مرد بھی خود کو آزاد محسوس کرتے ہیں۔ کوئی فراہم کرتے ہیں۔ مرد بھی خود کو آزاد محسوس کرتے ہیں، کوئی ذمہ دار نہیں، اگر کچھ ہو بھی گیا، تو ذمہ داری، تو شوہر کے سر جائے گی۔ دونوں طرف سے اطمینان، نہ احسان سر پر اور نہ احساسِ جرم، یہ مرد عورتوں کو نہ تحفے دیتے ہیں اور نہ پیار، یہ عجیب قسم کی لت ہے، جو بہت سے مردوں اور عورتوں کو لگی ہوتی ہے۔ بس ایک ذمہ داری ہے، فرض ہے، جو ادا کرنا ہے، بس وہ اپنے کام پہ چلا گیا اور آپ نے اپنے کام شروع کر دیے۔'' ۶۳

کرپٹ مردوں کی کرپشن کے بارے میں بیان کیا ہے:

''مرد جس عورت کا شوہر بن کر رہتا ہے، اس سے گھر کی چار دیواری تک ہی وفادار ہوتا ہے۔ باقی زندگی کے اِس کے کسی ورق پر ہاتھ رکھو، تو تلملا کر کہہ دیتا ہے تمھارا حق اور تمھارا گوہر تمھیں مل رہا ہے، بس یہی فکر کرو اور یہی اطمینان رکھو، اس سے بڑھنے کی جرأت نہ کرنا۔'' ۶۴

ڈاکٹر سلطانہ بخش کے افسانے ''جوگ اور دوسری عورت'' میں سماجی مسائل کی ایک اور بہت بڑی وجہ عورت کا عورت کے بارے میں مخاصمانہ رویہ ہے۔ شادی شدہ زندگی میں سب سے زیادہ رخنہ، آوارگی و عدم توجہی کے علاوہ غیر مرد و عورت کی مداخلت، جس کی وجہ سے ہنستی بستی زندگی وبال بن جاتی ہے:

"پہلے عورت کو عورت سے آزاد کراؤ۔ عورت پر عورت کا دباؤ معاشرتی بھی ہے اور مردوں کا عورت پر تسلط فطری، یا یہ کہہ لو کہ حقیقتاً عورت کی جنگ مرد سے نہیں، بیویوں کی شوہروں سے ہے۔ عورت ، مرد سے بھائی باپ اور محبوب کی شکل میں اتنی تنگ ہیں، جتنی خاوندوں کے رویے سے شاکی ہے۔" ۶۵

وارث میر نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مردوں نے دینی احکام کو ہمیشہ اپنے 'حاکمانہ' مفادات میں استعمال کیا ہے، مثلاً فتویٰ دینے والوں نے یہ، تو فتویٰ دے دیا کہ شبِ عروسی اگر عورت کا کردار مشکوک لگے، تو اُسے اُسی وقت طلاق دے رہی چاہیے، لیکن اگر عورت کو خاوند کے کردار پر شک پڑ جائے، تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟ یعنی کیا عصمت کا تصور صرف عورت کے ساتھ وابستہ ہے اور مرد ہمیشہ "نہلایا دھلایا گھوڑا" ہی رہے گا؟۔ پاکستان میں جسم فروشی کے حوالے سے وارث میر کا مؤقف ہے کہ اِس میں زیادہ تر ہاتھ اغوا کنندگان اور ہمیشہ عورتوں کا ہے، بعض گروہ جسم فروشی کے قانون پرستوں کی زیرِ نگرانی بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ جسم فروشی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اِس مرض کی جڑیں خود ہمارے اقتصادی و معاشرتی نظام میں موجود ہیں، جہاں فرد کو ملک اور معاشرے کی تمام برکتوں اور خوشحالیوں میں شریک نہیں سمجھا جاتا ، اِس کے انفرادی تحفظ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اور جہاں روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے عورت کے جسم کی بوٹی بوٹی کی قیمت چکائی جاتی ہے اور انسانیت ندامت کے کونوں میں منہ چھپائے خون کے آنسو روتی رہتی ہے۔" ۶۶

منیر احمد ایسی بُرائی کے ہاتھوں بے بس ہونے والوں کی سرزنش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"تمھارے پاس اچھائی اور بُرائی دونوں راستے موجود ہیں، اِن پر چلنے کی سزا اور جزا کا تعین کر دیا گیا ہے، تم اپنے غلط فیصلے کا خدا کو موردِ الزام کیوں ٹھہراتی ہو۔۔۔ جسم فروشی One way نہیں، بلکہ Two away ٹریفک ہے، عورت اُس وقت تک فاحشہ نہیں بن سکتی، جب تک اُسے خریدار نہ ملے اور مرد اُس وقت تک بُرائی کے گڑھے میں نہیں گر سکتا ، جب تک عورت کی شکل میں سراب اُس کی قسمت کا حصہ نہ بنے ۔۔۔ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لیے عزت اور رُسوائی کا سامان بنتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زانی مرد اور زانی عورت دونوں کو کوڑے مارنے کا حکم دیا ہے۔" ۶۷

کتاب کے آخر میں بچوں سے جنسی تشدد اور دُنیا کے مختلف ممالک میں جسم فروشی کی تاریخ رقم کرنے کے علاوہ منیر احمد نے طوائف معاشرہ اور عورت نومولود ناجائز اولادوں کو قتل کیا جانا یا کوڑے کے ڈھیر پر نوزائیدہ بچوں کی لاشوں کا ملنا گھناؤنے جرائم کے نتائج تھے، اِس کے علاوہ ہیجڑوں کے ذریعے جسم فروشی پر بھی بحث کی گئی ہے۔ معاشرے میں لوگوں کی اخلاقی پستی، قبائلی نظام، سرمایہ داری، وڈیرہ گری، بچوں سے جبری مشقت اور بچوں سے زیادتی کو موضوع بنایا ہے کہ کس طرح ماں باپ اپنے چار پانچ سال کے بچوں کو فروخت کر دیتے ہیں کہ وہ بچے اونٹ ریس میں خلیجی ممالک کے بادشاہوں کا دِل بہلا سکیں، اِس حوالے سے کشور ناہید لکھتی ہیں:

"تم دیکھتیں کہ کس طرح درگاہوں، مزاروں اور صوفیا کے درباروں سے لڑکیاں اغوا کی جاتی ہیں۔ کس طرح وہ لڑکیاں فروخت کی جاتی ہیں، کس طرح اِن لڑکیوں کو جنسی لذتی کے لیے سپلائی کیا جاتا ہے اور کس طرح آج بھی مسجدوں سے لے کر درگاہوں میں چھوٹے لڑکوں کے ساتھ جنسی زیادتی کو روا سمجھا جاتا ہے، ہر گھرانے میں کوئی ماموں، کوئی خالو، کوئی رشتہ دار یا باہر کا شخص ننھی بچیوں کے ساتھ ۷ سال یا اِس سے زیادہ کی عمر میں زیادتی کرتا تھا، تو خاندان کی بڑی بوڑھیاں لڑکی کو مار کر چپ کر دیتی تھیں اور سختی سے منع کرتی تھیں کہ یہ بات کسی اور کے سامنے مت کہنا۔" ۶۸

وڈیروں، زمینداروں، ٹھیکیداروں اور پنچائیتوں کے عورت کے ساتھ رکھے گئے ناروا سلوک کی عکاسی بھی حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہوئے کشور ناہید کا یہ بھی کہنا ہے: "اگر ایک خاندان کی لڑکی اپنی مرضی سے کسی دوسرے گھر کے لڑکے سے شادی کر لے، تو اِس لڑکے کے خاندان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکی کے گھر میں موجود کسی اور لڑکی عزت لوٹ کر اِس گستاخی کی سزا دیں۔" ۶۹ زاہدہ حنا کے خیال میں کثیر الاشاعت ماہناموں یا ہفت روزہ رسائل میں شائع ہونے والی کہانیوں پر نظر ڈالیں، تو اِن میں سے بیشتر میں ہمیں عورت ہر قدم پر جنسی کجروی اور رسوم و روایات کا نشانہ بنتی نظر آتی ہے، اِن کہانیوں میں ماں، بہن، بیٹی یا بیوی پر بات بے بات ہاتھ اُٹھنا، زدو کوب کرنا، زندہ جلانے کی کوشش، کرنا یا زندہ جلا دینا، زخمی کر دینا یا قتل کر دینا روزمرہ بن جاتا ہے۔ ۷۰

"ذرائع ابلاغ اور عورت" میں اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ہونے والے پروگراموں کی وجہ سے عورت نفسیاتی سطح پر بہت متاثر ہوتی ہے، اگر چہ اِس کی ناعاقبت اندیشی، نا آسودگی شاملِ حال ہوتی ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے خود آ گاہی اور شعور بیدار کیا جائے، تا کہ بُرائیوں اور مشکلات سے بچا جا سکے۔ کشور ناہید نے خواتین افسانہ نگار کے دیباچے میں اُردو افسانے کا پس منظر نہایت اختصار سے پیش کیا ہے کہ ۱۹۳۰ کی دہائی جسے تراجم کی دہائی کہتے ہیں۔ ۱۹۳۰ کے اہم رسائل نثر پارے، ادبِ لطیف، ہمایوں اور ادبی دُنیا میں حقیقت نگاری کی جھلکیاں لیے ہوئے افسانے ملتے ہیں، جن میں تانیثی احساس نمایاں ہے، مثلاً امتیاز علی تاج کا "بیمارِ غم" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"اللہ! کیا مشرق میں لڑکی محض اِس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی خوشیوں پر بھینٹ چڑھادی جائے، کیا اُس خود اپنی زندگی کے معاملے میں بھی دخل دینے کا اختیار نہیں؟ کدھر ہیں وہ ریفارمر، جو قوم کے آگے لمبی لمبی تقریریں کرتے اور بہبودی قوم کا ترانہ بڑے زور و شور سے گاتے ہیں۔۔۔ کیا وہ عورت کو قوم سے خارج سمجھتے ہیں؟ کیا قوم صرف مردوں ہی کے اجتماع کا نام ہے۔" ۷۱

"ادب کی نسائی ردِ تشکیل" میں ایروٹک ادب۔ نجمہ منظور منٹو کے ہاں عورت کے تصور کے بارے میں لکھتی ہیں:

"عورت بھی سماج کی ایک ایسی اکائی ہے، جو تذلیل کا شکار رہی ہے اور جسے منٹو نے اپنی کہانیوں کی صورت میں ہمدردی اور یک جہتی کا عطر بیز گلدستہ پیش کیا ہے، اِسی لیے ہم خواتین اِسے پختہ فیمینسٹ مانتی ہیں، اِس نے طوائف کا کردار اُٹھایا، جس کے سر پر مامتا

اور ستی ساوتری ہونے کا تاج بھی نہیں اور قاری کو عورت کی انسانیت سے آشکار کیا۔''۲ے
جب کہ فاطمہ حسن عورت کے متعین کردہ روایتی کردار یعنی کمزور و کمتر کے تصور کو عورت کے خلاف پروپیگنڈے کا نتیجہ قرار دیتی ہیں:

''صدیوں سے رائج اِن رُسوم رواج کے پردے میں عورت کو معاشرتی زندگی سے اِس طرح الگ کر دیا گیا کہ مکمل عورت اپنی ذہانت اور توانائیوں کے ساتھ سامنے آہی نہ سکے۔ محکوم بیوی، داشتہ، طوائف، بھکارن یہ وہ کردار ہیں، جنھیں افسانہ نگار اپنی بساط، تخیل یا اساطیر کے حوالوں سے لکھتے رہے ہیں، بیدی کا افسانہ 'گرہن' بہت بڑا ہوتے ہوئے بھی، ایک سطح پر، اپنے اختتام پر اِسی محدود دائرے میں آجاتا ہے کہ عورت کی عزت، عصمت صرف گھر کی چاردیواری میں محفوظ ہے، وہ اس سے نکلتی ہے، تو تارتار ہو جاتی ہے۔''۳ے

ڈاکٹر عقیلہ جاوید ''اُردو ناول میں تانیثیت'' میں عورت کے ساتھ برتی جانے والی سماجی ناہمواریوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

''گو کہ خواتین پر ظلم و ستم کی داستان بہت پرانی ہے، لیکن آج بھی معاشرے میں ایسے رسم و رواج موجود ہیں، جو خواتین کی حالتِ زار کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ شادی کرنا مردوں کی طرح عورتوں کا بھی بنیادی حق ہے، لیکن پاکستان میں کئی علاقوں خصوصاً سندھ میں خواتین کو اس حق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور لڑکیوں کی قرآن سے شادی کر کے ان سے حق بخشوا لیا جاتا ہے۔ معاشرے میں اِس رسم کے خلاف محض چند لوگ ہی آواز بلند کرتے ہیں، کیوں کہ معاشرے میں اسے رائج کرنے والوں کا تعلق جاگیرداروں اور وڈیروں کے خاندان سے ہے۔ اِس لیے ان کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کرتا۔''۴ے

''لیلیٰ کے خطوط'' قاضی عبدالغفار نے میں استبدادر رویوں کے خلاف عورت کی بغاوت کا اظہار کیا ہے:

''ہندوستان میں اور غالباً تمام ایشیا میں ایک دفعہ عورت مرد کے تفوق کے خلاف ایسی خوفناک بغاوت کرنے والی ہے، جو تمھاری خود ساختہ سوسائٹی کے شیرازہ کو دھرم بھرم کر دے گی۔ ہم تم غالباً اُس وقت دُنیا میں زندہ نہ ہوں گے، جب وہ طوفانِ نوحؑ آئے گا، لیکن ہماری آئندہ نسلیں عورتوں کو مردوں کے تختِ شاہی پر قبضہ کرتے دیکھیں گی اور ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیا جائے، بلاشبہ جفا کار مردوں کے لیے وہ یوم الحساب بہت سخت ہوگا۔''۵ے

وارث میر کی کتاب ''کیا عورت آدھی ہے'' عورت اور پردے کے مسائل اور اِس کے جدید زندگی پر مذہبی اور نفسیاتی اثرات کا جائزہ لینے کے علاوہ حقوقِ نسواں کی اسلامی تحریک اور مغرب زندگی کی اصطلاح کے گمراہ کن تصور کی وضاحت کی گئی ہے، اِسی طرح پاکستان میں نویں ترمیم اور عائلی قوانین کے آرڈیننس، خواتین کی گواہی، عصمت فروشی کے انسداد، قصاص و دیت کے قوانین کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے:

''مُلا اور ملوکیت کے گٹھ جوڑ نے علم و عقل اور آزادیِ افکار سے محاذ آرائی کی، ہمارے اور

تیسری دُنیا کے سبھی مسلم ممالک میں فیوڈل ازم کے نظام کا ہرز ہر موجود ہے۔ملوکیت کی جگہ مارشل لا حکمران ہیں۔کئی حصوں میں سرداری اور قبائل نظام کی جکڑ بڑی سخت ہے،ان خیالات میں عورت کی حالتِ زار اور دیگر کمزور طبقوں کی غلامی بہت گہری ہو جاتی ہے۔ اِدھر مارشل لا کے اسلام میں مُلا اور فیوڈل ضابطوں کی مدد سے ایسے انتظام کیے جا رہے ہیں کہ پاکستان کی عورت اپنے انسان ہونے کا حکیم بھول جائے،اس کا شعور قطعی معطل ہو جائے اور وہ بھیڑ بکری کی سطح پر جینا قبول کر لے۔اسلامی شریعت کا نام استعمال کرتے ہوئے فیوڈل لوہے کی زنجیر پھر سے بنانے میں لگے ہیں،کئی ایسے ادارے،جن کی چابی مُلا کے ہاتھ میں ہے وہی یہ کام کر رہے ہیں۔''۶ے

خواتین کے خلاف گھریلو تشدد کا بدترین طریقہ یعنی جلائے جانے کی طرف زاہدہ حنا نے اشارہ کیا ہے،اس ناقابلِ جرم تصورِ جُرم میں شوہر،دیور،ساس،سُسر اور نندیں شامل ہوتے ہیں۔عورتوں اور نو بیاہتا دلہنوں کو یہ سزا جہیز کم لانے،بیٹا نہ پیدا کرنے یا کسی 'نافرمانی' پر دی جاتی ہے ۷ے ڈاکٹر زاہد محمود کی کتاب ''گھریلو تشدد'' میں گھریلو تشدد کی تعریف،نوعیت،تشدد پسندوں کی اقسام،تشدد کے افرادِ معاشرہ پر اثرات اور روک تھام کا جائزہ لیتے ہوئے آخر میں تجاویز دی گئی ہیں،جن پر عمل کر کے متشددانہ رویے سے بچا جا سکتا ہے۔گھریلو تشدد کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر زاہد محمود لکھتے ہیں:''تشدد میں دوسرے کے حقوق کے احترام اور باہمی برابری کا فقدان ہوتا ہے۔تشدد میں ایک شخص مسلسل دوسرے کو ڈرا دھمکا کر دبانے کی کوشش کرتا ہے،اس طرح لڑائی جھگڑے،مار کٹائی،بدسلوکی،جسمانی اور ذہنی اذیت روزمرہ کا معمول بن کر رہ جاتی ہے۔''۸ے

گھریلو تشدد کا سب سے زیادہ شکار عورتیں اور بچے بنتے ہیں۔خاوند عموماً اپنی بیوی سے بدسلوکی کرتا ہے۔گالی گلوچ، مار پیٹ اور طعن و تشنیع سے کام لیتا ہے۔تشدد کو عام طور پر ذاتی معاملہ کہا جاتا ہے،جب کہ یہ خالصتاً سماجی مسئلہ ہوتا ہے۔ گھریلو تشدد کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔حصہ اول میں تشدد کرنے اور ظلم سہنے والوں کی نفسیات بیان کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں تشدد کے تدارک و انسداد کی تجاویز پیش کی ہیں،چوں کہ گھریلو تشدد کا تدارک فردِ واحد کا مسئلہ نہیں،بلکہ بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔حصہ سوم میں اِن نفسیاتی اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے،جن پر عمل پیرا ہو کر اِس سے بچا جا سکتا ہے۔عورتوں کے خلاف گھریلو تشدد کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اُسے کمزور کو کمتر سمجھتے ہوئے جبر اور اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں۔تشدد کے عادی لوگ عام طور پر پُرکشش،خوش باش اور دلفریب شخصیت کے مالک ہوتے ہیں،یہ لوگ ہمیشہ اپنی مرضی دوسروں پر مسلط کرتے ہیں اور دھونس جماتے ہوئے نفسیاتی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ڈاکٹر زاہد محمود کے خیال میں اگر غلاموں اور جانوروں کے حقوق تسلیم کیے جا سکتے ہیں،تو پھر عورتوں کے حقوق مان لینے میں کیا قباحت ہے۔ گھریلو تشدد کے حل کے لیے کی جانے والی کوششوں میں قانون نافذ کرنے والے ادارے،صحت و سماجی بہبود کے پیشہ ور ماہرینِ نفسیات،ماہرینِ مشاورت،قانون دان،سیاست دان،متشدد افراد اور تشدد زدہ افراد ایک ساتھ برابر حصہ لے سکتے ہیں۔مشاورتی عمل سے بھی متشددانہ رویے میں کمی لائی جا سکتی ہے۔

پنجاب کے علاقوں میں خواتین کی سرِ عام ''رُسوائی'' اُنھیں برہنہ کر کے اِن کے رشتہ داروں،محلہ داروں،گلیوں اور بازاروں میں پھرانا ایک ایسا ہولناک جُرم ہے،جو پنجاب کے دیہاتوں میں عام ہے ۹ے زاہدہ حنا پولیس کی دستاویزات کے

حوالے سے پاکستان میں عصمت دری اور اجتماعی آبروریزی کے واقعات میں پے در پے افسانے کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ ایچ آر سی پی کا کہنا ہے کہ پاکستان میں مجموعی طور پر ہر گھنٹہ میں ایک خاتون کو عصمت دری کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔۸۰ کاری قرار دی جانے والی عورت کو داغ دار قرار دے کر خاندان میں نہیں بیاہا جاتا، بلکہ اوباش لوگوں کے ہاتھوں میں بیچ دیا جاتا ہے۔ اوباش لوگ اُسے زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں، اگر کاری کے والدین غریب اور نادار ہوتے ہیں، تو کاری کو سردار بیچ دیتا ہے اور اُس کی رقم بھی ہتھیا لیتا ہے۔۸۱ غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے زاہدہ حنا کا کہنا ہے ۲۰۰۰ میں غیرت کے نام پر قتل کی ۱۰۰۰ وارداتیں ہوئیں۔ صوبہ پنجاب میں خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات میں کم از کم ۷۰۰ واقعات عصمت دری کے تھے اور ۸۶۱ عورتیں قتل کر دی گئیں، اِسی طرح خلع مانگنے والی عورت کو بھی غیرت کے نام پر قتل کیا گیا۸۲ ''فیمنیزم اور ہم'' میں انیس ہارون کا مؤقف ہے کہ ضیاء دور میں زنا اور زنا بالجبر کے قانون میں کوئی فرق نہ تھا۔ زیادتی کا شکار ہونے والی عورت کو خود اپنے گواہ پیش کرنا پڑتے تھے، یعنی چار گواہوں کی شہادت ضروری تھی:

> ''اگر قتل یا ریپ صرف خواتین اور غیر مسلم مردوں کی موجودگی میں ہو، تو حد کی سزا نہیں دی جا سکے گی، اس سراسر غیر منصفانہ قوانین کا شدید نقصان خواتین کو پہنچا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں غریب عورتیں، جن میں ۱۶ سے ۲۰ سال تک کی خواتین شامل ہیں۔ 'زنا' آرڈیننس میں جیل جا چکی ہیں، جنھیں اِن کے شوہر، سُسرال والوں یہاں تک والدین نے بھی اُپنی مرضی سے شادی کرنے یا بدلہ لینے کی خاطر پولیس میں شکایت کر کے جیل میں پہنچا دیا۔''۸۳

نسوانیت کے بارے میں تنویر انجم کا کہنا ہے:

> ''نسوانیت ایک رومانی تصور ہے، جو عورت کو مرد کی مسلط کردہ حدود کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ نسوانیت عورت سے زیادہ سے زیادہ تقاضا کرتی ہے۔ اِسے مستقلاً مرد کے سامنے اپنے 'امتیاز' کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نسوانی امتیاز کے اظہار میں ناکام ہو جانے کا مطلب ہے مرد کی توجہ اور پسندیدگی کھو دینے کا خطرہ مول لینا۔۔۔ ایک طرف نسوانیت اختیار کرنا عورت کے لیے اپنی سماجی کامیابی کی ضمانت ہے، تو دوسری طرف نسوانیت اختیار کر کے اِسے اپنی اصل اور اپنی شناخت سے دُور چلے جانے کا غم برداشت کرنا ہے، اگر اسے اِس کی خامیوں اور نقائص کے لیے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، تو اسے اپنی نسوانیت کی سطح کو مزید بلند کرنا ہوگا، اسی طرح اِس کے اوپر ایک مستقل بوجھ ہے، جو نسوانیت کے تصور نے اِس پر ڈال دیا ہے۔''۸۴

اِسی طرح ملک کی تہذیبی اور ثقافتی میدانوں میں عورت کو پسِ پُشت ڈالے جانے کے حوالے سے وارث میر کا مؤقف ہے: ''مرد کی ذہنی صحت کا تعلق اُس کی جسمانی صحت سے ہو سکتا ہے، تو عورت کے سلسلے میں جسم اور ذہن کے فطری تعلق کو کیوں کر ختم کیا جا سکتا ہے۔''۸۵ منیر احمد کی کتاب ''عورت اور بازار'' میں جسم فروشی کا دھندہ کرنے والوں کے مختلف ہتھکنڈوں، اڈوں اور ٹھکانوں کو موضوع بنایا گیا ہے اور مختلف کیس ہسٹریوں کے ذریعے حقائق اکٹھے کیے گئے ہیں کہ کس طرح عورت اور مرد اوچھے ہتھکنڈوں سے ایک دوسرے کو موہ لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وقتی جذباتیت کی بنا پر

ہنستے بستے گھر اُجڑ جاتے ہیں، اُنھوں نے نیکیوں کے سفید لبادوں میں چھپی ہوئی کالی بھیڑوں کو بے نقاب کیا ہے۔ میڈیکل کالج کی طالبہ کے 'روزگار' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب بہت چھوٹی تھی، تو ماں کے پاس آنے والے مجھے بھی کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔ پیسے لے کر بہت خوش ہوتی تھی، میں وہ پیسے مٹی کے ایک گلّے میں ڈال دیتی تھی اور خواہش ہوتی کہ یہ جلد از جلد بھر جائے، کبھی گلہ ایک ہی ماہ میں بھر جاتا اور کبھی کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا۔۔۔، جب گلہ بھرنے میں تاخیر ہو جاتی ،تو ماں کے چہرے پر فکر کی پر چھائیاں نمایاں ہو جاتیں۔''۸۶

طوائف کی زبان سے ایک اور بات منکشف ہوئی کہ بیٹی سے پیشہ کرانے والے اپنی بہو سے پیشہ نہیں کراتے:

''بازارِ حسن کے رہنے والے اپنے لڑکوں کی شادی کرنے کے بعد 'بہورانی' سے پیشہ نہیں کراتے، بلکہ وہ ایک وفا شعار بیوی ہوتی ہے، میں حیران تھا کہ جو گھرانہ بیٹی سے جسم فروشی کرانے میں عار محسوس نہیں کرتے وہ، بہو کو اس قدر مقام کیوں دیتا ہے۔''۸۷

اسی طرح منیر احمد نے اپنی تحقیق کے دَوران اِس افسوسناک حقیقت کو بے نقاب کیا کہ بہت سے تعلیمی اداروں کے ہوسٹلوں کی طالبات اور شریف گھرانوں کی چشم و چراغ اِس دھندے میں مبتلا ہیں:

''میں انتہائی تحقیق اور ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ لاہور میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں رہنے والی متعدد لڑکیاں اِس موذی مرض میں مبتلا ہیں اور اُنھوں نے ہوسٹل کو گندگی میں تبدیل کر رکھا ہے۔ کالج کی پرنسپل کے علم میں تھا کہ ہوسٹل کے کس کمرے میں ہم جنس پرستی ہوتی ہے اور ہوسٹل میں رہنے والی کون کون سی لڑکی ''پارٹ ٹائم کام'' کر کے Extra آمدن حاصل کرتی ہے، لیکن کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ خواتین کے ایک تعلیمی ادارے کے ہوسٹل کے گیٹ پر کئی مرتبہ لڑکیوں کو گاہکوں کے ساتھ جاتے دیکھا گیا ہے، میں اِن تعلیمی اداروں کے نام اور ہوسٹلوں کے کمروں کے نمبر تک جانتا ہوں، لیکن شرفا کی بچیوں کو مسائل سے محفوظ رکھنے کے لیے اس موضوع کو تشنہ چھوڑ رہا ہوں۔ مطلب یہ کہ فحاشی کا براہِ راست تعلق عورت اور مرد دونوں سے ہے اور دونوں میں سے کسی ایک کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔''۸۸

انیس ناگی نے ایسی ہی شریف زادیوں کے ہنر بیان کرتے ہوئے اُس مکتبِ فکر کی عورت کو بے نقاب کیا ہے، جو شرعی، حرمت کے رشتوں کو بڑی آسانی سے پامال کر دیتی ہے، اِس حوالے سے عرفان صاحب اور اُن کی بہو کی زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تنہائی، تو انسان کے ساتھ پیدا ہوئی تھی، دوسرے گھر سے آئی ہوئی ناواقف عورت اِس تنہائی کو کیسے ختم کر سکتی ہے؟ اِس کا وجود، تو تنہائی کے احساس کو محکم کرتا ہے، میرے بیٹے کی بیوی، جسے میں بہو کہنا پسند نہیں کرتا، آئی اور دو برسوں میں ہمیں ساری زندگی کا روگ دے کر

چلی گئی، اِس کی ذات نے مجھے زندگی کے گھناؤنے پن کا احساس دلوایا ہے، وگرنہ میری زندگی
بڑی پُر امن تھی، کوئی خواہش تھی اور نہ رنجش، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا شادی کرے۔''۸۹

رابعہ الربا نے عورت (مصائب ، وجوہات ، نفسیات) میں عورت کی پیدائش ، نکاح ، مہر ، نفقہ ، طلاق ، خلع ، جہیز ، ثقافت ، وراثت ، تشدد ، تعویز ، گنڈے ، زنا ، شک ، بہتان ، سمگلنگ ، تعلیم ، چار دیواری ، مجرم عورتیں ، تھانہ ، جیل ، فنونِ لطیفہ ، آزادیِ نسواں ، طلاق یافتہ ، بیوہ اور غیر شادی شدہ عورتوں ، دارُالامان اور دارالا قامہ ، خودکشی ، گھر سے بھاگنا ، ساس ، نند ، بہو کے جھگڑوں ، اسلامی تعلیمات کا غلط استعمال ، دیہاتی و شہری طرزِ زندگی کی محاسن و مصائب کو موضوع بنایا ہے۔ خواتین میں شعور و آگہی کی شمع فیروزاں کرنا اور کہتر و کمزور گردانے جانے کی وجوہات کو موضوع بناتے ہوئے ، اس کے تاریخی ، سماجی ، نفسیاتی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ رابعہ الربا نے اُن عوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے ، جس کے تحت مرد کا دین محض کثرتِ زوج اور عورت پر حاکمیت کے علاوہ عورت کو کمتر ثابت کرنے کے لیے مختلف دلائل کا سہارا لینے پر موضوع بنایا ہے۔ رابعہ الربا نے لڑکی اور لڑکے کی تربیت میں امتیازی حیثیت کو بگاڑ کی وجہ قرار دیا ہے۔ لڑکی کی تربیت میں انتہا پسندی کا رویہ مردستائی عورت پیدا کر رہی ہے۔ نکاح میں لڑکی اور لڑکے کی رضامندی پر زور دیتے ہوئے معاشرتی رویے کی مذمت کی ہے ، جس میں زبردستی کی شادیوں کے بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں اور بیوی کو ایک '' نوکرانی کی حیثیت '' دے رکھی ہے۔ غیر برادری میں شادی کو نام نہاد شرفا محض لڑکے کی وقتی پسند ، عیاشی یا ضد قرار دے کر خاندان میں اُسے وقعت نہیں دیتے ، اسی جھوٹ کی بنیاد پر قائم کی جانے والی عمارت بہت جلد ڈھے جاتی ہے۔ کمسنی کی شادی ، وٹہ سٹہ ، نان و نفقہ ، طلاق و مہر ، جہیز ، خلع ، جائیداد اور وراثت کے مسائل کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے اور دلائل کے طور پر قرآن مجید کی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آج کل عورتوں میں شادی کے فوراً بعد ، جو طلاق و خلع یا علیحدگی کا رویہ جنم لے رہا ہے ، اِس کی نفسیاتی وجوہ بیان کرتے ہوئے رابعہ الربا لکھتی ہیں ، چوں کہ عورت گھر کی بنیاد ہوتی ہے ، اِسے ہر چھوٹی موٹی سختی یا تلخی سے اپنا گھر نہیں توڑنا چاہیے ، کیوں کہ آج کل خلع و طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح آزادیِ نسواں کے نام پر مرد سے انتقام ، فیشن اور اپنی جیت متصور کی جاتی ہے۔ کاروکاری ، ونی ، غیرت کے نام پر قتل ، سرِ عام برہنہ کر کے رُسوا کرنا ، عصمت دری ، دشنام طرازی کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے مطابق اسلام نے بچیوں کے قتل کی مذمت کی ہے اور عورت کو مکمل معاشرتی مقام بھی رہا ہے اور یہ کہ اسلام میں بیوی کی حیثیت باندی کی نہیں ہوتی ، بلکہ اِسے شوہر کے ساتھ بالکل مساوی حیثیت ملتی ہے ، کثرتِ زوج کے حوالے سے ، جو غلط تشہیر کی جاتی ہے ، اس کی نفی کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر نائیک قرآنی آیت (۱۲۹:۴) کا حوالہ دیتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں: ''گویا ایک سے زیادہ شادیاں کوئی اُصول نہیں ہے ، بلکہ ایک استثنائی صورتِ حال ہے ، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک سے زیادہ شادیوں کا حکم دیتا ہے ، جب کہ اس کا شمار تیسرے درجے میں ہوتا ہے ، یعنی ایسے کام جن کی نہ حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور نہ ہی روکا گیا ہے۔''۹۰

اسلام نے عورت کو آج سے چودہ ہزار سال قبل ہی حقوق دے رکھے ہیں۔ کشور ناہید نے ''عورت : خواب اور خاک کے درمیان'' لکھنے کا سبب اپنے اردگرد پھیلے ہوئے عورت کے مسائل کا گسٹالسٹ کو قرار دیا ، وہ جذباتی استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ صنفی امتیاز ، اکیلے پن اور تنہائی کا موجب بن رہا ہے ، اِس شدید ردِ عمل کے محرکات ہیں ، سب سے زیادہ عمل دخل اُس کی ماں کا استحصال تا ، جس کی عملی شکل قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی۔ اردگرد کے حالات و واقعات ذاتی تجربات اور

لوگوں کے مسائل ہیں۔ ایک نامعلوم خط کا حوالہ دیتے ہوئے کشور ناہید لکھتی ہیں: کشور ناہید نے عورت کے استحصال کی سب سے بدترین شکل زنا بالجبر اور اجتماعی زیادتی اور محرمات سے جنسی بدسلوکی جیسے واقعات ہیں:

''سوتیلے باپوں، بھائیوں، چچا، ماموں، دیگر رشتے داروں اور محلے داروں کا چھوٹی بچیوں کی عصمت دری کرنے کا مسئلہ ساری دُنیا میں پیش آتا ہے، یہ وہ واقعات ہیں، جن کی رپورٹنگ ہوتی ہے، ورنہ بیشتر واقعات کی تو رپورٹنگ ہی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹروں کا بچی کا بدن دیکھتے دیکھتے اکیلے میں چھیڑ دینا اور پھر اس سلسلے کو عادت بنالینا، عورت کے ساتھ بھی ایسا کرنا، درزی کا ناپ لیتے لیتے اور نائی کا بال کاٹتے کاٹتے چھیڑنا، وہ معاملات ہیں، جو اکثر رپورٹ نہیں کیے جاتے۔'' ۹۱

اِسی طرح بچپن میں جنسی اختلاط کی زیادتی، بدعملی کا خوف، بے عزتی اور بدنامی کا ڈر، تحت الشعور میں چلے جانے سے ہسٹریا کے دَورے معمول بن جاتے ہیں، اِس کے برعکس مرد ہر حال میں اعلان کرتا ہے کہ عورت نے اُسے خود دعوتِ گناہ دی تھی۔ مرد کا یہ جملہ ''عالمی مردانہ رائے'' بن گیا ہے، اِسی طرح زنا بالجبر میں پاکستان پینل کوڈ کے مطابق مرد و عورت دونوں کے خلاف پرچہ ہوسکتا ہے، یہ ناقابلِ ضمانت جُرم ہوتا ہے، تاہم عورت کو ضمانت کی رائے دی جاتی ہے، مگر کشور ناہید اِس سماجی مسئلے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''ہوتا یہ ہے کہ عورت پر جیسے ہی یہ الزام لگتا ہے کہ خاندان والے اِس سے لاتعلقی کر لیتے ہیں، جس مرد کے ساتھ اِس کو ملوث کیا جاتا ہے، وہ اُسے شناخت کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے اور یہ کہنے سے بھی باز نہیں آتا کہ میں، تو اِس عورت کو جانتا ہی نہیں، یہ تو مجھے بدنام کرنے اور میری شہرت کو نقصان پہنچانے کے لیے مجھے ملوث کر رہی ہے۔'' ۹۲

اسقاطِ حمل کے حوالے سے، کشور ناہید کا کہنا ہے کہ ساری دُنیا اور پاکستان میں عورتوں کا مطالبہ ہے کہ وہ حمل، جو زنا بالجبر کا نتیجہ ہے اُسے اسقاط کرانے کی قانونی اجازت ہونی چاہیے، کیونکہ ایک طرف، تو عورت پر عصمت دری کا الزام اور لوگوں کی پھٹکار پڑتی ہے اور دوسرا وہ زہر اپنے اندر پالنے پر مجبور ہوتی ہے، اِسی طرح طلاق، نان نفقہ کے مسائل، مہر، جہیز اور عورت کو بانجھ پن، پاگل پن اور لڑکے کی پیدائش کا نہ ہونے کا قصور وار ٹھہرا کر دوسری شادی رچانا۔ مرد ہمہ وقت عورت کو طلاق سے دھمکانا، دوسری شادی کی دھمکیاں اور بچوں کو چھین لینا، جیسے خوف اور مستحکم کرنے جیسے مسائل کو موضوع بناتے ہوئے ایک مناسب لائحہ عمل اور فیملی یا عائلی قوانین کی ضرورت پر زور دیا ہے، تاکہ عورت کو استحصال کی تمام صورتوں سے بچایا جاسکے۔ اگر سیاست میں عورت حصہ لیتی ہے، تو اُسے اپنے شوہر کا اجازت نامہ جمع کروانا پڑتا ہے، تاکہ اُس کی خانگی زندگی متاثر نہ ہو:

''عورت کو سیاست میں آنے کے لیے لوہے کا کلیجہ کرنا پڑتا ہے، ہر قسم کے لطیفے، بدکرداری کے قصے، طرح طرح کے بہتان، الزام، دشنام، جلسے کرنے، لوگ اکٹھے کرنے، اُن کی سوطرح کی فرمائش سُننی، طرح طرح کے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اور پھر گاؤں گاؤں شہر شہر گھومنا، جب عورت اِن تمام پابندیوں اور مشکلات کے باوجود، مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہونے لگے، تو اِس پر حملہ آور ہونا اور برملا یہ کہنا، آپ اچھی، عورت

ہوتیں، تو گھر بیٹھتیں۔''۹۳

''عورت اور جُرم'' میں جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کشور ناہید اِس کا سبب جہالت ، ناواقفیت اور بے جا پابندیوں کے باعث لاعلمی کو قرار دیتی ہیں۔ دُنیا بھر مین جسم بیچنے کا جُرم عورت کا متصور کیا جاتا ہے، حالاں کہ اعداد وشمار کے مطابق ۱۴ فیصد عورتیں اور ۸۶ فیصد مرد ملوث ہوتے ہیں۔ جرائم کی طرف راغب ہونے کے شاخسانے بچپن ہی میں گھریلو ماحول سے ملتے ہیں۔ ماں باپ کی عدم توجہی ، ماں باپ کے لڑائی جھگڑے ،طلاق ، گھر سے دور کام کرنے یا کسی سبب ماں باپ کا گھر میں نہ رہنا، غربت ، بے جا اخلاقی قدروں کی پامالی بنتے ہیں۔عورتوں میں جرائم کی وجہ وہ ترغیب ہے ، جو باپ ، بھائی ، عاشق یا شوہر کی طرف سے عورت کو دی جاتی ہے۔ دوسرے مرد کے ساتھ بھاگنے والی عورتوں میں بدکاری کی شرح ۱۸.۲ فیصد ہے۔ ۲۷ فیصد دوسرے مردوں کے بھاگنے والیوں کو حرام کاری پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ عورتیں زیادہ تر شوہر کے بُرے سلوک اور سُسرال کے مظالم سے یہ راستہ اختیار کرتی ہیں۔ سمگلنگ میں ۲۵ فیصد اور ۷۵ فیصد دُکانوں سے چیزیں اُٹھانے کی مجرم ہوتی ہیں۔ ۸.۴ فیصد ساس سُسر کا قتل ، ۲۸ فیصد شوہروں کا قتل اور اپنے ہی والدین یا بہن بھائی کا قتل ، ۷۱ فیصد جرم خواتین میں پایا جاتا ہے۔۹۴ قیدی عورت ، جاہل اور اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے حقوق نا آشنا ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ''صاحب لوگ'' جس قدر ممکن ہوتا ہے اُسے جبریت اور بربریت کا نشانہ بناتے ہیں۔

ضمیر علی بدایونی نے ''نسائی شعور'' کو تنقیدی مطالعے کا اہم جذز قرار دیا ہے، اُن کے خیال میں ''نسائی شعور'' کا مطالعہ ایک تحریک اور فکری دبستان کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ نسائی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نسائی شعور دراصل مابعد جدید Post Modern رویوں کی آگہی کا نام ہے، جو ہماری فکر کا مکمل حصہ نہیں بن سکا ، کیوں کہ ہماری قدریں روایتی طور پر مردوں کی فکر کی تابع رہی ہیں، اِن میں عورت کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے، اَب صورتِ حال یہ ہے کہ عورتیں مرد کی حاکمیت اور اُن کے تابع رسم و رواج سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اِس آئینے میں دیکھ رہی ہیں، جو اِن اور اِن سے متعلق معاشرے کا سچا اور اصلی روپ سامنے لا سکے ، اِس آئینے سے قدیم رسم و رواج کی گرد اُتر رہی ہے اور عورت کا بہ حیثیتِ انسان ایک مکمل وجود سامنے آ رہا ہے، جس میں فکر، ادراک اور شعور بھی ہے، وہ شعور، جس پر مردانہ معاشرتی روایت کے زیرِ اثر ادیبوں اور تنقید نگاروں نے توجہ نہیں دی تھی ۔ اَب خواتین اپنی فکر اور اِس کے اظہار میں اتنی ہی آزاد ہیں اور خود مختار بھی جتنے مرد۔''۹۵

''گائنو کریٹی سیزم'' ناقدین نے مختلف افکار و نظریات کی ترویج کے لیے تنقیدی اُصول اور قواعد و زبان وضع کیے ہیں۔ تنقیدی اصطلاحات عموماً موضوع کی مناسبت سے وضع کی جاتی ہیں۔ نسائی تنقید کے لیے ضمیر بدایونی نے گائنو کریٹی سیزم کا ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے یہ اصطلاح ایلن شوالٹر نے استعمال کی، اِس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گائنو کریٹی سیزم خواتین کی تمام ادبی تخلیقات کا احاطہ کرتی ہے، جن میں ناول، افسانے ، ڈراما، شاعری مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ نسائی تنقیدی مطالعہ، خواتین کے تخیلات ، زبان اور اِن کے تجربات و کیفیات سے متعلق ہے۔ نسائیت کی پوری تحریک اور نسائی تنقید

دراصل نسائی ادب کے پوشیدہ خزانے کی بازیافت ہے۔"۹۶

ناصر عباس نیر تانیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تانیثیت محض ادبی متون ہی نہیں، پوری انسانی تاریخ اور جملہ ثقافتی مظاہر کے مطالعے کا نیا تناظر فراہم کرتی ہے، یہ تناظر دراصل وہ نئے سوالات ہیں، جنھیں حقوق نسواں، آزادیٔ نسواں کی تحریکوں اور تانیثی تھیوری نے گزشتہ صدی میں تشکیل دیا ہے، گویا تانیثیت محض ایک ادبی تھیوری نہیں ہے۔ اِس کی نہج اور دائرہ کار دونوں عورتوں کی آزادی اور حقوق کی سیاسی وسماجی تحریکوں سے شدید طور پر متاثر ہیں۔"۹۷

ناصر عباس نیر کے خیال میں عورت پدر شاہی نظام کی پیداوار ہے اور انسانی اوصاف سے تہی کمتر مخلوق ہے، اُن کے خیال میں پر کھے جانے والے متون میں عورت، عموماً اتنی فعال نظر نہیں آتی یعنی تاریخی وثقافتی پس منظر میں اِس کا کردار معدوم دکھائی دیتا ہے، اِس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اِس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ تب عورت کی ذات کو فقط جذباتی پہلو کے اظہار کی اجازت اور گنجائش تھی، اِسے ثقافتی نظام میں جو کردار سونپا گیا اور جسے نباہنے پر اِسے برابر مجبور رکھا گیا، وہ 'خانگی' تھا 'سماجی' نہیں تھا۔"۹۸

مذکورہ بالا مباحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تانیثیت نے تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی گہرے نقوش ثبت کیے ہیں اور تانیثی محققین وناقدین نے خیالات کی وسعت اور موضوعاتی رنگا رنگی کے باعث اُردو کے ادبی سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ قاضی عبدالودود، اصولِ تحقیق مشمولہ آج کل (تحقیق نمبر)، اگست ۱۹۶۷ء، ص ۴
۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مباحث، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۳۶۲
۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول مشمولہ اُردو میں اصولِ تحقیق، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، س ن، ص: ۶۶
۴۔ شاہدہ حسن، نسائی حسیت اور شعری پیرائے مشمولہ فیمینزم اور ہم مرتبہ فاطمہ حسن، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۳۔۱۵۴
۵۔ افتخار احمد شیروانی، عورتوں کی محکومیت، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۳ء، ص ۵۲۶
۶۔ منیر احمد، عورت اور بازار، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸
۷۔ ایضاً، ص ۳۵
۸۔ انیس ناگی، ناراض عورتیں، لاہور، جمالیات، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲
۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس اور جذبات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۹
۱۰۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین کے افسانوی ادب میں عورتوں کے مسائل تصویر کشی (۱۹۴۷ء۔۲۰۰۱ء)، اسلام آباد: وزارتِ ترقی خواتین، حکومتِ پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۸
۱۱۔ چراغ حسن حسرت، سرگزشتِ اسلام، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ص ۹۵
۱۲۔ وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، لاہور: نگارشات، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵
۱۳۔ ایضاً، ص ۴۰
۱۴۔ ایضاً، ص ۴۱
۱۵۔ ایضاً، ص ۴۲
۱۶۔ سوزن گریفن، عورت اور فطرت مترجمہ شفقت تنویر مرزا رمسعود اشعر مشمولہ عورت۔ زبانِ خلق سے زبانِ حال تک مرتبہ کشور ناہید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۵۱
۱۷۔ شاہین سردار علی، عورت اور اسلام مترجمہ مسعود اشعر مشمولہ عورت۔ زبانِ خلق سے زبانِ حال تک مرتبہ کشور ناہید، ص ۱۱۴
۱۸۔ وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، ص ۸۳
۱۹۔ کشور ناہید، عورت، خواب اور خاک کے درمیان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰
۲۰۔ ایضاً، ص ۷
۲۱۔ وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، ص ۶۶
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۰۳
۲۳۔ نعیم صدیقی، عورت معرضِ کشمکش میں، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۴
۲۴۔ منیر احمد، عورت اور بازار، ص ۹۲

۲۵۔ایضاً،ص۹۲

۲۶۔ایضاً،ص۱۱۰

۲۷۔ایضاً،ص۱۱۱

۲۸۔رابعہ الربأ،عورت (مصائب، وجوہات، نفسیات)، لاہور: دُعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵،ص ۲۷

۲۹۔کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط (نازائیدہ بیٹی کے نام)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳،ص ۳۶

۳۰۔انیس ناگی، ناراض عورتیں، لاہور: جمالیات، ۲۰۰۳،ص ۲۶

۳۱۔ایضاً،ص ۶۷

۳۲۔شمیم مختار، کیا عورت آدھی ہے (حلالہ کے موضوع پر ایک چھوٹی تحریر)، لاہور: شاہد پبلی کیشنز: س ن،ص ۱۵۷

۳۳۔کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط،ص: ۱۱، ۱۳

۳۴۔ایضاً،ص ۱۹۲

۳۵۔فاطمہ حسن، بیدی کی کہانیوں میں عورت، پُرش اور پراکرتی مشمولہ ادب کی نسائی ردِ تشکیل (غلطی ہائے مضامین) مرتبہ فہمیدہ ریاض، کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۲۰۰۶،ص ۴۷

۳۶۔فاطمہ حسن، بیدی کی کہانیوں میں عورت، پُرش اور پراکرتی مشمولہ ادب کی نسائی ردِ تشکیل،ص ۷۶

۳۷۔انیس ناگی، ناراض عورتیں،ص ۴۱

۳۸۔امین احسن اصلاحی، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۹۶،ص ۹۶

۳۹۔زاہدہ حنا، پاکستانی عورت، آزمائش کی نصف صدی مشمولہ عورت: زندگی کا زنداں (مضامین)، کراچی: شہزاد، ۲۰۰۴،ص ۷۵

۴۰۔ایضاً،ص ۸۳

۴۱۔امین احسن اصلاحی، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام،ص ۱۰۰

۴۲۔ایضاً،ص ۱۵۱

۴۳۔ایضاً،ص ۱۵۲

۴۴۔کشور ناہید، بُری عورت کے خطوط،ص ۲۰

۴۵۔خاور ممتاز، فریدہ شہید، معاشی عمل اور خواتین مترجمہ شفقت تنویر مرزا مشمولہ عورت۔زبانِ خلق سے زبانِ حال تک مرتبہ کشور ناہید،ص ۲۹۴

۴۶۔کشور ناہید، عورت، عورت۔بطور جُز وقتی کارکُن مشمولہ خواب اور خاک کے درمیان،ص ۳۵

۴۷۔ایضاً،ص ۴۶

۴۸۔انعام الرحمٰن سحری، عورت جرائم کی دلدل میں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱،ص ۱۵۴

۴۹۔زاہدہ حنا، ذرائع ابلاغ کا صنفی رویہ مشمولہ عورت: زندگی کا زنداں،ص ۱۳۴۔۱۳۵

۵۰۔انیس ناگی، ناراض عورتیں،ص ۱۳

۵۱۔ابوالکلام آزاد، مسلمان عورت، لاہور: مکتبۂ جمالیات، ۲۰۰۶،ص ۱۲

۵۲۔یاسر جواد،عورت (جسمانی،تاریخی،نفسیاتی اور معاشرتی مطالعہ) مترجمہ،لاہور: فکشن ہاؤس،۱۹۹۹،ص ۲۰۱
۵۳۔ایضاً،ص ۳۰۵
۵۴۔خلیل احمد،عورت،جنسی تفریق اور اسلام،مترجمہ،لاہور: مشعل،۱۹۹۵،ص ۸
۵۵۔ایضاً،ص ۱۱
۵۶۔کشور ناہید،عورت کی آزادی۔مغرب و مشرق۔قربتیں اور فاصلے مشمولہ عورت،خواب اور خاک کے درمیان،ص ۲۸
۵۷۔کشور ناہید،خواتین لکھنے والیوں کے توسط،استعارے کی تفہیم مشمولہ خواتین افسانہ نگار ۱۹۳۰ سے ۱۹۹۰ تک مرتبہ،
لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۶،ص ۱۰
۵۸۔یاسر جواد،عورت،ص ۵۱۶
۵۹۔خلیل احمد،عورت،جنسی تفریق اور اسلام،ص ۳۷
۶۰۔سلیم اختر،ڈاکٹر،عورت جنس اور جذبات،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۹،ص ۱۶۹
۶۱۔ایضاً،ص ۱۷۰
۶۲۔کشور ناہید،بُری عورت کے خطوط،ص ۱۷
۶۳۔ایضاً،ص ۹۴
۶۴۔ایضاً،ص ۹۵
۶۵۔سلطانہ بخش،ڈاکٹر،پاکستانی خواتین کے افسانوی ادب میں عورتوں کے مسائل تصویر کشی،ص ۲۱۵
۶۶۔وارث میر،کیا عورت آدھی ہے،ص ۱۷۷
۶۷۔منیر احمد،عورت اور بازار،ص ۱۲۳
۶۸۔کشور ناہید،بُری عورت کے خطوط،ص ۵۵۔۵۶
۶۹۔ایضاً،ص ۳۸
۷۰۔زاہدہ حنا،ذرائع ابلاغ کا صنفی رویہ مشمولہ عورت: زندگی کا زنداں،ص ۱۳۹
۷۱۔کشور ناہید،خواتین لکھنے والیوں کے توسط،استعارے کی تفہیم مشمولہ خواتین افسانہ نگار،ص ۶
۷۲۔نجمہ منظور،منٹو کی عورت اور وارث علوی مشمولہ ادب کی نسائی ردِ تشکیل،ص ۶۳
۷۳۔فاطمہ حسن،بیدی کی کہانیوں میں عورت: پُرش اور پراکرتی مشمولہ ادب کی نسائی ردِ تشکیل،ص ۷۱
۷۴۔عقیلہ جاوید،ڈاکٹر،اُردو ناول میں تانیثیت،ملتان: شعبۂ اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی،۲۰۰۵،ص ۳۰۲
۷۵۔قاضی عبدالغفار،لیلیٰ کے خطوط،لاہور: یو پبلی شرز،۲۰۰۱،ص ۱۲۷
۷۶۔وارث میر،کیا عورت آدھی ہے،ص ۱۰
۷۷۔زاہدہ حنا،پاکستانی عورت: آزمائش کی نصف صدی مشمولہ عورت: زندگی کا زنداں،ص ۹۹
۷۸۔زاہد محمود،ڈاکٹر،گھریلو تشدد،لاہور: نگارشات پبلشرز،۲۰۰۶،ص ۱۳
۷۹۔زاہدہ حنا،پاکستانی عورت: آزمائش کی نصف صدی مشمولہ عورت: زندگی کا زنداں،ص ۹۷

۸۰۔ ایضاً،ص ۱۱۴

۸۱۔ ایضاً،ص ۹۱

۸۲۔ ایضاً،ص ۹۶

۸۳۔ انیس ہارون، فیمینزم اور پاکستانی عورت مشمولہ فیمینزم اور ہم،ص ۱۴

۸۴۔ تنویر انجم، عصمت چغتائی کا نسائی شعور مشمولہ فیمینزم اور ہم،ص ۱۲۳۔۱۲۴

۸۵۔ وارث میر، کیا عورت آدھی ہے،ص ۴۵

۸۶۔ منیر احمد، عورت اور بازار،ص ۳۹

۸۷۔ ایضاً،ص ۲۵۲

۸۸۔ ایضاً،ص ۶۸۔۶۹

۸۹۔ انیس ناگی، ناراض عورتیں،ص ۱۱۷

۹۰۔ ذاکر نائیک ڈاکٹر، اسلام میں خواتین کے حقوق، جدید یا فرسودہ؟، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۶،ص ۶۴

۹۱۔ کشور ناہید، زنا بالجبر اور اسقاطِ حمل مشمولہ عورت: خواب اور خاک کے درمیان،ص ۵۸

۹۲۔ ایضاً،ص ۶۰

۹۳۔ کشور ناہید، عورت اور سیاست مشمولہ عورت: خواب اور خاک کے درمیان،ص ۹۹۔۱۰۰

۹۴۔ کشور ناہید، عورت اور جُرم مشمولہ عورت: خواب اور خاک کے درمیان،ص ۱۰۵

۹۵۔ ضمیر علی بدایونی، نسائی شعور مشمولہ نسائیت کی تحریک اور اُردو ادب مرتبہ ضمیر علی بدایونی / فاطمہ حسن، کراچی: اکادمی بازیافت، جنوری تا جون، ۲۰۰۳، مکالمہ (کتابی سلسلہ: ۱۰)،ص ۲۱

۹۶۔ ایضاً،ص ۲۲۔۲۳

۹۷۔ ناصر عباس نیر، تانیثیت اور جدید اُردو نظم مشمولہ سُمبل، راول پنڈی، الیف۔ آئی پرنٹرز، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶، جلد اول، شمارہ ۱۰،ص: ۶۰

۹۸۔ ایضاً،ص ۶۱۔

باب چہارم

تانیثیت کے اثرات مستقبل کے اُردو ادب پر

ادب اور فنونِ لطیفہ زندگی کے عکاس و ترجمان ہوتے ہیں، کسی بھی دَور کا ادب انسان، کائنات اور خدا کی تثلیث کے علاوہ مذہب، اخلاق اور سماج کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ ہر دَور نئے رُجحان، نئی سوچ اور طرزِ فکر کا غماز ہوتا ہے، گنگا جمنی تہذیب کے مظہر، اُردو ادب نے مقامی بولیوں، عرب، ترک و ایران اور یورپی ادب کے اثرات قبول کیے، مستقبل میں دُنیا کے سیاسی و سماجی حالات اور ادبی رُجحانات نئے رُخ اختیار کر رہے ہیں، اِن میں دوسری جنگِ عظیم کی طرح نائن الیون کے واقعات اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیاں ہیں، جن سے مستقبل میں پوری دُنیا میں جبر و دھونس اور عدم تحفظ کا احساس مزید بڑھے گا اور طاقتور اقوام کمزور قوموں کو نگلنے لگیں گی، ملکوں کے مابین جنگ و جدل اور اندرونی خلفشاری بڑھنے سے ریاستیں معاشی، صنعتی اور زرعی لحاظ سے مزید بدحالی کا شکار ہوں گی۔ پروپیگنڈا اوار کے ذریعے ملکوں کی بجائے عوامی ذہنوں کو غلامی کا طوق پہنا دیا جائے گا۔ ریاستی جبر کے ردِعمل کے طور پر ذہنی آزادی اور آزادیِ اظہار کی تحریک کے جنم لینے سے استبدادی قوتوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت شروع ہو جائے گی۔ تانیثی ادب کے ذریعے ہی ہم یہ سوچ پروان چڑھا سکتے ہیں کہ عورت صرف جسمانی ضرورت کی شے نہیں اور نہ ہی کمتر، کم فہم اور نادان ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان ہے۔ جذبات و احساسات اور سوچ و فکر رکھتی ہے۔ گھر بھر کی ذمہ داری، بچوں کی تربیت اور پرورش صرف اِس کا فرض ہی نہیں، بلکہ مرد بھی برابر کا حصے دار ہے۔ مرد کو بھی حاکمیت کا طلسم کدہ توڑتے ہوئے نئے اندازِ فکر اور فلسفۂ حیات اپنانا پڑے گا، جس میں عورت اِس کی ماتحت نہیں، بلکہ شریکِ حیات اور ہم قدم و دمساز ہوگی۔

آج کی عورت باشعور بھی ہے اور حقوق آشنا بھی وہ محض جذباتیت اور سطحیت کو زندگی کی اساس قرار نہیں دے رہی، بلکہ زندگی اپنے تمام تر حقائق کے ساتھ اُس کے روبرو عیاں ہے۔ وہ خودستائشی کی بھول بھلیوں میں اُلجھنے کی بجائے حقیقتوں کے تانے بانے بننے لگی ہے، یہی وجہ ہے کہ قلمکار عورت موجودہ دَور میں پروان چڑھنے والے رُجحانات و محرکات سے آگاہ ہو چکی ہے۔ حد سے تجاوز کرنے والی تلذذ اور ابتذال کی آمیزش کا تدارک نہ کیا گیا تو بہت سے مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کے افراد کو زبان و قلم کے ساتھ عورت و مرد کو احساسِ ذمہ داری فرائض کی طرف مائل کرنا ہوگا، اُنھیں عزت و وقار، شخصی انا اور عصمت کی حفاظت سے آگاہی و شعور بھی دلانا ہوگا، ورنہ جس تیزی کے ساتھ گلوبل ویلج کی آڑ میں مخربِ اخلاق غیر انسانی پُرتشدد ذہنیتوں کی آبیاری کی جارہی ہے، اِسے کنٹرول کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ ہمارا دانش ور طبقہ بھی بعض اوقات عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔

ادب میں جہاں عورتوں کو درپیش مشکلات کی نشاندہی کا تعلق ہے، تو تانیثی شعور کے حامل نثر نگاروں اور شعرا و شاعرات نے بڑی کامیابی سے اِس کی عکاسی کی ہے، اِن مسائل کے بہتر حل کی تلاش کا عمل بھی جاری ہے۔ پہلا مرحلے میں مسائل کو منظرِ عام پر لا کر عوامی سطح پر آگاہی کا تھا، یقیناً مستقبل میں لکھے جانے والے ادب میں اِن کے مسائل کا حل مزید

بہتر صورت میں سامنے آئے گا، تا کہ استحصال سے پاک معاشرہ تشکیل دیا جا سکے گا۔ بصورتِ دیگر موجودہ دَور میں استحصالی رویوں سے خائف عورت نفسیاتی طور پر اپنی حیثیت کو قائم رکھنے کی بجائے اپنا وقار داؤ پر لگا کر خانگی نظام کی تباہی کا سبب بن جائے گا اور بے جا آزادی اور اخلاقی اقدار سے لاتعلقی کا رُجحان، بے راہ روی کے فروغ کا سبب بن جائے گا اور آزادانہ مخلوط میل جول کو دوستی کے نام پر مرد و عورت کی مساوات قرار دیے جانے کے غلط نظریات فروغ پانے لگیں گے۔

موجودہ دَور کی عورت کے مسائل سابقہ ادوار سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا، ایک ایسے طریقہ کار یا لائحہ عمل ضروری ہو جائے گا، جس سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ اور گھریلو عورت کی عزتِ نفس اور تکریمِ ذات کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مردوں کے رویوں کی، جن بدصورتیوں کی شکایت عورتیں کرتی ہیں۔ احساسِ برتری اور رعونت پیدا کرنے والی بھی عورتیں ہیں، اگر اِن کی سوچ میں تبدیلی نہ لائی گئی، تو عورت، عورت کے لیے جبریت، استحصال اور تسلط کا شکار ہو گی، خصوصاً عورت بہ حیثیتِ ماں حاکمیت اور استحصال کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ کمپیوٹر ایج میں الیکٹرانکس کی ترقی، موبائل فونز اور انٹرنیٹ کے ذریعے انسانی تعلقات کے لیے نئی آزمائش ثابت ہو گی۔ ان اشیائے سہولت نے گھروں کی پرائیوسی پر زقند لگانے کی وجہ سے میسجز اور ایس ایم ایس کے ذریعے گھروں کی چاردیواری میں غیر مرد اور عورتوں کی ہونے والی مداخلت کی روک تھام نہ کی گئی تو خانگی زندگیوں کے شرازے بکھر جائیں گے۔

ہر دَور اپنی آزمائش لے کر آتا ہے۔ مستقبل میں لوگوں کا طرزِ زندگی میں آنے والی تبدیلی اخلاقی معیارات، قدریں تبدیل ہو جائیں گی۔ سماجی رویوں میں اجتہادی رویے اختیار نہ کرنے سے زندگی جمود کا شکار ہو جائے گی اور جنریشن گیپ کے بڑھنے کا سبب بنے گی۔ زندگی کے ہر میدان میں عورتوں کی شمولیت اِس بات کا پیش خیمہ ہے کہ عورتوں میں خود انحصاری کا رُجحان فروغ پائے گا، جس کی وجہ عورتوں کی داخلی خودمختاری کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ ماں باپ کی مصروفیت، عدم توجہی، ڈے کیئر سنٹرز اور آیاؤں کی پروردہ نسل، سہولیاتِ زندگی کی فراوانی کے باوجود دائمی ناآسودگی کا شکار ہو گی، بے راہ روی سگریٹ نوشی، مخلوط محافل، رقص و سرود، ایڈوینچر کے نام پر چوری چکاری اور لوٹ مار کے علاوہ سرد مہری کے رویوں میں اضافہ ہو گا۔ فرسٹیٹیڈ نسل کے یہ نمائندگان والدین کے وجود سے متنفر ہو جائیں گے، اولاد کے ہوتے ہوئے بھی دائمی جدائی اِن کا مقدر بنے گی:

> ''یہ سلطنت ہر عورت کو بلا کسی مطالبہ اور بغیر کسی کشمکش کے حاصل ہوتی ہے۔ اَب غور کیجیے کہ عورت اگر اِس سلطنت کو چھوڑ کر معاشی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے باہر نکلتی ہے، تو وہ اِس کے بدلہ میں کیا حاصل کرتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ کسی کارخانہ یا دفتر کے اندر ایک ملازمت یا حکومت کے اندر ایک کُرسی، جس کا بڑا سے بڑا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ عورت کو معاشی خودمختاری حاصل ہو جائے۔ کیا یہ معاشی خودمختاری ایسی چیز ہے، جس کے لیے عورت اپنے گھر کی مملکت کو خیر آباد کہہ دے۔''[۱]

مرد وعورت کا تعلق فطری اور نا گزیر ہے، اِن معاشرتی وتہذیبی عوامل کی بیخ کنی کرنی چاہیے، جو استحصال کا سبب بنتے ہیں۔ مرد وعورت کی تخلیقات تعصبات سے مبرا ہونی چاہیں۔ مستقبل قریب میں اگر مرد وعورت نے خود احتسابی کا عمل جاری نہ رکھا تو وقت کے کٹہرے میں دونوں سماجی انتشار کا سبب ٹھہرائے جائیں گے۔ آزادیِ اظہار اور سنے جانے کی شدید ترین خواہش کا کتھارسس خواتین نثر نگاروں اور شاعرات کے ہاں بکثرت موجود ہے۔ کشور ناہید کا اِس سلسلے میں کہنا ہے:

''ساری خواتین افسانہ نگاروں میں Monologue کی فضا جاری رہتی ہے۔ کہانی میں کہیں بھی Dialogue کی نوبت نہیں آتی ہے کہ زندگی میں بھی اصل یہی منظر ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، میاں بیوی۔۔۔ کسی کے درمیان ڈائیلاگ نہیں ہے۔ محلوں میں اصطبلوں کی طرح بھری عورتوں اور مسجدوں میں سب لذتوں سے محروم مولویوں کو جن غیر فطری عادتوں کا شکار کرتا ہے، اِن میں ایک معصوم مگر لڑکی کی تعلیم کے آغاز سے اَب تک متوسط طبقے کی لڑکیوں اور اُستانیوں کے درمیان، چنگاریوں کے سے رشتے کو بھی عورت ہی نے موضوعِ سخن بنایا۔''[۲]

خواتین کی نوکریوں نے فرائض کا انبوہِ عظیم اُن پر لاد دیا ہے، جب کہ حقوق دب کر رہ گئے ہیں اور آج کا مرد اپنے حصے کا بوجھ بھی عورت کے کندھوں پر ڈال کر بے فکری اور لا پروائی کا شکار ہو رہا ہے اور احساسِ ذمہ داری، کنبے کا تحفظ اور بقا کی کاوشیں، جو مردانگی کی دلیل تھیں، ان پر قابو پانے سے ہی وہ عورت کی نظر میں اپنا کھویا ہوا وقار بلند کر سکے گا۔ عورت کو کمانے کا حق تو مل گیا ہے، لیکن اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا اختیار بھی دینا ہوگا:

''اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے سے پہلے گزرنے والی عورتوں کی تخلیقی ہنر مندیوں کو دریافت کریں اور مرد کے لیے ادب کا اور تاریخ کا ایک سچا نصاب مرتب کریں، جو اِس کے ذہن سے عورت کے بارے میں تحفظات، بے جا برتری اور غاصبانہ رویوں کے جالے صاف کر سکے۔ ایک روشن خیال اور آزاد روح عورت کے لیے مساوات پر ایمان رکھنے والے روشن دماغ مرد سے خوبصورت ساتھی اور کون ہوسکتا ہے؟۔''[۳]

عورت کیا ہے، اِس کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟، کیا مرد وعورت برابر ہیں؟ کیا عورت عملی زندگی میں مردوں کے ساتھ شریک ہوسکتی ہے؟۔ کیا پردہ غلامی اور دقیانوسیت کی علامت ہے؟ مسلمان عورت کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے وغیرہ پر ابوالکلام آزاد نے مدلل گفتگو کی ہے، مقدمے میں لکھتے ہیں:

''آج علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ اُنھیں عام آزادی بھی دے دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے، جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام

نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں، پروفیسر عورتیں ہیں اور لیکچرار عورتیں ہیں، غرض یہ کہ ہر میدان میں عورتیں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں، یہ نظیر بھی بتلا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فائدہ اُٹھائیں، تو وہ کسی چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہوسکتیں۔''[۴]

صنفی امتیازی رویوں کے باوجود آج عورت زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں اپنی خدمات انجام دیتی دکھائی دے رہی ہے، حتیٰ کہ اُن میدانوں میں بھی، جو خاص الخاص مردوں سے مخصوص سمجھے جاتے ہیں، مستقبل کے تناظر میں ملازمت پیشہ خواتین کو دیکھا جائے، تو اِن کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ مردوں کو اُنھیں محض عورت سمجھنے کی بجائے اپنی معاون کارکن کے تسلیم کرنا پڑے گا، اِن کے بچوں کے لیے دفاتر اور اداروں میں نرسریوں کے علاوہ خواتین کے لیے الگ بیت الخلا کی سہولیات مفقود ہوتی ہیں، ادارے کی تعمیر میں اس کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ عورتوں کی زندگی کے ہر میدان میں شمولیت سے مردوں کی عورتوں میں حریصانہ نگاہوں کی ہوسنا کی بڑھنے سے عورتوں میں نقاب وحجاب کے استعمال کے رُجحان میں تیزی آئے گی۔ شعروادب میں بھی عورت کو محض سامانِ راحت وتعیش بنانے والوں کو عورت کے خال وخط کے گورکھ دھندوں سے نکلنا پڑے گا۔ ابتذال ورکاکت، طعنہ وتشنیع اور معاندانہ ومتعصبانہ رویوں کے علاوہ شہوت پرستانہ خیالات کی آماجگاہ ثابت کرنے والوں کو بالآخر عورت کو تکریم وتعظیم دینا پڑے گی۔

سماجی رشتوں میں میاں بیوی کا رشتہ پوری حیاتِ انسانی اور سماجی ڈھانچے کی بنیاد ہوتا ہے۔ بہت سے مصنفین ایسے ہیں، جنھوں نے معاشرتی ناسوروں اور استحصالی رویوں کو بے نقاب تو کر دیا ہے، لیکن اِس ناہمواری اور بے انصافی کا تدارک بتانے سے گریز کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسائل تو اُجاگر ہوگئے ہیں، لیکن اِن کا حل تلاش کرنا قدرے دشوار ہے۔ اِسی حوالے سے فہمیدہ ریاض کا کہنا ہے کہ اب گزشتہ نسلی اور اندھے قوم پرستانہ رویے میں تبدیلی پیدا ہوچکی ہے۔ لہٰذا، عورتوں کی جانب ادیبوں کا رویہ نسلی، قومی اور طبقاتی نابینائی کی ایک توسیع ہے، اُردو ادب پر یہ اول تا آخر مسلط نہیں ہے۔[۵] ادب اور ذرائع ابلاغ ایسا وسیلہ ہیں، جو مثبت ومنفی خیالات وقدروں کی ترویج کا باعث بنتے ہیں، اگر اِن کے ذریعے مسائل کی اصل وجوہات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ایک بہتر حل تلاش کر لیا جائے، تو معاشرے میں فکری اور نفسیاتی سطح پر بہت اچھی تبدیلی آسکتی ہے۔

مستقبل قریب میں عورتوں نے معاشی انحصار اور تنگ دستی کا طویل دَور گزار کر اقتصادی سطح پر اپنے آپ کو مضبوط اور خودمختار کرنے سے گھر کی چار دیواری کے اندر اور گھر سے باہر کی دُنیا میں اپنی عزت ووقار کی تعظیم، عزتِ نفس کی تکریم ذات اور مرتبے کی اگر حفاظت نہ کی گئی، تو آزادی کے نام پر بُری طرح استحصال کا شکار ہوگی، کیوں کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ باشعور پڑھی لکھی حتیٰ کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز عورتیں بھی مردوں سے دوستانے اور تعلقات، جدیدیت اور برابری کی آڑ میں بڑھا کر، گھروں کی بربادی کا سبب بن رہی ہیں اور اِن کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوتا جائے گا، اِسی تباہی کی

شدت میں اضافہ شادی شدہ افراد کے ناجائز تعلقات اور معاشقوں کی صورت میں زیادہ ہوگا، کیوں کہ اِن کے ساتھ افراد کی زندگیاں وابستہ ہوتی ہیں۔

جنسی تشدد اور جنسی طور پر ہراساں کرنا لاشعوری طور پر اپنی برتری جتانے کا انتہائی منفی طریق کار ہے۔ مرد کے اِس ذہنی انتشار کی اصل بنیاد کو جانتے ہوئے، اِس کا سختی سے تدارک کرنا پڑے گا۔ عورت سے متعلق جرائم کا خاتمہ کے قوانین کا اطلاق ناگزیر ہو جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ اخلاقی قدروں میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں، یہ انسانی قوت اور طاقت کو ظاہر کرتی ہیں، اِن کی پاسداری ہی سے اِن کا استحکام ممکن ہے۔ ونی کاروکاری، وٹہ سٹہ، قتل، جائیداد و جھگڑوں کے خاتمے کے لیے پنچائیت کے غلط فیصلوں کی بھینٹ چڑھنے والی عورتوں کی بغاوت بڑھنے سے مرد کے غاصبانہ رویے کے خلاف مزاحمت شدید ترین ہو جائے گی۔ عورتوں، بچوں پر جنسی تشدد کے خلاف اُٹھائی جانے والی آواز شدت اختیار کر جائے گی۔ بے حرمتی و عصمت دری، بچیوں کا اغوا، جنسی تشدد کا شکار بننے والی عورتوں کے لیے سماجی تنظیموں، پڑھے لکھے اور ادبی حلقوں، مذہبی رہنماؤں، قانون نافذ کرنے والے اداروں، سماجی تنظیموں اور عوامی سطح پر نعرۂ احتجاج بلند کرتے ہوئے مشترکہ لائحہ عمل اپناتے ہوئے ظالم درندوں کو اِن کی ہوسنا کی کی سرِ عام عبرت ناک سزا دینا پڑے گی ورنہ، جس تیزی سے جنسی جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے گمان غالب ہے کہ اِس کی آگ بڑی تیزی کے ساتھ بہت سے گھروں کو جلا کر خاکستر کر دے گی، کیوں کہ انسانی سطح پر اِس مسئلے کو صرف یہ کہہ کر ضمیر کو میٹھی نیند نہیں سُلایا جا سکتا۔ ورنہ یہ حریص بھیڑیے کمزور و بے بس شکار نگلتے ہی جائیں گے اور جنگل کے قانون میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔

ہمارا معاشرہ بیمار سے بیمار تر ہوتا جا رہا ہے، جس کی بنیادی وجہ عورت و مرد کے بنیادی حقوق و فرائض میں عدم توازن ہے، اِس کا خاتمہ کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔ خلفشار کے اِس دَور میں خاتمے کے لیے ماں اور باپ کو بھی باشعور کردار ادا کرنا پڑے گا۔ مشترکہ خاندانی نظام کی قباحتوں پر قابو پانے اور اِس کے مثبت کی بجائے منفی اثرات سے بچنے کے لیے مناسب اقدامات کرنا پڑیں گے، اِس حوالے سے معاشرے میں اسلامی عائلی قوانین کو فوقیت دینا پڑے گی، جس کے مطابق سُسرال کی اجارہ داری اور مظالم کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، مستقبل میں خوش گوار خانگی زندگی کی بنیاد اِس اصول پر ممکن ہو سکے گی کہ مشترکہ نظام کے خواہاں ایک دوسرے کی خود مختاری اور معاملات و اُمور میں دخیل نہ ہوں گے۔ برابر و مساوی حقوق کی فراہمی اور بے جا مداخلت کے خاتمے ہی سے مشترکہ خاندانی نظام کی استواری ممکن ہو سکے گی، کیوں کہ سُسرال اور شوہر کے خلاف گھریلو عورت کی بغاوت کو روکنا ناممکن ہو جائے گا، مستقبل میں اِس اضافی دھونس کا خاتمہ یقیناً شخصی آزادی اور باہمی رواداری کے فروغ کا سبب بن سکے گا۔ تعلیم کے میدان میں ''باعثِ ننگ و عار'' سمجھی جانے والی عورت آج زندگی کے ہر میدان میں مردوں کو مات دے رہی ہے۔ مستقبل میں یقیناً اِن کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ مردوں کو مجہولیت کا راستہ ترک کرتے ہوئے، محض عورت کو سیکس سمبل سمجھنے کے تصور اور رویے میں تبدیلی پیدا کر کے اپنا مثبت کردار ادا کرنا پڑے گا۔

سیف الدین بوہرہ کے خیال میں سرکاری سطح پر تعلیم پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے:

''فیوڈل معاشرے میں تو عورت کیا مرد کا بھی تعلیم یافتہ ہونا پورے نظام کے لیے خطرہ بن سکتا ہے، اِس لیے بہتر یہی ہے کہ لڑکیوں کو جاہل اور بے زبان رکھا جائے، تا کہ وہ سرمایہ داروں کے احکامات بے چون چرا بجالاتی رہے اور زور زیادتی پر سر تسلیم خم کر کے پنچائیت اور جرگہ کا بول بالا رکھے۔ طاقتور مزید طاقت حاصل کرتا رہے، یہ اُسی وقت ممکن ہے، جب تعلیم کے نام پر آنے والے بجٹ اوطاق کی تعمیر اور کتاب کے نام پر جہالت کی اشاعت ہو۔''[۶]

فہمیدہ ریاض کے خیال میں ایک بڑا ادیب عورت کے معاشرے میں کردار، مرد و عورت کے تعلقات کی پیچیدگیوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتا ہے، اِن کے ہاں عورت تمام مصائب و محاسن سمیت موجود ہوتی ہے، جب کہ ایسے ادیبوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، جو عورت کو صرف جسم کی حد تک محدود رکھتے ہیں، اُن کے نزدیک عورت محض شے ہے۔ عورت کی جانب بعض بڑے اہم ادیبوں کی نگاہوں میں بھی صرف تاریکی سمائی ہے:

''اسی مردانہ 'بایولوجیکل ازم' اور عورت کے وجود کی محض حیوانی توجیہ کو بعض فرمانبردار (دراصل بے حد عدم تحفظ کا شکار) خواتین ادیبوں نے بھی جزوِ ایمان بنالیا ہے، وہ اِس چالاکی کو نہیں سمجھ پاتیں کہ اُن کو بعض اعلیٰ خصوصیات تک محدود کر کے اُن کی مکمل انسانیت چھینی جارہی ہے۔''[۷]

ادب کے ذریعے ہی ہم یہ سوچ پروان چڑھا سکتے ہیں کہ بیوی صرف جسمانی ضرورت کی شے نہیں اور نہ ہی کمتر، کم فہم اور نادان ہے۔ محض بچہ پیدا کرنے کی مشین نہیں، بلکہ زندگی کی حقیقی ساتھی اور مونس و غم خوار ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بھی انسان ہے۔ جذبات و احساسات اور سوچ و فکر رکھتی ہے۔ گھر بھر کی ذمہ داری، بچوں کی تربیت اور پرورش صرف اس کا فرض نہیں، بلکہ جس طرح اولاد کی پیدائش میں مرد و عورت لازم و ملزوم ہیں، اسی طرح اُن کی تربیت اور تعلیم کو پروان چڑھانے اور گھریلو اُمور اور معاملات میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ دونوں کے حقوق و فرائض یکساں ہیں۔ جتنا یہ رشتہ مضبوط گہرا اور مبنی بر اخلاص ہوگا اور اولاد کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں دونوں فریق، جس حد تک معاون ہوں گے، ایک ایسی نسل یقیناً پروان چڑھے گی، جو سماج میں انقلاب لانے کا سبب بنے گی۔ تمام استحصالی سوچ اور روایات کی بیخ کنی کر کے نئی راہیں نکالے گی اور مثبت سوچ و فکر صحت مند معاشرے کی تشکیل کا باعث بنے گی۔ ادا جعفری کے بقول:

میرا خیال ہے کہ اس سمت میں پیش رفت خود عورتیں ہی کریں گی۔ عورتیں جو ادب تخلیق کریں گی، اُن میں مکمل عورت، یعنی اپنی تمام انسانی خوبیوں اور خامیوں سمیت نظر آسکتی ہے، جس طرح کہ ادب عالیہ میں 'انسان' مرد ہی ہوتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ واقعی اچھا ادب ہو، صرف پروپیگنڈہ نہ ہو۔ گو شروعات میں کچھ غلطیاں بھی ہوں گی۔[۸]

پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کے افراد کا جہاد بالقلم اور جہاد بالزبان یہی ہے کہ فحاشی کی جنگ کے خلاف سینہ سپر ہونا ہو گا۔ مردوں کو ان کی غیرت وحمیت اور اس کی ذمہ داری فرائض کی طرف مائل کریں اور عورتوں کو اپنی عزت ووقار، شخصی انا اور عصمت کی حفاظت اور اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہی وشعور دلائیں، ورنہ جس تیزی کے ساتھ گلوبل ولیج کی آڑ میں مخربِ اخلاق غیر انسانی پُر تشدد ذہنیتوں کی آبیاری کی جا رہی ہے، اُسے کنٹرول کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اِس حوالے سے فہمیدہ ریاض کا کہنا ہے:

> ''کتنی طویل مدت سے عورتوں کے اپنے جسم اور اپنی بایولوجی کے لیے مقتدر ادیبوں کے یہ لغو اور بے معنی جملے پڑھے ہیں۔ کتنے برسوں سے ایک دبا ہوا اور کچلا ہوا غصہ ان کے سینوں میں کھولتا رہا ہے۔ مبارک ہے وہ دن اور وہ ساعت جب صدیوں سے ریاضت کا شکار یہ مخلوق اور لب کشائی کر رہی ہے۔ آج دانش ور عورت خوفزدہ نہیں، وہ پُر اعتماد ہے اور چند نہایت نامور ادیبوں کی تحریروں کو خود اپنے ہاتھ میں آئینہ کی طرح اُٹھا کر دُنیا کو دِکھا رہی ہے اور ان تمام مقامات پر سرخ نشانات خود اپنے ہاتھ سے لگا رہی ہے، جہاں مرد ادیب اپنی انسانی اقدار کا مضحکہ اُڑاتے نظر آتے ہیں۔'' ۹

یہ بھی طے شدہ حقیقت کہ خانگی زندگی میں بے زبان گھریلو عورت کی جگہ باشعور اور تعلیم یافتہ عورت لے رہی ہے۔ مستقبل میں مرد کا مقابلہ کمزور وکمتر اور اِس کی دستِ نگر استحصال شدہ عورت کی بجائے اپنے حقوق آشنا اور فہم وادراک کی حامل اور معاشی طور پر مستحکم عورت سے ہوگا اور اِس لیے مرد کو عورت پر بے جا دھونس اور تشدد کے رویے میں تبدیلی لانا ناگزیر ہو جائے گا۔ بصورتِ دیگر گھریلو انتشار اور شرحِ طلاق میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ عورت کے اعتماد کی مضبوطی کے ساتھ مردوں کے رویے میں مثبت تبدیلی عائلی زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہو جائے گی۔ اِس کی بنیادی وجہ عورتوں میں شرح خواندگی میں اضافے کے علاوہ معاشی استحکام ہوگا، سماجی وشخصی سطح پر استحصال کی شکار گھریلو عورت ظلم وجبر کے زندان کے خلاف آمادۂ بغاوت ہو جائے گی۔ یہ انقلاب ایک ایسا طوفان ہوگا، جو مرد کی حاکمیت کے بتوں کو توڑ دے گا۔ ادب کے منصب داروں کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ وہ متعصبانہ اور معاندانہ رویے کی بجائے ایک متوازن روش اپنائیں۔

خانگی تشدد کی مختلف صورتوں کے خلاف عورت میں شعور وآگہی ایک طرف حقوق کی بازیافت کے لیے خواتین کو آمادۂ عمل کر رہی ہے، تو دوسری طرف گھریلو عورت بھی بے جا دھونس، گالی گلوچ، مار پیٹ، متشددانہ اور ظالمانہ رویوں اور عزتِ نفس کے مجروح ہونے پر انتقامی رویہ اختیار کر رہی ہے اور موجودہ گھریلو عورت مرد کی آوارگی کا جواب آوارگی ہی میں دے گی۔ مرد ناجائز تعلقات، معاشقے، غیر عورتوں سے دوستانے اپنا حق متصور کرتا رہا ہے، جسے سہنا اور برداشت کرنا گھریلو عورت کے فرائض میں شمار کیا جاتا ہے، اِن کے مظالم کا شدید ردِعمل بھی بغاوت کی صورت میں نمودار ہوگا۔ موبائل فونز اور انٹرنیٹ نے جہاں مرد کی عیاشی کا سامان کیا ہے وہیں عورت کے لیے بھی قدرے آسان ہو جائے گا کہ وہ اِن کے ٹیکنالوجی

کے منفی استعمال سے بھرپور فائدہ اُٹھائے۔ غیر مردوں، عورتوں کی فیس بک، پیغامات، تصاویر، گفتگو سہل ترین عیاشی بن گئے ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی گھر کی چار دیواری میں غیر مردوں کی رسائی آسان تر ہونے سے جنسی ہوس عام ہو جائے گی۔ خانگی زندگی کے استحکام کی دوہری ذمہ داری کا، جو بوجھ اَب تک عورت اپنے کندھوں پر اُٹھاتی آئی تھی، اَب اسے بوجھ کو اُتار دینے پر آمادگی سے خانگی نظام کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ موجودہ دَور میں عورت، عورت کے لیے شعوری طور پر جبر واستحصال کی علامت بن رہی ہے، تاہم عورتوں کا ایسا گروہ بھی ہے، جو اِس آزادی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اخلاقی قدروں کی پائمالی اور خاندانی نظام کو توڑنے کا سبب بنتا ہے۔ اِس لیے عورتوں کو نہ تو خود کو اخلاقی سطح پر اتنا ارزاں ہونا چاہیے کہ وہ آزادی کے نام پر بے راہ روی اختیار کر کے گھروں کی تباہی کا باعث بنیں اور نہ مردوں کو اپنا تقدس اور وقار کھونا چاہیے، اِس حوالے سے کشور ناہید کے خیال میں مرد و عورت کی اخلاقی گراوٹ بہت بڑے اخلاقی زوال کا سبب ہے:

> ''ایسی بیٹیاں اور عورتیں بھی دیکھی ہیں، جو خود مردوں کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ بے شمار ایسی عورتیں ہیں کہ جن کے مرد باہر گئے ہوئے ہیں اور وہ اپنی تنہائی کو دوسرے مردوں کے ساتھ بانٹتی ہیں۔ مرد کے ساتھ ذہنی یا جسمانی تعلق کم کم ہے تو کوئی اور دوسرا تلاش کر لیا، مگر مرد بھی بڑے استاد ہو گئے ہیں، وہ دن گئے جب مرد، عورت کے ناز نخرے، غصے، سیر سپاٹے کراتے تھے۔ اَب تو وہ کھاتی پیتی عورت تلاش کرتے ہیں، جس کے گھر جا سکیں، کھا پی سکیں۔ وقت اور موقع ہو تو اُس کا استعمال بھی ہو۔ واپس، صاف ستھرے گھر کو سدھاریں۔ بس یہی موضوعات ہیں، جو میری نظموں میں تم کو بھی نظر آتے، بلکہ تم نے یہ سب کچھ کہیں بھی اور پڑھیں بھی۔''[۱۰]

اِس لیے خانگی قوانین کے اجرا کا ہونا ضروری ہے۔ گھریلو تشدد کا قانون بھی ہراساں کیے جانے کے قانون کی طرح حکومتی سطح پر لاگو ہونا چاہیے۔ جہاد بالقلم اور جہاد بالزبان اِس سلسلے میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ادب کو محض جذبات کی برانگیختگی کی بجائے نسلوں کے تحفظ کا بھی امین ہونا چاہیے۔ آج کی نوجوان نسل کے سماجی بغاوت پر آمادہ ہے، بہت سی نفسیاتی اُلجھنوں کی شکار ہے، اِن میں انتشار اور انارکی، آزاد منشی اور بے راہ روی کی بیخ کنی میاں بیوی کی رشتے کی مضبوطی اور پائیداری پر مبنی ہے، شادی شدہ جوڑوں میں اختلافات کی وجہ بیان کرتے ہوئے نازیہ بٹ لکھتی ہیں:

> ''مرد اکثر عورت کی شخصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اِس کے لیے کچھ نہیں کرتے ہیں، اگر وہ اِس کی خدمات کو اِس طرح فراموش کر دے گا، تب عورت کا رویہ اُس کی جانب انتہائی منفی ہو جائے گا۔ ایسا اکثر جوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے، پھر مرد کا عورت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ سرد پڑ جائے گا، وہ ایک سُست ترین انسان بن جائے گا۔''[۱۱]

خانگی و عائلی زندگی، سماجی استحکام کی بنیاد ہوتی ہے، اِس لیے ادیبوں، شعرا کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق

کریں، جو موجودہ نسل کے مسائل اور اُلجھنوں اور ذہنی تناؤ کے حل کی صورت اختیار کرتے ہوئے سامانِ راحت ثابت ہوگا، اگر ہمارے آج کے ادیب اور ادیباؤں نے اپنے فرائض ٹھیک طور پر انجام نہ دیے، بے سمت اور انتشار کی شکار نسل تباہیوں کے دھانوں پر جا پہنچے گی۔ ادب پاروں کو تعصب سے پاک ہونا پڑے گا یہ تخصیص بتانا پڑے گی۔اپنی حیثیت سماجی اقدار اور مرد وعورت کے بارے میں متوازن نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے ، اجتہادی ضابطۂ حیات اپنانا پڑے گا۔عورت کی سیاسی سماجی اور معاشی حالت کی پائیداری کے لیے قبائلی نیم قبائلی اور جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ کرنا پڑے گا۔عابد حسن منٹو کا مؤقف بھی یہی ہے:

''خواتین شعرا نے اِن رویوں ، رواجوں اور قوانین اور اِن سے پیدا ہونے والے بے ضرورت، بلکہ ظلم پر مبنی معاشرے کے خلاف آواز بھی اُٹھائی ہے اور سماج کو ایک مختلف سوچ اور نفسیات کی نئی جہتوں اور انسانی رشتوں کے نئے تناظر سے روشناس بھی کروایا ہے، وہ باتیں جو پہلے، عموماً مرد ہی کی نظر سے دیکھی اور اُس کی آواز میں سنی جاتی تھیں۔ اَب ایک دوسرے انداز میں دیکھی اور سنی جا رہی ہیں۔'' [۱۲]

عورت کے خلاف بڑھتے ہوئے سماجی استحصال کے پیشِ نظر عائلی قوانین پر نظرِ ثانی اور اِن کا اطلاق نہایت ضروری ہو جائے گا، تاکہ دھوکے کی شادی، نکاح، نکاحِ ثانی، جہیز، طلاق، بچوں کی تحویل، نان ونفقہ کے مسائل کے علاوہ خانگی تشدد کی مختلف صورتوں اور ہراساں کیے جانے، جائیداد سے محروم کیے جانے پر قانون سازی کر کے عمل درآمد کرنا پڑے گا، تاکہ اِن پر قابو پایا جا سکے اور سماج کے اس کچلے ہوئے کمزور طبقے کو جینے کا حق میسر آئے۔بقول بادشاہ منیر بخاری:

''آزادی کے بعد جو معاشرہ وجود میں آیا اور اُس میں عورت کو کن کن مختلف حالات سے گزرنا پڑا اور اُس کے مسائل میں بھی تبدیلی آئی۔آزادی اور حقوقِ نسواں کا مفہوم بدلا ہے۔اَب عورت نے بنیادی حقوق حاصل کر لیے ہیں، مگر اِن حقوق کو حاصل کر کے، جب وہ ترقی کی اگلی منزل کی طرف گامزن ہے، تو اُس کو بدلتے معاشرے اور بدلتے دَور میں دوسری نوعیت کے مسائل درپیش ہیں، مثلاً مردوں کے ساتھ کام کرنے کے مسائل، آزاد تعلیم یافتہ خود مختار عورت کے گھریلو مسائل، صدیوں سے عورت کے کمتر حیثیت کے تصور کی وجہ سے مرد اور عورت کا ٹکراؤ، اِس سلسلے میں مردوں کی نفسیاتی گتھیاں، جذباتی طور پر مردوں کا اِن کو بلیک میل کرنا۔آزادی کے نام پر اُن کا مختلف سطحوں پر استحصال اِن ہی مسئلوں کو ناولوں میں پیش کیا جا رہا ہے، جس سے عورت کے بارے میں مرد ناول نگاروں کے ہاں نئے تصورات بن رہے ہیں۔'' [۱۳]

یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تانیثیت کے ادب پر اثرات مثبت قدروں کے فروغ اور سماجی انقلاب کا باعث ہوں گے،

زاہدہ حنا تحریکِ حقوقِ نسواں کی اصل افادیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اِس تحریک کی بنیاد حقوق انسانی کے اِس تصور پر استوار ہے کہ تمام امتیازات کو ختم ہونا چاہیے اور عورت کو بطور انسان وہی حقوق حاصل ہونے چاہیں، جو ایک مرد کو حاصل ہیں۔ صنفی مساوات کی یہ تحریک ایک سیاسی اور نظریاتی تحریک ہے۔ اس میں عورت اور مرد انسانی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ شانہ بہ شانہ ایک ایسے سماج کی تشکیل کے لیے جدوجہد کریں گے، جو حقیقی معنوں میں امتیازات اور استحصال سے پاک اور جمہوری و منصفانہ ہوگا، اور اُسے بجاطور پر ایک سچا انسانی سماج کہا جا سکے گا، اِس جدوجہد کا آغاز اُٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں ہوا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اُس نے کئی بڑی مشکلات اور رکاوٹوں پر قابو پایا اور اکیسویں صدی میں یہ سفر امکانی طور پر زیادہ تیزی سے طے کیا جائے گا۔'' ۱۴؎

آج کی عورت اپنے بارے میں قائم کردہ فرسودہ تصور کے خلاف باغیانہ روش اختیار کر رہی ہے اور زندگی کے مسائل و مشکلات کے چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہیں۔ سکریتا پال کمار عورت کو زندگی کے نئے معیارات سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتی ہیں:

> ''اِس کا حل شاید یہی ہے کہ 'ذوجنسی اقدار' پیدا کی جائیں یعنی مرد و عورت کو الگ الگ متقابل خانوں میں بانٹنے کے بجائے اِن میں اتصال اور امتزاج پیدا کیا جائے۔ ایسا اتصال جس میں دونوں کی آزادی، خودمختاری برقرار ہو، اگر ایسا نہ ہوا، تو عورتوں میں ایک قسم کی رجعت پسندانہ ریاست ابھر کر سامنے آجائے گی۔'' ۱۵؎

اِسی طرح نام نہاد علما اور مولویوں، عورتوں کے قانونی اور آئینی حقوق کے حصول میں رُکاوٹ پیدا کرنے کی بجائے ساری سہولیات زندگی اور ملازمت کے مواقع کا حصول ممکن بنانا پڑے گا، اِس سلسلے میں باشعور علمائے کرام کو متوازی طریقے سے اپنی اقدار کی ترویج و اشاعت اور اسلام و مذہب اور سماجی روایات کے نام پر عورت کے خلاف ہونے والے ناروا سلوک اور ظالمانہ رویوں کی بیخ کنی کرنا پڑے گی۔ اساتذہ، والدین، سماجی حلقے و انسانی حقوق اور عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں، علمائے کرام، ادب اور ابلاغیات کو بھی مشترکہ کاوشیں کرنا پڑیں گی، تاکہ عورت کے خلاف ہونے والے مظالم کا خاتمہ کیا جا سکے۔

صنفی امتیازی سلوک کے خاتمے کے لیے ادب اور تعلیمی اداروں کے نصابات کے ذریعے مرد و عورت کے وقار و عزتِ نفس کا تحفظ اور جبری رویوں کی مذمت کرتے ہوئے ایسے چور راستوں کو بے نقاب کرنا ہوگا، جو اُنھیں سماجی، اخلاقی اور مذہبی سطح پر ذلیل و رسوا کرنے کا باعث بنتے ہیں، اِس ضمن میں مختلف مباحثوں، تقریری مقابلوں، مضمون نویسی، مشاعروں

اور کوئز پروگراموں اور دیگر ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے بھی لڑکے لڑکیوں کو ایک دوسرے کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کرنے کی تعلیم دی جاسکتی ہے، اِس طرح مستقبل کا ادب ایک ایسی شعوری کاوش بن جائے گا، جس سے امتیازی رویوں میں تبدیلی کے علاوہ حقوق و فرائض سے آگاہی پیدا ہوگی، خصوصاً عورت اِس ضمن میں اساسی کردار ادا کر سکے گی، کیوں کہ عورت کی بیداری صرف اُس کی ذات سے ہی وابستہ نہیں، بلکہ پوری نسل پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مورخین تاریخ نویس اور تذکرہ نگار مجبور ہو گئے ہیں کہ اب، جو تدوینی سرمایہ منظرِ عام پر آئے گا، اِس میں عورت کا ذکر نا گزیر ہو جائے گا۔ عورت کا تذکرہ جہاں آٹے میں نمک کے برابر تھا، اَب اپنا مقام پانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ماضی میں لکھا گیا ابتدائی گھریلو اور خانگی ادب، مستقبل میں تانیثی حقیقت نگاری کے ذریعے تانیثی طرزِ فکر کا عکاس بنے گا۔ تانیثی نظریات کے حامل افراد کے لیے سماجی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرنے کے علاوہ مسائل کے حل کی طرف قدم اُٹھانا ناگزیر ہو جائے گا۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آیا صنفی امتیازی سلوک اور استحصالی رویوں کے خاتمے پر حقوقِ نسواں کی تحریک اپنی افادیت کھو دے گی، یقیناً جب کوئی تحریک اپنے مقاصد پا لیتی ہے، تو اِس میں پہلے جیسا جوش و خروش نہیں رہتا، بلکہ رفتہ رفتہ کمی واقع ہونے لگتی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قوانینِ بقا کی طرح کوئی بھی تحریک یا رُجحان یکسر ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مستقبل میں مرد و عورت کے مابین کہتر و برتر، غاصبانہ رویوں کے برعکس دونوں کو یکساں حقوق کو تسلیم کرنے سے ہی ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے گی۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔امین احسن اصلاحی،اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام،لاہور:فاران فاؤنڈیشن،۱۹۹۶،ص۲۰۰
۲۔کشور ناہید،خواتین لکھنے والیوں کے توسط،استعارے کی تفہیم مشمولہ خواتین افسانہ نگار مرتبہ د،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۶،ص۸
۳زاہدہ حنا،اُردو ادب اور پدرسری معاشرہ مشمولہ عورت:زندگی کا زنداں،کراچی:شہزاد،س ن،ص۱۸۱۔۱۸۲
۴۔ابوالکلام آزاد،مسلمان عورت (مقدمہ)،لاہور:مکتبۂ جمالیات،۲۰۰۶
۵۔فہمیدہ ریاض،ردِ تشکیل آخر کیوں؟ آغازِ گفتگو مشمولہ ادب کی نسائی ردِ تشکیل،غلطی ہائے مضامین،کراچی:وعدہ کتاب گھر،۲۰۰۶،ص۹
۶۔سیف الدین بوہرہ،عورت تیری کہانی۔عورت تو کیا تھی،کیا ہے اور کیا بنے گی،لاہور:مکتبۂ اُردو ادب،۲۰۰۷،ص۱۱۰
۷۔فہمیدہ ریاض،ادب کی نسائی ردِ تشکیل،غلطی ہائے مضامین،ص۱۱
۸۔ایضاً،ص۱۳
۹۔ایضاً
۱۰۔کشور ناہید،بُری عورت کے خطوط،نازائیدہ بیٹی کے نام،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص۲۵
۱۱۔نازیہ بٹ،ع عورت م مرد مترجمہ،لاہور:نگارشات،۲۰۰۴،ص۲۲۷
۱۲۔شبنم شکیل،خالدہ حسین سلیم اختر،ڈاکٹر،خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی،مرتبہ،اسلام آباد:وزارتِ ترقی خواتین،۲۰۰۵،ص۲۵۱
۱۳۔ایضاً،ص۳۱۲
۱۴۔زاہدہ حنا،ماں سے باپ کی حکمرانی تک مشمولہ عورت:زندگی کا زنداں،ص۶۱
۱۵۔کشور ناہید،عورت۔زبانِ خلق سے زبانِ حال تک،مرتبہ،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۰،ص۲۴۷

محاکمہ

عورت اور اُس کی مختلف سماجی حیثیتوں کے حوالے سے بہت سے امتیازی رویے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ عورت و مرد کے مابین صنفی امتیازی سلوک میں موروثی، ثقافتی، سماجی، تمدنی، تاریخی اور نفسیاتی عوامل کارفرما ہیں۔ عورت کے بنیادی حقوق کے حصول کے لیے یورپ میں با قاعدہ ایک تحریکِ حقوقِ آزادیِ نسواں یا فیمینزم کی شکل اختیار کر لی، جس کے اثرات دیگر یورپی تحریکوں و رُجحانات کی طرح برصغیر کے ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ سوسن بی اینتھنی، ایلزبتھ کیڈی سٹانٹن کی رکھی گئی بنیاد کے تحت دُنیا کی تقریباً ہر عورت ووٹ یا حقِ رائے دہی استعمال کر رہی ہے، اسی طرح جنسی تشدد، جنسی طور پر ہراساں کیا جانا، ملازمت پیشہ خواتین کی اُجرت کا کم معاوضہ، خانگی تشدد، شادی، طلاق، پریگنینسی ایکٹ، فیملی ایکٹ وغیرہ کے حوالے سے لیڈی میری والسٹونیکرافٹ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۸۵۰ سے قبل شروع ہونے والی تحریکِ آزادیِ نسواں دُنیا کے گوشے گوشے تک پھیل چکی ہے۔ جنوبی ایشیا، خصوصاً پاکستان میں شادی بیاہ، جہیز، طلاق، خلع، نان و نفقہ، خانگی تشدد، جنسی تشدد اور ہراساں کیا جانا، جائے ملازمت کی مشکلات اور خانگی قوانین کا اجرا اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تانیثیت سے ہماری مُراد وہ خاص رُجحان ہے، جو تحریکِ حقوقِ نسواں کے منشور اور لائحہ عمل کا مرہونِ منت ہے اور تانیثی تنقید اس بات پر زور دیتی ہے کہ کسی بھی ادب پارے کو پرکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ متن کی نوعیت کیا ہے، اس میں کس قسم کی حقائق پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے، ان کے سماجی و نفسیاتی محرکات کیا ہیں؟ اگرچہ جمالیاتی تشکیل، متن میں خصوصی اہمیت کی حامل ہے، لیکن تانیثی تنقید میں اسے ثانوی حیثیت حاصل ہے اور اولیت ان رُجحانات کی ہوتی ہے، جو تانیثی تناظرات و نظریات پر پورا اُترتے ہیں۔

تاریخ اور مختلف ادیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو عورت سے منسوب بہت سے اوہام و اقوال حرفِ آخر متصور کیے جاتے ہیں، جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ عورت کا تذکرہ تاریخ میں طوائف، رقاصہ اور گانے والی کے بھی آتا ہے۔ یہودی مذہب میں بیٹوں کی بہ نسبت بیٹیوں کو وراثت کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا اور عورت کو تمام گناہوں کا سبب گردانتے ہوئے، باپ اپنی بیٹی کو بطور کنیز کسی کے ہاتھ بھی فروخت کر سکتا تھا۔ عورت پر مرد کی مکمل حاکمیت تھی۔ عیسائی مذہب میں عورت شر، خدا کی نافرمان، انسان کو بگاڑنے والی، انسانیت کی مجرم، جھوٹ کی بیٹی، دوزخ کی سیاہی، امن کی دشمن اور وحشی درندوں میں سب سے زیادہ خطرناک قرار دی گئی۔ اسلام دینِ فطرت ہے، اس نے عورت کے کھوئے ہوئے تشخص کو بحال کیا، دیگر ادیان کی بہ نسبت اسلام میں عورت کو بہ حیثیتِ انسان تسلیم کیا ہے اور مردوں اور عورتوں کے یکساں حقوق متعین کیے، اگر ایک مقام پر کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دی گئی ہے، تو دوسرے مقام پر اول الذکر کی برتری ثابت ہے۔ عورت جو قبل از اسلام معتوب و ملعون قرار دی گئی تھی، اس کی تکریم و توقیر میں اضافہ ہوا اور عورت بہ حیثیتِ ماں، بہن

بیوی اور بیٹی اس کے حقوق متعین کیے گئے۔ دُنیائے عرب میں اسلام آنے سے پہلے عورت کو بہت ہی حقیر سمجھا جاتا تھا اور جب لڑکی پیدا ہوتی تو اسے بالعموم زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے عورت کو برابری کا درجہ دیا، اس کے حقوق کا تعین ۱۴۰۰ سال پہلے ہی کر دیا گیا تھا، تاہم معاشرتی نظام میں توازن کے لیے بعض معاملات میں مرد کو عورت پر جو فضیلت دی گئی ہے، وہ نظامِ معاشرت میں توازن کے لیے ہے مثلاً نان ونفقہ کی دوہری ذمہ داری مرد پر ڈالے جانے کی وجہ سے وراثت میں اس کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہے۔ مرد کو گواہی کے معاملے میں بھی عورت پر فوقیت دی گئی ہے، اس لیے کہ ایک عورت بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے۔ عورت کو امامت کے درجے پر فائض نہیں کیا گیا۔ بہ حیثیتِ انسان عورت کو بھی خدا نے تمام اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا حق دیا ہے، لیکن بعض اُمور جن پر خدا نے قدغن لگا رکھی ہے، اس میں کوئی بہتری کا پہلو پوشیدہ ہے۔ عورت مرد کی طرح 'قطعی اور واجب الادا' حقوق وفرائض رکھتی ہیں۔ مردانہ حاکمیت والے معاشرے میں لڑکوں کو زیادہ فوقیت دی جاتی ہے، جب کہ لڑکیوں کو ہوش سنبھالتے ہی مختلف پابندیوں اور خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اُنھیں پسپائیت اور بے جا مفاہمت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے حق میں اچھا ہو، تاہم اسلام میں عورت ومرد کی وہ مساوات قابل قبول نہیں، جس میں دونوں کے حقوق اور فرائض کی ادائیگی میں بے اعتدالی، عدم توازن اور ناانصافی پائی جائے، یہی وجہ ہے کہ عورت اگر بچہ پیدا کرنے کی صعوبتوں سے گزرتی ہے، تو مرد کے کندھوں پر بھی اس فوقیت کی وجہ سے فرائض زیادہ رکھ دیے گئے ہیں۔

امریکہ ویورپ کا نعرہ ہے کہ حجاب عورت کے استحصال کا مؤجب ہے، جب کہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی ممالک میں عورتیں سب سے زیادہ استحصال کی شکار ہیں۔ حجاب نہ ہونے کی وجہ سے آبروریزی وعصمت دری کے واقعات کی شرح دُنیا کے تمام ممالک کی نسبت زیادہ ہے، کیونکہ مغربی تہذیب عورت کی جس آزادی کا دعویٰ کرتی ہے وہ درحقیقت اس کے استحصال کا بہت بڑا مؤجب ہے، اس کی عزت کو پامال کر کے شرف ومنزلت سے گرا دیا جاتا ہے اور اُسے داشتہ ومحبوبہ بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اس تہذیب میں عورت محض حصولِ لذت کی شے ہے۔ نام نہاد فن اور ثقافت کی آڑ میں عورت کی تحقیر کی جاتی ہے۔ کثرتِ زوج کو بھی مردوں نے اپنے لیے بہت بڑی مراعات سمجھا ہے اور اس کی آڑ میں کسی قسم کے استحصال کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ مختلف توجہات کی آڑ میں اپنے مفادات کو ہوا دیتے ہیں، اگرچہ کثیر الزوجگی انسانی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں ناگزیر تھی، جس کا مقصد کرۂ ارض پر زیادہ سے زیادہ انسانوں کا پھیلاؤ تھا۔ انسانی آبادی میں اضافے کے ساتھ مختلف معاشرے اور تہذیبیں جنم لینے لگیں۔ چار شادیوں کا نعرہ لگانے والے قرآنی متن کی درست تفہیم وتشریح سے قاصر ہیں اور اسے حکم کا درجہ سمجھتے ہوئے جگہ جگہ منہ ماریاں کرتے پھرتے ہیں، حالاں کہ مختلف ناگزیر حالات میں اجازت کی بات کی گئی ہے، نہ کہ حکم کی، لیکن اس کے ساتھ کڑی شرط عائد کی گئی ہے کہ انصاف ضروری ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تحقیق کے مطابق خدا نے آدم کے لیے ایک ہی بیوی پیدا کی ہے۔ یہ بات فطرت کے مطابق ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت مل کر اپنا گھر بنائیں۔۔۔ آخری عمر میں آپ ﷺ کی شادیوں کے پیچھے ہرگز کوئی جنسی جذبہ کارفرما نہیں، بلکہ اُمتِ مسلمہ کی تشکیل کے سلسلے میں یہ سب نکاح پروردگار کے براہِ راست حکم کے تحت کیے گئے۔ ایک مرد کے لیے ایک عورت ہی کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ آج کے کامیاب معاشروں کی کامیابی کے پسِ پردہ کارفرما عوامل میں ایک زوجگی بھی ہے۔ تحقیقات کے مطابق کچھ بہت چھوٹے قبائلی اور پسماندہ تمدنوں کو چھوڑ کر یک زوجگی آج کے انسان کا عالمگیر بندھن ہے۔

نفسیاتی وحیاتیاتی سطح پر کھا جائے تو ابتداً انسانی ذہین ایک صاف تختی 'خالی سلیٹ' کی مانند ہوتا ہے اس پر وہی کچھ لکھا جاتا ہے، جو ماحول اور افرادِ معاشرہ اس پر تحریر کر دیتے ہیں۔ یہ نقوش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو کر تا حیات قائم رہتے ہیں، ان میں تنوع اور ترفع تو پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن بدلا نہیں جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے باڑ کی تراش خراش سے بظاہر متوازن وخوبصورت تو دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی جڑوں میں عدم توجہی سے گھن لگ جائے تو یہ کبھی نہ کبھی اپنا رنگ دکھاتا ہے، اِسی طرح انسانی زندگی کے ابتدائی پانچ سال تمام عمر کے رویوں کی بنیاد ہیں۔ بچے کی اولین تربیت گاہ ماں کی آغوش اور باپ کی شخصیت بھی کلیدی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں بھی آیا ہے کہ باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس میں سب سے قیمتی جو چیز ہے وہ اچھی تعلیم وتربیت ہے، یعنی مالی منفعیت اور آسائش کے برعکس تربیت انسانی زندگی کی اساس ہے۔ اسی سے رویے جنم لیتے ہیں، سوچ وافکار عملی شکل اختیار کرتے ہیں، اگر یہ مثبت ہوں گے تو عمل بھی بہترین ہوگا۔ بصورتِ دیگر تباہی و بربادی کی جو مثالیں بکھری پڑی ہیں، ان میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ماں باپ کی عدم توجہی وہ عذاب ہے، جو لاشعوری طور پر یا غیر دانستہ طور پر دونوں اپنی اولاد کے گلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ خارگلونہ جینے کے ڈھنگ سکھاتے ہیں، جو ماں باپ بیٹے اور بیٹی میں امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں ان کی یہ جاگیردارانہ سوچ آئندہ آنے والی نسلوں کے ذہنوں میں بھی یہی زہر بھر دیتی ہے، جو مرد بہ حیثیتِ باپ اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ عورت ہی بچے کی پرورش کی ذمہ دار ہے، اس طرح گھریلو اُمور بھی اسی سے وابستہ ہیں، جب کہ باپ کوئی خاص کردار ادا نہیں کرتا۔ وہ بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ عورت و مرد کے حوالے سے مختلف تہذیبی وتمدنی اور تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ دُنیا میں مروجہ چاروں بڑے ادیان کے عمیق مطالعے کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت سے متعلقہ مفروضات کو ختم کیا جائے اور حقائق کی کسوٹی پر تمام مسائل کو پرکھتے ہوئے ان کا حل تلاش کیا جائے۔ تعلیم مرد وعورت کی زینت ہے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارا معاشرہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو پسند تو کر رہا ہے، لیکن درپردہ عملاً اُنھیں انتقام کا نشانہ بھی بنایا جا رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ملازمت پیشہ خواتین بہت سی سماجی ناہمواریوں اور مسائل کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو وہ مرد کی معاشی معاونت کے حصول کے لیے محنت کر رہی ہیں، تو دوسری طرف گھر، خاندان اور بچوں کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے برعکس مرد کی جفاکشی اور انتھک محنت کے خصائص کی جگہ سستی وکاہلی، آرام طلبی اور سہل انگاری نے لے لی ہے، حالاں کہ مرد کی وجہِ فوقیت معاش، بیوی بچوں کے حقوق کی پاسداری اور توجہ ومحبت ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ملازمت پیشہ خواتین کو یہی درپیش ہے کہ ان کی رقوم پر شوہر اور سسرال والے، والد و بھائی اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔ اس مکروہ سوچ نے عائلی زندگی پر گہری ضرب لگائی ہے۔

حالیہ دَور کے بیشتر خانگی مسائل کی بنیاد مرد کی عدم مطابقت کا رویہ ہے۔ عورت کو گھریلو مسائل، بچوں اور معاش کے جھمیلوں میں اُلجھا کر خود آزاد اور کھلنڈری اور بے فکری زندگی گزارنے پر ترجیح دی جا رہی ہے کہ اس چیلنج کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ عورت بااعتماد اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے، جب کہ مرد اپنی مردانگی کے جوہر سے عاری ہو رہے ہیں۔ کمانا اور بیوی بچوں کی ضرورت پوری کرنا، اپنے گھر اور معیارِ زندگی کو بلند کرنا مرد کا حُسن اور حقیقی فرائض ہیں، جن کی وجہ سے اسے عورت پر فوقیت دی گئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت و مرد آپس میں دوستانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے زندگی کے مسائل وخوشیوں کو بھرپور انداز میں باہم مشاورت سے حل کریں۔ اس سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی خوش گوار ہوگی، بلکہ وہ

لوگ جن کی نگرانی قدرتِ حق نے انھیں سونپی ہے، ان کی بہتر ذہنی و جسمانی نشوونما بھی بہتر انداز میں ہو سکے گی اور وہ ایک اچھے اور مہذب معاشرے کی بنیاد ڈالنے اور اسے مضبوط بنانے کا سبب بنیں گے۔

ہمارے معاشرے کو سب سے بڑا نقصان ادھوری صداقتوں نے پہنچایا ہے۔ خانگی و عائلی زندگی کی بربادی بھی اسی کا پیش خیمہ ہے۔ سچ نما جھوٹ نے اعتماد اور بھروسے کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہر بگاڑ کی اصل وجہ عورت کو گردانا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُسے ہوش سنبھالتے ہی بے جا دھونس اور سخت تربیتی اصولوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ میاں بیوی کے باہمی جھگڑوں اور بیشتر مسائل کا سبب، بلا مبالغہ ۹۸% ارد گرد کے لوگ اور گرد و پیش کا ماحول ہوتا ہے، کیوں کہ عموماً عورت و مرد سے متعلقہ افراد دونوں میں بدگمانیاں پیدا کرنا اور انھیں ہوا دینا اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ ہمارے سماج میں کہا جاتا ہے کہ لڑکی کی شادی ایک فرد کے ساتھ نہیں، بلکہ پورے خاندان کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ صرف شوہر کی بجائے پورے کنبے کی پابند ہوتی ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک اُسے ہر سانس پر اپنے جینے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام میں مرد کو بھی دوہری آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ عموماً وہ اپنے فرائض میں توازن و اعتدال قائم کرنے میں کام رہتا ہے، خصوصاً بیوی بچوں کی بہتر پرورش اور بہتر سہولتوں کی فراہمی میں اس کی شکست اسے نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ڈپریشن، ذہنی دباؤ، عدم دلچسپی اور بیزاری، بیوی بچوں سے جھگڑا، ڈانٹ ڈپٹ، مار کٹائی اس کی ناکامی کی دلیل ہوتی ہے۔ عورت کی طرح اگر مرد بھی غیر معمولی قوتِ برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کریں اور اپنی عائلی زندگی کو اہمیت دیں، تو یقیناً خانگی زندگی کے بہت سے مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

اگرچہ، مرد و عورت کائنات کی اساس ہیں، لیکن اول الذکر کے حصے میں پورے خاندان کی پزیرائی اور ستائش آتی ہے، جب کہ مؤخر الذکر کی پیدائش بذاتِ خود ایک سوگ بن جاتی ہے۔ اولاد کے معاملے میں بھی عورت سے ناانصافی برتی جاتی ہے۔ بیٹیوں کو جنم دینے والی ماں کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔ مرد نے اپنی مرضی کی اولاد کی خاطر عورت کو دباؤ میں رکھا ہوا ہے۔ عربوں کے دورِ جہالت میں لڑکی کو پیدا ہوتے ہی زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا، اس کے برعکس آج کل کے دَور میں الٹرا ساؤنڈ کی سہولت کی وجہ سے قبل از پیدائش بہت سی لڑکیوں کو موت کے منہ میں بھیج دیا جاتا ہے، حالاں کہ حیاتیاتی اصول کے تحت لڑکی یا لڑکے کی پیدائش مرد کے 'Y' کروموسومز کی مرہونِ منت ہے۔ عورتوں کی اس سے عدم واقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بیٹیوں کی پیدائش کی اصل قصوروار اُنھیں قرار دیا جاتا ہے اور اس کی پاداش میں طلاق دینے کے علاوہ تمام عمر کے لیے عدم تحفظ کا احساس، ذہنی کرب اور کمتر کیے جانے کے احساس میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

والدین کی محبت، توجہ اور عدم تحفظ کے احساس کے باعث بہت سے بچے غلط ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے لیے کسی اور گھر کی ہو جانے کی مسلسل گردان، لڑکیوں کو ہر مسئلے کا حل شادی سمجھ لینے پر مجبور کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے شادی سے بہت سی توقعات و خواہشات اور ارماں وابستہ ہو جاتے ہیں، جو پورے نہ ہونے کی صورت میں ڈپریشن، اینگزائیٹی اور ناآسودگی کو جنم دیتے ہیں، حتیٰ کہ بچیوں کی سیر و تفریح، بننے سنورنے، کھانے پینے کو بھی شادی سے مشروط کر دیا جاتا ہے۔ ماں باپ کی عدم مطابقت اور باپ کے جابرانہ رویے کے نتیجے میں عدم تحفظ کے شکار بچوں کو محبت کے چند بول انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیتے ہیں، جس کے باعث گھروں سے بھاگنا، چوری چھپے کی شادیاں اور انجامِ کار قتل کیا جانا، قحبہ خانوں کی زینت اور جسم فروشی پر مجبور کیا جانا، لڑکیوں کا مقدر بن جاتا ہے، جب کہ لڑکے عموماً جنسی بے راہ روی، سگریٹ

نوشی، منشیات میں مبتلا ہو کر جرائم پیشہ بن جاتے ہیں، جس طرح بعض مرد عیاش طبع ہوتے ہیں، کچھ عورتیں بھی جنسی ہوس پرستی کا شکار ہوتی ہیں اور فردِ واحد پر اکتفا کرنے کے بجائے غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہوتی ہیں اور اس کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ خود کو مجبور و بے کس اور مصیبت زدہ ثابت کر کے غیر مردوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایسی عورتوں کے دروازے خاوندوں کی عدم موجودگی اور بعض قبیح صورتوں میں باپ، بھائیوں اور خاوندوں کی موجودگی میں بھی غیر مردوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ ایسے تعلقات بنانے والی عورتیں اور مرد عموماً تعلقات کی ابتدا مقدس رشتوں کی آڑ میں کرتے ہیں۔ بہن، بھائی، کزن، بھابی جیسے قابلِ احترام رشتوں کی آڑ میں شیطانیت کو کیموفلاج کیا جاتا ہے۔ ایسی عورتوں کو انیس ناگی نے ''ناراض عورتوں'' کا نام دیا ہے۔

موجودہ دَور کا سب سے بڑا چیلنج برائی کو برائی نہ سمجھنا درحقیقت اچھائی اور برائی کے فرق کو مٹانا ہے۔ منفی اندازِ فکر نے لڑکے لڑکیوں کی دوستی کی بے جا حمایت کی ہے۔ ایک لڑکی اب موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے کئی کئی لڑکوں اور مردوں کو اپنے جال میں پھنسائے ہوئے ہے۔ جواباً ٹیلی کارڈز، نیٹ کارڈ کی وصولی، ان کی ذہنی عیاشی کی ابتدا کے علاوہ بہت سی اخلاقی کج رویوں کا شاخسانہ بنتی ہے۔ یوں اس دَور کی سب سے بڑی آزمائش رحمت کا زحمت بن جانا ہے۔ اچھائی و برائی کا مٹتا ہوا فرق، مثبت روایات سے دُوری اور مذہبی بیزاری بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے، کیوں کہ اس قسم کے رویہ جات ہمارے سماجی اور خانگی نظام کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ لہٰذا، ضرورت اس امر کی ہے عورت و مرد کمتر و برتر کی مباحث میں اُلجھنے کے بجائے اپنے متعین کردہ حقوق و فرائض، جس میں نہ کوئی غالب ہے اور نہ کوئی مغلوب، نہ کوئی حاکم ہے اور نہ کوئی محکوم، کیوں کہ فرائض سے روگردانی، دونوں کی حیثیتوں کو کمتر کرنے کے مترادف ہے، جہاں تک ابلاغِ عامہ کا تعلق ہے پُرتشدد، فحش فلموں نے انٹرنیٹ اور ویب سائٹس نے سادہ ذہنوں کو پراگندہ کر دیا ہے۔ فلرٹ، دوستیاں، وقتی محبتیں جیسے نفسیاتی ہتھکنڈے جنسی بے راہ روی اور حرام کاری کے پھیلاؤ کا مؤجب بن رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی مثبت پالیسیوں کی مدد سے عورت کے حوالے سے قائم کردہ مفروضات، اوہام اور آرکی ٹائپس میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے، اس لیے عورت کو بھی اپنے حقوق کا احساس اور ذات کے تشخص اور شعور ہونا ضروری ہے۔ عورت بہ حیثیتِ انسان اپنی پہچان و مقام چاہتی ہے۔ اِسے محض مرد دشمنی کا نام دے کر تمسخر کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔ مخالفتوں کے باوجود خواتین اپنے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کر رہی ہیں، اگرچہ اسے بہت سے القابات، طعنہ و تشنیع اور طنز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن آگاہی کا یہ سفر جاری و ساری ہے، اِس کے برعکس ایسے مرد بھی ہیں، جو فن و ثقافت، خصوصاً آزادی کے نام نہاد نعرے کی آڑ میں ہوس کا آلۂ کار بن رہے ہیں۔ مغرب زدہ مرد و عورت تہذیب و اخلاق اور سماج کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے علاوہ تحریکِ حقوقِ نسواں کے لیے زہرِ ہلاہل ثابت ہو رہے ہیں اور اس رُجحان کی غلط تشریح و توضیح کا سبب بن رہے ہیں۔ ہر باشعور مرد و عورت بخوبی آگاہ ہے کہ ان دونوں کے حقوق و فرائض کی حدیں کہاں ہیں اور اُن کا حصول کیوں کر ممکن ہے۔ پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کے افراد کا جہاد بالقلم اور جہاد بالزبان یہی ہے کہ فحاشی کی ذرائع ابلاغ کی جنگ کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔ مردوں کو ان کی غیرت و حمیت اور اس کی ذمہ داری فرائض کی طرف مائل کریں اور عورتوں کو اپنی عزت و وقار، شخصی انا، عصمت کی حفاظت اور اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہی و شعور دلائیں، ورنہ جس تیزی کے ساتھ گلوبل ویلج کی آڑ میں مخربِ اخلاق غیر انسانی پُرتشدد ذہنیتوں کی آبیاری کی جا رہی ہے، جسے کنٹرول کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ عورت کے استحصال کی داستان تاحال ختم

نہیں ہوئی۔ خواتین کے خلاف متشددانہ رویے کے خلاف عملی اقدامات کرنے چاہیے، خصوصاً نوجوان طبقے میں شعور و بیداری پیدا کرنے کے لیے ادب اور میڈیا کی مدد لینے کے ساتھ ساتھ ہر سطح پر ان کی سوچ وافکار میں عورت کے لیے انتقامی واستحصالی رویہ کی بجائے دوستانہ اور انسانیت کا رویہ اپنانے کی ضرورت ہے، اس طرح خانگی تشدد کے قوانین کی اشد ضرورت ہے۔ مردوں میں حاکمیت کو کم کرنے کے لیے انتظامی ڈھانچے میں تبدیلی ضروری ہے۔ حال ہی میں خواتین نے ذہنی دباؤ اور خانگی تشدد کا قانون پیش کیا۔ اس ناہمواری پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دونوں فریقین ایک دوسرے کو انسان سمجھتے ہوئے دوستی ومفاہمت کا راستہ ہموار کریں۔

ازمنہ قدیم سے عورت شاعری کا محور ومرکز رہی ہے، محض حسن و جمال کا مرقع سمجھے جانے کی وجہ سے دل لگی اور جنسی تسکین کا سامان متصور کی گئی۔ شمالی ہند خصوصاً دکنی شاعری میں امیر خسرو کے ہاں شادی بیاہ کے گیت، لوک گیت، کہہ مکرنیاں، لوریاں وغیرہ کی روایت ملتی ہے، لکھنؤ میں ریختی کو رواج ہوا، مثنویات میں عورت کی جذباتی واحساساتی کیفیات بیان کی جانے لگیں، مثلاً مثنوی ''سحرالبیان'' میں مافوق الفطرت عناصر کی بجائے زندہ گوشت پوست کے کردار پیش کیے گئے، ہجویات میں شعرانے معاصرانہ چشمک کے نتیجے میں دشنام طرازی پر اُترتے ہوئے ایک دوسرے کے گھر کی عورتوں کو خوب لتاڑا ہے۔ غالب جیسے آفاقی شاعر نے بیوی کو ''پاؤں کی بیڑی'' اور بچوں کو ''ہاتھ کی ہتھکڑیاں'' قرار دیا ہے۔ تذکروں میں شاعروں کی بہ نسبت شاعرات کا ذکر آتے میں نمک کے برابر ہے، سماجی دباؤ کی وجہ سے اُس دَور کی اکثر شاعرات نے مردانہ تخلص استعمال کیا، اِسی طرح بہت سی تاریخِ ادب کی کُتب میں بھی شاعرات کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

جن ابتدائی شاعرات میں تانیثی رنگ نمایاں ہے، اُنھوں نے لڑکیوں کی تعلیم، خانگی زندگی میں عدم تحفظ کا احساس، ناآسودگی، آزادیٔ فکر کے فقدان، ذہنی کشمکش اور اُلجھنوں کے علاوہ والدین اور سُسرال کی زندگی میں تضاد اور سُسرال کے استحصالی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ مزید براں، معاشرہ عائلی زندگی کا تمام بوجھ عورت کے کندھوں پر ڈالتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں تانیثی شعور کے حوالے سے اہم ترین نام ادا جعفری کا ہے، اُنھوں نے مرد کی حاکمیت کے معاشرے میں عورتوں کے حقوق کے حصول کے لیے آواز بلند کی، ان کے ہاں دُنیا کو پرکھنے کی خواہش جبر، بے چینی اور اضطراب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ادا جعفری کے ہاں عورت محض وقتی بہلاوے اور جسم کا نام نہیں، بلکہ وہ جذبات واحساسات، شعور وادراک رکھتی ہے، وہ عورت کے حقوق کی بازیافت کی متلاشی ہیں، اُن کے ہاں عورت خود آگاہ بھی ہے اور روایت شکن بھی۔ زہرا نگار نسائی شعور کی نمائندہ ہیں۔ سماجی روایات کے ردِعمل کی آواز ہیں، اُنھوں نے مذہبی سماجی اور جذباتی لحاظ سے عورت کے استحصال، مرد کی حاکمیت اور جبری رویے کے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا ہے۔ فہمیدہ ریاض تانیثی شعور کی پہلی توانا آواز ہے، جس نے مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں مروج عورت دشمنی، رسومات اور روایات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور مرد کے معاشرے میں مظلومیت کا رونا رونے کی بجائے احتجاج کے ذریعے خود کو منوایا ہے، نظم ''مقابلۂ حسن'' میں بڑے واشگاف لفظوں میں عورت کے جسم کے بارے میں مرد کے توہین آمیز رویے کے خلاف ردِعمل ملتا ہے۔ پروین فنا سید کے جدیدِ عورت کے مسائل اور اُلجھنوں کو موضوع بنایا ہے۔ کشور ناہید تانیثیت کی علمبردار شاعرہ ہیں، سماجی جبر، ناہمواری، احساسِ ذات، جنسی تشدد، نفسیاتی اور ذہنی دباؤ، قانون سازوں پر طنز، ان کے کلام کے اہم موضوعات ہیں۔ شبنم شکیل نے عورت کی نفسیات کی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سماج کے غیر مساویانہ رویے

اور محرومی کو موضوع بنایا ہے۔ یاسمین حمید کے ہاں نئے آدرشوں کی تلاش معاشرے کے جور و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ احساسِ ذات اہم موضوعات ہیں۔ پروین شاکر نے ''ماہِ تمام'' میں نسائی جذبات کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ خواہشِ وصل، لذتِ وصل، مکمل سپردگی کی خواہش، لمس کی ضرورت، بے وفائی کا دُکھ، فرسودہ رسوم و رواج کی بھینٹ چڑھانے والوں کا محاسبہ، فیکٹریوں، کارخانوں اور گھروں میں کام کرنے والی خواتین کے مسائل ان کے اہم موضوعات ہیں۔ نوشی گیلانی، شاہین مفتی، منصورہ احمد، ثمینہ راجا، نیلما سرور، شاہدہ حسن، سارا شگفتہ، شہناز مزمل، نسرین انجم بھٹی، فاخرہ بتول اور حمیدہ شاہین تانیثی شعور کی وہ توانا آوازیں ہیں، جنھوں نے محض عورت کی مظلومیت کا پرچار نہیں کیا، بلکہ مضبوط قوتِ ارادی سے استحصالی قوتوں اور کٹھن حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی دیا ہے۔ مرد کے حاکمانہ رویے کی مذمت، جنسی تشدد و ہراساں کیا جانا، سماجی ناہمواری کے خلاف بغاوت اور ملازمت پیشہ خواتین کی زندگی کے مسائل بھی اُجاگر کیے ہیں۔ رابعہ نہاں، شبہ طراز، رخشندہ نوید، نجمہ یاسمین یوسف، بسمل صابری، عذرا عباس، یاسمین گل نے مرد و عورت کی نفسیات کی عکاسی کے علاوہ عورت کی زندگی کی تلخیوں کو بھی بیان کیا ہے، دیگر شاعرات ناہید قاسمی، ریحانہ قمر، فرخ زہرا گیلانی، عائشہ مسعود ملک، سیدہ عظمیٰ گیلانی، عذرا خان، شاہدہ لطیف، بلقیس سیفی، غزالہ خاکوانی، درِ انجم عارف زاہدہ صدیقی، سیدہ فرحت صفدر، گلنار آفرین کے ہاں بھی تانیثی رُجحان نئے امکانات لیے ہوئے ہے۔

جب ہم اُردو شعرا کے ہاں تانیثی شعور کا جائزہ لیتے ہیں، تو اِس کی ابتدائی جھلکیاں الطاف حسین حالی کے ہاں ملتی ہیں، اُنھوں نے عورتوں کے مسائل خصوصاً ستی کی رسم کی مذمت کی۔ تعلیم کو آگہی کا بڑا ذریعہ قرار دیتے ہوئے عورت کی سماجی حیثیت بلند کرنے کی کوشش کی۔ اکبر الہ آبادی اور چکبست لکھنوی اِسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے خیال میں عورت کی تعلیم و ترقی اور خود انحصاری بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہے، اُنھوں نے ''نشتریاتِ اکبر'' کے زیرِ عنوان انگریزی تہذیب کی مادہ پرستی اور اِس کے مضر اثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال آزادیِ نسواں کے تو قائل ہے، لیکن ایسی آزادی، جو عورت کے فرائض میں حائل ہو اُس کی نفی کرتے ہیں۔ شوق قدوائی، فانی بدایونی، عظمت اللہ خان، حفیظ جالندھی، پنڈت نرائن ملا، اختر شیرانی، اسرار الحق مجاز، اختر الایمان، نے بھی عورت کی مادر پدر آزادی کے مذمت کی، لیکن وہ عورت پر مرد کی بے جا حاکمیت اور مظالم کے مخالف تھے اور سماجی رسومات، جو عورت کے استحصال کا باعث ہیں، شدید مذمت کرتے ہیں۔ احسان دانش، صوفی تبسم، مجید امجد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور خاطر غزنوی نے عائلی زندگی میں ناآسودگی، عورت اور مرد کے مابین امتیازی رویوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے، محنت کش و مزدور عورت سے روا استحصال، اِسی طرح سماجی چیرہ دستیاں اور مظالم و افلاس، جو عورت کو اپنا جسم بیچنے پر مجبور کر دیتے ہیں، اُن کے خلاف شدید ردِعمل ملتا ہے۔ اعظم خورشید، اختر حسین جعفری، نعیم صدیقی، شورش کاشمیری، ساحر لدھیانوی، ماحر القادری، جگن ناتھ آزاد، وزیر آغا، احمد فراز، ساقی فاروقی، سلیم احمد، شہزاد احمد، جاوید شاہین، انیس ناگی، مظہر الاسلام، شمیم جاوید اور اظہر غوری وغیرہ کے ہاں عورت سے ناروا سلوک، اُسے انسان کی بجائے شے متصور کرنا، جسم فروشی پر مجبور کرنا، خانگی و جنسی تشدد، ہراساں کرنا، بے جوڑ اور نارضامندی کی شادیاں، جیسے عورت کے خلاف برسرِ پیکار عناصر کی مذمت ملتی ہے۔

جہاں تک اُردو ناول میں تانیثی رُجحان کے اثرات کا تعلق ہے، تو ڈپٹی نذیر احمد، رشیدۃ النسا، محمدی بیگم، عبدالحلیم شرر رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، سرفراز حسین دہلوی، سجاد حسین انجم کے ہاں عورتوں کے خلاف سماجی جبر اور جور و ستم کی

نشاندہی ملتی ہے۔ مرزا محمد سعید، علی عباس حسینی، سر سید احمد پاشا، منشی سجاد حسین، عظیم بیگ چغتائی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد کرشن چندر، رامانند ساگر اور عصمت چغتائی کے ہاں عورتوں پر بے جا قسم کی سماجی اور مذہبی بندشوں کے خلاف بغاوت پائی جاتی ہے۔ فضل کریم فضلی، احسن فاروقی، خدیجہ مستور، انتظار حسین، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، رضیہ فصیح احمد، جیلانی بانو، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، رضیہ بٹ، اے۔ آر خاتون، زبیدہ خاتون، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، انیس ناگی، ڈاکٹر انور سجاد کے ہاں تانیثی شعور کی پختگی نمایاں ہے، اِن کے ہاں مرد و عورت ایک دوسرے کی تکمیل ہیں، مرد کی طرح عورت بھی انا و خودداری رکھتی ہے، اُس کے احساسِ ذات کو کچلنے کے نتیجے میں بغاوت کا اُبھرنا قدرتی امر ہے۔ عورت کے خلاف رسوم و رواج، توہم پرستی سماجی آلودگیاں خاص موضوع ہیں۔ مرد کے جذباتی عدم استحکام کے باعث عورت، بالآخر نا آسودگی، محرومی اور ذہنی تشنج کا شکار ہو جاتی ہے، جب کہ گھریلو ادب کے حوالے سے اے۔ آر خاتون، رضیہ بٹ، زبیدہ خاتون، حمیدہ جبیں، سلمیٰ کنول بشریٰ رحمٰن، سلمیٰ اعوان، وحیدہ نسیم، عائشہ جمال، صالحہ عابد حسین، عمیرہ وغیرہ کے نام خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔

افسانے سے مُراد وہ مختصر تحریر ہے، جو کم سے کم وقت میں پڑھی جائے، جب کہ ایڈگرایلن پو نے آدھ گھنٹے سے لے کر ایک گھنٹے تک پڑھی جانے والی تحریر کو افسانے کا نام دیا ہے۔ افسانہ زمان و مکاں کی قیود کے ساتھ کسی ایک کردار یا افرادِ معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ جدید اُردو افسانے پر چیخوف، موپاساں کے علاوہ کارل مارکس اور میکسم گورکی کے اثرات نمایاں ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم، پریم چند نے انسان کی لاشعوری و نفسیاتی کیفیات کے علاوہ مرد کی حاکمیت، دھونس اور خود غرضانہ طبعیت کو نا آسودگی کا بہت بڑا سبب قرار دیا ہے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، قرۃ العین حیدر، علی عباس حسینی حیات اللہ انصاری، دیوندر ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، خدیجہ مستور ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں عورت کے استحصال کی مختلف شکلیں، بے وقعتی کا احساس، سماجی و ازدواجی زندگی کی ریاکاری خاص موضوع ہیں۔ راجند سنگھ بیدی، حسن عسکری، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی نے عورت کو زندہ انسان متصور کرنے پر زور دیا ہے اور اِس کی عزتِ نفس کو مجروح کیے جانے کی نفی کی ہے، کیوں کہ اِس کے ردِ عمل میں پیدا ہونے والی باغیانہ روش پورے معاشرے کی بنیاد ہلا دیتی ہیں، اِس کے علاوہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں کی جنسی بھوک، خانگی تشدد و استحصال اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انتظار حسین، الطاف فاطمہ، غلام عباس، جیلانی بانو، احمد ندیم قاسمی قدرت اللہ شہاب، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، مسعود مفتی، ڈاکٹر سلیم اختر، نیلم احمد بشیر، بشریٰ اعجاز، فرخندہ لودھی، داؤد رہبر یونس جاوید، عطیہ سید، محمد یحییٰ خان، محمد سعید شیخ، نیر اقبال علوی، منعم مجید، غزالہ خاکوانی، اُم عمارہ وغیرہ نے عورت کے نفسیاتی مسائل اور اُلجھنوں کے علاوہ فلرٹیشن، جسمانی معاشقوں، گھناؤنے کاروبار، مفادات، کج روی، معاشرتی تضادات میں عورت کی مظلومیت، دقیانوسی رسمیوں، عورتوں، بچوں اور ہسپتالوں میں مریضوں اور اُن کی عیادت کرنے والی خواتین پر جنسی تشدد اور سنگسار کیے جانے جیسے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اُردو ادب میں فنِ ڈراما نگاری کا جائزہ لیں۔ ''اِندر سبھا'' کا پورا اسٹیج مرد کی حاکمیت ظہار کرتا ہے، جو عورت کو محض دل لگی اور جنسی تسکین کا سامان سمجھتا ہے اور عورت بھی توجہ کی بھیک مانگتی دکھائی دیتی ہے۔ آغا حشر کے خیال میں عورت، جب ماں بنتی ہے، تو بیوی اور ماں ہر دو حیثیتوں میں اِس کا احترام دُگنا ہو جاتا ہے۔ سُسرال کی زندگی کے مسائل اور ڈھائے جانے والے مظالم عورت کا مقدر قرار دیے جاتے ہیں۔ سید امتیاز علی تاج کا ڈرامہ ''انارکلی'' اُردو ڈراما میں ایک اہم موڑ

ثابت ہوا۔ انارکلی حاکم اور کنیز کی روایتی کشمکش کی داستان ہے، اِس کے نسوانی کردار، جہاں حسد ورقابت کا شکار ہیں وہیں اِن میں خیر وشر کی داخلی کشمکش بھی پائی جاتی ہے۔ فلک پیا کے ڈرامے ''ماں بیٹی'' میں عورت کے روایتی سماجی رویے کی عکاسی کی ہے کہ عورت سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہی شوہر اور سُسرال کے مزاجوں کو سمجھنے اور مفاہمانہ طرزِ عمل اختیار کیے رکھنے، اِس کے جینے کی تمام اُمیدیں انھی سے وابستہ ہیں وہ چاہیں تو اِسے خوشیاں دیں اور چاہیں تو نعمتوں سے محروم کر دیں۔ عصمت چغتائی کا ڈراما ''سانپ'' میں شک و وہم کے اژدہوں کا ذکر ہے، جو عدم اعتمادی کے باعث ہنستی بستی زندگی کو ڈس لیتے ہیں۔ ڈراما ''فسادی'' میں عصمت نے بچپن کی شادیوں کو موضوع بنایا ہے اور ''ڈھیٹ'' میں عورت کے بارے میں سماجی روایات، خیالات ونظریات کو نشانۂ تنقید بنایا ہے عورت کو مرد ہی کی طرح انسان سمجھنا چاہیے، اِن کے خیال میں صنفی امتیازی رویے سماج کے چہرے پر بدنما داغ بن جاتے ہیں۔ ''شیطان'' میں ناجائز تعلقات ومعاشقوں کی موضوع بنایا ہے۔ مرد عورتوں کو محبت میں ٹھکرانا اپنا حق سمجھتا ہے، اس کے برعکس، جب عورت اِسے ٹھکراتی ہے، تو بے بسی کا رونا روتا ہے۔ ڈراما ''دھانی بانکیں'' میں قیامِ پاکستان کے دوران ہونے والی لوٹ مار اور غارتگری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ڈراموں میں عورتوں کی نفسیاتی اُلجھنوں، سُسرال اور بیوگی کے مسائل کے علاوہ معاشرے کے بے حسی، کمتر و کمزور گردانتا، رشتوں کی کدورتیں اور ناچاقیاں شامل ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے ڈراما ''اکیلی'' میں منٹو کا مؤقف ہے کہ عورت کی قدر نہ کرنے والے مردوں کے ہوتے ہوئے بھی عورت خود کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرتی ہے، اسی طرح ''ہتک'' میں منٹو نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت خواہ کسی ملک، خطے یا کسی قماش کی کیوں نہ ہو، جب اِس کی عزتِ نفس کی نفی کی جائے، تو وہ شدید ترین نفرت پر اُتر آتی ہے اور تذلیل کرنے والے کا منہ نوچنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ میرزا ادیب کے ڈرامے ''ساحل'' میں مرد کے حاکمانہ رویے کے خلاف ردِعمل ظاہر کیا گیا ہے کہ مرد قوام بننے کے زعم میں عورت کو اپنا دستِ نگر اور ماتحت سمجھنے لگتا ہے، اِس کا حد سے بڑھا ہوا احساسِ تفاخر عورت پر ظلم ڈھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ رضیہ فصیح احمد، مستنصر حسین تارڑ، مسعود مفتی کے ڈراموں میں گھروں میں کام کرنے والی ملازماؤں اور نوکرانیوں کی زندگی کے مسائل، غریب وافلاس سے محروم بچے، ماں سے دوری کے شخصیت پر اثرات، ناجائز تعلقات اور معاشقوں کے بھیانک نتائج، شوہر کی عدم توجہی، بیوی میں سرد مہری اور بیگانگی، مسلسل جور وستم سے دبی ہوئی عورت، سُسرال کے مظالم اور سماجی بے انصافی، بے وفائی کا دُکھ، عورت کو اپنا دستِ نگر سمجھنا، بیوی ملکیتِ کل، بانجھ پن کے طعنے اور ردِعمل کے طور پر عورت کے باغیانہ رویوں کی عکاسی ملتی ہے۔ یونس جاوید، امجد اسلام امجد کے ہاں عورت کے ساتھ روا استبدادی رویے، گھریلو تشدد، زمینداروں، چوہدریوں، وڈیروں کی عیاشیاں، لڑکیوں کا اغوا، سرِ بازار برہنہ گھسیٹا جانا، اپنوں کا ناروا سلوک اور ہتک آمیز جملے وغیرہ کی عکاسی ملتی ہے۔

جہاں تک خودنوشت آپ بیتی اور سوانحِ حیات کے متعلق بیشتر مصنفین کے ہاں تانیثیت با قاعدہ ایک موضوع کے طور پر سامنے تو نہیں موجود ہے، بلکہ اِس کی جھلکیاں کہیں شعوری، تو نہیں لاشعوری سطح پر موجود ہیں، مثلاً ہجرت وفسادات کی بھٹی سے گزرنے والی نسل کے نمائندہ مصنفین کے ہاں فسادات ایک اہم ترین موضوع کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ انسانی زندگی کی ارزانی، ہندو سکھوں کی بربریت اور لوٹ مار کے مناظر، جن آنکھوں نے بھی دیکھا تا حیات لہو روتی ہیں۔ لوگ ہجرت کے تکلیف دہ مراحل، مناظر تا حیات، اُن کی زندگی کا یہ بہت بڑا المیہ بن گئے، اِن کی عکاسی انتظار حسین، اے حمید

رشیدہ عیاں نے کی ہے۔ سر رضا علی کی آپ بیتی ''اعمال نامہ'' میں مسلمان گھرانوں میں پردے کی پابندی اور سُسرال کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم اور بیوگی کے مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ''شہاب نامہ'' میں قدرت اللہ شہاب نے ہجرت کے دوران خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے دلدوز واقعات کے علاوہ بیوروکریٹس، سیاست دان، قانون کے رکھوالوں اور جعلی پیروں وگدی نشینوں کی سیاہ کاریوں کو موضوع بنایا ہے، کشور ناہید کے تانیثی نظریات نظم ونثر دونوں میں نمایاں ہیں۔ ''لیلیٰ خالد'' میں اُنھوں نے اُن فلسطینی خواتین کی خدمات کو سراہا ہے، اسرائیلیوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کی ماں بہنوں، بیٹیوں کی عصمت دری کے واقعات، خواتین کو بسوں، راستوں اور جائے ملازمت پر جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کی مثالیں دی گئی ہیں، اِسی طرح ''بُری عورت کی کتھا'' میں کشور ناہید نے والدین کی عدم توجہی کی وجہ سے لڑکیوں میں پیدا ہونے والی نفسیاتی اُلجھنوں اور جنسی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے لڑکیوں کی تعلیم، جہیز شادی سُسرال کے مظالم اور بیوگی کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ امرتا پریتم کی ''ایک تھی سارا'' میں مرد کی حاکمیت والے معاشرے میں عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، ماں کی حیثیت سے عورت کا استحصال، خانگی وجسمانی تشدد، غربت اور افلاس کے علاوہ شوہر کے غیر عورتوں سے دوستانے اور معاشقے غیر عورتوں پر دولت اور پیسوں کو لٹانے والوں کے گھروں کے سرد چولہے اور عورت کے مسلسل استحصال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بغاوت کو موضوع بنایا ہے۔ ساقی فاروقی نے ''آپ بیتی، پاپ بیتی'' میں لکھاری خواتین کے مسائل، مرد ادیبوں اور شعرا کی طرف ہراساں کیا جانا اور انتقامی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ تہمینہ کھر نے بیوو کریٹس، زمینداروں، وڈیروں کے حاکمانہ رویوں کی تصویر کشی، شوہر کی اذیت پسندی، مار پیٹ اور مظالم، عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنا، اذیت پسندی اور جسمانی وذہنی اذیتوں کی عکاسی کی ہے۔

تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی عورتیں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے چلائے جانے والی تحریکِ حقوقِ نسواں کے تحت ایسا ادب تخلیق کیا گیا، جو خواتین کے ذہنی وجسمانی اور اخلاقی تربیت کے لیے سود مند ثابت ہو۔ مزید برآں، خواتین پر ڈھائے جانے والے مظالم اور استبدادی رویوں کی عکاسی کی گئی۔ تحریکِ علی گڑھ کے دَور میں لکھی جانے والی تحریوں میں، بچپن کی شادی کی روک تھام، تعلیم کی اہمیت وافادیت، ستی کے خلاف مہم جیسے اُمور پر توجہ دی گئی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی ''بہشتی زیور'' میں خانگی وعائلی زندگی کے قواعد وضوابط اسلام کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں، اگرچہ مولانا کا قلم بار ہا حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، تاہم اِس کتاب کی عوامی پزیرائی کا یہ عالم تھا کہ لوگ بچیوں کو جہیز میں تحفۃً دیتے تھے۔ ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' میں لکھنے والی خواتین نے دُنیا میں رونما ہونے والی سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے زیرِ اثر نئی طرز کے گھریلو اور خانگی ادب کی تشکیل کی، سعیدہ قمرالدین سیدہ کشور آرا، مسزائے شہید، عزیز فاطمہ، جمیلہ بیگم، رافعہ خاتون، فاطمہ بیگم، نے لڑکیوں کی تربیت، ملازمت پیشہ عورتوں کے مسائل، گھریلو عورت کے مصائب ومشکلات کو موضوع بنا کر خانگی ادب کو تقویت دی۔ علامہ راشد الخیری نے ستی کی رسم کی مذمت، بیوہ کے بال کٹوا دینا اور کم کھانے کو دینا، دیوروں، جیٹھوں اور نندوں کے جھگڑوں، لڑکی کی پیدائش کو بوجھ سمجھنا، جب کہ بیٹے کو طاقتور اور قوت کا مظہر قرار دینے کے خلاف آواز بلند کی اور صنفی امتیاز برتنے کی نفی کرتے ہوئے مسلمان بچیوں کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ شادی شدہ عورت کی زندگی کے مسائل مرد کی حاکمانہ طبیعت کی وجہ سے عورت کو ذہنی دباؤ اور تناؤ کا شکار کر کے کٹھ پتلی بنائے رکھنے کی مذمت کرتے ہوئے، بچے کی پیدائش اس کی نشوونما اور تربیت کے علاوہ گھریلو اُمور کی تمام تر

ذمہ داری اُس کے کندھوں پر ڈالنے کے باوجود زندگی کو محض طعنہ بنا دینے کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے خیال میں مہر عورت کا بنیادی حق ہے اور مرد عموماً اس حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ بُرے شوہروں سے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا جاتا، غیرت کے نام پر اور جائیداد کے حصول کے لیے باپ، بھائیوں کے ہاتھوں قتل کے جانے کی تصدیق کی ہے۔ محمودہ رضویہ، امت الوحی، غلام رسول، سلطانہ غاضیہ، بیگم نصیر الدین، بیگم عظیم النسا، بیگم عزیز الحسن، رفعت حسن کے ہاں شوہر کی عدم توجہی، خستہ حالی، بنیادی انسانی حقوق کی سلبی، نارضا مندی کی شادی، ساس بہو کی ازلی رقابت، نفسیاتی دباؤ اور عورت کے تقدس واحترام کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد لکھے گئے تانیثی تنقید و تحقیق کے حامل مضامین اُردو ادب کے نثری سرمائے میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔ ''عورت معرضِ کشمکش میں'' میں نعیم صدیقی عورت کی آزادی کے قائل ہیں، اُن کے خیال میں مغربی تہذیب کی متعصبانہ تعلیم اسلام کی اعتقادی اور اخلاقی بنیادوں کو لرزا دیتی ہے۔ وہ معصوم ذہنوں میں پروپیگنڈے کے زیرِ اثر اسلام کے خلاف زہر بھرنے والوں کی اِس کیفیت کو ذہنی اغوا کا نام دیتے ہیں۔ شفقت تنویر مرزا اور مسعود اشعر کے ترجمہ مضمون ''عورت کے خلاف جنگ ہر محاذ پر'' میں مرد وعورت کی نفسیات بیان کرنے کے علاوہ مختلف ممالک میں مختلف طبقوں کی عورتوں میں تحریکِ نسواں کے حوالے سے اور کارکن عورتوں نے مزدور تحریکوں کے ذریعے آواز بلند کی۔ فاشسٹ حکومتوں نے خواتین کے مسائل کا حل یہ تلاش کیا کہ عورتوں پر مردوں کا کنٹرول مزید سخت کر دیا۔ مردوں کی بالا دستی والی ٹریڈ یونینوں میں اِس مسئلے پر مفاہمت ہی کا نتیجہ ہے کہ ہر کہیں عورتوں کو باعزت معاوضہ پر کام دینے سے انکار کیا گیا کہ مرد پہلے ہی سے عورت کے کفیل ہوتے ہیں۔ ''غلاموں کی آزادی'' میں ڈاکٹر نوال السوداوی نے عورت کی حیثیت معاشرتی نظاموں اور مختلف مذاہب یہودیت، عسائیت، بدھ ازم اور اسلام میں جانچنے کی کوشش کی ہے اور اِس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ عبرانی یا یہودی گھرانے میں باپ کی حکمرانی ہوتی تھی۔ رومیوں کے خیال میں مرد کی سربراہی کی طرح باپ لامحدود اختیارات کا مالک تھا، اِسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ بولی لگانے والے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ بچے کی زندگی اور موت بھی اِس کی مرضی کے تابع تھی، اگر وہ چاہتا، تو بچے کو ختم کر سکتا تھا، یہودی گھرانے میں عورت بھی جائیداد کی طرح ورثے میں ملنے والی شے تھی، اسرائیلوں میں مردوں کو لامحدود جنسی آزادی حاصل تھی، اِس کے برعکس عورت کو بڑی پابندیوں کا سامنا تھا، اگر مطلقہ عورت دوسرے مرد سے شادی کرے اور یہ دوسرا خاوند اسے طلاق دے یا مر جائے اور وہ بیوہ ہو جائے تو اُس کے پہلے خاوند کو اِس سے شادی کی اجازت نہ تھی، کیوں کہ اِس عورت کو اِس کے لیے ناپاک قرار دے دیا جاتا تھا۔ ''لوریاں، لوک رسوم اور سماجی تفریق'' میں ڈاکٹر صبیحہ حفیظ نے لڑکے اور لڑکیوں کی پرورش کے طریقوں میں روا رکھے جانے والے فرق پاکستان کے مختلف علاقوں کے سماجی ڈھانچوں کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ لڑکے لڑکی کی تربیت میں سماجی امتیاز کی ابتدا پیدائش سے ہی شروع ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوریاں اور لوک گیتوں میں یہ احساس نمایاں ہوتا ہے، اِسی طرح پنجاب کے مختلف علاقوں میں شادی کی رُسوم، وٹہ سٹہ، بچپن کی شادی، دشمنی ختم کرنے کی خاطر خون بہا کے طور پر بچیوں کا رشتہ دینا، ولور، جہیز جیسی قبیح رسوم، کا دور دورہ ہے، جس کا خمیازہ ہمیشہ لڑکی بھگتتی ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ حفیظ نے ایسے عائلی قوانین کی ضرورت پر زور دیا ہے، جو لڑکیوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کریں۔ ''نسوانیات اور نفسیات'' میں حمیر ہاشمی نے اُن عوامل کی نشاندہی کی ہے، جن کی بنیاد پر مرد وعورت میں فطری تضاد پایا جاتا ہے، یہ امتیاز جسمانی، نفسیاتی سطح پر ہے۔

حمیر ہاشمی نے انسانی نفسیات پر فرائڈ اور یونگ کے نظریات کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ''منٹو کی عورتیں'' میں ڈاکٹر روش ندیم نے سماجی سیاسی تبدیلیوں سے مادر سری، پدر سری اور صنفی مساوات کے حامل معاشروں سے افراد کے مختلف جنسی رویے سامنے آئے ہیں، اُنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں سماجی و سیاسی تناظر میں عورت کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخی پس منظر میں مادر سری نظام، پدر سری نظام، زرعی انقلاب، اشتراکی نظام اور مختلف تہذیبوں میں عورت کے بارے میں قائم کردہ نظریات اور اُس کی حیثیت کا تعین بھی کیا ہے۔ مضمون ''ماں سے باپ کی حکمرانی تک'' میں زاہدہ حنا نے ارتقائے انسانی کی بات کی ہے۔ عورت کو بطور انسان مرد کے مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں، تاکہ ایک نئے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی جاسکے۔ ''پاکستانی عورت: آزمائش کی نصف صدی'' میں زاہدہ حنا نے لرزا دینے والے تاریخی حقائق کی تصویر کشی کی ہے۔ تحریک پاکستان کی کارکن خواتین خصوصاً پشاور کی پٹھان عورتوں نے جلوس نکالا اور ''پاکستان براڈ کاسٹنگ اسٹیشن'' کے نام سے خفیہ ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے قبل بنگالی لڑکیوں نے استبداد کے خلاف آواز بلند کی، تو اُن پر لاٹھی چارج اور گولیاں برسائی گئیں۔ پہلا مترا اسٹوڈنٹ لیڈر کو انتہائی بھیانک جسمانی اجنسی تشدد کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۹۷۱ میں ۸ مہینے اور ۱۶ دن کے دوران ڈھائی لاکھ مسلمان پاکستانی عورتیں جن کو ضمنی قومیت بنگالی تھی، بے حُرمت کی گئیں، اِن میں سے لگ بھگ تیس ہزار عورتوں نے خودکشی کی، ہزاروں سوزاک اور آتشک کا شکار ہوئیں، ہزاروں ذہنی توازن کھو بیٹھیں۔ بین الاقوامی طبی اداروں کے ڈاکٹروں نے ایک لاکھ ستر ہزار اسقاط کرائے۔ اِس بدلے میں وحشیانہ جنسی تشدد کی شکار ہونے والی پاکستانی عورتوں کی تعداد الگ ہے۔ ''عورت۔ زبانِ خلق سے زبانِ حال تک'' میں کشور ناہید نے عورت اور مرد کے مابین تضادات کو بے نقاب کیا ہے، بیشتر مضامین کا لب لباب اُس ناآسودگی کی وجوہات کا متلاشی ہے، جن کی وجہ سے یہ اکیسویں صدی کے لوگوں کی زندگی کا نوحہ بنتی چلی جارہی ہیں۔ مرد نے درحقیقت عورت کو کمزور اور کمتر ثابت کرنے کے لیے اِس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پسِ پشت ڈالا ہے اور اِس کا اقتدار اور حیثیت کو کم کرنے کی خاطر دائرۂ زندگی اِس کے لیے محدود کردیا، یہی وجہ ہے کہ عورت کے جسم پر قبضہ جمانے اور اُسے قابو میں رکھنے کے لیے دُنیا کا ہر مرد سرگرمِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ ''فیمنزم اور ہم'' میں فاطمہ حسن پیش لفظ کے مطابق فیمنزم کی تحریک عموماً تعصب کی شکار ہے، اِس کے خلاف مرد دشمنی اور گھریلو بنیادوں کو مسمار کرنے کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، اکثر عورتیں پدر سری نظام کی حمایتی نظر آتی ہیں اور فیمنزم کی مخالف بھی ہیں۔ فیمنزم کے حوالے سے دو مختلف تعریفوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک یہ اِس احساس کا نام ہے، جو معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور استحصال کے خلاف برسرِ پیکار ہو اور اُسے بدلنے کی کوشش کرے۔ دوسرا یہ کہ فیمنزم پدر سری نظامِ معاشرے کے خلاف ردِ عمل کا نام ہے اور نظریاتی سطح پر عورت کی محنت، جنسیت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت خاندان اور کام کرنے کی جگہ پر غرض پورے معاشرے میں استحصال کیا جاتا ہے اور اُسے کچلا جاتا ہے اور وہ تمام مرد اور عورتیں، جو اِس حالت کو بدلنا چاہتے ہیں وہ فیمنسٹ ہیں۔ ''فیمنزم اور ہم'' میں فہمیدہ ریاض کا کہنا ہے کہ عورت انسان کا نسوانی روپ ہے اور اِس میں عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کرنے اور اِس کا احترام کرنے کے خلاف جو مزاحمت نظر آرہی ہے، وہ تاریخ کے کسی ایسے پیچیدہ راستے سے گزر رہی ہے، جو ماضی کی بہتر اقدار کی نفی کرتا ہے۔ آج یہ اہم ضرورت ہے کہ ہم اپنے مسلم تشخص کو درست سیاق و سباق میں دیکھ سکیں اور اِن چراغوں کو نہ بجھنے دیں، جو ہمارے اجداس اور بزرگوں نے روشن کیے تھے۔ ''ع عورت م مرد'' مترجمہ نازیہ بٹ میں خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے

ایسے نقطے بیان کیے ہیں، جو مرد و عورت کی نفسیاتی اُلجھنوں کا حل بیان کرتے ہیں۔ روز مرہ زندگی چھوٹی اور معمولی معمولی باتیں ہیں، جن پر توجہ دے کر آپس کی تلخیوں اور رنجشوں سے بچا جا سکتا ہے، اِس کا لبِ لباب یہی ہے کہ میاں بیوی دونوں میں سے ہر ایک توجہ اور محبت کا متقاضی ہوتا ہے۔ عدم توجہی دونوں کے لیے سوہانِ روح ہوتی ہے۔ ''خواتین لکھنے والیوں کے توسط، استعارے کی تفہیم'' میں کشور ناہید نے بیرون مُلک غیر ملکی عورتوں سے معاشقے لڑانے اور شادی کرنے والوں پر تنقید کی ہے کہ کس طرح آزاد معاشرے کے مضمرات اُنھیں اُس وقت محسوس ہوتے ہیں، جب اپنی بیٹیاں جوان ہوتی ہیں، اُنھیں بیاہنے کے لیے پاکستان لے آتے ہیں، خود اُن کے بوڑھے ماں باپ تمام عمر انتظار میں آنکھیں بچھائے منتظر رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ عورت سے برتے جانے والے غیر مساویانہ سلوک کی بنیاد اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان خود۔ چند استثنائی مثالوں سے قطعِ نظر عورت تاریخ کے پردے سے غائب نظر آتی ہے، اگر کہیں اس کی جھلک دکھائی بھی دیتی ہے تو محض تفریحِ طبع کے لیے اس کی حسن و خوبصورتی سے اوراق مزیّن کیے جاتے ہیں۔ ستائش و زیبائش کا یہ راگ اپنی تاثیر اس لیے کھو رہا ہے، کیوں کہ عملی زندگی میں عورت ، مرد کے حاکمانہ نظام والے معاشرے اور غالبیت کا شکار رہی ہے۔ کمتر ناقص العقل کمزور و ناتواں گردانی جانے والی یہ مخلوق، مرد کی غاصبانہ ذہنیت کی بنا پر مغلوبیت اور استحصال کا شکار ہے اور بہ حیثیتِ انسان بہت سے حقوق سے محروم ہے۔ نفسیاتی طور پر عورت سے خائف مرد، اپنی عقل و شعور، بہادری و جفاکشی اور مضبوطی و صلابت کی دھاک بٹھانے کے لیے شعوری و لاشعوری طور پر عورت مخالف نظریات کی تشہیر کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک طویل مدت تک علم و حکمت، سائنس و ٹیکنالوجی، علم و سیاست، ہر میدان میں عورت کو پسِ پُشت ڈالا گیا اور اُنھیں اپنا میدان خاص قرار دیا ہے، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ عورتیں زندگی کے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتی نظر آتی ہیں اور علم، سیاست، قانون، طب، فوج، سفارت، ادب و فنونِ لطیفہ اور سماجی بہبود اور حکمرانی میں اپنا نام پیدا کر رہی ہیں۔ یہ وہ خواتین ہیں جو انقلابی قدم اُٹھاتی ہیں اور مرد کی غالبیت و حاکمانہ سماج سے ٹکراتی ہیں۔ خانگی زندگی میں عورت کی صلاحیتوں سے خائف مرد لاشعوری طور اُس کی ترفعِ ذات کو کچلتا ہے۔ پاکستانی کلچر میں شادی ایک خاتون کی زندگی میں اہم ترین موڑ ہوتی ہے، جس میں وہ اور اس کا شوہر زندگی کی نئی راہ پر گامزن ہوتے ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے کی سماجی معاونت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ عدم توجہی سے دونوں جسمانی طور پر کم زور، جذباتی سطح پر احساسِ محرومی، سماجی طور پر تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ بھرپور توجہ اور تعاون سے دونوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ سماجی و خانگی سطح پر عورتیں مجبورِ محض ہیں، اُنھیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا قطعاً کوئی حق نہیں دیا جاتا، اُس کی زندگی کے اہم ترین فیصلوں میں اُسے شامل نہیں کیا جاتا اور اپنی مرضی مسلط کر دی جاتی ہے۔ شوہر عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے، ساس، دیوروں اور نندوں کے عناد اور رنجشوں کا سامنا کرتی ہے۔ مہر اور جہیز، نان و نفقہ، خلع و طلاق کے مسائل زندگی کی تلخیوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ لہٰذا، عورت کے وقار، عزتِ نفس اور ذات کے ترفع کے استحکام کے لیے تانیثیت باقاعدہ ایک پلیٹ فارم کے طور پر کام کر سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

کتابیات

اُردو کتب:

۱۔آصف نواز چودھری، محمد طارق چودھری، واجدہ تبسم کے بہترین افسانے مرتبہ، چودھری اکیڈمی، لاہور، س ن

۲۔ // // // // // ، عصمت چغتائی کے سوافسانے مرتبہ، چودھری اکیڈمی، لاہور، س ن

۳۔آغا سہیل، ڈاکٹر، اگن کنڈلی، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱

۴۔آغا حشر کاشمیری، نیک پروین، آئینۂ ادب، لاہور، ۱۹۸۳

۵۔آمنہ مفتی، جرأتِ رندانہ، قوسین، لاہور، ۲۰۰۷

۶۔ابصار عبدالعلی، شہ رگ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸

۷۔ابنِ حنیف، دُنیا کا قدیم ترین ادب، جلد اول، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۸

۸۔ // // ، دُنیا کا قدیم ترین ادب، جلد دوم، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۸

۹۔ابوالکلام آزاد، مولانا، مسلمان عورت، مکتبۂ جمال، لاہور، ۲۰۰۶

۱۰۔احسان دانش، فصلِ سلاسل، دانش آباد، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۰

۱۱۔احسن فاروقی، ڈاکٹر، سنگم، م ن، س ن

۱۲۔ // // ، ڈاکٹر، شامِ اودھ، مطبع ندارد، س ن

۱۳۔احمد بشیر، بھٹکے گا دِل، فیروز سنز پرائیویٹ لمٹیڈ، لاہور، ۲۰۰۳

۱۴۔احمد فراز، میرے خواب ریزہ ریزہ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸

۱۵۔ // // ، شہرِ سخن آراستہ ہے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴

۱۶۔احمد ندیم قاسمی، افسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳

۱۷۔ // // ، ندیم کی غزلیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۱۸۔ // // ، ندیم کی نظمیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۱۹۔اختر حسین جعفری، جہاں دریا اُترتا ہے، فردا پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳

۲۰۔اختر حسین رائے پوری، گردِ راہ، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۲۰۰۰

۲۱۔اختر شمار، یہ آغازِ محبت ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۴

۲۲۔ // // ، دھیان، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، طبع اول، ۲۰۰۵

۲۳۔ادا جعفری، موسم موسم (کلیات)، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۲

۲۴۔ارشاد احمد پنجابی، پنجاب کی عورت، حیات وثقافت، الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، لاہور، ۱۹۷۶

۲۵۔ارشد رازی (مترجم)، عورت، مرد اور تاریخ، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۶

۲۶۔اسرار الحق مجاز، کلیاتِ مجاز، مکتبہ اُردو ادب، لاہور، س ن

۲۷۔اسلم، ایم، حقیقتیں اور حکائتیں، مکتبۂ نظامی، لاہور،۱۹۷۲
۲۸۔// // ،ناظمہ کی آپ بیتی، پنجاب بک ڈپو، لاہور،۱۹۴۹
۲۹۔// // ،نیلماں، دارالبلاغ، لاہور،۱۹۶۲
۳۰۔اشرف علی تھانوی، تحفۂ زوجین، مکتبہ العلم، لاہور، س ن
۳۱۔اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۴
۳۲۔ // // ،حیرت کدہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳
۳۳۔ // // ،شاہلا کوٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۱
۳۴۔ // // ،کھیل تماشا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۱
۳۵۔ // // ،بند گلی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳
۳۶۔ // // ،ایک محبت سو ڈرامے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۰
۳۷۔اصغر ندیم سید، دریا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۱
۳۸۔ // // ،آدھے چاند کی رات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۳
۳۹۔اظہر غوری، غیر مشروط محبت، ملٹی میڈیا افئیر ز، لاہور،۲۰۰۰
۴۰۔اعظم خورشید، حرف ہالے، لودھی پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۸۹
۴۱۔افتخار احمد شیروانی (مترجم)، عورتوں کی محکومیت، فیروز سنز، لاہور،۱۹۹۳
۴۲۔افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر (مرتب)، کلیاتِ نظمِ حالی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور،۱۹۷۰
۴۳۔اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور،۱۹۷۳
۴۴۔الطاف فاطمہ، کشتانِ محفل، مطبع دارالبلاغ، لاہور، س ن
۴۵۔امجد اسلام امجد، دن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۳
۴۶۔ // // // ،اپنے لوگ (طویل ڈرامے)، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۱
۴۷۔ // // // ،وارث، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳
۴۸۔اُمِ عمارہ، آگہی کے ویرانے، مقبول اکیڈیمی، لاہور، طبع اول،۱۹۸۹
۴۹۔امین احسن اصلاحی، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، فاران فاؤنڈیشن، لاہور،۱۹۹۶
۵۰۔انتظار حسین، شہرِ افسوس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۵
۵۱۔// // // ،جنم کہانیاں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۰
۵۲۔// // // ، چاند گہن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۲
۵۳۔انعام الرحمٰن سحری، عورت جرائم کی دلدل میں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۱
۵۴۔انوار صدیقی، دستک، نیر اسد پریس، لاہور،۱۹۹۸
۵۵۔انور سجاد، سورج کو ذرا دیکھ، مکتبۂ عالیہ، لاہور،۱۹۹۴

۵۶۔انور مسعود، قطعہ کلامی، گورا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶
۵۷۔انیس ناگی، بیگانگی کی نظمیں، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰
۵۸۔// // //، ناراض عورتیں، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۳
۵۹۔// // //، ایک ادھوری سرگزشت، جمالیات لاہور، ۲۰۰۸
۶۰۔اے۔آر خاتون، افشاں، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۰
۶۱۔// // // //، کہانیاں، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۱
۶۲۔// // // //، تصویر، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۴
۶۳۔// // // //، چشمہ، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۴
۶۴۔بانو قدسیہ، سورج مکھی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱
۶۵۔ // //، تماثیل، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰
۶۶۔ // //، فٹ پاتھ کی گھاس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰
۶۷۔ // //، پیا نام کا دیا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴
۶۸۔ // //، آتش زیرِ پا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴
۶۹۔ // //، توجہ کی طالب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۷۰۔ // //، سامانِ وجود، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۷۱۔ // //، حاصل گھاٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۷۲۔ // //، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۷۳۔ // //، شہرِ بے مثال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۷۴۔ // //، پُروا، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶
۷۵۔ // //، دست بستہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶
۷۶۔بسمل صابری، پانی کا گھر، نمیر انٹر نیشنل، لاہور، ۱۹۹۸
۷۷۔بشریٰ اعجاز، بارہ آنے کی عورت، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴
۷۸۔بشریٰ رحمٰن، لازوال، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱
۷۹۔ // //، پارسا، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱
۸۰۔ // //، خوبصورت، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱
۸۱۔ // //، پیاسی، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲
۸۲۔ // //، شرمیلی، خزینۂ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۲
۸۳۔بشریٰ فرح، اک قیامت ہے لمحۂ موجود، ملت ایجوکیشنل پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰
۸۴۔بشیر طارق (مترجم)، تحفظِ نسواں، فوجداری ترمیم، ایکٹ ۲۰۰۶، ایسٹرن لا بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۷

۸۵۔ بلقیس ریاض، بادبان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰
۸۶۔ // // // تجدیدِ وفا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴
۸۷۔ // // // ، مجھے بولنے دو، کمبائن پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۷
۸۸۔ بلونت سنگھ، رات، چور اور چاند، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷
۸۹۔ پرویز اختر، خالد ارمان (مترجمین)، سیفو، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۳
۹۰۔ پروین شاکر، ماہِ تمام (کلیات)، مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد، س ن
۹۱۔ پروین فنا سید، تمنا کا دوسرا قدم، ایس۔ ٹی پرنٹرز، راول پنڈی، ۱۹۸۵
۹۲۔ پریم چند، منشی، نرملا، گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، س ن
۹۳۔ // // // ، پردۂ مجاز، لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی، ۱۹۴۹
۹۴۔ // // // ، میدانِ عمل، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴
۹۵۔ // // // ، گئودان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴
۹۶۔ توصیف قیصر، ڈاکٹر (مرتب)، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹
۹۷۔ ثبینہ رفعت، لوری دِل دُکھاتی ہے، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵
۹۸۔ ثریا شہاب، خود سے ایک سوال، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹
۹۹۔ ثمینہ راجا، شہرِ سبا، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷
۱۰۰۔ // // ، اور وصال کہاں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸
۱۰۱۔ // // ، باغ شب، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹
۱۰۲۔ جاں نثار اختر، کلیاتِ جاں نثار اختر، مکتبۂ عالیہ، لاہور، س ن
۱۰۳۔ جاوید شاہین، عشقِ ناتمام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳
۱۰۴۔ جاوید دانش، ہجرت کے تماشے، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور، ۱۹۹۳
۱۰۵۔ جمیل محمد، تذکرہ شاعراتِ ہند، بریلی قومی کتب خانہ، بریلی، ۱۹۴۴
۱۰۶۔ جمیل الدین عالی، دوہے، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۰۳
۱۰۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، اُردو میں اصولِ تحقیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، س ن
۱۰۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، کلیاتِ میراجی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶
۱۰۹۔ جمیلہ ہاشمی، تلاشِ بہاراں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳
۱۱۰۔ // // ، آتشِ رفتہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳
۱۱۱۔ // // ، دشتِ سُوس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷
۱۱۲۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی بارات، مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۷۵
۱۱۳۔ جیلانی بانو، نئی عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳

۱۱۴۔ چراغ حسن حسرت، سرگزشتِ اسلام، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، طبع اول، ۲۰۰۳
۱۱۵۔ حجاب امتیاز علی، وہ بہاریں، یہ خزائیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲
۱۱۶۔ // // // ، سوکھے پتے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹
۱۱۷۔ // // // ، پاگل خانہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۱۱۸۔ حسن عسکری، عسکری نامہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸
۱۱۹۔ حفیظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محمد، قصص القرآن، جلد اول ودوم، مکتبۂ رحمانیہ، لاہور، س ن
۱۲۰۔ حمید کاشمیری، کافی ہاؤس، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲
۱۲۱۔ حمیدہ اختر حسین رائے پوری، نایاب ہیں ہم، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۲۰۰۳
۱۲۲۔ حمیدہ شاہین، دشتِ وجود، ملٹی میڈیا، لاہور، ۲۰۰۶
۱۲۳۔ حنیف ندوی، مولانا محمد، مسلمان عورت، مکتبۂ جمالیات، لاہور، ۲۰۰۶
۱۲۴۔ حیا لکھنوی، ارمغانِ حیا، فرائیڈے پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۶
۱۲۵۔ خالدہ حسین، دروازہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹
۱۲۶۔ // // ، میں یہاں ہوں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۱۲۷۔ // // ، کاغذی گھاٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۱۲۸۔ خدیجہ مستور، بوچھاڑ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵
۱۲۹۔ // // ، ٹھنڈا میٹھا پانی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵
۱۳۰۔ خلیل احمد (مترجم)، عورت جنسی تفریق اور اسلام، مشعل، لاہور، ۱۹۹۵
۱۳۱۔ خلیل الرحمٰن منشی، عذرا۔ عذرا کی واپسی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴
۱۳۲۔ خورشید رضوی، سرابوں کے صدف، دستاویز مطبوعات، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۵
۱۳۳۔ داؤد رہبر، پراگندہ لوگ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷
۱۳۴۔ دُردانہ نوشین خان، اندرجال، مثال پبلی شرز، فیصل آباد، ۲۰۰۷
۱۳۵۔ ذاکر نائیک، ڈاکٹر، اسلام میں خواتین کے حقوق۔ جدید یا فرسودہ، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۰۶
۱۳۶۔ ذوالفقار احمد، قاضی، جنس کی سیاست، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۷
۱۳۷۔ رابعہ الربأ، عورت۔ مصائب، وجوہات، نفسیات، دُعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵
۱۳۸۔ راجندر سنگھ بیدی، مجموعہ راجندر سنگھ بیدی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷
۱۳۹۔ راشد الخیری، علامہ، بنت الوقت، عصمت بک ایجنسی، دہلی، ۱۹۴۲
۱۴۰۔ راضیہ شمشیر، لکھاری عورتیں اور دوسرے مضامین، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰
۱۴۱۔ رُباب انجم، تنہائیوں میں خدا، عظیم علیم پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰
۱۴۲۔ رخشندہ نوید، کسی اور سے محبت، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱

۱۴۳۔ رشید احمد، تاریخ مذاہب، زُمرد پبلی کیشنز، کوئٹہ، طبع اول، ۲۰۰۰

۱۴۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، عام آدمی کے خواب، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷

۱۴۵۔ رشیدہ عیاں، آئینوں کے چہرے، دنیائے ادب، کراچی، ۱۹۹۶

۱۴۶۔ // // //، میری کہانی (منظوم آپ بیتی)، اشارات پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۴

۱۴۷۔ رضا علی، سر، اعمال نامہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵

۱۴۸۔ رضی عابدی، مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں، ادارۂ تالیف و ترجمہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۷

۱۴۹۔ رضیہ بٹ، ثمینہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲

۱۵۰۔ // // ، رفاقتیں کیسی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳

۱۵۱۔ // // ، اماں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵

۱۵۲۔ // // ، مجموعہ رضیہ بٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷

۱۵۳۔ رضیہ فصیح احمد، بارش کا آخری قطرہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹

۱۵۴۔ // // //، یہ خواب سارے، دانیال، کراچی، ۱۹۹۲

۱۵۵۔ // // //، انتظارِ موسمِ گل، کلاسیک، لاہور، ۲۰۰۰

۱۵۶۔ // // //، چاکِ قفس، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۳

۱۵۷۔ // // //، مجموعہ رضیہ فصیح احمد، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۵

۱۵۸۔ // // //، کالا چور، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹

۱۵۹۔ رفعت سراج، گلابی کاغذ اور زرد پھول، خزینۂ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۸

۱۶۰۔ رفعت مرتضٰی، آدم کی پسلی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱

۱۶۱۔ رماشنکر یاتھی، تاریخ قدیم ہندوستان، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، طبع سوم، ۲۰۰۶

۱۶۲۔ ریاض، مرزا، نامکمل کہانی، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۶

۱۶۳۔ زاہد محمود، ڈاکٹر، گھریلو تشدد۔ وجوہات، اثرات اور انسداد، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۶

۱۶۴۔ زاہدہ حنا، نہ جنوں رہا نہ پری رہی، ناولٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸

۱۶۵۔ // // ، عورت: زندگی کا زنداں، شہزاد، کراچی، ۲۰۰۴

۱۶۶۔ // // ، تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸

۱۶۷۔ زبیدہ خاتون، نادرہ، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۵

۱۶۸۔ // // // ، ہما، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۵

۱۶۹۔ زکریا، ڈاکٹر، خواجہ محمد (مرتب)، کلیاتِ حفیظ جالندھری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵

۱۷۰۔ // // // // // //، کلیاتِ مجید امجد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳

۱۷۱۔ زہرہ نگار، شام کا پہلا تارا، گولڈن بلاک ورکس لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۸۰

۱۷۲۔ساحرلدھیانوی،کلیاتِ ساحر،علم وعرفان پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴
۱۷۳۔سارا شگفتہ،آنکھیں،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۰۶
۱۷۴۔ساقی فاروقی،سرخ گلاب اور بدرِ منیر،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵
۱۷۵۔// // //،آپ بیتی/ پاپ بیتی،اکادمی بازیافت،کراچی،۲۰۰۸
۱۷۶۔سجاد حیدر یلدرم،خیالستان،ایجوکیشن پبلی کیشنز،دہلی،۲۰۰۵
۱۷۷۔سعادت حسن منٹو،منٹو ڈرامے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳
۱۷۸۔// // // کلیاتِ منٹو،افسانہ حصہ اول ودوم،ایجوکیشنل پبلی کیشنز،دہلی،۲۰۰۵
۱۷۹۔سعد اللہ جان برق،دخترِ کائنات،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸
۱۸۰۔سعید شیخ،محمد،ایک اور دریا،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۲
۱۸۱۔// // //،زمین کا دُکھ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳
۱۸۲۔// // //،اقبالِ جرم،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵
۱۸۳۔// // //،رکاب،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶
۱۸۴۔سلطانہ ایمان،بیدار بخت (مرتبین) کلیاتِ اختر الایمان،ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۰۰
۱۸۵۔سلطانہ بخش،ڈاکٹر،ایم،پاکستانی اہلِ قلم خواتین۔ایک ادبی جائزہ،اکادمی ادبیاتِ پاکستان،اسلام آباد،۲۰۰۳
۱۸۶۔// // // // //،پاکستانی خواتین کے افسانوی ادب میں عورتوں کے مسائل تصویر کشی (۱۹۴۷۔۲۰۰۱)،
وزارتِ ترقیٔ خواتین،حکومتِ پاکستان،اسلام آباد،۲۰۰۵
۱۸۷۔سلمیٰ کنول،لالہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶
۱۸۸۔// // ،اکیلی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷
۱۸۹۔// // ،اِس دیوانگی میں،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷
۱۹۰۔// // ،دکھ سکھ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷
۱۹۱۔// // ،دل کی چوکھٹ پر،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸
۱۹۲۔سلمیٰ مسعود،خانماں برباد،فکشن ہاؤس،لاہور،۱۹۹۳
۱۹۳۔سلیم احمد،کلیاتِ سلیم احمد،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳
۱۹۴۔سلیم اختر،ڈاکٹر،عورت جنس اور جذبات،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۹
۱۹۵۔// // ،ضبط کی دیوار،سکالرز پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳
۱۹۶۔// // ،نرگس اور کیکٹس،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴
۱۹۷۔سلیم ملک،ڈاکٹر محمد،تلاش،بک ہوم،لاہور،۲۰۰۴
۱۹۸۔سلیمان بٹ،گھائل روحیں،نگارشات،لاہور،۲۰۰۵
۱۹۹۔سیماں،گیلی ریت کے گھر،بے مثال پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۵

۲۰۰۔شاہدہ حسن،ایک تارا ہے سرہانے میرے،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۵
۲۰۱۔// // ،یہاں کچھ پھول ہیں،کراچی،شہزاد،۲۰۰۲
۲۰۲۔شاہدہ لطیف،معجزہ،الحمد پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۰
۲۰۳۔شاہین مفتی،امانت،نقوش پریس،لاہور،۱۹۸۱
۲۰۴۔// // ،مسافت،اساطیر،لاہور،۱۹۹۸
۲۰۵۔شبنم شکیل(ودیگر مرتبین)،سلیم اختر،ڈاکٹر،خالدہ حسین،خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی،
وزارتِ ترقی خواتین،اسلام آباد،۲۰۰۵
۲۰۶۔// // ،اضطراب،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۴
۲۰۷۔// // ،شب زاد،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۸
۲۰۸۔// // ،مسافت رائیگاں میری،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸
۲۰۹۔شبہ طراز،جگنو ہنستے ہیں،تجدیدِ اشاعت گھر،اسلام آباد،۲۰۰۲
۲۱۰۔شرر عبدالحلیم،عصر قدیم،سٹی بک پوائنٹ،کراچی،۲۰۰۵
۲۱۱۔شمیم مختار،کیا عورت آدھی ہے،شاہد پبلی کیشنز،لاہور،س ن
۲۱۲۔شورش کاشمیری،موت سے واپسی،الفیصل تاجران کتب،لاہور،۱۹۹۴
۲۱۳۔شوکت صدیقی،چار دیواری،رکتاب پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۰
۲۱۴۔// // // ،جانگلوس جلد اول،رکتاب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۰۹
۲۱۵۔// // // ،جانگلوس جلد دوم،رکتاب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۰۹
۲۱۶۔// // // ،جانگلوس جلد سوم،رکتاب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۰۹
۲۱۷۔// // // ،خدا کی بستی،رکتاب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۰۹
۲۱۸۔شہرت بخاری،شبِ آئینہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۸۷
۲۱۹۔// // // ،کھوئے ہوؤں کی جستجو،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۲
۲۲۰۔شہزاد احمد،دیوار پہ دستک،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱
۲۲۱۔// // ،تیسری دُنیا کے مسائل،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۶
۲۲۲۔شہناز مزمل،میرے خواب ادھورے ہیں،عمیر پبلشرز،لاہور،۱۹۹۵
۲۲۳۔// // ،موم کے سائباں،پاک بک ایمپائر،لاہور،۱۹۹۴
۲۲۴۔// // ،عشق تماشا،ندا پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۲
۲۲۵۔صادق کمال،ڈاکٹر،خانم،مثال پبلی شرز،فیصل آباد،۲۰۰۶
۲۲۶۔صالحہ عابد حسین،حالی کی ایک جھلک،انجمنِ ترقی اُردو،ہند علی گڑھ،۱۹۵۹
۲۲۷۔صدیق سالک،پریشر ککر،الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب،لاہور،۲۰۰۷

۲۲۸۔صلاح الدین محمود (مرتب)، مجموعہ راجندر سنگھ بیدی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۴
۲۲۹۔// // // // // // ،مجموعہ مرزا عظیم بیگ چغتائی مرتبہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸
۲۳۰۔صوفی تبسم،کلیاتِ صوفی تبسم،ماورا،لاہور،طبع اول،۱۹۹۰
۲۳۱۔ضیاالدین،ڈاکٹر سید،عورت۔قبل از اسلام اور بعد از اسلام،النور ہیلتھ ایجوکیشن ٹرسٹ،کراچی،۲۰۰۶
۲۳۲۔طارق چودھری،محمد،کرشن چندر کے سوافسانے،چوہدری اکیڈمی،لاہور،۲۰۰۲
۲۳۳۔طاہرہ اقبال،سنگ بستہ،قرطاس،فیصل آباد،۱۹۹۹
۲۳۴۔ظہیر کاشمیری،کلیاتِ ظہیر،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۴
۲۳۵۔عابدہ علی،ڈاکٹر،عورت قرآن وسُنت اور تاریخ کے آئینے میں،قرآن منزل،لاہور،س ن
۲۳۶۔عبدالرحمٰن خان،ایم،عورت انسانیت کے آئینے میں،شیخ اکیڈمی،لاہور،۱۹۷۴
۲۳۷۔عبدالکریم ذاکر نائیک،ڈاکٹر،اسلام میں خواتین کے حقوق۔جدید یا فرسودہ،دارالنوادر،لاہور،۲۰۰۶
۲۳۸۔عبداللہ حُسین،نادار لوگ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴
۲۳۹۔// // // ،نشیب،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴
۲۴۰۔// // // ،باگھ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶
۲۴۱۔// // // ،رات،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۶
۲۴۲۔// // // ،قید،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸
۲۴۳۔عذرا عباس،خواب مجھے دیکھتے ہیں،پیکیسیس پریس،لنڈن،س ن
۲۴۴۔عرفانہ عزیز،کفِ بہار،مکتبۂ افکار،کراچی،۱۹۸۵
۲۴۵۔// // ،حرفِ شریں،خزینۂ علم وادب،لاہور،طبع اول،۲۰۰۲
۲۴۶۔عزیز احمد،مرمر اور خون،مکتبۂ جدید،لاہور،۱۹۵۱
۲۴۷۔// // ،ایسی بلندی ایسی پستی،تخلیقات،لاہور،۲۰۰۰
۲۴۸۔// // ،آگ،تخلیقات،لاہور،۲۰۰۰
۲۴۹۔عشرت آفریں،دھوپ اپنے حصے کی،کراچی،سمیع سنز پرنٹرز،لاہور،۲۰۰۵
۲۵۰۔عصمت چغتائی،شیطان،م ن،س ن،
۲۵۱۔// // // معصومہ،نیا ادارہ،لاہور،۱۹۲۶
۲۵۲۔// // // ،بہروپ نگر،ندیم پبلی کیشنز،راول پنڈی،۱۹۴۷
۲۵۳۔// // // ،کلیاں،اُردو مرکز،لاہور،۱۹۶۰
۲۵۴۔// // // ،ٹیڑھی لکیر،نگ ٹائم،کراچی،۲۰۰۹
۲۵۵۔عطیہ سید،خزاں میں کونپل،شہرِ ببول،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴
۲۵۶۔عظمیٰ گیلانی،سیدہ،کرچیاں مگر نہیں سمٹیں،لاہور،عروج پرنٹرز،۲۰۰۰

۲۵۷۔عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵

۲۵۸۔عبدالغفار، قاضی، لیلیٰ کے خطوط، یو پبلی شرز، لاہور، ۲۰۰۱

۲۵۹۔عبداللہ، ڈاکٹر سید، مباحث، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۶۵

۲۶۰۔عمیرہ احمد، لا حاصل، علم و عرفان پبلی شرز، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۷

۲۶۱۔// // ، دوراہا، علم و عرفان پبلی شرز، لاہور، طبع اول، ۲۰۰۹

۲۶۲۔غزالہ خاکوانی، در تو کھولیے، جاذب پبلی شرز، ملتان، ۲۰۰۵

۲۶۳۔فاخرہ بتول، سمندر پوچھتا ہوگا، خزینۂ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۱

۲۶۴۔// // ، اَب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو، خزینۂ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۰

۲۶۵۔// // ، دُور مت نکل جانا، خزینۂ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۲

۲۶۶۔فاخرہ تحریم، عورت کا المیہ، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۹

۲۶۷۔فاروق خان محمد، ڈاکٹر، رضوانہ فاروق، ڈاکٹر، اسلام اور عورت، دار الاشراف، لاہور، ۲۰۰۱

۲۶۸۔فاطمہ حسن، بہتے ہوئے پھول، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹

۲۶۹۔// // ، دستک سے در کا فاصلہ، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹

۲۷۰۔// // ، فیمینزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۵

۲۷۱۔فاطمہ مبین، مجموعہ فاطمہ مبین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷

۲۷۲۔فرحت صفدر فرح، فضائیں دیکھ کر پرواز کرنا، گلوبل پبلی شرز، اسلام آباد، س ن

۲۷۳۔فرخندہ لودھی، حسرتِ عرضِ تمنا، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، لاہور، ۱۹۹۴

۲۷۴۔// // // ، شہر کے لوگ، یونیوسل بکس، لاہور، ۱۹۹۶

۲۷۵۔// // // ، خوابوں کے کھیت، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰

۲۷۶۔// // // ، جب بجا کٹورا، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹

۲۷۷۔فرمان فتح پوری، افسانہ اور افسانہ نگار، م ن، ۱۹۸۶

۲۷۸۔فضل کریم فضلی، خونِ جگر ہونے تک، انجمنِ ترقیِ ادب، کراچی، س ن

۲۷۹۔مہر نگار مسرور، فلک پیا کے ڈرامے مرتبہ، ماس پرنٹرز، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۴

۲۸۰۔فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی ردِ تشکیل۔ غلطی ہائے مضامین، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶

۲۸۱۔// // // ، میں تو مٹی کی مورت ہوں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸

۲۸۲۔// // // ، بدن دریدہ، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۷۴

۲۸۳۔فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، مکتبۂ کارواں، لاہور، س ن

۲۸۴۔قتیل شفائی، رنگ، خوشبو، روشنی کلیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸

۲۸۵۔قدرت اللہ شہاب، ماں جی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴

۲۸۶۔ // // // // ، یا خدا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۲۸۷۔ // // // // ، شہاب نامہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹

۲۸۸۔ قرۃ العین حیدر، کوہ دماوند، مکتبۂ اُردو ادب، لاہور، س ن

۲۸۹۔ // // // ، چار ناولٹ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰

۲۹۰۔ // // // ، میرے بھی صنم خانے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰

۲۹۱۔ // // // ، کارِ جہاں دراز ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۲۹۲۔ // // // ، آگ کا دریا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷

۲۹۳۔ کرشن چندر، غدار، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۴

۲۹۴۔ کشور ناہید (مترجم)، زیتون، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲

۲۹۵۔ // // ، خواتین افسانہ نگار ۱۹۳۰ سے ۱۹۹۰ تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶

۲۹۶۔ // // ، عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰

۲۹۷۔ // // ، دشتِ قیس میں لیلیٰ کلیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱

۲۹۸۔ // // ، بُری عورت کے خطوط۔ نازائیدہ بیٹی کے نام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳

۲۹۹۔ // // ، عورت: خواب اور خاک کے درمیان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵

۳۰۰۔ // // ، ورق ورق آئینہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۳۰۱۔ کوثر علی، آئینۂ حیات، عبداللہ پبلی شرز، لاہور، طبع اول، س ن

۳۰۲۔ گورو گرنیش، عورت، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۶

۳۰۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵

۳۰۴۔ مجیب، محمد، دُنیا کی تاریخ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۰۵

۳۰۵۔ کلیم، محمد، عورت اور قرآن، نگارشات، لاہور، ۲۰۰۶

۳۰۶۔ یحییٰ خان، محمد، شب دیدہ، پیارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱

۳۰۷۔ مسعود مفتی، توبہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶

۳۰۸۔ مظہر الاسلام، اے خدا، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹

۳۰۹۔ // // ، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹

۳۱۰۔ معراج نیر، ڈاکٹر سید (مرتب)، پریم چند، بیسویں صدی کے منتخب افسانے، الاعجاز پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳

۳۱۱۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول (ہیئت، اسالیب اور رُجحانات)، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۷

۳۱۲۔ ممتاز مفتی، گڑیا گھر، الفیصل ناشران و تاجران، لاہور، ۲۰۰۸

۳۱۳۔ // // ، علی پور کا ایلی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸

۳۱۴۔ // // ، سمے کا بندھن، الفیصل ناشران و تاجران، لاہور، ۲۰۰۸

۳۱۵۔ // // ،چُپ،الفیصل ناشران وتاجران،لاہور،۲۰۰۸
۳۱۶۔ // // ،اَن کہی،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸
۳۱۷۔ // // ،اسمارائیں،الفیصل ناشران وتاجران،لاہور،۲۰۰۸
۳۱۸۔ // // ،الکھ نگری، الفیصل ناشران وتاجران،لاہور،۲۰۰۸
۳۱۹۔ // // ،روغنی پتلے،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۹
۳۲۰۔ منصورہ احمد،طلوع،لاہور،اساطیر،۱۹۹۷
۳۲۱۔ منعم مجید،قابلِ رحم،روشن پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۵
۳۲۲۔ منیر احمد،عورت اور بازار،نگارشات،لاہور،۲۰۰۳
۳۲۳۔ مہر نگار مسرور،فلک پیا کے ڈرامے،بیت العزیز،کراچی،۱۹۸۴
۳۲۴۔ میرزا دیب،آنسو اور ستارے،مقبول اکیڈمی،لاہور،س ن
۳۲۵۔ // // ،رفیع پیر کے ڈرامے،مجلسِ ترقیِ ادب،لاہور،۱۹۹۰
۳۲۶۔ // // ،مٹی کا دیا،مقبول اکیڈمی،لاہور،۲۰۰۹
۳۲۷۔ میمونہ روحی،کانٹوں میں جگنو،سلیم نواز پرنٹنگ پریس،فیصل آباد،۱۹۹۸
۳۲۸۔ مستنصر حسین تارڑ،کالاش،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳
۳۲۹۔ نازیہ بٹ (مترجم)،ع عورت م مرد،نگارشات،لاہور،۲۰۰۴
۳۳۰۔ ناہید قاسمی،بنجر دِل سیراب کرو،مکتبۂ فنون،لاہور،طبع اول،۱۹۹۱
۳۳۱۔ نثار عزیز بٹ،مجموعہ نثار عزیز بٹ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۹
۳۳۲۔ نجیب رام پوری،عورت نامہ،ندیم یونس پریس،لاہور،۱۹۹۴
۳۳۳۔ نذیر احمد،ڈپٹی،مراۃ العروس،یو پبلی شرز،لاہور،۲۰۰۳
۳۳۴۔ نذیر،سی ایم،پتھر کی عورت،نگارشات،لاہور،۱۹۹۸
۳۳۵۔ نسرین انجم بھٹی،بن باس،پلس کمیونی کیشنز،لاہور،۱۹۹۴
۳۳۶۔ // // // ،زنداں کے گیت،بکسن پرنٹرز،لاہور،۲۰۰۰
۳۳۷۔ نسرین پرویز،شیخ وفاحشہ،مشہور پریس،لاہور،۲۰۰۶
۳۳۸۔ نسیم اختر،ادھورے خواب،خزینۂ علم وادب،لاہور،۲۰۰۳
۳۳۹۔ // // ،کلیاتِ نسیم اختر،خزینۂ علم وادب،لاہور،۲۰۰۴
۳۴۰۔ نسیم حجازی،خاک اور خون،م ن،س ن
۳۴۱۔ نصیر الدین بٹ،مردانہ معاشرہ۔مظلوم عورت اور جمہوریت،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۰۸
۳۴۲۔ نظیر اکبر آبادی،کلیاتِ نظیر،مکتبۂ شعر وادب،لاہور،س ن
۳۴۳۔ نعیم صدیقی (مرتب)،افشاں،الفیصل ناشران وتاجران،لاہور،۲۰۰۶

۳۴۴۔// // // // ،عورت معرضِ کشمکش میں،الفیصل ناشران وتاجران، لاہور،۲۰۰۳
۳۴۵۔نوازش علی راول (مترجم)،ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال، گندھارا بکس، راول پنڈی، ۲۰۰۵
۳۴۶۔نوشی گیلانی، اُداس ہونے کے دِن نہیں ہیں، گیلانی پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸
۳۴۷۔// // ، پہلا لفظ محبت لکھا، جے بی ڈی آرٹ سیکشن، لاہور، ۲۰۰۳
۳۴۸۔نیر اقبال علوی، عالم سوز وساز، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵
۳۴۹۔// // // ،سلسلۂ روز وشب، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵
۳۵۰۔// // // ، جہانِ رنگ وبو، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵
۳۵۱۔نیلم احمد بشیر، لے سانس بھی آہستہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹
۳۵۲۔// // ، جگنوؤں کے قافلے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸
۳۵۳۔نیلما سرور، جب نہر کنارے شام ڈھلی، کلاسیک، لاہور، س۔ن
۳۵۴۔ن۔م۔راشد، کلیاتِ ن۔م۔راشد، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، طبع دوم، ۱۹۹۱
۳۵۵۔وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۹
۳۵۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، چُنا ہم نے پہاڑی رَاستہ، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۹
۳۵۷۔ہاجرہ مسرور، سب افسانے میرے، مقبول اکیڈیمی، لاہور، ۱۹۹۱
۳۵۸۔ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۹۹
۳۵۹۔یاسر جواد (مترجم)، عورت۔جسمانی، تاریخی، نفسیاتی اور معاشرتی مطالعہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۹
۳۶۰۔یاسمین حمید، پسِ آئینہ، بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور، ۱۹۸۸
۳۶۱۔ // // ، حصارِ بےدرودیوار، جنگ پبلی شرز، لاہور، ۱۹۹۱
۳۶۲۔ // //، فنا بھی ایک سراب ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱
۳۶۳۔یاسمین گل، اعتراف، مکتبۂ اساطیر، لاہور، ۱۹۹۵
۳۶۴۔یونس جاوید، آوازیں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، س ن
۳۶۵۔یونس حسنی، ڈاکٹر (مرتب)، کلیاتِ اختر شیرانی، ندیم بک ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳

English Books:

366-Abida Samm-Ud-Din , Muslim Feminism and feminist movement , (Central Asia) global vision publishing house, India .

367-Ambreen Sallah ud Din ,Feminism in modern urdu poetesses(1857-2000) , west Pakistan urdu Acadamy,2005.

368-Fareeha Zafar , Finding our way (Reading on women in Pakistan) ,1991.

369- Farida Shaheed , Shapping women's life (Laws, Practices and starteges in Pakistan) ,

Shirkat Gah 1998.

370-Herbert Lockyer, All the women of the Bible(4th addition), India, Zondervan publishing house, 2005.

371- Keiko Takahashi , The Principle of Hope, Samoh Publishing Co.,Ltd. Tokyo .

372- Kishwar Naheed, Women Myth & Realities,Sang-e-meel publications,Lahore,2008.

373-Rashid Mahmood,Langrial, Story of the fair sex socioeconomic conditions of women , through time, Lahore, Takhleeqat, 1995.

رسائل اور روزنامچے:

۳۷۴۔ادبیات (سہ ماہی)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، جلد ۱۴۔۱۵، شمارہ ۵۹۔۶۰ جنوری تا جون، ۲۰۰۲

۳۷۵۔تضمین (سہ ماہی)، حافظ جمیل پرنٹنگ پریس، لاہور، اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۷، جلد ا، شمارہ ا

۳۷۶۔دریافت ۲، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۰۳

۳۷۷۔سمبل، ایف۔آئی پرنٹرز، راول پنڈی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶، شمارہ ا، جلد ا

۳۷۸۔ادبیات (سہ ماہی)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۷۴۔۷۵، جنوری تا جون، ۲۰۰۷

۳۷۹۔کاغذی پیرہن (ماہنامہ)، لاہور، مارچ، اپریل، ۲۰۰۷

۳۷۰۔مکالمہ (کتابی سلسلہ ۱۰)، اکادمی بازیافت، کراچی، جنوری تا جون، ۲۰۰۳

۳۸۱۔نقاط، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۰۷

۳۸۲۔جناح (روزنامہ)، ۱۶ مارچ ۲۰۰۷

Journals and Encyclopedia:

383-Dawn (Magazine), January 12 , 2003 .

384-The New Encyclopedia Britannica valume 19, 15th edition .

TANISYAT AUR PAKISTANI URDU ADAB

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

IN

URDU

BY:

NAUREEN RUBY

UNDER SUPERVISION OF:

DR. MUHAMMAD SALEEM MALIK

PROF. DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF THE PUNJAB, ORIENTAL COLLEGE, LAHORE

2010